ٹیلیفون نمبر
۳۵۲۵
۶۴۸۹۱

رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

نقوش

شوکت نمبر

۹۹
ستمبر ۱۹۶۳ء

مدیر
محمد طفیل

فی پرچہ
سات روپے

سالانہ چندہ بیس روپے
غیر ممالک سے پچیس روپے

ادارۂ فروغِ اُردو ۔ لاہور

ترتیب

طلوع
نطقہ و تیغ
میری سرگزشت

حرف فصل - ۶
حفیظ ہوشیارپوری، ۵
شوکت تھانوی، ۷

(۱)

ہمعصروں کی نظر میں

ڈاکٹر اقبال، ۹
فرحت اللہ بیگ، ۱۰
خواجہ حسن نظامی، ۱۳
مرزا عظیم بیگ چغتائی، ۱۷
رشید احمد صدیقی، ۲۲
نیاز فتحپوری، ۲۸
جعفر علی خاں اثر، ۳۳
مولانا عبدالماجد دریابادی، ۳۶
سید وقار عظیم، ۴۰
احمد جمال پاشا، ۵۸

(۲)

۲۲۱۳۹

منتخب مضامین

۱ — اپنے مضامین اپنی نظر میں، ۴۹
۲ — سودیشی ریل، ۵۳
۳ — شاہین بچے، ۶۰
۴ — تعزیت، ۶۷
۵ — لکھنؤ کا ٹنڈرس سیشن، ۷۱
۶ — پرابلم، ۷۶
۷ — کچھ یادیں کچھ باتیں، ۸۲
۸ — شیش محل، چند اسکیچ، ۹۱
۹ — بار خاطر (چند خطوط)، ۹۶
۱۰ — قاضی جی، ۱۰۷
۱۱ — منشی جی، ۱۱۳
۱۲ — پہاڑ تلے، ۱۱۹

(۳)

غیر مطبوعہ مضامین اور ڈرامے

۱ — رعنا، ۱۲۵

۲ — ڈروانہ ، ۱۵۱
۳ — جگر مراد آبادی ، ۱۶۵
۴ — ڈاکٹر صاحب ، ۱۶۹
۵ — دیگ ، ۱۸۰
۶ — مرقع ، ۱۸۷
۷ — آم اور جامن ، ۱۹۵
۸ — نقش و نگار ، ۲۰۳
۹ — دوزخ ، ۲۱۳
۱۰ — ہم اور وہ ، ۲۲۲
۱۱ — [illegible] ، ۲۲۹
۱۲ — گداگری ، ۲۳۳
۱۳ — نقوش کے نقاش ، ۲۳۸
۱۴ — خواہ مخواہ ، ۲۳۵
۱۵ — لاحول ولا قوۃ ، ۲۶۳
۱۶ — [illegible] ، ۳۰۳

(۴)

بحیثیت مدیر

۱ — سرخی کی ایک جھلک ، ۲۷۵
۲ — طوفان (روزنامہ) ۲۸۷

(۵)

منظومات

۱ — ۲۵ غیر مطبوعہ غزلیں ، ۳۰۲

مزاحیہ نظمیں

۲ — شاعر کی بیوی ، ۳۲۷
۳ — مری ، ۳۲۹
۴ — آشا ، کراچی کی بسیں ، ۳۳۲
۵ — الوداع ، ۳۳۴

مرثیہ

۶ — شہادتِ عظمیٰ

(۶)

شخصیت

(الف) ۱ — بڑا سانحہ — چودھری خلیق الزمان ، ۳۳۹
۲ — حضرت تھانوی مرحوم — عبدالماجد دریا بادی ، ۳۴۰

۳ — ایک مہذب ظرافت نگار — قرۃ العین حیدر، ۳۴۲
۴ — میرا رفیق — قدرت اللہ شہاب، ۳۴۷
۵ — باغ و بہار شخصیت — حفیظ جالندھری، ۳۴۸
۶ — شوکت تھانوی کی یاد میں — فیض احمد فیض، ۳۵۲
۷ — گوہر فن ظرافت — کنہیا لال کپور، ۳۵۳
۸ — صاحب طرز ادیب — سید ہاشم رضا، ۳۵۷
۹ — شوکت تھانوی — شاہد احمد دہلوی، ۳۵۸
۱۰ — عجیب و غریب ادبی شخصیت — محمد شعیب، ۳۶۸
۱۱ — جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں — حجاب امتیاز علی، ۳۶۹
۱۲ — آہ شوکت — محمد عبدالرؤف عباسی، ۳۷۴
۱۳ — مسکراہٹوں کا سفیر — ماہر القادری، ۳۷۹
۱۴ — آہ شوکت تھانوی — امین سلونوی، ۳۸۵
۱۵ — شوکت اور نسیم — نسیم انہونوی، ۳۹۰
۱۶ — شوکت تھانوی سودیشی ریل کے بعد — حکیم یوسف حسن، ۴۰۰

(ب) ۱۷ — بیگم شوکت نے کہا (انٹرویو) — محمد طفیل، ۴۱۱
۱۸ — میرا بیٹا — خاتون ارشد، ۴۲۷
۱۹ — شوکت نامہ — ارشد تھانوی، ۴۳۴
۲۰ — ابا — رشید عمر، ۴۵۵
۲۱ — پیارے ابا شوکت تھانوی — شوکیہ تھانوی، ۴۶۰
۲۲ — پیارے ابا — خورشید (عمر) شوکت، ۴۶۳
۲۳ — جو نہ مرتا کوئی دن اور — عادل رشید، ۴۷۳
۲۴ — شوکت بھائی! — اقبال صفی پوری، ۴۸۸

(ج) ۲۵ — شوکت تھانوی — امتیاز علی تاج، ۵۰۳
۲۶ — شوکت تھانوی کے آخری ایام — فضل احمد کریم فضلی، ۵۱۱
۲۷ — چند یادیں — عشرت رحمانی، ۵۱۵
۲۸ — مرحوم — نادم سیتاپوری، ۵۲۷
۲۹ — مرد خوش گفتار — نسیم ممتاز، ۵۳۶
۳۰ — میرے تاثرات — ڈاکٹر میمونہ انصاری، ۵۵۶
۳۱ — میں اور شوکت بھائی — بیگم خورشید (حفیظ جالندھری)، ۵۶۱
۳۲ — شوکت تھانوی جب قاضی جی ہوتے — اختر جہاں، ۵۶۶

(۷)

خطوط

بنام سعیدہ خاتون، زہرا شوکت، ۵۷۰

آرٹسٹ: اسلم کمال

محمد طفیل پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر نقوش ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

شوکت تھانوی

مولف اپنی بیگم کے ساتھ

سعید عمر

نواز شوکت

خورشید عمر

فوزیہ شوکت

[illegible]

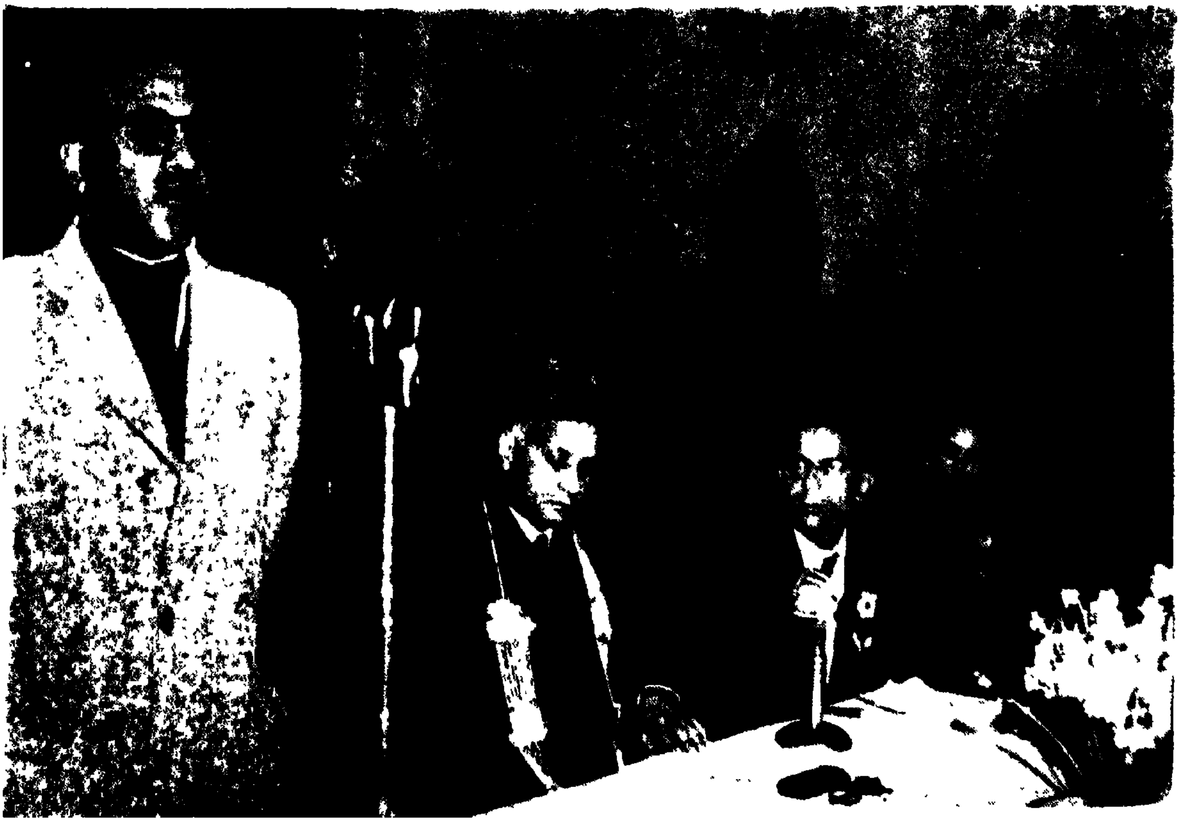

مرحوم صدر و گورنر کے ساتھ

عکس تحریر

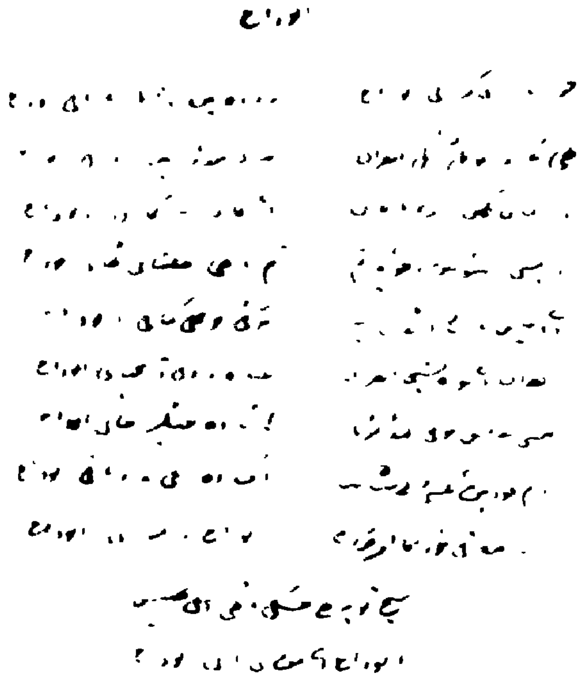

قطعۂ تاریخ

وہ بزم کو جگمگانے والا نہ رہا   وہ غم میں بھی مسکرانے والا نہ رہا
یادِ شوکت میں عید کے دن روئیں   ہنسنے والا ہنسانے والا نہ رہا

۱۹۶۳ء

حفیظ ہوشیارپوری

طلوع

دیکھئے، وہ صاحب بھی مر گئے۔ جو مجسم زندگی تھے۔

شوکت صاحب کی شخصیت میں کچھ ایسی موہنی تھی کہ انھیں دیکھ کر اکتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ زندگی کی ساعتیں طویل تر ہو جائیں۔

گھر کی کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے تو اس کا بھی ہفتوں قلق رہتا ہے۔ پھر یہ تو شوکت تھانوی تھے ایک ایسی بھرپور ہستی جسے میں اس دکھی دنیا کیلیے خدا کی طرف سے عطیہ سمجھتا رہا۔ انھوں نے ہزاروں کو زندگی سے پیار کرنے کا درس دیا مگر جب ان سے پیار کرنے والوں کی تعداد بڑھی تو یہ چپکے سے موت کی انگلی پکڑے دور نکل گئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ شوکت صاحب صرف میرے دوست تھے۔ نہ ہی یہ دعویٰ کروں گا کہ انھیں جتنا میں جانتا تھا اُتنا کوئی اور واقف نہ تھا۔ اتنی بے تعلقی پر بھی میرا ان سے جتنا بھی ربط ضبط رہا۔ اُس کی بنا پر مجھ سے اُداس ہونے کا حق کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔

بیماری کے دنوں میں شوکت صاحب اپنے دوستوں کو دیکھ کر رو دیا کرتے تھے۔ زندگی بھر ہنسنے ہنسانے والا انسان یوں ٹپ ٹپ آنسو بہائے اچھا نہ لگتا تھا۔ مگر انسانی زندگی پر شوکت صاحب کا یہ خاموش طنز بھی بھولنے والی بات نہیں۔

ہم سب کتنے عاجز ہیں کہ زندگی رونے کی آواز سے شروع ہو کر، درد کی آواز پہ ختم ہو جاتی ہے۔

شوکت صاحب کی عمر ۵۹ برس کی تھی۔ مگر عمروں کو برسوں کے اعتبار سے ناپنا نہیں چاہیے۔ عمر اُن کی زیادہ ہوتی ہے جو کام زیادہ کرتے ہیں۔ آپ اُن لوگوں کے بارے میں سوچیں، جو دفن ہونے سے پہلے مر جاتے ہیں اور ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔ جو دفن ہونے کے بعد بھی نہیں مرتے۔

محمد طفیل

کتب خانہ [illegible] اسلامیہ دہلی

میری سرگزشت

شوکت تھانوی

دس منٹ میں کوئی اپنی سرگزشت آخر کیا بیان کرے گا البتہ سرسری سرگزشت ۔ بیان کرنا تو دوسری بات ہے ۔ لہٰذا میں بھی اس صحرا کو ذرے میں سمیٹنے اور اس سمندر کو قطرے میں جذب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس اختصار کی بدولت اور کچھ نہ سہی لوگ مجھ کو کم عمر تو سمجھ ہی لیں گے کہ کیا ننھی سی عمر کی ننھی سی تفصیل ہے ۔

یہ حادثہ ۲ فروری ۱۹۰۴ء کو بندرابن ضلع متھرا میں پیش آیا کہ میں نے بھی کرشن جی کی جنم بھومی کو اپنی جنم بھومی بنا لیا۔ کوئی مناسبت نہ سہی لیکن ایک عجیب و غریب نسبت تو ہے ہی اور اگر کوئی اس کو گستاخی کے زمرے میں لے اس بے ساختہ گستاخی کا میں ذمہ دار نہیں ہوں ۔ ہوش سے پہلے میں گوش کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بعض وہ باتیں جو میں نے اپنے متعلق سنی ہیں خود مجھ کو یاد نہیں ہیں کہ میں بچپن میں بے حد بیمار رہا کرتا تھا اور علاوہ دوسری وقتی بیماریوں کے ضعف معدہ کی شکایت نہایت تسلسل کے ساتھ جاری تھی اور اس کی وجہ سے نہایت سخت پرہیز ہوتا تھا۔ اتنا سخت پرہیز کہ میں والد صاحب کو کھانا کھاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اور اس کی وجہ سے خوش ہو جاتا تھا کہ میں نہ سہی میرا باپ تو کھانا کھاتا ہے اور اگر وہ کبھی شوربے میں ڈوبی ہوئی انگلی چٹا دیتے تو دیر تک چٹخارے لیتا تھا۔ سنا ہے کہ اسی زمانے میں سب سے پہلا شعر میں نے کہا تھا جس کا مطلع تھا کہ ؎

نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں
ارے میرے اللہ میں کیا کروں

اس وقت میری عمر پانچ سال کی تھی اور یہ واقعہ میں نے نہایت تواتر کے ساتھ کئی مرتبہ والد محترم اور والدہ محترمہ سے سنا اور کچھ سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ شعر مجھ سے کیونکر سرزد ہو گیا ۔

میں نے اپنے ہوش کی آنکھیں بھوپال میں کھولیں جہاں والد محترم یو۔ پی پولیس سے مانگ لیے گئے تھے اور انسپکٹر جنرل پولیس تھے ۔ یہیں اس اسکول میں دو سال ہی رہنے پایا تھا کہ والد صاحب لکھنؤ آ گئے ۔ لکھنؤ میں میرا داخلہ چرچ مشن ہائی اسکول میں ہو گیا اور پھر گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں آ گیا ۔ جہاں میٹرک فیل ہونے تک رہا اس لیے کہ اس زمانے میں لکھنؤ میں فیل ہونے والے کلکتہ جا کر پاس ہوا کرتے تھے لہٰذا مجھ کو بھی کلکتہ جانا پڑا اور پھر لکھنؤ آ گیا

ی زمانے میں میں نے شاعر ہونا شروع کر دیا تھا اور والد صاحب سے چھپ کر سگریٹ پیتا اور شعر کہتا رہتا تھا۔ یہ طے تھا کہ اگر ان دونوں مشاغل میں سے کسی کی اطلاع والد صاحب کو ہو گئی تو طبیعت صاف کر دیں گے۔ مجھ کو اپنے اس زمانے کے اشعار میں سے صرف ایک شاہکار یاد ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تمہارا شربتِ دیدار ہی ان کو شفا دے گا
جو عشق مرض مہلک کے بیمار ہو جائیں

"مرض" کی "ر" کو اگر ساکن کی بجائے متحرک کر لیتا تو بھی اس شعر پر کوئی آنچ نہ آتی۔ ایسا شعر اب باوجود کوشش کے میں نہیں کہہ سکتا۔ تمنا تھی تو صرف یہ کہ میرا کلام کسی رسالے میں چھپ جائے۔ آخر یہ حسرت بھی پوری ہو گئی اور لکھنؤ کے ایک رسالے میں جس کے نام ہی سے اس کا معیار ظاہر ہے یعنی "ترچھی نظر" میری ایک غزل چھپ گئی۔ کچھ نہ پوچھئے میری خوشی کا عالم۔ میں نے وہ رسالہ کھول کر ایک میز پر رکھ دیا تھا کہ ہر آنے جانے والے کی نظر اس غزل پر پڑ سکے مگر شامتِ اعمال کہ سب سے پہلے نظر والد صاحب کی پڑی اور انھوں نے یہ غزل پڑھتے ہی ایسا شور مچایا کہ گویا چور پکڑ لیا ہو۔ والدہ محترمہ کو بلا کر کہا، "آپ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ جاتے ہی کیوں ہیں۔ کس سے پوچھ کر جاتے ہیں۔ والدہ بیچاری سہم کر رہ گئیں اور خوفزدہ آواز میں بولیں "وہ غلطی سے چلا گیا ہوگا"۔ مختصر یہ کہ اب میں شوکت تھانوی بن چکا تھا اور اب کوئی طاقت مجھ کو شوکت تھانوی سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ اسی زمانے میں علی گڑھ جا کر جھانکنے کا موقع بھی ملا۔ مگر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ والد محترم کا انتقال ہو گیا اور مجھ کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر فکرِ معاش میں مصروف ہو جانا پڑا۔ روزنامہ "ہمدم" اس دور کا بہت بڑا اخبار سمجھا جاتا تھا (بابائے صحافت سید جالب دہلوی اس کے ایڈیٹر تھے اور مجھ کو بحیثیت مترجم کے انہی کی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا) سید جالب نے میرا سب سے پہلا مزاحیہ مضمون "میٹھے چاول" ایک رسالہ میں پڑھا اور دوسرے ہی دن مجھ کو حکم دیا کہ "ہمدم" کا فکاہیہ کالم "دو دو باتیں" لکھنے کی کوشش کرو۔ لہٰذا میں نے یہ مشق شروع کر دی۔ کچھ دن اور گزرنے کے بعد شذرات لکھوانا شروع کر دیئے اور اب میں شعبۂ ترجمہ سے مستقلاً عملۂ ادارت میں آ گیا یہاں تک کہ پانچ سال بعد جب جالب دہلوی "ہمدم" سے رخصت ہوئے تو مجھ ہی کو ان کا چارج لینا پڑا۔ چند ہی دن بعد ملک نصر اللہ خاں نے آ کر چارج لے لیا اور میں روزانہ اودھ اخبار کی جو منشی نولکشور کا اخبار تھا ادارت پر آ گیا۔ اودھ اخبار کے بعد روزنامہ ہند کا ایڈیٹر رہا۔ خود اپنا روزنامہ طوفان کے نام سے جاری کیا۔ جب انقلابی حکومت نے راولپنڈی کو عبوری دارالحکومت بنایا تو جنگ نے بھی کراچی کے علاوہ راولپنڈی کو اپنا میدان بنایا اور میں جنگ راولپنڈی کی ادارتی ذمہ داریاں لے کر راولپنڈی آ گیا۔ جہاں اب تک موجود ہوں۔ اس تمام مدت میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ بچے تو خیر چند ہی ہیں مگر کتابیں بہتر ہو چکی ہیں سو دس منٹ تو صرف ان کے نام گنانے کے لیے درکار ہیں جو اب ختم ہو چکے ہیں۔

(ریڈیو کی ایک تقریر)

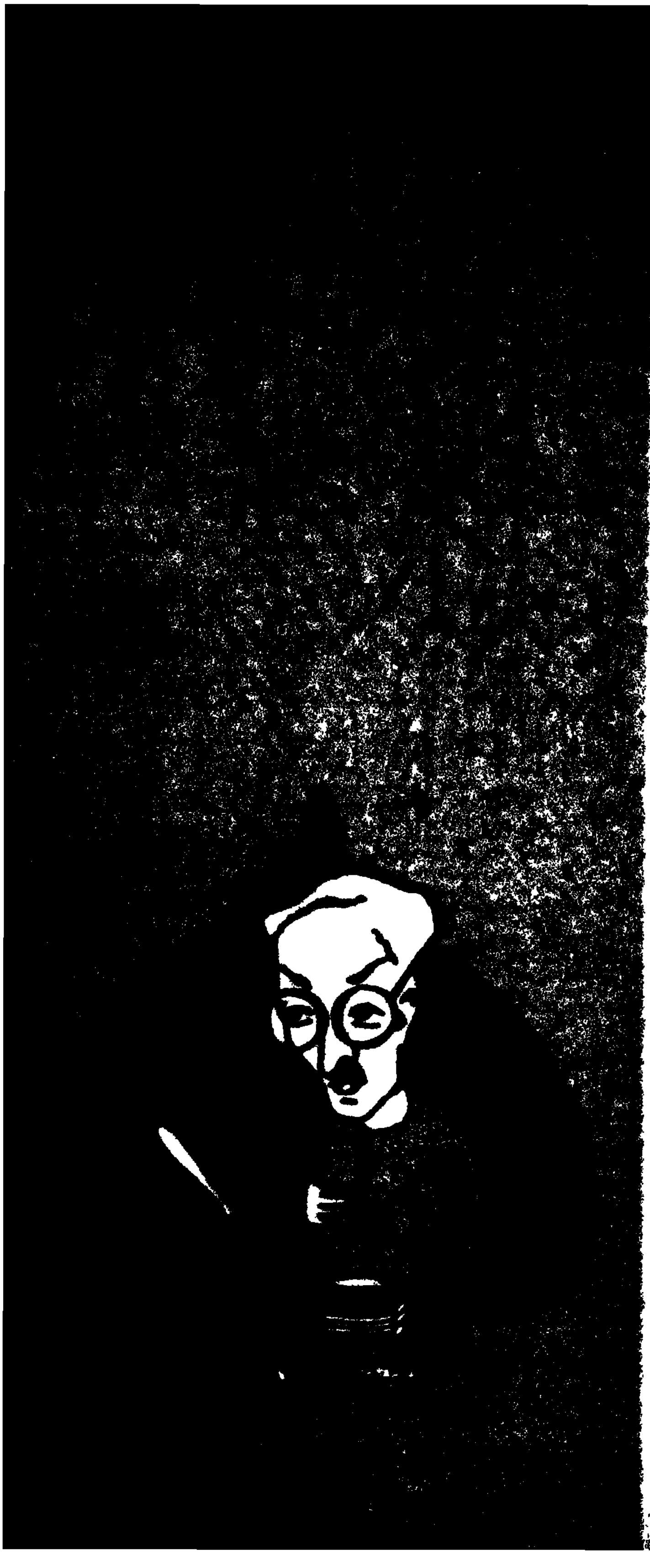

ہمعصروں کی نظر میں

(بہ حیثیت فن کار)

ڈاکٹر سر محمد اقبال

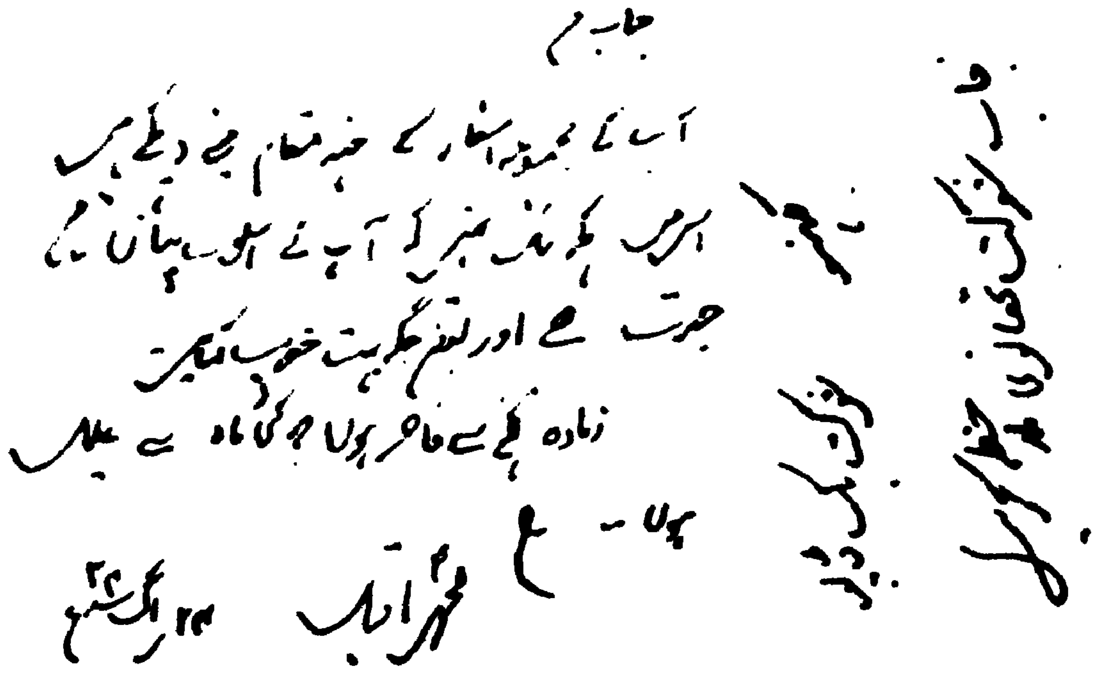

جناب من

آپ کے مجموعہ اشعار کے چند مقام میں نے دیکھے ہیں
اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ نے اسلوب بیان میں
جدت ہے اور لطف یہ کہ بہت خوب کی ہے
زیادہ لکھنے سے قاصر ہوں کیونکہ کئی ماہ سے علیل
ہوں۔ والسلام

محمد اقبال ۲۴ اگست ۳۶ء

جناب شوکت تھانوی مدظلہ العالی
شوکت بک ڈپو
لکھنؤ

دیباچہ

(۱)

مرزا فرحت اللہ بیگ

عدالتی مقدمات کی دو قسمیں ہیں، دیوانی اور فوجداری۔ اسی طرح کتابوں کے مقدمات بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، تعریفی اور تعارفی۔ تعریفی مقدمات صرف گذشتہ اہلِ قلم کی کتابوں پر لکھے جاتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خود اپنی تعریف کی جائے اور لوگوں کو سنایا جائے کہ

منم کردہ ام رستمِ داستاں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

اس قسم کا مقدمہ لکھنے والے اللہ کے فضل سے ہندوستان میں بہت موجود ہیں۔ تعارفی مقدمہ اس لیے لکھا جاتا ہے کہ پبلک سے مصنف کا تعارف کرا دیا جائے اور اس کی تحریر کی خوبیاں ظاہر کر کے لوگوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالا جائے۔

”طوفانِ تبسم“ پر مقدمہ تعریفی لکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ بفضلِ خدا اس کے مصنف ابھی تک بقیدِ حیات ہیں اور خبر نہیں کہ کب تک زندہ رہیں۔ اب رہا دوسرے قسم کا مقدمہ یعنی مقدمہ تعارفی تو مجھے کیا کسی کو بھی اس کتاب پر ایسی کوئی تحریر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان کا کون پڑھا لکھا شخص ہے جو شوکت تھانوی کو نہ جانتا ہو اور ان کی تحریر کی خوبی سے واقف نہ ہو۔ ایسی صورت میں ان کے مجموعۂ مضامین پر کچھ لکھنا بجلی کے ہنڈے کے سامنے چربی کی دو دوالی موم بتیاں جلانا ہے۔ ہاں اگر کچھ لکھا جا سکتا ہے تو اس پر لکھا جا سکتا ہے کہ آخر آج کل کے اہلِ قلم کھٹا اودے دوڑی“ کیوں بنے ہوئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ زمانہ کے ہاتھوں اس میں سب پریشان ہیں خاص کر اہلِ قلم کی تو یہ حالت ہے کہ:

ہاتھ کلے نہ مٹھی   ہلبلانی اٹھی

بیچارے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں جب رزق کا دروازہ کسی طرح نہیں کھلتا تو سوچتے ہیں کہ لاؤ پبلک کو ہم نے اپنی تحریر کا گرویدہ تو کر ہی لیا ہے، کچھ انہیں سے ٹھگ کر کمائیں، بس ان کی وہی کیفیت ہے کہ مداری پہلے تو ڈگڈگی بجا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیتا ہے اس کے بعد اپنے کمال دکھا کر ان کو خوش کرتا ہے اور پھر جھولی ہاتھ میں لے کر

ہر ایک سے کہتا پھرتا ہے کہ "روپیہ" اور "گانا" جو ہے وہ بیچا ہے۔ اب مگر اس طرح نذر پر کیا جس کے ہر بانی سخنور کے پاس سے ملنے کہ اگر کوئی کار آمد چیز ہے تو وہ اس کا دماغ ہے۔ اس دماغ کو علاوہ وہ صنف ادبی ملک بھر کے مضمون مانگنے کے لیے دو خط پرخط، تار پر تار بھیجے جاتے ہیں لیکن یہ کیوں نہیں ہوتا کہ کسی ادیب کے ساتھ مل کر اور ذرا بیٹھ کے اور اس طرح بیچا جائے کہ ناشر سے بھی وہ ذرا کے بدلے، وہ بھی وقت سے اطمینان ہو جائے۔ جب یہ صورت ہو تو مضامین کے مجموعے کیوں نہ چھپیں اور کیوں نہ پبلک پر ظلم کیا جائے کہ اس کو خریدیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل اس قسم کی کتابوں کا بڑا زور ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض اہلِ قلم تو اپنی کتاب بیچنے کا بلا شرکت خاص اچھا خاصا کما لیتے ہیں اور بعضوں کی کتابیں واقعی ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے خریدنے کو دل چاہتا ہے: "طوفانِ تبسم" بھی ایک ایسی کتاب ہے جس کو پڑھ کر شاید ہزاروں میں سے ایک بھی نہ کہے گا کہ "ہائے۔ پیسے ڈوب گئے"

"طوفانِ تبسم"! ماشاءاللہ کیا عجیب و غریب نام ہے۔ طوفانِ نوح کے متعلق تو سنتے آئے ہیں کہ ایک بڑھیا کے تنور سے نکلا تھا لیکن یہ "طوفانِ تبسم" آخر کہاں سے؟ شاید بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ آخر سمجھ میں آیا کہ منہ بھی تنور کی شکل ہے اور "تبسم" ہمیشہ ہونٹوں ہی پر آتا ہے۔ شاید اسی مناسبت سے یہ نام تجویز کیا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو ماشاءاللہ بڑی دور کی سوجھی"

اس مجموعے کے سارے مضامین خوش مذاقی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ شعر کی تعریف کی گئی ہے تب ہی۔ پڑھا جائے تو یہ شعر لگے کہ میں بھی ایسا شعر کہہ سکتا ہوں لیکن جب کہنے بیٹھیں تو بڑے بڑے سخن گو عاجز ہوں۔ دس دفعہ قلم دوات ہی سے ڈر جائیں اور ویسا ایک شعر نہ کہہ سکیں، بس یہی حال خوش مذاقی کا ہے۔ ہر شخص پڑھتے وقت سمجھتا ہے کہ "یہی میرے سوز میں ہے" لیکن دل کی اسی بات کو زبانِ قلم پر لانے والے ڈھونڈھے ہی سے کچھ ملیں تو ملیں ورنہ کہیں جاؤ، خود اپنے ملک کی حالت ہی دیکھ لیجیے یہاں ہزاروں اخبارات اور سینکڑوں رسالے چھپتے اور بکتے ہیں اور شاید ہی کوئی پرچہ ہوگا جس میں خوش مذاقی کا ایک آدھ مضمون نہ ہوتا ہو لیکن بس پڑھتے ہی دیکھیے۔

ہے اب شرط منہ نہ کھلوائیں

یہ تو سب جانتے ہیں کہ تبسم دو طرح پیدا کیا جاتا ہے۔ ایک تو "شخصیت" (کیرکٹر) پیدا کرنے سے، دوسرے واقعات کو اس طرح بیان کرنے سے کہ خواہ مخواہ پڑھ کر ہنسی آئے۔ پہلی صورت کی زندہ مثال چارلی چپلن اور دوسری کی ہیرلڈ لائیڈ موجود ہے۔ ہر انسان میں ایسے پہلو موجود ہیں جن کا سلیقے سے بیان کرنا لطف سے خالی نہیں ہوتا اور ہر واقعہ میں کوئی نہ کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے کہ اس کو خوش مذاقی کا رنگ دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی کا بیچ بازار میں گرنا کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے فطرت کا تقاضہ ہے کہ گرنے والے کی مصیبت پر اظہارِ ہمدردی کیا جائے لیکن اگر کوئی کالے صاحب سوٹ بوٹ سے آراستہ عینک لگائے، سگریٹ پیتے، سیٹی بجاتے، بید ہلاتے اور تمام بازار والوں کو اپنا زرخرید غلام سمجھتے ہوئے جا رہے ہوں اور ایک دفعہ ہی بیچ سڑک میں ان کا پاؤں آم کی گٹھلی پر سے رپٹ

بنا لے اور وہ چاروں خانے چت آ پڑیں تو دیکھئے کہ یہی جذبۂ حسد، وہی کس طرح جلد حسن کی صورت اختیار کر لیتا ہے غرض ہر واقعہ میں تبسم کا یہ پہلو موجود ہے شاید ایسا ہی ایک شعر ہے ؎

ہجوم یاس میں بھی کچھ نہ کچھ امید تو ہے
بھلا کہ غم میں بھی ہے اک نہ اک پہلو مسرت کا

اسی مسرت کے پہلو پر شوکت صاحب نے اپنے مضامین کی بنیاد رکھی ہے۔ اب رہی کھٹائی تو حضرت مشہور ہونا اور پھر سے ہیرا پیدا کرنا بھی جیسے اہل علم کا کام ہے۔ ورنہ ہوتا تو یہ ہے کہ بعض احباب تو مٹی کو سونا اور شیشے کو ہیرا سمجھ کر پبلک کے سامنے پیش کرتے اور داد طلب ہوتے ہیں لیکن پبلک کچھ ایسی اندھی تو ہے نہیں کہ مٹی اور سونے میں یا شیشے اور ہیرے میں تمیز نہ کر سکے۔ وہ ان چیزوں کو دیکھتی اور ہنس کر خاموش ہو جاتی ہے۔ ہاں جو واقعی جواہر کامل ہوتے ہیں ان کی قدر مرنے کے بعد ضرور کی جاتی ہے۔ شوکت صاحب بڑے خوش نصیب ہیں کہ ان کی زندگی ہی میں پبلک ان کی تحریر کی دلدادہ اور ان کی خوش مذاقی کی مداح ہے ورنہ عام طور پر تو زمانہ کی یہ حالت ہے کہ ؎

کس کی ہے یہ کہ جیتا کیسی

اب میری یہ رائے ہے کہ شوکت صاحب مقدمات کے ذریعہ سے اپنا تعارف کرانا چھوڑ دیں اور محض اپنی تحریر کے جال میں لوگوں کو پھنسائے رکھیں ورنہ خدانخواستہ کہیں یہ صورت پیدا نہ ہو جائے کہ

مرتے مرتے کھیلا ہوا
آج نہ ہوا کل ہوا

(۲)

خواجہ حسن نظامی

خدا رکھے منشی جی چالیس کے لگ بھگ ہیں مگر شیخ سعدیؒ کا سا زہد خدا نے ان کو دیا ہے۔ لیکن شیخ سعدیؒ بھی چالیس برس کی عمر میں گویا پچھتاتے اور کہتے تھے۔

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت

تو چالیس برس کے ہونے کو آئے مگر بچپن نہ گیا۔

چنانچہ اگر منشی جی چالیس سال کی عمر میں بسم اللہ پڑھنے بیٹھے اور ان کی بیوی نے دلّی سے پیر جی کو بلایا اور اس طرح بلایا کہ خط لکھے۔ ٹیلی فون دیئے، تار بھیجے، ریڈیو میں لکھڑی لکھڑی پکارا، تب کہیں پیر جی نے لکھنؤ آنے کی تیاری کی۔ گرمی کا موسم تھا، لو چل رہی تھی، لکھنؤ کے خربوزوں کی بہار تھی۔ پیر جی ریل سے اترے اور سیدھے منشی جی کے گھر پہنچے۔ دروازے پہ آواز دی۔ ارے میاں منشی جی! ہم دلّی سے آگئے۔ منشی جی نے اندر بیوی سے کہا۔ لو بی منشن، وہ پیر جی آگئے تم نے تو اب تک بلاوا بھی نہیں بھیجا، نہ کاغذ والے آئے، نہ کاپی نویس آئے، نہ چھاپے خانے والے آئے۔ تم کہتی تھیں کہ ان سب کو بلاؤں گی۔ گھر میں شادی رچاؤں گی، اور تب پیر جی سے بسم اللہ پڑھواؤں گی۔

بیوی نے کہا تو باہر جاؤ، ایک کرسی دروازے پر ڈال دو، پیر جی بیٹھ جائیں، پوچھو حقہ پیتے ہیں، پیتے ہوں تو اپنا حقہ لے جاکر سامنے رکھ دو، میں ابھی پان بنائے دیتی ہوں۔ اتنے وہ حقہ پئیں، پان کھائیں، اتنے میں تم جاکر کاپی نویسوں کو بلا لاؤ جتنے بھی لکھنؤ میں مل سکیں۔ کاغذ والے بھی جہاں جہاں ملتے جائیں بلاوا دیتے جانا، اور چھاپے خانے بھی جتنے رستہ میں ملیں سب کو آواز دے دینا کہ بھئی آؤ ہماری بسم اللہ ہے، پیر جی دلّی سے آئے ہیں، ہماری بیوی نے بلایا ہے، دروازہ کے باہر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں، پان کھا رہے ہیں، جلدی سے آجاؤ تو ہم سب کے سامنے بسم اللہ پڑھ لیں۔

منشی جی گھبرا کر اٹھے۔ کرسی باہر بچھائی، حقہ تازہ کر کے چلم بھری، باہر لے جاکر پیر جی کے سامنے حقہ رکھا، پانوں کا خاصدان بھی پیر جی کی گود میں رکھ دیا اور کہہ دیا کہ پان کی پیک دیوار پہ نہ تھوکئے گا وہ جو سامنے موری جاتی

ہے اس میں جا کر سو گئے گا۔

منشی جی اس کام سے فارغ ہو کر بلاوا دینے چلے تو بیوی نے کہا، لے ہے میں تو بھول گئی، ایک بڑا ضروری بلاوا تو باقی رہ گیا، وہ جو ریڈیو والے ہیں ان کے ہاں بھی جانا۔ اور کہہ دینا کہ ہم دونوں میاں بیوی تمہارے ہاں آ کر پہلے بھی باتیں کیا کرتے تھے، اور تم ہماری باتوں سے خوش ہو کر نوٹ کبوتر بن جایا کرتے تھے اس وقت ہمارا نام سکونی تھا کیونکہ ہم نے کیا نام اپنا غلط بنایا تھا۔ کچھ بات ہی ایسی تھی، یہ کہنا ٹھیک نہ تھا کہ ہمارا نام شوکت تھانوی ہے کیونکہ ہم کو ڈر تھا کہ ریڈیو والوں کی یا ریڈیو سننے والوں کی ہم کو نظر نہ لگ جائے، اس واسطے ہم نے ایسا نام بنایا جو پیر جی کے لکھے ہوئے سکورے کا ہم نام سکونی تھا۔ اب ہم آئے ہیں اور آپ سب کو بلاوا دیتے ہیں اپنے اصلی نام سے کہ ہمارا نام حضرت مولانا شوکت صاحب تھانوی ہے۔ ہم مرزی بھی ہیں، ایڈیٹر بھی ہیں اور منشی بھی ہیں اور جی بھی ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم کو ہماری بیوی نے بہت اللہ آمین کے ساتھ پالا پوسا ہے اور اب جبکہ ہم بیس اور بیس پورے چالیس برس کے ہو گئے ہیں تو ہماری بیوی نے ہم کو بسم اللہ پڑھانے کی شادی رچائی ہے۔ اور دلی سے ایک پیر جی کو بلایا ہے۔ ہم تم کو بھی بلاوا دینے آئے ہیں، اور بیوی نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ریڈیو والوں سے پوچھ بھی لینا کہ جو باتیں ہم دونوں نے ریڈیو میں سنائی تھیں وہ ہم کاپی نویس سے لکھوائیں گے اور چھاپے خانوں میں کاغذ پر چھپوائیں گے اور وہ سب گیارہ رات کی باتیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ منشی جی نے کہانی کہی۔ دوسرے یہ کہ منشی جی نے چائے بنائی، تیسرے یہ کہ منشی جی نے خط لکھا، چوتھے یہ کہ منشی جی نے دوا پی، پانچویں یہ کہ منشی جی نے صفائی کی، اپنی داڑھی کی نہیں، اپنے گھر کی، چھٹے یہ کہ منشی جی نے اپنی تصویر کھنچوائی، جرمنی کے بنے ہوئے فوٹو میں، ساتویں یہ کہ منشی جی خود بازار سے سودا لے کے آئے، آٹھویں یہ کہ منشی جی نے بسم اللہ پڑھنے سے پہلے دوسروں کو سبق پڑھایا، نویں یہ منشی جی لکھنؤ سے خبر نہیں کہاں کہاں کا سفر کیا، دسویں یہ کہ ایسی بے روزگاری کے زمانے میں منشی جی کو خدا نے نوکری دی اور وہ نوکر ہو گئے، گیارہویں یہ کہ منشی جی نے پرانا مکان بدل دیا، پس گیارھویں شریف کی یاد میں پیر جی آئے ہیں تو یہ گیارہ راتوں کی بات چیت ہم چھاپ دینا چاہتے ہیں اور شائع بھی کر دینی چاہتے ہیں آپ سب لوگوں کی اجازت سے اور مہربانی سے جس کو ہندی زبان میں کرپا کرنا بھی کہتے ہیں۔ مگر دیکھنا جب تم کرپا کا لفظ بولو تو کرپا نہ کہہ دینا، نہیں تو بسم اللہ کے وقت بدشگونی ہو جائے گی کہہ دینا کہ اس شادی میں چاچا بھی آئیں، بدھو بھی آئیں، ماموں جان بھی آئیں، اور بھی جو وہاں بیٹھے ہوں، سوتے ہوں، جاگتے ہوں، چائے پی رہے ہوں، سگرٹ پی رہے ہوں، مونچھوں والے ہوں، مونچھ منڈے ہوں، سبھی کو بلاوا دے دینا، گھر بدل ہی لیا ہے، جگہ کم سہی۔ بیٹھیں گے نہیں، کھڑے رہیں گے۔

آخر منشی جی سب کو بلا لائے اور لکھنؤ کے خربوزے بھی گیارہ ٹوکرے بھروا کر ساتھ لیتے ہوئے بیوی نے سنا تھا کہ اگلے زمانہ میں بادشاہوں اور پیروں کے لیے سوا لاکھ روپے کا چبوترا بنایا جاتا تھا آج انھوں نے خربوزوں کا چبوترا بنایا اور اس پر پیر جی کو بٹھایا۔ پیر جی نے منشی جی کو پاس بٹھا کر یوں بسم اللہ پڑھائی۔

- پڑھو میاں بڑے طوطے بسم اللہ۔ الرحمٰن۔ الرحیم، اللہ کا نام لے کر شروع کرتا ہوں چالیس برس کی عمر میں

خدا بخشا، اس اللہ کا نام لے کر جو بڑی رحمت والا ہے اور جو بڑی بندہ نوازی کرنے والا ہے۔ وہ اللہ جس نے قومیں پیدا کیں، ہندو قومیں بنائیں، بم بنوائے، ہوائی جہاز بنوائے، ٹینک بنوائے اور پھر اس نے شیطان کو بھی پیدا کیا اور اسی سے کہا تو نے آدمی کی دشمنی پر کمر باندھی تھی تو نے ہم پر چھاپا مار کر بیٹھے ہیں ان سے آدمیوں کو الگ ہی کرنا۔

پھر منشی جی اپنے خدا کا نام لے کر جس نے آدمی کو علم دیا اور قلم دیا۔ جب پیر جی نے کہا "قلم دیا" تو سب جلدی جلدی سمجھ کر لکھنے لگے۔ پیر جی منشی جی کو پڑھا رہے ہیں یا منشی جی کی بیوی کو۔ یوں لکھو کہ "قلم دیا" پیر جی بولے "ہاں ہاں قلم دیا"۔ سرکنڈے کا بھی اور لوہے کا بھی، اور وہ بھی جس کو جیبی قلم کہتے ہیں اور وہ بھی جو دودھ کھلاتا ہے اور وہ بھی جس کو خسرو، میر، غالب قلم، اور شوکت قلم، اور دلی قلم، اور لکھنؤ قلم بھی کہتے ہیں اور پرچے اخبار کے قلم ہم جیسے منسوب ہیں۔

اس کے بعد پیر جی نے کہا۔ لو بھئی بسم اللہ پڑھا دی۔ اب منشی جی کی بیوی کو ہماری طرف سے مبارکباد دیجئے۔ منشی جی بولے ابھی بسم اللہ کہاں ہوئی، جو آپ مبارک سلامت لینے لگے، ابھی جناب میری اور میری بیوی کی گیارہ رات کی بات چیت جو میں ریڈیو والوں سے چھاپنے اور شائع کرنے کے لیے بزبان خود و بقلم خود مانگ کر لایا ہوں تاکہ سند رہے اور ضرورت کے وقت کام آئے وہ بھی تو پڑھا دیجئے۔ پیر جی نے کہا اچھی بات ہے اور اس کے بعد پیر جی نے خربوزوں کے چبوترے پر بیٹھے بیٹھے یوں زبان کھولی۔

منشی جی اور ان کی بیوی اور ریڈیو والوں اور رسالہ نویسوں اور کاغذیوں اور چھاپے خانے والوں سے اگر مسلمان ہوں تو سلام اور ہندو ہوں تو رام رام کے بعد ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم دلی سے لکھنؤ آئے ہیں اور لکھنؤ سے یہ خربوزے کھانے اور لٹانے کے بعد ہم پھر دلی براستہ کانپور طوفان میل میں واپس جانے والے ہیں، آج وہ دن ہے یورپ میں لڑائی ہو رہی ہے، انگریز، فرانس، اٹلی اور خبر نہیں کون کون آپس میں لڑ رہے ہیں بہت گرمی ہے۔ بہت خاک ہے اور ہم کو بہت غصہ بھی آ رہا ہے۔ کیونکہ ہم اکّے والے کو کرایہ دینے کے لیے پانچ روپے کا نوٹ بازار میں بھنانے گئے تو کسی نے روپے ہم کو نہیں دیئے اور ہم نے غصہ کے مارے پورا کا پورا نوٹ بیچنے والے کے منہ پر کھینچ مارا یعنی اس کو کچا ہی نوٹ دے دیا کیونکہ وہ کسی سے بھن نہ سکا۔

بہنو اور بھائیو! ہم مولانا شوکت صاحب تھانوی کو جانتے ہیں اور ہم اس سے بھی آگاہ ہیں کہ انھوں نے لکھنؤ ریڈیو میں گیارہ رات تک سکونی کے نام سے جو باتیں اپنی بیوی سے کی تھیں وہ ہم نے اور سب بھارت ماتا کے سپوتوں نے اپنے اپنے گھروں اور دکانوں اور ہوٹلوں میں سنی تھیں اور وہ باتیں ہم کو بحیثیت گھر سدھار کا کام کرنے کے گھر سدھار کے لیے بہت ہی اچھی معلوم ہوئی تھیں۔ ہم کو ان کے سننے سے ہنسی بھی آئی تھی اور ہمارا مع آل اولاد و اجداد کے جی خوش بھی ہوا تھا اور ہم نے ان سے سبق بھی لیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب منشی جی کی بیوی نے ہم کو دلی سے بسم اللہ پڑھانے کے لیے بلایا تو ہم نے خود اپنے کان میں کہا کہ بھئی یہ الٹی گنگا کیوں بہنے لگی۔ ہم نے تو خود منشی جی سے گیارہ رات تک سبق پڑھا ہے، وہ ہم سے بسم اللہ کیا پڑھیں گے مگر خیر ہم کو عورت ذات کا کہنا ماننا ضروری تھا، اس واسطے ہم آ گئے اور اب ہم بسم اللہ پڑھانے کے بعد یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں اپنے عقل و ہوش کی سلامتی کی حالت میں اس یقین کے ساتھ کہ اب ہم

کو بانکی و بکاوٹ نہ جینے کا خطرہ نہیں ہے اور ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ کے ساتھ ہم یہ سب کچھ عرض کر رہے ہیں اور دعا ہو رہی ہے کہ جب یہ گیارہ کی گیارہ کہانیاں کتاب کی صورت میں چھپ کر تیار ہوں تو پہلے مصنف اپنی بیگم اس کو پڑھیں اور اپنے سب بچوں کو پڑھائیں۔ ان کے بعد گاندھی جی اور ان کی دھرم پتنی اور ان کے بچے اور پرجا اور ان کی جنتا و صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب اور سندھ اور مدراس اور بمبئی اور سی پی اور یو پی اور بہار اور بنگال اور آسام اور یہاں کے سب لوگ وزرا اور وزیر اور سکولوں اور کالجوں اور پاٹھ شالاؤں اور مکتبوں کے پڑھنے والے اور پڑھانے والے اور وہ سب جن کو اچھا اور اپنے بچا رہنے اور اپنی بیویوں کے خوش کرنے کی ضرورت ہو اور سلیقہ مند اور گھر بنانے کی ضرورت ہو وہ سب ان گیارہ کہانیوں کو لفظاً پڑھیں، معناً پڑھیں، اشارتاً پڑھیں، کنایتہً پڑھیں اور چھاپہ خانے کے مشہور کانے قانون سے لہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس کو پڑھیں پڑھائیں اور مولانا شوکت تھانوی سکونی و حقانی و شہری کے حق میں دعائے خیر کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو یہ بسم اللہ پڑھنی ایسا مبارک کرے کہ یہ ہمیشہ چالیس ہی برس کے رہیں کیونکہ جس کو بسم اللہ پڑھاتے ہیں تو صراط مستقیم بھی پڑھاتے ہیں اور مستقیم راستہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے راستے میں ثابت قدم رہے یعنی نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے بس ایک جگہ پاؤں جمائے کھڑا رہے۔ لہذا مولانا شوکت بھی جن کو ہم سب نے ابھی نوشہ بنے روپ میں دیکھا ہے اور جن کی عمر مبارک چالیس سال ہے وہ نہ کبھی ۳۹ سال کی طرف جائیں اور نہ کبھی ۴۱ کی طرف قدم بڑھائیں۔ کہیں سب حاضرین! اے خدا اے گاڈ اے پربھو ایسا ہی کر۔

---

(۴)

مرزا عظیم بیگ چغتائی

ایک وکیل کو مقدموں سے کہاں تک دلچسپی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ شاید کوئی وکیل ہی لگا سکے۔ پیشہ ور تو یہ نہیں دیکھتے کہ مقدمہ فوجداری کا ہے یا دیوانی کا یا کسی متروکات جیسے کا، انھیں مقدمے سے مطلب۔ لہٰذا مجھے چنداں ضرورت نہیں کہ اس "مقدمہ بازی" کے لیے کوئی معقول عذر تلاش کروں۔ بلکہ شاید یہ بھی ناممکن ہو کہ اس نوعیت کے کسی "ادبی مقدمہ" کا دعویٰ تو بڑی چیز ہے ذکر بھی اپنے رجسٹر مقدمات سے نکال کر پیش کر سکوں۔

جی ہاں! مجھے فخر ہے کہ میں حضرت شوکت تھانوی جیسے مسلّم ادیب اور مزاحیہ نگار کی بہترین کتاب پر مقدمہ لکھ رہا ہوں۔ کسی کتاب یا تحریر کا لطف خاص طور پر جب حاصل ہو سکتا ہے جب مصنف کے ہم عصروں کے مضامین بھی پیشِ نظر ہوں۔ دراصل موازنہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے سے مضامین کا اصل لطف حاصل ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور کے مزاحیہ نگاروں کی اگر فہرست تیار کی جائے تو حضرت ملا رموزی سے لے کر ہر وہ شخص مزاحیہ نگار ثابت ہو جائے گا جس نے کوئی مزاحیہ مضمون لکھا یا سنا ہے لیکن اگر واقعی دیکھا جائے تو چوٹی کے مزاحیہ نگار صرف تین چار ہیں۔ آغا فرحت، حضرت پطرس، مسٹر رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی اور بعد اس کے تو اللہ کے فضل سے سب ہیں چنانچہ ہم خود بھی کہتے ہیں کہ "ہم بھی ہیں پانچوں سواروں میں"۔ یعنی اگر میرا نام یا حضرت ملا رموزی کا نام اس میں اور جوڑ دیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں خود اپنی ذات سے تنقید شروع کرتا ہوں۔ محض اس وجہ سے کہ پستی سے بلندی کی طرف چلنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

قصّہ کو مختصر تو دو لفظوں میں اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ شوکت مجھ سے نہ صرف اچھا لکھتے ہیں بلکہ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ بہت ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لوگ خیال کریں گے کہ میں یہ بات دل سے نہیں لکھ رہا ہوں محض اس لیے کہ شیطان ہر مزاحیہ نگار کے کان میں یہی پھونک گیا ہے کہ "بیٹا! تجھ سے اچھا کوئی نہیں لکھ سکتا"، مگر واقعہ یہ ہے کہ مزاحیہ نگاری میں شوکت کی میں گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اگر افسانہ نویسی اور مزاحیہ نگاری میں کوئی فرق ہے اور آپ اس کو محسوس کرنا چاہتے ہیں تو میرے افسانے اور شوکت کے مضامین دیکھئے۔ میرے مضامین مزاح کی ایک چاشنی اور

زبان کی لطافت اور شگفتگی سے خالی نظر آئیں گے۔ یہ سوچئے کہ میری تمام مزاحیہ نگاری کا دار و مدار محض "افسانویت" یعنی پلاٹ پر ہے۔ پلاٹ نکال دیجئے تو پھر کچھ نہیں رہ جاتا۔ لیکن شوکت بغیر پلاٹ کے ایسا مضمون لکھتے ہیں کہ چاہے بہتر سے بہتر ہو پلاٹ اس کے آگے کچھ نہیں۔ بطور نمونہ زیر نظر مجموعہ میں "بیوی کا پروپیگنڈا" دیکھئے۔ ملاحظہ ہو دوست کی حماقت کہ جورو کو دوستوں کے خلاف "چھری پہ دھار" رکھے ہوئے ہے اور شوہر صاحب ہیں کہ خواہ مخواہ کا پروپیگنڈا کرتے پھر رہے ہیں۔ کس قدر واہیات آم کھلاتے ہیں۔ پھر شوکت ہی کا حصّہ ہے اور کس خوبصورتی سے آموں کی تعریف کرتے ہیں "دیکھو یہ آم چھوٹے ضرور ہیں اور ان کا ریشہ بھی بہت بڑا ہے لیکن عجب پرکیف آم ہیں تم ان کی کھٹاس پہ نہ جاؤ۔ سبحان اللہ، ورنہ اس کی کمی پر غور کرو۔" مزاحیہ نگاری اس کو کہتے ہیں۔

دراصل مزاحیہ نگاری کا یہاں کمال نظر آتا ہے اور یہی شوکت کا اصل رنگ ہے۔ پھر لطف یہ کہ آخری جملہ اس کا "اور اتنے سے آم میں گٹھلی تو دیکھو، ماشاء اللہ کتنی بڑی ہے۔۔" بخدا میں تو دس جنم لوں جب بھی یہ بات ہرگز نہیں پیدا کر سکتا جو اس جملہ میں ہے۔ بالفرض کوشش کروں یا کرتا تو لفظ "ماشاء اللہ" کا یہ استعمال۔ بخدا میری دانست میں شوکت اس سے بڑھ کر مزاحیہ نگاری کی خود اپنے یہاں سے بھی کوئی مثال مشکل سے پیش کر سکیں گے مضمون کی پوری کومیڈی اس لفظ "ماشاء اللہ" میں بند کر دی ہے ساتھ ہی لطف یہ ہے کہ گو ان کے مضامین کا محض پلاٹ پر دار و مدار نہیں ہوتا لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ شوکت کے یہاں پلاٹ کی خوبی ہی نہیں ملے گی بلکہ "شامت" کو ملاحظہ فرمائیے تو اس میں ایک معمولی سے واقعہ کے ساتھ قصہ کو کتنا عمدہ پلاٹ دیا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ "بیوی کا پروپیگنڈا" بھی کسی طرح پلاٹ سے خالی نہیں۔ مضمون کے آخری حصہ میں بہترین "ٹریجڈی" پیش ہے۔

قصہ مختصر یہاں تک میرا اور شوکت کا تقابل یا موازنہ ہو سکتا ہے میں ایک افسانہ نویس یا ناول نویس ہو کر شوکت کے پایہ کو چھونے کی کوشش کر سکتا ہوں مگر بحیثیت مزاحیہ نگار کے شوکت کا رنگ میرے لئے قابلِ تقلید ہے نہ کہ قابلِ تنقید۔ دراصل مزاحیہ نگاری اور چیز ہے اور افسانوں میں عشقیہ معاملات اور شوخی و شرارت سے جان ڈالنا اور بات ہے۔ قصہ مختصر میری مزاحیہ نگاری میں عشق و محبت کی داستان زائد ہے اور اس چیز کو دوسرے مزاحیہ نگاروں نے بالخصوص نہیں چھوا ہے۔

اس کے بعد میں چوٹی کے ادیب کو لیتا ہوں یعنی آغا فرحت۔ لوگ کہتے ہیں کہ اردو ان کے گھر کی لونڈی ہے اور میں کہتا ہوں کہ ادب کے تمام صیغے اور تمام محکمے ان کے غلام ہیں۔ آغا فرحت کس گھر بند ہیں۔ مزاحیہ نگاری افسانہ نویسی اور حد ہو گئی شاعری بھی۔ لہٰذا ان کا شوکت کا مقابلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ شوکت ایک خاص فلک ادب کے مالک ہیں مگر آغا فرحت کے یہاں تورۂ چنگیزی پر عملدرآمد ہے۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ آغا فرحت کو زبان کی بڑی بھاری جیت ہے۔ جی میں آتا ہے پلاٹ سے مزاحیہ نگاری پیدا کر دیتے ہیں اور جی میں آتا ہے زبان سے۔ اور جی میں آتا ہے "یونہی"۔ آغا فرحت کی زبانی مزاحیہ نگاری کا کمال "اصلاح سخن پر میرے خیالات" میں آتا ہے مضامین فرحت حصہ سوم دیکھئے۔ اور اس ادب کے شاہکار اور زبان کی زبردستی کو دیکھئے کہ کس غضب کی مزاحیہ نگاری ہے۔ آغا فرحت کا مقابلہ شوکت

اپنے رنگ میں ضرور یکتا ہیں اور جہاں تک اپنے رنگ کا پابند رہ کر مضامین لکھنے کا تعلق ہے شوکت بھی ان سے کم نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آغا فرحت پڑھ کر ایک پھریری سی لیں اور میں شیکسپیئر پڑھ کر جھومتا رہ جاؤں۔

حضرت پطرس کو لیجئے جو کچھ بھی چند مضامین ان کے موجود ہیں وہ مضمون نہیں بلکہ ادبی شہ پارے ہیں۔ میں بعض شوکت اور ان کے مضامین کا موازنہ کرنے سے قاصر ہوں۔ ایک عجیب ناقابل بیان خوبی پطرس کے جملوں میں ہے۔ شوکت کے یہاں اتنی ہی خوبصورت چیزیں ہیں مگر جنس اور ہے۔ دونوں کی مزاحیہ نگاری اپنے اپنے رنگ میں خوب ہے اور دونوں اپنے اپنے رنگ کے بادشاہ ہیں۔

حضرت ملا رموزی کسی زمانہ میں ملک کے واحد ادیب مزاح نگار رہ چکے ہیں اور اپنا نیا طرز تحریر لے کر آئے اور بعض چیزیں پیش کیں اور جو ان کی قدر ہوئی وہ اس کے مستحق تھے مگر ان کے یہاں کوئی چیز پائدار نہ ہو کر رہ گئی۔ ان کی جدت قابل تعریف ہے مگر بار بار ایک ہی بات کا دہرانا ان کی مقبولیت کے لیے سم ہو گیا۔ "ننھے میاں کی والدہ" ایک ایسا جملہ تھا کہ جس کی جدت اور مزاحیہ نگاری اس میں موجود تھی لیکن جب خود حضرت ملا رموزی نے صد مبالغہ ہر مضمون میں کوئی سو دفعہ استعمال کیا۔ حتیٰ کہ اس کا استعمال بدمذاقی کا ثبوت ہو کر رہ گیا ہے۔ جانے کس کے اب اس جملہ کو پڑھ کر رونا آتا ہے۔ قصہ مختصر ملا رموزی کی تمام مزاحیہ نگاری کا دارومدار چند جملوں پر تھا جو بار بار دہرائے جا چکے اور اب ان میں کچھ نہیں رہ گیا۔ پھر خیر سے ملا صاحب از خود مزاحیہ نگاری کو چھوڑ کر لیڈری کے چکر میں پڑ گئے اور اپنی قسمت انھوں نے جمعیۃ العلماء سے وابستہ کر کے کچھ اور ہی کرنا شروع کر دیا۔ یعنی فی الحال بقول مسٹر رشید احمد صدیقی، ملا صاحب اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ پھر اس سلسلہ میں انھوں نے غصہ کا اتنا زیادہ استعمال شروع کر دیا ہے کہ کوئی شائستہ ادبی پرچہ ان کے اس سب و شتم کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے جو وہ علی گڑھ کالج کے خلاف بالخصوص اور مہذب اور انگریزی تعلیم یافتہ جماعت کے خلاف بالعموم اپنی قدامت پرستی کے رنگ میں کر جاتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ مزاحیہ نگاری اور تجارت دونوں مقاصد کو انھوں نے مدغم کر کے رکھ دیا اور ساتھ ہی اپنے ذاتی پروپیگنڈے اور کتابوں کی اشاعت کا بار بھی مزاحیہ نگاری کی نازک کمر پر لاد دیا۔ نتیجہ یہ کہ "بڑھیا کیچڑ میں بیٹھ گئی" اور ملا صاحب کو "لاٹھی اور بھینس" کی فکر پڑی۔ مزاحیہ نگاری اور مزاحیہ نگار دونوں ملا صاحب کے ہمیشہ ہمیشہ اگر شکر گزار اور مداح رہیں گے تو ان وجوہات کی بنا پر شاکی بھی رہیں گے۔ انھوں نے مزاحیہ نگاروں کی اگر توہین کی تو مزاحیہ نگاری کی تذلیل کی۔ شوکت تھانوی کو ملا صاحب سے کوئی مناسبت نہیں۔ ملا صاحب کے مقابلہ میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ شوکت ادیب اور مزاحیہ نگار ہیں اور ملا صاحب محض ایک "خود طلب مصلح" نہ کہ مزاحیہ نگار۔

حضرت رشید احمد صدیقی کی اور شوکت کی مزاحیہ نگاری میں عجیب و دلچسپ مناسبت بھی ہے اور فرق بھی۔ فرق یہ کہ اگر مسٹر صدیقی بلاغت کے ساتھ مزاحیہ نگاری کے عجیب و غریب نمونے پیش کر سکتے ہیں تو شوکت اپنی فصاحت اور شستگی میں جواب نہیں رکھتے۔ مسٹر صدیقی کے ریمارک غضب کے ہوتے ہیں پھر طنز کی شاید مزاحیہ نگاری میں ان کے برابر کوئی نظیر پیش ہی نہیں کر سکتا۔ ایک جگہ جامعہ ملیہ کی "کھدر نگاری" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "کچھ پتہ ہی یہاں

[illegible] جامعہ ملیہ میں نہیں جاتا کہ یہ وضاحت کروں [illegible] در اصل یہ تعریفی جملہ ہے کیونکہ دہلی پر مضمون بھی اسی [illegible] دکھائے ہیں [illegible] کرتے ہیں۔ مناسبت دونوں میں یہ ہے کہ دونوں . . حضرات کے یہاں روزمرہ کے واقعات سے ہیں۔ میری طرح کسی غیر معمولی واقعہ یا پلاٹ کے قطعی محتاج نہیں۔ شوکت اور صدیقی میں [illegible] کا [illegible] مگر جیسا عرض کر چکا ظرافت کے ساتھ مزاحیہ نگاری کا انداز دکھانا اور حقائق نگاری اور مزاحیہ نگاری کو ملا کر ظرافت نگاری کا کمال دکھانا خاص مرشد صدیقی کا رنگ ہے اور [illegible] شوکت [illegible] اور دونوں اپنے اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔

قصہ مختصر زیر نظر مجموعہ میں دیکھئے تو شوکت اپنے [illegible] رنگ میں موجود ہے۔ برقعہ والا مضمون دیکھئے کوئی کسر اس [illegible] لباس کی ہجو میں اٹھا نہیں رکھی۔ ہر فقرہ [illegible] وہ پول کھول ہے کہ خدا کی پناہ مگر لطف یہ [illegible] حضرت نہایت ہی خوبصورت سے [illegible] مضمون میں [illegible] ظرافت کے ساتھ موجود ہے۔ "چالیسواں" دیکھئے کس غضب عجیب رنگ میں شروع ہوا ہے [illegible] زوجیت کا سارا مضمون سے [illegible] اعتراض کہ [illegible] بات۔ ہو سکتا ہے حضرت معترض نے ایک بہت عمدہ افسانہ لکھ دیا لکھ بھی یہی لکھ پڑا اور [illegible] اعتراض وارد ہو چکے ہوں گے۔

شوکت کے یہاں معمولی واقعات [illegible] بھی بعض جگہ عجب دلچسپ اسنیپ موجود ہے۔ مضمون "گھاگرا بار" دیکھئے۔ ریل کے [illegible] پر بیٹھے ہیں [illegible] جس طرح بلس میں جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک کی ایڑی ایک [illegible] " یا پھر اسی مضمون میں صفحہ ۶۳ پر نسیم صاحب کے غزل پڑھنے کی مشق کا بیان [illegible] ہے اور یہی شوکت کا کمال ہے جو آپ کو کسی دوسرے مصنف کے یہاں [illegible] مزاح نگاری ہے جس نے شوکت کو شوکت بنا دیا ہے اور اردو اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

قصہ مختصر شوکت کا یہ مجموعہ مضامین اس قابل ہے کہ اس کی قدر کی جائے اور مجھے امید ہے کہ جس طرح ان کی پہلی دو کتابیں مقبول ہوئیں یہ مجموعہ بھی مقبول ہوگا۔

اس مختصر مقدمہ میں ہندوستان کے سب کے سب مزاحیہ نگاروں کی فہرست دینا میرا مقصد ہرگز نہیں اور اسی وجہ سے میں نے ان مزاحیہ نگاروں کو نہیں لیا ہے جن کی مزاحیہ نگاری سے کہیں زیادہ بہتر خود ان کی سنجیدہ تحریریں ہیں اور ان کا اصل رنگ ہی اور ہے۔ ان کا ذکر نہ ہونے سے خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کسی طرح بھی مجھ سے کسی طرح کم ہیں یا میں نے محض تفریحاً ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

سب کچھ تو میں نے لکھ دیا مگر آپ کہیں گے کہ شوکت کی خامیاں اور کمزوریاں بھی ہوں گی وہ آخر کہاں گئیں؟ تو عرض یہ ہے کہ کوئی ایسا لکھنے والا نہیں جس میں خامیاں نہ ہوں اور یقیناً شوکت کوئی دیوتا یا فرشتہ نہیں۔ مجھ میں

آپ میں، شوکت میں سب ہی میں خامیاں بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ زیرِ نظر مجموعہ بھی ان خامیوں یا غلطیوں سے خالی نہ ہوگا۔ اور بات ہے کہ [illegible] ان خامیوں کا [illegible] درست ہے لیکن۔ [illegible] ہے کہ جو کچھ بھی خامیاں ہیں وہ کہیں چھپا کر نہیں رکھی گئی ہیں اور اسی مجموعہ میں ان کو تلاش کر لیجئے۔ [illegible] وقت ضرور ہوگی [illegible] کوشش شرط ہے۔ خود شوکت تھانوی صاحب بھی [illegible] میں [illegible] کر سکتے [illegible] مجموعہ [illegible] ہر وقت عیب جوئی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ عیب زیادہ ہیں یا خوبیاں، اور اس معیار پر آپ اس مجموعہ کو شاید کھرا پائیں گے۔

[illegible]

(۴)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پچھلی تعطیلوں میں شوکت صاحب نے فرمائش کی کہ میں ان کے زیر نظر مضامین (دونلئے قسم) پر کچھ لکھوں، میں فوراً رضامند ہوگیا لیکن تعطیل میں کام کرنے کا جو وعدہ کر لیا جاتا ہے اسے تعطیل ہی میں پورا کر دینا نہ میرے بس کی بات ہے اور نہ میں اسے پسند کرتا ہوں، تعطیل میں وہ کام کرے جسے کام کرنے کا سلیقہ نہ ہو، یا جو کام نہ کرنے کے فن سے ناواقف ہو۔ میں نے اس فن میں یہ بڑا راز پا لیا ہے (اور وہ یہ کہ یہ بڑی کم ظرفی ہے کہ ادھر کام آیا، ادھر لگے اسے کرنے۔ میں پہلے تو ہر قسم کا کام اکٹھا کرتا جاتا ہوں۔ اور جب سمجھ لیتا ہوں کہ کاموں کی اچھی خاصی مقدار جمع ہو گئی ہے تو پھر ان کی کمبختی شروع کرتا ہوں بڑے کام، اوسط کام، چھوٹے کام۔ اس کے بعد اوسط کاموں کو چھوٹے کاموں سے ٹکراتا ہوں۔ اس میں سارے چھوٹے کام پاش پاش ہو کر ختم ہو جاتے ہیں اور اوسط کام بھی اچھی خاصی تعداد میں مجروح ہو جاتے ہیں، اب اوسط کو بڑے کاموں سے ٹکراتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ سارے اوسط کام آ جاتے ہیں اور بڑوں میں بھی مضروبین و مجروحین کی تعداد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جو جانچ پڑتال کی جاتی ہے، تو صرف بعض سخت جان باقی رہتے ہیں۔ ان کو اپنی سہل انگاری، حیلہ پروری، ناکسی و نااہلی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی، جن کا اعلان نامناسب ہے، ملاتا ہوں۔ نتیجہ اکثر خاطر خواہ نکلتا ہے۔ میرا کچھ نہیں بگڑتا نکمّے کاموں کا مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ وعدے کے معاملہ میں بھی یہی اصول بعض جزئی ترمیم کے ساتھ کام میں لاتا ہوں۔ لیکن میں کم سے کم یہاں خواہ مخواہ غیر متعلق مسائل چھیڑنا نہیں چاہتا۔

چنانچہ شوکت صاحب کی فرمائش رفتہ رفتہ فہمائش کی حد تک پہنچی اور آزردگی پر ختم ہونے والی ہی تھی کہ میں چونکا تو پانی سر سے گزر چکا، تعطیلیں ختم ہو چکی ہیں اور کچھ لکھنا تو درکنار پڑھنا اور سوچنا بھی ناممکن ہو گیا ہے لیکن ان باتوں کو خاطر میں کون لاتا ہے۔ شوکت صاحب میرے بڑے عزیز دوست سہی، لیکن میرے ہاتھوں ان کی دوستی کا جو حال ہوا ہے، اس سے میں یہ کیسے مان لوں کہ وہ مجھے معاف کر دیں گے اور اب تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ لکھوں گا اسے بھی وہ معاف نہ کریں گے۔

قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کروں ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے جس کا اظہار کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں اوّل تو یہ کہ میرے اکثر دوستوں بزرگوں اور عزیزوں نے میرے ساتھ تصویریں کھنچوائیں لیکن خود مجھے وہ تصویریں کبھی دیکھنے کو

دیکھیں۔ میں نے اس دفعہ کے نقوش کی تو معلوم ہوا کہ وہ تو [illegible] ابھی نہیں آئی تھی [illegible] شوکت سے پہلے آس پاس والوں کی تصویر خراب کر دی تھی۔ اس لیے اس مگدپ ہی کو گول کر دیا گیا۔ اس طرح میں [illegible] خلاف مجھ دائے نثر و نظم پر مقدمے بھی لکھے خوب خوب لکھے۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب کتاب چھپ کر آئی تو معلوم ہوا کہ میرا مقدمہ چھپنے سے رہ گیا۔ اور اتفاق پر معلوم ہوا کہ بعض مصالح کی بنا پر مقدمہ کا شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ سبب مجھے نہیں معلوم کہ اس مضمون کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ [illegible] چاہے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔

شوکت صاحب کے مضامین کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کے عنوان یہ ہیں "برجستہ" "سیلاب تبسم" "طوفان تبسم" میں ایک بات دہراتا ہوں۔ شوکت صاحب جیسے زباں داں کے مجموعہ کا کوئی نام ہی تجویز کر دو احتیاط سے اسی زمانے میں سوا گئی۔ چاندنی چوک دہلی [illegible] "چیل ہی چیل" اچھل پڑا۔ چیل کا لفظ ان کے قریب ہو اور اچھل پڑنے کے محل استعمال پر خطر ناک کرنا چاہیے تھا۔ لیکن [illegible] "لاحول ولا قوۃ" میں نے فوراً ہی شوکت صاحب کو لکھا کہ "تبسم ہی تبسم" کیسا رہے گا۔ لیکن شوکت صاحب نے "دنیائے تبسم" ہی موزوں سمجھا میں کیا کرتا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"چیل ہی چیل" اور "تبسم ہی تبسم" کے بعد اپنا سا منہ لے کر رہ جانے کا محاورہ بھی یہاں کچھ نامناسب ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اب تو یہ چیز بندھ ہی گئی۔ آخر ہمارے اردو شعرا بھی تو ایسے مواقع پر یہی کرتے آئے ہیں۔ [illegible] نے لیا کر لیا۔

میرا خیال ہے کہ ناموں کے انتخاب میں شوکت صاحب نے اپنی فطری کسرنفسی سے کام لیا ہے، ان کی شگفتگی کی تلافی تبسم سے نہیں ہوتی اور ممکن ہے یہی سبب ہو کہ انھوں نے غیر شعوری طور پر تبسم کے ساتھ "سیلاب" اور "طوفان" کی ترکیبیں بنا رکھیں، حالانکہ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبسم کا سیلاب طوفان بالکل متضاد نہ سہی اختلاف آہنگ ضرور ہے۔ اتنا لکھنے کے بعد مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ میں بعض باتیں قبل از وقت کہنے لگا ہوں اس لیے اسے ذہن فی الحال یہاں ختم کرتا ہوں اور دو چار دوسری باتیں عرض کرتا ہوں۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ طنز و ظرافت کی ابتدا ایک طرح کی سب و شتم یا پھکڑ اور پھبتی سے ہوئی ہے جس کے نمونے روم اور یونان کی رسوم و عبادات کی تاریخ کے اولین اوراق میں جہاں تہاں ملتے ہیں۔ لیکن مشکل اور مصیبت یہ ہے کہ ہمارے شاعر اور ادیب آج بھی طنز و ظرافت میں تاریخ کے انھیں ابتدائی اوراق سے سبق لیتے ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہمارا تمدن ترقی کرتے کرتے وہیں پہنچ گیا؟ جہاں اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ لیکن یہاں میں تاریخی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ہم اس حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے اور شاید عمل کر بھی نہیں سکتے کہ ظرافت نگاری کا مقصود بالذات صرف ہنسانا ہی نہیں ہوتا ہی نہیں بعض مسخرے تو ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو ہنسانے سے پہلے خود قہقہے لگانے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں سننے والے کو رونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ یا پھر کوئی ایسا منچلا بھی نکل آتا ہے جو اس قسم کی حرکت پر ہنسانے والے کو زد و کوب کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ

بعض ظرافت نگار ہم میں ایسے بھی موجود ہیں جو تلخ یا کھری بات کو ہنسی ہنسی میں بتا دیتے ہیں اور سننے یا پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس نے کیا سنا اور کیونکر متاثر ہوا۔ اس قسم کے کہنے والے بالعموم طنزیات سے لگاؤ رکھتے ہیں جن کے اردو شاعری میں اکبر مرحوم امام تھے۔ ان کے بارے میں اقبال نے آخری بات کہہ دی ہے۔

گہے گریۂ او چو ابر بہارے
گہے خندۂ او چو تیغ اصیلے

ہر قوم اپنے تمدنی عروج کے اعتبار سے مختلف مدارج پر فائز ہوتی ہے اور ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا ہے۔ الّا خال خال کہ ایک اعتبار سے وہ نہایت درجہ متمدن ہو اور دوسرے اعتبار سے غیر متمدن۔ یہ ستم ظریفی بھی ہم ہندوستانیوں ہی کے حصہ میں آئی ہے۔ شخصی اور جماعتی اعتبار سے ہماری قوم خاصی متمدن قوم ہے۔ لیکن شعر و ادب کی وادی میں پہنچ کر ہم اکثر گمراہ و درماندہ راہ ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا شعر و ادب ابھی پورے طور پر مکمل نہیں ہوا ہے۔ طنز و ظرافت کا فن نہایت مشکل ہے۔ نہایت خطرناک بھی۔ معمولی یا گھٹیا ظرافت ایسا حربہ ہے جس سے اس شخص کو کم نقصان پہنچتا ہے جس پر حملہ کیا جائے بلکہ اس کی سب سے کاری ضرب خود اس شخص پر پڑتی ہے جو اس حربہ سے حملہ آور ہوتا ہے۔ سب سے کاری اور سب سے مکمل وہ طنز یا ظرافت ہوتی ہے جو غیر شعوری طور پر برسرِ کار آ جائے اور یہ تمیز کرنا دشوار ہو جائے کہ مقصود طنز یا ظرافت تھی یا تلقین حقیقت، یہ بات بڑی دیر میں آتی ہے اور بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ لیکن بجائے خود یہ بات جتنی مشکل ہے اتنی ہی دلکش ہے اور اس فن کی شاید یہ آخری منزل ہے۔ اس کی مثال اردو میں قاضی عبدالغفار کے ہاں ملتی ہے۔ ان کے لیلیٰ کے خطوط میں تھوڑی بہت۔ نقشِ فرنگ میں بدرجۂ اتم اور مجنوں کی ڈائری میں بالکل نہیں۔

طنز نگاروں میں بھی کئی گروہ ہیں اور ان کے مسالک بھی جداگانہ ہیں۔ بعض میں جوش و ہیجان و طغیانی ہے بعض میں تلخی و زہرناکی۔ بعض میں شگفتگی و دلربائی۔ ادبیات قدیم میں ان کے علمبردار ہوریس۔ جووِنل اور پرسی اس تھے۔ ہمارے شعر و ادب میں ابوالکلام، عبدالماجد اور اکبر مرحوم ہیں۔ اس موضوع پر بالتفصیل میں نے علیحدہ بحث کی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ شوکت صاحب کی دنیائے تبسم کو اس قسم کی بحث سے گرانبار کروں۔

شوکت صاحب کو ممکن ہے یاد ہو کہ میں نے ایک بار ان سے عرض کیا تھا اور غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب میں میڈیکل کالج لکھنؤ میں صاحبِ فراش تھا اور شوکت صاحب مجھے اکثر دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ان کی مہربانی و مروت میرے دل میں اب تک تازہ ہے۔ میں نے کہا تھا کہ شوکت صاحب آپ نے تحریر کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ روزمرہ کی دنیا میں جو چاہے دیکھئے، سنئے لیکن لکھتے وقت اس دنیا میں چلے جایا کیجئے جو تماشا اور تماشائی دونوں سے الگ ہو اور تنہا ہو۔ حالات و حوادث آپس میں اور دوسری چیزوں سے بھی اتنے ملے جلے یا گڈمڈ ہوتے ہیں کہ ان کو جوں کا توں بیان کر دینے سے نہ تو وہ اپنے اصلی خدوخال میں نمایاں ہوتے ہیں اور نہ ان میں کوئی لطافت یا جاذبیت ہوتی ہے سننے یا پڑھنے والے اسی وقت مسرور یا متاثر ہوتے ہیں جب آپ ان کو حالات اور واقعات کی سیر اس طور پر کرائیں کہ وہ ہر چیز کو اس کے اسی رنگ و آہنگ

ہیں جو کچھ باتیں ہیں۔ مثلاً راگ یا رنگ کیسے بنے، میں سمجھتا ہوں راگ یا رنگ سے [illegible] ہو، [illegible] ورنہ ہے یا کرنا ہی ہے، راگ رنگ کی ناقص تعبیر ہے۔ اصل چیز راگ رنگ ہے۔ [illegible] وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ باتیں شوکت صاحب کی سمجھ کی نہیں۔ وہ کہتے ہیں [illegible] مذہبی ہے یا تصوف کی ذہنیت کا ری میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ رجحانوں سے اس قسم کی باتیں [illegible] چاہئیں۔ [illegible] شوکت صاحب میں اتفاق کر سکے کہ کوئی ہنسی یا کسی کی گراں باری سے [illegible] ہوتا ہے اور اس کی [illegible] جیسی ہے اور نہ کم اور بھی سبب ہے کہ اس کے موضوعات کے مطالبے یا بار بھی [illegible] بلند یا نازک زیر پرواز تخیل سے بچنا چاہ رہے، ہمکنار رہتے ہیں۔ وہ حرف کائنات ہے [illegible] زیادہ بہتر ہے مجھے لیکن یہ بات بھی کچھ [illegible]۔ بھی [illegible] فلسفہ اور تصوف [illegible] شوکت صاحب کو خود رکھنا چاہیے تھا۔

خیر اسے جانے ہی دیجئے۔ جہاں زمین شعر [illegible] شوکت صاحب [illegible] ظرافت کے بڑے متوالا وہ ہیں، اس لیے [illegible]۔ یہاں گھر [illegible] مروت کی [illegible] قسم کی باتوں سے میرا مطلب ہے میری مراد خانگی زندگی سے ہے۔ شوکت صاحب اپنے قریبی رشتہ دار مثلاً بیوی بچے، جانی [illegible] بعض بے تکلف ملنے والے دوستوں اور ساتھیوں پر [illegible] جڑی ہیں ان کی خوب خوب خبر لی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس [illegible] امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں شوکت صاحب کے حریف چغتائی اور ملا رموزی ہی ہیں۔ یہ بات اچھی بھی ہے اور بری بھی اور بڑھ جانے پر بہت ہی بری جس کا نمونہ ملا رموزی ہیں۔ ان کی ہر قسم کی ظرافت یا اس قسم کی غیر سنجیدگی سے ملوث ہو کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہیں۔

میں نے ابھی ابھی کہیں ذکر کیا تھا کہ ظرافت اور طنز کو کائناتی پس منظر میں رکھنا بہت ضروری ہے چہ جائیکہ پس منظر ذاتی حالات و حوادث کی زد میں آجائے۔ ملا رموزی جن حالات و حوادث کو اپنی طنز و ظرافت کا ہدف بناتے ہیں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہدفِ ملامت محض اس لیے بنائے گئے ہیں کہ خود ملا رموزی ان میں مبتلا ہیں ورنہ وہ حالات و حوادث کبھی اس قابل نہ تھے کہ ان کے خلاف طنز و ظرافت کا حربہ استعمال کیا جاتا۔ وہ غربت فلاکت ناکسی و کس مپرسی وغیرہ وغیرہ کے اس لیے شاکی ہیں کہ وہ خود ان میں مبتلا ہیں ورنہ ان کے عقیدے میں یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان کو ہدفِ ملامت بنایا جائے اس قسم کی کمزوریوں کا شمار طنز و ظرافت کی شریعت میں کبائر میں ہوتا ہے۔ جو شخص اپنی و زمانہ کی حرمت نہ قائم رکھ سکے اس کو طنز و ظرافت کی وادی میں قدم نہ رکھنا چاہیئے۔ شوکت صاحب کو سوجھتی بہت اچھی ہے لیکن سوجھنے اور سجھانے میں فرق ہے۔ ممکن ہے کسی کو سوجھتی اچھی ہو لیکن سوجھانے میں وہ قطعاً ناکامیاب رہے۔ سودیشی ریل گاڑی میں شوکت صاحب نے سوجھنے سوجھانے دونوں میں کمال کر دیا اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شوکت صاحب کی سودیشی ریل گاڑی نے انھیں جس منزل اور منزلت پر پہنچا دیا ہے اس پر بڑے بڑوں کی بھی نظر رشک سے پڑے گی۔ "کانگریس" کا بھی یہی درجہ ہے، ہماری زندگی، ہمارے تمدن، ہمارے سیاسی رجحانات، ہمارا عزم و عمل لکھنؤ کی فضا، ہندوستان کی ذہنیت کا ایسا بدیع نقشہ

کھینچا ہے کہ شوکت صاحب کا سخت سے سخت ناقد بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شوکت صاحب کی زبان اچھی ہے اور بیان بہت اچھا۔ اس موقع پر بعض لوگ کوثر و تسنیم کا لفظ استعمال کئے بغیر نہ رہتے لیکن محض اس ڈر سے کہ آجکل ہماری انشاپردازی پر سب سے بڑا جرم یہ لگایا جاتا ہے کہ ہم عرب و فارس و ترکستا وغیرہ سے لائے ہوئے تشبیہ و استعاروں کے بڑے دلدادہ ہیں میں کوثر و تسنیم کے الفاظ سے ہاتھ دھوتا ہوں اور اپنے دوستوں کی خاطر یہ کہوں گا کہ شوکت صاحب کی زبان و بیان میں وہی لطف ہے جو لکھنؤ کی بالائی اور گلوریوں میں ہے!

شوکت صاحب نے لکھنؤ کی زبان میں پورب کے بعض خاص الفاظ اور لہجے بڑے لطف و لطافت سے سموئے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے فقرے شعر و ادب کا مزا دے جاتے ہیں۔ ان کے مضامین میں لکھنؤ کے تمدن اور وہاں کی روزانہ زندگی کے بعض بڑے مزے دار نمونے ملتے ہیں ایسے نمونے جو کسی اور تھانوی کو مشکل نصیب ہو سکتے ہیں، بے موقع نہ ہوگا اگر ان میں سے بعض بعض کا تذکرہ یہاں کر دیا جائے مثلاً:

۱۔ کانگریس کی صدارت لکھنؤ کے ایک نواب صاحب کر رہے ہیں۔ بہت کچھ تکلف و تعظیم کے بعد جناب صدر صاحب خطبۂ صدارت پڑھنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ شوکت صاحب فرماتے ہیں۔
"آپ نے سب سے پہلے تو اپنا بٹیر اپنے خدمت گار کو دیا"۔

۲۔ ایک مقام پر تکیہ کا غلاف بنانے کا مسئلہ در پیش ہے۔ بھائی اور بھاوج میں حجت ہو رہی ہے شوکت صاحب فرماتے ہیں: "یہی غلاف باعث موازنہ انیس و دبیر بن جاتا"۔

۳۔ لکھنؤ اور لاہور کے موازنہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم کو طائرانہ نظر سے مقابلہ کرنے کے لیے پہلے عمارتوں پر منڈلانا چاہیے اس کے بعد شہر کی گلی کوچوں پر اڑنا چاہیے، پھر دونوں شہروں کے باشندوں کا ترکیب نحوی کرنا چاہیے اور آخر میں دونوں کی عام حالت لکھ کر یہ کہہ دینا چاہیے کہ یہ بھی جیتے اور وہ بھی جیتے، جیسے ان دونوں کے دن پھرے خدا سب کے پھیرے"۔

۴۔ ایک ڈاکٹر کی خستہ حال موٹر کا خاکہ کھینچا ہے: "وہ موٹر ضرور تھا اور اگر اس میں پٹرول ڈال دیا جاتا تھا تو چلتا بھی تھا، یہ اور بات ہے کہ آواز و رفتار کے اعتبار سے وہ کسی لاری اور چھکڑے کی سول میرج کی زندہ یادگار نظر آتا تھا"۔
انہیں ڈاکٹر صاحب اور مالک مکان کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کے مکان میں ڈاکٹر صاحب کرایہ ادا کرکے بیٹھتے تھے۔ مالک مکان کے باب میں لکھتے ہیں "مکان دار نے کچھ نامناسب طریقہ پر دروازہ پر کچھ غیر طبی کلمات کہے"۔

۵۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی کے درمیان گفتگو ہوتی ہے۔ بیوی کہتی تھیں کہ ڈاکٹری میں بڑی آمدنی ہوتی ہے انھوں نے اپنے اس خیال کا ثبوت یہ دیا کہ ڈاکٹر آخر دن رات موٹر میں کہاں کہاں پھرا کرتے ہیں۔ شوکت صاحب (بزبان ڈاکٹر صاحب) جواب دیتے ہیں، "یہ لوگ فضول بھی اپنے موٹر کو ادھر ادھر دوڑاتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ڈاکٹری چل رہی ہے حالانکہ محض موٹر چلتا ہے"۔

۶۔ ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب بہت زچ ہوئے ہیں۔ شوکت صاحب نے ان کا یہ رخ یوں پیش کیا ہے: "ڈاکٹر صاحب نے اپنے

چھوٹی بحروں اور زمین شگفتہ ہو کے کہا:

یہ چند مثالیں میں نے جہاں تہاں سے اخذ کی ہیں ورنہ دیوانِ قہقہہ میں اس کے جگہ جگہ ایسے دلچسپ اور بقول بعض مشاعرہ والوں کے "بھرپور" مصرعے کافی تعداد میں ملتے ہیں۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ ایک رات میں شوکت صاحب کی وہ تقریر سُن رہا تھا جو لاہور سے ایک افیونی کی جنت کے تخیل پر کی تھی۔ ایک افیونی اپنے کسی مرحوم دوست سے جنت میں ملتا ہے اور جنت کے تمام لطائف و ظرائف کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ جہاں تک ریڈیو کا تعلق ہے ان کی تقریر یقیناً کامیاب تھی اور غالباً یہ ہمارا یا مجبوری تھا کہ خود ایک ایسی چیز ہے جس کو مدِ نظر رکھ کر اس تقریر پر کچھ زیادہ سوچا جانا بھی موزوں ہے لیکن شوکت صاحب میرے چھوٹے ہیں۔ فنی حیثیت یا رتبے کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس اصول کے ماتحت جو مشرق میں خوردوں بزرگوں کے باہمی تعلقات پر حاوی ہوتا ہے۔ اس تقریر کے بارہ میں شوکت صاحب سے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صاحبِ فن اس بحث پر ایک دوسری نوعیت سے اظہارِ خیال کرتا۔ افیونی کو ممکن ہے بہشت میں گنے، دودھ، شہد، سوجی حلوا ہی نظر آتا ہو یا ملتا ہو لیکن افیونی اور افیونی کے وکیل کے نقطۂ نظر میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ جنت میں واقعات سے نہیں نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہیئے افیونی کی مرغوب خاطر نعمتیں اور چیز ہے اور افیونی کی شریعت دوسری چیز ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہے بصیرت افروز اور دلچسپ بھی لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے ورنہ اس

درِ دیک ساغر ہے چہ دنیا و چہ دیں

پھر کہا کچھ نہیں جا سکتا

ہاں شوکت صاحب ایک بات اور سُن لیجئے اور گو یہ کان میں کہنے کی ہے لیکن خیر کوئی حرج نہیں گوش ہم دیوار دارد: ہماری یہ کائنات ظرافت کی تاریخ کا اولین اور سب سے اہم باب ہے ملائک کی تخلیق سے جب یہ ——— و ابھرتی محفلیں فرسودہ اور بے مزہ ہونے لگیں تو مشیتِ الٰہی نے اس میں طنز کا عنصر بھی شامل کر دیا اور اُن بزرگ کو عالمِ وجود میں لایا گیا جن کو ہمارے بزرگ شیطان کہتے ہیں۔ چنانچہ بقول امیرؔ مینائی مرحوم جن کا پورا شعر مجھے یاد تو ہے لیکن ممکن ہے موزوں یاد نہ ہو اور میں نے بعض بڑی جان جوکھوں قسم کے استادوں کو بھی اسے ایسا ہی پڑھتے ہوئے سنا ہے جیسے کہ یہ شعر ناموزوں ہی موزوں ہو گیا تھا۔ پانی کی چند بوندیں جو کبھی انگور میں تھیں کھنچیں تو تلواریں گئیں اور ظرافت ستم ظریفی میں تبدیل ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہماری کائنات وہ چیز بن گئی ہے جس پر میں آسانی سے اظہارِ خیال کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے آپ اسی آسانی کے ساتھ اسے شائع نہ کر سکیں گے۔ اس لیے میں اس بحث کو یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں لیکن مجھے امید ہے اس کی بصیرتوں سے آپ کبھی نہ کبھی ضرور فیضیاب ہوں گے۔

اچھا شوکت صاحب خدا حافظ میری دُعا ہے کہ آپ پر وہ مصیبت نازل نہ ہو جس نے اکثا آپ سے بے پناہ کو بھی بدحواس کر دیا تھا۔ ہر روز ایک نیا لطیفہ دریافت کرنا ممکن ہے آپکے نزدیک اتنا دشوار نہ ہو جتنا میں سمجھتا ہوں لیکن احتیاط شرط ہے۔ دنیائے تبسم میں سرحد کے ایڈیٹر کو کہاں جگہ ملے گی مجھے نہیں معلوم۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ پیشتر بھی اسی وادیِ پرخار سے گزرے تھے ان کے دامن سے تو کانٹوں ہی کو گزند پہنچا۔ خدا کرے آپکے دامن کو کانٹے گزند نہ پہنچائیں۔

(۵)

نیاز فتحپوری

دنیا مصائب و آلام کی جگہ ہے یا لطف و مسرت کی، اس کا فیصلہ آج تک نہ ہو سکا۔ جو لوگ حور و قصور و کوثر و سلسبیل کے قائل ہیں وہ دنیا کو دار المحن کہہ کر آخرت کی امید پر ہر تکلیف جھیل رہے ہیں اور اس کے دور کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے کہ مبادا یہاں کا ذرا سا آرام وہاں کے لذائذ میں کمی کر دے، جو زندگی کو صرف اسی دنیا کی چیز سمجھتے ہیں وہ یہاں کے ہر ہر لمحہ کو "شاہد و شعر و ست و شراب و شکر" میں بسر کر دینا چاہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اگر جنت کے وجود کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا۔

به فردوس روزن بدیوار کو — نظر بازی و ذوق دیدار کو
صبوحی خورم گفتہ از آب طہور — کو زہرہ و شمع و جام بلور

ایک زاہد شب زندہ دار کہتا ہے کہ اگر واقعی مرنے کے بعد حیات بعد الممات اور حور و قصور کا وجود ثابت ہوا تو پھر دنیا میں گناہ کرنے والے کیا کریں گے، ایک رند شراب خوار بھی یہی کہتا ہے کہ اگر یہ سب کسی کا "وعدۂ فردا" نکلا تو پھر بتاؤ "مواد زندگی" کس نے دی اور کون خسارہ میں رہا، بہرحال یہ جھگڑا نہ کبھی طے ہوا نہ آئندہ طے ہوگا، مرنے کے بعد خدا ہی کو معلوم ہے کہ کیا ہوگا اور کیا نہیں، اس لیے میرے نزدیک اس سے زیادہ حماقت کوئی نہیں کہ "شے حاصل" اور "امید موہوم" میں کوئی فرق نہ کیا جائے اور موجودہ زندگی کو صرف اس لیے رو رو کر گزار دیا جائے کہ کہیں اور جا کر ہنسنا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ "خوش باش دمے" کیا چیز ہے؟ وہ لوگ جو اپنی تمام تمناؤں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جن کے یہاں کسی ارادہ کا پیدا ہو جانا اس کی تکمیل کا مترادف ہے، ان کے یہاں حقیقی لطف و مسرت کا وجود کبھی نہیں پایا جا سکتا، ان کے لیے تو پہلے ضرورت اس کی ہے کہ

خارم کن و در رہ گزر چارہ گرم ریز

اس لیے نشاط کا مفہوم حقیقتاً الم سے پیدا ہوتا ہے اور اس شخص کو ہم مسرت کا جستجو کرنے والا پائیں گے جس کو یہ چیز حاصل نہیں ہے یا ہاتھ سے کھو چکا ہے، غالباً یہی وہ فلسفہ ہے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ "وہ شخص جو تمھیں ہنساتا ہے بسا اوقات تم سے زیادہ مغموم ہوتا ہے" ہرچند یہ کلیہ نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن اس میں کلام نہیں کہ اگر کوئی شخص ایسا ہے

جس کا جی چاہے صاحب سے [illegible] تب سے زور سے [illegible] چاہے [illegible] [illegible] [illegible] میں ان سے زیادہ [illegible] (یعنی) [illegible] نہیں ہوں جتنا فرض کیا جاتا ہے [illegible] [illegible] مسلمان [illegible] [illegible] بھی بہر [illegible] [illegible] [illegible] و ملکن ہوتی ہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے نکل جا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] وقت پر [illegible] نہیں ہو جاتا۔ لیکن [illegible] حالات لکھے ہیں [illegible] [illegible] ہیں۔

جب مجھ سے جناب [illegible] صاحب نے [illegible] [illegible] [illegible] گئی [illegible] خیال [illegible] [illegible] کہ آیا شوکت صاحب کی [illegible] نگاری [illegible] [illegible] بالکل [illegible] [illegible] پڑھے ہیں [illegible] جاتا ہے [illegible] [illegible] حالات [illegible] [illegible] حقیقت [illegible] جب مجھے کسی وقت [illegible] تصنیف [illegible] [illegible] ہے۔ چنانچہ [illegible] میری توجہ اس طرف منعطف ہوئی اور تصنیف سے قبل مصنف کی [illegible] [illegible] کے حالات میرے سامنے آئے۔ [illegible] ظاہری خد و خال [illegible] [illegible] نہیں [illegible] تعلق ہے [illegible] [illegible] تصویر [illegible] جو ان کے مجموعہ کے ساتھ شامل ہے۔ لیکن [illegible] نے شوکت صاحب کو مختلف صورتوں میں نہیں دیکھا وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جب شوکت صاحب صرف تصویر کھچوانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو ان کے چہرہ میں کس قدر [illegible] سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے جو "یعنی" [illegible] [illegible] ترشے سکتے ہیں لیکن دلکشی سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔

شوکت صاحب ایک جوان شاعر و ادیب ہیں، نوجوان ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی شادی بھی ہو چکی ہے اور وہ ایک بچہ کے باپ بھی ہیں نوجوانی کے مفہوم میں جو تصور [illegible] پایا جاتا ہے وہ ان کے حالات پر منطبق نہیں ہوتا، اور بعض خصوصیات ایسی بھی ہیں جن کے متعلق یہ فیصلہ دشوار ہے کہ آیا وہ مردوں کے لیے زیادہ موزوں ہیں یا عورتوں کے لیے بہر حال فی الجملہ ان کی دلکشی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کیفیات صرف اسی وقت تک نمودار ہوتی ہیں جب تک شوکت صاحب اپنے آپ کو نوجوان سمجھ کر کافی طور پر بنے رہتے ہیں، ورنہ اس کے بعد مختلف اوقات میں جو بے ساختہ کیفیات ان کے چہرے سے ظاہر ہوتی ہیں وہ البتہ ایسی حقیقتیں ہیں جن کا علم ان کے مجموعہ پر تنقید کرنے والے کے لیے ضروری ہے۔ افسوس کہ تفصیل سے کام لینے کے لیے اوراق مقدمہ بہت تنگ نظر آتے ہیں ورنہ شاید میں اپنی معلومات کو زیادہ بسط کے ساتھ بیان کرتا۔ تاہم اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ شوکت صاحب ہمیشہ وہ نہیں رہتے جو اپنے مضامین میں نظر آتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ "حقیقی شوکت صاحب" شاید وہی ہیں جب وہ خستہ و پریشان اپنے دفتر سے دوپہر کی گرمی میں گھبرائے ہوئے نسیم صاحب کی جستجو میں آتے ہیں اور یہ حضرت جو "با ما شراب خوردہ و زاہد نماز کردہ" کی بہترین تفسیر ہیں یا تو ...... صاحب کے حجرہ میں ہوتے ہیں یا انعامی بسکٹ فیکٹری کی دکان پر۔ اس وقت شوکت صاحب کے نتھنوں کی کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، مدعا یہ ہے کہ شوکت صاحب کو غصہ بھی آتا

ہے اور بہت کافی ۔ وہ زود رنج بھی ہیں اور خطرناک حد تک، وہ افکار و آلام سے بھی مغلوب ہو جاتے ہیں اور پھر بڑی شدت کے ساتھ ـــــ اس لیے میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں، کہ ان کی مزاح نگاری محض ایک پھول کی شگفتگی ہے اور اس سے "انشراح زخم" کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ بات میں بات بڑھتی جا رہی ہے حکایت لذیذ نہیں لیکن دراز تر ہوتی جا رہی ہے مجھے اظہار رائے کرنا تھا اس مجموعے کے متعلق، اور گفتگو شروع ہو گئی نفسیات مزاح نگاری پر، شوکت صاحب کی ذاتی خصوصیات پر، بہر حال میں اس کو یہیں ترک کر کے بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس حد تک ایک مصنف کی خصوصیات کا اس کی تصنیف سے تعلق ہوتا ہے، اس مجموعہ میں اس کی کافی جھلک پائی جاتی ہے مگر میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کے ہر مضمون میں وہ اپنے کردار اپنی فطری کیفیات کو تکمیل کے ساتھ نمایاں کر سکے ہیں۔

شوکت فطرت کی طرف سے اس قسم کی حس لے کر آئے ہیں جو ہر چیز کا شیریں حصہ حاصل کر کے تلخ حصہ کو دوسروں کے لیے چھوڑ دینا پسند کرتی ہے اور اس لیے قدرتاً ان میں ایک لطیف قسم کی بے اعتنائی یا بے رخی پیدا ہو جانا چاہیے چنانچہ آپ اس مجموعہ میں بعض مضامین ایسے پائیں گے جس میں یہ پر لطف ایذا رسانی پورے طور پر نمایاں ہے۔

شوکت، ایک فطری ادیب و شاعر کی طرح جزئیات کے مطالعے کے بہت شائق ہیں، اور ان کے اظہار پر بھی قدرت رکھتے ہیں، لیکن کھلنڈرے پن کے ساتھ اور یہی وہ چیز ہے جس نے انھیں "مزاح نگار" بنا دیا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو انھیں ملک کے دوسرے مزاح نگاروں سے جدا کرتی ہے۔ اس رنگ کے لکھنے والوں میں اس وقت، پطرس، رشید اور عظیم چغتائی بہت مشہور ہیں۔ لیکن جس طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے سے ممیز ہے اسی طرح شوکت ان سب سے علیحدہ ہیں، چغتائی صاحب کی مزاح نگاری، اکثر و بیشتر منحصر ہوتی ہے پلاٹ یا واقعات پر یعنی وہ حالات ایسے پیش کرتے ہیں جو مشاہدے کے بعد یوں بھی ہر شخص کو ہنسا سکتے ہیں۔ رشید کی مزاح نگاری منحصر ہے اس امر پہ کہ وہ الفاظ و فقروں کا استعمال ان کے عام متبادر معنی سے ہٹ کر کرتے ہیں، رشید صاحب کی مزاح نگاری دور اولین فلسفیانہ مزاح نگاری کا بہترین نمونہ تھا۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا دماغ زیادہ تھک گیا ہے، اور وہ غور و تامل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی اور کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں، تاہم کوئی نہ کوئی سنجیدہ نتیجہ ان کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا ہے۔ پطرس کی مزاح نگاری بڑی حد تک مغربی رنگ کی ہے جس میں واقعہ و انداز بیان دونوں سے مضحک کیفیات پیدا کی جاتی ہیں، لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ہمارے لیے یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس میں واقعی کسی تلخ حقیقت (GRIM REALITY) کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایک مزاح نگار کا حقیقی کمال یہی ہے۔ شوکت کی مزاح نگاری بھی اس خصوصیت سے معرا ہے اور وہ بھی سطحی طور پر اپنے موضوع سے گزرنا چاہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان کے یہاں زبان کا لطف، مشاہدۂ جزئیات اور لطافت خیال یہ سب اس قدر خوبی کے ساتھ ملے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی فضا خاص پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی مزاح نگاری ہوا کا وہ ہلکا جھونکا ہے جو پانی کی سطح پر ننھی ننھی موجوں کا جال بچھا کر قلب و نگاہ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور پھر سطح کو ساکن چھوڑ کر گزر جاتا ہے ان کے یہاں کبھی کوئی ایسی طوفانی ہوا نہیں پائی جاتی جو پانی کو تہہ و بالا کر کے بھنور پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا مقصود ایک غم آلود شخص کو ہنسا دینا ہے لیکن وہ غم کو

سنجیدہ ہونا نہیں چاہتے۔ اگر وہ مختلف مسئلے پر دوستانہ [illegible] جب بھی ہوں۔ لکھنے میں نہیں تو کم از کم [illegible] اتنا ہی برداشت [illegible] حاصل کر سکتے۔ یہ نہیں کہتے [illegible] ہمارے [illegible] کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے جو کسی حد تک [illegible] ظرافت [illegible] ہے۔

میں نے شوکت صاحب کے اکثر مضامین سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں پڑھے ہیں اور ہمیشہ میں نے محسوس کیا [illegible] کا مستقبل شاہراہ کی طرف [illegible] پنہاں ہے۔ [illegible] اپنی عادت کے خلاف کسی اور رنگ کی طرف مائل نہ ہو گئے [illegible] مزاح کا ایک [illegible] ہے۔ [illegible] مطالعہ کر سکتے ہیں [illegible] سے بھی بنا سکتے ہیں [illegible] پر وہ کسی [illegible] اصول کا کوئی معیار قائم نہیں کر سکتے [illegible] بات ماحول کی بنا پر کسی حقیقی واقعہ [illegible] طرح کر سکتے ہیں لیکن کسی [illegible] وہاں کی دنیا میں وہ ایسے [illegible] کوئی [illegible] طرح تنقید پیدا نہیں کر سکتے [illegible] مختلف [illegible] حالات [illegible] کوئی ناگوار [illegible] اس کے دور کرنے کی فکر میں ہے تنقید کو جاری نہیں رکھ سکتے [illegible] ناگواری کو بڑھانے والا ہے۔ یہ رفتہ رفتہ مزاح کی [illegible] دونوں بساط الٹ دیتے ہیں۔

چونکہ شوکت صاحب ابھی بہت کم عمر ہیں اس لیے زمانے کے ساتھ ساتھ [illegible] ان کے رنگ میں بہت کچھ تبدیلی یقینی ہے لیکن یہ پیشین گوئی تو کر نہیں سکتے کہ وہ کسی وقت اس مخصوص رنگ سے بالکل علیحدہ ہو کر کوئی جداگانہ روش اختیار کریں گے اور اگر انھوں نے کبھی ایسا کیا تو سخت غلطی کریں گے لیکن یہ ضروری ہے کہ یا تو ان کی موجودہ مزاح نگاری کا معیار ادنیٰ ہو جائے گا یا اعلیٰ۔ یہ سطح قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر انھوں نے ہر سال ایک مجموعہ شائع کرانے کا ارادہ کیا یا محض فرمائش پوری کرنے یا ہر رسالہ میں نظر آنے کی غرض سے لکھنا شروع کیا تو یقیناً وہ حال کے معیار سے بھی نیچے آ جائیں گے۔ لیکن اگر انھوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا کہ جس طرح بغیر کسی جذبۂ محبت کے غزل گوئی کوئی معنی نہیں رکھتی اسی طرح مزاح نگاری بھی بے روح ہے اگر وہ واقعی کسی کیفیت انبساط کا نتیجہ نہیں تو ان کے موجودہ رنگ کا اور زیادہ نکھر جانا یقینی ہے۔ لیکن میں مشورہ ضرور پیش کروں گا اور وہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو جارحانہ پہلو سے اعراض کریں اور ضرورت سے زیادہ "ذاتی چیز" پیش نہ کریں۔ اس کے ساتھ یہ بھی عرض ہے کہ جب ان کی عمر چالیس سال سے زیادہ متجاوز ہو جائے تو وہ اس رنگ میں کبھی کبھی کچھ پھیکا پن خوبی کی بھی ملا دیا کریں تو زیادہ مناسب ہے جس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ اپنی نقاشی کے لیے جو بیک گراؤنڈ متعین کریں وہ "مشاغل و حرب" ہو۔ اس سے جو وزن ان کی مزاح نگاری میں پیدا ہو جائے گا، وہ بہت کچھ ہمارے "سوشل مسائل" کی چیز بن جائے گا اور بڑی حد تک غیر فانی۔

مزاح و مذاق کا فلسفہ یہ ہے کہ جب اس سلسلے میں کسی خاص شخص کا ذکر کیا جائے تو سچی بات کوئی نہ کہی جائے۔ ورنہ اس کا کسی وقت سنجیدگی میں تبدیل ہو کر "بات کا بتنگڑ" بن جانا بعید نہیں۔ نسیم صاحب لاکھ ان کے بے تکلف دوست ہوں لیکن غالباً ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ ان کی "چہرہ نمائی" میں اس قدر صحت و سچائی سے کام لیتے اور خواہ مخواہ

دوسروں کو یہ رشک کرنے کا موقع دیتے ہیں کہ "شوکت صاحب نسیم صاحب کیوں اس قدر بے تکلف ہیں"۔ اسی طرح آگ کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے سائرہ صاحبہ کے متعلق اظہارِ جذبات میں وہ زیادہ بہک گئے ہیں مگر اس رشک اور احساسِ "لغزش" میں خود میرے جذبات کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ کہنے کا امکان ضرور ہے کہ

ایں نشئہ بہ من نسبت اگر با دگرے ہست

بعض بعض مضامین اس مجموعہ کے خصوصاً شوکت کے بہت بلند شاہکار ہیں جیسے کہ "یہ کیا سفر" "بیکاری" "سودیشی عدالت" وغیرہ۔ ایک مضمون ان کا "منحوس بیضہ" ایسا ہے جس کو شوکت صاحب کے سوا اور کوئی مزاح نگار یوں ہی بلکہ لکھو سے، ہرگز نہیں لکھ سکتا۔

بہرحال ملک کو شوکت صاحب اور ان سے زیادہ نسیم صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ پے در پے دو مجموعے ایسے دلچسپ مضامین کے ان کی وجہ سے شائع ہو گئے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ضرور مشورہ دوں گا کہ تیسرا مجموعہ اب دو سال سے پہلے شائع نہ کرائیں ورنہ "جہانگیرزم" پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

"نیاز"

(۶)

نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی

ذہین شخص جو کام کرتا ہے اس میں وہ خلوص کے ساتھ ڈوبا [illegible] ہوتا ہے۔ شوکت [illegible] جیسے [illegible] پیچیدہ ہے۔ ان صفات سے مالا مال ہے۔ ان کی حیثیت [illegible] ہے [illegible] خیال محترم متانت و سنجیدگی ہوتی ہے۔ شوکت نے جتنے [illegible] ہیں۔ [illegible] معیار لیا ہونا چاہیے اور اس میں وہ آوازی کسی طرح پیدا ہوتی ہے۔ ان کے تخیل [illegible] اسلوب ادا [illegible] میں تازگی و ندرت پائی جاتی ہے۔ گفتگو مختصر جست [illegible] درست [illegible]

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست

عشق کر لیجئے۔ ان کے نزدیک معشوق سے طالب وصال ہونا بھی ہوس ہے اور یہی ہوس کی وجہ یہ ہے کہ انسان محویتِ خیال کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے ـــ

ہوس جس کو سکھا دے طالب دیدار ہو جانا
اسے کیا آئے گا محوِ جمالِ یار ہو جانا

بزم شراب میں شور و اودھم برپا ہونا نیز رندان خرابات کی زاہدان ریائی سے نوک جھونک مشہور ہے مگر شوکت لکھتے ہیں ـــ

خمارِ تشنہ لبی کو اثر دکھانا تھا
پہنچ کے ہاتھ میں ساغر کو ٹوٹ جانا تھا

یہ ایسی کیفیتیں ہیں جنہیں غیر شاعر یا متشاعر محسوس ہی نہیں کر سکتا نظم کرنا تو در کنار۔ وہ سطحی خیالات سے حتی الوسع اجتناب کرتے ہیں اور سامنے کی بات بھی اس طرح کہتے ہیں کہ گہرائی اور بانکپن پیدا ہو جائے ـــ

وہ کس خطا پہ ہوئے دشمنی کو آمادہ
انہیں تو میں نے کبھی دوست بھی نہ جانا تھا

دوسرے مصرع کے انوکھے انداز نے شوخیوں میں بجلیاں پیس کر ملا دی ہیں معشوق سے جلی کٹی ہو تو اس لطف سے ہو۔

اس شعر نے اُن زمزموں سے بہت قریب کر دیا ہے ؎

جان دے دیں گے ہم اے ہمت دشوار پسند
مرضِ عشق اگر قابلِ درماں نکلا

سستیِ مطالب کی گنجائش نہیں۔ اسی غزل کا یہ شعر بھی عجیب آن رکھتا ہے ؎

موت برحق ہی مگر کاش نہ آتی شبِ غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کہ اک ارماں نکلا

رفتہ رفتہ اس انداز بیان نے بداحت اختیار کر لی ہے ؎

درد کیا جانا دمِ آخر تسلی سے ، مگر
زندگانی میں سکونِ موت شامل ہو گیا

غزل اسی کا نام ہے اور مجھے بے حد مسرت ہے کہ باوصف نوجوان ہونے کے شوکت نے وہ غلط راستہ اختیار نہیں کیا جس کو بعض حضرات "رقص الفاظ" اور "رندی و مستی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر اہل نظر محض اس کو ڈھکوسلا سمجھتے ہیں۔ موسیقی اور شعر سے بہرہ ہیں شوکت آجکل کے بہترین خوش گلو اور خوشگو نہ پڑھ جانے کا ، شاعروں کو مات کر سکتے ہیں۔ بیان و شاعر پہلے ہیں ترنم پروری وصف اضافی ہے۔ اُن کے شعر کی بنیاد کوئی خیال ہوتا ہے جس کے اظہار کو الفاظ لاتے ہیں نہ کہ الفاظ اور ردیف و قافیہ کی مدد سے کسی مبہم اور ناقص خیال کی تشکیل ہوتی ، جسے جلد کی نوک پر جو بچا گیا ، اگر پورا اترا تو شعر ہے۔ تخیل کی ناداری ، جذبات کی بے مائگی کچھ تو مستعار یا مسروقہ ترکیبوں میں کچھ لفظ بازی میں دب گئی۔ مشاعرہ میں واہ واہ ہو گئی ، یہی اُن کی شاعری کا مآل اور یہی بانی کا صلہ ہے۔ مسیلمہ کذاب کی طرح اُن کے متبعین بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ پروپیگنڈا مہمل اشعار کو الہام کا درجہ دینا ہے یا فلسفہ و تصوف کے سر تھوپتا ہے۔ زبان سے اُن کی بلا واقف ہو اگر کسی نے اس بنا پر گرفت کی تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شعر میں اصل شئے تخیل ہے۔ الفاظ چنداں اہمیت نہیں رکھتے بس اتنا ہو کہ خیال کی ایک جھلک نظر آ جائے۔ جو کچھ بھی ہے الفاظ کا رقص و موسیقی اور ترکیبوں کی خوبصورتی ہے۔ ممکن ہے کہ مجذوب کی طرح شاعر غیر ارادی طور پر غیب کی باتیں نظم کر گیا ہو۔ غرضکہ اس فرقہ کے نزدیک جو شعر جس قدر مہمل ہے اُسی قدر عمدہ ہے کیونکہ قیاس آرائی کی پوری آزادی ہے۔ شعر میں جو معنی چاہے پہنا دے۔ اگر کسی نے اعتراض کیا کہ الفاظ تو اس مفہوم کے متحمل نہیں تو ارشاد ہوا کہ اگر شعر کا یہی مطلب نہ ہوتا تو میرا ذہن اُدھر منتقل کیوں ہوتا ! چلیے جھگڑا چکا ! —

ایک گروہ مغرب زدہ ذہنیت والوں کا ایسا ہے جو غزل کو ایک سرے سے ناقابلِ التفات سمجھتا ہے اور "نظمیات" کا دلدادہ ہے جن میں جو چاہے بکتے چلے جاؤ کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ملے گا۔ اور اگر کوئی شامت کا مارا اُلجھ پڑا تو اُس کو یہ جواب دے دیا گیا کہ حضرت مسلسل نظموں میں ایسی جزئیات سے بحث اصولاً غلط ہے اس کی "تعمیری" خوبیوں اور "تخلیقی" رعنائیوں پر غور کیجئے اور داد دیجئے ، الغرض ہرزہ سرائی و بے راہ روی کا ہنگامہ برپا ہے۔ لیکن

پڑھنے کی ضرورت نہ کبھی ہے۔ زبان سے مبتذل داخل ہو کر بھی جاتی ہے۔ ناقدوں کا [illegible] ہے۔ یہ تعصب حسد یا بدحسی کا الزام لگا کر سرے سے [illegible] رہی ہے۔ غزل کی قسمت [illegible] نہیں جانتے کہ [illegible] [illegible] کی پرکھ [illegible] نے [illegible] وہی بھی صنف موزوں ہے۔ علاوہ بریں زبان کو وسعت دینے والے [illegible] کرنے والے وہی شعر ہوتے ہیں جو زبانوں پر چڑھ کر ضرب الامثال کا درجہ حاصل کریں۔ [illegible] میں بھی ہے۔ اور اگر یہ [illegible] ہے۔ چنانچہ اقبال نے بہت کچھ لکھا اور بہت خوب لکھا۔ مگر [illegible] شہرت کا سنگِ بنیاد ایک غزل کا مطلع ہے۔ اگر کسی سے فرمائش کروں [illegible] اقبال کا کوئی شعر سناؤ تو یقیناً مطلع پڑھے گا ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

غزل کا ایک ایک شعر بلکہ دل سے نکلا ہوا ایک طویل نظم پر بھاری ہوتا ہے۔ [illegible] غزل کے [illegible] شعر لکھا جاتا ہے۔ شوکت کا یہ مطلع ہے ؎

[illegible] آن کر مجھ سے کہا اور مرے افسانے سے کہا
[illegible] شراب کام ونہ [illegible]

[illegible] کا ہے۔ شاید ہی کوئی شخص ہو جس کی زندگی کے کسی نہ کسی تجربے سے اس شعر کے مفہوم کا تعلق نہ ہو [illegible] سرگزشت کی ترجمانی نہ کرتا ہو۔

ہوشمندوں کی ایک اور جماعت غزل کو اس وجہ سے مردود قرار دیتی ہے کہ اس میں خیالی باتیں ہوتی ہیں کوئی ایسا پیغام نہیں ہوتا جو اُن کے مُردہ دلوں اور مضمحل بلکہ معطل قوتوں میں عمل کی روح پھونک دے۔ [illegible] ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا ؎

گرم اشعار سے [illegible] ؎
کام کرنا ہے جنھیں کام کیا کرتے ہیں   مکتبِ شعر میں یاد رس لیا کرتے ہیں

غالباً ایسے ہی لوگ شوکت کے ذہن میں تھے جس وقت انھوں نے یہ شعر کہا ؎

جس طرح گزری ہے اب تک اب بھی گزرے گی یونہی
ہم نہیں بدلے تو دنیا کے بدل جانے سے کیا۔!

غزل میں کیا کچھ نہیں ہوتا اور کیا کچھ نہیں ہو سکتا مگر مزدوروں، اور سرمایہ داروں کو لڑا کر پیٹ ڈالنے والوں کے لیے نہیں، نہ جاہلوں اور نااہلوں کے لیے، بلکہ اہلِ ذوق اور اہلِ نظر کے لیے۔ ایسی غزل کی تمثیلی شاعری میں جسے بے درد گل و بلبل کی شاعری کہہ کے ہنسی اڑاتے ہیں، ایک سچا شاعر سیاسی و اقتصادی گتھیاں سلجھا دیتا ہے اور طبائع کو غور و فکر اور حقیقی نفع و ضرر سمجھنے پر آمادہ کرتا ہے، سنیئے ؎

یہ سچ ہے ایک حالت پر کبھی دنیا نہیں رہتی
قفس کو آج میں ترجیح دیتا ہوں گلستاں پر

مسلمانوں کی تاریخ عروج و زوال پڑھ جائیے اس شعر کی شرح ثابت ہوگی۔

مادہ پرست دور یورپ کی تشنگی ان کے سدھے جسمانی عیش و راحت کے حریص، روح کی تربیت سے غافل عقل و روح کے وجود کے منکر اور دنیا و مافیہا پر دنیا سے بےخبر ہو گئے ہیں۔ مغربی ممالک کی معاشی اضطرابی و تباہ کاری شورش پسندی و پریشاں حالی سے ہم وہ عبرت نہیں لیتے اور نہیں سمجھتے کہ روحانیت کو چھوڑ کر مادیت کی طرف بڑھنا بہیمیت و درندگی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ صحیح مفہوم آزادی سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ بیڑیاں بیڑیاں ہیں سونے کی ہوں یا لوہے کی۔ شوکت ساری دنیا کو بیدار کرتے ہیں اور متنبہ کرتے ہیں، لیکن وعظ و خطابت سے الگ ہو کر شعر پاروں دل لبھانے والے لہجے میں کہ ؎

محبت ہو گئی ہے چار دیوارِ قفس سے
اسیر آب و گل عاشق ہوئے ہیں اپنے زنداں پر

مادیت سے روحانیت کی طرف رجحان کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ شوکت کی یہ پیشین گوئی مستقبل قریب میں پوری ہو۔۔۔۔

ان سجدہ ریزیوں کا وہ دور آ رہا ہے
جب سنگِ در کرے گی سجدہ مری جبیں پر

خیر یہ تو حشو الکلام سمجھ لیا جائے، آپ اب محض روحانی انبساط حاصل کریں، ادب کا اصلی منشا اور صحیح مفاد یہی ہے۔

زمانے کے نشیب و فراز طے کرنے کے بعد انسان کو امید ہوتی ہے کہ اب اطمینان نصیب ہوگا مگر تقدیر ہنستی ہے اور کہتی ہے کہ ابھی سرنوشت کی تکمیل کی مشیت ایزدی کو نہ سمجھے ہو نہ سمجھو گے۔ اگر شعور ہے تو آرام کی خواہش کے بدلے اور محنت و جانکاہی کے صلے کا متوقع ہونے کے بجائے راضی برضا ہو اور سرِ تسلیم جھکا دو، اپنی سعی و جد و جہد پر نازاں ہو کر اصل مقصد کو نہ بھول جاؤ ؎

میری قسمت کے پیچ و خم نکلے　　میرے دم سے ہے نشیب و فراز

خالص تغزل بے پناہ شعریت اور اثر انگیزی میں یہ شعر آپ اپنی نظیر ہے ؎

تاثیر ہی بیاں میں نہ ہو جب تو کیا کروں
کیا اپنا حال اُن کو سناتا نہیں ہوں میں

صرف اندازِ بیان کی لطافت نے اس شعر میں کیا کیا مزہ بھر دیا ہے اور کس قدر معنوی اضافہ کیا ہے ؎

توبہ کروں گا واعظ لیکن ذرا یہ سن لوں
کچھ مجھ سے کہہ رہی ہیں اُمڈی ہوئی گھٹائیں

واقعاتِ "حسن و عشق" کی مصوری کس دلکش پیرایہ میں ہوئی ہے ؎

رسوا تھا تماشا ہوں کا مگر خوب تھا [illegible]
پھر [illegible] نظروں میں نہیں نظر آتی

[illegible] کی شرارت، خدا کی پناہ ـــ

خوب [illegible] میں [illegible] ادوں سے [illegible]
[illegible]

[illegible] میں چٹکاریاں دیکھیے ـــ

[illegible]
[illegible]

[illegible] وحشت سے مخصوص [illegible] ہے ۔۔

حسن محشر [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] جوش ہے

[illegible] میں بھی [illegible] شوخی دیکھیے ـــ

[illegible] وصل و جدائی میں [illegible]
[illegible] جلوہ نظر آتا ہے

[illegible] شعر کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر یہی نہیں [illegible] عدیم الفرصت ہوں جلد شوکت [illegible] مضمون [illegible] یاد [illegible] اور صفحے بھی بسم اللہ [illegible] کے [illegible] چند [illegible] حیثیت دی [illegible] شوکت نے [illegible] حرف بحرف [illegible] ہے ۔

شوکت کا مجموعۂ غزلیات جس کے نام کا بھی مجھے علم نہیں، [illegible] کا مجموعہ ہے ۔

ہر صفحہ پر [illegible]

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست"

دعا ہے کہ اہلِ نظر میں شرفِ قبول پائے اور ان کی محنت ٹھکانے لگے ۔ آمین ۔

شیش محل

(۷)

مولانا عبدالماجد دریابادی

سوانح نگاری و ظرافت دونوں کے لیے بطرس، رشید صدیقی تک لے دے کے ایک مشغلہ تفریح رہی ہے۔ شوکت نے اسے ایک مستقل فن بنا لیا ہے اور قدرتاً ان کی نگاہ ایک فن کار کی نگاہ ہو گئی ہے۔ ان کا قلم ایک فن کار کا قلم ہے۔

یہ شیش محل ان کے مصورانہ ہنرمندی کا نمونہ ہے۔ اپنے ملنے والوں میں سے ۱۲ کے چہرے حرفِ تہجی کی ترتیب سے مصور نے اس قلمی آئینہ میں دکھا دیئے ہیں۔ سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے ادب ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ افراطِ نازک خیالی سے کہیں صرف کتب فروشی کو بھی اس تعلق کے لیے کافی سمجھ لیا گیا ہے۔

یہ قلمی نگار خانہ، یوں کہیے کہ ایک عجائب خانہ ہے۔ بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کہ ان کا تعارف بھی ان کی توہین۔ بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف و تعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، بعض ایسے ہیں جو سب کچھ ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں۔ ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی، ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں۔ غرض ریاض خیرآبادی، ڈاکٹر عبدالحق، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی سے لے کر افقر موہانی، آمید امیٹھوی اور صدیق بک ڈپو تک، ہر ردیف، ہر قافیہ، ہر وزن، ہر بحر کے فرد نے اس دیوان میں، شاعر کہیں تو خالی مصرعہ طرح پڑھ کر چپ ہو گیا ہے اور کہیں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ چھیڑ دیا ہے۔ نگار خانہ ظریف کا ہے، مزاح و شوخی ہر چیز پر مقدم ہے لیکن حقیقت و صداقت عموماً دوش بدوش۔ "عموماً" کا لفظ خیال میں رہے۔ ظرافت کی گلکاریاں، شوخ نگاری کی رنگ آمیزیاں، مورخ کے کیمرے اور فوٹوگرافی کی قائم مقام نہیں ہو سکتیں۔ چہرے یقیناً دلچسپ و دلکش بن گئے ہیں اور یہی فن کار کا کمال ہے۔ البتہ کوئی چہرہ اترا ہوا، کوئی ذرا لٹکا ہوا، کسی پر رعنائی و زیبائی کا نقاب پڑا ہوا۔ کسی پر روغن حسن افزا کا غازہ پھرا ہوا، کسی کی پیشانی پر شکن، کسی کے چشم و ابرو پر غضب کا بانکپن۔

ظریف نے ہنسنے ہنسانے کا سامان قدم قدم پر کیا ہے، لیکن کہیں کہیں اندازہ کرنے میں خود بھی غچّا کھا گیا ہے۔ نازک خیال اور پھر لکھنؤ و جوارِ لکھنؤ کے نازک خیال، نازک مزاج بھی کچھ کم ہوتے ہیں۔

حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم

خوب کہا شوکت صاحب نے دیباچے میں بات معانی مالک کی ورنہ محض [illegible] [illegible] بھی تند ہو کر [illegible] ہیں اور

[illegible] اور بچے کے [illegible] ہیں

ان شاعروں حقیقت بہکر [illegible] خدا نخواستہ سعادت خاں ناصر میں [illegible] [illegible] حاصل کئے ہوئے ہیں

میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

[illegible] [illegible] [illegible] رنگ میں [illegible] [illegible] صاحب [illegible] لکھا ہے — تبصرہ محل پہ لکھا تھا پھر اس کے بعد کچھ بھی [illegible] رہ جاتا ہے:

یہ چیز محض تفریح اور دل لگی کی نہیں۔ دل اس سے بڑے بڑے سنجیدہ موتی خوشہ چینی کر سکے [illegible] کتاب الاغانی کے حوالے کس [illegible] کے ساتھ مغرب و مشرق کے بڑے بڑے سنجیدہ موتی [illegible] ہیں۔ چھوڑ لیا جا [illegible] شاعروں اور گویوں کے سازندوں اور شاعروں سے بھی کئے گئے جب [illegible]۔

کمی اور بڑی کمی اس کتاب میں یہ ہے [illegible] خود شوکت کی [illegible] سے خالی ہے — [illegible] کے پارٹ کے [illegible] بقیہ نوٹ کے [illegible] بغیر بزعم خود [illegible] کی ستم ظریفی:

شخصیت نگار شوکت

(۸)

وقار عظیم

شوکت تھانوی دنیا سے رخصت ہو گئے اور دوستوں کی محفلیں سونی ہو گئیں۔ شوکت کی ایک ذات ایک انجمن تھی، اور جب یہ چلتی پھرتی انجمن احباب کی محفلوں میں پہنچ جاتی تو ایک محفل میں کئی محفلوں کی چہل پہل شروع ہو جاتی تھی۔ بات بات پر فقرے اور لطیفے، ہر فقرے اور لطیفے میں ذہانت، شگفتگی، تازگی اور بھرپور زندگی، اور ان فقروں سے پیدا ہونے والے تبسم اور قہقہے کی پیہم اٹھتی ہوئی اور گرد و پیش پر چھا جانے والی لہریں — یہ سب کچھ شوکت کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنے قلم کی شگفتگی و تازگی سے فقروں اور لطیفوں کی بے شمار ایسی محفلیں آباد کی ہیں کہ آدمی ان میں داخل ہو جائے تو نکلنے کو جی نہ چاہے۔ یہ محفلیں اُن کے ناولوں میں ہیں، مضامین میں ہیں اور اُن خاکوں میں ہیں جنھیں یکجا کر کے شوکت نے شخصیتوں کا آئینہ خانہ یا شیش محل تعمیر کیا ہے اور جنھیں اپنے 'بے قاعدہ قاعدے' کی زینت بنایا ہے۔

انسان کو معاشرتی حیوان کہا گیا ہے اور اس کے اس وصف کو اس کا ایسا امتیاز قرار دیا گیا ہے جس کی بدولت اس کی جملہ خارجی اور داخلی صلاحیتیں ابھرتی، پرورش پاتی اور ارتقا کے مرحلوں سے گزر کر بامِ عروج تک پہنچتی ہیں۔ لیکن ہم میں سے اکثر کا یہ حال ہے کہ 'معاشرتی حیوان' ہونا ہم پر ایک بڑی تہمت ہے۔ ہم معاشرتی ہیں لیکن معاشرتی ہونے کا حق ہم میں سے بہت کم ادا کرتے ہیں۔ یہ حق زندگی میں جس جس طرح ادا کیا جاتا ہے، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی لوگوں میں مل کر بیٹھے تو اس کا شریکِ محفل ہونا سب کو بھلا معلوم ہو، لوگ اس بات کی آرزو کریں کہ یہ 'معاشرتی حیوان' اکثر ان کی بزموں میں آتا اور بزموں میں زندگی کا رنگ اور زندگی کا نور بھرتا رہے۔ شوکت تھانوی اسی قسم کے برگزیدہ 'معاشرتی حیوانوں' کی صف میں آتے ہیں۔ انھوں نے زندگی زندگی کی طرح بسر کی اور دوسروں کو یہ سبق دے گئے کہ ہزار الجھنوں میں پھنس کر بھی آدمی ہنستے ہنساتے رہنے کو اپنی عادت اور معمول بنا سکتا ہے۔ شوکت کی زندگی میں اور شوکت کے ادب میں ہمارے لیے یہی بہت بڑا سبق ہے۔

شوکت کی زندگی کے مختلف رُخ ہیں لیکن زندگی کے ہر رُخ میں اُن کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو یہی ہے کہ انھوں نے زندگی خوشدلی اور خوش مزاجی کے ساتھ بسر کی۔ خود ہنسے، دوسروں کو ہنسایا اور اس طرح زندگی بسر کرنے میں ان کی نظر ہمیشہ ایسی چیزوں پر پڑی جن کے مشاہدے اور بیان، دونوں میں لطفِ حیات کا سامان موجود ہے۔ گھریلو ماحول سے الگ ہٹ کر شوکت کی زندگی کے اس پہلو پر نظر ڈالیے جسے میں نے زندگی کا معاشرتی رُخ کہا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شوکت کو ابتدائے شباب ہی سے ایسے مشاغل اپنانے اور اختیار

سے پہلے چھپی تھیں تقریباً نصف صدی ایک ہندوستانی [illegible] ہیں۔ [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] ان کی شخصیت سے [illegible] مختلف ادوار میں [illegible] تقریباً [illegible] ہیں جن میں شوکت [illegible] شوکت کی [illegible] ہیں۔ ان خاکوں [illegible]

ان خاکوں کی [illegible] شخصیت کے نقش [illegible] شخصیت نگاری کے [illegible] شوکت تھانوی کی اپنی شخصیت اور مزاج کا [illegible] طرح طرح سے پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ بنا دی ہے۔

شوکت بہ حیثیت انسان ایک خوش طبع اور خوش فکر انسان تھے اور بہ حیثیت ادیب شگفتگی اور مزاح ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ شگفتگی کبھی واقعات کے بیان کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی شخص کے اوصاف کے ذکر میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ کبھی بے ساختہ کوئی دل کی کلی کو کھلا دینے والا فقرہ ان کی زبان پر آتا ہے اور کبھی ایسے لطیفے کا روپ دھارتی ہے کہ محفل قہقہوں سے گونج اٹھتی ہے۔

شوکت نے اِن شخصی خاکوں میں کس طرح بہ یک وقت شخصیت کی مصوری کا حق ادا کیا ہے، اور پڑھنے والوں کے لیے انبساطِ خاطر کا سرمایہ بھی مہیا کیا ہے، اس کے لیے "شیش محل" اور "قاعدہ بے قاعدہ" کے چند خاکوں کی تھوڑی سی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:-

اقبال کا مصرعہ "کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں"

ایک زمانے میں زبان زدِ خلائق تھا۔ لکھنؤ میں ایک مشاعرے میں یہی مصرع طرح کے لیے دیا گیا۔ اس مشاعرے میں شوکت بھی شریک ہوئے اور غزل پڑھی۔ اس کا ذکر آرزو لکھنوی کے خاکے میں اس طرح کیا ہے "چھوٹی چھوٹی بحروں میں مصرعوں کے وزن کا سنبھالنا دوبھر تھا۔ یہ تو اچھی خاصی تندرست قسم کی بحر تھی۔"

ایک زمانے میں لکھنؤ سے "ترچھی نظر" نام کا ایک رسالہ نکلتا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"کیا تاریخی اسم مبارک تھا"

۲۲۱۳۹

اصغر خاں کے حلیے میں ڈال کے دو جملے ٹانکے ہیں، وہ ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کرتے ہیں:

"ڈاڑھی اور چٹے اور، نفاست میں اپنی آپ نظیر"

"تجارت عطر فرماتے ہیں اور شعر زبردست پڑھتے ہیں۔"

شفقت لکھنوی سے تعارف یوں کراتے ہیں۔

"کیا مجال کہ انگرکھے کے بند، اور چوڑی دار پاجامے کی چوڑیوں میں ذرا بھی شکستگی پیدا ہو جائے۔"

حفیظ حسین کاظمی اور ادب کے ساز دانوں میں جو مرتبہ ہے اُس کے پیش نظر اپنی اور اُن کی بے تکلفی کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

"لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر اکثر ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ میاں اور میرا ادب تھوڑی دیر کے لیے درمیان سے اُٹھ جاتا تھا۔"

ایک دعوت میں مولانا احسن مارہروی کو صافہ باندھے دیکھا تو ان پر یوں پھبتی کہی،

"خدا کی قسم مولانا شبلی کے استفسار معلوم ہوتے ہیں آپ"

شیخ احمد خاں کے ہاں بے تکلف دوستوں کی محفل کی آبادی اور ویرانی کا تذکرہ کرتے لکھتے ہیں کہ:

"پکے گانے گائے جا رہے ہیں، کچے شعر پڑھے جا رہے ہیں"

کوئی سنجیدہ بزرگ آئے تو ان سے علمی مسائل پر تبادلہ خیال ہونے لگا، ورنہ

"اُن کے جاتے ہی پھر منہ سے پھول اور چہرے سے ٹھٹھے برسنے لگے۔"

شوکت نے ان خاکوں میں لفظوں کی مدد سے جو جادو جگایا ہے اُس کی یہ تھوڑی سی مثالیں ہیں۔ ان خاکوں میں الفاظ کو کسی ایسے سیاق میں استعمال کر کے جہاں وہ عام طور پر استعمال نہیں ہوتا، کہیں انھیں آس پاس کے لفظوں کی مناسبت سے ایک نئے معنی اور نیا مفہوم دے کر، کہیں لفظ کے ایک مفہوم سے زیادہ دوسرے پر زور دے کر یا اُس کے دو مفہوموں میں سے دوسرے مفہوم میں برت کر، کہیں لفظ کو پھبتی بنا کر، کہیں اضداد کو نگینوں کی طرح جملوں میں سجا کر، اور کہیں محاورے سے سیدھے سادے لفظ کا کام لے کر شوکت نے لطیف مزاح بھی پیدا کیا ہے اور موقع اور محل کے مطابق کوئی مؤثر بات بھی کہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظوں کے استعمال کی یہ مثالیں الفاظ پر اُن کی قدرت اور اس قدرت سے بے ساختہ مزاح پیدا کرنے کی صلاحیت کی بڑی سیدھی سادی مثالیں ہیں۔ اُن کی مزاح نگاری کے زیادہ شگفتہ، زیادہ بلیغ اور زیادہ مؤثر نمونے اس وقت سامنے آتے ہیں، جب شوکت کی ذہانت اُن کی رنگینیِ تخیل اور تازگیِ فکر کو اُبھارتی اور ان کے میل جول سے لفظوں کا طلسم خانہ آباد کرتی ہے۔ لفظوں کے اس میل ملاپ کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک ہی جملہ اتنی بڑی بات کہہ جاتا ہے کہ پوری شخصیت کا پھیلاؤ اس میں سما جاتا ہے۔ اس طرح کے چند جملے سُن لیجیے:

"طبعاً فیشنلسٹ اور وضع قطع میں پیرس کا دُھلا ہوا کھدر واقع ہوئے ہیں۔" (یہ ہیں ساغر نظامی)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (شیش محل)

[illegible] (شیش محل)

[illegible] (شیش محل)

[illegible] (ساغر۔ شیش محل)

"ان کو سب انسپکٹر پولیس بھی سمجھا جا سکتا ہے، یونیورسٹی کا پروفیسر بھی اور جنرل مرچنٹ بھی" ([illegible] شیش محل)

"سر تیج بہادر سپرو سے ملاقات ہونے کی دو چار ہی صورتیں ممکن ہیں۔ خود آدمی [illegible] ہو یا مہاتما گاندھی یا شاعر یا کم سے کم جرائم پیشہ"

"حضرت بیخود لکھنوی کے کلام کو ہندوستان میں صرف دو ہستیوں نے چمکایا ہے۔ اختری بائی فیض آبادی نے گا کر اور شاہد احمد صاحب نے چھاپ کر" (شاہد احمد۔ شیش محل)

"سر میں دماغ اور پاؤں میں سنیچر۔ دماغ بھی چل رہا ہے اور خود بھی چل رہے ہیں۔ نہ وہ تھکتا ہے، نہ یہ تھکتے ہیں" (حکیم خواجہ شمس الدین۔ شیش محل)

"جوش صاحب کا پٹھان ہونا شاعر ہونے سے بھی زیادہ یقینی ہے، چنانچہ ان کے کلام میں بھی ہٹ دھرمی، مردانگی، جنگ جوئی، خونخوارت اور غیظ وغضب نظر آتا ہے جس کو لوگ انقلاب پسندی کہتے ہیں اور یہی جوش کی شاعری کی روح ہے۔"

—

"کلام سُن کر غضب ہو اور صورت دیکھ کر شفقت کو دل چاہتا ہے۔ کلام نہایت وزنی اور خود نہایت ہلکے پھُلکے۔ سُناتے اس طرح ہیں گویا پھونک رہے ہیں۔ کلام کے زور میں اکثر خود اُٹھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آواز دھیمی ہے، گلے میں نرمی ہے مگر جوش میں آ کر جیسے شیر ہوتے ہیں اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خلافت فنڈ سے اپیل کرتے کرتے بالشیوں کے مولانا شوکت علی کو غصہ آ گیا ہے۔"

(روشن صدیقی ۔ شیش محل)

—

"ظریف صاحب کے کلام میں قہقہے اور تازیانے کچھ اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں کہ آدمی ہنس ہنس کر تازیانے کھاتا اور تازیانے کھا کھا کر ہنستا ہے۔" (ظریف لکھنوی ۔ شیش محل)

اب خاص ظریفانہ انداز کے تبصرے ملاحظہ کیجئے:-

"اگر یہ کلام سمجھ میں آ جائے تو دماغ کا علاج کراؤ اور اگر نہ سمجھ سکو تو اس دماغ کی قدر کرو۔ یہ ضرور کسی دن تمھارے کام آئے گا۔" (میراجی ۔ قاعدہ بے قاعدہ)

—

"یہ پٹھان شاعر خدا سے بھی اکڑتا ہے۔" (جوش ملیح آبادی ۔ قاعدہ بے قاعدہ)

—

"اُن کا اسلوب اُن کی سگی بہن حاجرہ مسرور کے اسلوب کا سگا بھائی معلوم ہوتا ہے اور بس!"

(خدیجہ مستور ۔ قاعدہ بے قاعدہ)

—

"بچو! ان..... کا کلام اگر پڑھنا ہے تو ان کی غزلیں ڈھونڈو۔ نئی شاعری میں یہ پُرانا شاعر تم کو مشکل سے ملے گا، اور ان کا کلام بھی سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔" (ن۔م۔ راشد ۔ قاعدہ بے قاعدہ)

ادیبوں کے فن پر یہ ماہرانہ تبصرے اُس وقت اور بھی مؤثر معلوم ہوتے ہیں، جب اس کا مقصد ادبی مرتبے کے یقین کے بجائے شاعر یا ادیب کی شخصیت کا تعارف ہو۔ یہ تعارف عموماً واقعات کے بیان کی صورت اختیار کرتا ہے اور واقعات کا بیان اپنی تصویری خصوصیات کی بنا پر کسی شاعر یا ادیب کی زندگی کے ایک یا کئی پہلوؤں کو اس طرح اُجاگر کر دیتا ہے کہ اس کی شخصیت کا نقش ہمارے دل میں گہری اور دائمی جگہ بنا لیتا ہے۔ چند چھوٹے چھوٹے تعارفی جملے سُن لیجئے:-

"موٹے تازے لمبے تڑنگے آدمی ہیں۔ داڑھی قد سے کچھ ہی چھوٹی ہو گی۔" (خلیل احمد ۔ شیش محل)

—

"اتفاق سے بہت سی قسمیں دیکھی ہیں۔ کوئی [illegible] کوئی [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]" (صادق [illegible]۔ شیش محل)

شوکت تھانوی کے مزاح کی یہ شان [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے کوئی [illegible] [illegible]۔ [illegible] ایک بات بھی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہوتا ہے۔ اس بات میں بھی چند مثالیں سے [illegible] پیدا ہوگا:

"شاعروں کی نہ پوچھئے [illegible] [illegible] [illegible]" ([illegible]۔ شیش محل)

"شاعری میں جوش کا اور ان کی زندگی میں ہوش کا افسانہ نمایاں ہے۔" (جوش ملیح آبادی۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"روش ان کا تخلص نہ کہیے، یہ تو ان کے نام کی مشرف ہے۔" ([illegible]۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"وہ خط جو مقدمہ چلوانے کے لیے افسانہ لکھتے ہیں۔" ([illegible]۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"جب مزاحیہ کلام سناتے ہیں تو لوگ عبرت پکڑتے ہیں۔ حالانکہ خود ان کو کپڑے ناپ [illegible] [illegible]۔"

"اور آزادی ملنے کے بعد سے اگر غزل نہ بھی کہہ سکیں تو قومی ترانے کہتے رہتے ہیں۔" (ن۔ م۔ راشد۔ قاعدہ بے قاعدہ)

یہ مختصر جملے کبھی کبھی بڑے چٹکلے سے، معصومانہ رنگ میں ادیبوں اور شاعروں کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت پر تبصرہ کر جاتے ہیں اور پڑھنے والا سوچتا رہ جاتا ہے کہ ایک مزاح نگار کے چلتے ہوئے فقروں میں بھی کتنی معنویت اور گہرائی ہو سکتی ہے۔ ان معصومانہ اور بے تکلفانہ فقروں کی تہ کی گہرائی اور فکر کی سنجیدگی اور اس گہرائی اور سنجیدگی کے پردے میں چھپی ہوئی لطافت اور شگفتگی نے ہمیشہ زندہ رہنے والی تنقید کا ہم مرتبہ بنایا ہے۔ اس طرح کے چند جملے دیکھئے جن کی تنقیدی بصیرت ہر نقاد کے لیے قابل رشک ہونی چاہیے۔

اصغر گونڈوی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جس شعر کے اعمال خداوند کریم کے نزدیک صالح ہوتے ہیں، اس کو اصغر سے کہلوا دیتا ہے۔ تمام نشاط روح اسی قسم کے خوش اعمال اشعار کی جنت ہے۔"

"وہ یہ کو ٹھڑی پاس میں رکھتے اور پیروں کی طرح سڑک پر لاتے ہیں تو ٹھڑی کو بالکل مچھ کر فرماتے جاتے ہیں" ([illegible] ۔ شیش محل)

"آپ نے کبھی [illegible] شعر کے مصرعۂ ثانی کا قافیہ اور ردیف نہیں سنا۔ شعر کے آخر تک پہنچتے پہنچتے آواز تو جیسے کہ ڈوبنے لگتے تھے۔ لوگ بیٹھنے تھے اور [illegible] جس میں شعر کی خوبی بھی گم ہو جاتی تھی۔"

(صفدر مرزاپوری ۔ شیش محل)

"صرف زبان سے [illegible] شعر پڑھتے ہیں۔ نہ ہونٹنے کا ہوش ہوتا ہے نہ داد کی رسید دینے کا۔ خود ہی [illegible] شعر کو بھی چاہتا ہے پچاس دفعہ پڑھ جاتے ہیں اور جس شعر کو بھی چاہتا ہے ایک ہی مرتبہ پڑھ کر رہ جاتے ہیں۔" (مجذوب ۔ شیش محل)

"آج کل جب سے [illegible] کے مرض میں مبتلا ہیں۔ جسامت بڑھ رہی ہے اور خوراک گھٹتی جاتی ہے۔ ورزش کی ہمت نہیں۔ [illegible] زبان [illegible] کو خس [illegible] کھا کر خود فاقہ کشی سیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ [illegible] تو سر چرچل اور [illegible] کامیاب ہوگئے تو مہاتما گاندھی بن کر رہیں گے۔" ([illegible] ۔ شیش محل)

"انگریزی لباس کبھی نہیں پہنا مگر ہندوستانی لباس میں بھی تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں۔" ([illegible] ۔ شیش محل)

"شعر خواہ کسی بحر کا ہو پڑھتے مثنوی کے انداز سے ہیں لے سمجھ میں آجاتی ہے۔ الفاظ سمجھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی گفتگو سمجھ لیتا ہے تو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر شفقت [illegible] ڈھب [illegible] الفاظ فرما رہے ہیں۔ ورنہ عام طور پر گفتگو صرف یہ سمجھ میں آتی ہے کہ گویا کوئی بقبق بقبق کرکے کسی حوض میں ڈوب رہا ہے۔" (امید امیٹھوی ۔ شیش محل)

"پڑھنے کا انداز عدم تشدد کے منافی ہے، آواز بلند ہے مگر اس کو بھی انتہائی بلندی پر پہنچانے کی کوشش فرماتے ہیں۔ بیٹھ کر پڑھ رہے ہوں تو ہر وقت کھڑے ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسٹیج پر تشریف فرما ہیں۔ پڑھتے ترنم سے ہیں، مگر کچھ الفاظ دانتوں میں اور کچھ ناک میں آکر اپنی ساخت بدل دیتے ہیں۔ مثلاً آپ کا مصرع ہے ؎

موت تک اُلٹ دیتی ہے نقاب ہستی

اس کو آپ پڑھیں گے ؎

موت تک ووٹ دیں گی نقا بنیں ہستی (بسمل الہ آبادی ۔ شیش محل)

[illegible] زیادہ پسند [illegible] کے بارے میں [illegible] ۔ قاعدہ بے قاعدہ

مولانا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] (قاعدہ بے قاعدہ)

ابھی ہم نے کہا تھا کہ شوکت تھانوی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] خصوصیت [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] شوکت [illegible] شخصیت نگاری [illegible] [illegible] [illegible] خصوصیت [illegible] وقت [illegible] [illegible] [illegible] شوکت [illegible] شاعر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
احسان دانش کے متعلق لکھتے ہیں :-

" جب میں غزل بھی [illegible] ہے تا کہ [illegible] [illegible] رہے ۔

اکبر حیدری کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

" سیماب صاحب اور اکبر حیدری صاحب میں [illegible] کا تبادلہ خیال ہو رہا تھا ۔ ۔ حضرت [illegible] دونوں خاموش تماشائی تھے اس لیے کہ [illegible] تھے ۔"

تاج صاحب کے متعلق لکھا ہے :-

" [illegible] ان کا نام ہے اور [illegible] تخلص مگر شعر نہیں کہتے تاکہ تخلص خرچ نہ ہو جائے اور تخلص اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ دنیا کا کیا بھروسا جانے کب شعر کہنا پڑ جائیں " (قاعدہ بے قاعدہ)

پطرس کے متعلق لکھا ہے :-

" یہ اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں مگر مزاح نگاری نہیں کرتے تاکہ لوگ ترسیں اور اردو زبان خدانخواستہ ترقی نہ کر جائے کہ وہ انگریزی زبان بھی منہ دیکھتی رہ جائے جس کے وہ [illegible] [illegible]
(قاعدہ بے قاعدہ)

کرشن چندر [illegible] واجبی سے آدمی ہیں کہ وہ :-

" لکھتے زیادہ ہیں اور ورزش کم کرتے ہیں "

ن ۔ م ۔ راشد پہلے بہت اچھی غزلیں کہتے تھے :-

"پھر جب اُن کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اور شاعر بھی اچھی غزلیں نہ لکھنے لگیں تو باقی شاعروں کو بھگانے کے لیے کچھ آزاد نظمیں بھی کہہ ڈالیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب آزاد نظمیں کہنے لگے۔" (قاعدہ صفحہ ۱۵۲)

شوکت تھانوی کے لکھے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے یہ خاکے شوکت تھانوی کے اسلوب مزاح کی جملہ خصوصیات کے حامل ہونے کی وجہ سے پڑھنے والے کی تفریح اور انبساط کے بے شمار سامان مہیا کرتے ہیں۔ تفریح اور انبساط کا سرمایہ ایک طرف تو سیدھی سادی بامحاورہ سلیس اور صاف و شستہ نثر کی وجہ سے مہیا ہوتا ہے، دوسرے الفاظ کی اس بازی گری سے جس میں شوکت کو مہارت حاصل ہے اور جس کی مثالیں اُن کے خاکوں کے متن سے نمونے بھی پیش کیے گئے۔ لیکن زبان و بیان کے لطف کے علاوہ ان خاکوں کی ایک تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اہمیت بھی ہے۔ ان خاکوں سے بہ حیثیت مجموعی ہمارے معاشرے کے ایک خاص دور کا تہذیبی کردار ابھرتا ہے۔ اور ادیبوں اور شاعروں کے متعلق ہم جو کچھ پڑھتے ہیں اُس میں ایسی بہت سی اخلاقی اور معاشرتی قدروں کا رچاؤ نظر آتا ہے، جو رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہیں۔ شاعروں کے لطائف و ظرائف کے یہ مرقعے حقیقت میں ان شاعروں کے تہذیبی طرزِ فکر اور طرزِ حس کے دلکش مرقعے ہیں، جن کی تکمیل ایک طرف خود ان تمام ادیبوں اور شاعروں کے ذکر سے ہوئی ہے جو ان خاکوں کا موضوع ہیں اور دوسری طرف ان کے مصنف کے رنگِ طبیعت سے جس نے ان کرداروں کے تہذیبی مزاج کو اپنے مزاج میں جذب کر کے یہ زندہ رہنے والی تصویریں بنائی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان تصویروں میں سے بعض ادھوری اور نامکمل ہیں اور بعض رنگ اور نقش یا بہت ہلکے ہیں یا بہت تیز اور شوخ، اور رنگوں کا یہ فرق مصنف کے ذاتی مراسم کے رنگ کا پیدا کیا ہوا ہے۔

میرے نزدیک ان خاکوں کی ایک اہم خصوصیت اُن کا وہ خلوص اور دیانتداری ہے جس کی بنا پر انھیں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس لیے ان میں کہیں کہیں قصیدے اور ہجو کا جو رنگ پیدا ہو گیا ہے اُس سے قطع نظر ان کے مطالعے سے ادیبوں اور شاعروں کی عظمت کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور ان کی بعض کمزوریوں کا اظہار بھی ہوتا ہے، اور اچھائیوں اور برائیوں کا یہ امتزاج انھیں مافوق الفطرت ہونے سے بچا لیتا ہے —— وہ شاعر اور ادیب ہوتے ہوئے بھی انسان ہیں، جو اشرف المخلوقات ہو کر بھی خطا و نسیان کا مرکب اور مجموعہ ہے۔

منتخب مضامین

([illegible])

اپنے مضامین اپنی نظر میں

شوکت تھانوی

اپنے مضامین کو میں نے مختلف حیثیتوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مثلاً ذہنی، فنی، [illegible] سوانحی اور [illegible] تقسیم ہی یہ ہے کہ جب تک میں خود ان پر روشنی نہ ڈالوں، ان کی حیثیت [illegible] لگا کرتا ہے۔ لہٰذا سب سے ضروری یہ ہے کہ میں اپنی [illegible] کا مفہوم خود بیان کروں۔

فرمائشی مضامین بہت مجبوری [illegible] مضامین ہوتے ہیں جو کسی عنوان دے کر کسی مضمون سے [illegible] بعض اوقات مضمون کا نہایت تفصیلی خاکہ دے کر لکھوائے جاتے ہیں۔ کہ یہ مضمون [illegible] لکھ دیجئے۔ گویا مضمون تو لکھا ہوتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کو [illegible] طرح قبول کرکے اس مضمون کو اپنا نام دے دوں۔ پھر وہ خود ہی کیوں نہ لکھ لیا کریں۔ اب مثلاً میں نے ایک مضمون لکھا سودیشی ریل جو کسی رسالہ میں چھپ گیا [illegible] کے ایڈیٹر صاحب کی [illegible] یا تو ان کا نہایت تفصیلی خط آئے گا یا اگر مضافاتی قصبہ ہوا تو وہ خود نہایت تفصیلی طور پر تشریف لے آئیں گے کہ صاحب ایسا مضمون آپ پھر کبھی لکھ دیں۔ مثلاً دیکھئے نا کتنا اچھا موضوع ہے سودیشی ڈاکخانہ۔ اس مضمون کو اگر آپ اس طرح لکھیں کہ مثلاً آپ کوئی پارسل لے کر ڈاکخانے گئے ہیں اور وہاں پارسل کلرک آپ سے کہہ رہا ہے کہ وزن تو اس کا اتنا ہے مگر کہئے تو رعایت کر دوں اور جب آپ اس پارسل کے ٹکٹ خریدتے ہیں تو ایک ایک کرکے تول تول کر دیتا ہے اور پھر بمشکل تمام آپ کو بارہ آنے کا ٹکٹ مل جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بڑی گنجائش ہے اس موضوع میں۔ عرض کیا ان سے کہ "بندہ نواز آخر آپ خود ہی کیوں نہیں لکھ لیتے۔" اپنے نزدیک وہ اس کو بھی لطیفہ سمجھ کر ہنسے تو خوب ہنسے پھر جب اس لطیفے سے لطف اندوز ہو چکے تو بڑی کسر نفسی سے فرمایا کہ میں لکھ سکتا تو آپ سے کیوں عرض کرتا۔

اب ان کو بتانا پڑا کہ وہ لکھ چکے ہیں ان کو سمجھاتے ہوئے عرض کیا۔

"دیکھئے نا جو کچھ آپ نے تجویز کی صورت میں اس مضمون کا خاکہ بنایا ہے۔ وہی دراصل مضمون ہے۔ بس اسی کو آپ لکھ دیجئے۔ میں اس لیے قاصر ہوں کہ میں اب آخر اس میں کیا لکھوں گا۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی اور یہاں مصیبت یہ کہ مگر اپنا اخلاق کے حدود سے بھی نہ گزر سکتے تھے۔ مگر جب عاجز ہی آ گئے تو کہنا پڑا حضور والا آپ تو مضمون کا موضوع اس طرح لے کر آ گئے ہیں۔ جیسے کسی درزی کے یہاں کوئی شخص اپنا کپڑا اور اپنی جسامت لے کر پہنچ جاتا ہے کہ یہ کپڑا اس جسم کے لیے سی دو۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ پہلے گھر تشریف لے جائیے اور اطمینان سے بیٹھ کر درزی اور انشاپردازی میں جو لطیف سا فرق ہے۔ اس کو محسوس کرنے کی کوشش کیجئے۔

اس فرمائشی مضمون سے بظاہر یوں نجات مل گئی مگر دوسرے دن معلوم ہوا۔ اس نے فہمائش صورت اختیار کر لی ہے یعنی یہی حضرت ایک ایسے بزرگ محترم کے غصے کر پہنچ گئے جن کے اختیار میں اور کچھ نہ سہی تو یہ تو تھا ہی کہ اگر ناراض ہو جائیں تو والد صاحب کو لکھ بھیجیں کہ آپ کے صاحبزادے سخت نالائق ہیں اور ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ میں اپنی لڑکی کی قسمت ان سے جوڑوں حالانکہ بڑے پیار سے خط لکھا گیا تھا اور بڑی شفقت برس رہی تھی۔ اس خط کے ہر حرف سے اور ہر لفظ سے۔ مگر اس محبت اور اس شفقت کا نتیجہ ہوتا کہ انجام بھی تو نظر کے سامنے تھا کہ اب انکار کر کے دیکھ لیا ہوتا ہے۔ ہوتا کیا! ہوا یہی کہ ان حضرات کے لکھائے ہوئے مضمون پر گویا اپنا نام لکھ دیا اور اب قدم دنیا سے جواب دہی کرتے پھر رہے ہیں کہ یہ آخر کیا۔ پڑی تھی کہ سودیشی دل سے جو یہ حماقت کر بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک کو تو نہیں سمجھایا جا سکتا کہ یہ حماقت کن راستوں سے گزر کر اپنے پاس آئی تھی۔ اور وہ اب سب سمجھے کہ اس کو اخلاص ہی تھا۔

اس قسم کے فہمائشی مضامین اکثر لکھنا پڑتے ہیں۔ اس لیے کہ عزت آبرو بڑی چیز ہے۔ ورنہ نہ لکھنے کی صورت میں یہی چیز خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ تعلقات کے انقطاع کی دھمکی دی جاتی ہے۔ دوستی کے دشمنی میں تبدیل ہو جانے کا خطرہ سامنے آ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اپنا نام اگر نہ بھیجا ہے تو ٹوپی اچھالنے کی اجازت دیجیے۔ مگر اس فہمائشی سلسلہ کی سب سے خطرناک صورت حال ہی میں ایک دوست نے پیدا کی ہے کہ پہلے تو وہ نہایت شرافت اور انسانیت کے ساتھ فرمائشی خطوط لکھتے رہے مگر جب کامیاب نہ ہوئے تو ایک فہمائشی خط اس مضمون کا لکھ بھیجا کہ حضرت اگر آپ نے اب بھی مضمون نہ بھیجا تو میں ایک ایسا مضمون لکھ کر آپ کے نام سے چھاپ دوں گا جس میں وہ تمام کمزوریاں ہوں گی جن کے آپ متحمل نہ ہو سکیں گے۔ کوشش کروں گا کہ املا کی بھی غلطیاں ہوں، انشا کی بھی ہوں، مذاق اور بدمذاقی کا امتیاز اٹھ جائے اور جس کو آپ مزاح لطیف کہتے ہیں وہ پھکڑ بن کر آپ کے نام سے اس طرح مرتب ہو جائے کہ آپ کو مزاح نگار سمجھنے والے [illegible] تسلیم کر کے فاتحہ پڑھ دیں۔ ظاہر ہے کہ اس فہمائش کے بعد کچھ نہ لکھنا خواہ مخواہ اپنے کو خطرے میں ڈالنا تھا لہٰذا لکھا ان کے لیے اور جو کچھ لکھا اس کو آج کل فہمائشی مضامین کے ذیل میں لکھے ہوئے ہیں۔

نمائشی مضامین سے مراد ان مضامین سے ہے جو رسائل اور اخبارات کے نمائشی نمبروں کے لیے لکھنا پڑتے ہیں۔ یہ مضامین بنیادی طور پر فرمائشی اور دوسرے درجہ پر فہمائشی ہوتے ہیں۔ یعنی ان کی فرمائش بھی کی جاتی ہے اور اگر وہ رسالہ یا اخبار کا خاص نمبر نکلنے کے سلسلہ میں جانبر ہو جائے تو کچھ نہ کچھ معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔ جب کہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ ہمارے رسائل اور اخبارات عام نمبر نکالنے سے گھبراتے ہیں اور خاص نمبر نکالنے کے بہانے ڈھونڈھا کرتے ہیں پہلے یہ جریدے اپنے سالانہ نمبر نکالا کرتے تھے۔ یا ایسا ہی کوئی اولوالعزم رسالہ ہوا، تو اس نے اپنا سالگرہ نمبر نکالنے کے علاوہ ایک نصف سالگرہ نمبر بھی نکال دیا۔ مگر اب عام نمبر خاص خاص موقعوں پر نکلتے ہیں۔ خاص نمبر تو نکلتے ہی رہتے ہیں۔ مثلاً اقبال نمبر، آزادی نمبر، قائداعظم نمبر، عید نمبر، بقرعید نمبر، میلاد نمبر، اردو نمبر اور خدا جانے کون کون نمبر۔ ان نمبروں کے لیے اگر آدمی لکھنے بیٹھے تو زندگی کی مہلتیں اس کو نہایت مختصر محسوس ہوں، مگر پھر بھی لکھنا ہی پڑتا ہے۔ سب اخباروں اور سب رسالوں کے لیے تو خیر ناممکن ہے لکھنا مگر چند کے لیے تو لکھنا ہی پڑتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اخبارات اور رسائل کی تعداد حد و شمار سے باہر ہے۔ اور یہ سب بے شمار اخبار اور رسالے بے شمار خاص نمبر نکالتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ تین عزیز قریب ایک قسم کے رسالے یعنی اقبال نمبر نکال رہے تھے۔ اس لیے تینوں کے لیے مضامین لکھنا از بس ضروری تھا۔ ایسا ضروری کہ زندگی اور موت کی قسم کا سوال آ پڑا تھا یعنی لکھیں تو خود مریں اور نہ لکھیں تو یقین یہ دلایا گیا تھا کہ لکھوانے والے خودکشی کر لیں گے لہٰذا

یہ مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ [illegible] اور [illegible] ایک [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible] مضمون [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اب [illegible] مضمون [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہیں [illegible] [illegible] ہے۔

[illegible] میں [illegible] مضامین [illegible] [illegible] [illegible] ہیں۔ [illegible] [illegible] [illegible] ہیں۔

اب [illegible] مضامین [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] یہ مضامین وہ ہیں جو [illegible] رسائل اور اخبارات [illegible] [illegible] معاشی [illegible] [illegible] معاوضہ دیتے ہیں [illegible] [illegible] [illegible] یہ لکھتے ہیں کہ ——

کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ اب اگر ان مضامین پر دل سوزی برتی جائیں تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی۔ جو مضامین اس معاوضت پر لکھے جائیں کہ جتنا گڑ ڈالیے اتنا ہی میٹھا ہوگا۔ ان مضامین کو ادبی معیار پر جانچنا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ ان مضامین کے لکھتے وقت [illegible] کس قسم کے خیالات کی [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] قلم [illegible] مضمون [illegible] سوچ رہا ہے کہ جب اس کا [illegible] ملے گا تو ایک تو [illegible] قسم کا سگریٹ کیس اور اس پر خواہش کہ اپنا [illegible] کا رعب [illegible] کے سامنے سگریٹ نکال کر پیش کریں۔ تو وہ بھی مرعوب ہو جائے۔ اس قسم کی چیزیں آدمی کو خواہ مخواہ جاری جرم کر بندی ہیں۔ سگریٹ [illegible] ایک ہی ہو مگر سگریٹ کیس اگر شاندار ہے تو رعب پڑے بغیر نہیں رہتا۔ قلم چل رہا ہے اور دماغ میں ایک دوسرا خیال ہے۔ گھڑی کہ سگریٹ کیس زیادہ ضروری ہے یا گھڑی۔ دوسروں سے وقت پوچھنا بڑے شرم کی بات ہے۔ یہ [illegible] توضیح اوقات خود اپنے پاس ہونا چاہیئے۔ زیور کا زیور اور مصیبت وقت ایک خود بھی کام کی چیز ہے۔ قلم چل رہا ہے اور دماغ میں ایک تیسرا خیال آیا کہ اس مضمون کا معاوضہ ملتے ہی سب سے پہلے دھوبی کا حساب چکانا چاہیئے ورنہ یہ ساری سفید پوشی کسی دن دھری رہ جائے گی۔ راستے پڑے دیکھے وہ نہایت بے ادبی کے ساتھ تقاضے بھی کرنے لگتا ہے کسی دن کپڑے ہی نہ مارے۔ انہی خیالات میں مضمون مکمل ہو جاتا ہے اور معاوضہ مل جاتا ہے۔ مگر قیامت یہ ہے کہ ان مضامین کو بھی لوگ تنقیدی نظر سے پڑھتے ہیں۔ اب ان کو کیسے سمجھایا جائے کہ صاحب! اس قسم کی تنقید آخر آپ ترکاریوں پر کیوں نہیں کرتے جو بازار میں بکنے کے لیے ڈھیر ہوتی ہے۔ اس قسم کی تنقید آخر آپ کسی کباڑیئے کے نیلامی فرنیچر پر کیوں نہیں کرتے۔ آخر یہ بھی تو بکاؤ مال ہے۔

فرمائشی، نمائشی اور معاشی کے علاوہ مضامین کی ایک اور بھی قسم ہے یعنی آزمائشی۔ اس قسم کا میں نے اس لیے ذکر نہیں کیا ہے کہ ان مضامین سے میں ہمیشہ بھاگا ہوں اور اب تک خدا نے مجھ کو مضامین کی اس قسم سے بچایا ہے۔ یہ وہ مقابلے کے مضامین ہوتے ہیں جن کے اعلان کبھی سرکاری طور پر اور کبھی نجی طور پر اخبارات میں چھپتے ہیں کہ اس موضوع پر بہترین مضمون لکھنے والے کو پہلا انعام اتنا اور دوسرا

اتنا اور تیسرا اتنا دیا جائے گا۔ اور یہ کچھ نہیں کہا جاتا کہ چوتھے نمبر پر آنے والے کو اور اس سے بھی بدترین پوزیشن حاصل کرنے والوں کو کیا کیا سزائیں دی جائیں گی۔ بس اعلان یہ ہوتا ہے کہ مضمون آٹھ صفحات کا ہو خواہ وہ چاول پر "قل ہو اللہ" لکھنے والے ہوں یا آپ سائن بورڈ کے خطاط وہ آٹھ صفحے بھر دیں۔ فیصلہ کرنے والوں یعنی ججوں کا اعلان ہو جاتا ہے نیز آخری تاریخ کا بھی۔

پھر دوسری احتیاطیں نہ کاغذ کے صرف ایک طرف لکھئے۔ بائیں ہاتھ میں قلم پکڑ کر نہ لکھئے اور اگر آپ کا بایاں ہاتھ ہی داہنا ہو تو داہنے ہاتھ سے جو آپ کا بایاں ہو قطعی پرہیز کریں۔ میں اس جھگڑے میں قطعی نہیں پڑا اور یہ بھی اتفاق ہے کہ انعام کی بڑی سے بڑی رقم بھی مجھ کو اس طرف متوجہ نہ کر سکی۔ اس لیے کہ میرا ہاتھ دیکھ کر فراست الید کا ایک ماہر یہ بات پہلے ہی بتا چکا ہے کہ تم کو کسی لاٹری، کسی معمہ اور اس قسم کے کسی مقابلے کا انعام کبھی نہ ملے گا۔ رہ گئی اب ایک آخری قسم یعنی پیدائشی مضامین کی۔ یہ مضامین وہ ہیں جن کے متعلق مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ ؏

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

یہ مضامین وہ ہیں جن میں خود اپنے لیے لکھتا ہوں اور آپ سے زیادہ خود ہی خوش ہوتا ہوں۔ خود لکھتا ہوں اور خود ہی اپنے کو سناتا ہوں خود ہی اپنے کو داد دیتا ہوں اور خود ہی کسر نفسی سے اس داد کو وصول کرتا ہوں۔ کہ میں کس قابل ہوں۔ مگر اس قسم کے مضامین بہت کم ہوتے ہیں۔ لوگ میرے مضمون "سودیشی ریل" کو لے اڑے اور میں محض اس خیال سے چپ ہو رہا کہ غیبت نہ لگ جائے۔ اب اپنا مضمون شاہین بچے مجھ کو سودیشی ریل سے کہیں زیادہ پسند ہے اس لیے کہ اقبالیات لکھ کر مجھ کو وہ مسرت اور اطمینان حاصل نہیں ہوا جو خوشی شاہین بچے لکھ کر حاصل ہوئی۔ اسی طرح بے شمار ایسے مضامین ہیں جن کو دوسرے پسند کرتے ہیں۔ مگر میں ان کو اتنا پسند نہیں کرتا۔

اب اگر مجھ کو غم روزگار اور فکر معاش دونوں سے آزاد کر کے خود اپنے مضامین پر نظر ڈالنے کا موقع دیا جائے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت ہی کم سخت جان مضامین ایسے نکلیں گے جن کو میں باقی چھوڑ دوں۔ باقی سب ردی کی ٹوکری میں نظر آئیں گے۔ لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ مجھ کو اس طرف متوجہ نہ کیجئے اور میرے مضامین کو میری نظر بد سے بچائیے۔

سودیشی ریل

دن بھر کے تھکے ماندے بھی تھے اور رات کو سفر بھی درپیش تھا مگر جلسے کے نعروں پر کان کھڑے کر لینا ہماری ہمیشہ کی عادت ہے اور ان نعروں کو بھی یہ سمجھے رہنا چاہیے جو عمل بھی ہوتا تھا۔ جب کسی منزل کی عمارت پر [illegible] کوئی مجبوری ہو مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے، اور اپنی طرف بڑی کشاں کشاں کھینچ کر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ حقہ کا نیچہ اور صراحیاں ایک دکان پر پیر یار کر کے کہہ دیا کہ " بھائی ابھی آتے ہیں " اور سیدھے میدان میں گھس گئے جہاں ایک صاحب جو صورت سے بیرسٹر معلوم ہوتے تھے یعنی سر پر گاڑھے کی گاندھی کیپ، داڑھی مونچھ سے صاف، ایک لمبا سا کھدر کا کرتہ، ٹانگوں میں بھی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے ہوئے تھے، ایک ہاتھ کو اپنی پشت پر رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بید کو حرکت دیتا ہے۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا۔ اس لیے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے، کبھی مغرب کی طرف اور کبھی کبھی ایک دم سے پیچھے کو مڑ جاتے تھے۔ بہرحال فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف تھے یا سامنے، اس لیے مشکل تھا کہ ان کو خود قرار نہیں تھا۔ وہ تخت پر کھڑے ہوئے وہ گھوم رہے تھے مجمع کے وسط میں تھا اور تمام مجمع کا رخ تخت کی طرف، کبھی کسی کی طرف منہ کبھی کسی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا اور اسی طرح ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف، کبھی دور کی آواز کی طرح اور کبھی بالکل نہیں ہمارے کانوں میں آ رہے تھے۔ ہاں ایک بات یہ تھی کہ ہماری طرف کے لوگ تالی بجانے میں آگے وقت اور مجمع کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے ہم تقریر سننے کے معاملے میں ذرا گھاٹے میں تھے۔ پھر بھی جو کچھ سنا وہ بہت کافی تھا اس لیے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں کبھی اردو میں، کبھی نثر میں، کبھی نظم میں، کبھی ہنس کر، کبھی چیخ کر، کبھی ادھر مڑ کر، کبھی ادھر گھوم کر وہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم نے سن لیے تھے:-

بھائیو! اب وہ وقت نہیں ہے کہ ریزولیوشن پاس ہوں اور رہ جائیں ......
تجاویز منظور ہوں اور شرمندۂ عمل نہ ہوں ...... سرگرمیاں ...... اب بیدار
ہو جاؤ ...... ہوشیار رہو ...... کہ تم کو ...... ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے
بعد اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے ...... اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے

. . دوسری طرف گھوم گئے) خواب غفلت سے بیداری کا وقت . . ہے

ہے . . . اور دوال نم . . . . برٹش گورنمنٹ . . . سوراج سورج

مرغو . لمتر . . . (دہیرز کے بعد تقریر ختم)

دو گھنٹے میں ہم نے حرف بہ حرف سنا اور سمجھ لیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا غالباً اس سے زیادہ انھوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی ہو تو ہم کیا کریں۔ ہمارے سبق ہی بس یہ تھا کہ ۳۱ دسمبر کو سوراج ملے گا۔ ہم اسی خیال میں مخلوق مجمع کو دھکیلتے خود دھکے کھاتے کسی طرح باہر نکل آئے۔ وہاں پر سے گھر کا یکہ لیا مگر جان ایسی پرواہ بے پرواہ کہ چلے گئے اسباب باندھا کھانا کھایا حقہ بھرا آرام کرسی پر بیٹھ کر شوق فرمانے لگے گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے اس لیے اطمینان بھی نصیب تھا مگر احتیاطاً شیروانی نہیں اتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے گا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

لیکن کا خیال اور ۳۱ دسمبر کے بعد سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کے لیے ۳۱ دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے۔ اگر آج ۳۱ دسمبر ہوتی تو ہم اپنی ریل پر سفر کرتے نہ مدراس کا رڈ نہ خانہ خالی نہ اینگلو انڈین کا علیحدہ درجہ ہوتا۔ ہم خود ریل کے مالک ہوتے جہاں جی چاہتا بیٹھتے جہاں جی چاہے فرسٹ میں ہم سے کوئی کچھ کہنے والا نہ ہوتا۔ ہم خود فرسٹ میں بیٹھتے اور انگریزوں کو تھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوتے سفر کرتے ہم یہ سوچ رہے تھے کہ یکایک ہمارے کان میں پھر وہی 'بندے ماترم' کی آواز آئی اور ہم ایسے ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے فوراً باہر نکلے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک زبردست جلوس جھنڈیوں اور تختیوں سے سجا ہوا 'بندے ماترم' کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ہلاتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گزر رہا ہے ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ "بھائی یہ کیا ہے؟" جواب ملا "کیا سو رہے تھے، خبر نہیں کہ سوراج مل گیا" ہم نے بڑا سا منہ کھول کر کہا "سوراج؟" جواب ملا "جی سوراج، سوراج!" ہم نے اپنے دل میں کہا کہ "واہ بھئی واہ! دعا تو قبول ہوئی ہماری اور سوراج مل گیا ان لوگوں کو" ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی۔ پھر سوچا کہ ہم اور یہ لوگ کچھ غیر تھوڑی ہیں۔ ان کو ملا یا ہم کو ایک ہی بات ہے مگر واللہ کمال ہوا کہ سوراج مل گیا۔ دل کو کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سوراج مل گیا ہوگا ساتھ ابھی تک جلوس نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جب جلوس کی طرف نظر پڑ جاتی تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا اور جب سوراج ملنے پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے۔ لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج ملنے کی خوشخبری سنائی تو شک دور ہوا اور ایک آزادانہ و خود مختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا۔ ابھی ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹہ نے ٹن ٹن کرکے دس بجا دیے یعنی ہم کو فوراً اسٹیشن چلے جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لیے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہنچ کر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"بابو جی! ایک کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجیے۔"

بابو جی نے جلدی [illegible] ٹکٹ [illegible] سمجھے تو برا گھور کر پھر بڑے اطمینان سے بیٹھ گئے۔

"ایک بات کہدیں اصل قیمت؟"

"تم کیا ہم سے مذاق کرتے ہو [illegible] ہم جس [illegible]"

"جناب سچ کہہ [illegible] روپیہ [illegible]"

اب قیمت [illegible] زیادہ [illegible]

"جناب [illegible] ایک روپیہ [illegible] آپ [illegible] مجھے پہلا ٹکٹ چاہئے کا پہلا سیکنڈ کلاس:"

بابو جی نے فرمایا [illegible]

صاحب والا! ہم [illegible] سمجھا ہے کہ آپ کو پہلا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہئے [illegible] کم [illegible] یہی چاہئے [illegible]

ہم : ۔ مگر بابو صاحب! ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ [illegible] آج یہ ہو گیا۔ کب سے بڑھ گیا؟

بابو : ۔ کل کی بات ہے [illegible] سرکار [illegible] لگایا ہے۔

ہم : ۔ پہلے کہہ رہے تھے [illegible] ٹکٹ [illegible] چھوٹ [illegible]

بابو : ۔ [illegible] آپ کی بات [illegible] ٹکٹ لے لیجئے۔

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر ہم کو ہنسی تو آتی تھی [illegible] ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی۔ ٹکٹ [illegible] آخرکار ہم نے طے کر لیا کہ [illegible] ٹکٹ [illegible] کر بکنگ آفس سے چلنے لگے۔ ہم کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی۔

"سنئے تو جناب! ٹھہریئے تو جناب! دیکھئے تو جناب! اچھا دو روپے دے دیجئے۔ [illegible] ایک روپیہ [illegible] ۲۰ بھی نہ دیجئے گا! اچھا آپ ہی کیا کہیں گے۔ لیجئے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ کم نہیں کر سکتے۔ ہمارا نقصان ہو رہا ہے"

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور [illegible] چڑھا کر [illegible] کہہ دیا۔ "ایک روپیہ دیں گے۔ ایک روپیہ کر دینا ہو تو دے دو۔"

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے مگر واللہ کمال کیا انہوں نے کہ گردن جھکا کر [illegible] آمادگی ظاہر کی۔

"لائیے صاحب لائیے۔ بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے۔"

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا لیکن وہ ٹکٹ ریل کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس پر تاریخ پڑی ہوئی تھی اور نہ اس پر کچھ چھپا ہوا تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر "[illegible] ٹو کانپور" لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی جو غالباً ان کے دستخط تھے۔ ہم نے ٹکٹ کو ادھر سے دیکھا ادھر سے دیکھا اور دو تین مرتبہ غور سے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ بابو صاحب بھی غالباً قیافہ شناس تھے۔ ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسم ہو کر کہنے لگے "جناب والا! رات کو [illegible]

ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں وہ دو دنوں میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب آپ تو سفر کیجیے اب آپ سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

بابو صاحب سے تسلی ہو گئی مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ تھی نہ کرایہ نہ فاصلہ اور فاصلہ ہوتا کہاں سے انہوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ سمجھ کر کہ بارہ روپیہ گیا یا ہم تیرہ آنے کے نفع میں رہے اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے اور شاید زندہ کر کے ٹانگ دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی وہی گھڑیاں مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ سامنے کے ٹھیلے پر پان والا اپنی دکان سجائے بیٹھا تھا۔ قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل تک پہنچائیں۔ بمشکل تمام ایک قلی ملا لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اٹھانے کو کہا فوراً خفا ہو کر جواب دیا۔

"اندھے ہو گئے ہو؟ دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر!"

"معاف کیجیے گا غلطی ہوئی" کہہ کر پورے پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ یا اللہ! یہ کیا انقلاب ہے۔ پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے۔ اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو پھر قلی کس صورت کا ہوگا؟ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اٹھایا اور دو مرتبہ کر کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ اسباب قرینے سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہیے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور۔ سب سے پہلے تو ہم نے انہی حضرت سے پوچھا جو ہمارے ڈبے میں تشریف فرما تھے لیکن انہوں نے صرف یہ جواب دیا "بالی بھیا ہم کا ناہیں مالوم۔" یہ خالص سودیشی ریل کے سیکنڈ کلاس کے خاص پسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائے گی۔ اسی لیے اب تک ابھی نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف۔" ہم نے گھبرا کر پوچھا۔

"لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا؟"

جواب ملا کہ "جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے۔"

ہم نے پھر پوچھا: "لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا؟"

جواب ملا کہ "ہو جایا کرے جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے؟ کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟"

اب ہم بالکل راضی بہ رضا ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس انتظام کو برا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دعا تھی۔ اچھا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا جس کی اب کوئی امید بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ غرضیکہ کبھی اپنے ڈبے میں بیٹھ کر، کبھی لوٹے میں پانی لا کر، کبھی پلیٹ فارم پر ٹہل کر، کبھی انجن کو مشرق اور مغرب کی سمت حد نظر تک ڈھونڈھ کر، کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹنے لگے۔

[illegible] ایک ایک سے دو دو [illegible] گاڑی کی [illegible] اپنی جگہ سے [illegible] رہے تھے۔ [illegible]
بس آدمی نے [illegible] شروع کیا۔

[illegible] مسافر وہ گاڑی جاتی ہے۔

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف [illegible] طرف [illegible] ہم نے سنا کہ [illegible] گاڑی [illegible] نہیں تھا کہ وہ اسسٹنٹ اسٹیشن [illegible] بیٹھ گئے۔ [illegible] ہے لال [illegible] جاتی [illegible] ہم [illegible] میر صاحب [illegible] انہیں اسسٹنٹ اسٹیشن [illegible] جواب انہوں نے اپنی [illegible] ماہر ہیں۔ سب بھائی ہیں۔ سب [illegible] کے پیروکار ہیں۔ [illegible] کے فرق کو بھول جائیے۔ سب کو برابر سمجھئے۔ [illegible] جگہ نہ ملے گی۔ [illegible] اپنے ڈبے میں آگئے جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور [illegible] کھڑے کھڑے سفر ہوتا [illegible] کی بجائے اپنا ٹرنک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

مگر بیٹھے بیٹھے ہی ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا۔ گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر جب پلیٹ فارم پر آئے، دیکھا کہ [illegible] گاڑی میں شور مچا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کانپور ہی کی طرف جا رہا ہے یعنی [illegible] گھنٹے کے بعد بھی گاڑی جب [illegible]۔ چنانچہ ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے۔ وہ کانپور جائیں گے انہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آجائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی بلانے کے لیے گیا ہوا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا نہ جائیں۔ [illegible] صبر کرکے ارادہ ملتوی کر دیں، کام اشد ضروری تھا اس لیے جانا ضروری تھا۔ گاڑی چھوٹتی نہ تھی اس لیے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کشمکش میں جان تھی۔ معلوم نہیں وہ کونسا وقت تھا جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی۔ اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا اس لیے کہ کفرانِ نعمت کا الزام بھی تو ہم پر لگا دیا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے بندے ماترم کے فلک شگاف نعروں سے اچھل پڑے۔ معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے۔ ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دیئے جنہوں نے رات کو تقریر کرکے سوراج دلوا لیا تھا اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سیکرٹری ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرض ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی شوں شوں کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش زیبا بزرگوار لال اور سبز گارڈ کی جھنڈیاں لیے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر بیٹھ کر یہ سمجھا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے

غلطی سے شروع جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ "گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں مگر تمہارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔"

ڈرائیور نے بھی ان کے بے جا غصہ کا جواب کرارا کر دیا "جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں۔ میرا کیا قصور ہے۔ دو گھنٹہ سے فائرمین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا کہ ایک گھنٹہ میں جلدی سے آؤ۔ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ ریاست گنج کے چوراہے سے نہ لینا۔ عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا۔ دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتائیے میرا کیا قصور ہے۔" گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور پا کر چپ ہو گئے اور کوئلہ کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن بھی یہ بڑی بھدی بات ہے کہ وہ بغیر کوئلہ کے چل ہی نہیں سکتا۔ جس طرح گھوڑے کے لیے دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو تھوڑی دیر بھوکا بھی چل سکتا ہے مگر یہ اتنا بھی کام نہیں دے سکتا۔ اب بتائیے کہ ریل بھی تھی، انجن بھی، مسافر بھی تھے، گارڈ بھی، سیکرٹری صاحب [illegible] بھی آ گئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد فائرمین کوئلہ کی گٹھری لیے ہانپتا ہوا آ پہنچا۔

"آدھی رات کو کوئلہ ملتا کسے ہے۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک سیر نو آنہ میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔ راستہ بھر گرتا پڑا آیا۔ تمام گھٹنے چھل گئے۔ کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔"

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا۔ دو سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چل ہی رہی تھی کہ ایک شور ہوا "روکو۔ روکو گارڈ صاحب رہ گئے۔" گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی وہ فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہوگی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلا چلا کر پوچھنا شروع کیا "ارے لائن کلیئر بھی لے لیا تھا۔" ـــ "وہ ٹن کلیئر" ڈرائیور نے بھی چلا کر جواب دیا "لے لیا تھا۔ ـ لے لیا تھا۔" گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا "اچھا تو چھوڑو گاڑی میں سیٹی بجاتا ہوں۔" گاڑی پھر چلی۔ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس۔ اس لیے کہ اس کی رفتار سے زیادہ تیز شاید ہم خود چل لیتے اور اگر ابھی شرط بد کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک شریک سفر سے پوچھا "کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس۔" وہ پہلے ہی کچھ خفا بیٹھے تھے غالباً گاڑی پہ بھرے ہوں گے غصہ ہم پر اتارا اور جھڑک کر فرمانے لگے "میاں خدا کا شکر بھیجو کہ یہ گاڑی ہی ہے ورنہ تم میل ایکسپریس لیے پھر رہے ہوتے۔" ان کا جواب سن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی مگر سب سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے سٹے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے جاتے تھے اور گاڑی چھک چھک چل رہی تھی۔ اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پہ رکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ:۔

"جب تک میں نے سگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن میں گاڑی لانے کا حق کون تھا؟"

ڈرائیور:۔ جب آپ نے گاڑی آتے دیکھ لی تھی تو سگنل کیوں نہیں دیا؟

اسٹیشن ماسٹر:۔ ایک تو گاڑی دیر سے لایا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا، دوسرا ڈرائیور رکھ لوں گا جو مجھ سے

گاڑی کی [illegible] تو تماشا ہو جاتا۔ آدھی رات سب پر بھاری۔

ناظمہ۔ دیکھئے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے بات کیجئے۔ تو کیا آپ [illegible] سمجھ گئے۔ [illegible] سمجھنے والے ہیں ہم ان ہی کے تو ہیں۔ [illegible] گاڑی [illegible] اب اس [illegible] اٹھئے۔ دیکھیں یہ گاڑی کیا کہتی ہے۔

اسٹیشن ماسٹر۔ دیکھئے، صاحب منع کر چکے، [illegible] بات کہہ چکے۔ [illegible] بالکل نہیں۔ بیکار [illegible] ہے۔

گارڈ۔ جلدی بھی دو، [illegible] جانے بھی دو۔ ابھی [illegible] یہ تماشا ہو [illegible] ہٹ جاؤ۔ [illegible] سب [illegible] ہے۔ اسے [illegible] اسٹیشن [illegible] ہے۔

اسٹیشن ماسٹر نے [illegible] اور [illegible] اسٹیشن ماسٹر کھڑے [illegible] سب کے سب شروع کر دیئے اور تمام مسافر [illegible] کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں [illegible] اور [illegible] روشنی [illegible] لیا۔ ابھی [illegible] کہ [illegible] نے [illegible] گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

گارڈ صاحب! اے گارڈ صاحب! ادھر مال گاڑی چلی آ رہی ہے۔ [illegible] بس یہ حادثہ ہو گیا۔

گارڈ یہ سنتے ہی بدحواس ہو گیا اور چلانا شروع کر دیا۔

مسافرو جلدی اترو، گاڑی [illegible] ہے۔ گاڑی [illegible] ہے جلدی اترو۔

سب مسافر گھبرا کر اپنا اپنا اسباب لے کر [illegible] چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس گاڑی سے اس بری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے سر پر آ پڑا۔ میں ایک دم سے چونک پڑا۔ کھڑکی [illegible] میرے سر پر آ کر لگی تھی۔ [illegible] آرام کرسی بھی شبنم سے تر ہو گئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے کے قریب تھے۔ میں کرسی سے اٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا، اس لیے کہ اب گاڑی تو [illegible] چھوٹ چکی تھی۔ اب بھی کیا سکتا تھا سوائے [illegible] کے۔

شاہین بچے

یہ میرے یہاں خدا کے فضل سے تین شاہین بچے ہیں جو آپ کی دعا سے خاکبازی کی تعلیم حاصل کرنے میں شب و روز مصروف ہیں اور اگر سچ پوچھیے تو میں خداوندان مکتب کا ممنون احسان ہوں کہ وہ ان شاہین بچوں کو یہی یقین دلاتے رہتے ہیں کہ وہ ہوئے ہیں جس طرح اللہ آمین سے۔ ان کو پروان چڑھا کر مکتب جانے کے قابل بنا لیا ہے۔ ایسے مکتب میں ان کے لیے بسم اللہ کا گنبد بنا ہوا ہے۔ جہاں ان کو خود اڑنا نہیں سکھایا جاتا۔ بلکہ پروں کی گیند اچھالنا سکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ میرے شاہین بچے جب سکول سے آتے ہیں۔ تو ایک ساتھ مل کر دن ڈھلے تک بیڈمنٹن کھیلا کرتے ہیں۔ اور وہ پروں والی گیند ان کے درمیان اچھلا کرتی ہے۔ جب تمام شٹل کاک خراب ہو جاتے ہیں۔ تو ان شاہین بچوں کی ماں مجھ سے کہتی ہے کہ ــ

پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

اور میں تو اسی دن ایک درجن شٹل کاک بازار جا کر خرید لاتا ہوں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ شاہین بچے نہایت محفوظ قسم کا کھیل کھیلتے ہیں۔ جس میں نہ کوئی جان جوکھم کا معاملہ ہے۔ نہ منہ ٹوٹنے اور سر پھوٹنے کا کوئی اندیشہ۔ اگر بارش ہوگی۔ اور پروں والی گیند کی پرواز میں کوتاہی واقع ہوگی۔ تو یہ شاہین بچے ایک بڑی سی میز پر جال تان کر چھوٹی چھوٹی تھاپیوں سے سلولائڈ کی ہلکی پھلکی گیند سے ٹیبل ٹینس کھیلتے ہیں۔ جس کو وہ پنگ پانگ کہتے ہیں۔ یہ کھیل بھی کچھ خطرناک نہیں ہے۔ کہ چوٹ چپیٹ کا اندیشہ ہو۔ یا مثلاً کیرم ہے۔ یہ بھی محفوظ قسم کا کھیل ہے کہ انگلی ذرا بچا کر اسٹرائکر چلایا جائے۔ تو کسی قسم کے گزند کا امکان نہیں۔ بڑا شاہین بچہ چونکہ کالج میں پڑھتا ہے لہذا وہ کبھی کبھی بیرڈ کھیلنے بھی چلا جاتا ہے۔ یا اپنے احباب کو بلا کر جو اتفاق سے سب کے سب شاہین بچے ہیں۔ تاش وغیرہ کھیل لیتا ہے۔ اس میں نقصان مایہ تو ہے۔ بلکہ شماتت ہمسایہ بھی ہے۔ مگر یہی کیا کم ہے۔ کہ زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جان کا صدقہ مال ہے۔ لہذا میں اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ وہ برج اور پوکر وغیرہ کھیل کر کچھ ہار جاتا ہے مگر ہاکی اور کرکٹ قسم کے خطرناک کھیل تو نہیں کھیلتا۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ قمار بازی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہی کیا کم ہے۔ کہ کوئی جان کی بازی نہ لگائے۔ جب تک میں

[illegible] ہی قسم کی [illegible] ہے۔ اس کے بعد [illegible] کے مطالب [illegible]
طرح عمل کر سکیں۔

میں سمجھتا ہوں زمانے کی عام فضا میں ان شاہین بچوں کے [illegible] والی [illegible] میں [illegible] کر [illegible] ہوں [illegible] جب [illegible] شاہین بچوں کے [illegible] کرنا [illegible] سے بھی کہتا ہوں [illegible]

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور ان کو [illegible] ہوں اگر وہ کہتے بھی ہیں کہ آپ نہیں چلیں گے پہاڑ پر [illegible] ہوں کہ [illegible] شاہین [illegible] مجھ کو کرگس ہی سمجھتے ہوں

میرے یہ شاہین بچے حلوے، مٹھائی کے عادی نہیں ہیں۔ [illegible] شاہین [illegible] تھوڑا بھی نہیں لے سکتے۔ [illegible] ان کے دشمنوں کی حالت خراب ہو [illegible] جماہیاں اور انگڑائیاں لینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بھی [illegible] کے بعد بھی [illegible] حرارت۔ حرارت کے بعد [illegible] اور [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] طرح کا ہوتا ہے۔ لہذا [illegible] ہے کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر ان کو وقت پر [illegible] ضرور ملنا چاہیے۔ [illegible] قسم [illegible] خان چلنے [illegible] طرح [illegible] ساتھ [illegible] ہی چاہیے۔ اور [illegible] کیک، پیسٹری، بسکٹ، مختلف قسم کے پھل سب ہی کچھ آتے ہیں۔ وہ کیا کھانا وہ اگر ان شاہین بچوں کو اچھا نہ ملے گا۔ تو یہ نازو نعم میں پلے ہوئے اپنی صحت کیونکر برقرار رکھ سکیں گے۔ صحت تو خیر روٹی دال سے بھی برقرار رہتی ہے مگر دل کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ محسوس کر کے کہ یہ غریبوں کا کھانا ہے۔ اور امیروں کے دسترخوان پر انواع و اقسام کی چیزیں ہوتی ہیں۔ لہذا ان شاہین بچوں کو ضعفِ قلب سے بچانے کے لیے کھانے کا بھی معقول ہی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ ان کو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیمی کا احساس نہ پیدا ہو۔ اور باپ کے گھر کو وہ یتیم خانہ سمجھ کر دل شکستہ نہ ہو جائیں۔

یہ قاعدے کی بات ہے۔ کہ اچھا کھانے والے اچھا پہننا بھی چاہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے، کہ وہ اپنے لباس میں ہر طرح کا تکلف برتتے ہیں۔ مگر اولاد کو کچھ اس طرح پہناتے اوڑھاتے ہیں کہ وہ کچھ لے پالک یا سوتیلی سی اولاد نظر آتی ہے۔ اس قسم کے بچے ابتدا ہی احساسِ کمتری کا شکار ہو کر کرگس زادے تو خیر بن جاتے ہیں مگر شاہین بچے نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میں اپنے شاہین بچوں کو اپنی اوقات سے زیادہ شاندار لباس بھی مہیا

کرتا ہوں۔ اور وہ بھی ایسے تمیزدار ہیں۔ کہ کیا مجال کہ نیلے سوٹ پر براؤن جوتا یا کریم رنگ کے پتلون پر سیاہ بوٹ تو پہن لیں۔ میری آنکھوں میں خاک ایسے جامہ زیب بچے آپ کو مشکل ہی نظر آئیں گے۔ میری آنکھوں میں خاک میں نے اس لیے عرض کیا کہ ماں باپ کی نظر سب سے زیادہ اولاد کو لگتی ہے۔ پھر یہ کہ میرے شاہین بچے اس قدر نفاست پسند ہیں۔ کہ اگر آپ ان میں سے کسی کی ڈریسنگ ٹیبل دیکھ لیں تو دنگ رہ جائیں۔ کنگھا تو میز پر کیا معنی وہ جیب میں بھی رکھے ہیں آئینے اور کنگھے کے علاوہ بے شمار شیشیاں ڈبے اور ڈبیاں آپ کو ان کی ڈریسنگ ٹیبل پر سجی ہوئی نظر آئیں گی۔ رات کو لگانے کی کریم الگ ہے۔ صبح کو لگانے کی اسنو الگ، ناخن تیز کرنے کے اوزار۔ بالوں میں چھلے بنانے کے کل پرزے۔ بھنوؤں کا تناسب قائم رکھنے کے لیے بال کی کھال نکالنے والی قینچیاں۔ ہونٹوں پر لگانے کے لیے خاص قسم کے موم روغن مختصر یہ کہ ایک دکان سی سجی ہوئی نظر آئے گی۔ اور یہ تمام چیزیں محض اس لیے مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ کہ شجرہ تو ان کے گلے میں لٹکایا نہیں جا سکتا۔ صورت ہی سے شرافت برسائی جا سکتی ہے۔ کہ دیکھنے والے ایک ہی نظر میں بھانپ لیں کہ ہاں یہ ہیں نجیب الطرفین شاہین بچے۔

اس طرح تو صاحب ان شاہین بچوں کو پروان چڑھایا گیا ہے اور مرزا صاحب سے جو پوچھا کہ بڑے بچے کو آخر کس کام سے لگایا جائے کالج سے نکلنے والا ہے۔ تو عقلمندی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ۔

قبلہ میری تو یہ رائے ہے کہ ایرفورس میں بھیجدیجئے۔

ایرفورس کا نام سن کر ہوش اڑ گئے۔ یعنی ہوائی جہاز کی نوکری چہ خوش۔ عرض کیا۔ مرزا صاحب میں نے تو یہ سمجھ کر آپ کی رائے طلب کی تھی۔ کہ آپ ماشاءاللہ خود صاحب اولاد ہیں۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر مشورہ دیں گے۔ مگر آپنے تو عجیب بات فرمائی ہے۔"

مرزا صاحب نے اسی استغنا سے فرمایا۔ میں نے تو اپنے نزدیک بہترین مشورہ دیا ہے۔ صاحبزادے کی ماشاءاللہ صحت بھی اچھی ہے۔ چشم بد دور ہاتھ پیر کے بھی اچھے ہیں۔ ان کے لیے ایرفورس میں ترقی کے بڑے امکانات ہیں۔ اور اگر سچ پوچھئے تو ہمارے ایرفورس میں ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے۔

عرض کیا۔ ترقی گئی بھاڑ میں مرزا صاحب ذرا غور تو فرمائیے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کو بھلا کیونکر ایرفورس میں بھیج سکتا ہوں کہ جاؤ بیٹا اپنی جان سے دور اڑ جاؤ۔ ہے ہے تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں طرح طرح کے ہول آنے لگتے ہیں۔ یہ آپنے کیا مشورہ دیا ہے۔"

مرزا صاحب نے فرمایا۔ لاحول ولا قوۃ۔ کس قدر فرسودہ تخیل ہے۔ آپ کا بھی۔ اے جناب اب وہ زمانہ گیا۔ جب ان لاڈلوں کو روئی کے گالوں میں پٹاری کے انگور کی طرح سینت سینت کر رکھا جاتا تھا۔ اب آپ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے ذمہ دار شہری ہیں۔

گھبرا کر عرض کیا۔ دیکھو بھئی مرزا۔ اولاد کے معاملہ میں تو یہ سیاسی باتیں مجھ سے کرو نہیں۔ مجھے ہوتی ہے الجھن۔ میں سیاست کا بس اتنا ہی قائل ہوں کہ جتنا چاہو مجھ سے چندہ لے لو۔ کوئی مر جائے کالی شیروانی پہنا دو۔

کہہ کر کوئی سیاسی جشن ہو گھر پہ چراغاں کرنے کو میں موجود ہوں۔ مگر چندے میں ادا نہیں کر سکتا۔ یہ آپ نے کیا منہ بھر کر کہہ دیا۔ کہ ایر فورس میں بھیج دوں۔

مرزا صاحب پھر بھی قائل نہ ہوئے۔ جوتوں سمیت آنکھوں میں گھس کر بولے۔ بندہ نواز اب یہ خودنگری اور خودشناسی کا دور ہے۔ اب قوم کا ہر فرد سپاہی ہے۔ ملت کا ہر جوان ملت کے مقدر کا ستارہ ہے۔ مگر آپ اسی طرح شاہین بچوں کو ممولا بنائے رکھیں گے۔ اور شہباز بننے سے روکیں گے۔ تو آخر ملک کا مستقبل کیا ہوگا۔

اکتا کر عرض کیا۔ خیر میں آپ سے بحث تو کرنا نہیں چاہتا میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ ان کے لیے وکالت اچھی رہے گی۔ یا ڈاکٹری۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔ ڈاکٹری بھی اچھی ہے۔ اس وقت ہم کو ڈاکٹروں کی بے حد ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کو پورا کرنا ان بزرگوں کا فرض ہے۔ جو اپنے بچوں کو ڈاکٹری کی تعلیم دلوانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔

عرض کیا۔ ڈاکٹری کے فوائد تو میں خود جانتا ہوں۔ نہایت شریف پیشہ ہے۔ اور اگر چل نکلی ڈاکٹری تو دولت قدم بھی چومے گی۔ مگر قباحت یہ ہے کہ صاحبزادے واقع ہوئے ہیں۔ نہایت کمزور دل کے۔ ایک مرتبہ مرغا ذبح ہوتے دیکھ لیا۔ اسی سے ڈر کر ایک ہفتہ تک بخار آتا رہا۔ سوتے میں اچھل اچھل پڑتا تھا۔ ڈاکٹری میں چیر پھاڑ کیسے کریں گے۔ اور میں نے سنا ہے۔ کہ لاشوں کو چیرنا پھاڑنا پڑتا ہے۔“

مرزا صاحب نے فرمایا۔ جی ہاں یہ تو ہے۔ مگر اس میں مضائقہ کیا ہے۔

عرض کیا۔ جو مضائقہ ہے۔ اس کا افسوس یہ ہے۔ کہ تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ بہرحال ڈاکٹری سے تو باز آیا میں رہ گئی وکالت ویسے تو اس پیشے میں کوئی خرابی نہیں۔ مگر ایک بات سے ذرا ڈر لگتا ہے۔ کہ اگر خدانخواستہ وکالت نہ چلی اور صاحبزادے بن گئے کچھ لیڈر ویڈر تو میں کیا کروں گا۔“

مرزا صاحب عقل کے ذرا واجبی ہی سے لوگ ہیں۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ تو اور کیا چاہیے آپ کو۔ اگر صاحبزادے لیڈر بن جائیں۔ اور ان کو عوام اپنا رہنما تسلیم کر لیں تو اس سے زیادہ آپ کے لیے باعثِ فخر اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔

سمجھاتے ہوئے عرض کیا۔ میاں بات سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ لیڈر کوئی یونہی نہیں بن جاتا۔ اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ صرف زندہ باد ہی کے نعرے بلند نہیں ہوتے مردہ باد کے نعرے بھی ہم نے سنے ہیں۔ صرف پھول ہی نچھاور نہیں کیے جاتے۔ جوتے بھی اچھالے جاتے ہیں۔ خوش آمدید ہی نہیں کہا جاتا۔ واپس جاؤ بھی کہا جاتا ہے۔ جلوس ہی نہیں نکلتا۔ کالی جھنڈیاں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ خیر یہ سب کچھ بھی سہی مگر لیڈر بننے کے لیے پولیس کے ڈنڈے بھی کھانا پڑتے ہیں کبھی کبھی، اور شیطان کے کان بہرے جیل میں چکی بھی پیسنا پڑتی ہے۔ بس میں ان ہی باتوں سے ذرا ڈرتا ہوں۔ اور چونکہ میں نے وکیلوں بیرسٹروں ہی کو زیادہ تر لیڈر بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ لہٰذا وکالت سے کچھ دل کھٹا سا ہو گیا ہے۔“

مرزا صاحب نے گرما مزے سے فرمایا۔ اس قسم کے اندیشے تو کم و بیش ہر مشغلہ میں موجود ہیں۔ اور یہ نشیب و فراز تو عملی زندگی میں ہر ایک کے لیے موجود ہیں۔ زیادہ محتاط طریقہ تو یہ تھا۔ کہ اس زمانہ میں ان صاحبزادوں کو پیدا ہی نہ کیا جاتا۔

عرض کیا خیر اب تو پیدا ہو ہی گئے ہیں۔ لہٰذا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ میں کہتا ہوں کسی مقابلہ کے امتحان میں کیوں نہ بٹھا دوں۔

مرزا صاحب نے کہا۔ بڑا اچھا خیال ہے۔ مگر ان امتحانوں میں بھی اس قسم کی خطرناک وادیوں سے گزرنا ہی پڑیگا۔ مثلاً پولیس کی ملازمت کو آپ کیا سمجھتے ہیں۔

کانوں پر ہاتھ رکھ کر عرض کیا۔ اجی توبہ کیجیے مرزا صاحب ہتھیلی پر جان لیے پھرتے ہیں۔ یہ بیچارے پولیس والے ایسی بھی سرفروشی کیا کہ انسان واقعی سر کاٹ کر بیچنا شروع کردے۔ ایک سے ایک خونخوار بدمعاش سے آئے دن سابقہ پڑتا ہے۔ پھر یہ کہ ایسی سخت ڈیوٹی کہ نہ دن کو دن سمجھو نہ رات کو رات۔ صاحب آدھی آدھی رات تک تو یہ پولیس والے گشت لگاتے پھرتے ہیں۔ بلوہ ہو جائے تو گولیوں کی بارش میں سینہ تان کر جاؤ۔ ان صاحبزادے نے تو آج تک شب برات کی آتش بازی بھی اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑائی۔ یہ پستول کیونکر چلائیں گے۔ اور اس قسم کی بے شمار باتیں ہیں۔ جن کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ مثلاً گھوڑے کی سواری کو میں نہایت غلط سمجھتا ہوں۔ یا گھوڑے کی جگہ پر وہ جو موٹر سائیکل آجکل نکلی ہے۔ وہ اور بھی خطرناک۔

مرزا صاحب نے پھر چٹکیوں پر اڑایا۔ اگر پولیس آفیسر ڈولی میں بیٹھا کریں۔ اور وردی میں چوڑیاں بھی ہوں۔ تو غالباً کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔"

جل کر عرض کیا۔ برادرم آپ تو خیر مذاق فرما رہے ہیں۔ یہ تو اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ میرا دل ایسا مضبوط نہیں ہے۔ کہ اس بچہ کے لیے میں ایسی ملازمت کو موزوں سمجھوں جس میں بس بدمعاشوں ہی سے واسطہ پڑے خواہ وہ بدمعاش انسان ہوں یا بدمعاش گھوڑے۔ مجھ کو تو اس کے لیے ایسے مشغلہ کی ضرورت ہے جس میں امن و امان کے ساتھ زیادہ نہیں تو بس اتنا پیسہ مل جائے کہ جس طرح کی زندگی میں نے اس کو بسر کرائی ہے۔ وہ خود بھی بسر کر سکے۔

مرزا صاحب بولے۔ بندہ پرور آپ نے تو بچوں کو مرزا پھویا بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ مردوں کو مرد بن کر رہنا پڑے گا۔ وہ گہواروں میں جھولنے کا زمانہ گیا۔ اب آپ ایک آزاد قوم کے فرد ہیں۔ اور قوم کی یہ آزادی اسی وقت تک برقرار رہ سکتی ہے جب تک قوم کے ہر فرد میں اس آزادی کے تحفظ کا صرف جذبہ ہی نہیں۔ بلکہ بل بوتا بھی موجود ہے۔ ہر شخص ملت کا جانباز سپاہی بن کر رہے گا۔ اب ملت کے افراد موت سے ٹکرا ٹکرا کر زندگی کے حقوق حاصل کریں گے۔ یہ عمل پیہم کا زمانہ ہے۔ یہ جدوجہد کا دور ہے۔ یہ ہم کو تلافی مافات کا موقع ملا ہے۔ اور اگر اس وقت بھی ہمارا یہی عالم رہا۔ جو آپ کا میں دیکھ رہا ہوں تو پھر خدا ہی حافظ ہے ہمارا۔

عرض کیا۔ بھائی جان آپ تو یہ باتیں کچھ کتابوں کی دنیا کی کر رہے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کتابوں میں تو خیر پڑھی جا

تو یہ بحران پر عمل ذرا مشکل سے ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب اللہ کا شکر ہے۔ عمل کیوں نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ کے سامنے ہی مثال موجود ہے۔ کہ میں نے اپنے دو بڑے بچوں کو نیوی میں بھیج دیا ہے۔ دو چھوٹے بچے ایر فورس کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ آخر ان بچوں کو میں کسی سے کمتر تو نہیں رکھنا تھا۔ الغرض تو یہ کہ میں اولاد کے ساتھ جو بہتر سے بہتر سلوک کر سکتا تھا۔ وہ میں نے کیا۔

خوب کیا وہ یہ سلوک تھا۔ کہ ان کو جان بوجھ کر ایسے محکموں میں بھیجا کہ خدا ہی ان کا محافظ ہے۔ اصل میں یہ بڑی غلطی تھی کہ میں آپ سے مشورہ کرنے بیٹھ گیا۔ جس نے خود اپنے بچوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو۔ وہ دوسرے کی اولاد کے لیے دل میں کیا درد رکھ سکتا ہے۔

مرزا صاحب نے پھر ہنسنے کی کوشش کی۔ میری رائے میں تو آپ صاحبزادوں کو ایک ایک دودھ کی شیشی دے کر ایک ایک کھلونے کے سپرد کر دیں۔ کہ ان کو دراصل پاکستانی رہنا ہے کہ ان ہی کو پاکستان میں بننا ہے۔ اور یہی اس آزادی کے محافظ ہوں گے۔

مرزا صاحب تو اس قسم کی جلی کٹی سنا کر تشریف لے گئے۔ عجیب پتھر دل پایا ہے اس شخص نے بھی۔ مگر اب ہر ایک تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھلا غور تو کیجیے وہ بچے دھوپ میں کمھلا جائیں۔ جو ٹھنڈی ہوا میں چھینکیں لینے لگیں ان کے لیے آپ تجویز فرماتے ہیں۔ ایرفورس۔ پولیس کی نوکری۔ فوج اور سپہ گری سبحان اللہ۔ دروازہ زور سے بند ہو جاتا ہے تو وہ اچھل پڑتے ہیں۔ ننھا سا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بھلا وہ پستول اور بندوق سے کیونکر کھیل سکیں گے۔ اور صاحب سو باتوں کی ایک بات تو یہ کہ اپنے جیتے جی تو یہ ہو نہیں سکتا کہ ان کو آنکھ بند کر کے جھونک دیا جائے کسی ایسے محکمہ میں بلکہ اگر وہ خود اس قسم کا ارادہ کریں بھی تو میں یہی کہوں گا کہ ؎

اللہ آمین سے ہم تو یوں پالیں
آپ آفت میں جان کو ڈالیں

یہاں زندگی کے لالے پڑے ہیں جی۔ بچپن میں یہی بہت ہے۔ اگر یہی روزگار رہ گئے ہیں۔ تو ان کے لیے بیکاری بھلی۔

تعزیت

ریاض کے والد بزرگوار نے انتقال فرما کر ایک عجیب سوال پیدا کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد کا غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو والدین کا غم؟ ماشاء اللہ ایک سو پانچ یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا لیکن ریاض کا یہ حال تھا کہ مچھلی کی طرح تڑپتا معلوم ہوتا تھا کہ جوان اولاد کا داغ لگ گیا ہے۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تل جائے تو والدین کا داغ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے مرنے سے والدین یتیم نہیں ہوتے لیکن باپ کے مرنے سے اولاد یتیم خانے میں داخل کر دی جاتی ہے۔ اولاد کے مرنے کے بعد انسان اپنی دوسری اولادوں کو دیکھ کر صبر کر لیتا ہے دوسرے کم یہ امکان تو ضرور رہتا ہے کہ خداوند کریم اور دے گا لیکن سوال تو یہ ہے کہ ریاض بیچارے اپنے لیے والد کا انتظام کیونکر کرتے ان کو تو یہی غم تھا کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑے گا۔ ماں کے غم سے وہ واقف نہ تھے۔ اس لیے کہ وہ غریب ان ہی حضرت کی پیدائش کے سلسلے میں دنیا سے کوچ کر چکی تھیں اور ان کو ان ہی ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا لہٰذا ان کی ماں سمجھئے تو وہی اور باپ سمجھئے تو وہی جن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لیے ان سے جدا کر دیا تھا۔

ریاض کے والد ماجد کا انتقال خود ان کے لیے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنے کے برابر تھا لیکن اس سلسلہ میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہ تھے اس لیے کہ بحیثیت دوست کے ہم کو ریاض کے پاس تعزیت کے لیے جانا تھا۔ ان سے اظہار ہمدردی کرنا تھا۔ جنازہ میں عدم شرکت کے عذر کرنا تھے وغیرہ وغیرہ لیکن ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے کہ ہم کو اس سلسلہ میں کیا کیا کرنا ہوگا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی تھی اور وقت آنا تھا نہیں کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق کر لیں۔ بہرحال ہم کو اطمینان تو تھا ہی کہ ہم بالکل کورے ثابت نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ متعدد مرتبہ لوگ ہمارے پاس تعزیت کے لیے آ چکے تھے اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسرے لوگوں کو آپس میں یہی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر کچھ ہم کو جھجک تھی تو صرف اس لیے کہ خود ہم نے بنفس نفیس آج تک یہ رسم ادا نہ کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ جانا اور تعزیت کرنا تقریباً ناگزیر تھا لہٰذا ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنے ارادے کو پختہ کر لیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے ذہن پر زور دے کر یکجا کرنا شروع کر دیے

"مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے ---- صبر کیجیے ---- جس کی چیز تھی اس نے لے لی ---- دنیا کا یہی دستور ہے ---

بڑا صدمہ ہوا ہے۔ کل ملنے گئے تھے [illegible] ایک دن کی بات ہو جاتا ہے ۔۔۔ [illegible] ہے۔ [illegible] دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے [illegible] ۔۔۔ اب سمجھ میں آتا ہے [illegible] ایک [illegible] دن آنے والا ہے ۔۔۔ دنیا [illegible] فانی ہے۔ کیا خلق تھا [illegible] ۔۔۔ کبھی کوئی فرق نہیں کی ۔۔۔ خدا مغفرت کرے گا۔ ۔ اچھوں کو [illegible] ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے ۔۔۔ بہت [illegible] ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ [illegible] ۔ ۔ [illegible] اب [illegible] وقت ملتے ہیں:

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی کمی نہیں [illegible] کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ سوال [illegible] لہٰذا ہم نے ان الفاظ کو ترتیب [illegible] کر دیا اور ان کی مشق کرنے کے بعد [illegible] تمام راستہ پھر تعزیتی الفاظ رٹتے رہے اور [illegible] تعزیتی تقریر [illegible] ہو گئی۔

"ہائے! [illegible] یقین نہیں آتا۔ عجیب غضب ہے۔ عجب حادثہ ہے۔ خدا [illegible] آپ کو صبر [illegible] کہاں رحمت میں جگہ دے۔ کیا بھلے تھے [illegible] ہر ایک [illegible] ۔۔۔ بہت [illegible] تیار [illegible] ۔ [illegible] اخلاق تھا مرحوم کا [illegible] آپ کی قسمت [illegible] ۔ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے [illegible] ۔۔۔ [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] ابھی تو [illegible] ان کے مرنے کے دن [illegible] ۔ وہ جنت کا ایک پھول تھے۔ [illegible] پرہیزگار، خوش وضع، خوش اخلاق، دوست نواز، غریب پرور، نیک بچے، فرشتہ صفت، محبت کرنے والے، پڑھے لکھے [illegible] کہ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے۔ خدا [illegible] ۔ خدا آپ کو [illegible] کرے [illegible] اطلاع ہوتی تو [illegible] کام آتا۔ [illegible] میں شرکت کرتا۔ نماز جنازہ میں شریک ہو جاتا مگر افسوس کہ [illegible] ہے۔ جیتے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ السلام علیکم۔"

ریاض کے دروازے پر پہنچ کر ارادہ ہوا کہ "خدا کے جانے" کی آواز دیں لیکن یاد آیا کہ غم کا موقع ہے۔ فوراً اپنا چہرہ اداس بنایا اور مری ہوئی آواز کے ساتھ پکارا۔ "ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" آواز کے ساتھ ہی ملازم باہر آیا اور ہم کو اپنے ہمراہ گھر میں لے گیا جہاں ایک کمرے میں ریاض اوندھے لیٹے پڑے تھے ہم نے مضمحل آواز میں کہا۔

"السلام علیکم!"

انہوں نے اس کے جواب میں سوائے کہ "اس سلام" کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہمارا بھی دل بھر آیا لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا۔ ہم تعزیت کے لیے آئے تھے لہٰذا ہم کو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھی۔ ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر دہرانا شروع کی لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے الفاظ پھیلائے دیتا تھا کہ ہم اپنی تقریر بھولے جا رہے تھے۔ [illegible] یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس کی ہچکی [illegible] خیالات منتشر کر دیتی تھی اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرتے [illegible] تھے۔ جب اسی میں بڑی دیر ہو گئی تو ہم نے

اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بُری بات ہے کہ وہ روتے روتے جان دیئے دیتا ہے اور ہم چپ بیٹھے ہیں۔ سمجھا ہم نے کہ [illegible] کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیے جو اس خاموشی سے بہتر ہو لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں، کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے تھے۔ بس ابتدا شروع ہونے کی دیر تھی، لہٰذا یہی سوچ رہے تھے کہ شروع کس طرح کریں، چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا لہٰذا اس پر غور کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر، اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی گھڑی کی چال پر آدھ گھنٹے کے قریب ہوتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تعزیت کے لیے آتے ہیں اور آدھ گھنٹے سے بت بنے بیٹھے ہیں، لہٰذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو از سر نو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ کے والد ——— پھر سوچا کہ اب کیا کہیں، کچھ یاد آ گیا تو عرض کیا۔

"آپ کے والد ——— ہم کو خود یاد نہیں رہا کہ ہم کو کیا یاد آیا تھا مگر ٹھیک ہے وہ بات یہی تھی کہ۔

"آپ کے والد ——— آپ کے والد ——— آپ کے والد ——— " خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے، دماغ میں گوبر بھرا تھا۔ آخر دماغ نے کام نہ دیا لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ کہتے چلو لہٰذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد ——— آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔"

ریاض نے یہ سنتے ہی پھر ایک چیخ اس طرح ماری گویا اس کو انتقال کی خبر میں ہی نے سنائی ہے۔ میں پھر خاموش ہو گیا لیکن ساتھ ہی مجھ کو یاد آیا کہ مجھ کو خاموش نہ ہونا چاہیے لہٰذا میں نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز نہیں قضا ہوئی۔ زندگی بھر روزے رکھتے رہے آپ کے والد مرحوم، مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ صبر کیجئے اب رونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ کے والد ——— آپ کے والد ——— آپ کے والد تھے ——— جس پر گزرتی ہے وہی جانے مگر اب نہ روئیے ——— جانے بھی دیجئے ——— ہٹائیے بھی اس قصہ کو ——— آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی، وہ روتے روتے خاموش ہو گیا تھا اور گردن جھکائے خاموشی کے ساتھ میری باتیں سن رہا تھا۔ کبھی کبھی میرے بعض زوردار الفاظ پر گردن اٹھا کر میرا منہ بھی دیکھ لیتا تھا۔ اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"باپ بھی دنیا میں عجب نعمت ہیں، بہت سے بیچارے اس ارمان میں مر جاتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی کا دے نہیں تو اس سے نہ ہونا ہی اچھا ہے۔"

ریاض برابر میرا منہ دیکھے جا رہا تھا لیکن میرے اس جملہ کا اس پر خاص اثر ہوا۔ اس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرے پر جما دیں۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکار کر پھر کہنا شروع کیا۔

"اب وہ واپس تو نہیں آ سکتے۔ مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ ہم کو بھی ایک دن اسی طرح تصویر کھنچانا یعنی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے۔ خدا بخشے عجیب انسان تھے۔ دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ مجھ کو تو کل خبر ہوئی۔ آج وہ کل جاسی باسی ہے ورنہ مجھ کو اطلاع ہوتی تو میں کچھ کام آتا اور بفرضِ محال یعنی یہ کہ مٹی میں شرکت ہو جاتی۔ نمازِ جنازہ تو ضرور ہوئی ہوگی۔"

ریاض سے مل کر [illegible] صاحب [illegible] ہے:

شب :۔ یہ میرے بھائی جان کے [illegible] آپ کو ذرا [illegible] کیا ہوا ہے۔

ریاض :۔ جی ہاں! [illegible] صاحب سے ملنے آیا۔

شب :۔ ان صاحب [illegible] ہو جاتا ہے [illegible]

ریاض :۔ اسے [illegible] ہے۔

میں :۔ ان صاحب [illegible] بھائی صاحب [illegible] ہو گئی ہے [illegible] صاحب [illegible] کہ [illegible] بچے ہیں۔ اور [illegible]

ریاض :۔ ایک تو میری بہن۔

میں :۔ ابھی سے؟ تم تو ابھی [illegible] کہ شادیاں ہو رہی ہیں۔ ارے ان کا کیا تعجب ہے؟

ریاض :۔ جی ہاں دو بھائی اور ایک بہن اور ہے۔

میں :۔ [illegible] ماشاء اللہ [illegible] ہے نا؟

ریاض :۔ جی ہاں میری والدہ تو [illegible] میرے چھوٹے بھائی کی پیدائش ہی کے وقت انتقال کر گئی تھیں اور [illegible] دوسری والدہ [illegible] سال ہوئے [illegible]
[illegible] سے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔

میں :۔ ان کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہوا مگر مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ [illegible] ماشاء اللہ [illegible]

ریاض :۔ میرے [illegible] چھ سال اور [illegible]

میں :۔ افسوس صد افسوس! [illegible] ان بچوں پر [illegible] کیسے مر گئے۔

ریاض نے مجھ کو اس نظر سے دیکھا گویا میں دنیا داری کر رہا ہوں اور یہ سب تصنع ہے۔ مگر میں نے [illegible] انداز میں کہا۔

"خدا گواہ ہے کہ چچا جان مرحوم مجھ کو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے اور محبت کرتے تھے۔"

ریاض :۔ جی ہاں! ان کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا۔

میں :۔ ارے بھائی میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں خدا ایسا [illegible] باپ سا [illegible] دنیا کو دے۔ ہر ایک [illegible] کبھی نماز
قضا نہیں کی۔ ابھی تو [illegible] تھے ان کے مرنے کے دن [illegible] خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔ تو سب بچے آپ ہی [illegible]

ریاض :۔ جی ہاں اب تمام ذمہ داری میرے ہی سر ہے۔

میں :۔ گھبرائیے نہیں۔ جس خدا نے ان کو اٹھایا ہے وہی آپ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے گا۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ عجب
ذات شریف تھے مرحوم۔ کبھی نماز قضا نہیں کی اور ان ہی کی قضا آگئی۔

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

دنیا کا یہی دستور ہے۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔ اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے؟

ریاض :۔ جی ابھی تو نہیں ہوئی۔

میں ۔ بزرگانہ اور مربیانہ انداز سے، بھائی تو اس سلسلہ میں اس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ۔

ریاض ۔ اس کا یہ کون موقع ہے بھلا؟

میں ۔ تو اب اور کون سا موقع آئے گا؟

ریاض ۔ اب خوش ہونے والا کون ہے، جو تھے وہ نہیں رہے تو اب کیا ہوگی شادی؟

میں ۔ ہاں یہ تو کہتے ہو کہ ابا جان مرحوم کو چاہیے تھا کہ اس خوشی کو دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونے والے ہم لوگ موجود ہیں۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے [illegible] مگر ساری شادیاں [illegible] زندگی کا کوئی اعتبار نہیں

[illegible]

نہ جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ع

سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

اب دیکھو نا چچا میاں مرحوم تو جیتے سے آخر کیا بیمار تھے۔ یہی کہ بس وقت آگیا ورنہ کہیں جانے کے آثار تھے اور کسی کو شبہ بھی ہوتا تھا کہ مر جائیں گے، مگر خدا کی مصلحت۔ وہ ہم پر تو وہ جان دیتے تھے۔ اب تو کون اس طرح چاہے گا۔ تنہا محبت کرنے والا اٹھ گیا۔ ہم یتیم ہو گئے تھے پہلے ہی والدین کا سایہ اٹھ گیا۔ ع

[illegible] انصاف طلب ہے

ریاض نے پھر ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا اور میں گھبرایا۔ اب کس طرح سمجھاؤں۔ تمام الفاظ ختم ہو چکے۔ کیا ان ہی کو پھر سے شروع کر دوں، لیکن اگر انہوں نے بعد میں پھر رونا شروع کیا تو کیا ہوگا۔ آخر کار دل نے کہا بس اب جاؤ ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا مگر پھر دل نے دوسری بات کہی کہ اس طرح روتے ہوئے دوست کو نہ چھوڑو لہٰذا میں نے کہا۔

"بھائی رونے کے لیے تو تمام عمر پڑی ہے اور واللہ تم سیکڑوں برس تک زندہ رہ کر روتے رہو گے مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے۔ تم کو سمجھ سے کام لینا چاہیے۔"

ریاض کی ہچکیاں سسکیاں بن گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہو گئیں تو میں نے سب سے پہلی بات یہی کہی کہ

"اچھا بھائی اجازت دو۔"

ریاض نے کہا "جاؤ گے؟"

ہم نے کہا "ہاں! السلام علیکم!"

ریاض کے یہاں سے آ کر مجھ کو پورا اطمینان تھا اور اب میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے یہاں کہیے تعزیت کے لیے روز چلا جایا کروں۔

لکھنؤ کانگریس سیشن

لکھنؤ میں ۱۹۱۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اور خوب ہوا۔ [illegible] چہل پہل تھی۔ [illegible] تھی۔ [illegible] حل شیعہ سنی [illegible] ایک ایسی وحدت کو برقرار رکھا گیا۔ نمائش بھی تھی اور مشاعرہ بھی۔ ڈرامہ بھی ہوا اور [illegible] سیشن بھی [illegible] اگلا پچھلا [illegible] اس موقع پر [illegible] خیال آتا تھا [illegible] کانگریس [illegible] وقت منعقد ہوئے جب اس [illegible] کی [illegible] اور [illegible] نے اس کو [illegible] بنا دیا۔ [illegible] شاہی [illegible] جب یہاں کا ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات ہوا کرتی تھی۔ [illegible] وقت کانگریس سیشن ہوتا تو معلوم بھی [illegible] لکھنؤ میں جو کانگریس ہوئی تھی [illegible] جس طرح [illegible] آباد [illegible] اجلاس ہوتے اسی طرح لکھنؤ میں بھی [illegible] سیاسی [illegible] تھا اس وقت یعنی جب لکھنؤ لکھنؤ تھا یہاں سیشن ہوتا تو اخبارات وہ [illegible] نہ کرتے جو آج پیش کی جا رہی ہے۔ بلکہ اگر آپ [illegible] دیکھنے ہے عالم تصور کی سیر کرنا چاہیں تو سمجھئے کہ لکھنؤ کے شاہی دور میں فرض کر لیجئے [illegible] اس شاہی دور کے کانگریس سیشن کی روداد۔

لکھنؤ کے موتی نگر کا صدر دروازہ جامہ دار کا بنا ہوا تھا اور اس پر ایک لمبا سا چھتر لگا تھا۔ اس پھاٹک کے نیچے ہی روشن چوکی رکھی ہوئی تھی جس کے مدھر نغمے فضا میں ایک وجد کی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ اس دروازہ پر مجلس استقبالیہ کے صدر اور چند اراکین مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھے اور نہایت گرم جوشی کے ساتھ بڑھ بڑھ کر اور دیدہ و دل فرش راہ کر کر کے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب بہار نظر آتی تھی۔ سرخی کی بنی سڑکوں پر کیوڑے اور گلاب کا چھڑکاؤ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہو رہا تھا اور سڑکوں کے دو رویہ ریشمی جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ چنبیلی اور بیلے کے پھولوں کی لڑیاں عطر میں بسی ہوئی بھی آویزاں تھیں اور شامیانے بھی۔ ان ہی سڑکوں پر جا بجا ساقی حقّے لیے ہوئے اور حقّہ پر ہار لپیٹے ہوئے ٹہل رہے تھے جن کے خمیرے کی خوشبو اور بھی قیامت تھی۔ جو سڑک صدر دروازہ سے عام اجلاس کے پنڈال تک گئی تھی اس کے دونوں طرف دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ کہیں پان کی دوکان تھی تو کہیں پھلکیوں کی۔ کہیں گنڈیریاں برف میں لگی ہوئی چھالی پھولوں میں بسائی جا رہی تھیں تو کہیں دوکان پر انواع و اقسام کے کھلونے اور ہر قسم کی ڈوریاں بکتی تھیں۔ کوئی جامدانی کی دوکان تھی تو کسی دوکان میں لکھنؤ کی مشہور و معروف زردوزی کے نمونے نظر آتے تھے۔ مختصر یہ کہ دو فرلانگ تک یہ خاص سڑک اسی طرح

بارونق بنائی گئی تھی کہ گویا چوک کی تمام چہل پہل اس جگہ نے حاصل کر لی ہے۔ وہی بھیڑ تھی اور وہی ٹھٹھے۔

روز فرخندہ تک اس خوبصورت اور بارونق سجی ہوئی اور منور سڑک پر چلنے کے بعد کانگریس کے عام اجلاس کا وہ پنڈال تھا جس کو لکھنؤ کے نفاست پسندوں کا ایک جامع نمونہ کہنا چاہیے۔ پنڈال جس کو بنایا گیا تھا کہ ہوادار بھی ہے اور خوشنما بھی۔ پنڈال کے تمام ستون چاندی کے تھے اور شرکائے اجلاس کو شبنم سے بچانے کے لیے پنڈال کے اوپر ایک مخمل کا شامیانہ کھینچا گیا تھا جس کی جھالر جس کے پردے اس صنعت کے ساتھ لٹکائے گئے تھے کہ اگر رات کا اجلاس ہو تو ان پردوں کو گرا دیا جائے اور جالی سے چھن چھن کر تازہ ہوا آ سکے اور اگر دن کا اجلاس ہو تو لو سے حاضرین کو بچانے اور پنڈال کو خنک رکھنے کے لیے یہ پردے کھول دئیے جائیں۔ پنڈال میں ہر طرف رومی قالین اور مخمل کے گاؤ تکیے نظر آتے تھے۔ صرف صدر منتخب کے لیے اس پنڈال کے اندر کارچوبی شامیانہ لگایا گیا تھا جس کے نیچے زرتار مسند اور تکیہ تھا اور سامنے ہی قد آدم ایک سونے کا پیچوان اور سونے کے خاصدان کے قریب [illegible] کا اگالدان رکھا ہوا تھا۔ صدر کے علاوہ تمام حاضرین اور شرکائے اجلاس کے لیے چاروں طرف چاندی کے خاصدان اور پیچوان رکھے گئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دور اگالدان نہایت سلیقے اور قرینے سے سجائے گئے تھے۔ وسط میں گلدانوں کی قطار اس طرح تھی کہ ہر گلدان کے بعد اگر کی بتیاں اور دیگر اقسام کی خوشبو جلانے کے لیے چلمچیاں رکھے ہوئے تھے اور ہر چلمچی کے بعد ایک گلدان تھا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر موم بتیوں کے لالے روشن تھے اور پنڈال کو موم بتیوں کے ہزاروں جھاڑوں اور قندیلوں سے منور کر دیا گیا تھا۔

اجلاس کا وقت ۵ بجے شب مقرر ہوا تھا مگر ۹ بجے شرکا نے آنا شروع کیا اور دس بجے کے قریب تمام پنڈال معزز حاضرین سے بھر گیا اور ٹھیک ساڑھے دس بجے پہلا گولہ چھوٹا۔ پھر روشن چوکی نے ایک ترانہ گایا اور آخر میں نقیب نے پنڈال میں آ کر آواز لگائی ؎

نگہ دار ہوشیار آتے ہیں
صدر عالی وقار آتے ہیں

یہ سنتے ہی تمام حاضرین بزم کھڑے ہو گئے اور پنڈال کے صدر دروازے سے زرق برق لباس پہنے ہوئے پہلے تو چوبدار داخل ہوئے اور درمیان میں صدر محترم تاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح خراماں خراماں تشریف لاتے۔ ہر طرف سے لوگوں نے جھک جھک کر سلام کیے اور خود صدر محترم نے سب کے سلاموں کا جواب جھک جھک کر، آداب بجا لا کر اور تسلیمات عرض کر کے، ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور مسکرا مسکرا کر دیا۔ اس کے بعد صدر محترم اپنی جگہ پر رونق افروز ہوئے اور آپ کے تشریف فرما ہوتے ہی تمام حاضرین بزم قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر دو زانو بیٹھ گئے۔ اس کے بعد اجلاس کی باضابطہ کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی مجرا شروع کر دیا گیا۔ کچھ دیر تک لکھنؤ کی مشہور مغنیہ عشو جان نے موسیقی کے کمالات دکھا کر حاضرین محفل کو مسحور کیا۔ اس کے بعد [illegible] اور ناگرہ کی دو چوکیاں بیٹھیں۔ آخر میں میاں مصطفیٰ حسین کا مردانہ طائفہ آیا جس نے دور دور سے آئے ہوئے مندوبین کانگریس کو لکھنؤ کے بھانڈوں کا گرویدہ بنا دیا۔ اس نغمہ و رقص کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا اور اس کے بعد کانگریس کے اجلاس کی باقاعدہ کارروائی اس طرح شروع کی گئی کہ صدر مجلس استقبالیہ نے حاضرین بزم میں سے ایک ایک سے اجازت طلب کرنے کے لیے

دعا کے بعد صدر محترم نے حاضرین کی اجازت طلب کر کے اپنا خطبہ اس شعر سے شروع کیا۔

"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

اس شعر کو پڑھتے ہی تمام پنڈال ماشاء اللہ اور واہ واہ کی صدا سے گونج اٹھا [illegible] اللہ اللہ [illegible] تھا یا خطبہ [illegible] کے بجائے [illegible] کر کے شروع کر دیا اور [illegible]۔ حاضرین کی [illegible] اس شعر کو پھر پڑھا اور شعر کے بعد خطبہ [illegible] شروع کیا۔ اس خطبہ کے ایک ایک لفظ پر [illegible] اور [illegible]۔ [illegible] سلام کرنے کی [illegible] خطبہ [illegible] کرتا۔ شاید [illegible] کے سلام کرنے اور وصول کرنے کے [illegible] ایک گھنٹہ میں ختم ہوا اور خطبہ کے ختم ہونے کے بعد بھی تحسین و آفرین کا سلسلہ [illegible] جاری رہا۔ [illegible] کے بعد صدر محترم کھڑے ہوئے اور آپ کے کھڑے ہوتے ہی حاضرین [illegible] تعظیم صدر محترم کے اشارے سے بیٹھ گئے۔ اب صدر محترم نے حاضرین سے ہاتھ جوڑ کر اپنا خطبہ شروع کرنے [illegible] جس کا جواب سب نے [illegible] "بسم اللہ" اور سب [illegible] سے [illegible] اور [illegible] سے [illegible] کرنے کے بعد صدر محترم نے فرمایا۔

"آسماں بار امانت نتوانست کشید"

اور اے حضور!

"قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند"

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ "اے سبحان اللہ" کا وہ فلک شگاف نعرہ بلند ہوا ہے کہ خود صدر محترم بھی تھوڑے اچھل پڑے اور پھر زرا سنبھل کر آپ نے سلام کرنے شروع کر دیئے۔ تین چار مرتبہ حاضرین کے اصرار سے اسی شعر کو پڑھنا پڑا۔ پھر بھی حاضرین نے یہی کہا کہ حضور سیری نہیں ہوتی ایک مرتبہ اور زحمت فرمائیے۔ آخر صدر محترم نے پھر یہی شعر پڑھا اور شعر پڑھنے کے بعد آپ نے خطبہ شروع کیا۔

"ہر چند کہ یہ خاکسار فرائض صدارت سے ناچار تھا۔ خود بھی علیل تھا اور شیر بھی اس [illegible] کا بیمار تھا مگر آپ حضرات کا اصرار، اور پھر اس پر اصرار کی تکرار، مجبوراً انکار سے قاصر تھا اور افتاں و خیزاں تعمیل حکم کے لیے حاضر ہوا۔"

حاضرین نے "کیا سلاست ہے اور کیا روانی ہے" کا نعرہ بلند کیا اور صدر محترم نے جھک جھک کر کلام کا تمام [illegible] میں صرف کرنے کے بعد پھر فرمایا۔

"آپ کے سر عزیز کی قسم کھاتا ہوں بلکہ اماں جان مرحوم کی روح پاک کو درمیان میں لاتا ہوں کہ میں ہرگز اس اعزاز کے قابل نہ تھا اور انکار میرا کسر نفسی میں شامل نہ تھا مگر آپ حضرات نے اس کو مذاق جانا اور میرا کوئی حیلہ نہ مانا۔ مختصر یہ کہ اپنی تمام مجبوریوں کو بالائے

جو کشاں کشاں جانب بزم کانگریس آنا پڑا۔"

حاضرین نے پھر "مصرعہ۔ واقعہ ہے کہ موتی پرو دیے ہیں اور جواہرات جڑ دیے ہیں" کی صدائیں بلند کیں اور صدر محترم نے ہاتھوں کو جوڑ کر "آپ عزت بڑھاتے ہیں" کہہ کر فرمایا۔

"آج ہمارے پیشِ نظر جو سوال ہے وہ کوشش کے بعد آسان اور بغیر کوشش کے سخت محال ہے"

حاضرین نے ہم آواز ہو کر کہا۔

"کیا کلیہ بیان فرمایا ہے حضور نے۔"

صدر محترم نے پھر بجوابی لاؤ، ارشاد فرمایا۔

"باہمی اتفاق یعنی سدِ باب نفاق و شقاق از بس ضروری ہے اور بغیر اس کے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں سخت دشواری ہے۔ ہماری راہ پُر خطر اور دشوار ہے۔ منزل دور ہے اور راستہ ناہموار ہے۔ مگر کچھ بھی ہو اب تو مٹنا ہے اور مٹانا ہے یعنی ہر صورت مقدر کو آزمانا ہے۔ اگر ہمارے ارادوں میں استقلال ہے تو سمجھ لیجئے کہ درخشاں تیرا اقبال ہے۔"

"ثم آمین؛ آپ کے منہ میں گھی شکر" کے نعروں سے پنڈال گونج اٹھا۔ صدر نے پھر فرمایا۔

"ہم کو آج یہ طے کرنا ہے کہ اب ہم کو زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے۔ ذلتوں کی انتہا ہو گئی۔ تکلیف حد سے سوا ہو گئی۔ ہم شہزادے ہو کر بات بات کا محصول اور لگان ادا کریں۔ ہم سے محصول اور لگان مانگنے والے خدا غارت کریں۔ کہا جاتا ہے کہ پیٹ کاٹ کر اور بچوں کی پائیاں بند کر کے مالیہ کی ادائیگی کا انتظام کریں گویا ہم اپنی جان سے رو۔ جان دے دیں اور جزیہ نصیبِ اعادیہ"

حاضرین نے "دور باش جا بجا بہت ہی مدعی" کا نعرہ بلند کیا اور صدر محترم نے پھر اپنا خطبہ شروع کیا۔ اس خطبہ میں شروع سے آخر تک اس قسم کی شکایتیں تھیں کہ جب حکومت ہماری ہے اور ہم خود شہزادے ہیں تو ہم مرغ کی پالیوں کا ٹیکس، بٹیربازی اور کنکوے بازی وغیرہ کے محاصل کیوں ادا کریں۔

یہ خطبۂ صدارت تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوا اور آخر میں جناب صدر نعرہ ہائے تحسین و آفرین کے درمیان سلام کرتے ہوئے تھک کر خستہ ہو کر پسینہ پسینہ ہو کر بیٹھ گئے۔ چوبداروں نے پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ کوئی برف آب لے کر دوڑا تو کسی نے خاصدان پیش کیا۔ آخر دس پندرہ منٹ کے بعد صدر محترم کے حواس بجا ہوئے اور اس کے بعد اجلاس کی ایجنڈے کے مطابق کارروائی شروع ہوئی۔

سب سے پہلے دربارِ شاہی میں نیابت کا مسئلہ تھا۔ شاہی خاندان کے دیگر نواب زادگانِ وقت کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کو بھی دربار میں کرسی نشینی کے ۳۴ فیصدی حقوق دیے جائیں۔ چنانچہ نواب زادگانِ اودھ کی طرف سے جس وقت اس سوال کو لے کر نواب ولادے مرزا صاحب کھڑے ہوتے ہیں اور حاضرینِ محفل کو جھک جھک کر سلام کیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی وقت سے ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ آپ نے سب سے پہلے تو اپنا بٹیرا اپنے خدمتگار کو دیا۔ اس کے بعد ایک مدلل، منطقی اور مسجع تقریر جس میں دربارِ شاہی میں اپنے ۳۴ فی صدی حقوق پر زور دیا اور آدھ گھنٹے تک تقریر کرنے کے بعد شہزادہ والا تبار، برہان الدولہ نواب فلک رفعت بہادر نے

نوٹ ——— ۵۰ ——— [illegible]

[illegible] پیش کریں۔ آپ [illegible] آزادی [illegible]
[illegible] اور [illegible] ہوتا ہے " [illegible] " اور [illegible]
[illegible]
[illegible] کرنے کے بعد فرمایا۔

[illegible] جب [illegible] آپ [illegible]
[illegible] دوست [illegible]
[illegible] ہیں [illegible]
[illegible] حال ہے [illegible]
[illegible] حال ہے [illegible] تشریف [illegible]
[illegible] اور [illegible] تشریف [illegible]
[illegible] کر [illegible] بیٹھ گئے اور [illegible] اب [illegible]
[illegible] گئے اور [illegible] آپ [illegible]

[illegible] ہے [illegible] بھی یہ تسلیم کرتے ہیں۔
کہ [illegible] کہ تجویز متفقہ طور پر منظور ہو گئی مگر
[illegible] اب آزادی کامل کی تجویز تھی۔ امید تھی کہ [illegible]
سوال یہ تھا کہ آخر اس تجویز کو کس صورت میں کون عمل میں لاتے۔ نواب زادگان نے شہزادوں کی طرف اشارہ کرتے کہا۔

حضرت پہلے آپ آزادی حاصل کریں:

شہزادوں نے کہا نہیں پہلے آپ"

نواب زادوں نے کہا پہلے آپ:

شہزادوں نے کہا یہ ناممکن [illegible] پہلے آپ: آخر اسی پہلے آپ اور نہیں حضرت پہلے آپ میں صبح ہو گئی اور جلسہ ختم ہو گیا۔
اس طلسم خیال کو توڑ دیا اور [illegible] کہ ایسی ہی کانگریس کے مقابلہ میں جس کا [illegible] تصور [illegible] دماغ میں [illegible] رہ گیا
[illegible] اور [illegible] کے یہ کہنہ قسم کی کانگریس کیونکر پسند [illegible] شخص کو اس قسم کا کانگریس
کیونکر پسند آ سکتا ہے جس کا دماغ جمہوریت کے تصور سے معمور ہو رہا ہو۔

— ——— —

پرابلم

جس کا وطن غریب الوطنی ہو وہ اپنے کندھے پر اپنا مکان تلاش نہیں کرتا بلکہ خانہ بدوشی پر ایسا اتراتا ہے گویا اسی سے وطن کے تمام حقوق حاصل کر کے رہے گا۔ معلوم نہیں یہ بات ہم نے انگریزوں سے سیکھی ہے یا ہر انسان فطرتاً مگر غیر محسوس طریقہ پر انگریز ہوتا ہے۔ بہرصورت کچھ بھی ہو حال یہ ہے کہ اٹھائیس سال تک لکھنؤ میں مہمان رہے۔ وطن پردیس اور پردیس وطن بنتا رہا۔ بیگانگی یگانگت بن گئی۔ نام کے ساتھ لکھنوی لکھ لکھ کر لکھنوی بنتے رہے۔ دو مسافرخانہ میں پڑے رہے۔ اسی سرائے میں شادی بیاہ سے فارغ ہوئے۔ اسی ڈاک بنگلہ میں بچوں کے باپ تک ہو گئے۔ اور عین اس وقت جبکہ لکھنؤ قریب قریب وطن بن چکا تھا۔ ازلی خانہ بدوشی نے پھر کروٹ لی۔ پیروں کے سنیچر نے وحشتِ غربت کی راہ لی اور اب جو آنکھ کھلی تو ہم لاہور میں تھے۔

لاہور آ کر نیا دانہ نیا پانی نئے آدمی نئے جانور۔ یہاں تک کہ ادب بھی نیا ملا مگر طے تھا کہ اس نئی نویلی غربت کو پرانے بال بچوں کے ساتھ گھر بنا کر رہنا ہے۔ فکرِ آشیانہ کہیے یا آرزوئے دولت خانہ مختصر یہ کہ سر چھپانے کی جگہ درکار تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک پردیسی اس قسم کے واقف کارانہ کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا نئے ہمدردوں اور پرانے دوستوں سے اس کارِ خیر میں امداد کی مہم لے کر روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے جن بزرگِ محترم کے دروازہ پر دستک دی تھی ان سے مراسم کچھ ایسے ویسے نہ تھے ہم دونوں تو ہم دونوں ہمارے والد بھی آپس میں دوست تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی "اخاہ" کا نعرہ بلند کر کے لپٹ گئے۔ پہلے کرسیاں نکلیں۔ پھر شکنجبین کی بارش شروع ہوئی۔ پھر سگریٹ کی ژالہ باری ہوئی۔ مختصر یہ کہ عجیب خوشگوار ملاقات تھی۔ دل خوش ہو گیا، پردیس میں ایسے ہمدم و دیرینہ کا ملنا واقعی مسیحا اور خضر کی ملاقات سے بہتر ہے۔ مکان تو مکان اس سے تو اگر ہم جان تک مانگیں تو یہ عذر نہیں کر سکتے ہوٹل میں ٹھہرنے ہی پر ایسے خفا ہوئے کہ مشکل راضی ہو سکے کہنے لگے "اچھا کھانا کل ساتھ کھاؤ۔"

عرض کیا "بھائی جان میں مہمان بن کر نہیں آیا ہوں، وبالِ جان بن کر حاضر ہوا ہوں۔" یہ کہہ کر تمام حالات سنا دیئے کہ اب مستقل طور پر یہیں رہنا ہے اور جب ٹیپ کا بند عرض کیا کہ فوراً مکان دلوائیے ڈھونڈھ کر تو ایک دم رُخِ روشن کی تمام روشنی غائب۔ دیر تک آسمان کی طرف دیکھتے رہے گویا ہمارے لیے عالمِ بالا میں مکان تلاش ہو رہا ہے

[illegible] ——— ،، ——— مشکل ہے

[illegible] سے مکان کا پتہ پوچھ لے۔ [illegible] ایک [illegible]
[illegible] انداز سے بولے" مکان!"
[illegible] مکان۔ یعنی جو مکان ہوتا ہے نا۔ رہنے کے لیے یعنی کرایہ کا مکان۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] فرمایا: وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر [illegible] مکان [illegible]
جناب [illegible] عرض کیا۔ بہر حال!
ارشاد ہوا: مطلب یہ کہ غور کر دیکھا!
[illegible] بات [illegible] یعنی [illegible] مکان [illegible] چاہیئے [illegible]
کہ مجھے مکان [illegible] چاہیئے!
ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد فرمایا: "بڑا پرابلم ہے صاحب بڑا پرابلم۔ بہر حال اور لوگوں سے بھی [illegible]
میں بھی کوشش کرتا ہوں"

ان حضرت کے رویے میں [illegible] اور اخلاق زیادہ [illegible] تھا۔ [illegible] دوسرے لوگوں سے بھی گائیڈ کی ایمانداری کے ساتھ [illegible] مصیبت [illegible] لوگ [illegible] مکان ڈھونڈ [illegible] مگر وہ جو مشہور ہے جو ڈھونڈے وہ پائے [illegible] ایک [illegible] ہوٹل کے گائیڈ [illegible] سے آدمی ہیں خصوصاً ہمارے ساتھ تو اسٹیشن پر اس اخلاق سے پیش آتے تھے کہ ان کا بس چلتا تو [illegible] ضروری اسباب اٹھا لیتے۔ جب ہمارے برابر خیریت پوچھ لیا کرتے تھے اور خدمات لائقہ کا برابر تقاضا فرمایا کرتے تھے۔ آخر ہم نے اُن سے عرض کر دیا کہ" بھائی صاحب سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ مکان دلوائیے کوئی"
پہلے تو وہ منہ کھول کر اس طرح رہ گئے گویا اس وقت ہم کو آنکھوں کے بجائے منہ سے گھور رہے ہیں۔ پھر تعجب سے بولے" مکان یعنی مکان آخر کیوں؟"
ہم نے اپنا مفہوم واضح کرتے ہوئے کہا" بھئی رہنا ہے نا۔ تو اس لیے مکان چاہیئے ہے ہم کو"
کچھ ڈرے ہوئے انداز سے فرمایا" آخر آپ کو ہوٹل سے کیا شکایت ہے؟"
ہم نے سمجھ کر بڑے تدبر سے کہا" او ہو، آپ غلط سمجھے، ہوٹل کی بات نہیں ہے مجھے اب مستقل طور پر لاہور میں رہنا ہے۔ بال بچوں کو بلانا ہے۔ اس لیے کرایہ کا مکان چاہتا ہوں"
گائیڈ صاحب نے اب پھر سے اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے کہا" ہوں۔ ہوں تو گویا مکان۔ مگر صاحب مکان ہے ———"
ہمارے دل نے باقی جملہ پورا کر دیا ——— بڑا پرابلم ہے ———
گائیڈ صاحب کہہ رہے تھے" مگر خیر یہ جلدی کا کام نہیں ہے۔ فی الحال آپ ہوٹل ہی میں رہیئے میں برابر مکان

کی فکر رکھوں گا۔"

ظاہر ہے کہ ان حضرت نے محض اپنے ہوٹل کی وجہ سے یہ بات کہی تھی۔ ان کو بجائے مکان کے زیادہ ہوٹل کی فکر ہونا چاہیے۔ ان سے ہمارا مطالبہ ہی غلط تھا مگر اہل غرض اندھے تو ہوتے ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ بیوقوف بھی ہونے کی سعی بلیغ فرماتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ اس حماقت کا اس قدر جلد احساس ہو گیا۔ چنانچہ اب کی مرتبہ ہم نے سمجھ بوجھ کر ایک ایسے شخص سے مکان کے متعلق کہا جس کے انتخاب پر خود ہم کو ناز ہے چشمہ لگا کر آنکھوں کی کمزوری کا علاج کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نظر انتخاب بھی کمزور ہے۔ ہوا یہ کہ حضرت جوابی تار آیا تھا۔ اسی ہوٹل کے پتہ پر فوراً خیریت لکھو۔ طریقہ یہ ہے کہ تار والے کو کچھ نہ کچھ اس بات کا انعام دیا جاتا ہے کہ وہ ان کے مرنے کا تار نہیں لایا۔ چنانچہ ہم نے بھی بزرگوں کی اس رسم کو قائم رکھا۔ تار والا تھا شریف آدمی، نہایت اخلاق سے "اس کی کیا ضرورت ہے صاحب جی" کہہ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ ہم نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔ یہ تو خیر یوں ہی ہے البتہ اگر مکان دلوا دو کہیں سے ہم کو تو پھر انعام دیں گے۔ اس نے چشمہ کی اوٹ سے ہم کو اس طرح دیکھا گویا ہمارے متعلق یہ غور کر رہا ہے کہ اس شخص کے متعلق مکان میں رہنا ٹھیک کہا جا سکتا ہے یا حجرہ میں رہنا اور تفصیلی طور پر غور کرنے کے بعد تار کی زبان میں ارشاد فرمایا "مکان اچھا جی"۔ تار کی عبارت غیر متعلق لوگ ذرا کم سمجھتے ہیں مگر ہم ٹھہرے اہل معاملہ فوراً سمجھ گئے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ وہ بے چارہ سلام کر کے رخصت ہوا اور ہم پھر ان لوگوں کی تلاش میں نکل گئے جن کے متعلق مکان کی تلاش کے سلسلہ میں ذرا بھی شبہ ہو سکتا تھا۔ تفصیلات سے نہ آپ کو دلچسپی ہوگی نہ میں اپنی ہی باتیں بتلانے کا شوقین ہوں۔ البتہ اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ایک لسی والے سے مکان کے لیے کہا اور محض یہ کہنے کے لیے لسی کا ایک گلاس پینا پڑا۔ ایک ہیر کٹنگ سیلون میں تفصیلات سے مکان کی اپیل کرنے کے لیے بال بنوا ڈالے۔ ایک تانگہ والے کے چہرے پر "ٹو لیٹ" کا سائن بورڈ نظر آیا لہٰذا ایک گھنٹہ کا کرایہ اس کو دے دیا۔ ایک دن۔ دو دن۔ تین دن یہاں تک کہ اسی جستجو میں صبح ہونے لگی اور شام ہونے لگی مگر مکان نہ آج ملتا ہے نہ کل۔ ملی ملائی اچھی خاصی ملازمت کو چھوڑ کر بھاگنے کی ٹھانی۔ اپنے آقائے نامدار سے بھی مکان کی مشکل کے مقابلہ میں ملازمت سے دست برداری کے آسان ہونے کا اظہار کر دیا۔ مگر اس سلسلہ میں اس کثرت سے "پرابلم" کا لفظ سنا ہے کہ اب تو یہ شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں پنجابی زبان میں انگریزی کے اس لفظ کے معنی مکان ہی کے تو نہیں ہیں۔

جستجو پر ایک وقت وہ بھی گزرتا ہے جب جستجو کرنے والا تھک کر بیٹھ رہے اور منزل خود اسے ڈھونڈنے نکلے۔ چنانچہ ہم اس کمال کو بھی آخر پہنچ ہی گئے۔ گھر خط لکھ دیا کہ نوکری مل گئی ہے مگر تم سب کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس لیے کہ مکان نہیں ملتا۔ ارادہ کر لیا کہ کسی ہوٹل ہی کو اپنا یتیم خانہ بنائیں گے۔ ایک ہوٹل سے بات چیت بھی کر لی۔ اب خدا کی دین ملاحظہ ہو کہ مکان ملنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے گاڈ صاحب نے ایک مکان کا مژدہ سنایا ہم نے بے اختیار ان کو کلیجہ سے لگاتے ہوئے عرض کیا کہ یوں نہیں جناب پہلے آپ یہ کہیے کہ کل صبح چائے میرے ساتھ نوش فرمائیے۔ اس کے بعد ہم دونوں چلیں گے مکان دیکھنے۔ وہ فرشتہ رحمت تو تھے ہی ہماری محبت کو بھلا کیسے

[illegible] کہتے تھے۔ بہرحال [illegible] ایک [illegible] اب اس کی [illegible] ایک کمرہ [illegible] سامان [illegible] ہونا چاہیے۔ کہ آدمی [illegible] خواب [illegible] نہیں بلکہ [illegible]۔ اس طرح ہر کمرہ کا [illegible] [illegible]

[illegible]

جوں ہی [illegible] مکان [illegible] کل کسی وقت دیکھ لیجئے۔

ہم نے سوچا کہ دیکھیں مکان [illegible] دیکھیں۔ [illegible] صاحب کو [illegible] ہو گئی [illegible] مکان دیکھنے گئے تو [illegible]۔ مگر اس بیچارے نے ہی محبت [illegible]۔ [illegible] غور کرنے کے بعد [illegible] مکانات کیسے لگتا ہے۔ [illegible] کی عقل نہیں [illegible] کہ گراں [illegible] ناشناسی ہے۔ [illegible] ہو گیا۔ [illegible] ہم اس کے تانگہ پر روانہ ہوئے۔ چلا چل۔ چلا چل۔ شہر کے تمام محلے ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے۔ یہاں تک کہ [illegible] کی تمام آبادیاں ختم ہو گئیں۔ مگر ہمارے مجوزہ دولت خانہ کا کہیں پتہ نہیں۔ تانگہ ہے کہ چلا جاتا ہے۔ ادھر ہم ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ اس سے پوچھیں تو سہی کہ آخر ارادہ کیا ہے۔ مگر پھر خود ہی اپنے [illegible] پر شرما کر رہ گئے۔ کہ اس بیچارے نے تو ہماری محبت میں اتنی دور تک خاک چھان کر [illegible] مکان ڈھونڈا ہے۔ اور ہم اس کے جذبہ کی یہ قدر کرتے ہیں کہ ذرا سے فاصلہ ہی کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ غالباً اس غریب کو پتہ [illegible]۔ لہٰذا وہ بخط مستقیم چلا جا رہا تھا۔ لاہور میں اس کو مکان نہ مل سکا تو اس نے کسی اور شہر ہی سہی۔ بہرحال مکان ڈھونڈنا۔ آخر خدا خدا کرکے اب اس نے سڑک کو چھوڑ کر گلیاں دریافت کیں۔ ایک گلی سے دوسری میں، دوسری سے تیسری میں اور تیسری سے چوتھی میں جا کر ایک جگہ تانگہ روک کر کہا: "یہ ہے سامنے والا مکان۔"

ہم نے چاروں طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا: "کون سا مکان؟"

اطمینان سے کہنے لگا: "وہ جو ٹاٹ کا پردہ سامنے پڑا ہے نا بس اسی کے اندر ایک طرف کو مکان ہے۔"

ہم نے اس ٹاٹ کے پردے کو دیکھا جو ایک آبنائے پر اس طرح پڑا ہوا تھا گویا جہاز ڈوب چکا ہے صرف اس کا پھریرا باقی رہ گیا ہے۔ ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ اور یہاں پیراکی سے قطعاً ناواقف۔ مرتے کھپتے۔ دیوار سے چپکے ہوئے اس ٹاٹ کے پردے تک پہنچے اور اندر جو جھانک کر دیکھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مالکہ مکان ایک بڑی بھاری بکری سے کان میں کچھ باتیں کر رہی تھیں تاکہ ان کی مرغیاں نہ سننے پائیں۔ ہم کو دیکھتے ہی اندر بلا لیا اور مکان دیکھنے کی غرض

معلوم کہنے کے بعد بولیں:

"یہی ہے بیٹا مکان دیکھ لو۔ میرا کیا ہے میں ایک کونے میں پڑی رہوں گی"

وہاں سے جو بھاگے ہیں تو ہوٹل کے پاس پہنچ کر اس وقت ہوش بجا ہوئے جب تانگہ والے کو ساڑھے تین روپے مکان کی رونمائی کے سلسلے میں دینا پڑے مگر اطمینان تھا کہ یہ مکان تو تفریحاً دیکھا ہے۔ اصل میں تو صبح دیکھیں گے گائڈ صاحب کے ساتھ۔

صبح گائڈ صاحب بیچارے کو جب المکلّف الخدمت کو رخصت فرمایا تو مکان دکھانے لے چلے۔ یہ مکان یقیناً کسی زمانے میں مکان تھا۔ غالباً نانا فرنویس کے زمانہ میں اس کی پہلی مرتبہ مرمت ہوئی تھی۔ آسانی صرف یہ تھی کہ اس میں رہ کر انسان اپنی اس نخوت کو بھول سکتا تھا جو با وجہ اشرف المخلوقات سمجھ سمجھ کر اپنے اوپر طاری رکھتا ہے۔ گائڈ صاحب نے نام کے ساتھ "غازی" دیکھ کر غالباً یہ سمجھ لیا تھا کہ ان حضرت کو اصطبل درکار ہے۔ آفتاب کی روشنی سے آنکھوں کو جو تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے پورے بچاؤ کا انتظام تھا۔ ہوا لگ جانے سے جو بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کا بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہر کمرہ غسل خانہ اور ہر غسل خانہ آسانی سے کمرہ بن سکتا تھا۔ نمی اس قدر تھی کہ خس کی ٹٹیوں کا خرچ آسانی سے بچایا جا سکتا تھا۔ ہر کمرے کا فرش ایسا کہ چاہے کھیتی باڑی شروع کر دیجئے، چاہے پھول دار چمن بنا لیجئے مختصر یہ کہ ہم نے مکان دیکھنے کے بعد گائڈ صاحب کا منہ جو دیکھا تو دونوں میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ وہ بھی عجیب آثار قدیمہ بنے ہوئے کھڑے تھے۔ مزہ یہ کہ ہم کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا:

"کیا رائے ہے؟"

ہم نے کہا "مکان کے متعلق تو بعد میں عرض کروں گا پہلے تو مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ آپ کی کیا رائے ہے میرے متعلق"

صاف گوئی تو دیکھئے کہنے لگے "آپ اچھے رہیں گے اس میں"

ہم اپنے کو سنبھالتے ہوئے اس مکان سے نکل آئے اور اس کے بعد سے گائڈ صاحب کی صورت سے وہ نفرت ہوئی ہے کہ اگر مکان فوراً مل نہ جاتا تو عدم تشدد پر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ جیل میں رہنے کا انتظام ہو ہی جاتا۔ مگر شکر ہے کہ سب سے پہلے دوست نے آخر ایک جگہ تلاش کر دی اور ہم سے دوستی کے نام پر اپیل کی کہ ہم اس جگہ کو مکان سمجھیں۔ اس میں کمرے بھی ہیں، دروازے بھی، چھت بھی ہے اور غسل خانے بھی۔ کوٹھڑیاں بھی ہیں اور باورچی خانے بھی مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کو مکان نہیں کہا جا سکتا البتہ کہیے تو "پرابلم" کہہ دیا کریں۔

اب سنیئے دیگر پرابلموں کی ریل پیل:-

"مکان تو مل گیا ہے اب ملازم دلوائیے"

"جی کیا کہا۔ ملازم؟ ملازم تو بڑا پرابلم ہے"

"مکان اور نوکر تو آپ کی دعا سے مل گئے ہیں البتہ ضرورت کی بعض چیزیں نہیں ملتیں مثلاً گھی"

- بھئی ——— بھئی تو بڑا پرابلم ہے:
- اچھا صاحب ذرا اداسی۔ ہم بتا دیتے ہیں کہ وہ بیچارے تم شکر؟
- شکر بیچ میں جا بیٹھے بے تکلف ——— صاحب جی وہ بڑا پرابلم ہے:

جیسے کہا۔ اسلام علیکم جیسی کے لیے جیسے کا۔ تو حاصل کرتے ہیں اپنے زند پاکر کی کس سے دور ہے:

- خدا جانتا ہے اس فکر میں ابھی تک ہوں بیاہ یہ دن کا معاملہ بڑا پرابلم ہے:

غرض ہر کہ لا الہ الا اللہ جو چیز ہے پرابلم۔ جو بات ہے پرابلم۔ فیصلہ اس پر پہنچے۔ یہ ہونے کی وجہ سے پھر میں
اب لاہور میں یہ پرابلم چھڑ جانے کا مصیبت تو اس پرابلم کے مت میں یہ کہ حل ہو جائے تو پرابلم نہ حل ہو تو
پرابلم۔ پہلے تو صبر کر لیا تھا کہ شاید صرف مکان کی کمی ہی پرابلم ہے مگر اب تو معلوم ہو رہا ہے کہ ہر بات
ہی کو پرابلم کہنا ہے کا جان ان پرابلموں کے مارے ہم خود ہی حل ہوئے جاتے ہیں۔

کچھ یادیں، کچھ باتیں

اودھ اخبار صحافت کے دورِ اوّل کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی ادارت مل جانے کو ہی ایک صحافتی معراج سمجھا جاتا تھا اس لیے کہ اس کرسی پر ایسے ایسے نامور لوگ رہ چکے تھے جن کے ڈنکے ادب میں آج تک بجتے ہیں مگر اودھ اخبار کا قلمدانِ وزارت سنبھالنے کے بعد پتہ چلا کہ اب تو یہ روزنامہ محض ایک روزگار بن چکا ہے۔ نہ مطبع نول کشور کے مالکوں کو اس سے کوئی بحث ہے کہ اس کی اشاعت کیا ہے نہ اس سے کوئی بحث ہے کہ یہ کتنے نقصان پر چل رہا ہے وہ تو بس اس کو نول کشور جی کی یادگار کے طور پر نکالے جا رہے تھے۔ نہ اس کی کہیں کوئی ایجنسی تھی نہ خود لکھنؤ کے کسی بازار میں فروخت ہوتا تھا بس چار پانچ سو پرچے وضعداری کے طور پر چھاپے جاتے تھے ورنہ جانے کہاں چھپا دیئے جاتے تھے۔ نہ اس کے کسی شہر قصبہ یا گاؤں میں نامہ نگار تھے نہ کسی اور ہی ذریعے سے خبریں فراہم ہوتی تھیں۔ ہوتا صرف یہ تھا کہ صبح تڑکے لکھنؤ میں شائع ہونے والے انگریزی اخبارات آجاتے تھے اور ان کی تھوڑی بہت خبریں الٹا سیدھا ترجمہ کرکے نہایت [illegible] کتابت کے ساتھ شائع کر دی جاتی تھیں۔ چند مراسلہ نگار جن کے مراسلے دوسرے اخبارات شائع نہ کرتے تھے اپنے مراسلے بھیج دیا کرتے تھے۔ ایک ایڈیٹر ہوتا تھا اور دوسرا اس کا نائب۔ یہ دونوں مل کر ان ہی خبروں کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ایڈیٹر صاحب اداریہ لکھنے بیٹھ جاتے تھے اور نائب صاحب قینچی ہاتھ میں لے کر ڈاک میں آئے ہوئے تبادلے کے اخبارات کی قطع و برید و درج کرتے تھے لیکن اگر سچ پوچھیے تو اس سارے عملے میں کام کے صرف ایک ہی بزرگ تھے جو اپنے منصب کے اعتبار سے تو کاتب تھے مگر تھے ہر مرض کی دوا۔ اسم مبارک تھا منشی بنواری لعل اور تخلص تھا شوخ۔ کتابت اور شاعری تو یہ خیر کرتے ہی تھے مگر اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ مثلاً ایڈیٹر صاحب کی طبیعت موزوں نہیں ہے یا وہ بیٹھے نائب کے ساتھ تاش کھیل رہے ہیں تو منشی بنواری لعل شوخ ہی ایڈیٹوریل بھی لکھ دیا کرتے تھے اور اس ایڈیٹوریل کا کوئی جداگانہ مسودہ نہ ہوتا تھا بلکہ وہ براہِ راست کتابت ہی کرتے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دفتر میں اگر کسی کا دبدبہ تھا تو منشی بنواری لعل شوخ کا، جو نہ ایڈیٹر کو خاطر میں لاتے تھے نہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کو بلکہ ان کو یہ بھی اختیار حاصل تھا کہ وہ ایڈیٹر صاحب کے لکھے ہوئے اداریے میں جہاں چاہیں اصلاح کر دیں اور ایڈیٹر کو بتا دیں کہ یہ بات تم نے غلط لکھی تھی جس کو میں نے یوں ٹھیک کر دیا ہے اور بے بس سا ایڈیٹر کو صرف مسکرانا پڑتا تھا ورنہ منشی بنواری لعل شوخ اس کو آٹھ آٹھ آنسو رلانا بھی جانتے تھے۔

اور اسی طرح چار مہینے کے بعد جب ملازمت [illegible] جب یہ کیفیات میں نے نہیں دیکھی [illegible] [illegible] کیا ہی اچھا ہوں اور اس ملازمت میں کچھ مضمون کا کام ہو سکے تو منشی پریم چند، جو ان دنوں مشہور افسانہ نگار [illegible] منشی نول کشور کے شعبہ تصنیف و تالیف [illegible] اور اودھ اخبار [illegible] بہت [illegible] میں نے اس حالت کی تفصیلیں ان کو بتا کر ان سے مشورہ لیا [illegible] کچھ [illegible] [illegible] آپ جس کام [illegible] صاحب [illegible] اور [illegible] یہ [illegible] جاتا ہے۔ آپ اگر مجھے [illegible] اصل اس کی [illegible] منشی نول کشور کا جو تصور [illegible] دائرہ میں [illegible] منشی نول کشور [illegible] مقصد ہے یعنی یہ اخبار کی [illegible] نہیں بلکہ نول کشور کی روح [illegible] بنانا چاہیے اس لیے کہ اس سے [illegible] منشی نول کشور کو [illegible] خاطر خواہ [illegible] کے علاوہ [illegible] کا اور کوئی مقصد نہیں۔ میں نے منشی پریم چند سے [illegible] ہو سکے گا اور یہ حرام کی تنخواہ مجھے کیسے ہضم ہوگی؟ انھوں نے مسکرا کر خندہ پیشانی سے [illegible] اور آپ یہ دعوے سچائی سے کرتے ہیں کہ [illegible] تو آپ اس کے لیے ایک اسکیم [illegible] بنائیے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ وہ اسکیم آپ [illegible] منشی بشن نرائن بھارگو کے سامنے پیش کر دوں گا [illegible] کہا یا جا سکتا ہے لکھا دوں گا۔ منشی پریم چند کے اس وعدے کے بعد میں نے ایک مفصل اسکیم بنائی [illegible] ہے۔ میں اس طرح اس کی [illegible] چاہتا ہوں [illegible] اس طرح [illegible] چاہتا ہوں۔ [illegible] کے علاوہ اپنے مقالے [illegible] اخبار کی ترتیب، کتابت اور طباعت میں یہ انقلاب چاہتا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ منشی بنواری لعل کو [illegible] بالکل ہی نہیں چاہتا بلکہ صرف ایک کاتب کی حیثیت سے چاہتا ہوں جس کا اور کسی بات میں کوئی دخل نہ ہو سکے۔ منشی پریم چند نے پوری اسکیم نہایت غور سے سنی۔ منشی بنواری لعل والے حصہ میں یہ ترمیم کی کہ ان کا نام نہ لکھو بلکہ یہ لکھ دو کہ [illegible] صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ عملہ کے لیے ایڈیٹر کے احکامات اور ہدایات کو قطعی سمجھا جائے اور اس میں کسی کو مداخلت کا مجاز نہ سمجھا جائے۔ ایڈیٹر کو اپنے عملہ کے تقرر اور برخاستگی کے کل اختیارات حاصل ہوں۔ میں نے اس ترمیم کو اپنے اختیارات کے لیے اور بھی مستحکم سمجھ کر قبول کر لیا۔ چنانچہ منشی پریم چند کی معیت میں منشی بشن نرائن بھارگو مالک مطبع کے سامنے میری پیشی ہوئی جہاں سب سے پہلے منشی پریم چند نے ایک نہایت [illegible] تمہیدی تقریر کی۔ اس کے بعد میری اسکیم ان کے سامنے پیش کر دی گئی۔ بدقسمتی سے اس وقت بھارگو صاحب ریس پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے اور ان کے ذہن میں گھوڑوں کا اصطبل کھلا ہوا تھا۔ انھوں نے اسکیم لے کر رکھ لی کہ میں اس پر غور کر دوں گا۔

میں نے منشی پریم چند کے مشورے سے منشی بنواری لعل شوخ سے نہایت روادارانہ تعلقات قائم رکھے یہاں تک میرے فرائض میں یہ بھی شامل ہو گیا کہ روزانہ ان کی ایک تازہ غزل سُنا کروں اور اس کی بے حد داد دیا کروں۔ ایک

دی وہ ایک نہایت خوبصورت فریم میں ایک نہایت طویل فارسی کا قصیدہ تھا جو شاہ نادر شاہ والیٔ افغانستان کی شان میں تھا اور منشی ہزاری لعل شوخ اسے جشن تخت نشینی کے موقع پر سفیر افغانستان مقیم دہلی کے توسل سے بھیجنا چاہتے تھے۔ نہایت ثقیل فارسی تھی اس قصیدہ کی [illegible] کی آمد کا سرے سے زمانہ ہی [illegible] دیکھا تھا مگر جب منشی ہزاری لعل شوخ نے وہ قصیدہ بھجوا دیا تو کچھ ہی دن بعد ان کو ایک [illegible] موصول ہوا جس میں دربار افغانستان کی طرف سے ایک پروانہ خوشنودی تھا، ایک پارکر قلم اور ایک سونے کی گھڑی۔ اب تک تھا سب تو منشی ہزاری لعل شوخ۔ سب کے سب متفق ہو گئے تھے کہ ان کی شان میں سب قصیدے کہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ منشی ہزاری لعل شوخ کی شاعری نے مجھ کو اب عاجز کیا کہ میں نے منشی پریم چند سے فریاد کی [illegible] تب گڑگڑا کر کہ جب تک بھارگو صاحب اس اسکیم پر عمل پیرا رہے ہیں ہم سے کہ خود کو منشی ہزاری لعل شوخ کی شاعری سے تو نجات دلا دیجئے چنانچہ منشی پریم چند نے اور حضرات نے [illegible] کا معائنہ کیا۔ اسی وقت۔ اعلان ہو گیا کہ تیرا کمرہ میرے کمرے سے ملا ہوا ہونا چاہئے۔ اور اس طرح میں منشی ہزاری لعل شوخ کی دسترس سے نکل جاتا۔

میں منشی پریم چند سے زیادہ سے زیادہ قریب پہنچ گیا تھا اتنا قریب کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہی بیٹھے پوچھ لیا کرتے تھے کہ کیوں بھئی شوکت صاحب حضرت آدم کی اہلیہ کا کیا نام تھا؟ اور یہ [illegible] دریافت کر لیا کرتا تھا کہ رکشا بندھن کی تاریخ کیا ہے؟ اور وہ کبھی میرے کمرے میں آ کر اور کبھی مجھ کو اپنے پاس بلا کر بڑی تفصیل کے ساتھ اسی قسم کی معلومات فراہم کرتے رہتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگ خیال کے مدیر حکیم یوسف حسن صاحب نے مجھ کو ایک خط لکھا کہ میرا ایک کام کر دو۔ منشی پریم چند سے ایک افسانہ لے کر میرے نام وی۔ پی کرا دو۔ چنانچہ مجھ کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ افسانے اور مضامین بھی وی۔ پی کئے جاتے ہیں۔ جب میں نے منشی پریم چند سے کہا تو وہ کچھ جھینپ سے گئے اور بڑی دیر کے بعد کچھ عجیب شرماتے ہوئے انداز سے کہا کہ یہ سلسلہ [illegible] مرحلہ ہوتا ہے کہ مثلاً آپ کے ذریعہ سے فرمائش آئی ہے تو میں کیونکر وی۔ پی بھیجوں اور بھیجوں بھی تو کس رقم کا۔ بہرحال میں افسانہ لکھے دیتا ہوں پھر دیکھا جائے گا۔ اور دیکھا یہ گیا کہ بہت شرماتے ہوئے ایک دن منشی پریم چند نے پچاس روپے کا وی۔ پی بھیجا جو فوراً وصول کر لیا گیا۔ اس زمانہ میں ادبی مضامین کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور معاوضہ بھی اتنا کہ شرماتے رہنے پر بھی گویا بڑی رعایت کے ساتھ پچاس روپے۔

سچی بات یہ ہے کہ مجھ کو تو منشی پریم چند پر بہت ہی رشک آیا اور ادبی رسائل سے مضامین کا معاوضہ لینے کی راہ منشی پریم چند ہی نے مجھ کو سجھائی تھی مگر ایک افسانہ کا معاوضہ پچاس روپے دینے والے تو آج بھی شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

وہ اسکیم جو میں نے منشی پریم چند کے ساتھ جا کر بھارگو صاحب کو دی تھی اس کا چھ مہینہ بعد یہ پتہ چلا کہ وہ بھارگو صاحب نے اپنے نہایت قریبی دوست رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف ہسٹری آف اردو لٹریچر کو غور کرنے کے لیے دے رکھی تھی چنانچہ منشی پریم چند نے ایک دن مجھ کو یہ پیغام دیا کہ تم کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے طلب کیا ہے جو اصلاً تو ڈپٹی کلکٹر ہیں مگر آج کل حکومت صوبجات متحدہ کے محکمہ اطلاعات کے افسر اعلیٰ لگے ہوئے ہیں اور پھر ان کے متعلق مجھ کو چند موٹی موٹی باتیں سمجھا دیں کہ وہ آدمی نہایت علامہ قسم کے ہیں چنانچہ تم پر فرض ہے کہ تم ان کو علامہ سمجھو اور ان کو یقین دلا دو کہ اگر

میں نے اردو کا تذکرہ انگریزی میں لکھا ہوا [illegible] اردو ترجمہ میں دخل [illegible] کے متعلق [illegible] نصیب ہوا وہ آپ ہی کی ذات والا صفات سے [illegible] یہ قصیدہ [illegible] ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی مدت میں [illegible] تو میں نے دیکھا ایک [illegible] کرسی پر [illegible] [illegible] اس [illegible] [illegible] [illegible] انگریزی [illegible] اردو [illegible] [illegible] ہو جاتی تھی۔ [illegible] اردو [illegible] کے متعلق [illegible] [illegible] اس کے بعد [illegible] سوال [illegible] کہ آپ نے [illegible] اردو [illegible] میں نے [illegible] قصیدہ شروع کر دیا [illegible] منشی پریم چند [illegible] [illegible] یہ قصیدہ [illegible] اور [illegible] معلوم ہو رہا تھا [illegible] قصیدہ [illegible] [illegible] چنانچہ [illegible] [illegible] جانی گئی تھی۔ چنانچہ [illegible] داخل ہوا آپ نے [illegible] [illegible] مجھ سے [illegible] کا حصہ بھی تیار کر رہا ہوں جس میں اس وقت کے [illegible] اور [illegible] کا ذکر ہوگا۔ [illegible] وقت نہیں ملتا۔ مثلاً یہ گروپ دیکھئے۔ میں نے جب اس گروپ کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں پہچانتا ہوں یہ گروپ [illegible] پہلی آل انڈیا [illegible] کانفرنس کا گروپ تھا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اس تصویر میں ایک [illegible] پر انگلی رکھ کر کہا "ان کو پہچانتے ہیں آپ؟" میں بھلا اس بے خد و خال دھبہ کو کیا پہچانتا۔ [illegible] اس کو دیکھ ہی رہا تھا کہ آپ نے [illegible] فرمایا "یہ میں ہوں۔ دماغ کا سوت نکال کر آیا ہوں گر [illegible] کانفرنس میں [illegible] وہ لوگ بھی یاد کریں گے کہ کس حیثیت کا [illegible] کانفرنس میں [illegible] کر لیا تھا" میں ان کی مرضی کے مطابق اس گروپ کو دیکھ کر [illegible] بھی [illegible] ہو گیا مگر بعد میں صرف یہی کہا کہ آپ کی [illegible] سیاسی اور سرکاری ذمہ داریاں کاش آپ کو اردو کی حق تلفی نہ کرنے دیں۔ [illegible] [illegible] کے سر پر [illegible] [illegible] چڑھا دیجئے۔ یہ سن کر [illegible] میری طرف [illegible] [illegible] کہا [illegible]

ایک ہفتہ کے بعد منشی پریم چند نے مجھ کو چند کاغذات دیتے ہوئے کہا کہ تمہاری اسکیم بڑی حد تک منظور کر لی گئی ہے معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو خاصا شیشہ میں اتار چکے ہو۔ [illegible] اب مجھ کو بتانا پڑا کہ اس موضوع میں تین چٹھیاں ہو چکی ہیں اور [illegible] قصیدہ بھی سنا چکا ہوں بہرحال میں اس کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ منشی بنواری لعل شوق کے بجائے مجھ کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی دربارداریاں کرنا پڑ رہی ہیں اور ان کا یہ صلہ بھی مل گیا ہے کہ میری اسکیم بڑی حد تک منظور ہو گئی ہے۔

ابھی اس اسکیم پر عملدرآمد شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نولکشور اسٹیٹ معہ روزنامہ اودھ اخبار کے کورٹ آف وارڈس میں چلی گئی اور سارے کئے دھرے پر پانی پھر گیا۔ منشی پریم چند کچھ دن پہلے ہی بنارس جا چکے تھے میرے لیے بھی اب اودھ اخبار میں رہنا ممکن نہ رہا۔

(۲)

وصل صاحب کا ذکر ختم ہو تو کسی اور کا بھی ذکر شروع کیا جائے مگر یہ ذکر نہ اتنا مختصر ہے کہ اتنی جلدی ختم ہو جائے

نہ اتنا محدود کہ اس میں کسی اور کے ذکر کی گنجائش ہی نہ نکلے میں تو جس کسی کا ذکر چھیڑنا چاہتا ہوں، وصل صاحب کو ہر ذکر میں موجود پاتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ گو بلگرام سے لکھنؤ آ جانے کے بعد وصل صاحب ایک انسان نہیں بلکہ ایک انجمن بن کر رہ گئے تھے۔ اور لکھنؤ کے تمام شعری اور ادبی حلقے کی ٹھیکیداری اس حد تک ان کے حصے میں آ گئی تھی۔ کہ لکھنؤ کی ادبی محفلیں تو درکنار، لکھنؤ سے باہر بھی اگر کوئی مشاعرہ ہوتا تھا۔ تو بانیانِ مشاعرہ لکھنؤ کے شعراء کو مدعو کرنے۔ کے دعوت نامے شعرا کے گھر پر بھیجنے کے بجائے سیدھے وصل صاحب کی خدمت میں بھیجتے تھے اور وصل صاحب ہی سب کی طرف سے وعدہ کر کے بانیانِ مشاعرہ کی طرف سے بڑے میزبان بن جایا کرتے تھے۔ اور اب یہ ان کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ کہ وہ لکھنؤ کے شعرا کو دعوت نامے پہنچائیں۔ ان کو مشاعرے کی شرکت کے لیے راضی کریں۔ اور وہ اگر شرافت سے مانیں۔ تو خیر نہیں تو ڈرا کر، دھمکا کر، ڈانٹ کر، ڈپٹ کر، بہرحال کسی نہ کسی طرح راضی کریں۔ اور اپنی قیادت میں ان کا قافلہ لے کر روانہ ہوں۔ راستے میں وہ ہر شاعر سے فرداً فرداً اس کی طرحی غزل سنتے تھے۔ کسی سے کہتے تھے کہ اپنا ساتواں شعر کاٹ دیجئے۔ کسی کو حکم ملتا تھا۔ کہ اپنا دوسرا مطلع غزل سے خارج کر دیجئے۔ کسی کو نویں شعر کے پڑھنے کی ممانعت ہوتی تھی کسی کو گیارہویں شعر کے نہ پڑھنے کی تاکید کی جاتی تھی اور اگر اس کی وجہ پوچھی جائے۔ تو نہایت سادہ سا جواب دیا جاتا تھا کہ یہ میں پڑھوں گا۔ حالانکہ خود ان کے پڑھنے کے لیے ایک نہیں کئی غزلیں ان کی جیب میں ہوتی تھیں۔ جن کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کہاں سے آئیں جس پر یہی کہہ کر رہ جانا پڑتا تھا کہ۔ ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

مشاعرے سے کچھ دیر پہلے وصل صاحب ان سینکڑوں اشعار میں سے چن چن کر ایک تیرہ شعری غزل تیار کرتے تھے جو ظاہر ہے کہ عجیب مجموعے قسم کی ہوتی تھی اور حاصلِ مشاعرہ بھی بننے کی مستحق ہوتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وصل صاحب اس کو پڑھ کر غارت کر دیں۔ اس لیے کہ وہ غزل پڑھتے نہیں بلکہ "غزل ڈانٹتے" تھے۔ چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں سے خون چھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں۔ منہ سے جھاگ اڑتا تھا اور وہ زانو پیٹ پیٹ کر اس طرح ایک ایک شعر پڑھتے تھے۔ گویا ہر شعر کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے ہیں اور کہہ چکے ہیں کہ آج یہ شعر نہیں یا ہم نہیں۔ ان کی شعر خوانی کا انداز ہسٹیریا کے دورے سے بہت ملتا جلتا تھا مگر کچھ دن کے بعد ان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی اچھی سے اچھی غزل ان کی اس خونخوار شعر خوانی سے ذبح ہو کر رہ جاتی ہے لہٰذا انہوں نے خود پڑھنا ترک کر دیا تھا اور ہر مشاعرے کے لیے کسی نہ کسی خوش آواز شاعر کو پہلے سے طے کر لیا کرتے تھے کہ وہی ان کی غزل پڑھے گا۔ اور وہ صرف داد کی رسید کے طور پر سلام کریں گے۔

وصل صاحب جب سے شاعروں کے تھوک فروش تاجر یا ٹھیکہ دار بنے تھے ان ہی کے درِ دولت پر ہر چھوٹے بڑے شاعر سے ملاقات ہوتی رہتی تھی کہ آج ان کے یہاں حضرت ریاض خیرآبادی ٹھہرے ہوئے ہیں تو کل حضرت جگر مرادآبادی ان کے یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے پھڑپھڑا رہے ہیں۔ مگر راہِ فرار نہیں ملتی۔ ایک دن دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے حضرت جوش ملیح آبادی ان کی حراست میں آئے ہوئے ہیں ہر چند کہ جوش صاحب سے رفیع احمد خاں مرحوم کے ساتھ بارہا ملاقاتیں ہو چکی تھیں

[illegible] مطابق عادت کے معمول کے ایک کام کر رہی تھیں۔ ہاں وصل صاحب کے لنگر میں [illegible] بجانے کا جو تماشہ نظر آیا، وہ کچھ ہی منظر آیا تھا۔ وصل صاحب ان کو اپنے ساتھ مشاعروں میں لے جانے کے بے حد شوقین تھے۔ جوش صاحب ان سے ہر کہیں کہتے تھے کہ وہ کسی طرح ان کو اپنی دلچسپ صحبت سے محروم نہ رکھیں۔ جوش صاحب [illegible] یا اشخاص کو کہ نہیں صاحب اس شاعرہ کے کی ترنم کے لیے آدمی کو ایک عمر چاہیے، جو مجھ میں نہیں پاتا ہے الجھن ہے:

وصل صاحب کو اس کی [illegible] پھر [illegible] حفیظ [illegible] کے [illegible] صاحب [illegible] یہ وقت بتانے ہی پر جوش صاحب نے ایک جھرجھری لے کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا

اُف، اُف، جانے دیجئے صاحب، سنا جاؤں گا، [illegible] جانے دیجئے صاحب!

اور پھر وصل صاحب سے اپنے یہ دانت صحیح کئے جوش صاحب پھر مستانہ [illegible] شروع کر دیں۔ مگر وہ بیچارہ باتوں سے کہیں ان کو وصل صاحب [illegible] حاصل ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد کانپور جانے والی ٹرین میں وصل صاحب اور جوش صاحب ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے، [illegible] وصل صاحب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے دانت باہر نکال کر [illegible] جوش صاحب پھر جھرجھری لے کر "اُف" کہہ کر آنکھیں بند کر لیتے تھے، اور تھوڑی دیر کے بعد وصل صاحب کو پکارتے تھے، وصل صاحب [illegible] لیتے تھے۔ پھر جوش صاحب پہلو بدل کر کہتے تھے کہ "بس صاحب بس" اور وصل صاحب پھر دانت نکال کر دکھا دیتے تھے۔ [illegible] یہ سلسلہ [illegible] کانپور کے اسٹیشن پہنچ جوش صاحب ٹرین سے اترتے ہیں تو [illegible] ختم ہو گیا۔ لیکن صبح ہوتے ہی جوش صاحب [illegible] احباب کو لے کر دریا کی سیر کو گئے اور گنگا کے [illegible] پہنچ کر کشتی کی سیر کے لیے چل گئے۔ آخر ایک کشتی کرایہ پر لی گئی اور اس میں ہم سب بیٹھ کر اس پار سے اس پار جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ گنگا ان دنوں باڑھ پر تھی۔ نہایت خوفناک بھنور پڑ رہے تھے اور ملاح کا دل ہی جانتا ہوگا کہ وہ [illegible] کر جوش صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ ایک دم کشتی میں کھڑے ہو گئے اور پہلے تو ایک مختصر سی مگر نہایت دلنشیں تقریر کی جس کے ممدوح وصل صاحب تھے کہ اس شخص نے کل سے آج تک مجھ پر نہایت [illegible] ظلم کئے ہیں اور مجھ کو زندگی سے اس حد تک بیزار کر دیا ہے کہ اب میں خودکشی کی جرأت آزمانے کے لیے آمادہ ہو چکا ہوں اور یہ کہہ کر انھوں نے کشتی کے ایک کنارے پر ایک پیر اور دوسرے کنارے پر دوسرا پیر رکھ کر ایک پوربی گیت چھیڑ دیا کہ:

اب نہ لکھو سیاں چٹھیاں گوری کی ——— اب نہ لکھو
چٹھیاں پڑھت موسے انسوا بہت ہیں
انسوا بہت جیسے ندیاں ساون کی
اب نہ لکھو سیاں چٹھیاں گوری کی ——— اب نہ لکھو

وہ شوق سے گاتے کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر انھوں نے ساتھ ہی ساتھ رقص بھی شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ

ظاہر ہے کہ ناؤ ڈگمگانے لگی اور ملاح نے چیخ کر کہا کہ ڈوب جائے گی ناؤ صاحب یہ نہ کرو۔ مگر جوش صاحب کا جواب یہی تھا کہ ہم ناؤ ڈبونے ہی کے لیے بیٹھے ہیں اور پھر جونہی دونوں پیروں کو جنبش دی ہے تو ہم سب کو موت کا ایک ایسا جھونکا آیا ہے کہ ہر زبان پر کلمۂ شہادت تھا۔ مولانا آسی نے سنجیدگی سے بُرا مان کر کہا۔

" بیٹھ جائیے جوش صاحب یہ نہایت مہلک مذاق ہے "

جوش صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا " غالب کا شارح اور سنجیدگی کو مذاق کہہ رہا ہے "

مولانا آسی کی شرح دیوانِ غالب اسی زمانہ میں نکلی تھی۔ نشتر سندیلوی نے گھبرا کر کہا " یہ کیا بیہودگی ہے!" اور جوش صاحب نے بڑے رعبِ سلطانی کے ساتھ کہا " یہ کس گستاخ کی آواز ہے؟ میں حکم دیتا ہوں کہ وہ میرے قدموں پر جھک جائے ورنہ یہ لو "

اور اب جو ایک ہچکولا کشتی کو دیتے ہیں تو نشتر سندیلوی " خدا کے لیے جوش بس کرو " کہتے ہوئے واقعی ان کے قدموں پہ جھکے ہوئے تھے۔ اب وصل صاحب کی باری تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ " میں کہتا ہوں جوش "

کہ جوش صاحب نے کڑک کر کہا " خاموش نمبردار جو ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔ نکالو اپنے دانت۔ بالکل ہاں لو۔ اپنی ہتھیلی پر درندے کے اس مصنوعی جبڑے کو رکھ لو۔ کر دو ان کو دریا برد۔ ان ملتجی نظروں سے دیکھتے ہو تو ان دانتوں کو صرف گنگا اشنان کراؤ۔ اب رکھو ان کو جیب میں "

اور وصل صاحب ان کے ایک ایک حکم کی تعمیل کرتے رہے۔ اس کے بعد جوش صاحب دوسروں کی طرف مخاطب ہوئے۔

" اے موت سے ڈرنے والے بزدل شوکت تھانوی اپنی ناک سے کشتی کے تختہ پر دستخط کرو "

میں ایک طرف سہما ہوا بیٹھا تھا اور واقعی اختلاجِ قلب میں مبتلا تھا۔ طرح طرح کے خیال دل میں آ رہے تھے کہ جب اس غرقابی کی خبر گھر پہنچے گی تو گھر میں کیسا کہرام مچے گا۔ میری دکھیاری ماں کیسی پچھاڑیں کھائے گی۔ اس غم کے پہاڑ کو میرا بوڑھا باپ کیونکر برداشت کرے گا۔ میری چاہنے والی بہن اپنا کیا حال کرے گی۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جان بخشی کی صرف یہی صورت نظر آئی کہ کشتی کے تختہ پہ ناک سے لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔ امین سلونوی جو غالباً سہمے ہوئے بیٹھے تھے اپنی مونچھوں کا سارا تاؤ بھول چکے تھے اور اس دنیائے فانی کو بڑی حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ اپنا نام سن کر چونکے۔ جوش صاحب نے ان کو للکار کر کہا " اپنا شجرہ بیان کرو "

اور جب ان کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی تو جوش صاحب نے کشتی کو ایک مرتبہ ڈگمگا کر نادری حکم دیا کہ " بیان کرو اپنا شجرہ "

اور امین سلونوی نے اس وقت اور اس عاجزی سے " یاد نہیں آتا جوش صاحب " کہا ہے کہ جوش صاحب کی ساری اداکاری ختم ہو گئی اور وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔ بات یہ تھوڑی ہی دیر کی تھی مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہم سب پر مصیبتوں اور آزمائشوں کی صدیاں بیت گئی ہیں۔ گنگا کی خوفناک طغیانی کیفیت ملاح تک کا بار بار یہ کہنا کہ بس اب ڈوبتی ہے ناؤ مگر اس کے باوجود جوش صاحب کا یہ ہولناک کھیل ایسا نہیں تھا جس نے کسی کے حواس بجا رکھے ہوں۔ یوں تو سب

[illegible] قبل مجھ سے [illegible] تب زیادہ بڑی ہی کیفیت کا عرصہ لطف تو یہ کہ جہاں تک اس مشاعرے میں جاری [illegible] کر [illegible] رہا تھی اور یہ حضرت تک اس وقت [illegible] جوش [illegible] میں یکسوئی سے [illegible] جوش بہانہ ہو چکے اور یہ یقینی شکر کی سا محسوس ہوتا رہا کہ اس گروپ بلا سے زندہ سلامت نکل آئے ہیں [illegible] تو ایک عمل سکوت کا عالم تھا۔ [illegible] بعد سب سے پہلے [illegible] مولانا عبد الباری آسی نے جیسا [illegible] کا تابوت نشتر بستہ بلوہ نے کی۔ کہ [illegible] شاہ صاحب مولانا آسی [illegible] میں [illegible] کا عادی ہوں نہ اس قسم کے مذاق کو پسند کرتا ہوں اور یہ سارا کیا دھرا وصل صاحب کا ہے [illegible] اس ہنگامے میں شرکت کرنا نہیں چاہتا تھا مگر آپ کی اتفاقاً مند نے مجھ کو اس حماقت میں مبتلا کیا ہے۔ [illegible] بیان [illegible] کتنا رکھا گیا تھا۔

وصل صاحب نے جوش صاحب پر مخاطب ہو کر کہا جو نہایت غیر متعلق سے کچھ جا سکتے کہ یہ مولوی کیا تھی آخر؟ جوش صاحب نے شیخ گلزار انداز میں جواب دیا۔ [illegible] مر رہے ہو [illegible] احسان فراموش اقوام سے پیچھے وہ لوگ ہیں جن کا [illegible] اسی طرح [illegible] اس وقت کچھ [illegible] جا رہا ہے خیر یاد زندہ صحبت باقی [illegible] مغفور [illegible] جوش صاحب کے جواب میں بھی کچھ [illegible] اس [illegible] ہو چکے تھے کہ نہ صرف اس وقت انھوں نے اس بحث میں کوئی حصہ لینا نہ چاہا بلکہ اس دن دوپہر کے کھانے میں جب جوش صاحب نے ان کی طرف مرغ کا قورمہ بڑھایا ہے تو انھوں نے نہایت خشمگیں نگاہوں سے جوش صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جبیر خیر آباد مرغا تک ان کے ہاتھ سے کھانا گوارا نہیں کیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مولانا آسی اس واقعہ کو [illegible] ہو رہے تھے اور نئی نسل نہایت ناگوار [illegible] کے ساتھ اس واقعہ کو دوہرا چکے تھے۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ واقعہ ان کے ذہن میں ایسا ہی تازہ ہوتا تھا کہ مولانا آسی کی اس یادداشت پر عصر آنے لگتا ہے۔ مثلاً جوش صاحب کی ایک نظم [illegible] ایک رسالہ میں دیکھ کر میں پھڑک اٹھا اور وہ نظم مجھ کو اس قدر پسند آئی کہ جو کوئی بھی مجھ کو ملتا تھا اس کو میں اس نظم کا ایک آدھ بند سنانا ضرور تھا۔ چنانچہ مولانا آسی کو بھی میں نے اس نظم کے کچھ حصے سنائے۔ مولانا بڑے غور سے نظم سنتے اور جھومتے رہے اور جب نظم سن چکے تو کہنے لگے :

ہاں صاحب بہت بڑا فنکار ہے یہ شخص۔ الفاظ کا ایسا جادوگر بڑی مشکل سے پیدا ہوگا مگر وہ یاد ہے آپ کو کانپور والا واقعہ۔ زندگی ہی میں جناب جو ہم لوگ بچ گئے۔ اس دن میرے خیال میں وہ کوئی مرض کا دورہ اٹھا تھا جوش صاحب کو۔" میں نے جل کر کہا کہ چھوڑئیے مولانا اس قصہ کو۔ دیکھئے تو سہی کیا کہتا ہے ظالم کہ ـــ

ہاتھ اس نے نامحرم کا جھٹکے جو ناز سے
آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلف دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہ دل نواز سے
دل ہل گئے جمال کی شان نیاز سے

پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ ایک سمت پھر گئی
اک پھیرے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی

مولانا نے بڑی فراخ دلی سے داد دی اور دیر تک ہنستے رہے پھر ایک دم سے کہنے لگے: بھئی [illegible] جوش کو بڑا کیا تھا۔ مگر یہ تو کہیے کہ کیسی بے کسی کی موت مرنے ہم ہیں؟

عرض تو کیا کہ مولانا آپ مرتے دم تک اس نہ ہو سکنے والے صدمہ کا بوجھ لئے رہے تھے مگر [illegible] ایک صدمہ جوش صاحب کو بھی تھا۔ "ہائے آج رفیع احمد خاں نہ ہوا، زندگی بھر کے بدلے آج چکا لیتا۔" [illegible] ہوتے تو اس موقعہ پر کیا کرتے۔ مگر جوش صاحب کا یہ جذبۂ انتقام بھی بے معنی نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ واقعہ ہے کہ رفیع احمد خاں نے جوش صاحب کے ساتھ بعض ایسے سلوک کیے تھے کہ ان کا بدلہ لینے کے لیے جوش ترستے ہی رہ گئے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ جس کا میں خود بھی گواہ ہوں۔ اس حقیقت پر تھوڑی بہت روشنی تو ڈال ہی سکے گا۔ دیوہ شریف میں حاجی وارث علی شاہ کا عرس تھا۔ اس عرس کے موقع پر دیوہ شریف میں خاصی چہل پہل ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے جوش صاحب، رفیع احمد خاں مرحوم اور میں غالباً کچھ اور لوگ بھی ساتھ تھے دیوہ شریف پہنچے۔ وہاں سماع خانہ میں بیدم شاہ صاحب وارثی کی نظر جوش صاحب پر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا جوش، جوش، جوش کا ایک شور برپا ہو گیا اور جوش صاحب ہاتھوں ہاتھ اس بے پناہ ہجوم سے اٹھا کر بیدم شاہ صاحب کے پاس پہنچا دیے گئے اور ہم لوگوں کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ رفیع احمد خاں مرحوم کو کسی اور پر تو نہیں البتہ جوش صاحب پر بے حد غصہ تھا کہ یہ حضرت بھی ہم لوگوں کو بھول گئے۔ جوش صاحب بڑی دیر کے بعد جب اس میلے میں دھکے کھا کر سماع خانے سے باہر آئے تو رفیع احمد خاں نے ان سے کچھ نہ کہا اور بڑی محبت سے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھومنے لگے کہ ناگاہ ایک نہایت دخترِ ابو الہول قسم کی دیہاتی عورت جوش صاحب کے قریب سے گزری تو رفیع احمد خاں نے اپنے اسی ہاتھ سے جو جوش صاحب کی کمر میں تھا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس "ابو الہول" قسم کی عورت کے بازو میں چٹکی لے لی۔ عورت نے دیکھا آؤ نہ تاؤ جوش صاحب کے وہ دو ہتڑ رسید کیا ہے کہ وہ چونک پڑے اور اب لگی وہ پکارنے۔ جوش صاحب کا دل ہی جانتا ہوگا کہ وہ کس طرح اپنے کو بچا کر وہاں سے نکلے ہیں۔ رفیع احمد خاں نے یہ انتقام لینے کے بعد صرف اتنا کہا کہ "بڑی عزت افزائیاں ہو رہی تھیں جناب کی سماع خانہ میں اور ہم نیاز مندانِ قدیم نیچے دھکے کھا رہے تھے۔ اس وقت ہم عالی مرتبت کو یاد نہ آئے۔ اب جو اس پہلوان عورت نے ایک ہی ہاتھ دکھایا ہے تو ہماری آڑ لے رہے ہو۔ جاتے کیوں نہیں اپنے بیدم شاہ وارثی کے پاس۔" جوش صاحب سمجھ چکے تھے کہ یہ ایک پٹھان نے ایک دوسرے پٹھان سے بدلہ لیا ہے لہٰذا کہتے تو کیا کہتے۔ صرف یہی شکر ادا کرتے رہے کہ جس میلہ میں ابھی جوش کے آنے کی دھوم تھی۔ اس میں شکر ہے جوش کی اس عزت افزائی کے چرچے نہیں ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ جوش کی پھڑکتی ہوئی جوڑ اگر تھا تو رفیع احمد خاں ہی تھا جس کے تذکرے میں ایسے ایسے نہ جانے کتنے اور واقعات سامنے آئیں گے۔ ابھی تو اس یگانہ روزگار کا ذکر ہی نہیں چھڑا ہے۔

شیش محل

(چند اسکیچ)

انیس احمد عباسی

لکھنؤ سے روزنامہ حقیقت کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ میونسپل کمشنر بھی ہیں۔ وہ لکھنؤ میں بھی خاصی وقعت دار حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سادہ زندگی آج تک بسر کر رہے ہیں۔

بہت لکھا ہے جب بھی جا بیٹھا ہے صاحب و نیک نفس ہے۔ بڑی تیزی جانتے ہیں مگر کبھی کبھی مقابلت صاحب سے سیاسی کی کاوش بھی آ جاتی ہے۔ مجبوری کی بات دوسری ہے۔ ورنہ فطرتاً ان کی سے سب سے وگ اور آزاد ہوا کرتی ہے۔ صحافت کے تصور ابھر جاتے ہیں۔ سید جالب سے بابائے صحافت کے محبوب شاگرد رہے ہیں۔ ویسے بھی آپ کی تحریر میں اسلوب مرحوم کا رنگ جھلک نکلتا ہے۔ مدت سے روزنامہ حقیقت کو اپنے ہی سہارے کے نقطۂ توکل پر چلا رہے ہیں آج اخبار نکل جاتا ہے اور کل کی کبھی فکر نہیں ہوتی مگر اس بے سر و سامانی کے باوجود آپ کو خالی کا شکوہ کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا گیا۔ سادگی اور وضع داری یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے قائل آپ کے مخالفین بھی ہو گئے لڑکپن میں مگر دُبلے ہونے کی بدولت ڈیل پاس بھی مشکل ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ تنگ ٹوپی اور کبھی کبھی گاندھی کیپ بہ حسن جو ٹوپی تھی جو سر پر منڈھ کر رہ جاتی ہے پھر کیا مجال کہ سر سے کبھی اتر جائے۔ جاڑے میں سی ٹوپی پر ایک گلوبند باندھ سا جاتا ہے۔ چھڑی کا سہارا لے کر میلوں کا سفر کر جاتے ہیں دفتر تک۔ گھر گئے سسرال ہو آئے۔ بارشوں میں شرکت کی اردو کی میٹنگ میں حاضری دی اور سب جگہ ہو نہ ہو آئے اسی چھڑی کے سہارے رات کو دس بجے گھڑی کی سوئی کے ساتھ خان بہادر شیخ احمد علی عرف ڈھلی صاحب کے یہاں موجود ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں۔ ہنس بول رہے ہیں۔ دوسروں کے ذکر سن رہے ہیں اپنا تذکرہ کسی کو نہیں سناتے۔

صورت سے یتیم نظر آتے ہیں مگر چپکے چپکے سینکڑوں یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتے رہتے ہیں کوئی ضرورت مند آپ کے پاس پہنچ جائے تو اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم سمجھیں گے پھر خواہ چاہے قرض لے کر جانے پھر بھی مگر خوش ہوتے ہیں کہ ضرورت مند کی ضرورت پوری ہو گئی۔ کئی بار کہا کہ انیس بھائی یا تو فقیری لے لیجئے یا انسانوں کی صورت بنائیے کہتے ہیں کہ تم مزاح نگار ہو مذاق کر رہے ہو۔ کاش کوئی سنجیدگی سے انیس بھائی کو سمجھا دیتا۔

انصار ناصری

سید انصار علی ناصری۔ ریڈیو اسٹیشن دہلی کے دور میں سب سے پہلے ملاقات ہوئی۔ افسانے اور مضامین اس سے بھی پہلے دیکھ چکے تھے۔ ملے تو ان کو اپنے سے بھی کم عمر اور اپنے سے کم، [illegible] سفر میں ملاقات ہوتی رہی۔ کبھی ریڈیو اسٹیشن پر کبھی شاہد صاحب کے یہاں مگر یہ ملاقاتیں وہی آداب عرض، تسلیمات عرض۔ مزاج تو اچھا رہا۔ آپ کی دعا ہے۔ جی وہ مضمون خوب تھا قسم کی رسمی ملاقاتیں تھیں۔

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر ہم تو خیر تھے ہی لیکن ایک دن دیکھتے کیا ہیں کہ آپ بھی بسلسلۂ ملازمت چلے آئے ہیں۔ پھر کیا تھا تقریباً تین چار سال دن رات کا ساتھ رہا۔ ساتھ ساتھ ناچے، ساتھ ساتھ گائے۔ لڑے جھگڑے۔ روٹھے منے۔ دھول دھپا۔ ہاہا ہوہو۔

انصار پہلے کہانی لکھتے تھے۔ ریڈیو میں کیا آئے کہ ادب کے قبرستان میں آ گئے۔ پھر قسم کھانے کو بھی کچھ نہ لکھا البتہ ایک اچھے پروڈیوسر بن گئے۔ ڈرامہ آپ کی خاص لائن ہے اور ڈائریکشن عبادت کے سے انہماک کے ساتھ فرماتے ہیں۔ الفاظ کے مد و جزر کے ساتھ آپ کے جسم میں بھی جوار بھاٹے کی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ پس منظر موسیقی کے ساتھ غیر ارادی طور پر متحرک رہتے ہیں۔ غیر محسوس طور پر ناچ رہے ہیں۔ کوشش کامیاب رہی تو قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ تمام اداکاروں پر سے صدقے ہوتے جاتے ہیں۔ ناکام رہی تو پیشانی پر دو ہتڑ مارتے ہیں اور ایسا گہرا اثر لیتے ہیں گویا کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔

ایک اچھے ادیب تھے مگر بہت اچھے پروڈیوسر بن گئے ہیں۔ پروڈیوسر کے لیے موزوں ترین شخصیت ہیں۔ اپنے کو ماحول کے مطابق ڈھال لینے میں کمال حاصل ہے۔ ان تمام خوبیوں میں ایک برائی بھی ہے کہ خلوص پر اعتماد نہیں کرتے۔ چوکنا رہتے ہیں اس خوبصورت ہرن کی طرح جسے اپنے باغ میں ہر طرف شکاری نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ وحشت کیوں ہے؟

بہزاد لکھنوی

سردار حسین بہزاد لکھنوی کو میں بہزاد کے علاوہ سردار حسین کی حیثیت سے بھی اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ بہزاد کم اور سردار حسین زیادہ تھے۔ طالب علم کی حیثیت سے ان کو اس معاملہ میں شہرت حاصل تھی کہ بنتے بہت ہیں۔ زمین کی باتیں بہت کم کرتے تھے ہر بات آسمان سے کم بلندی کی نہ ہوتی تھی۔

"بھئی سردار حسین یہ شیروانی کا کپڑا تو خوب ہے۔"

"ہاں۔ مگر اب تو مل ہی نہیں سکتا۔ دو شیروانیوں کا بنا تھا ایک شیروانی ڈیوک آف کناٹ کی بن گئی دوسری یہ ہے۔"

آواز میں بھی تصنع ہوا کرتا تھا۔ بات کرتے ہوئے چہرہ بھی بڑے آدمیوں کی طرح کا بن جاتا تھا۔ ایک دور وہ آیا کہ آپ ثاقب لکھنوی کے شاگرد کی حیثیت سے مشاعروں میں داد لیتے نظر آئے۔ پھر جو دیکھا تو ایسٹ انڈین ریلوے میں

[illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] کے مریض نے [illegible] پیدا کر دیا۔ [illegible] ہی ہے۔ یہاں تک کہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ کی شہرت [illegible] بلکہ [illegible] چھپا سکتے ہیں۔ [illegible]

حسرت موہانی

[illegible] حسرت موہانی

شعر کا شعور پیدا ہونے کے بعد سے حسرت کا [illegible] حسرت [illegible] کی سیاسی سرگرمیوں کو اخباروں میں دیکھا کرتے تھے زیادہ تر [illegible] حسرت [illegible] آج اس جیل میں ہیں کل اس جیل میں ہیں۔ گویا آپ کا مستقل جیل خانہ [illegible]۔

ایک مرتبہ ہمیرپور میں ایک مشاعرہ تھا۔ میں لکھنؤ سے چلا [illegible] اجاڑ سی صورت۔ عینک میں ایک طرف ایک دھجی بندھی ہوئی۔ [illegible] ڈھیلی ڈھالی اچکن۔ پیروں میں میلا سا کرمچ کا جوتا۔ جس پر چپ چپ کرتی ہوئی آواز اور عجیب حقہ [illegible] تعارف کرایا کہ آپ مولانا حسرت موہانی ہیں۔ میں تو سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ [illegible] حسرت موہانی [illegible] راستے میں دوستی ہو گئی۔ اس لیے کہ دشمنی کرنے کی اہلیت ان میں تھی ہی نہیں۔ [illegible] وقعت نظر آنے لگے۔ حالانکہ باتیں بھی یوں ہی سی کرتے تھے کچھ عجیب کھوئی کھوئی سی اور بھی ضعف کی کوئی وجہ نظر آتی تھی مگر سب سے بڑی بات یہ نہیں کہ وہ وقیع نظر آتے تھے۔

ایک مرتبہ ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے حسرت صاحب کی خدمت میں کانپور حاضر ہوا۔ دیکھا کہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پانی سے بھرا ہوا گھڑا اٹھائے گھر میں جا رہے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر بھی اپنے اس کام میں مشغول رہے جب فارغ ہوئے تو ایک کھری چارپائی پر بیٹھ کر چند باتیں کیں اور جب میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا اچھا۔ گویا نہ تمہارے آنے کی خوشی تھی نہ جانے کا غم۔

مسٹر سومناتھ چپ اسٹیشن ڈائرکٹر لکھنؤ کی بڑی خواہش تھی کہ حسرت صاحب سے ان کا کلام براڈکاسٹ کرائیں۔ مدت تک کوشش کرتے رہے کہ مولانا حسرت اپنا کلام براڈکاسٹ کرنے پر تیار ہو جائیں مگر کسی طرح قابو ہی میں نہ آتے تھے۔ آخر ایک مرتبہ لکھنؤ میں مل گئے۔ میں نے ان کو تو ایک ریستوران میں بٹھا کر چائے میں مصروف کر دیا اور چپکے سے مسٹر چپ کو فون کیا کہ مولانا

حسرت کا کچھ لطف ہے وہ آپ خود سنیے۔ تھوڑی دیر میں مولانا حسرت جب صاحب کے بنگلہ پہنچے اور ان سے پاکستان کے متعلق اپنے نئے فارمولا پر بحث کر رہے تھے۔ اصرار یہ تھا کہ یہ فارمولا براڈکاسٹ کر دیا جائے۔ جب کسی طرح مولانا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ آپ ریڈیو سٹیشن چلیں ہم آپ سے دو ایک غزلیں پڑھوا کر ریکارڈ کر لیں گے۔ معلوم نہیں کیوں مولانا نے کہا یہ اچھا پھر ترنم کے ساتھ غزلیں پڑھیں اور پھر جب وہ ریکارڈ سنا تو بہت خوش ہوئے۔ فرمایا: ارے! یہ تو بالکل میری ہی آواز ہے۔ تو پھر —— اب میں سٹیشن جا رہا ہوں۔ ریڈیو سٹیشن تک ... میاں لطیف الرحمٰن بھی ساتھ تھے۔ حسرت صاحب کچھ رنگین اور رومانی افسانے بھی سنائے یعنی اپنے ذاتی رومانی افسانے اور چیدہ چیدہ کلام بھی سنایا۔

مولانا کا سیاسی مسلک خواہ کچھ بھی ہو مگر ان کے شدید سے شدید مخالف کو بھی اس بات کا یقین ہے کہ ان کی سیاست ایماندارانہ اور آزاد ہوا کرتی ہے۔ ساری خدائی ایک طرف ہو جائے اور مولانا اپنی تنہا آواز بلند کیے بغیر نہیں مان سکتے۔ نہ ان کو ہوٹنگ کی پروا، نہ مخالفت کے طوفان سے کبھی مرعوب ہوئے جو اپنا عقیدہ ہے وہ ظاہر کریں گے اور برملا ظاہر کریں گے خواہ کچھ ہو جائے۔ وہ شاعر کی حیثیت سے بلند ہیں بانسبت لیڈر کی حیثیت سے۔ اس سلسلہ میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں اور لیڈری ان کی ثانوی حیثیت ہو سکتی ہے۔

روشن صدیقی

علامہ شوکت کی عظمت کی راہ صورت دیکھ کر شفقت کو دل چاہتا ہے۔ کلام نہایت وزنی اور خود نہایت ہلکے پھلکے۔ سنانے اس طرح ہیں گویا پھدک رہے ہیں۔ کلام کے زور میں اکثر خود اڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آواز اچھی ہے اور گلے میں سُر بھی ہے مگر جوش میں آکر جب بے تحاشہ پڑھتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خلافت فنڈ کے لیے اپیل کرتے کرتے بالشیویکوں کے مولانا شوکت علی کو غصہ آگیا ہے۔ نتھنے پھول جاتے ہیں۔ گھونسہ تان لیتے ہیں اور پھر اسی گھونسے سے تعریف کرنے والوں کو سلام بھی کر لیتے ہیں۔ مشاعروں کی شرکت عبادت کی طرح پابندی سے کرتے ہیں آج آگرہ میں ہیں تو کل گوپامؤ میں۔ کبھی بنارس میں ہیں تو کبھی کسی غیر معروف مقام پر مشاعرے میں نظر آ رہے ہیں۔ نیشنلسٹ شاعر ہونے کا دعویٰ ہے۔ وردی کے طور پر کبھی کبھی کھدر بھی پہن لیتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت آپ کو سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ نظم کے علمبرداروں میں اس طرح شامل ہیں جس طرح راجہ پورس کی فوج میں ہاتھی شامل تھے۔ یعنی بوقت ضرورت غزل بھی اس طرح پڑھ دیتے ہیں کہ نظم کی تمام علمبرداری سرنگوں ہو کر رہ جاتی ہے۔

فطرتاً بہت معصوم، صورتاً نہایت خام مگر اقتصادی معاملات میں نہ معصوم نہ خام بلکہ نہایت پکے بزنس مین "یک سخن" کی قسم کے ضدی بھی اور "نو نقد نہ تیرہ ادھار" کی قسم کے منہ پھٹ بھی۔

مجنوں گورکھپوری

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری۔ معلوم نہیں یہ تخلص شعر کہنے کے لیے رکھا ہے یا اپنا تعارف کرانے

کہ سلیقہ آپ کی پیدائشی خصوصیت آپ کے تخلص میں سما رہ گئی ہے۔ اس جماعت سے یہی تخلص اور اسی تخلص کے لیے یہی جماعت ہونا چاہیے تھی۔ مہاشے المختصر مختصر کے پورے اہل انسان ہیں۔ اور باوفا وہ شرافت بعنوان [illegible] کا اضافہ کر [illegible] حد تھا میں فقط مگر باقی تمام حیثیتوں سے [illegible]۔ ادیب۔ نقاد۔ شاعر۔ افسانہ نگار۔ غالب [illegible] سب کچھ ہیں۔ یہ اور بات کہ مجنوں کو شہرت بحیثیت ایک افسانہ نگار کے حاصل ہوئی حالانکہ [illegible] صرف ایک [illegible] ہے۔ وہ شعر کہتے اور خطرناک حد تک کہتے ہیں۔ گویا شعر و شاعری کے معاملے میں [illegible] خطرناک [illegible] پھر تو پکڑ کر منہ چپت ہی لگا دیتے ہیں۔ آپ کا شعر سنیں گے اور داد دیں گے تو وہ اپنا شعر [illegible] سے لطف لیں گے کہ آپ منہ دیکھتے رہ جائیں۔ کسی سے مرعوب ہونا تو جانتے ہی نہیں۔ [illegible] مرعوب ہوتے ہم نے خود دیکھا ہے۔

مجنوں میں دوستوں کے لیے خلوص بھی ہے۔ مگر بہت سیاست فرما۔ شروع شروع میں لوگ ان کو [illegible] سمجھتے ہیں مگر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ [illegible] سے بری ہو کر [illegible] اخلاق اور دروغ بافانہ علم مجلس سکھاتا ہے۔ مجنوں کا دوست بننا گویا دل گردے کے آدمی کا کام ہے۔ جو کوئی دوست بن جاتا ہے وہ اس چھوٹے سے آدمی کی بڑی بڑی باتوں میں بہت کچھ معلوم کر لیتا ہے۔

مجنوں صاحب پہلے ہمارے بھی بزرگ تھے مگر رفتہ رفتہ دوست ہو گئے۔ اب جب کبھی ملاقات ہو جاتی ہے تو کم سے کم ہمارا دل تو خوش ہی ہو جاتا ہے ان کو خواہ کیسی ہی کدورت کیوں نہ ہوتی ہو۔

بارِ خاطر

(چند خطوط)

سید امتیاز علی تاج کے نام

لاہور
۲ فروری ۵۱ء

سیدنا

اس وقت آپ بے طرح یاد آ رہے ہیں۔ لکھنؤ سے ایک عزیز بھاگ کر آئے ہیں مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ بیسنی پانوں کی ڈھولیاں بھی لائے ہیں اور وہ چکنی ڈلی بھی جو کبھی "صاحب" کے کفِ دست پر ہوا کرتی تھی۔

دوپہر کا وقت ہے صحن میں دھوپ کھانے نکلا تھا بیٹھ گیا پان کھانے جب پُرتکلف پاندان میرے سامنے کھل جاتا ہے تو ذہن کا وہ دریچہ بھی کھل جاتا ہے جس میں سے آپ کو جھانکا جا سکتا ہے۔ آج میرا پاندان ایک ایسی دلہن کی طرح سجا ہوا ہے جو بیوگی کی خبر پا کر عدت کے دن گزار رہی ہو کہ یکایک اس کا دولہا پردیس سے آجائے اور اس کو غیر متوقع طور پر اس کا سہاگ واپس مل جائے۔ کب امید ہو سکتی تھی کہ اس پاندان میں لکھنؤ کے بیسنی پان پھر نظر آئیں گے مگر آج اس پاندان میں بیسنی پان بھی ہیں۔ کیوڑے میں بسا ہوا دودھیا کتھا بھی۔ چھالیہ بھی وہ جس کو اہلِ ذوق "باجرہ" کہتے ہیں۔ چونا اس قدر شفاف کہ دودھ بھی اس کو اپنا آئینہ سمجھے اور کہنا یہ مری کی برف بھی اس کے سامنے پانی پانی ہو جائے۔ سفید سڈول الائچیاں بھی ہیں اور مشکی دانے کا تمباکو بھی۔ پھر قوام کی شیشیاں تو آپ جانتے ہی ہیں میری جان کے ساتھ ہیں۔

اس اہتمام سے پان کھا رہا ہوں اور جھوم جھوم کر گنگنا رہا ہوں ؎

پان اے عنوانِ رنگینیِ لبِ لعلینِ یار
اے ذرا سے سبز پتے غازۂ روئے بہار
اے کہ تیرا رنگِ رعنا جاذبِ جذبات ہے
اے کہ تجھ سے سرخرو صبحِ تجلیات ہے

پہلے پہل [illegible] ذرا ذرا سے بہار [illegible] آتے دیکھا ہی ہوگا [illegible] تجلیات میں آپ نے دیکھی ہے [illegible] [illegible] جھلک پا ایک ساتھ [illegible] [illegible] ذرا ذرا [illegible] وغیرہ کو کتابوں میں دیکھے دو [illegible] کا کبھی نشان نہیں پاکر وہ ہیچ کا ہوتا ہے جس کے متعلق جوش ایسے شاعر نے ہی کہہ دیا ہے کہ [illegible] ؏

اگر دستور نہ ہوتے تو ہیچ کا ذوق

مسند ہی کبھی [illegible] ہم را جو نہیں یہ شعر صنعت کے کہ ؎

بات گزری [illegible] کا ترکا ہو

ہوشیار اس کڑی کا لگا ہوا

طالب علمی کے زمانہ میں بھی اس خاکسار کے یہاں ذرا کا تکا کبھی [illegible] نہ ہوا۔ طالب علمی کے بعد شاعر مشرق کے اس حضرت کا خطاب پانے پر کہا کہ ؎

کس قدر منہ پہ گرا [illegible] کی بیداری ہے

ہے کہ کیسا یہ جہاں [illegible]

کاش وہ موجود ہوتے اور میں ان کو بتا سکتا کہ جنہیں [illegible] نہیں بلکہ جنہیں ہم چاہے جو چاہتے ہیں۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ آخر ایسی بھی کیا [illegible] کسی دن [illegible] تو دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے [illegible] مگر [illegible] نہیں وہ الارم کس کے کانوں میں بجا [illegible] بہرحال ہم کو کبھی اس شاہدے کا [illegible] چھوڑئیے موضوع بحث اس وقت صرف پان ہے جس کے متعلق شاعر کہتا ہے ۔ ؏

اے ذرا سے سبز پتے خانہ [illegible]

مگر صاحب "ذرا سا سبز پتا" تو آج اتفاق سے آگیا ہے ورنہ یہاں تو "بہت سا سبز پتا" ملتا جس پر کچھ بھی نہیں آتا کہ کتھا چونہ کوئی پیپل [illegible] لگائے تا وقتیکہ باقاعدہ بیٹھ کر یہ فرض پورا نہ کیا جائے اور پھر اس "بہت سے سبز پتے" کو کھانے کے لیے بھی بڑے دل گردے کے آدمی کی ضرورت ہے۔ گلوری اس کی بن ہی نہیں سکتی۔ چپڑا کا چپڑا منہ پھاڑ کر کھانا پڑتا ہے اور کھانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ منہ نہیں ہے بلکہ مال گودام ہے اور تو اور یہاں پان مانگنے والوں سے [illegible] یہ سوال کرتے ہیں کہ میٹھا یا الائچی سپاری کا ؟ اب بتائیے کوئی خوش مذاق انسان کیا جواب دے اور جواب نہ دے تو کھانا پڑے وہ پان جس [illegible] سونف بھی ہوتی ہے اور مٹھی کا سفوف بھی معلوم ہوتا ہے کہ پورا زردہ خانہ اٹھا کر رکھ گئے ۔

آپ تو خیر تمباکو کے پان میں الائچی کے شریک کے بھی قائل نہیں ہیں مگر میں اس باب میں مشرک واقع ہوا ہوں، تمباکو بھی کھاتا ہوں اور الائچی بھی یعنی گنڈا بھی کھاتا ہوں اور لونگوں سے بھی پرہیز نہیں کرتا ہیں پان کے معاملے میں آپ کی [illegible] کا قائل ہوں کہ تمباکو بھی خوشبودار پسند نہیں کرتے۔ آپ کے مراد آبادی تمباکو کے خلوص سے انکار نہیں مگر خشکی دانہ دار تمباکو کا تصور اور قوام یا قوام کی گولیوں کا [illegible] افزا خوشبو جو گل کھلاتی ہے اس کا بھی دیوانہ ہوں خالص تمباکو خالص شکر کی خامی ہے مگر غالب [illegible] گلاب ہی شراب یا شراب ہی میں گلاب ملا کر پیتے تھے۔ آپ زیادہ سے زیادہ پان کے معاملہ میں اپنے کو سادہ اور مجھ کو

بدکار تو کہہ سکتے ہیں مگر اپنے کو بے گناہ اور مجھ کو بدکار نہیں کہہ سکتے۔ آپ کا مراد آبادی تمباکو سب کچھ کر سکتا ہے مگر وہ لعاب کیسے تیار کرے گا جو قوام تیار کرتا ہے کہ وہ لعاب منہ میں لیے بیٹھے ہیں اور تر گرم شکل و گرنہ گرم شکل کو "تفسیر نذرا" کہیے۔ دیکھئے تاج صاحب یہاں پان کی تائید میں ایک نکتہ اور سوجھ گیا کہ پان انسان کو نہایت کم سخن بھی بنا دیتا ہے یعنی انسان ایک ایک بات کو پہلے سو سو مرتبہ منہ میں تولتا ہے پھر اگالدان سے مشورہ کرتا ہے اس کے بعد کہیں بات کرتا ہے بجائے کہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور یاوہ گوئی کے گُل کتر رہی ہے۔

پان کے سلسلے میں آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ چھوٹا کھایا جائے اور کثرت سے کھایا جائے مگر اس عقیدے کے پس منظر میں غالباً وہی پان ہے جس کو میں چھپر کھٹا کہتا ہوں اور جس کے آٹھ آٹھ اور دس دس ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس وقت میرے سامنے وہ پستی پان ہیں جن سے غالباً "دھان پان" کا محاورہ نکلا ہے۔ نازک نازک۔ چھوٹے چھوٹے پتے۔ گلوری بنا کر منہ میں رکھیے تو گھل جائیں۔ ان چھوٹے چھوٹے پانوں کی خوب صورت گلوریاں جھومر میں پرو کر خاصدان میں اگر آپ کے سامنے آ جائیں تو کثرت سے کھانے کے بھی آپ اس خوف سے قائل نہیں رہ سکتے کہ یہ خاصدان ختم ہو جائے گا تو کیا ہو گا۔ میرے پاس اس وقت پستی پانوں کی دو ڈھولیاں ہیں یعنی ایک دو نہیں بلکہ پورے چار سو پان مگر دل دھڑک رہا ہے اس وقت کے خیال سے جب یہ نہ ہوں گے اور میں پھر اپنے مگھئے پر قناعت کروں گا۔

میں یا تو یہ پان کھا سکتا ہوں ورنہ اپنے کو لنڈورا ہی بھلا سمجھتا ہوں کہ چھالیہ، خشک کتھا۔ الائچی۔ رگھمنی تمباکو اور قوام کھا کر چونا چاٹ لوں مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جوٹ اور پٹ سن کی برادری کے پان کھاؤں جو منہ سے رسیاں بٹواتے ہیں اور جن میں لوگ مسلّم الائچی ڈلوا کر جبڑوں کی ورزش کرتے ہیں۔

تقسیم ملک سے پہلے پستی نہ سہی مگر بنارس کے سفید پان لاہور میں مل جاتے تھے۔ وہ ذرا تیز ضرور ہوتے تھے مگر یہ تیزی چنداں ناگوار نہ ہوتی تھی اور چونکہ تیز زبان کی تیزی کو رام کر لیتی تھی۔ ملیح صاحب ملاحظہ فرمایا آپ نے بنارس کا ذکر تھا تو بے ساختہ رام کرنے کا محاورہ قلم سے نکل گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ شعر بھی یاد آ گیا کہ ؎

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

معاف کیجئے گا اس شعر کا یہاں کوئی محل تو نہ تھا مگر اچھا شعر اگر بے محل بھی ہو تو رنگ دے جاتا ہے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ تقسیم ملک کے بعد وہ بنارسی سفید پان بھی سفید فام قوم کی طرح عنقا ہو گئے اور رہ گئے یہ پان جن کو پان کی حیثیت سے کھانا تو سمجھ میں آتا نہیں البتہ روٹی کی صورت سے کھایا جائے تو دوسری بات ہے۔

کس طرح میں آپ کو یہ پستی پان کھلاؤں۔ گڑھی شاہو سے ایبٹ روڈ زیادہ دور نہیں مگر یہ نازک گلوریاں وہاں پہنچتے پہنچتے مرجھا جائیں گی کملا جائیں گی اور پان کا خون ہو جائے گا جس کو شاید آپ بھی گوارا نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا آپ کے حصے کے پان بھی میں خود ہی کھا رہا ہوں اور کھا کھا کر آپ کو یاد کر رہا ہوں معطر، لطیف اور خنک گلوریاں۔ محسوس ایسا ہوتا ہے گویا پان نہیں بلکہ پان کا تصور چبا رہا ہوں گلوری منہ میں جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ سدرح ری

...رہے ہے ملنے کا پتہ نہیں۔ آپ ان کے پیچھے بہت ہاتھ دھو کے ہیں، وہ صاحب اس کے قائل ہوں گے تو ہوں گے ورنہ معاف میں
ماہیت مظہم و ماہیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

شوکت تھانوی

حضرت جگر مراد آبادی کے نام

۲ ملی شاہراہ۔ لاہور
۱۵ جون ۱۹۵۴ء

صدیق مکرم

ابھی ابھی میں آپ کے مسودہ سے ملا ہوں، وہ بڑھ کر خواب آور دوا کھا کر [illegible] پہنچا ہوں گزشتگی باقی ہے اور پھر آپ سے مخاطب ہوں۔ مجھ میں زور ہی کا مسلسل جاری ہے اور ایک مدت سے جاری رہا کرتی ہے سرمے کا [illegible] کا گمان ہو رہا ہے۔ اگر آپ یاد کریں تو عرض کروں کہ وہ [illegible] میں [illegible] نے پہلی بار جیسے تک ہر فرد پر تاش کے پتوں کا شبہ ہوتا تھا۔ ہر عورت جو نظر سے گزری حسن کی بیگم یا اینٹ کی ملکہ نظر آئی۔ ہر مرد پر پان کے غلام یا حکم کے بادشاہ کا گمان گزرا۔ غضب خدا کا، [illegible] راتیں [illegible] کی [illegible] کر بسر کر دیں۔ زندگی میں ایسی ایسی خدا جانے کتنی راتیں بسر کی ہیں اور ایک سے ایک گذری ہے [illegible] آپ کے انہماک کا جواب نہیں۔ اس موقع پر آپ ہی کا ایک شعر آپ کو سناتا ہوں جو آپ کے لیے آپ کی ایک معقول دعا کی حیثیت رکھتا ہے ——

عشق بے حد تصور، شوق بے مقصد نظر
مجھ کو جو کچھ چاہیے بے حد و پایاں چاہیے

بے شک جو شغل بھی اختیار کیا انتہا پر پہنچ کر اور انتہا تک پہنچا کر اختیار کیا۔ رندی اور بدمستی کا وہ زمانہ جب ہر نظر جام و سبو اور ہر نفس میخانہ تھا ابھی کل کی بات ہے۔ رند بلانوش بڑھ حاضر ور تھا مگر ۱۹۲۶ء کی ایک رات میں [illegible] کے ایک مشاعرے میں دیکھا بھی تھا جب ایک [illegible] صورت کا شاعر جیسے [illegible] پر چھپی ہوئی خیام کی تصویر مشاعرے کے بیچ گرتے گرتے تھا اور اس نے مقطع [illegible] جھوم کر پڑھا ——

نظر کو مست مئے حسن کر حجاب اٹھا
جگر شراب نہ پی تہمت شراب اٹھا

اور میں چونک پڑا کہ کیا یہی ہیں جگر؟ اور فوراً ہی جگر نے یہ شعر پڑھ کر تصدیق کر دی ——

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

۱۹۲۶ء کی وہ رات اور آج کا دن۔ تعلقات کے اٹھائیس سال۔ اور ہم دونوں ایسے سخت جان کہ دونوں کو تعلقات کی

یہ مدت نہ مار سکی۔ اس عمر کے نہ دوست ملتے ہیں نہ دشمن۔ اس مدت میں دوستیاں دشمنی بن جاتی ہیں اور اتنی طویل دشمنی بھی وفا نہیں کر لی۔ آنے کو تو بہت سے انقلاب آئے۔ ایک رند نے توبہ کی۔ ایک خانہ بدوش صاحب خانہ بنا جس کا کوئی نہ خانہ وہ کسی کا ہو گیا اس کے علاوہ اور بھی بہت سی گتھیاں سلجھیں۔ بڑے بڑے الجھاؤ سلجھے۔ ملکوں کی تقسیم ہوئی نئے نئے ممالک کرۂ ارض پر ابھرے اور بٹوارے ایسے ایسے ہوئے کہ آخر ہم بھی بٹ گئے آپ اُدھر ہیں اور اِدھر بیچ میں آگ اور خون کے مواج سمندر۔ مگر یہ تعلقات قائم رہے رند کی توبہ ان کو ختم نہ کر سکی۔ خانہ بدوش کی خانہ آبادی ان پر اثر انداز نہ ہوئی نہ کسی الجھن نے ان کو سلجھایا نہ کسی سلجھاؤ نے ان کو الجھایا۔ وہ رہبانی آگ اور خون کے سمندر دیکھ دیکھ کر بھی یہ تعلقات یہی کہتے رہے کہ :

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اور یہ تعلقات صرف مجھ ہی سے نہیں ہیں۔ آپ کہتے ضرور ہیں کہ آپ کو مجھ سے ایک خصوصیت ہے مگر آپ کی یہ خصوصیت اتنی عام ہے کہ ؎

اللہ رے چشم یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

میں نے تو آپ کی اس خصوصیت کا مرکز ان کو بھی دیکھا ہے جن سے گلے ملنے کے بعد جن کو نہایت خلوص سے پہلو میں جگہ دینے کے بعد آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ :۔

"آپ مجھ سے یہ تقاضا نہ کیجئے گا کہ میں آپ کو آپ کا نام بھی بتاؤں نام اصل چیز نہیں ہے شخصیت اصل شے ہے۔ دماغ میں نام محفوظ نہیں تو نہ ہو مگر وہ جو ایک تعلق ہوتا ہے روح کا روح سے جی ہاں۔ وہ بہرحال موجود ہے۔ فاصلہ اور وقت نام و دماغ کو محو کر سکتا ہے مگر اس تعلق کو ختم نہیں کر سکتا۔"

بلکہ میں نے آپ کی اس خصوصیت کا مرکز ان ناجنسوں کو بھی دیکھا ہے جو محض ایک جذبۂ پرستاری لے کر اس وقت آجاتے ہیں جب آپ تاش کھیل رہے ہوں ماشاء اخلاق کے آپ تمام حرف و حکایت اور تمام دیدہ و دل بن جانا چاہتے ہیں مگر اس اہتمام کے باوجود شرح عاشقی اس لیے نہیں ہو سکتی کہ توجہ ہوتی ہے آپ کی تاش کے پتوں کی طرف اور دل جوئی کرنا چاہتے ہیں آپ مہمان کی بھی آپ کی وہ کیفیت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ ہاتھ میں رمی کے بارہ پتے ہیں جن کو آپ گھبرا گھبرا کر مرتب کر رہے ہیں اور باتیں ان حضرت سے بھی کرتے جاتے ہیں۔

"خلوص کا سوائے خلوص کے کوئی نام نہیں ہوتا اہل خلوص کا تعارف ایک مخلص دل خود ہی کرا دیتا ہے" اور وہ حضرت اپنی ہانک رہے ہیں "صاحب میں تو اِدھر آ کر مسلسل پریشانیوں میں مبتلا ہوں"

" آپ اپنے تیرہ پتوں میں گم ان کی بات کا جواب بھی دیتے جاتے ہیں اور اپنے کھیل کے ساتھیوں سے بھی مخاطب رہتے ہیں نتیجہ یہ کہ مکالمہ کچھ اس طرح کا بن جاتا ہے۔

جی ہاں وہ پریشانیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ صاحب گن لیجئے تیرہ پتے ہیں نا ؟

کیا ملازمت نہیں ملی۔ ملازمت ابھی تک نہیں مل سکی؟

• جی ہاں ـــ استاد [illegible] آپ کی چال [illegible] صاحب؟

• بچوں کی تعلیم کا ابھی کوئی بندوبست نہیں؟

• جی ہاں۔ آپ امریکہ [illegible] کہاں تک ہیں؟

• آپ کے والد صاحب کا ابھی انتقال ہو گیا؟

- جی ہاں وہ تو ہو ہی چکا ہے؟

اور پھر یکسر چونک کر: جی کیا فرمایا۔ والد صاحب کا انتقال؟ [illegible] یہ جملہ بھی کہتے ہیں جس سے ایسے ہے جب آپ تاش کے پتے ملا کر ان میں ترتیب کرنا چاہتے ہیں [illegible] اب تا تو آدمی کو اپنے اس بکھرے پر شرمندہ ہو جانا چاہیے۔ مگر چونکہ وہ صرف [illegible] نہیں بلکہ [illegible] ہو رہے ہیں کے پتے تو اکٹھے ہیں اور جو کچھ [illegible] تاش بھی ہو سکتے ہیں لہٰذا آپ گاڑی سے پتا کھینچتے ہوتے ہیں

- آپ کے والد مرحوم ـــ جو کہ [illegible] اور آپ کو جوکر ہی بکنے پر جائے اُن حضرت کے آپ کے کھیل کے ساتھی ہم ہو کر رہ جاتے ہیں اور آپ شو کر کے بازی جیت لیتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک تمثیلی منظر خواہ مخواہ بیچ میں آ گیا ورنہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آپ کی اس خصوصیت کی بدولت مجھ کو اس لیے ناگوار نہیں ہے کہ مجھے آپ سے نہیں خود اپنے سے غرض ہے اور مجھے جو خصوصیت ہے وہ خصوصیت کے جواب میں خصوصیت ہی نہیں چاہتی اس لیے کہ خصوصیت کوئی تجارتی لین دین ہے نہ جوابی پوسٹ کارڈ آپ کے پاس مجھ کو جو صرف اس شعر کی تفسیر بن جاتا ہوں ؎

تیری محفل میں ہے اک رنگ محبت بھی ذرا
دیکھنا ہو کے پشیمان نہ جانے پائے

اور یہ غنیمت ہے کہ میں اس محفل سے کبھی پشیمان ہو کے نہیں اٹھتا۔ ممکن ہے آپ کو اپنی اداؤں کا اندازہ نہ ہو اور اندازہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ نہ تو ان میں منافقت ہے نہ سیاست نہ مصلحت بلکہ یہ ادائیں آپ کی بے ساختگی ہو چکی ہیں۔ میں نے یہ مناظر دانستہ اس لیے پیش کر دیے ہیں کہ ؎

وہ کیا دیکھ سکتے ہیں اپنی ادائیں
ہمیں دیکھتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

آپ کے پاندان کی یاد میں ایک تازہ پان اپنے خاصدان سے نکال کر کھا رہا ہوں اور اس وقت آپ کا وہ تصور نگاہوں کے سامنے ہے جب آپ بہت ہی خلوص کے ساتھ میرے لیے پان بنا کر اس میں اپنا نہایت نفیس دانہ دار تمباکو ڈال کر اور گلوری بنانے کی کوشش میں سنبوسہ بنا کر بجائے مجھ کو دینے کے خود کھا جاتے ہیں اور پھر چونک کر لاحول پڑھتے ہوئے دوسرا پان بنا کر

مجبور کر دیتے ہیں۔ پان سے آپ کو وہی شغف ہے جو ہر شریف آدمی کو ہونا چاہیئے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب ملانے میں اگر شطرنج کا ایک مہرہ ہے تو دوسرا مہرہ آپ کے پاندان کا ہوا ہے۔ اگر آپ اس جام سے واقف نہ ہوتے تو معلوم نہیں آپ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے مجھ کو کتنے دن لگ جاتے۔ ہم نے آپ کی سرمستی کے زمانے میں بھی آپ کی خود فراموشی دیکھی ہے اور موجودہ عالم ہوش کی ہوشیاری بھی نظر کے سامنے ہے مگر ان دونوں حالتوں میں اپنے پاندان سے آپ کبھی غافل نہ رہے۔

پاؤں اٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

جس وقت آپ کے سامنے پاندان کھل جاتا ہے اس وقت میری طرح آپ کا بھی یہی عالم ہوتا ہے کہ

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں
خلد شیشے میں ہے فردوس ہے پیمانے میں

جگر صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ جو پان آپ ادھر آکر کھاتے ہیں یا جس پان کو ہم پان سمجھ بیٹھے ہیں اس کا بھلا پان سے کیا تعلق۔ پان تو نہیں پان کا دھوکہ کھا رہے ہیں۔ کھاتے ہیں یہ پان اور تصور کرتے ہیں اس پان کا جو میسر نہیں

اس پردۂ رنگین پہ نظر آتا ہے جو کچھ
جیسے کہ یہ اک خواب ہے معلوم نہیں کیوں

شکر ہے کہ یہاں کی ایک غنیمت قسم لاہور میں ملنے لگی ہے جس کو بیچنے والے میٹھا پان کہہ کر بیچتے ہیں اور ہم اس کو صبر کے پھل والے درخت کا پتا سمجھ کر کھا لیتے ہیں۔ اس پان کو طبیعت نے گوارا کر لیا ہے مجبوری کا صبر ہے اور صبر نے عادت کی صورت اختیار کر لی ہے لہٰذا اسی پان کی ایک گلوری کے لیے پھر ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ خط ختم کرتا ہوں۔

شوکت

مولانا عبدالمجید سالک کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

آقائی و مولائی

اگر "للّٰہی بغض" کوئی چیز ہے تو "للّٰہی حب" کے وجود سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ہم کو بعض افراد سے خواہ مخواہ کا تنفر سا ہوتا ہے خواہ اس نفرت کی کوئی وجہ ہو یا نہ ہو بس ان کی صورت دیکھی اور طبیعت میں اشتعال پیدا ہوا۔ اسی طرح بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی طرف خواہ مخواہ دل کھنچتا ہے۔ میرے لیے آپ کی شخصیت کچھ اسی قسم کی ہے۔ اب سے پچیس۔ ستائیس برس پہلے جب میں لکھنؤ کے روزنامہ ہمدم کا مدیر معاون اور پھر مدیر تھا ہمدم کے معاصرین میں سے صرف انقلاب ہی ایک ایسا روزنامہ تھا جس کو میں نے اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھا اور اگر سچ پوچھئے تو اس کا بھرہ "حوادث و افکار" ہی تھا جس نے

[illegible] صاحب کا اثر ہے وہ دو باتیں، میری مزاح نگاری کا گنجینہ [illegible] تھا۔ آپ نے جس [illegible] آپ سے ملنے چاہ رہا [illegible] کہ آپ [illegible] خدمت نے [illegible] کی تشریف [illegible] آپ [illegible] اور [illegible] تھا مگر اس [illegible] اختیار کیں۔ [illegible] کہ جب [illegible] ہی [illegible] آپ کی شہرہ کی [illegible] بازوں کا [illegible] ہوئی ؎

شفق نے چھوڑ لی جیسے خزاں کی داد ہی ہے
ہر شفق میں مشرق کو [illegible]

ایک پھرتی سی چاندی کی ڈھالی ہیں [illegible] دیکھ کر ہم تو حیران رہ گئے کہ یہاں بھی [illegible] اور اس [illegible] تو [illegible] ہوں کہ [illegible] مسرت ہوئی [illegible] مگر جب [illegible] فرض کر لیجئے کہ [illegible] سامنے ہیں سالک صاحب بھی [illegible] نہیں بلکہ [illegible] مگر اس معاملہ میں بھی آپ کا [illegible]

جو شریف پاکر معلوم ہوا کہ منہ مانگی مراد مل گئی۔ [illegible] ناقصہ میں [illegible] مولانا آپ نے [illegible] فرمایا۔ یاں کے [illegible] مانگی مراد کس قدر برجستہ آیا ہے [illegible]

ب وہ وہی کہاں۔ وہ وقت کہاں وہ زمانہ کہاں۔ ماضی کو یہ یاد کب تک ؎

گزر رہا ہے جو اس کے لمحوں کی بات کرو

آخرکار تقسیم ملک نے اسی لاہور کو وطن بنا دیا جہاں ۱۹۲۳ء میں صرف ایک سال [illegible] آنے کا اتفاق [illegible] اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ لاہور آکر مکان بھی آپ ہی کے محلے میں ملا۔ اللہ جانے یہ آپ کی کشش تھی یا میری طلب کا خلوص۔ غالباً دونوں ہی کا اس میں ہاتھ تھا۔ بہرحال یہ قرب اور یہ اتصال عارضی اور وقتی سہی مگر غنیمت بہت غنیمت۔ پھر تو پاکستان بن جانے کے بعد حکومت [illegible] کے انتظامات نے یہ صورت حال پیدا کر دی کہ ؎

دشتِ جنوں میں ہو گئی منزل بلا سراغ
قافلہ کس طرف گیا بانگِ درا کو کیا ہوا

مگر شکر ہے کہ صرف محلہ ہی بدلا شہر نہیں بدلا اور تقویت کے لئے یہی غنیمت نظر آنے لگا کہ بہرحال آپ اسی شہر لاہور میں ہیں حالانکہ فاصلے نے صورت یہ پیدا کر دی کہ ؎

میسر جس سے آجاتی تھی ساقی کی قدم بوسی
مقدر میں نہیں وہ لغزشِ مستانہ برسوں سے

یہ لغزش مستانہ ہی تو تھی کہ پنچولی اسٹنڈ پر سے گھر چلے ہیں کہ آپ کی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر قدم ڈگمگائے۔ سمت بدلی اور پہنچ گئے آپ کے پاس۔ گھر سے اسٹینڈ پر جاتے ہوئے آپ نظر آ گئے اور اسٹنڈ پر پہنچنا کچھ غیر ضروری سا نظر آنے لگا۔ اب تو گویا مشاعرے مسلم ٹاؤن جانا ایک ایسا سفر معلوم ہوتا ہے جسے انگریزی کا SUFFER کہنا چاہیے۔ حالانکہ اب بھی کچھ کچھ [illegible] جی چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضری دی جائے اور آپ سے پوچھا جائے کہ جس ناز و نعم سے آپ نے

سپانے پان کھانے کے ذوق کو جس نے پروان چڑھایا تھا وہ ذوق آجکل کس عالم میں ہے۔ یہ بہشت میں شاد رہیں۔ آپ [illegible] ہوں گے اور انھیں کلکتہ میں رستیاں بٹنے کا کارخانہ آپ سے کیسے کھو جاتا ہوگا۔ میں نے تو خیر پان ہی ترک کیا ہے گٹکے پر گذر اوقات ہو رہی ہے۔ اگر کبھی دیسی پان مل جاتا ہے تو اسے چوستا ہوں۔ آنکھوں سے لگاتا ہوں اور سر [illegible] اس طرح خوش ہوتا ہوں جس طرح عید بقر عید کو پان کھا کر خوش ہوا کرتے تھے۔ مگر جب یہ پان میسر نہیں آتا تو [illegible] پان کے جو ملتے ہیں "تیمم" کا قائل ہو جاتا ہوں اور اب اس گٹکے کی عادت سی پڑ گئی ہے ؎

علت سی ہے نشہ ہے نہ شباب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

تو کیا آپ اب تک پان کھاتے ہیں۔ یعنی یہ کیفیت پان؟ کاش آجکل آپ حوادث و افکار لکھ رہے ہوتے اور اس نام نہاد پان کو اپنا موضوع بنا کر اس کی قلعی کھولتے۔ حوادث و افکار پر یاد آیا کہ خدا کرے حوادث و افکار کی ایک مجموعہ کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت کا آپ کو بھی احساس پیدا ہو چکا ہو۔ کام آسان نہیں ہے ایک انبار ہوگا جس میں سے انتخاب کرنا پڑے گا مگر یہ کام ہو جانا چاہیے یہ ایک بڑا قیمتی ادبی سرمایہ ہے جسے بہر حال محفوظ کر لینا چاہیے۔ آپکے سواد شعر و فکر کی یاد میں گٹکے کی ایک تازہ خوراک بنا کر کھاتا ہوں۔ آپ بھی پان کے بجائے جو دھوکہ آجکل کھا رہے ہیں کھائیے ۔

شوکت تھانوی

لتا منگیشکر کے نام

گوالمی شاہدرہ - لاہور

عالمہ محترمہ

آپ کے نام یہ خط اس ذیل میں ہرگز نہیں آتا کہ ؎
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

اس لیے کہ جس حد تک ملاقات ضروری ہے وہ ہوتی ہی رہتی ہے ؎

تو نہیں تو کیا ہوا کونسی کمی رہی
ہم ترے بغیر بھی تجھ سے ہم کلام ہیں

آپ کی نواؤں سے جو دنیا آج گونجی ہوئی ہے اسی دنیا کے بسنے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ آپ کی یہ دنیا صرف بھارت یا پاکستان تک محدود نہیں بلکہ آپ کے نغموں کی گونج میں تو افغانستان۔ سیلون۔ ایران۔ برما۔ انڈونیشیا بھی بستے ہیں انگلستان اور امریکہ کی نشرگاہیں بھی آپ کی آواز فضا میں منتشر کرتی ہیں اور یہ آفت ہوش و ایمان آواز تو در در اور گھر گھر پہنچی ہوئی ہے۔ کون سا خطہ ہے جہاں یہ شراب نہ برستی ہو۔ ان نغموں کی زبان کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر یہ گیت گنگنانے والے وہاں بھی مل جاتے ہیں جہاں اُردو ابھی تک نہیں پہنچی ہے۔ میں نے اُردو کے سب سے بڑے محسن مولانا عبدالحق کے نام جو خط لکھا ہے

آپ کی شخصیت [illegible] کے ساتھ [illegible] عبارت کو [illegible] ہے جس کے [illegible] اس [illegible] گانے میں پیچھے چھوڑا۔ اردو سے اپنا اس بچانے کا جو [illegible] اُردو ہی کے [illegible] گا رہی ہے [illegible] جانے ہیں لوگوں کے [illegible] ملک میں پہنچ چکی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اُردو کا [illegible] غیر ارادی طور پر آپ نے کی ہے اُردو کے کسی [illegible] یا اُردو کے کسی [illegible] ادارے سے [illegible] نہ ہو سکی ہندوستان [illegible] لوگوں سے [illegible] ہندوستان [illegible] باہر بھی [illegible] پائے گئے ہیں کہ

شمع پہ آکر گرنے ہی کیوں جل جل کر پروانے
مر کر جینا ہی مرنا ہے [illegible] جانے

بجا جا ہے

آپ کی آواز کی ایک ہی صفت یہ ہے جو [illegible] شدت سے [illegible] کر کے رہ گئے ہیں [illegible] کے قریب آتی [illegible] اور تقدس کے اقبالات سے کھنچے ہی [illegible] کہیں نہ ہو جائیں وہ کشاں کشاں آتے ہیں اور [illegible] کر آمادہ ہوئے کہتے ہیں ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

آواز کا یہ جادو اور موسیقی کا یہ تاثیر ہی تو ہے کہ ہندوستان سے اُردو کو فنا کیا جا رہا ہے مگر آپ کے گانوں میں جو اُردو سنائی ہوتی ہے وہ سر آنکھوں پر قبول ہے۔ اُردو کے لیے جارحیت کے دل کو جتنا تنگ کیا جا رہا ہے آپ کی آواز اتنا ہی کشادہ کرتی جاتی ہے حالانکہ یہ بھی درست ہے کہ ؎

کھل نہ جانا ہے عشق کے ہم و زیب ے دل
نہ رہا زندہ دیا بس تو کیا دل کی کشود

مگر جب تک آپ کے لحنوں کی گونج باقی ہے کم سے کم اُس وقت تک اُردو آپ کے مُلک میں زندہ رہے گی۔ یوں تو آپ کے پردھان منتری بھی اُردو کا دم بھرتے رہتے ہیں اور ان کے مُلک میں اُردو کا جو خونِ ناحق ہو رہا ہے اُس سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر یہ خون ان کے دامن پر نہ سہی ان کی حکومت کے دامن پر بہرحال نظر آ رہا ہے ؎

لہو بسمل کا مقتل کی زمیں پر
نہ دامن پر نہ اُن کی آستیں پر

بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے گیتوں کی شکل میں جو اُردو ہندوستان میں اب تک قابلِ قبول بنی ہوئی ہے اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دُنیا کی تمام قوموں کی قدیم روایتوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گانے سے جانور تک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے پھر یہ تو اُردو کے لاکھ دشمن سہی مگر انسان تو ہیں ہی۔ کرشن جی کی بانسری کی لے پر اگر گئو ماتا چرنا چھوڑ دیتی تھیں تو ان کا

گانوں کی دُھن میں اس امتیاز کا ہوش کس کو ہو سکتا ہے کہ اس آواز کے پردے میں اردو ہے جو روح میں سمائی چلی جاتی ہے۔ اگر یہ ہوش آجائے تو وہ ہیچ آمیزش کرے

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

بہرصورت اردو کی جو نشر و اشاعت آپ کی حسین آواز کے ساتھ ہوئی ہے اس نے اردو کو ہندوستان میں عام بنا دیا ہے۔ کوشش کی گئی تھی اردو کے باب میں ایک ہندوستان گیر سناٹا پیدا کرنے کی مگر آپ کے نغموں نے اردو کی ایسی گونج پیدا کی ہے کہ اس نقار خانۂ اردو میں ہندی کے طوطی کی آواز مشکل سے سنی جا سکتی ہے۔ مانگی جا رہی تھی اردو کے لیے علاقائی حیثیت مگر آپ کے گانوں نے اس کو ملک گیر حیثیت خود بخود دے دی۔

مکتوب یہیں تک پہنچا تھا کہ ریڈیو سے آپ کا نغمہ ابھر کر فضا پر چھا گیا۔ لہٰذا اب میں بھی ایک تازہ پان کھا کر آپ سے باتیں کرنے کے بجائے آپ کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں آپ پان کھاتی ہیں یا نہیں مگر میں بغیر پان کھائے آپ کا گانا سننا ایک قسم کی گستاخی سمجھتا ہوں۔ ایک معطر گلوری منہ میں ہو اور کانوں میں آپ کی آواز کا رس انڈیل رہا ہو تو اس دو آتشہ کا کیف مجھ کو واقعی گم کر دیتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ کو نہ ڈھونڈے۔

شوکت تھانوی

قاضی جی

(دروازہ پر دستک)

اجمل: جناب قاضی صاحب۔ قاضی جی تشریف رکھتے ہیں؟

بیوی: کون اجمل بھائی؟ جی آرہی ہوں (دروازہ کھولتے ہوئے)

اجمل: (داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض بھابی۔ کیسے یاد فرمایا تھا۔ ہمارے قاضی جی کہاں تشریف لے گئے؟

بیوی: کیا بتاؤں میں اجمل بھائی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں ان کو سمجھاؤں کس طرح۔ اب سے وہی سودا سوار ہے کہ کسی فلم کمپنی پر قبضہ مل جائے۔

اجمل: فلم کمپنی پر قبضہ؟ آپ کو کیا معلوم کہ فلم کا سر کدھر ہوتا ہے اور دم کدھر۔

بیوی: یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ فلم کمپنی تو دوسری چیز ہے زندگی بھر بڑی مشکل سے دو تین تماشے دیکھے ہوں گے مگر دھن یہ ہے کہ فلم کمپنی اگر مل گئی تو جیسے دنیا ہی تو الٹ دیں گے۔

اجمل: مگر یہ فلم کمپنی کی سوجھی کیسے؟

بیوی: اللہ جانے فلم کمپنی نگوڑ ماری کا دورہ کیسے پڑ گیا ہے۔ دو دن سے نہ جانے کیا کیا خرافات لکھ رہے ہیں۔ اب یہ رٹ ہے کہ فلم کمپنی لے کر چھوڑوں گا۔ خدا جانے کیا کیا خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں۔

اجمل: اور تشریف کہاں لے گئے ہیں؟

بیوی: جانے کہاں اندر کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ آؤ تم ہی کچھ سمجھاؤ خدا کرے تمہاری ہی بات سمجھ میں آ جائے۔

(دونوں جاتے ہیں)

قاضی جی: اخاہ۔ اجمل صاحب ہیں۔ بھئی خوب آئے۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو نہایت ضروری مشورے کرنا ہیں۔ بلکہ اب یہ طے ہے کہ یا تو ہم دونوں بن گئے ورنہ جہاں ستیاناس وہاں ساڑھے ستیاناس سہی مگر دوست پھڑک اٹھو گے وہ ترکیب تمہارے اس ہیچمدان کے ذہن میں آئی ہے۔ قسم خدا کی سونے کی کان سمجھو سونے کی کان۔

اجمل: اللہ مبارک کرے مگر کچھ معلوم تو ہو کہ واقعہ کیا ہے۔

بیوی: "فلم کمپنی کھل رہی ہے۔"

قاضی جی: "کھل رہی ہے یا سمجھو کہ بس کھل گئی۔ خدا چاہتا ہے تو اس سے زیادہ نفع کسی کاروبار میں نہیں ہے۔ مٹی سے سونا بنا لو۔ دیکھ لینا یہ دلدر دھل جائیں گے دن پلٹ جائیں گے۔ موٹریں اڑاتے پھرو گے موٹریں۔ اماں میں تو یہ کہتا ہوں عجیب حماقت کی زندگی گزار میں نے برباد کر دی اور یہ ترکیب اب ذہن میں آئی ہے جب قبر میں پیر لٹک چکے۔ مگر خیر دیر آید درست آید۔"

اجمل: "یہ تو درست ہے مگر قبلہ آپ سے اور فلم کمپنی سے کیا تعلق۔ آپ کو اس کا کیا تجربہ ہے؟"

قاضی جی: "بھئی پھر وہی بچوں کی سی بات کی تم نے۔ عزیزمن بہت سی صلاحیتیں انسان میں ایسی ہوا کرتی ہیں جن کا اس کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر مجھ کمبخت کو اپنی اس صلاحیت کا پہلے سے علم ہوتا تو آج بھلا میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ مگر اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میری تو جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ اور اب مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ میں دراصل تھا کیا [illegible] آپ کو حیرت ہوگی کہ دو ہی دن میں کتنا بڑا کام میں نے کر لیا ہے۔ کہانی مکمل۔ گانے ختم۔"

اجمل: "یعنی آپ نے لکھے ہیں گانے اور کہانی وغیرہ۔"

قاضی جی: "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم کو حیرت ہوگی۔ ارے صاحب مجھ کو خود یقین نہیں آتا کہ میں ایسا قابل ہو سکتا ہوں مگر یہ تو مجھ کو کچھ خدا کا فضل نظر آ رہا ہے۔ ہماری کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا۔ استغفراللہ۔"

اجمل: "استغفراللہ؟"

قاضی جی: "نہیں صاحب یہ تو میں بیگم صاحبہ کے رخ روشن کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں کہ میں تو فلم کمپنی کی باتیں کر رہا ہوں اور وہ اس طرح منہ بنائے ہوئے ہیں گویا میں گھاس کھا گیا ہوں۔ میں چغد ہوں میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اے صاحب اب تک تو خیر میرے متعلق جو کچھ یہ کہتیں وہ ایک حد تک ٹھیک تھا مگر اب تو ان کو بجا فخر کرنا چاہیے کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک گویا ان کا شوہر ہے۔"

بیوی: "میں تو کہتی ہوں کہ خدا جانے میری قسمت میں لکھا کیا ہے۔ تم روز بروز بہکتے ہی جاتے ہو۔ بھلا بتاؤ یہ باتیں میرے ڈرنے کی ہیں یا نہیں کہ تم نے فلم کے لیے کہانی لکھ لی ہے تم نے گانے لکھ ڈالے ہیں۔ میں تو سچ مچ تمہاری طرف سے بے حد پریشان ہو گئی ہوں کہ خدا جانے میرے مقدر میں کیا لکھا ہے!!"

قاضی جی: "ملاحظہ فرمایئے آپ کی حماقت۔ خیر تم مجھ کو پاگل ہی سمجھو مگر جس وقت لوگ تم کو میری بیوی سمجھ کر سر آنکھوں پر جگہ دیں گے اس وقت تم کو اس پاگل اس خبطی اس نامعقول شوہر کی قدر و منزلت کا پتہ چلے گا۔ تو خیر۔ ہاں تو اجمل بھائی ہماری فلم کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا اتفاق۔"

اجمل: "اتفاق۔ اتفاق سے آپ کا مطلب اتحاد سے ہے۔"

قاضی جی: "یہی تو خوبی ہے اس نام میں کہ یہ مطلب بھی ہے اور وہ مطلب بھی جو تم نہیں سمجھے۔ کہانی میں نے اس طرح شروع کی ہے کہ ایک ربڑ ٹائر تانگہ ہے جس پر پردہ بندھا ہوا ہے گویا اس میں زنانی سواریاں ہیں اور وہ

[illegible] سے گزرتا ہے [illegible] تانگے والا گا رہا ہے ـــ

مو چوڑی [illegible] ہیں - ان پہ ان پہ - میرا تانگہ [illegible] جائے

میرا تانگہ [illegible]   یہ گھوڑا [illegible]

[illegible]   چال دکھائے

میں جوڑی [illegible] - ان پہ ان پہ میرا تانگہ جائے

[illegible] بھی چل سواری   [illegible]

بیوی: (ہنس کر) بھئی واہ۔ بس خدا کی قسم ہر [illegible] ہے!

قاضی جی: ہاں ہوں، [illegible] اگر اس سڑک کی طرف [illegible]۔ مجھے تو تیرے [illegible] کی [illegible] شروع کر دیا۔ ترکی جانور گھوڑے کے [illegible] کی طرح ہوتے ہیں۔ [illegible] کے ساتھ چلتی ہوئی [illegible] کی شکل میں آتے ہو تو دیکھو گے کہ کیا قیامت ہوتی ہے!

اجمل: بھائی ذرا سننے دیجئے مجھے تو بے حد لطف آ رہا ہے۔ قاضی جی کے [illegible] تو آج ہی مجھ پر روشن ہوئے ہیں!

قاضی جی: ارے صاحب ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے [illegible] آگے سن کر [illegible] جانے والا لطف تو سارا وہی [illegible] آ کر [illegible] قیامت کی بات۔ صاحب وہ تانگے والا اسی طرح گاتا جا رہا ہے کہ ایک موڑ پر ایک موٹر سے ٹکر ہو جاتی ہے اور تانگے کی سواری الٹ کر سڑک پر گر پڑتی ہے۔ قسمت کا حسن ہے۔ موٹر چلانے والا نوجوان اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اور اس کو اسی بے ہوشی کی حالت میں موٹر پر ڈال کر چل دیتا ہے اور اپنی عالی شان کوٹھی میں لے آتا ہے اور ڈاکٹر کو بلاتا ہے وہاں سے ایک واقعہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کو ہوش آ جاتا ہے"

بیوی: (ہنس کر) ذرا اور سنو۔ یہ واقعہ ہوا ہے!

قاضی جی: خیر، خیر۔ تم کو تو نکتہ چینی سے مطلب ہے۔ مگر خدا کے لیے کہانی کے لطف کو غارت نہ کرو یہ بڑا پر لطف موقع ہے تو جناب وہ ہوش میں آتے ہی کہتی ہے۔ میں کہاں۔ وہ جواب دیتا ہے۔ آپ یہاں۔ وہ کہتی ہے الٰہی یہ بیداری ہے یا خواب۔ وہ کہتا ہے۔ جو کچھ بھی سمجھیں جناب۔ وہ کہتی ہے۔ میں تانگے پر جا رہی تھی۔ وہ کہتا ہے۔ میں موٹر پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ تانگے والا گا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ یہ بھی اتفاق کہ میں سیٹی بجا رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ پھر تانگہ لڑا۔ وہ کہتا ہے آپ کو بالکل ٹھیک یاد پڑا!

بیوی: تو کیا پوری کہانی سناؤ گے اس وقت!

قاضی جی: لیجئے یہ ہوئی ہے قدر افزائی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب تم پر میری قابلیت کا سکہ جمنا شروع ہو گیا ہوگا۔ مگر وہ مثل کہ بھینس کے آگے بین بجائی بھینس نے کہا بین بھینس بولی۔ گویا بھینس نے کوئی عمل سا جواب دے دیا۔

خیر تم سے تو مجھ کو اسی قسم کی توقع تھی۔ مگر ان میاں اجمل سے پوچھو کہ ایمانداری سے بتا دیں کہ کس قیامت کی روانی ہے۔ اس قدر۔ تالیاں بجیں گی اس مکالمہ پر کہ میں ہی صدقہ اتاروں گی مجھ پہ سے کہ خدا مجھ کو نظرِ بد سے بچائے رکھے۔"

اجمل: "یہ تو ٹھیک ہے قاضی جی مگر نہ تو اس کہانی پر کوئی اعتراض ہے نہ میں گانے کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مگر فلم کمپنی ان ہی دو چیزوں پر تو ختم نہیں ہو جاتی۔ سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی ایسا کام یا اس سے ملتا جلتا کوئی کام شروع سے کیا ہی نہیں ہے۔"

قاضی جی: "نہ سہی۔ اسے بھی نہیں کیا ہے تو نہ سہی۔ اب کریں گے۔ اور دیکھ لینا ایسا کریں گے اس کام کو کہ دنیا دیکھ کے رہ جائیگی اور فرض کر لو کہ نصیبِ دشمناں شیطان کے کان بہرے۔ نہ چلی یہ کمپنی تو بھی اپنی گرہ سے کیا گیا۔"

بیوی: "ہاں اور کیا تماشے کے لیے تو ایک تماشہ ہو گیا اور جو لوگ اس کام کو کر سکتے تھے۔ ایک تو ان کا حق مارا گیا دوسرے تمہارے اس شوق کے پیچھے اپنے پاکستان کی ایک صنعت یوں غارت ہوئی۔"

قاضی جی: "لیجئے لے آئیں وہ گھما پھرا کر اپنے پاکستان کو اس ذکر میں بھی۔ کوئی پوچھے ان عقلمند سے کہ بھلا اس میں پاکستان کا کیا ذکر تھا مگر معلوم نہیں یہ پاکستان ان کی زبان پر کیوں اس قدر رچ گیا ہے یہ بات پاکستان وہ بات پاکستان۔ پاکستان نہ ہوا جناب کا تکیہ کلام ہو گیا۔ اور اگر پاکستان کو آپ میرے لیے کوئی دشمن سمجھتی ہیں تو کان کھول کر سن لیجئے کہ میں بھی کوئی انگلستان کا رہنے والا نہیں ہوں۔ پاکستان اگر تمہارا ہے تو میرا بھی ہے۔"

اجمل: "پاکستان زندہ باد۔ آج تو شکر ہے کہ پاکستان کو آپ نے بھی اپنا لیا۔ اچھا اب جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔"

قاضی جی: "فرمائیے۔ فرمائیے۔ آپ کے لیے تو ضروری ہے۔ کہ اپنی بھاوج کی طرفداری کریں۔ اس فرض سے بھلا آپ غافل ہو سکتے ہیں۔ بہرحال آپ کو جو کچھ فرمانا ہے ارشاد فرمائیے ــ میں سننے کے لیے پیدا ہوتا ہوں ــ وہ۔ وہ۔ ہائے ہائے کتنا لاجواب شعر تھا اس وقت بالکل یاد نہیں آ رہا ہے۔"

اجمل: "قاضی جی بھابی کا اور میرا مطلب یہ ہے کہ یہ فلم کمپنی آپ کے بس کا روگ نہیں ہے آپ کو اگر کچھ کرنا ہی ہے تو ایسا کام کیجئے جس کا آپ کو کچھ تجربہ ہو جس کی کامیابی کا آپ کو یقین ہو۔"

بیوی: "اور کیا۔ کرنا ہی چاہیئے وہ کام جس سے خود اپنے کو بھی فائدہ پہنچے اور ملک اور قوم کو بھی فائدہ پہنچنے کی امید ہو۔"

قاضی جی: "خدا کے لیے کبھی تو مجھ نامراد سے اس طرح باتیں کیا کرو جس سے مجھ کو یقین آ سکے کہ یہ میری بیوی گفتگو کر رہی ہے میں تو کانپ جاتا ہوں تمہاری زبان سے ملک اور قوم قسم کے الفاظ سن کر۔ ارے صاحب آپ میری اہلیہ ہیں میری رفیقۂ حیات ہیں۔ میری شریکِ غم ہیں مگر اس قسم کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا بیوی کے بجائے یا تو آپ اخبار بن گئی ہیں یا کوئی بہت بڑی لیڈر واقع ہوئی ہیں۔ اور پھر یہ کہ بات جو کہتی ہیں وہ نہایت مہمل جس کام کا مجھ کو تجربہ ہے وہ کیا خاک کر سکتا ہوں۔ تھانیداری کی ہے زندگی بھر اب بتلائیے میں تھانیداری کیسے

کر سکتا ہوں:

بیوی: اچھا تو سوال یہ ہے کہ تم انکار کیوں نہیں کرتے:

قاضی جی: تاکہ [illegible] (مسکرا کر) اس کا حق کو [illegible] بیوی کا ہے جو کہ جی۔ میں بھی [illegible] بھلا کیسے کر سکتا ہوں جب کہ یہ تمیز نہ ہو کہ محض انسان کی کد و کاوش ہوتی ہے۔ اصل میں اس کو تجاہلِ عارفانہ [illegible] کہاں ہیں:

بیوی: بس ٹھیک ہے اسی طرح تو ڈرا۔ میں نہیں معلوم کہ تم کس چیز کا اظہار ہے۔ [illegible] کے تجھلوں پہ ہو:

قاضی جی: یہ تو صاحب ٹال کرنے کا بہانہ ہے یہ بے ہودہ طریقہ ہے۔ کہ [illegible] کب جائے۔ بلکہ تم خود ہی دیکھ لو کہ تم میں نے کوئی ظلم ہے یا نہیں۔ کھانے کو لگے ہیں یا نہیں:

بیوی: خدا کے لیے یہ کہانی یا یہ تم نے کسی کو سنا ابھی [illegible] مذاق اڑا رہے گے:

قاضی جی: کیا مطلب میرا اس قدر [illegible] ہیں اس قدر [illegible] ہیں۔ جب ذرا تو [illegible] یہ مطلب ہے [illegible] ایک ہو کر اُن باتوں کو [illegible] کہ کوئی اور سے ایک نا مناسب ہو سکتی ہے۔ میں سعدی والی بات ہوئی کہ سعدی اپنے ——— نہ ——— نہ ——— وہ تو فارسی میں ہے۔ سعدی [illegible] دوست خوش [illegible] یاد۔ [illegible] کوئی شخص اپنے گھر ہی میں ذلیل سمجھ لیا جائے۔ میرا کیا ہے [illegible] کسی ناظرے کی بات کا ذکر بھی کروں تو سمجھو میری اوقات ہے:

(غصہ میں چلے جاتے ہیں)

منشی جی

(منشی جی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں کچھ ہانپ
رہے ہیں گویا دوڑتے ہوئے آئے ہوں اور بیوی کو آواز
دیتے ہیں۔)

منشی جی: "میں نے کہا سنتی ہو اجی کہاں گئیں؟ لاحول ولا قوۃ ہمیشہ کام کے وقت ندارد۔"

بیوی: "آئی رہی ہوں۔ تم تو گھبرا دیتے ہو ابھی گری ہوتی موئے دوپٹے میں اُلجھ کے۔"

منشی جی: "اجی میں نے کہا وہ آیا ہے تصویر والا۔ تصویر کھینچنے والا۔ اس کے ڈبہ پر لکھا ہوا ہے۔ اونہہ...... کچھ عجیب سی بات لکھی ہوئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ کبھی جو یاد آ جائے۔"

بیوی: "تو مطلب کیا ہے تمھارا۔ کھنچوا لو نا تصویر۔ کیا اچھے معلوم ہوں گے بیچارے اس بڑھاپے میں تصویر کھنچواتے ہوئے۔"

منشی جی: "کیا مطلب اس کا یعنی بڑھاپے میں تصویر ہی نہیں کھنچوائی جاتی۔ تمھاری اسی بات کا کچھ جواب اسی تصویر کھینچنے کے ڈبہ پر لکھا ہوا ہے۔ ذرا تم جھانک کے دیکھو تو باہر۔"

بیوی: "میں کیا کروں گی دیکھ کر تم کو تصویر کھنچوانا ہے تو کھنچوا لو نا میرا سر کیوں کھا رہے ہو۔"

منشی جی: "میرا مطلب یہ تھا کہ تم بھی کھنچوا لیتیں تصویر۔"

بیوی: "لو اور سنو۔ میں تصویر کھنچواؤں گی؟"

منشی جی: "تم بیٹھنا کرسی پر اور میں پیچھے کھڑا ہو جاؤں گا معلوم ہو گا جیسے میاں بیوی ہیں ہم تم۔"

بیوی: "خیر آپ مجھے تو معاف رکھیے اپنی ہی تصویر کھنچوا لیجئے۔ خدا نہ کرے کہ میں اس بڑھاپے میں ایسی سٹھیا جاؤں کہ موئی تصویر کھنچواتی پھروں۔"

منشی جی: "میرا کیا ہے میں نے تمھاری ہی بھلائی کے لیے کہا تھا کہ تمھاری بھی یادگار رہ جاتی .. ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے یہی لکھا ہے اس ڈبہ پر کہ ... کہ ...... لو پھر بھول گیا۔ تم تو سارے حواس کھو دیتی ہو اپنی کج بحثی میں....."

[illegible] کر دیکھ رہے تھے شاید کچھ ہوئی ہے :

بیوی: [illegible] بھی ایک بات کے دیکھ کر بیٹھے ہو جو اب بہو سے بھی چھپاؤ گے۔ مگر بتاؤ تمہیں ہوا کیا؟
آخر ہے کیا :

منشی جی: [illegible] تم کو معلوم ہے [illegible] (مصنف [illegible])
[illegible] تصویر [illegible] دیکھ [illegible] تھا :

بیوی: ان دیکھا کیا ہے کچھ :

منشی جی: تو کیا ہے کہ انسان کی ...... اصل یادگار ...... کیا ہے؟ تصویر۔ یعنی کچھ بھی تو میری یادگار
سمجھ کر رکھا جاتا ہوں اپنی اور تمہاری تصویر :

بیوی: اپنی یادگار سمجھ کر رکھا اگر میری موت یادگار کیا ہوگی؟

منشی جی: یادگار کیا ہوگی؟ یہی سخت جاہل ہو۔ خیر جانے دو تم تو غنیمت تھا گریجویٹ بھی ہو۔ اے صاحب
یادگار کے معنی یہی ہیں کہ اگر والد صاحب کی تصویر میرے پاس نہ ہوتی تو بھلا میں ان کو یاد کر سکتا تھا؟ نہایت
یکسر تو یاد نہ رکھتا۔ والدہ صاحبہ کی تصویر نہیں ہے تو یقین جانو کہ کسی مردود کو یہ بھی یاد ہو کہ ان کی صورت
کیسی تھی :

بیوی: اور صورت یاد نہ رہتی تو تم کیا کر لیتے؟

منشی جی: کیا کر لیتے؟ یہ کیا بات ہوئی؟ اے صاحب خوش ہوتے دیکھ دیکھ کر۔ اب والد صاحب کی تصویر دیکھ کر
کم سے کم یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے والد صاحب بھی تھے :

بیوی: اے جب انسان ہی کو دنیا میں رہنا نہیں ہے تو تصویر موئی رہ کر کیا کرے گی؟

منشی جی: لاحول ولا قوۃ۔ وہ تصویر والا باہر کھڑا ہوا شور کر رہا ہے اور تم بحث کر رہی ہو مجھ سے عزیزی ...... یعنی
...... یعنی ...... یعنی بیگم صاحب اگر انسان کو دنیا میں رہنا ہوتا تو تصویر کی کیا ضرورت تھی؟ مگر تصویر تو
اسی لیے ضروری ہے کہ انسان کو رہنا نہیں ہے یہاں تمہاری قسم ایسی بات کر رہی ہے یہ بیگم کہ اب تم کو
چپ ہو جانا چاہیے۔ ایں؟

بیوی: تو میں کچھ کہہ بھی رہی ہوں تم کو کسی نے روکا ہے البتہ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں تصویر نہیں کھنچواؤں گی :

منشی جی: شہین جب میری عمر کو پہنچے گا تو میری تصویر دیکھ دیکھ کر کیسا خوش ہوگا کہ میں کیا والد تھے ہمارے بھلا
تم کو یاد بھی نہیں رکھے گا۔ میرا کیا ہے :

بیوی: اس موئی بڑھاپے کی جھریوں والی ڈراؤنی صورت کو یاد رکھنے سے نہ یاد رکھنا ہی اچھا ہے تم کو شوق چرایا
ہے، تم کھنچواؤ :

منشی جی: اچھا بھائی اب کون تم سے بحث کرے مگر میں تو کھنچواؤں گا۔ ذرا منہ ہاتھ دھونے کا پانی صابن اور آئینہ کنگھا

سرمہ دھو تو رگڑ کر دھو :

بیوی : شرم تو نہیں آتی کی بڑھاپے میں یہ سولہ سنگار کر کے تصویر کھنچواتے ہوئے جیسے ہمارے [illegible] ؟
تو بیٹھے رہے ہیں :

منشی جی : خیر خیر یہ وقت مذاق کا نہیں ہے کہیں وہ انتظار کرتے کرتے باہر ہی سے چلے جائیں ذرا [illegible]
کر دوں - تم پانی وانی رکھ دو - پھر ذرا میرے کپڑے نکال دو - (جانتی ہو نہ) وہ جامہ وار کی اچکن
اور میرا نیا جوتا (دروازہ کھول کر بھائی ذرا ٹھہر جائیے میں بس تیار ہی ہو رہا ہوں :

تصویر والا : (دور کی آواز) جلدی کیجئے صاحب دھوپ جا رہی ہے - پھر وقت نہیں رہے گا :

منشی جی : (واپس آتے ہوئے) ابھی لو ...... ابھی لو ...... (بیوی کے پاس آکر) اب [illegible]
ہے کہ دھوپ جا رہی ہے - اور تم ہو کہ بیٹھی ہو ؟

بیوی : تم جب تک منہ دھو لو اور وہ اچکن کونسی کہی تھی ؟

منشی جی : ارے ارے صاحب وہی شادی والی اچکن جامہ وار کی اور نیا جوتا - لاؤ یہ تولیہ ادھر کھسکاؤ - صابن
بھی ادھر کدھر گیا ..... وہی ..... ارے صاحب - وہ وہ ..... صابن وانی :

بیوی : سامنے رکھا ہے اور دکھائی نہیں دیتا - اور کچھ چاہئے ہے کہ میں جاؤں بس کپڑے نکالنے :

منشی جی : نہیں بس تم کپڑے لاؤ جلدی سے - شاباش :

(بیوی جاتی ہے - منشی جی منہ دھوتے ہیں منہ دھونے کی آواز
کے ساتھ ہی منشی جی بڑی زور سے کہتے ہیں -)

منشی جی : لاحول ولا قوۃ - اُخ تھو ..... تھو ..... تھو ..... لاحول ولا قوۃ :

(بیوی دوڑی ہوئی آتی ہیں - منشی جی برابر تھوک رہے ہیں)

بیوی : یہ کیا ہے آخر ..... یہ کیا ہوا ؟

منشی جی : اُخ تھو ..... ہوا کیا ..... اُخ تھو ..... جلدی کا کام شیطان کا منجن کے بجائے صابن لگا
لیا دانتوں پر ..... تھو ..... اُخ تھو :

بیوی : (ہنسی سے دوہری ہو کر) منجن سے منہ دھو لو نا اب اور اسی طرح تصویر کھنچوا لو :

منشی جی : اب مذاق ہی کرو گی یا آئینہ کنگھا بھی دو گی مجھے ؟

بیوی : رکھا تو ہے آئینہ کنگھا دیکھا بھی تو کرو :

منشی جی : ٹھیک ہے - اب ذرا ازار بند تو ڈال دو پاجامہ میں - مجھی خط بہت بڑھا ہوا ہے اب کیا ہو ؟

بیوی : اب میں اس کا کیا جواب دوں میرے ہاتھ کا کام تو یہ ہے نہیں کہ میں خط بھی بنا دوں ؟

منشی جی : خیر ہو گا بھی - ذرا سا گوند تو نہیں ہے گھر میں ؟

بیوی: کہنا کیا ہوا آخر؟

منشی جی: وہی صاحب یہ تو تعلیم ختم تو جو کہنے لگی ہو بات بات پہ۔ مطلب یہ کہ ذرا مونچھوں پہ تاؤ دے
کر تصویر کو تیار ہو جاؤ؟

بیوی: تو گویا سے مری مونچھیں چپکائی جائیں گی؟ بھلا دیتی ہوں میں ہرگز نہیں۔

(بیوی آتی ہے)

منشی جی: دیکھا یاد ہے وہ فوٹو بیٹے کی مثال کہ بیٹا بڑا بیٹھنے کے پاس ہے۔ اے صاحب ادھر آ بھی چکو؟

بیوی: لو آگئی ہوں سامنے تو پھر بیٹھنے دیتے ہو۔ خود ہی تو کہا تھا کہ منہ کو گوارا ما۔

منشی جی: یہ آیا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے یہ بیٹا ہوا چہرہ لے کر کھنچے گی میری تصویر؟

بیوی: اے سبحان اللہ دیکھا بھی نہیں تو اس کا کیا ہے یہ تو کہتے ادھر کیسے بیچ رہے گا؟

منشی جی: بیچ رہے گا! ارے صاحب بیٹھ کے اس سے بیٹا بڑا ہے بیٹھنے کے پاس سے۔

بیوی: تو کیا بیٹھ کر گھٹنوں پر رہتا ہے تمہارے یہاں؟

منشی جی: دیکھا ہاں بیٹھنے کے انداز سے ٹھیک ہے یہ تو ادھر یہی رہے گا۔ اچھا ذرا گردن۔ ہاں یوں بس اب ٹھیک
ہے مطلب یہ کہ تصویر کھنچ جائے تو ذرا ڈھنگ کی تو ہو۔

بیوی: نہ ہے کیسی ٹیڑھی ہو گئیں مری مونچھیں معلوم ہوتا ہے جیسے پرا دم اٹھائے ہوئے تنکے پہ بیٹھا ہے۔

منشی جی: ایں ... ہاں واقعی۔ ذرا قینچی نکالنا اپنی پٹی سے۔

بیوی: کیا اب کاٹی جائیں گی مونچھیں اس وقت؟

منشی جی: یہ نہ دیکھ رہی ہو کہ ایک تو ہے بس نتھنوں تک اور دوسری تو دیکھو کہاں جا رہی ہے؟

بیوی: تو یہ چھوٹی بڑی کیسے ہو گئیں؟

منشی جی: اب میں کیا جانوں کیسے ہو گئیں۔ تم قینچی لاؤ بحث بعد میں کر لینا۔

بیوی: اب مونچھوں کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔ لو یہ قینچی۔

منشی جی: ادھر آؤ ذرا یہ آئینہ پکڑ کر مونچھوں کی سیدھ میں کھڑی ہو جاؤ۔

بیوی: لو بس ٹھیک ہے نا۔

منشی جی: ایں۔ ٹھیک ہے۔ مگر نہیں یہ تو بھویں ہیں، ذرا نیچے رکھو آئینہ۔ اور نیچے۔ بس بس اب ٹھیک ہے
یونہی رہنا۔

بیوی: کہیں زیادہ نہ کٹ جائے مونچھ۔

منشی جی: زیادہ کیسے کٹ جائے گی۔ تم ڈرو تو نہیں لے (مونچھ کاٹ کر) یہ لو۔

بیوی: کٹ گئی نا زیادہ۔ کیا برا منہ ہو گیا۔

منشی جی: زیادہ کٹ گئی؟ یہ کیسے کٹ گئی؟ اب یہ اُدھر والی بڑی معلوم ہونے لگی۔

بیوی: اب کہیں اُسے بھی نہ کاٹ دینا۔

منشی جی: تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں اس ڈیڑھ مونچھ کی تصویر کھنچواؤں؟

بیوی: میرا کیا ہے تم اپنی گت بناتے جاؤ۔ ذرا آئینہ تو دیکھو۔ کیسی موئی جوجو کی سی صورت ہو گئی ہے۔ چھوٹی بڑی رہ گئیں مونچھیں۔

منشی جی: تو پھر اب کیا کروں میں بغیر دوسری طرف کی مونچھ کاٹے کام نہیں ہو سکتا۔ اب کی بیوی خیال ہی کاٹوں گا۔

بیوی: دیکھو دیکھو دیکھو۔ پھر زیادہ کٹ جاتی۔

منشی جی: میرا ہاتھ کانپ گیا تھا تم اس وقت منہ میں قینچی بھی بھونکوا دو گی۔

بیوی: میرا کیا ہے تم میری طرف سے بالکل صاف کر دو مونچھیں۔

منشی جی: بالکل کیسے دیکھتی تو رہو۔ ذرا آئینہ برابر رکھو۔ ہاں یوں۔ (لے رہو مونچھ پر قینچی چلتی ہے) یہ لو اب تو ٹھیک ہے۔

بیوی: خاک ٹھیک ہے۔ اچھی خاصی مونچھوں کا ناس مار لیا ابھی اِدھر کی ذرا بڑی ہے۔

منشی جی: اُٹھانا ذرا آئینہ ..... ہاں بڑی ہے بہت بڑی ہے ابھی منہ ٹیڑھا معلوم ہو رہا ہے۔

بیوی: اسے نائی سے ٹھیک کراؤ نہیں تو اور خراب ہو جائیں گی مونچھیں۔

منشی جی: اب اس وقت نائی کی تلاش میں نکلوں۔ توبہ ہے تمام بال پسینہ میں اور بھی چپک رہے ہیں۔

بیوی: پھر ان میں لگا ہوا ہے گوند۔

منشی جی: توبہ۔ توبہ۔ بس یونہی دکھو آئینہ۔ (قینچی چلاتے ہیں) ارے استغفراللہ۔

بیوی: بس اب تو طبیعت خوش ہوئی بالکل ہی غائب کر دی ایک طرف کی مونچھ۔ بھئی واللہ مجھ سے تو تمہاری صورت بھی نہیں دیکھی جاتی۔

منشی جی: ایسی صورت کو ڈالو جہنم میں تصویر کا کیا ہوگا اب۔ مونچھ تو اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے اس طرف کی کچھ کچھ البتہ ٹھیک ہے۔ اچھا سنو۔ ٹھیک ہے بس تم شبن کی دوات لاؤ دوڑ کے۔

بیوی: دوات؟ ..... دوات سے کیا ہوگا؟

منشی جی: اچھا صاحب نہ لاؤ مگر اس وقت حجت نہ کرو میں خود لیے آتا ہوں مجھے خود ہی غصہ آ رہا ہے اس پر تمہاری بحث، ناطقہ بند کر دیا ہے تم نے۔

بیوی: ہئی تو یونہی پوچھا تھا۔ میں لا کے دیتی ہوں ابھی۔

(بیوی جاتی ہے منشی جی بڑبڑا رہے ہیں)

منشی جی: توبہ ہے۔ اِدھر کی ٹھیک کی اُدھر کی غائب۔ اُدھر کی ٹھیک کی اِدھر کی غائب اور دھوپ الگ جا رہی

...... سے آئینہ؟ دیکھو تو سہی ...... اچھا اب ذرا اطمینان کے ساتھ کرسی پر جا کر آئینہ سامنے لے کر:

بیوی: جتنے پیچ کرنے کا ارادہ ہے اب کرا ہو تب پھر جائے گا منہ کالا کر کے:

منشی جی: دیکھتی تو ہو۔ یہیں پر رکھو آئینہ ... ہاں ... اب ذرا ادھر ہٹ کر دیکھو کیا معلوم ہوتا ہے بالکل مونچھیں معلوم ہوتی ہیں نا؟

بیوی: کہیں بھی نہیں صاف معلوم ہو رہا ہے کہ روشنائی کی لکیر ہے۔ اچھے خاصے مسخرے معلوم ہوتے ہو بہتر ہے دھو ڈالو:

منشی جی: ایں؟ ... خیر؟ ... روشنائی ذرا ہلکی رہی۔ اچھا اور سہی۔ بس یہیں رکھنا آئینہ ...... ہاں ...... اب ٹھیک ہے ... دیکھو تو ذرا دور ہٹ کر:

بیوی: میں نہیں دیکھتی تمہارا تو دماغ چل گیا ہے اور ساتھ ساتھ مجھ کو بھی پاگل بنائے ہوئے ہو:

منشی جی: اچھا خیر۔ خود دیکھ لوں گا۔ یہ گالوں میں جو گڑھے پڑے ہوئے ہیں ان کو اب کیا کروں، تصویر خراب ہو جائیگی ان سے:

بیوی: مونچھوں کی گت بن چکی اب گالوں میں روشنائی بھر لو:

منشی جی: پھر وہی۔ ارے صاحب عقل سے کام لو تو سب باتیں سمجھ میں آ جائیں مگر عقل تمہارے پاس کہاں۔ جلدی سے دو گولیاں بنا دو یہ گڑھے بھی ابھر آئیں گے:

بیوی: گولیاں کہاں سے بنا دوں گی سو پیسے پانوں کے لیے بچا رہی ہوں مگر تم سنتے بھی ہو؟

منشی جی: اچھا اچھا خیر ... وہ ...... کیا چیز ہونا چاہیئے ...... ٹھیک ہے وہ لاؤ جلدی سے وہ ...

بیوی: وہ کیا اس موئے وہ کا کچھ نام بھی ہے یا بس وہ ہی وہ کیے جاؤ گے؟

منشی جی: وہی میرا مطلب ہے یعنی وہ ...... کیا کہتے ہیں اسے۔ مسّم ڈلی کے دو ٹکڑے:

بیوی: لاتی ہوں۔ گھن چکر بنا کے رکھ دیا ہے:

(جاتی ہے)

منشی جی: (خود ہی بڑبڑا رہے ہیں) مونچھیں تو اب ٹھیک ہیں۔ کنگھی بھی خوب ہو گئی ہے اس وقت (زور سے) ہم نے کہا لائیں وہ ڈلی کے ٹکڑے:

بیوی: لا رہی ہوں۔ لا رہی ہوں۔ لاتے ہی لاتے تو لاؤں گی۔ لو یہ ڈلی کے ٹکڑے:

منشی جی: ایک ایک گال میں ایک ایک ڈلی کا ٹکڑا ٹھیک رہے گا (گالوں میں ڈلی رکھ کر بدلی ہوئی آواز میں) اب دیکھو اب تو ٹھیک ہے؟

بیوی: میاں ٹھیک ہے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دونوں گالوں میں تھوڑیاں نکل آئی ہیں:

منشی جی: تھوڑیاں؟ ...... لانا تو آئینہ۔ (آئینہ لے کر) تھوڑیاں تو کیا البتہ کچھ ٹھیک نہیں رہا یہ ......

اچھا اگر دونوں گالوں میں ایک ایک نوالہ رکھ لوں روٹی کا تو . . . . "

بیوی :- "مگر تصویر ضرور کھنچواؤ گے اس گت کے ساتھ چاہے کچھ بھی ہو جائے "

منشی جی :- "کیا مطلب ہے تمہارا بغیر تصویر کھنچوائے مر جاؤں میں کمبخت تاکہ اولاد کو یہ بھی پتہ نہ چلے کہ باپ بھی تھا "

بیوی :- "نہیں نہیں تم برا نہ مانو ضرور تصویر کھنچواؤ تاکہ اولاد کو یہ معلوم ہو کہ باپ بہروپیہ تھا "

منشی جی :- "بھئی تم سخت دلشکنی کرتی ہو میری۔ اس میں بہروپیہ ہونے کی کونسی بات ہے۔ تصویر میں ان امور کا پتہ بھی نہ چلے گا اور تصویر ہی نہ ہوئی تو پھر یہ کون کہے گا کہ . . . کہ . . . وہی حسینوں کے خطوط اور تصویر بتاں . . . بولو وہ کیا ہے شعر . . . مگر مجھے یاد نہیں تو تمہیں کیا یاد ہوگا۔ تو بولو نوالے رکھ لوں منہ میں؟"

بیوی :- "جو تمہارا جی چاہے وہ کرو۔ مگر . . . " (دروازہ پر دستک)

منشی جی :- "آیا بھئی آیا ابھی آیا بس تیار ہی سمجھو (جھٹکے سے) چھوڑو نوالہ دوالہ کو لاؤ اچکن اٹھاؤ جلدی سے "

بیوی :- "اس گرمی میں یہ جو موٹی جامہ وار لادی جائے گی تو مزا ہی آجائے گا "

منشی جی :- (شیروانی پہنتے ہوئے) خیر۔ ہوگا تم ٹوپی تو لاؤ میری . . . . . . وہ دیکھو وہ رکھی ہے گھڑونچی پر۔

بیوی :- "یہ اچکن اور اس پر یہ موٹی چیتا شاہی ٹوپی "

منشی جی :- "اچھا تو جانے دو اپنا کوئی دوپٹہ ہی دے دو صافہ باندھ لوں گا "

بیوی :- "تیل تو چڑھا ہوا ہے تمہارے سر پر "

منشی جی :- "چاہے میری تصویر کمبخت خراب ہو جائے مگر تمہارا دوپٹہ خراب نہ ہو . . . اف وہ سخت گرمی ہے . . . . اچکن تو آگ لگنے دیتی ہے "

بیوی :- "تو یہی دوپٹہ لے لو نا "

منشی جی :- "لاؤ یہی لاؤ۔ سخت پسینہ ہے . . . . توبہ ہے . . . لاؤ دوپٹہ۔ مگر اب اسے باندھے گا کون؟ بیوی بھی ایسی ملی ہیں جن کو صافہ تک باندھنے کا ڈھنگ نہیں "

بیوی :- "لے اور کیا یہ تو عورتوں کے کام ہی ہیں کہ . . . . . " (دروازہ پر دستک اور آواز)

تصویر والا :- "ارے صاحب اب تکلیف نہ کیجئے وقت نکل گیا "

منشی جی :- "تو میں بھی اب تیار ہوں بھئی۔ (بیوی سے) رہنے دو صافہ میں ننگے سر ہی کھنچواؤں گا "

بیوی :- "لے ہے۔ یہ سارا منہ کالا ہو گیا۔ روشنائی پسینہ میں خوب منہ بھر پر پھیلی ہے "

منشی جی :- "ہیں . . . . لانا تو آئینہ . . . . لاحول ولا قوۃ "

تصویر والا :- "اچھا صاحب میں جا رہا ہوں "

منشی جی :- "ارے یار خدا دم تو لو . . . توبہ ہے یہ تو شیروانی پر بھی ٹپک رہی ہے۔ بھئی ذرا لوٹا لاؤ جلدی "

بیوی :- "لو لوٹا " (منشی جی منہ دھوتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں)

پہاڑ تلے

(۱)

چند روز سے یہ کالم غائب تھا اس لیے کہ کالم نویس راولپنڈی سے غائب تھا۔ اس کالم کے قارئین سے ہم اس غیر حاضری کی معذرت خواہ ہونے کے بجائے عرض پرداز ہوں کہ مجھ کو مشاعرہ ہو گیا تھا۔ آپ نے اخبارات میں تو یہ خبریں پڑھی ہوں گی کہ کراچی میں چیچک پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہاں چیچک سے کہیں زیادہ مشاعرے پھیلے ہوئے ہیں بچشم خود دیکھے ہیں۔ جہاں تک چیچک کا تعلق ہے اس کو زیادہ ہیبت نہ کھائیے۔ اس کے ٹیکے لگانے کی مہم شروع ہو چکی ہے مگر چونکہ اب تک کوئی اینٹی مشاعرہ ویکسین ایجاد نہیں ہوا ہے لہٰذا شاعروں سے تحفظ کے ٹیکے نہیں لگے اور اگر کسی جگہ کوئی مشاعرے کا کیس ہو جاتا ہے تو ایسا متعدی مرض ہے کہ ہر طرف مشاعرے ہی مشاعرے پھوٹ پڑتے ہیں چنانچہ جب مجلس یادگار جگر کا مشاعرہ ہو چکا ہے مشاعروں کی وبا کراچی میں پھیل گئی ہے اور کراچی کے گوشے گوشے میں ایک نہ ایک مشاعرے کی قیامت برپا نظر آ رہی ہے۔

کہا جاتا ہے اور کہا ہی نہیں جاتا بلکہ واقعہ بھی یہی ہے کہ مجلس یادگارِ جگر کا جو مشاعرہ ۹ جنوری کو ہوا تھا وہ کراچی کی ہی نہیں بلکہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا کامیاب ترین مشاعرہ تھا جو سات گھنٹے تک بیس بائیس ہزار سامعین نے نہایت سکون اطمینان کے ساتھ سنا۔ نہ کوئی ہنگامہ ہوا نہ ہوٹنگ کے ذریعے مشاعرے کو جگانے کی ضرورت محسوس کی گئی نہ سیٹیاں بجیں نہ جانوروں کی بولیاں سنائی دیں۔ حد یہ ہے کہ داد تک کو بیداد نہ بننے دیا گیا ورنہ آج کل تو مشاعروں میں جتنا کلام شاعر سامعین کو سناتے ہیں اس سے زیادہ بدکلامی سامعین کی طرف سے ان کو سننا پڑتی ہے، لاٹھی چارج ہوتے ہیں کرسیاں چلتی ہیں۔ شامیانے گرائے جاتے ہیں اور لوگ ایک دوسرے پر گرتے ہیں۔ مگر یہ پہلا مشاعرہ تھا جو اس عظیم اجتماع کے باوجود چشم بد دور ایسا مہذب، پرسکون اور شریفانہ ثابت ہوا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے سخن فہم کیونکر اس مشاعرے کو نصیب ہو گئے۔

یہ اصل مشاعرہ تو خیر بحمد اللہ خیریت سے گزر گیا مگر اس کے بعد جو مشاعرے کراچی میں پھیلے ہیں تو جان بچانا دوبھر ہو گیا ایک ایک رات میں کئی کئی مشاعرے اور ہر مشاعرے کی طرف سے شاعروں کی کھینچا تانی کوئی شاعر کو ادھر گھسیٹ رہا ہے کوئی ادھر اور شاعر کی حیثیت اس کٹی ہوئی پتنگ کی سی ہے جس کو لوٹنے والے لڑکے ایسے گھیرے ہوں کہ یا تو یہ پتنگ پھٹ کر رہ جائے

پھٹ جائے اور کسی کے ہاتھ نہ آئے اور ہر شاعر کا یہ حال کہ وہ کہہ رہا ہے کہ ؎

گر یہاں تھے شاعر ملتے
ہم بھی یارب کئی بنے ہوتے

نتیجہ یہ کہ اس نے وعدہ کسی سے کیا شعر کسی اور محفل میں پڑھے۔ داد کسی اور محفل میں حاصل کی چائے کسی دعوت میں کھایا کھانا کسی اور دسترخوان پر۔ پان کسی تیسری جگہ اور رنگ سے ہاتھ جائے قیام پر دھوئے۔

مجلس یادگارِ جگر والے اس مشاعرے کے دوسرے ہی دن بیت الغزل میں فضلی صاحب کا [illegible] کہ تمام بیرونجاتی اور کچھ مقامی شعرا گرفتار کیے جا چکے تھے لہٰذا مشاعرے کے ناظم اقبال صفی پوری صاحب کو اپنی صفی پور ہاؤس والی محفل "کھاؤ اور گاؤ" کو تیسرے دن کے لیے ملتوی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور ۹ جنوری کو تو شاعروں کا یہ حال تھا کہ وہ منہ چھپاتے پھرتے تھے اور ان کو ڈھونڈنے والے ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے سونگھتے پھر رہے تھے اور ان کا سراغ لگاتے پھرتے تھے اس لیے کہ اس ایک ہی دن میں کئی نشستیں منعقد ہو رہی تھیں حضرت جوش ملیح آبادی کے یہاں کی نشست مولانا ماہر القادری کے یہاں کی محفلِ طعام و کلام۔ کراچی یونیورسٹی کا مشاعرہ جونا گڑھ پیلیس کی "محفل پان و ساز و مشاعرہ" آخر یہ بے چارے شاعر اپنے کو چار ٹکڑوں میں کیونکر تقسیم کر دیتے نتیجہ یہ کہ کچھ کو جوش صاحب لے اڑے کچھ مولانا ماہر کے ہاتھ آگئے کچھ یونیورسٹی پہنچے اور کچھ جونا گڑھ پیلیس میں نظر آئے۔ بعض ایسے جانباز بھی تھے جو یونیورسٹی کی محفل میں بھی نظر آئے اور جونا گڑھ یا مولانا ماہر کے دسترخوان پر بھی اس میں دراصل شعرائے کرام کی "ہرجائیت" کا کمال نہ تھا بلکہ ان محفلوں کے بانی ہی ان کو اس طرح لوٹتے پھرتے تھے جس طرح الیکشن کے دوران ووٹروں کو لوٹتے پھرتے ہیں۔

واضح رہے کہ مجلس یادگار جگر کا مشاعرہ صبح چار بجے ختم ہوا بیت الغزل میں فضلی صاحب کا مشاعرہ رات کو دو بجے تک ختم ہوا۔

صفی پور ہاؤس میں اقبال صفی پوری کا مشاعرہ ڈھائی بجے رات کو ختم ہوا۔

جونا گڑھ پیلیس کا مشاعرہ رات کو ایک بجے ختم ہوا۔

ان مشاعروں کے علاوہ باہر سے آنے والے شعرائے کرام سفر میں بھی جاگے ہوئے تھے اور ان پے در پے مشاعروں میں مبتلا ہو کر تو راتوں کی نیند ہی ان پر حرام ہو چکی تھی۔ دن کو آٹوگراف لینے والے یا ان کے دوسرے قدردان یوں بھی سونے نہ دیتے تھے لہٰذا کیفیت ان کی یہ تھی کہ نیند میں ایک مصرع ایک غزل کا پڑھ جاتے تو دوسرا کسی اور غزل کا اور پھر معذرت خواہ ہوتے تھے کہ "حضور معاف کیجیے گا ہم چار پانچ دن کے جاگے ہوئے ہیں لہٰذا عفو و بخشش کے مستحق ہیں" دوسروں کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہوگا خود اپنا تو یہ حال ہو گیا تھا کہ اگر کسی وقت آنکھ لگ بھی گئی تو خواب میں مشاعرہ دیکھ کر پھر اچھل پڑے۔

ممکن تھا کہ کراچی میں ایک آدھ دن اور قیام ہوتا مگر جب مشاعروں کی بہ کثرت دیکھی اور وعدہ لینے والوں کے غول بالکل ہی پسپا کر دیا تو ۱۰ جنوری کو صبح اس وقت جبکہ سرسید گرلز کالج میں مشاعرہ برپا تھا میں اپنے سامان کے علاوہ [illegible] اپنے اوپر لادے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا اور اسٹیشن پہنچ کر ٹرین میں اگر دم لیا ورنہ کراچی میں تو اب تک مشاعرے بھگتا رہا ہوتا [illegible]

مس صاحب وہ لکھ لیتے تو اب یہ لکھ دیجئے تو پھر ٹھیک بیٹھتے ہیں ان پر ملک ایسا لگا ہوں اب آپ کی خدمت میں عرض ہے صاحب کہ بیچاری کی عزت ستاروں کا ٹیکہ لگوا کر بچا دیجئے ورنہ آپ جانتے ہیں کہاں بیت رہا ہوں جان ہے۔

(۲)

لندن میں ایک صاحب کہتے تھے زیادہ تعجب اس بات پر ہوا کہ جب ہم یانکی جیسے ہی کہ یہاں آئے تو ہم نو انگلستان پہنچے سب سے معلوم ہوا کہ چونکہ یہ ہر ز ہوٹل پہنچتے ہیں ان انگریزی بولنے والوں کو دیکھ کر کہاں صاحب کے معلوم ہوا کہ ہم جس کو انگریزی سمجھتے تھے وہ کچھ آدمی ہی نہیں جانتے اور انگلستان چلے گئے ہیں اس شہر میں سب سے پہلے ٹیکسی والا انگریزی بولتے ہیں سمجھ یہ کہ ہم زبان سمجھ ہی نہیں سکتے گونگوں کی طرح اشاروں سے اپنا مطلب سمجھانا پڑتا ہے نہ کسی کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ نہ اپنی بات کسی کو سمجھا سکتے ہیں۔ سنی سنائی انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اور بھی مشکل آن پڑتی ہے کہ کسی عورت سے "مس سر" کہہ دیا تو وہ چونک پڑی اور کسی مرد کو نہایت ادب سے "میڈم" کہہ دیا تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا "یس" کی جگہ "نو" اور "نو" کی جگہ "یس" کہہ رہے ہیں۔ خاص طور سے ہوٹلوں کے نوکروں کے ساتھ کھانے بیٹھتے ہیں تو آفت ہی ہوتی ہے لکھتے زمین کی ہیں اور سمجھی جاتی ہے آسمان کی بات، جانا چاہتے ہیں آکسفورڈ اسٹریٹ اور ٹیکسی والا پہنچا دیتا ہے مثلاً اسٹاک ایکسچینج یا دکانداروں سے مانگتے ہیں تولیہ اور وہ لا کر دیتا ہے رومال۔ کھانے کو مانگتے ہیں مرغی اور وہ لا کر رکھ دیتا ہے ٹماٹر۔ نہ کسی سے کسی جگہ کا پتہ پوچھ سکتے ہیں نہ کسی کا بتایا ہوا پتہ سمجھ سکتے ہیں سوائے اس کے کہ سب کچھ سن کر جان چھڑانے کے لیے بس "یس سر" کہہ کر خود ہی سرگرداں رہیں۔

سنا ہے کہ اسی قسم کے ایک منشی فاضل صاحب انگریزی کی دو تین ریڈریں پڑھ کر انگلستان جا پہنچے اور وہاں پہنچ کر ان کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ جتنی انگریزی وہ جانتے ہیں وہ زبان کے لیے اس قدر ناکافی ہے کہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ وہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گئے اور خدا جانے کس طرح ڈاکٹر تک پہنچے مگر اب ڈاکٹر کو اپنی تکلیف سمجھائیں تو کس طرح۔ خیال یہ تھا کہ ہمارے ناواقف طبیبوں کی طرح کے وہ ڈاکٹر بھی ہوں گے جو نبض دیکھ کر سب کچھ خود سمجھ لیتے ہیں اور مریض کو کچھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر وہاں ڈاکٹر اپنی زبان میں سوال کر بیٹھا کہ تم کو کیا شکایت ہے اور اب جو منشی صاحب نے اردو میں انگریزی بولنا شروع کی ہے تو ڈاکٹر بھی چکرا کر رہ گیا کہ اس مریض کو آخر کس مرض کی دوا دے۔ کہنے لگے کہ "سر ویسٹ نائٹ ہیڈک ان اسٹارٹ شروع ہوا پھر ٹو اور فائیو ٹائمز چھینکیں کیم اور اس کے بعد خارش بہت محسوس ہوا آفٹر ویٹ لیز وہ سے فیور ہو گیا"۔

ڈاکٹر کے پلے جب کچھ نہ پڑا تو اس نے ان کو بمشکل سمجھایا کہ علاج کرانا ہے تو پہلے کسی انگریزی جاننے والے ہم وطن کو لے کر آؤ ورنہ ایسا نہ ہو کہ اختلاج قلب کی شکایت ہو اور مراق کی دوائیں تمہارے لیے تجویز کر دی جائیں۔

ایسے تو خدا جانے کتنے لوگ وہاں پہنچ جاتے ہیں جو ہوٹلوں میں مرغی مانگنے کے لیے انڈا دکھا کر سمجھاتے ہیں کہ اس کی ماں چاہیے۔ تصویریں دکھا دکھا کر مطلوبہ اشیاء دکانداروں سے طلب کرتے ہیں آمد کا یہ ہوتا ہے کہ گھیروں دکھا کر انشاء اللہ کو گردش سمجھتے ہیں

کہ "اس کا یوں ہونا چاہیے" تو یہ انگریزی تقریباً اسی قسم کی ہوتی ہے جیسی ہمارے یہاں کے خوانچہ فروش انگریزوں کی تعداد دیکھ کر دور سے انگریزی بولا کرتے تھے کہ "صاحب بہادر گڈ ون آنہ لے گا خوش ٹیک خوش ٹیک" مگر اس قسم کی انگریزی بولنے والوں کو یہی جواب ملتا ہے کہ تم جو کچھ مانگتے ہو اس کو ہم اتنا ہی سمجھتے ہیں خوش ٹیک خوش ٹیک۔

صورت حال یہ ہے کہ برطانیہ کے متعلق ہمارے یہاں کے لوگ جب یہ سنتے ہیں کہ وہاں نہایت آسانی سے روزگار مل جاتا ہے اور معاوضہ نہایت معقول ملتا ہے تو وہ بغیر سوچے کہ انگریزی زبان جانتے ہیں یا نہیں کسی نہ کسی طرح انگلستان پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر صرف ہوٹلوں میں پلیٹیں ہی صاف کرنے کا کام مل گیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے مگر جب وہاں پہنچ جاتے ہیں تو ان کو ایسا گر لگا اور بڑا افسوس کرتے ہیں کہ خود بھی پریشان ہوتے ہیں۔ اور وہاں کے لوگوں کے لیے بھی مصیبت ثابت ہوتے ہیں کہ آخر ان کو کس طرح سمیٹا جائے ان کو کس طرح سمجھا جائے اور کس طرح کھپایا جائے۔ آخرکار ایک آخری ترکیب اس قسم کے نو وارد اہلِ برطانیہ کی سمجھ میں آئی ہے کہ ان کو پہلے انگریزی پڑھائی جائے اس کے بعد ان سے پوچھا جائے کہ یہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ اور کیا چاہتے ہیں۔ برطانیہ کے صنعتی شہر برمنگھم میں ان غیر ملکی اور انگریزی نہ جاننے والے افراد کی انگریزی پڑھنے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں تاکہ وہ یہاں آئے ہیں تو یہاں آنے کا مقصد بھی بیان کر سکیں ملازمتیں چاہتے ہیں تو ملازمتیں حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ محنت مزدوری کرنا چاہتے ہیں تو اس پر روشنی ڈالیں۔ ان اشارہ بازیوں سے آخر کب تک کام چل سکتا ہے۔

انگریزی نہ جاننے والے ان پردیسیوں کو انگریزی میں شدبد حاصل کرنے کی تحریک دراصل ایک ڈاکٹر کی اپیل پر شروع کی گئی ہے جس کا ایک ایسے پاکستانی مریض سے سابقہ پڑ گیا تھا جو بیمار تو یقیناً تھا مگر یہ بتانے سے قاصر تھا کہ اس کو بیماری کیا ہے اور وہ کن تکالیف میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے اشاروں پر بھروسہ کرکے اوٹ پٹانگ علاج کو خطرناک سمجھ کر اپیل کی ہے کہ ان نوواردوں کو کم از کم اتنی انگریزی تو آنا ہی چاہیے کہ وہ اپنے مرض کی علامات بیان کر سکیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ مبتلا ہوں ہیضہ میں اور علاج شروع ہو جائے بواسیر کا تکلیف ہو جوئی کو اور آپریشن کر دیا جائے خواہ ان کا۔

اب دفتر روزگار والے ان انگریزی نہ جاننے والوں سے پوچھتے پھر رہے ہیں کہ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس قسم کی کلاسوں میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ پوچھنا ان سے یہ چاہیے کہ بندہ نواز جب آپ انگریزی جانتے ہی نہ تھے تو انگریزوں کے ملک میں آخر کیا سمجھ کر آ پہنچے ہیں۔ اب یہ تو ہونے سے رہا کہ آپ سے سر کھپانے کے لیے اہلِ برطانیہ اردو پڑھنا شروع کر دیں یہ زحمت تو آپ ہی کو کرنا پڑے گی مگر ایسا نہ ہو کہ اس کے جواب میں وہ یہ کہیں کہ انگریزی جانتے ہوتے اور انگریزی ہی پڑھنا ہوتی تو اپنا دیس چھوڑ کر پردیس کا کیوں رخ کرتے انگریزی جاننے والوں کے لیے روزگار کی خود ہمارے یہاں کون سی کمی تھی ہم تو یہ سمجھ کر یہاں آ گئے تھے کہ یہاں پڑھے نہ لکھے بھی محمد فاضل ہوتے ہیں۔

[illegible] اور کراچی [illegible] شروع [illegible] ٹرک [illegible] سفر [illegible] تھا۔ یہ ٹرک ایک خاص تقریب منعقد کر کے دیا گیا جس میں بشیر نے شکریہ کی تقریر کرتے ہوئے اس تحفہ کا شکریہ و احسان مانا [illegible] سے دوستی کا [illegible] جنھوں نے ایک اونٹ والے کو ایک ٹرک [illegible] معلوم [illegible] ہمارے ملک کو [illegible] تحفہ حاصل کر کے [illegible] بہت جلد [illegible] مسٹر جانسن [illegible] کے سلسلے میں [illegible] احسان فراموش نہیں ہیں کہ اپنے اونٹ کو بھول جائیں [illegible] یہ ظاہر ہے کہ [illegible] اونٹ [illegible] حاصل [illegible] اپنے اونٹ [illegible] اونٹ [illegible] گے؟ اس خیال سے کہ ایک اونٹ کی [illegible] سکتا ہے [illegible] اور [illegible] ہے کہ وہ سفر [illegible] میں اپنے اونٹ کو ساتھ لے گئے مگر زندگی کے سفر میں وہ اونٹ کو ہمیشہ ساتھ رکھیں گے انھوں نے ایک شتربان کی خدمات حاصل کی ہیں کہ جب وہ ٹرک چلا رہے ہوں تو شتربان ان کا اونٹ چلاتا ہے۔ وہ یہ اونٹ کسی کو نہ دیں گے البتہ اگر مسٹر لنڈن جانسن مانگیں تو دوسری بات ہے۔

بشیر نے اپنی تقریر میں بڑی سادگی سے یہ بھی بات کہہ دی کہ یہ امریکی ٹرک تو مجھ کو دل لگی سے ملنے کے لیے [illegible] میرے پاس گیراج نہیں ہے اس لیے کہ جو ذرا سا گھر ہے اس میں رہتا ہوں اس ٹرک کے لیے دوسرا خانہ کہاں سے لاؤں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ٹرک نہایت قیمتی ہے اور کراچی میں اس قسم کے ٹرک کی قیمت آج کل پچیس ہزار روپے کے قریب ہے اس ٹرک کے علاوہ بشیر کو فاضل پرزہ جات اور اوزاروں کے دو صندوق بھی دیے گئے ہیں جن کی قیمت ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے مگر اس ٹرک اور ان دونوں صندوقوں کو رکھے گا کہاں اس کا فی الحال کوئی انتظام نہیں ہے مگر خدا مسبب الاسباب ہے [illegible] امریکی سفیر ولیم راونٹری بشیر کی اس پریشانی کی خبر بھی مسٹر لنڈن جانسن کو کر دیں اور حق دوستی ادا کرتے ہوئے گیراج کا بھی بندوبست کر دیں۔

فی الحال تو بشیر پر وہ قصہ صادق آ رہا ہے کہ ایک راجہ صاحب نے ایک سنت سے خوش ہو کر اپنا ایک ہاتھی اس کو انعام میں دے دیا تھا ظاہر ہے کہ اتنا بڑا انعام پا کر وہ خوش نصیب سنت کتنا خوش ہوا ہو گا ساری ریاست میں اس کی دھوم ہو گئی کہ مہاراج نے ایک غریب سنت کو اتنا بڑا انعام دے ڈالا ہر طرف سے لوگ اس ہاتھی کو دیکھنے آنے لگے جو سنت کے دروازے پر کھڑا جھوم رہا تھا اور سنت کو مبارکباد دیتے تھے مگر جب یہ مبارک سلامت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اس غریب سنت کو اس ہاتھی کی خوراک کا بندوبست کرنا پڑا۔ تو چند ہی دن میں اس سنت کا حال ایسا پتلا ہوا کہ دن کو تارے نظر آنے لگے اور اب پتہ چلا کہ مہاراج نے اس کو یہ انعام نہیں دیا ہے بلکہ ایسی سزا دی ہے کہ ہاتھی کے بوجھ تلے وہ دبتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اس انعام سے وہ مالا مال ہوتا ہاتھی کا پیٹ بھرنے کے لیے اس کو خود اپنا پیٹ کاٹنا پڑا۔ بال بچوں کا پیٹ کاٹنا پڑا اور آخر کار جب گھر کا سامان نیلام کرنے کی نوبت آ گئی تو وہ دست بستہ مہاراج کی خدمت میں حاضر ہوا کہ کم از کم اس کو وہ خطا تو بتا دی جائے جس کی اتنی بڑی سزا اس کو دی گئی ہے آخر بمشکل تمام مہاراج کو یہ سمجھایا جا سکا کہ یہ ہاتھی اس سنت پر کتنا بڑا بوجھ بن گیا ہے لہٰذا دوسرا انعام مہاراج نے یہ دیا کہ اپنا عطیہ واپس لے کر اس کو اس ناقابلِ برداشت بوجھ سے سنت کو

سبکدوش کر دیا۔

فورڈ کمپنی والوں کو کیا معلوم کہ مسٹر تھڈن جانسن کا یہ دوست اس قابل بھی نہیں کہ اس تحفہ کو سنبھال سکے گا ورنہ [illegible] جھونپڑے کی خبر ہوتی تو پہلے وہ خود بشیر کے لیے ایک گیراج کا بندوبست کرتے جس میں یہ بیچارہ رہ سکے اس کے بعد [illegible] ٹرک کا گیراج فراہم کرتے پھر ٹرک دیتے۔ اب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بشیر اس ٹرک کو اپنے جھونپڑے کے سامنے کھڑا کر کے خود اس میں رہنا شروع کر دے اور اس کو ٹرک سے زیادہ اپنے گھر کے طور پر استعمال کرے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب وہ ڈرائیونگ لائسنس حاصل کر لیں گے، ٹرک چلانا شروع کریں گے اور اس سے پیسہ کمائیں گے تو یہ آمدنی خود ہی گیراج کا بندوبست کر دے گی مگر اس آمدنی سے پہلے تو اخراجات ہی اخراجات ہیں کہ اونٹ کے بجائے ایک شتربان رکھنا پڑا ہے۔ ڈرائیونگ سیکھنے کی فیس ادا کر رہے ہوں گے۔ ٹرک تو آ گیا ہے اب پٹرول بھی پھونکنا پڑے گا۔ اس کے رجسٹریشن کے اخراجات کا بار الگ ہوگا اور ڈرائیونگ لائسنس بھی ظاہر ہے کہ مفت تو ملتا نہیں پھر یہ ٹرک چلانا شروع کریں گے تو نئے نئے ڈرائیور کی حیثیت سے جانے کتنے چالان کرائیں گے اور کتنے جرمانے ادا کریں گے۔ اور ان تمام منزلوں سے گزرنے کے بعد کہیں آمدنی کی شکل نظر آنے گی۔ نتیجہ یہ کہ بجائے اونٹ کے سامان کو اس ٹرک ہی سے پوچھنا پڑے گا کہ "ٹرک رے ٹرک تیری کونسی کل سیدھی"۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بشیر کو اگر خدا عقل دیتا تو وہ اس ٹرک کو شکریہ کے ساتھ قبول کر کے اس کی قیمت [illegible] اور پچیس چھبیس ہزار میں اس ٹرک اور اس کے سامان کو فروخت کر کے اس رقم سے کچھ اونٹ اور کچھ گاڑیاں خرید لیتے اور اپنے اس پیشہ کو ترقی دیتے جس کا ان کو تجربہ بھی ہے اور جس سے ان کو یہ عزت حاصل ہوا ہے بجائے ایک اونٹ گاڑی کے اونٹ گاڑیوں کے ایک قافلہ کے مالک بن کر چین سے زندگی بسر کرتے۔ مگر جانسن صاحب کی دوستی نے ان کو ساربانی سے ڈرائیور بنا کر رکھ دیا ہے تو اب وہ بھلا ہماری یہ بات کیوں مانیں گے وہ اپنی لائن شوق سے بدلیں مگر خدا کرے اونٹ گاڑی اور ٹرک میں جو فرق ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر نہ رہیں۔ اور اس ٹرک کو اس طرح استعمال نہ کریں کہ چند دن کے بعد اسی میں اونٹ جوڑنے کی نوبت آ جائے اور اونٹ ہی اس کو کھینچ کر گیراج تک نہ پہنچایا کرے

(۴)

شیدی گرلس کچھ بھی سہی مگر یہی کیا کم ہے کہ وہ اپنے کو گرلس تو کہتی اور سمجھتی ہیں مگر آپ ان مردانہ عورتوں کو کیا کہیں گے جو عورت پیدا ہو کر مرد بننے کے ارمان میں گھلی جاتی ہیں اور ایسی مردانہ وضع قطع اختیار کئے رہتی ہیں کہ عجیب خام خان قسم کی نظر آتی ہیں وہ نہ صرف مردوں کی طرح کے بال ترشوا کر گیسوئے تابدار کو مردانہ وار بنوا لیتی ہیں بلکہ اچھا خاصہ زنانہ شلوار ساڑی وغیرہ چھوڑ کر سلیکس پہننا شروع کر دیتی ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ گویا بہت حسین نظر آتی ہوں گی حالانکہ اس لباس اور اس وضع قطع کے ساتھ ان کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر یا سگریٹ کے کش لگاتی ہوئی دیکھ کر بہت غور کرنا پڑتا ہے کہ یہ مسماۃ غفورن ہیں یا مسٹر اے غفور۔ یہ بیوی بننے کے قابل ہیں یا ان کو شوہر بنا لینا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ عورتوں کے لیے زیادہ جاذب نظر ہیں یا مردوں کے لیے بلکہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو اگر مس کہہ کر مخاطب کر لیا گیا تو ناراض تو نہ ہوں گی اور

[illegible] باتیں اس کو [illegible] ہو جاتی [illegible] جنس کا لباس پہنتے ہیں [illegible]
[illegible]

کچھ ایسا ہوا کہ اس قسم کے مرد [illegible] کہ وہ مرد پسند کرتے ہیں وہ خود نسائیت میں مبتلا ہوتے ہیں [illegible]
[illegible] نہیں ہے یہ وہ مرد ہوتے ہیں جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ [illegible]
کو آئینہ خانہ میں گزارتے ہیں بال بنا کر رہتے ہیں اور آرائش [illegible] بار بار [illegible] اور گھر [illegible]
[illegible] کریم لگاتے ہیں [illegible] قریب پہنچیں ممکن ہے
آپ اس بات کا یقین نہ کریں مگر ہم نے [illegible] دیکھے ہیں جو ایسے ایسے ناز آفریں [illegible]
[illegible] پہنتے ہیں [illegible] زنانے کی کرتے
وہ اس طرح پھرتے ہیں کہ [illegible] ان سے پہلے کری جاتی ہے [illegible]
[illegible]

سمجھتے ہیں کہ جو بیویاں ان کو دیکھ کر خوش ہوں گی [illegible] حالانکہ عورتیں [illegible] اپنی موت سمجھتی ہیں یا اس کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ان کو [illegible] یا ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ [illegible] نام نہاد مرد تجھ کو یہ نسائیت زیب نہیں دیتی۔

اس قسم کے "لیڈیز مرد" ممکن ہے کہ ان جنسی عورتوں کو پسند کرتے ہوں ورنہ جو اصل نسل کے مرد ہیں وہ تو ایسے ہم جنس نظر آنے والی ان عورتوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے بلکہ اگر کسی شوہر کی بیوی یکایک اسی طرح [illegible] شوہر ہونا شروع کر دیتی ہے تو وہ بیچارہ سخت پریشان ہو جاتا ہے کہ [illegible] شوہر [illegible] تو آخر بیوی کون ہے۔ ہم آپ تو پھر بھی مشرقی ہیں یہ وضع قطع جس مغرب سے آتی ہے خود وہاں کے بھی اس قسم کے مردوں کا حال یہ ہے کہ جس بیوی کو عورت سمجھ کر بیاہ لاتے تھے اس کی اس مصنوعی جنسی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے چنانچہ فرانس ایسے فیشن ایبل ملک میں ایک شوہر نے اپنی بیوی سے طلاق حاصل کرنے کی محض اس لیے درخواست دے کر کامیابی حاصل کر لی کہ بیگم صاحبہ کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے اسکرٹ چھوڑ کر سلیکس پہننا شروع کر دی۔ اپنے تمام زنانہ لباس اپنی سہیلیوں میں تقسیم کر دیئے اپنے بال بھی مردوں جیسے کٹوا لیے اور پائپ پینا شروع کر دیا۔ پہلے تو شوہر نے بیوی کو سمجھایا کہ دیکھو نیک بخت میں نے مرد سے نہیں بلکہ ایک عورت سے شادی کی ہے اور تم کو میرے لیے عورت ہی بن کر رہنا چاہیے۔ تو میرا برادر عزیز بننے کی کوشش نہ کرو [illegible] کہ گھر والی درکار ہے گھر والا نہیں مگر جب ان محترمہ نے اس کی ایک نہ سنی تو اس نے طلاق کی درخواست دے دی کہ چونکہ میری بیوی وضع قطع کے اعتبار سے مرد بن چکی ہے لہٰذا میں اس مرد نظر آنے والی عورت کو اپنی بیوی نہیں سمجھ سکتا۔ عدالت نے اس کو طلاق کا حق دے دیا اور محض اس مردانہ پن نے اس عورت کو اپنے شوہر سے علیحدہ کرا دیا۔

عدالت نے اس مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے جج نے کہا کہ یہ بیوی کی سراسر زیادتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اس بات پر مجبور کرے کہ وہ ایک مرد نظر آنے والی جنس کو بیوی سمجھے۔ یہ عورت نہایت آسانی سے اس وضع کو ترک کر سکتی تھی اور عورت بن کر رہ سکتی تھی مگر اس نے شوہر کے جذبات کا خیال نہ کیا حالانکہ اس کو غور کرنا چاہیے تھا کہ اگر اس کا شوہر اسکرٹ پہننا شروع کر دیتا تو وہ کیا

طرح کے بال بڑھاتا، اونچی ایڑی کا جوتا پہننے لگتا۔ میک اپ کا پابند ہو جاتا تو خود اس کے لیے کس حد تک ناقابلِ برداشت ہو جاتا۔ اسی طرح وہ مردانہ وضع اختیار کر کے اپنے شوہر کے لیے ناقابلِ برداشت بن چکی ہے اور اسی پر مُصر ہے کہ اس وضع کو ترک نہ کرے گی تو سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کے شوہر کی درخواست منظور کر کے اس کو طلاق کا حق عطا کر دیا جائے اور اس کے مطالبہ کو حق بجانب سمجھا جائے۔ وہ عورت یہ فیصلہ سن کر پتلون پہنے سگریٹ کے کش لیتی ہوئی نہایت اطمینان سے چلی گئی اور وہ مرد بھی ایک مرد بیوی سے نجات حاصل کر کے سبکدوش ہو گیا۔

یہ حالات اس ملک کے ہیں جہاں عورتوں اور مردوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا مگر ہمارے یہاں تو عورت صحیح معنوں میں عورت، اور مرد صحیح معنوں میں مرد ہوتا ہے۔ یہاں یہ مغربی فضا بھلا کیونکر چل سکتی ہے مگر کورانہ تقلید کا یہ حال ہے کہ یہاں بھی کبھی نہ کبھی جب کوئی "پتلون آرا بیگم" نظر آجاتی ہیں تو مرد یہ غور کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اب ہم کیا پہنیں اور کیونکر اس فرق کو قائم رکھیں جو عورت اور مرد کے درمیان ہونا چاہیے۔

(۵)

متعدی امراض سے احتیاط برتنا اور اپنے کو بچائے رکھنا بے حد ضروری ہے اور اس احتیاط کے ہم خود قائل ہیں مگر ہم خوش خیال اہلِ برطانیہ کی طرح نہیں جو اس وہم میں مبتلا ہیں کہ پاکستان والے بذریعہ ڈاک ان کو چیچک ارسال کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اس کو نہایت خود غرضی سمجھتے ہیں کہ اکیلے اکیلے چیچک کے مزے خود ہی لوٹیں اور دور افتادہ اہلِ برطانیہ کو اس سے محروم رکھیں۔ چنانچہ ان برطانوی عقلمندوں کا خیال یہ ہے کہ یہ پاکستان والے نہ صرف تحفہ کے طور پر ان کے لیے چیچک لے کر جاتے ہیں بلکہ خطوط تک میں چیچک کے جراثیم بھر بھر کر بھیجے جا رہے ہیں لہٰذا وہاں کے اکثر عقلمند یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ؎

خط میں لکھے ہوئے چیچک کے پیام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

لندن وغیرہ میں کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ جہاں کوئی پاکستانی راستہ میں نظر آیا اور بھاگے یہ انگریز سر پہ پیر رکھ کر چلاتے ہوئے کہ ؎

آیا آیا پاکستانی بھاگیں سارے لوگ
اُوپر اُوپر اچھا خاصہ اندر چیچک روگ

ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے اور بھی اس وہم کو ہوا دے رہے ہیں چنانچہ ابھی پچھلے دنوں ایک ڈاکٹر صاحب ٹیلی ویژن پر عوام کو بتا رہے تھے کہ چیچک کے جراثیم خطوط، اخبارات اور کپڑوں کے ذریعے منتقل ہو سکتے ہیں اس خبر کو وہاں کا ایک اخبار ایوننگ نیوز بھی لے اُڑا۔ نتیجہ یہ کہ ڈاکخانوں کے ملازمین نے پاکستانی ڈاک کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا اور پوسٹ مینوں نے صاف کہہ دیا کہ صاحب جان ہے تو جہان ہے ہم یہ پاکستانی چیچک میں مبتلا ڈاک تو ہرگز تقسیم نہ کریں گے ان خطوط میں محبت نامے نہیں چیچک نامے بھرے ہوئے ہیں ان پاکستانی اخبارات میں خبریں نہیں چیچک بھری ہوئی ہے اور چونکہ یہ خطوط اور پاکستانی اخبارات

[illegible] تمام تر اس کے قریب ہی دبا دی جائیں گی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانی ڈاک تقسیم نہ ہو سکی اور اس کے ڈاک خانوں میں ڈھیر لگ گئے ہیں۔

اب لندن سے کچھ ہی [illegible] نے اعلان کیا ہے کہ پاکستانی ڈاک کی تقسیم شروع کر دی گئی ہے اس لیے کہ اس کا پوری طرح معائنہ ہو چکا ہے اور چونکہ اس میں چیچک کے جراثیم نہیں نکلے اس لیے مزید کسی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ یہ بظاہر [illegible] ہیں کہ ہر پاکستانی خط یا اخبار کے ساتھ اس کے متعلق ایک سرٹیفکیٹ بھی آنا چاہیے کہ اس خط یا اس اخبار کا باقاعدہ معائنہ کیا جا چکا ہے اور اس بات کی تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ خط یا یہ اخبار چیچک میں ہرگز مبتلا نہیں ہے احتیاطاً اس خط یا اس اخبار کے چیچک کا ٹیکہ بھی لگا دیا گیا ہے اور اس کے اندر بھی ایک ٹیکہ ملفوف ہے تاکہ اس خط یا اخبار کو وصول کرنے والا بھی ٹیکہ اپنے لگا لے اس کے بعد خط یا اخبار پڑھے اور ہر خط یا اخبار کے لفافہ پر یہ بھی لکھا ہونا چاہیے کہ ـــ

نامہ کو کھول لیجے گا ذرا دیکھ بھال کے
چیچک کا ٹیکہ لگ چکا ہے اس میں سنبھال کے

کراچی میں چیچک کے پھیلتے ہی برطانیہ میں پاکستانیوں سے ایسی نفرت ہو گئی ہے کہ وہ بے چارے سخت پریشان ہیں کہ کریں تو کیا کریں۔ وہاں کے عام ہوٹلوں میں ان کو گھسنے نہیں دیا جاتا ہے۔ ریسٹورانوں کے مالکوں نے پاکستانیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا ہے۔ انگریز دوستوں تک نے ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے اور اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ ان پاکستانیوں سے صاحب سلامت دور ہی اچھی۔ بسوں میں ان کو جگہ نہیں دی جاتی۔ ٹیکسی ڈرائیور ان کو ٹیکسی میں بٹھانے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اب وہ لاکھ کہیں کہ بھائی ہمارا چیچک سے جائز یا ناجائز کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تو مدت سے ولایت میں یہاں رہتے ہیں مگر ان کو جواب یہی دیا جاتا ہے کہ تم کو خود چیچک نہ سہی مگر تم دوسروں کو چیچک میں ضرور مبتلا کر دو گے۔ تم چیچک خود نہیں لاتے مگر تمہارے عزیز پاکستان سے تمہارے لیے چیچک بھیج دیتے ہیں۔ لہٰذا بحیثیت پاکستانی کے تمہارا کوئی اعتبار نہیں۔ کہ کب تمہارے لیے چیچک آگیں بن جاؤ۔ اس چیچک نے برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی پیچک ایسی الجھائی ہے جو کسی طرح سلجھائے نہیں سلجھتی۔

چیچک کے ٹیکے تو مدت ہوئی ایجاد ہو چکے ہیں مگر وہم کے ٹیکے چونکہ اب تک ایجاد نہیں ہوئے ہیں لہٰذا برطانیہ میں چیچک کے بجائے وہم کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ وہم کا علاج تو بیچارے لقمان کے پاس بھی نہ تھا چنانچہ یہ وہمی برطانوی آج کل عجیب و غریب حرکتیں کر رہے ہیں کہ پاکستان سے جو خطوط اور اخبارات جاتے ہیں ان کو اصل پتہ پر پہنچانے سے پہلے ہسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے اور بستر علالت پر لٹا دیا جاتا ہے اس کے بعد ان کا ایکسرے وغیرہ ہوتا ہے ان کے خون کا معائنہ کیا جاتا ہے ان کو دو ایک دن ہسپتال میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے کہ ان کے چیچک تو نہیں نکلتی اس کے بعد اگر وہ صحت یاب ثابت ہوتے ہیں تو ہسپتال سے نکال کر ان کو پوسٹ مین کے حوالے کر دیا جاتا ہے ورنہ وہ چیچک میں مبتلا ہو کر ردی کی ٹوکری میں دفن ہو جاتے ہیں یا ڈیڈ لیٹر آفس کے قبرستان میں ان کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔

اس قسم کے توہم پرستوں کی ہمارے یہاں بھی کوئی کمی نہیں ہے نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جو جہاں [illegible]

بہت سے لوگ [illegible] ہوتے ہیں اور جب تک صابن لگا کر ہاتھ نہ دھو لیں ان کو چین نہیں آتا۔ ایک بزرگ محترم ایسے ہی تھے کہ یہ سانحہ [illegible] کہ جہاں ان کے سامنے کسی کو چھینک آ گئی وہ اس طرح اچھل کر گر جاتے تھے کہ گویا ان کا کچھ گم ہو گیا ہے اور ان کو پورا یقین ہو جاتا تھا کہ اب ان کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ وہ ضرور طاعون میں مبتلا ہوں گے۔ ان کا یہ ظن یہ جان لیوا ثابت ہوا یہاں تک کہ جب ان کی ایک عزیزہ کا طاعون میں انتقال ہوا تو انھوں نے میت کو کندھا تک نہ دیا کیونکہ میت بے شک مر چکی ہے مگر ممکن ہے کہ اس کے جراثیم زندہ ہوں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ احتیاط نہ کرنا چاہیے مگر ایسی بھی کیا احتیاط کہ احتیاط اور وہم میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے۔

(۶)

اندازہ یہ ہوا ہے کہ انگریز بہادر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم وغیرہ سے بھی اتنا نہیں ڈرتے جتنی ان کی روح چیچک سے فنا ہوتی ہے چنانچہ آج کل برطانیہ میں کیفیت یہ ہے کہ جہاں ان کو کوئی پاکستانی یا بھارتی نظر آیا وہ مجتنب ہو کر سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کہ یہ شخص قریب آیا اور وہ چیچک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ برطانیہ میں رہنے والے پاکستانیوں کو سخت پریشانی ہے کہ وہ آخر ان انگریزوں کو کس طرح یقین دلائیں کہ ہم ٹیکہ لگوا چکے ہیں جب تک وہ اپنا بازو دکھلائیں تب تک یہ لوگ بھاگ کر دور ہو جاتے ہیں پہلے تو ان کا ارادہ ہوا کہ اپنے ٹیکے کو نمایاں کرنے کے لیے وہ اپنے بازو کے بجائے پیشانی پر ٹیکہ لگوانا شروع کر دیں تاکہ ان کی صورت دیکھنے والے اس ٹیکہ کو بھی پہلی ہی نظر میں دیکھ کر مطمئن ہو جایا کریں مگر اپنے چہرے کو مستقلاً داغدار بنانا اور کلنک کے ٹیکے کی طرح پیشانی پر چیچک کا ٹیکہ لگوانا جب ان کی سمجھ میں نہ آسکا تو اب انھوں نے یہ ترکیب کی ہے کہ اپنے خلاف اس نفرت اور بدگمانی کو دور کرنے کے لیے وہ ٹیکہ لگوا کر اپنے کالروں پر ایک بلّا آویزاں کر لیتے ہیں جس پر لکھا ہوتا ہے کہ "مجھے ٹیکہ لگ چکا ہے"۔ یہ بلّے لنکا شائر کامن ویلتھ سوسائٹی نے تیار کرائے ہیں جن کی سبز زمین پر پاکستان کا ہلال اور لنکا شائر کا سرخ گلاب بنا ہوا ہے اور یہ عبارت لکھی ہوئی ہے کہ "مجھے ٹیکہ لگ چکا ہے"۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان بلّوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔

برطانیہ تو برطانیہ انگریز جہاں کہیں بھی ہیں پاکستانیوں کو چیچک کے جراثیم سمجھ کر ان سے بدکتے نظر آ رہے ہیں مثلاً ایم سی سی کی جو ٹیم پاکستان کا دورہ کر رہی ہے اس کے کھلاڑی اب اس خیال سے لرزہ براندام نظر آتے ہیں کہ اب ان کو کراچی بھی پہنچنا ہے [illegible] چیچک کا مرکز ہے حالانکہ اب کراچی میں چیچک پر قابو حاصل کیا جا چکا ہے اور اس کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے کہ ڈھاکہ سے یہ کھلاڑی چیچک کے ٹیکے لگوا کر مغربی پاکستان بھیجے جائیں گے مگر وہ اس کے باوجود مطمئن نہیں ہیں اور طرح طرح کی شرطیں ان کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں کہ ہم کراچی کی آبادی سے دور کسی جگہ قیام کریں گے ہم وہاں کسی سے ہاتھ نہ ملائیں گے ہمارے پاس وہاں کوئی آٹوگراف لینے اور چیچک دینے نہ آئے ہم کو کراچی کے عوام اپنے نرغہ میں لینے کی کوشش نہ کریں ہم نہ ان کی آٹوگراف بکس کو ہاتھ لگائیں گے نہ اس بات کے دستخط دیں گے کہ ہم نے چیچک وصول پائی۔ لہٰذا ان کے لیے اسی قسم کے انتظامات کیے جا رہے ہیں کہ ان کو آبادی واقع ہوٹلوں میں ٹھہرانے کے بجائے ہوائی اڈے کے باہر ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرایا جائے گا۔ اس بات کا بھی احتیاط برتی جائے گی کہ ان سے آٹوگراف لینے کوئی ان کے قریب نہ آئے اور ان کو "چھوئی موئی" سمجھ کر سب دور سے

[illegible] کراچی کا ٹیسٹ میچ ہو یا ان کے کھیل کی نوعیت بھی [illegible] یہ بہت ہی اہم سوال ہے [illegible] احتیاط برتی گئی کہ اس گیند کو پاکستانی کھلاڑیوں کے چھونے [illegible] ہو سکتا ہے کہ اس ہیٹ میں چیچک کے جراثیم اس گیند سے بھی چپک گئے ہوں لہٰذا اس گیند کو [illegible] بہت ہی قابل قدر کھلاڑی پاکستانی پلیئروں کے [illegible] احتیاط ضروری [illegible] انھوں نے چیچک کے جراثیم چپکے ہوں [illegible] استعمال ہونے والے تمام گیندوں اور بلوں وغیرہ کے بھی چیچک کے ٹیکے لگوا دیئے جائیں تاکہ وہ بے خوف و خطر ان سے کھیل سکیں اور معلوم نہیں ان لوگوں نے یہ [illegible] کی طرف سے یہ مطالبہ کیوں نہیں کیا گیا کہ [illegible] آبادی سے [illegible] جانا چاہتے ہیں جہاں کراچی [illegible] شہر کیوں نہ [illegible] کہ صرف آبادی سے دور [illegible] ٹیسٹ میچ بھی کھیل لیتے اور قصہ ختم کرتے۔

انگریز دراصل چیچک سے اس بری طرح ڈر گیا ہے کہ اس کو یہاں [illegible] میں اپنے مریضوں پر [illegible] وہ کیا چیز ہے لہٰذا اب ان کے لیے تو صرف پاکستانی [illegible] کسی چیز سے بھی [illegible] اور جس کے خوف سے ان کے [illegible] ہو جاتے ہیں۔ [illegible] چیچک کے جراثیم بھر کر [illegible] دشمن ان ایٹم بم [illegible] ان پر پھیلا دیئے جائیں۔ وہ بھاگ کھڑے ہوں گے [illegible] فوج بھیجنے کی بھی ضرورت نہیں۔ چیچک میں مبتلا چند مریض [illegible] دیئے جائیں۔ وہ [illegible] چھوڑ کر بھاگیں گے اور ایسے غائب ہوں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ بہرحال [illegible] کے قدم اکھاڑنے کے لیے ایسا حربہ [illegible] کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا کیا عجب ہے کہ اب روس کی اسلحہ ساز فیکٹریوں میں [illegible] کے لیے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم وغیرہ بنانے کے بجائے چیچک بم بنانا شروع کر دیئے جائیں۔ اور ان تیاریوں ہی سے وہ لرزہ براندام نظر آنے لگیں۔

بعض حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اہل برطانیہ چیچک سے اتنا ڈرتے نہیں ہیں جتنا وہ ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ وہ اس بہانے تارکین وطن کا بل منظور کرانا چاہتے ہیں۔ تاکہ نہ صرف پاکستانیوں سے بلکہ دولت مشترکہ کی تمام سیاہ فام اقوام سے ان کو نجات مل جائے۔ مگر اس مقصد کے لیے جس طرح ساری قوم کو ڈرایا جا رہا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس ساری قوم میں چیچک سے انتہائی خوف موجود ہے لہٰذا اس خوف سے برطانیہ کے حریف یقیناً فائدہ اٹھائیں گے اور اس پر بجائے اس کے کہ خود حملہ کریں چیچک سے حملہ کرائیں گے۔ اہل برطانیہ کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے شیر کو چیچک کے سامنے بھیگی بلی نہ بننے دیتے اگر یہ خوف تھا بھی تو اس کو اپنے مریضوں سے چھپائے رکھتے۔ اور اپنے ہاتھوں یہ حربہ اپنے دشمنوں کو نہ دیتے۔ اب تو اس کا راز افشا ہونا بڑے سے بڑے جنگی راز کے افشا ہو جانے سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور اس کمزوری کے کھل جانے سے فائدہ اٹھانے والے یقیناً فائدہ اٹھائیں گے۔

چیچک سے ان صاحب بہادروں کا یہ عالم ہے کہ خود ایم سی سی کے پاکستان آئے ہوئے کھلاڑیوں تک کو یہ شکایت ہے

کردہ جو خطوط اپنے احباب و اعزہ کو بھیج رہے ہیں وہ ان تک نہیں پہنچتے اس لیے کہ وہ خطوط اگرچہ ہندوستان کے بسے ہوئے انگریزوں ہی کے نام ہوتے ہیں مگر چونکہ پاکستان سے جاتے ہیں لہذا ان کو پہلے طبی معائنہ کے لیے [illegible] داخل کر دیا جاتا ہے کہ کہیں پاکستان سے آئے ہوئے یہ خطوط بھی چیچک میں مبتلا تو نہیں ہیں۔ معالج [illegible] سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اور جب تک ان میں سے ہر خط کو صحت کا سرٹیفکیٹ نہ دے دیا جائے وہ اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ ابھی تو یہ صرف خطوط ہی کا قصہ ہے مزہ تو اس وقت آئے گا جب یہ ایم سی سی ٹیم پاکستان سے اپنے وطن واپس [illegible] اور وہاں ان کھلاڑیوں کے احباب و اعزہ بھی کہیں گے کہ دوستی اور قرابت دوسری چیز ہے مگر پہلے اسپتال تشریف لے جائیے۔ اس کے بعد گھر کے دروازے آپ پر کھل سکتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ تحفے کے طور پر چیچک لئے ہوئے ہوں

(۷)

بھارت کے جوتشیوں نے جب سے یہ پورا حساب لگایا ہے کہ ۴ فروری کو جبکہ آٹھ ستارے ایک ہی برج میں جمع ہو جائیں گے ساری دنیا تہس نہس ہو جائے گی بھارت کے توہم پرست جو ان جوتشیوں پر اعتقاد رکھتے ہیں سخت بدحواس ہیں کہ۔ ؎

جائیں تو جائیں کہاں

وہ تو کہتے ہیں کہ ان جوتشیوں نے یہ بتایا ہے کہ صرف بنارس ایک ایسا مقام ہے جو ان تباہیوں سے بچ جائے گا لہذا اب جس کو دیکھئے وہ منہ اٹھائے بنارس کی طرف چلا آ رہا ہے چنانچہ اب بنارس کا یہ حال ہے کہ وہاں نہ کسی ہوٹل میں تل دھرنے کی جگہ باقی رہی ہے نہ کوئی مکان کرایہ پر ملتا ہے نہ کسی سرائے میں کسی کی سمائی ممکن ہے یعنی اور کہیں یہ قیامت آئے یا نہ آئے بنارس میں تو میدانِ حشر کا سا منظر ابھی سے شروع ہو گیا ہے اور اندازہ یہی ہے کہ بنارس آنے والے چاہے اس قیامت سے بچ جائیں مگر خود بنارس کا بچنا مشکل ہے۔

بنارس کے علاوہ ان لال بجھکڑ جوتشیوں میں سے بعض کی پوتھی "یہ بتاتی ہے کہ بھارت کے دوسرے چند مقامات بھی بچ جائیں گے خصوصاً وہ تمام مقامات بچ جائیں گے جو تیرتھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہاں اول تو لوگ مریں گے کم اور اگر مر بھی گئے تو ان کو نروان حاصل ہو جائے گا۔ ان جوتشیوں نے بتایا ہے کہ بھارت بھی اس تباہی کے نرغے میں آ ہی جاتا اگر اس کا نام انڈیا کے بجائے بھارت نہ رکھ دیا جاتا بلکہ اب بھی بھارت کے صرف وہی لوگ بچیں گے جو اس کو انڈیا نہیں کہتے۔ رہ گئے وہ لوگ جو اب بھی مارے انگریزیت کے اس کو انڈیا ہی کہتے اور سمجھتے ہیں ان کو تو چاہیئے کہ وہ اپنا کہا سنا معاف کرائیں اور اپنے کریا کرم کا بندوبست کر رکھیں اس لیے کہ ان کے بچنے کی کوئی صورت نہیں اور وہ سب کے سب ۴ فروری کو "رام نام ست" ہے کہ مستحق بن کر رہ جائیں گے اور سارا ملک ایک عظیم الشان مرگھٹ بن کر رہ جائے گا۔

اس توہم پرستی میں صرف ہندو جہلا ہی مبتلا نہیں ہیں بلکہ بڑے بڑے پڑھے لکھے اس جہالت کے فارغ التحصیل ثابت ہو رہے ہیں مثلاً اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنا نند جن کو لوگ پڑھا لکھا آدمی سمجھتے تھے باوجود صورت سے پڑھے لکھے نظر آنے کے بعض معتبر لوگوں کا بیان یہ ہے کہ وہ اتنے جاہل بھی نہیں ہیں جتنے صورت سے نظر آتے ہیں اپنی جہالت اور

یہ پیشگوئی کی گئی ہے جیسا کہ ہم روزانہ [illegible] نہایت خوفناک دور شروع ہو رہا ہے۔ ان کی جوتش میں بڑا دخل [illegible] شخصیات کا [illegible] شہروں سے تعلق نہیں رکھتے ہیں [illegible] اندازہ کیا ہے کہ یہ زمانہ [illegible] آخری حصہ ہے تو پھر ختم ہو جائے گا لیکن [illegible] کے زمانے میں [illegible] ہوں گے اور سیاسی انقلاب [illegible] ہے۔

بھارت کے یہ جوتشی بھی بھیانک قسم کے بگلا بھگت ہیں، عوام کو خوف زدہ [illegible] جیسا کہ پنڈت نہرو [illegible] یہ سب [illegible] اس میں سے کچھ بھی [illegible] پنڈت نہرو کی شخصیت [illegible] انہوں نے یہ کہہ کر [illegible] ہے کہ یہ علم جیوتش نہیں فقط [illegible] اگر [illegible] کچھ نہ ہوا تو [illegible] فروری خیریت سے گزر گئی تو عوام ان کے قائل ہو جائیں گے۔ اور اگر جوتشیوں کا [illegible] ہے۔ یہ عام آدمی [illegible] کی طرف [illegible] اشارہ کرتے ہیں تو پنڈت نہرو [illegible] کیا جوتش ہو سکتا ہے [illegible] پنڈت نہرو [illegible] جوتشیوں کے [illegible] میں مصروف ہوں گے [illegible] پنڈت نہرو نے ایسی بات کہہ دی ہے کہ اگر خیریت رہی تو وہ بچ جائیں گے۔ اور اگر خیریت نہ رہی تو موت ان کی قسمت میں لکھی ہے گی۔

ان جوتشیوں نے بتایا ہے کہ اب سے چار ہزار نو سو چھتر ۴۹۰۶ برس قبل آٹھ سیارے ایک ہی برج میں جمع ہو گئے تھے تو دنیا میں کل جگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ اور مہا بھارت جیسی خوفناک جنگ کا آغاز ہو گیا تھا مہا بھارت کی تاریخ کے طالب علموں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ گریٹ وار قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ دو خاندانوں کی داخلی جھڑپ تھی جس میں دونوں طرف سے کچھ تیر وغیرہ چلے تھے۔ اگر یہ ایسی ہی ہولناک جنگ ہوتی اور چار ہزار نو سو چھتر برس پہلے واقعی قیامت برپا ہوئی ہوتی۔ تو آج اس نئی قیامت کی پیش گوئی کرنے والے موجود نہ ہوتے۔ ان کی ساری نسل اسی وقت ختم ہو گئی ہوتی اور ان کو تباہ کرنے کے لیے اب ان آٹھ سیاروں کو ایک ہی برج میں آنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔

بھارت میں دراصل کشمکش یہ جاری ہے کہ عام انتخابات کے پیش نظر کانگریس ایسی شورشیں برپا کر رہی ہے۔ کہ بھارتی عوام اس کی دیرینہ کوتاہیوں اور نااہلیوں کے بجائے اس شورش کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اور وہ اس طرح عوام کی توجہ ہٹا کر الیکشن کی بازی جیت لے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مخالف پارٹیوں نے کانگریس کی اس ترکیب کا توڑ یہ سوچا ہے کہ عوام کی توجہ ان شورشوں سے ہٹا کر ۴ فروری والی قیامت کی طرف مبذول کر دیں اور ۴ فروری گزر جانے کے بعد یہ کہہ دیں کہ فروری غلط کہا گیا تھا یہ تاریخ دراصل ۴ مارچ ہے اور جب مارچ بھی گزر کر مارچ ۵ ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد اپریل اور مئی وغیرہ بھی آتی ہے۔

تو دیکھنا یہ ہوگا کہ جب فروری کو کچھ نہ ہوگا تو یہ جوتشی اور یہ سمپورنانند سب یہی کہیں گے کہ یہ آفت تو آ ہی گئی تھی ہم نے پوجا پاٹ اور گیان دھیان سے اسے ٹال دیا ہے لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس پوجا پاٹ اور گیان دھیان کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ورنہ اگر اس سے ذرا بھی غافل ہوئے تو ایک ہی برج میں بیٹھے ہوئے یہ آٹھ سیارے قیامت ڈھا دیں گے۔ معلوم ہوا

کہ ۱۴ جنوری کو وہاں ایک عظیم الشان یگیہ بھی شروع ہوا ہے جس کا افتتاح بنارس کے سابق مہاراجہ نے کیا ہے [illegible] خیریت سے گزر گئی تو اس کو اس یگیہ ہی کی کرامت کہا جائے گا۔ مختصر یہ کہ اس سال جل اور اس سال توہم پرستی کا [illegible] کسی طرح تسلیم نہ کیا جائے گا۔

(۸)

اس خبر سے ہمارے رندانِ بادہ نوش کا اسلام افسردہ ہو رہا ہوگا کہ حکومت مغربی پاکستان مکمل طور پر شراب نوشی اور بادہ خوری پر پابندی عائد کرنے کے سوال پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ صوبہ بھر میں اب تک جاری شدہ پرمٹوں کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے گا۔ اس لیے کہ اب صرف ان ہی لوگوں کو پرمٹ دیئے جائیں گے جن کو واقعی طبی طور پر شراب نوشی کی ضرورت ہے باقی جتنے لوگ شوقیہ طور پر یہ شغل فرماتے ہیں اور محض غم غلط کرنے اور آپے سے باہر ہونے کے لیے شراب پیتے ہیں ان سے کہا جائے گا کہ وہ بھلے مانس بننے کی کوشش کریں بجائے شراب کے دودھ پیا کریں۔ شراب خور بجائے اپنے کو شیر خوار بنائیں تاکہ ان کو معصوم سمجھا جا سکے لیکن اگر وہ دودھ پیتے بچے بننا نہیں چاہتے تو پھر ان کے پینے کے لیے بہت سی چیزیں ہیں کوکاکولا پئیں۔ لیمن اسکواش پئیں۔ گنے کا رس پئیں۔ کافی پئیں۔ رہ گئی شراب اس کو اب مشروب کی نہیں صرف دوا کی حیثیت ہی حاصل ہوگی اور ڈاکٹر جس کو نسخہ میں شراب لکھے گا وہی بیمار شراب پی سکے گا۔

اس پابندی کے عائد ہونے کے بعد ہمارے رندانِ بادہ نوش یقیناً صدق دل سے اس مرض پر قربان ہوتے نظر آنے لگیں گے جس کی دوا شراب ہو وہ ان بیماروں کو رشک سے دیکھیں گے جن کو وہ مبارک مرض ہو جو ڈاکٹر سے نسخہ میں شراب لکھوا سکے اور اس کے بعد وہ ڈاکٹروں کے پاس محض یہ دریافت کرنے جایا کریں گے کہ وہ کیا تدابیر ہیں جن پر عمل کر کے ہم اس بیماری میں اپنے کو مبتلا کر لیں جس کے علاج کے طور پر ہم کو شراب کا پرمٹ حاصل ہو سکے۔ ڈاکٹروں سے اس سلسلہ میں دوستیاں پیدا کی جائیں گی سفارشیں پہنچوائی جائیں گی کہ کسی طرح ان محترم کو وہ بیماری پیدا کر دیں جو ان کو شراب کا حقدار بنا دے۔ اب تک ڈاکٹر کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ بیماریوں سے مریض کو نجات دلائے مگر اب ڈاکٹروں سے ایسی بیماریاں پیدا کرنے کی فرمائش ہوگی جن میں مبتلا ہو کر شراب پینے کی اجازت مل سکے۔ ڈاکٹر تو ڈاکٹر اب تو وہ مریض بھی بے حد ہر دلعزیز بن جائیں گے جن کے پاس شراب کے پرمٹ ہوں گے تاکہ ان سے مراسم بڑھا کر اس کا موقع مل جائے کہ ان کے شریکِ جام ہو سکیں اور یہ شغل جاری رہ سکے۔ ان سے اس قسم کے معاملات طے ہوا کریں گے کہ پرمٹ تمہارا پیسے ہمارے۔ مرض تمہارا علاج ہمارا۔ بیمار تم ہو دوا ہم پئیں اور فائدہ دونوں کو پہنچے یعنی تم کو مفت کی شراب ہم کو بے مرض کے دوا۔

پرمٹ تو خیر اب بھی رائج ہیں مگر جب ان کی از سرِ نو جانچ پڑتال ہوگی تو بہت سے منسوخ کیے جائیں گے اور بہت سے پرمٹ بند ہوں گے اس لیے کہ آج کل تو حال یہ ہے کہ کسی کے پاس اثر و رسوخ کے تحت پرمٹ موجود ہے تو کسی نے بصرفِ کثیر پرمٹ حاصل کر رکھا ہے۔ کسی کے پرمٹ کرایہ پر چلتے ہیں تو کسی کے پرمٹ ادھر ادھر مہمان جاتے رہتے ہیں اور ہر پینے والے نے کسی نہ کسی طرح پرمٹ حاصل کر رکھا ہے اور سب خوش ہیں کہ ان کو اتنی شراب حاصل ہے کہ گویا دریا میں اپنے کو تیرتا ہوا

[illegible] لازمی ہوا جب سے کہ جب ان [illegible] عشق کی [illegible]
[illegible] تو [illegible] سال [illegible] آتی [illegible]
[illegible] ہیں گے ۔

اف یہ ساقی تیری بے اعتنائیاں
کس قدر دلکش ہیں انگڑائیاں

خلاف ورزش اگر [illegible] بھی پابندی وقت کی لحاظ رہی [illegible] میں [illegible] افیونی کے جانے [illegible] ہو جاتا ہے کہ [illegible] پینک کے [illegible] افیون [illegible] ہے کہ کیفیت رکھتے ہے [illegible] اصل دنیا کے [illegible] نہیں بلکہ افیون کو [illegible] ہے جس کے بغیر وہ [illegible] سکتے ہیں۔ ان کا دل [illegible] چاہتا ہے کہ یہ کوئی دنیا ان ہی دوستوں کے ساتھ [illegible] ہوتے [illegible] کیا ہو دل جو [illegible] ہوتے۔ [illegible] ہم ہو بیٹھے ایک عالم [illegible] آتی [illegible] ہر طرف امن ہی امن ہوتا نہ یہ اہل پینک جگر ہوتے [illegible] کی نوبت آتی اور نہ جنگ [illegible] چلتے نظر آتے۔

لی نوبت نہ آتی ایک وجہ یہ [illegible] ان افیونیوں کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں سارے ہنگامے وہی لوگ برپا کئے ہوئے ہیں [illegible] ہوا ہے جو افیون سے شغل نہیں کرتے اگر یہ سب کے سب افیون نوش ہوتے تو وہ ان [illegible] ایک کنوئیں کی جگت پر بیٹھے [illegible] اپنی پینک میں مبتلا تھے وہی کیفیت ہوتی جو ان دو افیونیوں کی ہوئی تھی جو [illegible] افیون پی بیٹھے تھے اور آخر پینک میں آ کر ان میں سے ایک کنوئیں میں جا گرے۔ کنوئیں میں گرنے کے بعد جب ان کا نشہ ہرن ہوا تو انھوں نے اپنے ساتھی کو آواز دی کہ بھائی خدا بخش بچاؤ۔ اور جب بھائی خدا بخش نے کنوئیں میں جھانک کر ان کو دیکھا تو بڑے اطمینان سے کہا کہ اچھا تو گویا آپ وہاں تشریف رکھتے ہیں یہاں ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جہاں رہو خوش رہو۔ اس قسم کے لوگ کسی دوسرے کے معاملے میں بھلا کیسے پڑ سکتے ہیں اس عالم میں اگر ہوتے تو [illegible] بجائے دھمکیاں دینے کے [illegible] سے یہی کہتے کہ جہاں رہو خوش رہو۔

دنیا میں آج جو ہنگامے برپا ہیں اور عالمگیر جنگ کے جو بادل ہر طرف منڈلاتے نظر آتے ہیں ان کے متعلق اہل افیون کا خیال یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض اس لیے ہو رہا ہے کہ لوگ افیون سے شغل نہیں کرتے اور پینک کے فوائد سے بے بہرہ ہیں ورنہ اگر افیون پر بھروسہ کرتے تو ان واہیات باتوں میں پڑنے کا ان کو ہوش ہی نہ ہوتا ان سارے جھگڑوں بکھیڑوں سے بے نیاز خواب و خیال میں زندگی بسر ہوتی اور بغیر ہوائی جہازوں میں پٹرول بھرے ہوئے کے بیٹھے بٹھائے فضاؤں میں دن رات اڑتے رہتے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ افیون ان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ وہ بزدل ہرگز نہیں ہوتے بلکہ بڑے جرأت مندانہ حوصلے بھی رکھتے ہیں چنانچہ جنگ جرمنی کی جب ان کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے مردانہ وار اپنا جنگی نعرہ بھی بلند کیا تھا جس نے ہٹلر کے چھکے چھڑا دیئے

ہے کہ ـــ

ہم لوگ ہیں انوکھے اک رنگ جما دیں گے
جرمن تری توپوں میں ہم بالش چلا دیں گے

وہ تو کہیے کہ اس نعرے کے بعد ہی ان کو پینک آگئی تھی اور وہ اونگھ گئے تھے ورنہ ہیڈ کا تو اس سے بھی زیادہ عبرت انگیز حشر ہوتا جتنا آخر کار ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اب ان کی افیون پر بھی پابندی عائد ہونے والی ہے اور ان کو بھی مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے اپنے گوشۂ امن سے نکل کر اس عالمِ ہوش میں آجائیں جو سراپا انتشار بنا ہوا ہے۔

(۹)

گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خاں نے سرکاری افسروں کو ایک غیر رسمی گفتگو میں کہا کہ "انتظامیہ کی تنظیم نو کے بہت اقدام کئے جا رہے ہیں لیکن سب سے ضروری بات یہ ہے کہ صحیح کام پر صحیح آدمی مقرر کیا جائے"۔ اس معیار پر اگر سرکاری ملازمین کو پرکھا جائے تو عجیب عجیب منصبوں پر عجیب عجیب کارکن نظر آئیں گے۔ مثلاً ماہر ہیں وہ فن طبقات الارض کے اور خدمت سپرد ہے ان کے یہ کہ مرغبانی کو ملک میں فروغ دینے کی کوشش کریں۔ تعلیم حاصل کی ہے انھوں نے بینکنگ کی اور بنے ہوئے ہیں بغل میں سرخ اور سبز جھنڈیاں دبائے اور منہ میں سیٹی لیے ہوئے ریلوے کے گارڈ۔ تربیت حاصل کی ہے انھوں نے محتسب بننے کے لیے اور نوکری کر رہے ہیں ٹریفک پولیس میں۔

اس قسم کا ایک واقعہ آخر کس طرح بھلا دیا جائے کہ حضرت جگر مراد آبادی مرحوم ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جب لاہور تشریف لائے تو ان سے ایک ڈاکٹر صاحب جو ایم اے پی ایچ ڈی تھے ملنے آگئے۔ جگر صاحب نے مزاج پرسی وغیرہ کے بعد ان سے کرسی وغیرہ کی بات بھی چھیڑ دی کہ آج کل آپ کس یونیورسٹی میں ہیں تو ان ڈاکٹر صاحب نے ہچکچا کر خاموش رہ جانا ہی مناسب سمجھا مگر جب جگر صاحب نے اپنے سوال کے جواب کے لیے اصرار شروع کر دیا تو آخر بیچارے کو کہنا پڑا کہ میں کسی یونیورسٹی میں پروفیسر، لیکچرار وغیرہ نہیں ہوں بلکہ محکمۂ آبادکاری میں ملازم ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس جواب پر صرف جگر صاحب ہی نہیں بلکہ ان کا ہر ہمنشیں حیران ہو کر اور منہ کھول کر رہ گیا کہ آخر ایک پی ایچ ڈی کا محکمۂ آبادکاری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ جگر صاحب بہت دیر تک ان ہی ڈاکٹر صاحب کے سر رہے کہ صاحب آپ کیوں ہیں محکمۂ آبادکاری میں اور اپنی بربادکاری کیوں کر رہے ہیں مگر جب وہ سوائے مجبوری کے اور کوئی معقول وجہ نہ بتا سکے تو جگر صاحب نے اس نیاز مند کی خبر لینا شروع کر دی کہ یہ کیوں ہیں محکمۂ آبادکاری میں گویا اس بے تکے پن کا ذمہ دار میں ہی تھا آخر مجھ کو حکم دیا کہ گورنر صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری سے میرے لیے وقت لیجیے۔ ابھی ٹیلیفون کیجیے میں ان ڈاکٹر صاحب کو اور آپ کو لے کر وہاں جاؤں گا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے گورنر تھے۔ لہٰذا جگر صاحب ان سے ملے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کیا اور جب تک ان سے وعدہ نہ لے لیا کہ وہ خود اس معاملہ کی طرف متوجہ ہوں گے اس وقت تک وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیا۔

تقسیم ملک سے قبل دیسی ریاستوں میں تو اس قسم کی باتیں بہت عام تھیں کہ جس کو جس کام پر چاہا لگا دیا۔ چنانچہ ایک لطیفہ

[illegible] ہم آپ کا ایک کر سکتے ہیں یہ حل نکالا ۔ ہوا کہ ایک [illegible] کا علم [illegible]
[illegible] کہ اس تبادلے سے پہلے ۔ فیصلہ یہ ہوا کہ آنکھیں دکھائی [illegible] تبادلے سے پہلے [illegible]
[illegible] محکمے سے زیادہ بیچارہ اس [illegible] محکمہ [illegible]
[illegible] تبادلہ [illegible]
[illegible] ان کو انجینئر کے [illegible] انجینئری تو بالکل ہی نہ جانتا تھا
ہوا تھا [illegible] اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا تھا ۔ اس کے بعد
مگر ایک سال انجینئری کرتا رہا اس کے بعد ایک ڈاکٹر کی جگہ بھیج دیا گیا جو ایک [illegible] تبادلے سے انکار نہیں کیا مگر اب
کے بعد یہاں تبادلہ [illegible] اور میں آپ کی خدمت میں [illegible] اس قدر پریشان
کو تو تبادلہ چاہیے اس سے سمجھ کر جا لیجیے افسر نے پوچھا کہ جب تبادلے سے نہیں گھبراتے تو اب کیوں
ہو ۔ چنانچہ وہ بیچارہ مجبور ہو کر افسروں سے [illegible] اور اس نے کہا کہ حضور ابھی مجھے لیڈی ڈاکٹر بنا کر ایک زنانہ ہسپتال
میں بیٹھا دیا ہے ۔

تقسیم ملک کی گڑبڑ میں مختلف ماہرین اسی طرح گڑبڑ ہو گئے ہیں ۔ یہ گڑبڑ آج تک جاری ہے کہ مثلاً کوئی صاحب ہجرت
کر کے یہاں آ گئے اور ہر چند کہ وہ صاحب ماہر زردوز تھے مگر بجائے اس کے کہ وہ پہلے اس فن کو یہاں فروغ دیتے ان کو کسی [illegible]
ایک اچھی دکان بہ آسانی سے قبضہ میں آ گئی تو بیٹھ گئے دوا فروشی ہی کرنے لگے کوئی کیمسٹ صاحب بعد میں پہنچے ادھر انھوں نے دیکھا کہ
ایک ریستوران خالی پڑا ہے لہٰذا بجائے دوا فروشی کے چائے فروشی شروع کر دی ۔ کوئی صاحب نہایت ماہر حجام تھے مگر کوئی
ہیئر کٹنگ سیلون تو جلدی میں ان کو مل نہ سکا البتہ ایک دندان ساز کی دکان خالی تھی لہٰذا اسی کو اپنا لیا کوئی [illegible] کی دکان کی جگہ
کر آیا تھا اور یہاں ہیئر کٹنگ پارلر کا مالک بن بیٹھا کوئی نان کباب کا دھندا کرتا تھا مگر یہاں کتابوں کی دکان لے بیٹھا ۔ ظاہر ہے کہ
اس طرح ان لوگوں نے دو فنوں کو بیک وقت نقصان پہنچایا ایک فن وہ جس کو وہ جانتے تھے اور جس کے ماہر تھے اس کو چھوڑ کر
اور دوسرا وہ فن جس کو وہ نہیں جانتے مگر اختیار کر لیا ۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایک حجام سے جو کوئی بھی اپنے دانت نکلوانے جائے گا
وہ اپنے مسوڑھوں کی حجامت نہ کرائے گا تو کیا کرے گا ۔ یا اگر کوئی شخص کسی دندان ساز سے حجامت کرانے بیٹھ جائے گا ۔ تو اس کے
بال تو بمشکل بچ جائیں گے ۔ تو کس چیز سے تو بچ جائیں گے ۔

افرادی قوت کے کمیشن نے اپنی رپورٹ تو پیش کر دی ہے مگر معلوم نہیں اس رپورٹ میں اس گوشہ پر بھی روشنی ڈالی
ہے یا نہیں کہ اپنے سے غیر متعلق پیشہ اپنائے ہوئے کتنے لوگ ہمارے ملک میں کام کر رہے ہیں حالانکہ یہ بات اتنی ہی خطرناک ہے کہ
کوئی وکیل [illegible] شروع کر کے قبرستان بسانا اور کوئی ڈاکٹر وکالت شروع کر کے جیلیں بھرنا شروع کر دے اگر کوئی [illegible] کا
دھندا کرنے والا کسی ریستوران کو چلانے بیٹھ جائے تو اس ریستوران میں جانے والوں سے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

کہ ۔ م ۔

مختصر یہ کہ سرکاری محکموں میں اس کی جانچ پڑتال بے حد ضروری ہے کہ کس کام پر کون لگا ہوا ہے اور یہ کام بھی آدمی
متعلق بھی ہے یا ہم یونہی صحیح نتائج کے امیدوار بنے بیٹھے ہیں اگر افرادی قوت کی تنظیم کے سلسلہ میں یہ مہم بھی سر کر لی گئی تو یہ بڑا

کام ہوگا خدا کرے ملک امیر محمد خان کی یہ کوشش کامیاب ہو جائے اس لیے کہ جب تک بہ ہر شعبہ پر کام کے [illegible] بہتر نتائج کی امید کیونکر کی جا سکتی ہے۔ یہی بات تو یہ ہے کہ۔ ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ہمارے یہاں اہلِ صلاحیت کی کمی نہیں ہے مگر گڑبڑ تو یہی ہے کہ یہی کام پر غلط آدمی اور غلط کام پہ یہی آدمی اگر [illegible] تو کام کیونکر بنے۔

(۱۰)

خدا خدا کرکے ہم کو اب اس بات کا خیال پیدا ہوا ہے کہ ہمارے اُردو منہ میں جو انگریزی زبان انگریز لگا گئے ہیں یہ کچھ چھری کلنٹے سے کچھ مٹی کھانے والی بات ہے اور اس سے صرف یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز تو چلا گیا مگر انگریزی کو ہم سے چپکا گیا ہے کہ یہ سوتیلی زبان ہمارے لیے خدا جانے کیوں مادری زبان بنی ہوئی ہے کہ ضرورت اور بے ضرورت ہمارے بے شمار افراد انگریزی جھاڑتے نظر آتے ہیں وہ نہ صرف انگریزی جاننے والوں سے انگریزی بولتے ہیں بلکہ جو انگریزی نہیں جانتے ان سے بھی انگریزی ہی بولنا چاہتے ہیں اور بدرجۂ مجبوری اگر ان سے اُردو بولنا پڑتی ہے تو اس تکلف سے چبا چبا کر اُردو بولتے ہیں گویا لوہے کے چنے چبا رہے ہوں اور سخت تکلیف میں مبتلا ہوں۔ بلکہ ہمارے یہاں ایک طبقہ وہ بھی ہے جو عام طور پر انگریزی نہ جاننے والوں ہی سے انگریزی بولتا ہے اور اگر کوئی انگریزی جاننے والا ان پر نازل ہو جائے تو ان کی انگریزی فوراً ختم ہو جاتی ہے اور بھلے مانسوں کی طرح جھٹ اُردو بولنا شروع کر دیتے ہیں۔

اصولاً اب انگریزی زبان کا مصرف یہ ہونا چاہیے کہ اگر کسی بیرونی مُلک کے کسی مہمان سے تبادلۂ خیال کرنا ہو جو اُردو نہ جانتا ہو اور جس کی زبان آپ نہ جانتے ہوں تو اس قسم کے موقعوں پر اس سے انگریزی بول لیجئے اس لیے کہ اگر ایک جاپانی کی زبان آپ نہیں سمجھ سکتے اور اپنی زبان اس کو نہیں سمجھا سکتے تو اس مشکل کا حل انگریزی زبان ہی ہو سکتی ہے لہٰذا ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے انگریزی پڑھنا ضروری ہے مگر ہم ایسے انگریزی پڑھنے کے قائل نہیں ہو سکتے کہ کوا ہنس کی چال چل کر اپنی چال بھی بھول جائے یعنی انگریزی پڑھتا جائے اور اُردو بھولتا جائے اور جب پڑھ لکھ کر کالج سے گھر آئے تو اپنی بوڑھی ماں سے بھی انگریزی بولے اور نوکروں پر بھی انگریزی ہی جھاڑے اور جب کسی کے پلے کچھ نہ پڑے تو بھولی بسری اُردو اس طرح ٹٹولنا شروع کرے کہ:۔

"او آئی سی۔ آپ نہیں سمجھا۔ ہم آلو نہیں۔ وہ مانگتا ہے اس کو آپ
کیا بولتا ہے وہ جو مرغی کا بابا رگ بننے سے پہلے کی چیز ہوتا ہے"

اور اگر ماں نے یہ پہیلی بوجھ کر کہہ دیا کہ:۔

"اے بیٹا تم انڈا تو نہیں کہہ رہے ہو"

تو وہ ایک دم اچھل پڑتے ہیں یہ ہیر یو آر۔ انڈا۔ بالکل انڈا ٹھیک ہے اس کو انڈا بولتے ہیں۔ ہم اتنی دیر سے انڈا ہی مانگ

ہے۔

یہ تو انگریزی کی [illegible] ہے جس کی بدولت [illegible] کہ جو اب بعض ان سکولوں اور کالجوں [illegible] سے نکل کر [illegible] بنانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اگر خدانخواستہ اردو کا سہارا [illegible] [illegible] ہم تو ان لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں جو [illegible] انگریزی [illegible] جہاں کہیں بھی مل بیٹھے انگریزی [illegible] شروع کر دیتے [illegible] گفتگو [illegible] یا اگر کسی نے اردو بولنے کی [illegible] قائم کر [illegible] یہ نہیں کہ بعض صورتوں میں انگریزی بولنا [illegible] ضرورت ہو سکتی ہے۔ مثلاً کوئی ایسی بات کرنا ہے جو شریف بہو بیٹیوں کے سامنے نہ کرنا چاہیے تو وہ بات اچھا ہے اردو میں نہ کی جائے یعنی [illegible] وہ بات [illegible] اور اگر کسی طرح [illegible] تو انگریزی ہی میں کہی جائے بشرطیکہ وہ بہو بیٹیاں خود بھی انگریزی نہ جانتی ہوں۔ یا اگر کسی پر غصہ آگیا ہے [illegible] کہ وہ غصہ انگریزی ہی میں کیا جائے اس لیے کہ انگریزی زبان کی گالیاں [illegible] صاحب ان گالیوں کا اتنا [illegible] جتنا اردو کی گالیوں پر مشتعل ہو سکتا ہے [illegible] کوشش کرتا ہے [illegible] انگریزی زبان اتنی خطرناک نہیں ہے جتنی [illegible] اردو [illegible] لہٰذا بہتر یہی ہے کہ غصہ [illegible] بھی انگریزی ہی میں شروع کر دی جائے تاکہ حتی الامکان اردو کا سوال ہی کم پیدا ہو۔ اور [illegible] ایک فریق [illegible] بھی پیدا ہو۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے راولپنڈی میں بھی بعض ممتاز شخصیتوں نے محسوس کی ہے کہ انگریزی زبان [illegible] کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو دیکھے بغیر [illegible] انگریزی چھوڑا جائے یہ لوگ انگریزی کی [illegible] سے [illegible] آگئے ہیں اور اردو بولنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ ان میں شہر کے بہت سے لیڈر، وکیل، مجسٹریٹ وغیرہ شامل ہیں۔ جنہوں نے طے کیا ہے کہ حتی الامکان اردو بولنے کی کوشش کریں گے۔ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ ہم کو اردو بولنے کی گویا کوشش کرنا پڑے گی۔ اور اردو ماحول پیدا کرنے کی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ اردو [illegible] سے مراد یہ ہے کہ وہ کوشش کریں گے کہ ہمارے دکاندار اپنے گاہکوں کو انگریزی [illegible] چھوڑ دیں اور اپنا سائن بورڈ اردو میں لکھوائیں۔ دکانداروں کی کیفیت تو یہ ہے کہ جس گھر کو دیکھئے نام کی تختی انگریزی میں لکھی ہوئی آویزاں ہے خواہ گھر والا گھر کے اندر بیٹھا گلی سے کھیر چاٹ رہا ہو اور مکھی چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا ہو مگر دروازے پر انگریزی میں لکھا سائن بورڈ اس طرح آویزاں ہے کہ گویا یہ گھر نہیں انگلستان ہے اور اس میں صرف ان ہی لوگوں کو آنے کی اجازت ہے جو انگریزی داں ہیں ان کا نام پڑھ کر آ سکیں۔

دکانوں کے سائن بورڈ مشرف بہ اردو کرنے کی نہایت منظم تحریک لاہور میں شروع کی گئی ہے اور اب راولپنڈی والے بھی دکانداروں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ اس اردو ملک میں انگریزی کے سائن بورڈ آخر کیوں لٹکائے بیٹھے ہیں جن کی وجہ سے بے شمار لوگوں کو جو انگریزی نہیں جانتے دکاندار سے پہلا سوال یہی کرنا پڑتا ہے کہ آپ آخر بیچتے کیا ہیں۔ اور یہ کس چیز کی دکان ہے مثلاً ایک خاصی لڈو پیڑے امرتی اور بالوشاہی کی دکان ہے جس کا کوئی تعلق نہ کیک بسکٹ، ٹوفی یا کسی اور انگریزی مٹھائی سے نہیں

مگر سائن بورڈ انگریزی ہی میں لکھا ہوا ہے۔ مانتے ہوئے ہیں آپ غرارہ اور شلوار پہننے والے، زنانہ مگر سائن بورڈ [illegible] معلوم یہ ہو کہ صرف اسکرٹ اور سلیکس وغیرہ پہنتے ہیں۔ دکانوں سے اردو کتابوں کی اور سائن بورڈ انگریزی کا ہے [illegible] جس کا انگریزوں سے دور کا بھی تعلق نہیں مگر سائن بورڈ انگریزی کا لٹک رہا ہے۔ ہوٹل ہے خالص دیسی کھانوں کا [illegible] کھالیں تو ہوٹل سے نکل کر ہسپتال میں داخل ہو جائیں مگر سائن بورڈ انگریزی کا ہے۔ یہ انگریزی کا ہضم نہیں تو اسے کب [illegible] علاج آخر کب تک نہ لیا جائے گا۔

(۱۱)

عورتوں کو گھر والی کہنے والے مرد جب طبقہ نسواں میں یہ بیداری دیکھتے ہیں کہ ؎

قومی ترقیوں کی زمانہ میں دھوم ہے
مردانہ سے زیادہ زنانہ میں دھوم ہے

تو بجائے اس کے کہ وہ اس کو عورتوں کا قومی فرض سمجھیں طرح طرح کے اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ان عورتوں نے چولہا ہانڈی چھوڑ کر لیڈری شروع کر رکھی ہے اور بجائے شوہر کی اطاعت کے ملک و قوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھا لیا ہے۔ ان مردوں کا خیال یہ ہے کہ عورتیں صرف اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ بچوں کے ساتھ ساتھ شوہر کو بھی پالتی رہیں اور تیمارداری کے انداز سے اپنے کو اس کی خدمت کے لیے وقف رکھیں۔ وہ جب سیر و تفریح سے تھک کر آدھی رات کو گھر آئے تو ٹھنڈا کھانا اس کے لیے گرم کریں اور جب وہ کھانا کھا کر لیٹے تو اس کے سر میں تیل ڈالیں اور پاؤں دبائیں کہ میاں تاش کھیل کر آئے ہیں اور اس کھیل میں اپنا دماغ تھکا چکے ہیں جس کو آرام پہنچانے کی ضرورت ہے اور جب میاں خدا خدا کر کے سو جائیں تو وہ بھی اس نیت کے ساتھ ذرا سی جھپکی لے لے کہ صبح میاں سے پہلے بیدار ہو جائے تاکہ ان کو آنکھ کھولتے ہی سلگتا ہوا حقہ بھی مل جائے اور اس کے فوراً بعد چائے بھی بغیر مانگے مل جائے اور اس کے بعد ہی جب میاں ضروریات سے فارغ ہونے میں مصروف ہو جائیں تو وہ اس کے لیے ناشتہ تیار کرنے کے بعد ہی پان بنانے، دفتر جانے کے لیے کپڑے ٹھیک کرنے وغیرہ میں مصروف ہو جائے اور جب وہ خیر سے دفتر سدھاریں تو وہ باورچی خانہ کی ہو کر رہ جائے کہ دفتر کھانا بھیجنا ہے۔ اور دفتر کھانا بھیج کر وہ پھر میاں کی واپسی کے انتظامات میں مصروف ہو جائے کہ ان کو اپنا کمرہ صاف ملنا چاہیے وقت پر سہ پہر کا ناشتہ ملنا چاہیے، حقہ تیار ملنا چاہیے، گلوریاں ملنا چاہئیں اور اگر وہ اپنے چند دوستوں کو ساتھ لے آئیں تو ان کی مدارات کا بھی بندوبست ہونا چاہیے پھر میاں کی واپسی کے بعد منٹ منٹ پر باہر پان بھیجنا ہیں۔ بار بار چائے پہنچانا ہے کبھی خشک میوہ مانگا جا رہا ہے تو کبھی تر حلوہ اور ساتھ ہی رات کے کھانے کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال گویا ان سب کے علاوہ ہے۔

اس قسم کی خدمت گزار بیویوں کے بے بس شوہر قوم کے افراد بھلا یہ کیونکر برداشت کر سکتے ہیں کہ وہ قومی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیں اس لیے ظاہر ہے کہ اگر وہ قومی کارکن بن گئیں تو ان شوہروں کو اس ناز و نعم سے کون پالے گا پھر تو یہی ہوگا کہ دفتر سے آکر پوچھا کہ وہ کہاں گئیں تو معلوم ہوا کہ فلاں گرلس کالج میں آج ان کو تقریر کرنا تھی وہاں گئی ہوئی ہیں اور کہہ گئی ہیں کہ بے بی کو لے جا کر چیچک کا ٹیکہ لگوا دیجیے گا، فلاں جلسہ تقسیم انعامات میں ان کو انعام تقسیم کرنا تھے لہٰذا کہہ گئی ہیں کہ ننھے میاں کے بال بہت بڑھ گئے ہیں

[illegible] ہے کہ اگر [illegible] کوئی بھی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہو رہے ہیں۔

[illegible] اخبارات [illegible] [illegible] نہیں ہیں۔

[illegible] بیگمات کے نام سے [illegible] زیادہ تعداد میں نہیں ہیں۔ [illegible] اس بیداری کے پیچھے [illegible] اس وقت سامنے آتے ہیں جب [illegible] خواتین کے [illegible] شوہروں کا طبقہ خواتین ہیں [illegible] قطعاً معاف نہیں ہے اور اس قسم کے [illegible] یہ وہ لوگ ہیں جن کو مخاطب کرتے ہوئے بیگم لیاقت علی خان نے [illegible] کہ ان نقادوں کی یہ باتیں سن کر [illegible] بیگمات کا ایک [illegible] جو ہمیشہ [illegible] میں شریک ہوتی ہیں لیکن جو صرف سماجی تقریبات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اپوا پر نکتہ چینی کرنے والوں نے عوام کی [illegible] خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے بعد بیگم لیاقت علی خان نے بڑی تفصیل سے اپوا کی ان خدمات کا تفصیلی تذکرہ کیا جو یہ خواتین کا ادارہ [illegible] کی حالت سدھارنے کے لیے انجام دے رہا ہے۔

بیگم صاحبہ لیاقت علی خان کو اپوا کے ان نکتہ چینیوں سے بددل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر قوم میں اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اقتدار کو متزلزل دیکھ کر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ان کو اس قسم کی باتیں بنانے کا بہانہ اس لیے مل جاتا ہے کہ اپوا میں سب ہی ملک و قوم کا درد رکھنے والی اور تعمیری انہماک سے خلوص رکھنے والی خواتین شامل نہیں ہیں۔ بلکہ اس قسم بیگمات بھی ہیں جو [illegible] کے ساتھ ہجوم ریشم و کمخواب بنی ان قومی جلسوں میں جاتی ہیں اور ان جلسوں کو فیشن شو بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ شروع شروع میں تو واقعی ان کی بڑی تعداد اپوا میں نظر آتی تھی مگر رفتہ رفتہ انجمن خواتین پاکستان میں ایسی خواتین کی اکثریت ہو گئی جو محض اپنے کو دکھانا نہیں بلکہ کچھ کام کر دکھانا چاہتی ہیں۔ اور جن کو نام سے زیادہ کام سے غرض ہے۔ مثلاً۔

پورے ملک میں عموماً اور پنجاب کے دیہاتوں میں خصوصاً انہوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا سوائے ناشکری کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اب ایک یہ کارکن خواتین اپنے گھر اور اپنے بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتیں۔ اور ان قومی سرگرمیوں میں بھی [illegible] حصہ لیتی ہیں۔ اور دونوں کا ایسا توازن قائم کر لیا ہے کہ اب صرف وہی مرد شاکی نظر آتے ہیں جو عورتوں کو قوم کا نہیں صرف اپنا خدمت گار [illegible] چاہتے ہیں۔ اور شوہرانہ اقتدار کے ایسے مریض ہیں کہ بیوی کو صرف اپنا ہی تیمار دار بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

(۱۲)

ہمارے شاعروں کا معیارِ حسن بھی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے اگر محبوب کا قد بالا ان کے نزدیک حسن کا معیار ہے تو پستہ قد کو اصولاً اس معیار سے گرا ہوا ہونا چاہیئے۔ مگر ان حسن شناسوں کو یہ بھی پسند آجاتا ہے اور وہی محبوب اگر طویل القامت ہے تو اس کو بڑے پیار سے سرو قد کہہ کر اس کی تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ اگر محبوب ٹھگنا ہے تو اس کے قد کو بوٹا سا قد کہہ کر زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی کس بات کا اعتبار کیا جائے۔ اور حسن کا معیار قد بالا کو سمجھا جائے یا بقول ان کے بوٹے سے قد کو۔ حالانکہ اگر سچ پوچھئے تو ان دونوں قدوں کے درمیان ایک اور قد بھی ہوتا ہے جس کو "قد موزوں" کہتے ہیں کہ نہ بہت ہی اونچا نظر آئے محبوب نہ نہایت ہی پدّی مگر ان شاعروں نے اس قد موزوں کی بہت ہی کم تعریف کی ہے البتہ اگر محبوب تاڑ کا تاڑ ہے تو وہ اس کے متعلق نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں کہ یہ تو وہ سوا نیزہ ہے جس پر رخِ روشن کی حیثیت آفتابِ قیامت کی ہے۔ یہ تو وہ سرو قامت ہے جس نے قسامِ ازل سے انگڑائی کے بہانے ہاتھ بڑھا کر سارا حسن اپنے ہی لیے لے لیا تھا ؎

حسن قسامِ ازل بانٹ رہا تھا جس روز
لے لیا ہاتھ بڑھا کر تری انگڑائی نے

حالانکہ ان بلند قامت حسینوں کا دیدار ان کے پرستار اسی طرح کرتے ہیں جس طرح ہم آپ گھنٹہ گھر میں وقت دیکھتے ہیں کہ آنکھیں تو جلوۂ یار دیکھ رہی ہیں مگر ٹوپی سر سے گرے بغیر نہ رہ سکے ظریف لکھنوی نے اپنے رنگ میں اسی قد بالا کے متعلق کہا ہے کہ ؎

اور تو کیا میں کہوں اس قدِ بالا کی قسم
اونٹ کی شکل دکھا دی تیری انگڑائی نے

اور اس طرح سرو قدی کا لطف تو اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب ان کا شیدائی پستہ قد واقع ہوا ہو۔ ان دونوں طالب و مطلوب کو دیکھ کر گلی ڈنڈے کی ایسی کیفیت نظر آتی ہے کہ مثنوی زہرِ عشق کی قسم کی مثنوی "شتر گربہ" لکھنے کو جی چاہنے لگتا ہے مگر اب کیا کیا جائے کہ دلِ ناداں اکثر اسی قسم کی جست لگا جاتا ہے اور اہلِ دل اپنا دل اسی قسم کی بلندی پر اچھال دیتے ہیں۔ کہ گویا دل کو اسپوٹنک میں رکھ کر چاند کی طرف روانہ کیا ہے۔

مگر اس قد بالا کا ایک نمونہ نیویارک کی ایک خبر کے مطابق لوسانا میں پیش کیا گیا ہے۔ جن صاحبزادی کا یہ قد ہے ان کا اسم شریف ڈولرلیس ہے۔ نسلاً یہ کافر ماجرا حبشن ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ سرو قدی میں ان کا کوئی جواب اب تک تو پیدا

ہ نہیں، آئندہ کی خبر خدا جانے۔ اس بت آخر کی عمر زلف الف" بالی عمریا۔ ہے حالانکہ سن ۱۴ سال ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ان کا نشوونما ختم نہیں ہوا ہے، ابھی ان کا قد اور بھی بڑھ سکتا ہے کیونکہ اس چودہ سال کی عمر میں بھی اس کا طول طویل وغیرہ قد خدا نظر بد سے بچائے تو فٹ ۲ ، ۶ یعنی ساڑھے چھ لمبے ہیں اور یہ قد ابھی اور بڑھے گا۔ بچپن سے انھوں نے قد نکالنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ جب یہ چار سال کی بچی تھی اس وقت بھی دس برس کی لڑکی کا قد رکھتی تھی۔ سات سال کی عمر میں قد جوان ہو چکا تھا۔ اللہ جانے ابھی ان کا سلسلہ نمو کہاں تک کھنچے گا۔ اللہ جانے یہ صاحبزادی کس وقت میں قطب مینار کی منزل پہنچ گئی تھیں۔ یا اس ہی کی طرح سے قطب مینار بنتا ہے۔ بہرصورت یہ لڑکی اگر ایک قسم کی ڈیل ڈول میں نظر آنے لگی ہے تو چھجے پہ بیٹھ کر تو اچھا پتنگ ہی لگتی ہیں۔ اس سے اگر کوئی کہنے کے لیے زمین پر بھی کھڑی ہو کر خود اٹھے تو چاند تارا سر پر ہی نیچے ملنے کا شوق ان کا مکمل ہو جائے۔

محبوب کے قد بالا کی تعریف کرتے ہوئے یہ شعر بھی تو سننے کے قابل ہے۔ وقت سرو رواں بنتے کہ اس قد بالا کو لو کہ اس کی سیڑھیاں لگا لگا کر زیارت کرو اونٹ پر سوار ہو ہو کر حاصل کرو اس سے شرف ہم کلامی یا ہوائی جہاز پہ اڑ کر حاصل کرو اس کی رسائی اس زینے حد کبھی ہو۔ یہ لوگ قد بالا کی تعریف کریں اور اس کی شان میں طول و عرض رکھتے ہوں، مگر ان قصیدوں سے کہیں۔ اگر یہ حسن ان شعرا کے بیچ میں آ جائے تو منظر یہی ہو جیسے کوئی دیوار یا ستونوں کے گلے کی سیر کو اٹھتی ہو اور پھر جب وہ ایک ایک شعر کو اٹھا اٹھا کر اپنی جیب میں رکھنا شروع کرے تو ان کی سرو قدی کی ساری حسرت دھری رہ جائے گی۔ مگر صاحب ماشاء اللہ چودہ برس کی عمر دیکھیے۔ اس عمر میں "خوف" سے نکلا ہوا قد دیکھیے جس پر کہ یہ قد ابھی بڑھ رہا ہے۔ اللہ جانے کس حد پر پہنچ کر اس مسماۃ کا عالم کیا ہوگا۔ اور وہ کون شامت زدہ انسان ہوگا جو ان کو اپنی زوجیت میں لا کر اونٹ کے منہ میں زیرہ بنے گا۔ اور چلتے پھرتے بالاخانے کو اپنی زوجیت میں لینے کا کمال دکھائے گا۔

ویسے کو تو ہم نے بھی بڑے بڑے قد آور انسان دیکھے ہیں بلکہ بعض لوگ تو ایسے ہی نظر آتے ہیں جن کو دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اصولاً ان کے سر پر برف جمی ہوئی ہونا چاہیے۔ مگر اس قسم کا قد مردوں کے لیے تو پھر بھی گوارا ہو جاتا ہے مگر خدا نہ کرے کہ کوئی خاتون اس قدر دراز قد واقع ہوں۔ کہ اچھا خاصا شوہر ان کو ٹانگ برابر کا چھوکرا محسوس ہو اور جب منظر عام پر آئیں۔ دیکھنے والے یہی سمجھیں اونٹنی اور اس کا بچہ چلے جا رہے ہیں۔ مثلاً رسالہ کی یہ طویل القامت لڑکی تو خاتون بنتے بنتے اچھی خاصی بنت قطب مینار ہی کر رہ جائے گی۔ اور اس کو اپنی بلندی سے ہم ساکنان خطۂ خاک خدا جانے نظر بھی آئیں گے یا نہیں۔ کہیں ان صاحب کا واقعہ صادق نہ آ جائے جو سیب خریدنے بازار پہنچے تھے اور پھل فروش سے سیب کا بھاؤ دریافت کر کے کہنے لگے کہ اتنے اتنے سے سیب اور ان کے اتنے دام مگر سیب والا بھی حاضر جواب تھا کہنے لگا حضور ذرا بیٹھ کر دیکھیں اس بلندی سے تو یہ واقعی اتنے اتنے سے نظر آتے ہوں گے۔

شعرائے کرام خواہ برا مانیں مگر سچی بات تو یہ ہے کہ نہ معشوق "خاک بوس" ہی کسی کام کی چیز ہے نہ "معشوق زمین دوز" ہی قابل ستائش ہے۔ آخر یہ لوگ آدمیوں کی سی بات کیوں نہیں کرتے۔ کہ محبوب کا قد بس واجبی سا ہونا چاہیے۔ نہ اتنا لمبا کہ عاشق ناشاد حسرت دیدار کے معاملہ میں بس ناشاد ہی رہ جائے۔ نہ اتنا پستہ کہ اس کو طاق پر بٹھا کر دیکھا جائے۔ یہ باتیں شعر و شاعری

ابھرم کھونے والے ہیں اور صرف ایک قدم پر کیا منحصر ہے یہ شاعر تو اگر پتلی کمر پر آئیں گے تو اس کو غائب ہی کر دیں گے۔ نزاکت کا ذکر کریں گے تو اس کی حد یہ کر دیں گے کہ ؂

برا ہو نزاکت کا سو کر جب اٹھے
تو بستر پہ انگڑائیاں چھوڑ آئے

معلوم نہیں یہ لوگ اعتدال میں کیوں نہیں آتے۔ اگر ان کو سہرا باندھنے کے لیے قضا و قدر کوئی ایسا ہی پیکر بنا کر بھیجے جیسا وہ اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ تو بخدا یہ شاعر یہ شاعری چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے نظر آئیں۔ اور چیخ نکل جائے دیکھ کر کہ بالوں کی جگہ سانپ جھول رہے ہیں، ابرو کی جگہ خنجر لٹکے ہوئے ہیں، آنکھوں کی جگہ ترکش ہے جس سے تیر نکل رہے ہیں۔ گردن کی جگہ صراحی آ دھری ہے۔ کمر غائب ہے۔ اور اپنے جسم کے دو علیحدہ علیحدہ ٹکڑے لیے محبوب چلا آ رہا ہے۔ ہوش گم ہو جائیں، بھاگیں سر پہ پیر رکھ کر یا گر پڑیں غش کھا کر مع تخلص کے۔

(۱۳)

راولپنڈی میں گرمی اور مری میں رونق بے حد بڑھ گئی ہے اور راولپنڈی کی گرمی سے بوکھلائے ہوئے لوگوں کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آتا تو وہ بھاگتے ہیں سر پہ پیر رکھ کر مری کی طرف نتیجہ یہ کہ راولپنڈی کی ساری رونقیں مری منتقل ہو گئی ہیں اور مری کی آبادی یکایک اتنی بڑھ گئی ہے کہ مری کے سب ڈویژنل آفیسر کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ مری میونسپلٹی کے اسٹیشن ایریا کے اندر اب کسی قسم کے جانور لانے یا ان کو چرنے کے لیے چھوڑ دینے کی قطعاً اجازت نہیں ہے ان جانوروں میں گائیں، بھینسیں، بکریاں، گدھے اور گھوڑے وغیرہ شامل ہیں۔ البتہ جو گھوڑے اور گدھے سواری کے لیے مری میں رکھے گئے ہیں۔ ان پر یہ پابندی نہ ہوگی۔ وہ انسان جو جانوروں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں وہ تو خود ہی مری جانے کی ہمت نہیں کر سکتے خواہ گرمی سے مر ہی کیوں نہ جائیں البتہ بھینس کی جسامت کی خواتین و حضرات اور بکریوں کی قسم کی چانٹا شرٹ پہننے والیوں پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے اور ان کو اس کی بھی اجازت ہے کہ وہ مال روڈ پر کیک اور پیسٹریاں وغیرہ نہایت آزادی سے چرتی پھریں۔ وہ گدھے بھی وہاں جا سکتے ہیں جو شوہر واقع ہوئے ہیں اور خواہ کتنے ہی زیر بار کیوں نہ ہو جائیں مگر حکم بیگم مرگ مفاجات کے قائل ہیں اور عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اس موسم میں بیگم کے دماغ پر گرمی نہ چڑھنے دیں بلکہ بیگم کے ساتھ پہاڑ پر چڑھ جائیں اور خود اپنے اوپر قرض چڑھا لیں۔

واضح رہے کہ جانوروں میں کتا شامل نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ بہت سے لوگ اپنے لیے یا اپنے بال بچوں کے لیے سرد مقامات پر جانا اتنا ضروری نہیں سمجھتے جتنا اپنے کتے کے لیے پہاڑ پر جانا ضروری سمجھتے ہیں اس لیے کہ ان کا عزیز از جان کتا گرمی کی شدت برداشت نہیں کر سکتا اور ہو سکتا ہے کہ اس کی جان پر بن آئے۔ اس قسم کے کتوں کو جانور کہنا بھی ایسا ہی آدمی کہہ سکتا ہے جس کو کتے نے کاٹا ہو ورنہ ان کی زندگی پر تو بے شمار انسانوں کو رشک آتا ہے کہ وہ ریشم و کمخواب کے صوفوں پر لوٹتے ہیں معطر آغوشوں میں بیٹھتے ہیں۔ بہترین دودھ پیتے اور اعلیٰ درجہ کا گوشت کھاتے ہیں اور پھر مری کی مال روڈ پر ہوا خوری کو نکلتے ہیں۔ ان میں سے خدا جانے کتنے کتے ایسے ہوتے ہیں جو مالک کے ساتھ آئے ہوئے ہوتے ہیں اور کتنے مالک ایسے ہوتے ہیں

ٹی وی کے ساتھ نشستیں ہوتی تھیں ۔ دونوں صورتوں میں اگلے کو بار بار کہو کہ پابندی لگا دی جائے تو [illegible] [illegible] تعلق ہے کہ آپ باز رہیں ۔

[illegible] بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ ایک چھوٹا سا گاؤں [illegible] ہے ، وہ بہار رہتا ہے لہٰذا موسم [illegible] ہے جو مسلسل جاری ہے بالکل اسی طرح بدل جاتا ہے [illegible] آ جاتی ہے ۔ اسی [illegible] نظر آتے ہیں ۔

تیری گلی کے موڑ پہ

شہر میں لوگ کہتے ہیں کہ کبھی ادھر سے ادھر جاتے ہیں ، کبھی ادھر سے ادھر آتے ہیں ۔ مری یاد میں سے ہر ایک سے چالیس برس [illegible] ہوتا ہے ان میں سے کچھ نئے شادی شدہ جوڑے ہوتے ہیں جو کچھ عرصہ منتظر ہوتے ہیں ۔ یہ باقی شوہر بیوی کو لے کر چلتا سکتا ہوا نظر آتا ہے یا بیوی ہی شوہر کو [illegible] کی کوشش کرتی نظر آتی ہے ۔ کچھ ایسے بھی شادی کا غم غلط کرنے آئے ہوئے ہوتے ہیں ۔ اور ان کی نگاہیں اس ازدحام حسن و جمال میں کسی قابل خوبصورتی کی جستجو میں نظر آتی ہیں اور وہ کسی کو پانے کے لیے اپنے کو کھویا ہوا محسوس کرتے ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ کسی کا ساتھ تو نکلتا ہے شوہر ہو کسی کے ساتھ چلا جاسکتا ہے لہٰذا اگر وہ ایسے [illegible] دونوں ہی کاٹنے کو دوڑتے ہیں ۔ اور بہت سے ایسے خوش نصیب بھی ہوتے ہیں کہ ان کو پیار کرنے والی مل ہی جاتی ہے ۔ بشرطیکہ وہ خود ، حضرت کو نظر انداز کر دے ۔

اس اجتماع میں ایسے سعادت مند شوہروں کی بیویاں بھی ہوتی ہیں جو خود [illegible] کی ملازمت یا کاروبار کی وجہ سے گرمیاں بسر کرنے یہاں نہیں آسکتے البتہ بیوی کو ٹھنڈی ہوا کھانے کے لیے یہاں بھیج دیتے ہیں اور خود بیچارے بھوکے [illegible] یہ ان کی تو شرافت بلکہ سعادت ہے مگر حیرت ہے ان بیویوں پر جو یہاں ٹھنڈی سہاگن [illegible] بجائے خود تو موسم کی دل فریبی کے مزے اڑاتی ہیں اور شوہر کو اس قابل سمجھتی ہیں کہ وہ دوست ہوتا ہے اور میدانی گرمی میں جھلستا ہے ۔ شوہر کو جہنم واصل کر کے خود جنتی موسم میں اللہ جانے ان دنوں کی تپش سے [illegible] جاتا ہے ۔ مگر شوہر بھی ایسے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر آپ ان سے قیامت خیز میدانی گرمی کا ذکر کریں تو وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہیں گے کہ جی ہاں گرمی تو بے شک ہے مگر یہ کیا کم ہے کہ بیوی نہیں ہے چنانچہ محسوس یہ ہو رہا ہے جیسے انگریز چلا گیا ہو اور آزادی مل گئی ہو اپنی زندگی اب واقعی اپنی محسوس ہو رہی ہے ۔

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

مری لاکھ سرد اور پرفضا مقام سہی اور پنڈی جہنم سہی اور مری اس کے مقابلہ میں جنت سہی مگر یہ بڑی وحشت ناک بات ہے کہ وہاں جس کو دیکھئے وہ نکما ہی نظر آتا ہے کسی کو کسی قسم کا کوئی کام نہیں ہوتا جس کو دیکھئے منہ اٹھائے سڑک ناپ رہا ہے اور وقت کاٹنے کے بہانے ڈھونڈتا پھرتا ہے ۔ بس مال روڈ پہ ٹہلنا شروع کیا تو ٹہلتا ہی چلا جاتا ہے گویا زندگی کا مقصد ہی صرف یہ ہے کہ بس مال روڈ کے چکر کاٹتے رہو ۔ تاش کھیلنے بیٹھے تو معلوم ہوتا ہے کہ بس تاش ہی کھیلنے کے لیے پیدا ہوئے تھے ۔ کسی ریستوران میں بیٹھ گئے ہیں تو بس بیٹھے ہوئے ہیں اور اس انداز سے بیٹھے ہیں کہ ــــ

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں ریستوراں میں ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

بہانہ یہ ہے کہ صحت بنا رہے ہیں خواہ حالتیں کتنی ہی کیوں نہ بگڑ جائیں اور سوال یہ ہے کہ صحت ایسی کونسی خراب ہے جو آپ بنا رہے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ یہ فقیری دور ہے کچھ اور نہیں بنا سکتے تو صحت ہی بنا لیں مطلب یہ ہے کہ یہ بیکاری سخت پریشان کر دینے کی چیز ہے بلکہ اس تصور سے جنت تک سے جی گھبرانے لگتا ہے کہ سنا ہے کہ وہاں کوئی کام ہی نہ ہوگا۔

مری میں مستقل طور پر رہنے کی نہ تو فرصت ہے نہ توفیق البتہ ایک آدھ پھیرا اِدھر کا بھی ہو جاتا ہے مگر یہ پھیرا سخت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں جا کر جتنی راحت نہیں ملتی اس سے کہیں زیادہ واپسی میں تکلیف ہوتی ہے کہ جیسے جنت نصیب ہو جانے کے بعد پھر جہنم میں جھونک دیئے گئے ہوں۔ مری کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھانے کے بعد جب پھر لو کے تھپیڑ کھانا پڑتے ہیں تو طبیعت صاف ہو جاتی ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ مردانہ وار اسی موسم کا مقابلہ کریں اور اس عارضی جنت کے لیے اپنے مستقل جہنم کو شدید سے شدید تر نہ بنائیں۔

رعنا

(غیر مطبوعہ ناول کے دو باب)

کچھ تو وکیل صاحب کے اس انداز سے اور کچھ اس سے شیخ صاحب ناراض تھے کہ ان کے دور رہنے سے دلوں میں تھے رہے کہ وہ اپنی جگہ پر قطعی فیصلہ کر چکے تھے کہ لڑکی کے لیے اب لڑکی دوسرا گھر ڈھونڈنا چاہئے اور وکیل صاحب کی اس بیہودگی کا دندان شکن جواب یہی دیا جائے کہ اب اگر وہ ناک سے لکیر بھی کھینچیں تو بھی ان کے یہاں شادی نہ ہونے۔ بیگم صاحبہ البتہ یہ چاہتی تھیں کہ لڑکی کا نکاح بہت کسی طرح [illegible] نہ ہونے پائے۔ اس سلسلہ میں شیخ صاحب کے اور مستقل طور پر خانہ جنگی جاری تھی۔ بیگم صاحبہ کا قول یہ تھا کہ ڈھنگ کے لڑکے اس زمانہ میں مشکل ہی سے ملتے ہیں اور شیخ صاحب دعویٰ کر چکے تھے کہ میں ایک سے ایک ڈھنگ کا لڑکا مہیا کر کے دکھا سکتا ہوں۔ بیگم صاحبہ کو چونکہ شیخ صاحب کے متعلق یہ معلوم تھا کہ یہ حضرت اعلیٰ درجہ کے نکمے واقع ہوئے ہیں لہٰذا وہ ان کا چیلنج قبول کر چکی تھیں اور شیخ صاحب اس مہم کو سر کرنے پر کمر باندھ چکے تھے کہ وہ اپنی نظرِ انتخاب کی [illegible] کر رہیں گے چنانچہ وہ واقعی اسی تگ و دو میں ہمہ تن مصروف ہو چکے تھے اور اپنی بیماری کو ایک طرف سے بھول کر اس کام میں ایسی مستعدی دکھا رہے تھے کہ بیگم صاحبہ بھی حیران تھیں کہ یہ چستی اور مستعدی ان بڑے میاں میں یک دم سے کیسے پیدا ہو گئی ہے۔ شیخ صاحب اس جستجو میں جس رفتار سے ناکام ہو رہے تھے اسی رفتار سے ان کا جوش بڑھتا جاتا تھا مگر جوش کے ساتھ ہی ساتھ مزاج کا چڑچڑاپن بھی ترقی کر رہا تھا چنانچہ آج جو دنیا زمانے کی خاک چھان کر تشریف لائے تو ان کے تیوروں کا اندازہ کئے بغیر بیگم صاحبہ پوچھ بیٹھیں،

"کچھ پتہ چلا اکرم کے متعلق؟"

شیخ صاحب نے شیروانی ایک طرف اور ٹوپی دوسری طرف اچھالتے ہوئے کہا: "گولی مارو بابا اس ناکارہ [illegible] کو۔"

بیگم صاحبہ نے بڑے اطمینان سے کہا: "چلو چھٹی ہوئی۔ مگر کچھ معلوم تو ہو کہ کس سلسلہ میں گولی ماری گئی ہے۔"

شیخ صاحب نے کہا: "اس کا باپ اعلیٰ درجہ کا لفنگا ہے جس گرمجوشی سے نسبت طے کرتا تھا اسی سرد مہری سے میرے ساتھ پیش آیا کہ صاحب اب تو جب تک اکرم میاں چار پیسے کمانے کے لائق نہ ہو جائیں ہم ان کی شادی کر نہیں سکتا۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "یہ بات نسبت دینے سے پہلے ان کو نہ سوجھی تھی۔"

شیخ صاحب نے کہا: "گولی مارو، اس مردود کو۔ پہلے کے حالات اس کے کچھ اور تھے اب تو حالت بہت پتلی ہے۔ سنا ہے کہ بس اب خشک تنخواہ رہ گئی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح پوری پڑے گی۔ اوپر کی ساری آمدنی ایک دم سے ختم ہو گئی ہے۔ ہستی کم نظر آ رہی تھی اس کی۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "اوپر کی آمدنی؟ ہے تو کیا وہ گھوڑ مارا رشوت لیتا تھا؟"

شیخ صاحب نے کہا: "رشوت ہی کو بازار میں اوپری اور بالائی آمدنی وغیرہ کہتے ہیں۔ میں خود حیران تھا کہ اوپر کی تو رتی بڑی ہے نہیں جتنے ٹھاٹھ ہیں۔ اب تو آثار یہ ہیں کہ سارا ٹھاٹ باٹ ختم کرنا پڑے گا۔ تعجب نہیں کہ تبدیلی آب و ہوا کے لیے جیل بھی جانا پڑے ممدوح کو۔ آج بڑی پراگندہ نظر آ رہی تھیں اور وہ تنی ہوئی مونچھیں اور وہ اینٹھی ہوئی گردن بھی آج سیدھی دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگے کہ دعا کیجیے کہ یہ وقت عزت آبرو کے ساتھ ٹل جائے۔ سنا آپ نے یعنی حرام خوری آپ کریں اور دعا کریں ہم ان کی رسّی کی درازی کے لیے۔ مختصر یہ کہ میں نے تو گولی مار دی۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہ قصہ کیا ہے کہ جو ملتا ہے مگر ایسا ہی ملتا ہے۔ بڑے دعوے سے لائے تھے اس سوداگر کے لڑکے کی نسبت۔ کیا نام ہے اس کا ——"

شیخ صاحب نے کہا: "جی ہاں، بڑا ملک التجار بنا پھرتا تھا۔ چور کہیں کا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہم کو بچا لیا۔ کچھ دنوں بعد اگر وہ حضرت چور بازاری کے سلسلہ میں دھرے جاتے تو کیا ہوتا۔ صورت سے نہایت شریف بنتا تھا۔ نہایت بھلا مانس۔ اچھی خاصی دواؤں کی دکان کا مالک مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ دواؤں کی چور بازاری کرتا ہے ورنہ میں پہلے ہی گولی مار دیتا۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "دیکھو میں پھر کہتی ہوں کہ سلمان میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اچھا بھلا لڑکا ہے۔ ہم کو اس کے باپ سے کیا مطلب۔ خود لڑکا تو اپنی ذات سے برا نہیں ہے۔"

شیخ صاحب نے بگڑ کر کہا: "پھر تم نے اس کا نام لیا۔ جب میں اس کو گولی مار چکا ہوں تو تم بار بار اس کا نام کیوں لیتی ہو؟"

بیگم صاحبہ نے کہا: "تمہارے گولی مارنے میں یہی تو خوبی ہے کہ گولی مارنے سے قصہ ختم نہیں ہوتا کسی کا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ آخر خود اس لڑکے میں کیا عیب ہے؟"

شیخ صاحب نے نہایت جوش میں آ کر کہا: "سو عیبوں کا ایک عیب یہی کیا کم ہے کہ وہ ایک ایسے باپ کا بیٹا ہے۔ تم خود سن چکی ہو کہ اس کے ٹھگ باپ نے ملک و قوم کو کس کس طرح سے ٹھگا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "وہ تو جو کچھ کیا ہے اس کے باپ نے کیا ہے۔"

شیخ صاحب ابل پڑے: "غلط۔ سراسر غلط۔ باپ کو تو خیر گولی مارو مگر صاحبزادے بھی تو آخر اسی طرح کی کمائی میں ہمیشہ مصروف رہے ہیں۔ یہ کام جو وہ کر رہے ہیں کیا تم اس کو ڈکیتی سے کچھ کم سمجھتی ہو؟ پکے کاغذ پر مجھ سے لکھوا لو

[illegible] صاحب کے ساتھ [illegible] اقبال بھی کرفٹ میں آنے کے بعد [illegible] رہی ہے [illegible] کر رہے ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "سمجھا تو میں بھی تھی [illegible] آپ نے بوم کو لب [illegible] میں [illegible] ہے۔"

شیخ صاحب نے بلبلا کر کہا: "[illegible]"

بیگم صاحبہ نے احتجاج کیا: "[illegible] جیسے مجھے بھی [illegible] ہیں۔"

شیخ صاحب نے [illegible] مستقیم [illegible] ہے کہ جب آپ جیسے [illegible] اللہ گرفتار ہو جائیں گے [illegible] ہوئی کہ ذرا [illegible] تھا کر [illegible] ختم ہونے کے بعد جب وہ [illegible] سے [illegible] سے میں کام [illegible] ہی [illegible] کر سکتا۔"

بیگم صاحبہ [illegible] ہو کر [illegible] کھا [illegible] شیخ صاحب کی [illegible] صاحب [illegible] گھوم پھر کر اب [illegible] ہی کی طرف آگیا [illegible] حسن [illegible] کے متعدد [illegible] نسبتوں کا [illegible] کو کوئی خوف تھا نہ کوئی [illegible] البتہ شیخ صاحب [illegible] حسن سے وہ خائف ضرور [illegible] کہیں شیخ صاحب [illegible] کے لیے [illegible] بڑی چوٹی کا [illegible] کہ خود احسن ہی کے [illegible] تھے کہ شیخ صاحب اس کا نام [illegible] ہمیشہ [illegible] نسبت کو منظور نہ کریں گے مگر جب سے احسن کی والدہ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ وکیل صاحب نے [illegible] عرصہ مدت کے لیے ملتوی کر دی ہے ان کی توجہ بہت بڑھ گئی تھی یا تو یہ حال تھا کہ بھائی کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں اور ایک شادی میں شرکت ہی سے انکار کر چکی تھیں یا اب ایک دم سے بھائی کی محبت ایسی عود کر آئی تھی کہ ہر دوسرے تیسرے دن دھری ہوتی ہیں اور میاں احسن کی آمد و رفت بھی ان دنوں خلاف معمول بہت بڑھی ہوئی تھی حالانکہ اس گھر میں ان سے کوئی سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا تھا مگر ممدوح عجیب مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ رعنا کا ہر نخرہ ان کو گوارا تھا۔ شیخ صاحب اپنے مصنوعی دانت باہر نکال نکال ان کو دیکھتے ہی پیسنا شروع کر دیتے تھے بیگم صاحبہ ان کے سامنے قطعاً گھاس نہ ڈالتی تھیں مگر آپ تھے کہ نہایت پابندی سے حاضری بھی دیے جاتے تھے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر کسی نہ کسی خدمت کا موقع بھی حاصل کرتے رہتے تھے کچھ نہیں تو رعنا کے کتے کے لیے راتب ہی لیے چلے آ رہے ہیں اس لیے کہ گھر بھر میں وہی ایک

تھا جو ان کو دیکھ کر دم ہلایا کرتا تھا۔ رعنا کے چھوٹے بھائی اسلم ان کو پڑھنے کے بہانے سے جب ملتے موجود ہیں مہمان سے بیگم صاحبہ کو سخت وحشت ہو رہی تھی لیکن ان کی رعنا سے ملنا ماں شیخ صاحب کو گوارہ ہیں۔

رعنا کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی وہ بظاہر جس قدر شوخ اور شریر تھی اس سے کہیں زیادہ گہری بھی تھی، بیگم صاحبہ تو اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی جانتی تھیں کہ اس کو سلمان سے ایک قلبی لگاؤ ضرور ہے اس سلمان کی وہ طرفدار بھی محض اسی وجہ سے تھیں مگر اس قلبی لگاؤ کی اصل حقیقت سے اگر کوئی واقف تھا تو وہ رعنا کی واحد سہیلی ندرت تھی کہ باوجود اس قلبی لگاؤ کے رعنا اور سلمان کے درمیان کس قدر وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔ اور اب رعنا کا یہ حال ہے کہ وہ سلمان سے اپنے اس قلبی لگاؤ کو ناراضگی اور بے تعلقی سے تبدیل کر سکتی ہے اپنے دل کو مار سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک مجرمانہ بے حمیتی کے ساتھ سلمان سے اپنی وابستگی کو قائم رکھے۔ البتہ اس کو بھی اگر حیرت تھی تو صرف یہ کہ سلمان کی طرف سے اتنا بڑا دھچکہ پہنچنے کے بعد بھی جو اثر اس پر ہونا چاہیئے تھا وہ کیوں نہیں ہے وہ بدستور اپنی شگفتگی کو کیونکر قائم کئے ہوئے ہے اور اس کے ہر انداز سے یہ کیوں ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے اس نے کچھ کھویا ہی نہیں ہے۔ شروع شروع میں تو اس کو یہ شبہ رہا کہ رعنا در اصل شگفتہ نہیں ہے بلکہ شگفتگی کی اداکاری کر رہی ہے مگر رفتہ رفتہ اس کو اندازہ ہو گیا کہ یہ بناوٹی شگفتگی نہیں بلکہ سلمان کی اس نقاب کشائی کی اس کو واقعی کوئی پرواہ نہیں ہے اور اس یقین کے بعد تو اس نے ایک دن یہ ذکر چھیڑ ہی دیا۔

"رعنا ایک بات پوچھوں مگر پہلے مجھ کو یہ یقین دلا دو کہ تم مجھ سے بھی سچائی کو چھپانے کی کوشش کر کے میرا دل نہ توڑو گی۔"

رعنا نے غور سے ندرت کو دیکھتے ہوئے کہا "یہ بات تم مجھ سے کہہ رہی ہو یا پرویز بھائی سے باتیں کرنے کا گویا ریہرسل کرنا چاہتی ہو۔"

ندرت نے پرویز کے نام پر شرمائے بغیر نہایت سنجیدگی سے کہا "دیکھو رعنا میں اس وقت بے حد سنجیدہ ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ تم بھی سنجیدہ ہو جاؤ۔"

رعنا نے اپنا دوپٹہ درست کر کے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا "لو ہو گئی سنجیدہ۔ مگر یہ تم پر سنجیدگی کا دورہ کیوں پڑا ہے اس وقت۔ خیریت تو ہے۔"

ندرت نے کہا "میری خیریت کو تو جانے دو مگر مجھ کو تمہاری خیریت نظر نہیں آتی اگر تم نے اپنا یہ انداز تبدیل نہ کیا اور میری بات کو اسی طرح مذاق میں ٹالتی رہیں۔ یا صاف صاف یہی کہہ دو کہ مجھ کو تمہارے ہر راز سے آگاہ ہونے کا کوئی حق نہیں ہے اور بعض راز ایسے بھی ہیں جو مجھ سے بھی چھپائے جا سکتے ہیں۔"

اب رعنا نے بھی سنجیدگی سے کہا "دماغ ٹھکانے ہے یا نہیں۔ میں نے کونسی بات تم سے کب چھپائی ہے؟"

ندرت نے کہا: ”مجھے زندگی میں [illegible] اب بھی شبہ ہو رہا ہے اور مجھ کو [illegible] نہیں ہے [illegible] سلمان بھائی سے [illegible] کا تم پر کچھ کوئی اثر نہیں ہے۔“

رعنا نے سوال کیا: ”تو کیا تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں خود اپنے سے منافقت کر رہی ہوں؟“

ندرت نے کہا: ”تمہارا رویہ مجھے [illegible] ہو سکتا ہے کہ تم زندگی کے [illegible] میں بھی شامل ہو [illegible] منافقت کر رہی ہو۔“

رعنا نے کہا: ”تو آپ مجھ کو ندرت جو چاہیں کہیں مگر [illegible] میں خود سے منافقت کر سکتی ہوں۔ یہ خیال ہی تمہارے ذہن میں کیونکر آیا۔“

ندرت نے کہا: ”بھئی [illegible] اب میرے ذہن میں یہ خیال [illegible] سلمان بھائی سے [illegible] اس حد تک وابستہ نہیں۔“

رعنا نے کہا: ”غلط ہے میں واقعی اس سلسلہ میں اس حد تک [illegible] کر جذبات کی رو میں بہہ جانے والی کے [illegible] بات نہیں [illegible] ہیں کہ وہ مجھ [illegible] سے صحیح سلامت نکال آئے چنانچہ میں تو بے حد خوش ہوں۔ مجھ [illegible] اور میں اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھ کر بے حد خوش ہوں۔“

ندرت نے کہا: ”تو کیا یہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ تم نے کچھ کھو دیا ہے؟“

رعنا نے کہا: ”برعکس اس کے مجھ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں خود کھو گئی تھی [illegible] اب اپنے کو پا گئی ہوں۔ تم بھی [illegible] باتیں کر رہی ہو ندرت کیا خود تم یہ گوارا کر سکتی ہو کہ خدانخواستہ [illegible] پڑ جائے تمہاری محبت نامکمل [illegible] شروع کر دیں؟“

ندرت نے تعجب سے کہا: ”محبت کس طرح نامکمل ہو سکتی ہے؟“

رعنا نے کہا: ”ہو سکتی ہے۔ بلکہ ہوتی ہے۔ نہ جانے کتنے [illegible] خود میری محبت نامکمل ہوتی رہی ہے کاش تم اس ایک بات کو سمجھ سکو کہ محبت اس ایمانداری کا نام ہے جو کسی ایسے دل میں پنپ ہی نہیں سکتی جس میں بے ایمانی بھی رچ بس رہی ہو۔ ایک جرائم پیشہ آدمی اور خواہ کچھ کر سکتا ہو مگر محبت ہرگز نہیں کر سکتا۔ محبت کے ساتھ بے ایمانی ضرور کر سکتا ہے جو میرے ساتھ کی گئی۔“

ندرت نے کہا: ”مگر اس کا افسوس تو ہوتا ہے کہ جس کو ہم اپنی محبت کا مرکز بنائے ہوئے تھے وہ سراسر دھوکا نکلا۔“

رعنا نے کہا: ”مگر مجھ پر تو اس کے برعکس یہ اثر ہوا ہے کہ گویا میں کسی نہایت مہلک مرض سے یکایک صحت یاب ہو گئی ہوں اور میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے وقت سے پہلے ہی مجھ کو ایک ایسے خطرے سے بچا لیا جو میرے لئے واقعی جان لیوا ثابت ہوتا۔ سلمان تو اس لیے ناقابلِ علاج ہیں کہ وہ اپنے مرض کو مرض ہی نہیں سمجھتے۔“

ندرت نے کہا: ”محبت تو اندھی مشہور ہے مگر تمہاری محبت تو بڑی دور بین نکلی۔“

رعنا نے مسکرا کر کہا: ”جی ہاں اندھوں کی محبت اندھی ہی ہوتی ہو گی مگر میں تو اپنی عقل ہوتی آنکھوں سے دغا بازی کر محبت دیکھ نہیں سکتی مجھ کو یقین ہے کہ سلمان مجھ کو دھوکا دیتے رہے ہیں اور اس یقین کے بعد ان کو کھونے کا غم ہونے کے

بجائے میں تو حسن کو وہاں پاک کہا کرتی ہوں"

قدرت نے کہا: "مگر اب کیا ہوگا؟"

رعنا نے کہا: "نیلام ہوگا اور کیا ہوگا۔ ہم لوگوں میں لڑکیوں کا نیلام ہی تو ہوتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کو جوا کہہ لو۔ مگر میرے دل کو یہ اطمینان ہے کہ جس خدا نے مجھ کو اس گرداب سے بچایا ہے جو سلمان نے میرے لیے کیا تھا وہ بیڑہ ڈوبے گا نہیں پار ہی لگائے گا۔"

قدرت نے کہا: "سنا ہے کہ آجکل تمھاری پھوپھی جان اپنے نورِ نظر میاں حسن سلمہ کے لیے پھر مذبذب ہو گئے ہیں۔"

رعنا نے قہقہہ لگا کر کہا: "یہ مہم تو اس قدر عجیب ہے کہ سچ پوچھو تو میرے لیے دل کے بہلانے کا اس سے بہتر انتظام اور کوئی ہو ہی نہ سکتا تھا۔ کاش میں تم کو یہ تماشے دکھا سکوں۔ عزیز القدر میاں حسن سلمہ کو تم آجکل دیکھ سکیں کہ وہ کس حد تک حکم کے غلام بنے ہوئے ہیں۔"

قدرت نے ہنس کر کہا: "اچھا اب گویا ترقی کر کے حکم کے غلام بن گئے ہیں۔ ویسے غلام تو وہ ہمیشہ ہی سے تھے کہ عقل پر پتھر برسا کرتے تھے۔"

رعنا نے کہا: "خیر وہ پتھر تو آپ کی دعا سے اب بھی برس رہے ہیں مگر اب دیکھو گی تو مشکل ہی سے آنکھ ٹھہر سکے گی۔ مزاجِ یار کی طرح اس قدر جلد جلد بھیس بدلتے رہتے ہیں کہ گرگٹ بھی کیا رنگ بدلے گا۔ صبح سوٹ میں ہیں تو دوپہر کو شیروانی میں اور شام کو شکاری لباس میں ہیں تو رات کو ڈریس سوٹ تک میں جلوہ دکھا جاتے ہیں۔"

قدرت نے ہنس کر کہا: "سچ مچ ڈریس سوٹ میں تو اچھے خاصے بینڈ ماسٹر نظر آتے ہوں گے۔"

رعنا نے کہا: "اس سے ان کو کوئی بحث نہیں کہ وہ کیا نظر آتے ہیں وہ تو صرف اس جستجو میں ہیں کہ میرے نقطۂ نظر سے ان کو کیا نظر آنا چاہیے۔"

قدرت نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "بھئی یہ تو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ اس نے تم کو ایک ایسا کھلونا عطا کر دیا ہے مگر تم اس سے پوری دلچسپی شاید ہی لیتی ہو۔"

رعنا نے تردید کرتے ہوئے کہا: "جی نہیں میں ایسی بد مذاق نہیں ہوں کہ ایسی خداداد دلچسپی کی بھی ناقدری کروں۔ اچھا تم یہ کرو کہ کل آجاؤ نا یہ تماشہ دیکھنے کے لیے۔"

قدرت نے کہا: "لو بھلا اب بھی نہ آؤں گی۔ میں تو صبح سے شام تک کے لیے آؤں گی۔"

یہ پروگرام طے ہو جانے کے بعد رعنا قدرت سے رخصت ہو گئی۔

دُردانہ

ایک جدید مثنوی سے ریڈیائی اوپیرا

ترتیب **شوکت تھانوی**
عشرت رحمانی

(یہ اوپیرا آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے لیے ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔ حضرت جگر مراد آبادی سے ایک مثنوی لکھوائی گئی، اس کی اساس پر شوکت تھانوی مرحوم اور عشرت رحمانی نے ریڈیائی اوپیرا مرتب کیا۔ گیت اور غزلیں عشرت رحمانی نے لکھیں۔ حضرت جگر کے بعض اشعار اس میں استعمال ہوئے ہیں باقی تمام شوکت تھانوی اور عشرت رحمانی کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے ——— اور سید انصار ناصری حال ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان نے ہدایت کاری کے فرائض انجام دیئے تھے جہاں آرا کجن مرحومہ مشہور فلم و اسٹیج اداکارہ اور گلوکار طلعت محمود نے ہیروئن اور ہیرو کے کردار انجام دیئے تھے۔ مدیر)

(نغمہ)

ایک مترنم آواز:
بزمِ فطرت عجب فسانہ ہے   حسن و الفت کا کارخانہ ہے
شمعِ غم خانۂ حیات ہے عشق   زندگی کی اجالی رات ہے عشق
ایسے ہی عشق کا اِک افسانہ   سُنیئے اب سرگذشتِ دُردانہ

(موسیقی)

راوی: ———
قصۂ دل پذیر روپ نگر   عشق کی سیرگاہ کا نظارہ گھر
اُمرا جس میں شان کے مالک   غربا آن بان کے مالک
اُن میں سب سے زیادہ باوقعت   ایک نواب تھے فلک رفعت
تھے کنیز و غلام و دولت و زر   گوہرِ بے بہا حسین دختر

خوش رہو شاد کام نیک نہاد   باپ ماں کے دلوں کی نکلے مراد
نام ور ہو دوام یہ مہ طلعت   تو ہو سب جہاں خوش قسمت
سولھویں تھی جو نیک فال گرہ
ہوا تجویز جشن سال گرہ

(شہنائی کی آواز)

(باجوں اور مجمع کا شور)

بسنت : مبارک ہو یہ رنگ و بو کی کہانی
بہاروں پہ آئی کلی کی جوانی   مبارک ہو یہ دورِ شادمانی
مبارک ہو یہ رنگ و بو کی کہانی
یہ نغمہ یہ عشرت یہ رنگیں نظارے   بہر سو نگارے بہر سو بہارے
سناتے ہیں گل سولھویں کی کہانی
ہیں ناہید و زہرہ بھی رقصاں خوشی سے   سناتے ہیں نغمے جھوم کر بے خودی سے
یہ ہے بربط ماہ کی نغمہ خوانی
مبارک ہو یہ رنگ و بو کی کہانی

راوی : بزم عیش و نشاط برپا ہے   رقص ہے زمزمہ ہے نغمہ ہے
جشن گہ ہے کہ آنکھ کی پتلی   سمٹ آئی ہے جس میں کل بستی
آمد آمد ہے مہمانوں کی   دھوم ہر سمت شادیانوں کی
شادماں آج ہیں فلک رفعت   کرتے ہیں ہر ایک کی آؤ بھگت

(دور سے آوازیں قریب آتی ہیں)

آواز ۱ : آداب عرض!
آواز ۲ : تسلیمات عرض!
آواز ۳ : تشریف لائیے قبلہ۔
آواز ۱ : آداب۔ آداب
آواز ۲ : ادھر تشریف رکھیے
فلک رفعت : —

غریب خانہ میں بھائی قمر کو دیکھتے ہیں
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

آواز ملے: کیا خوب نواب صاحب۔ واہ واہ

آواز ملے: واہ کیا خوب فرمایا ہے۔

آواز ملے: گویا [illegible]

فلک رفعت: قدردانی [illegible] حضرت شریف [illegible] ارشاد فرمائیے۔

خسرو: ادھر تو [illegible] ہیں

فلک رفعت: ؎ ہے [illegible] ہیں

خسرو نواب: ؎ [illegible] یا [illegible]

خسرو: ؎ [illegible] ہیں

فلک رفعت: ؎ آہا [illegible] ہیں

آواز ملے: آپ آج تشریف لائیے۔

آواز ملے: [illegible]

ارجمند: حاضر، حاضر قبلہ۔

فلک رفعت: ؎ [illegible] آؤ   [illegible] آؤ [illegible]

ارجمند: خوب خوب۔ حاضر ہوا۔

فلک رفعت: ؎ اے جنی خاص دل جلائے کوئی   [illegible] لائے کوئی

آواز: حاضر سرکار۔ حاضر۔

ارجمند: ؎ جن کی لاجواب [illegible]   [illegible] کرم جس سے حیرت ہے

فلک رفعت: ؎ ہے تمہارے ہی دم سے [illegible]   ارے جنی گلے میں ہے کیوں [illegible]

آواز: بہت خوب سرکار۔

(گانا)

(جشن)

کورس: یہ نغمہ پر کیف یہ رنگین نظارے   دھرتی پہ اتر آئے ہیں آکاش کے تارے
اور ہیں مہ و انجم ہیں محبت سے اشارے
رنگین نظارے ہیں یہ رنگین نظارے
مستی کا چھلکتا ہوا پیمانہ جہاں ہے   یا نور محبت کا پری خانہ جہاں ہے
کیفیتوں میں غرق ہیں آکاش پہ تارے
رنگین نظارے ہیں یہ رنگین نظارے

ہیں بادۂ عشرت سے یہ بہکی ہوئی راہیں   مسرورِ جوانی کی یہ شوخی بھری باتیں
نغموں کی جوانی کہیں لے میں پکارے
رنگین نظارے ہیں یہ رنگینی نظارے

منظر: زنانخانہ

راوی: تھی محل میں بھی گرم اک محفل   پردہ پردہ میں دید کے قابل
عورتوں کا بپا تھا ہنگامہ   ڈھولکی بج رہی تھی ہر جانا
آرہی تھیں سواریاں پیہم   کر رہی تھیں پیشوائی خود بیگم

(ڈومنیوں کا گانا)

شادیاں رے آج ہے جھاجھم
لا ری مالن سہرا بی کا!
اس سہرے پہ تارے ہوں جھم جھم

میا باوا کو خوشیاں مبارک
خوشیاں رہیں یہ جم جم
شادیاں رے آج ہے جھاجھم

(موسیقی)

راوی: تھا محل میں جو آئینہ خانہ   اس میں تھی محوِ حسن دُردانہ
ملنے وہ سوزساز کی تصویر   حسن کا خواب عشق کی تعبیر
آرزوے طرب کا پیمانہ   زندگی کا حسین افسانہ
بال اپنے بناتی جاتی تھی   زیرِ لب گنگناتی جاتی تھی

دُردانہ: (گاتی ہے) بے زبانی اگر زباں ہو جائے   داستانِ دل کی جاوداں ہو جائے
ہے محبت سکوت میں سب کچھ   کچھ نہیں ہے اگر بیاں ہو جائے

(ستارہ کا آنا)

ستارہ: (کھلکھلا کر) یہ رہیں دُردانہ آخر پا لیا
دُردانہ: نا بہن نا مت کرو یوں گدگدی
ستارہ: دیکھ تیری گت بناتی ہوں ابھی

دردانہ: ابھی ستارہ بھی کہاں ہے [illegible]
ستارہ: ڈھونڈتی پھرتی ہیں [illegible]
دردانہ: ہیں کہاں [illegible] کس کمرے میں [illegible]
ستارہ: [illegible] اودھر [illegible]
دردانہ: کیا خبر [illegible]
ستارہ: تمھاری [illegible] آتی ہوں   [illegible] آتی ہوں
ارجمند [illegible]   [illegible]

دردانہ: میں ستارہ [illegible]
ستارہ: کہی تو ہوں
دردانہ: [illegible] لیے۔
ستارہ: [illegible]   [illegible]
ارجمند — آپ کا [illegible]   [illegible]
دردانہ: مجھ کو [illegible] ہوتی ہے چھوڑ کر   [illegible]
ہیں وہ دولت مند، وہ دولت پسند   [illegible] ان کا [illegible] ارجمند
ارجمند اکبر ہیں دولت کے سر   [illegible] رسمی خوبی ہے کیا

ستارہ: اے جناؤ یہ ذکر چھوڑو جی   اس طرح سے سب کو رنجاؤ نہ
پھر [illegible] دریچہ میں آؤ   ذرا محفل سے دل کو بہلاؤ
ہنسو بولو ہے نیک فال گرہ   آج خوشیوں بھری ہے سالگرہ

دردانہ: سب ہیں سلمان کہ جن سے دل مانوس   پھر بھی ہوتی ہے اک کمی محسوس
ستارہ: کیا ہوا خیر ہے، کمی کیسی؟
دردانہ: سنو! آئے نہیں ہیں ناصر آج؟
ستارہ: پر نہ آنے کا کچھ سبب بھی کھلا؟
دردانہ: بے بلائے وہ کیسے آتے بھلا؟
سمجھے شرکت ہیں اپنی وہ تحقیر   بڑی خودداری ان کی دامنگیر

ستارہ: ہاں ہیں وہ بھی تھے کبھی خوشحال
دُردانہ: مجھ سے پوشیدہ کب ہے یہ احوال
جب سے پردہ میں بٹھائی گئی   خاص کر اُن سے جب چھپائی گئی
اور بزرگوں کے دیکھے بدلے طور   اُن کا انداز ہو گیا کچھ اور
ستارہ: بچپنے کی منگی ہوئی تھیں تم   اُن کے دل میں بسی ہوئی تھیں تم
اُن پہ افلاس کا جو آیا دور   بدلے ماں باپ کے تمھارے طور
دُردانہ: ہے عجب اس زمانہ کا معیار   وہی سب کچھ ہے بس جو ہے زردار

(آہٹ)

ستارہ: کون؟ گلشن ہیں!
دُردانہ: (سنبھل کر) آؤ آؤ بوا!
گلشن: بہو جم جم نصیب ہو اچھا۔
دُردانہ: ادھر بیٹھو برسوں میں دکھلائی صورت
گلشن: میرے چاند کو سولہویں ہو مبارک
میں خود دیکھنے کے لیے تھی پریشاں   کیا آج ناصر میاں نے یہ ساماں
انھیں نے یہ خط دے کے بھیجا ہے مجھ کو   کہا ہے کہ جلدی جواب اس کا لاؤ
ستارہ: پڑھو خط کو دُردانہ کیا مدعا ہے   نہ آنے کا شاید سبب کچھ لکھا ہے

خط

مردانہ آواز: میری بیداریوں کے خواب سلام   ذرہ کہتا ہے آفتاب سلام
ہو مبارک تمھیں یہ سولھواں سال   مہِ کامل بنا ہے آج ہلال
گو بظاہر میں باریاب نہیں   کیا تصور بھی کامیاب نہیں
وہی معصوم چاندنی راتیں   بھولی بھولی سی سب وہی باتیں
تم تصور میں گنگناتی ہو   گو بظاہر چھپائی جاتی ہو
ہے یہ پردہ فقط مرا افلاس   ہے خطا یہ نہیں ہے دولت پاس
وہی محفل میں آج ہیں مہماں   خاندانی تھے جو کہ دشمنِ جاں
خیر اس ذکر ہی کو رہنے دو   تہنیت جشن کی قبول کرو
ٹوٹے دل کی دعائیں بھی لے لو   آرزوؤں کے پھول بن کے رہو
تا ابد یہ بہار دیکھو تم   ایسی خوشیاں ہزار دیکھو تم

ستارہ: آئینہ کی صورت چپ ہے [illegible] وہ تو سنے میں [illegible]

گلشن: [illegible] آ لی ہوں اب گھر کو اجازت دو

ستارہ: [illegible] پوچھ تم گھر کے [illegible] دے دو

[illegible]: [illegible] کیا گھر [illegible] کچھ [illegible]

ستارہ: ان میری کچھ میں بھی [illegible] خوب [illegible]

[illegible] ہم نے تو [illegible] ہے

بے زباں اگر زباں ہو جائے [illegible] داستاں دل کی [illegible] ہو جائے

ستارہ: [illegible] بے [illegible] پوچھ [illegible] دنیا

[illegible] ہاں ہے!

گلشن: [illegible] خوش [illegible] ہو گئی

ستارہ: [illegible] بے زباں [illegible] داستاں دل کی [illegible] ہو جائے

(موسیقی)

راوی:
[illegible] جو [illegible] ادھر   حال [illegible] کا [illegible]
[illegible] ستارہ [illegible] کیا   [illegible]
[illegible]   حال نا [illegible] وجہ حال
[illegible] صورت [illegible]   [illegible] دونوں کے [illegible] حال [illegible]
ہو گئی [illegible] سے نسبت   [illegible]
[illegible] مصیبت میں جو [illegible]   دونوں کے حق میں [illegible] ستارہ ہی
[illegible] اک دوست تھی ہی دمساز   [illegible] ہمراز
دونوں کے درد سے تھی وہ آگاہ   سوچ کر اس نے اک نکالی راہ

ستارہ:
دونوں تدبیر پہ بڑھتے کار   کر لیں یہ دونوں آخری دیدار
درد اک دوسرے کا کہہ سن لیں   ورنہ پھر بعد میں ملیں نہ ملیں

راوی:
کی ستارہ نے یہ مسیحائی   اجڑے گلشن میں پھر بہار آئی
اس کی تدبیر سے کھلا یہ گل   باغ میں مل گئے گل و بلبل!
معرکہ تھا عجیب اک درپیش   ہوش میں تھے کہاں محبت کیش

اس طرف شرم اور ادائے ناز   اس طرف بے قرار ذوقِ نیاز
آنکھیں پرنم گلے گھٹے زباں   دونوں جانب دبے دبے طوفاں
بے زبانی زباں تھی گویا!   خامشی داستاں تھی گویا!
ناصر اک دلفگار پروانہ   شمع سی بے قرار دُردانہ!
تمتمائے ہوئے سے وہ رخسار   جام خوش رنگ میں شفق کی بہار
تھی مجسم وہ کھوئی کھوئی سی   جاگی جاگی سی سوئی سوئی سی
غم سے دُردانہ بے قرار ہوئی   دل بھر آیا اشکبار ہوئی

سسکیاں

ناصر : دُردانہ ——————— دُردانہ
خدا کے واسطے دُردانہ اشکبار نہ ہو!
دُردانہ : خزاں نصیب ہوں کیونکر غمِ بہار نہ ہو!
ناصر : نگارِ خوبی و رعنائی بہار ہو تم   کسی کی قسمتِ بیدار کا سنگار ہو تم
دُردانہ : نہ ایسی باتوں سے للہ دل دکھاؤ تم   میں خود ہوں سوختہ ساماں اب جلاؤ نہ تم
ناصر : یہ دل جلانے کی باتیں ہیں کیسی دُردانہ!   چھلک اٹھا ہے مرے دل کا آج پیمانہ
دُردانہ : کہاں گیا وہ مسرت کا دور یاد کرو   وہ اپنا صحنِ چمن اور وہ چاندنی راتیں
ناصر : ورق الٹ بھی دو بھولے ہوئے فسانے کے   انہیں نہ یاد کرو خواب کی تھیں وہ باتیں
دُردانہ : ملے تھے آج مقدر سے اب ملیں نہ ملیں   خدا ہی جانے کہ اس غم میں اب جئیں نہ جئیں”
ناصر : یہ بدشگونی ہے کیسی نہ اس طرح ہو اداس   تمہاری یاس بڑھاتی ہے میرے دل کا ہراس
دُردانہ : بس اب تو موت ہی ناصر ہے میری چارہ ساز

(قدموں کی چاپ)

ناصر : ادھر ہی آتا ہے شاید کوئی سنو آواز
ستارہ : ششش تمھارے گھر سے بلانے کو آ گئی ماما
دُردانہ : میں جا رہی ہوں، بپا ہو نہ کوئی ہنگاما!

(جاتی ہے)

ناصر : دُردانہ ——————— دُردانہ
راوی : یوں اچانک وہ ہو گئی رخصت   ٹوٹی ناصر کے دل پہ اک آفت

درد پہلو میں یوں چمک اٹھا شعلۂ زندگی بھڑک اٹھا
دل میں یارائے ضبط ہی نہ رہا ہوش و تمکیں سے ربط ہی نہ رہا
اس کو رہ رہ کے تھی یہی وحشت

ناصر: کر رہے ہیں یہ کیا ملک رفعت؟
ہر چند ایک رند مشرب ہے اس کو [illegible] سے مطلب ہے
ہر گھڑی فیض نشۂ سرشاری ہے یہی اس کا شغل بیکاری
اس کو فرزانہ سے ہے کیا نسبت اس کی کچھ اور اس کی کچھ عادت

ناصر: کہیں شادی کا ہو نہ یہ انجام کہ رہے اس کی موت کا پیغام
کہنے خود ہیں جو حاضر خدمت دیکھوں کہتے ہیں کیا ملک رفعت
کیا عجب ہے جو کچھ سمجھ جائیں عقل کو اب بھی کام میں لائیں

نواب: آپ اور میرے محل آئیں خدا کی قدرت آج کیوں بخشی گئی ہے مجھے ایسی عزت
ورنہ حضور کے کیا آپ ادھر آتے میرے لائق کیا ہے حکم [illegible] خدمت

ناصر: رسم سے حضور یہ آنے سے رہا گو معذور میری حالت نے مجھے کر دیا ایسا مجبور
بندہ مطلب سے ہے اب بھی نہیں آیا

نواب: حال پہ میرے کرم کس لیے فرمایا ہے

ناصر: میں نے فرزانہ کی نسبت کا سنا جب سے حال

نواب: دیکھ کر آپ کو جو مجھ کو ہوا تھا یہ خیال آشکارا تھا جناب آپ کی صورت سے سوال

ناصر: میں قسم کھاتا ہوں اپنے سے سروکار نہیں ہر چند اچھا ہے مجھ سے مجھے انکار نہیں

نواب: مگر اس باب میں اب کچھ بھی نہ فرمائیں جناب ہے سنے آپ کی ہر بات کا ہے بس یہ جواب

ناصر: اس کی دولت سے وجاہت سے تو انکار نہیں پھر بھی فرزانہ کے لائق تو وہ زنہار نہیں

نواب: کون سا عیب ہے اس میں جو ہوا انگشت نما ہے رئیس ابن رئیس اس میں خرابی ہے کیا؟

ناصر: رنگ رلیاں ہیں وہاں آٹھ پہر اور شراب

نواب: سن چکا اب میں بہت آپ کی مہمل بکواس وقت اس کے لیے بیکار نہیں میرے پاس
تم جلے دل کے پھپھولوں سے ہو اپنے مجبور تم کو تو اس میں نظر آئیں گے لاکھوں ہی قصور

ناصر: قبلہ و کعبہ یہ الزام ہے مجھ پر بے سود ہے فقط آپ کی مجھ کو تو بھلائی مقصود

نواب: اپنی اولاد کی ہے تم سے زیادہ مجھے فکر   ختم فرمائیں براہِ کرم اب آپ یہ ذکر

راوی: جب یہ کوشش بھی ہو گئی بیکار   مرحلہ اور بن گیا دشوار
تھی ہر اک سمت بس یاس ہی یاس   گم ہوئے جاتے ہیں ہوش و حواس
تھک کے بیٹھا مگر نہ جاتا تھا   کسی پہلو نہ چین آتا تھا!
تھا خیالات کا عجب ہجوم   اور نتیجہ ہر ایک کا معلوم
یک بیک اس کو یہ خیال ہوا :-

ناصر: ارجمند مجھ سے گو ہے" لاکھ خفا
پھر بھی خود اس کے گھر اگر جاؤں   کیا عجب ہے، کہ راہ پہ لاؤں

راوی: ایک امید کے سہارے پر   بہہ چلا حسرتوں کے دھارے پہ
پہنچا وہ ارجمند کے ایواں   تھا جہاں عیش کا بپا طوفاں

(ارجمند کی محفل - رقص و نغمہ)

ارجمند : کیا خوب رقص و نغمہ ہے
دوست ۱: مے ہے سرور ہے
دوست ۲: یہ جلوہ گاہِ ناز ہے
دوست ۳: یا بزمِ نور ہے
دوست ۴: اپنے نشے سے مے بھی یہاں چور چور ہے
ارجمند : عشرت کا ہے وفور
ساقی : مسرت مزید ہے
دوست ۱ : ہر شب شبِ برات ہے
دوست ۲ : ہر روز عید ہے
ارجمند : چھلکے جام چلے پیمانہ   لب پر نام ہے دُردانہ
سب دوست: دُردانہ ——— دُردانہ ——— دُردانہ
ناصر : ہے اجازت کہ اندر آ جاؤں ؟
ارجمند : کون ہے ؟
ناصر : میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔

ارجمند : تو آؤ نا[illegible] کا ناشتہ
ناصر : جی - جی نہیں - جی
ارجمند : شرماتے ہو کیا میری پریوں کے سامنے ؟ (ہنستا)
ناصر : تنہائی میں گفتگو ضروری ہے التجا !
ارجمند : کچھ تخلیہ کی بات ہے ؟ اچھا تو تخلیہ !
(تخلیہ)

ارجمند : اوہو - یہ کون ؟ ہاں یہ آپ !
ناصر : ہاں بھائی میں ہوں
ارجمند : یعنی کہ ناصر میاں ہیں آپ !
کہئے یہ آج کس لئے زحمت اٹھائی ہے ؟
ناصر : اک التجا عجیب کہ اس در پہ لائی ہے
ارجمند : یہ کس طرح سے راستہ حضرت گئے ہیں بھول
میخانہ میں حضرتِ زاہد کا کیوں نزول
ناصر : گو ارجمند ہم میں بہت کچھ ہیں اختلاف
ارجمند : چھوڑو بھی اختلاف کو تم آ گئے یہاں
اے شیخ بھول جاؤ وہ سب پچھلی داستاں
اب غرقِ جام کر دیں ہر اک اختلاف کو
ناصر : انسانیت کے نام پہ کرتا ہوں التجا
ارجمند : آخر کہو تو صاف کہ یہ ماجرا ہے کیا ؟
ناصر : دُردانہ کے خیال کو دل سے نکال دو
شادی جو ہو رہی ہے کسی طرح ٹال دو
ارجمند : (قہقہہ مار کر) استاد تم کو مان گئے خوب ہے سوال
کیا خوب مجھ سے آئے ہیں چلنے یہ آپ چال
ناصر : تم کو غلط خیال ہے میری نہیں غرض !
ارجمند : اپنا علاج کیجئے دل کا ہے یہ مرض !
حیرت تھی مجھ کو خود بھی کہ آئے ہیں کیوں جناب   مغرب سے کیوں طلوع ہوا آج آفتاب
اتنا تو بیوقوف نہ سمجھیں مجھے جناب   عادی نہیں ہوئی ہے ابھی اس قدر شراب

یہ داؤں پیچ آپ کے سب جانتا ہوں میں   حرفوں کے ہیں بنے تجھے پہچانتا ہوں میں

ارجمند : بس بس بہت ہی سن چکا ان مہملات کو   اپنی گرہ میں باندھ لو تم میری بات کو
شادی اسی سے ہو کے رہے گی وہیں ضرور   پامال کر کے رکھونگا میں آپ کا غرور

راوی : ہوا تقدیر کا لکھا پورا   آخر کار وہ دن آ پہنچا
آج شادی تھی کیوں نہ ہوتی دھوم   مہمانوں کا تھا محل میں ہجوم
رشکِ فردوس تھا محل گویا   گوشہ گوشہ میں جشن تھا برپا
دھوم ہر سمت ہے برات آئی   نغمے برسا رہی ہے شہنائی

(نغمہ)

راوی : ارجمند آئے بن کے یوں نوشہ   سب نے خوش ہو کے واہ واہ کہا
مطربوں کی وہ گونجتی آواز   زمزمہ بار ہر طرف تھے ساز
تھا یہاں زمزموں کا یہ زور   اور ناصر کا تھا حال تھا کچھ اور
دل شکستہ تھا زیست سے بیزار   بیکسی میں نہ تھا کوئی غم خوار
ضبط جب ہو گیا بہت دشوار   حسرتیں گنگنا اٹھیں اک بار

(ناصر کا گانا)

مل کے بچھڑ گئیں ہم سے نظریں آہ مقدر پھوٹ گیا
اُن کے ہاتھوں بن کر آخر دل کا کھلونا ٹوٹ گیا
ہائے کہاں اب بادۂ باقی افسانہ ہے جلوۂ ساقی
کشمکش اندوہِ وفا میں ہاتھ سے ساغر چھوٹ گیا
نغمے چھلکے سب نے دیکھے دل کی کون آواز سنے
کس کے دل کا سہارا ٹوٹا کس کا ساتھی چھوٹ گیا

(منظر — تبدیل ہوتا ہے)

(آگ آگ کا شور بلند ہے)

راوی : شور اٹھا آگ آگ کا ناگاہ   چرخ نیلی ہوا دھوئیں سے سیاہ

(شور جاری رہتا ہے)

ایک کہرام سا مچا ہر سو   گویا محشر سا اٹھا ہو ہر سو
نغمہ و رقص سارے بھول گئے   دفعتاً ہاتھ پاؤں پھول گئے
دیکھتے تھے کھڑے تماشائی   نذر آتش کی شعلہ آرائی

ستارہ : بس جا کر اس کو کوئی بچائے   کوئی دردانہ کو نکال کے لائے
آس کے کس جا کے بجھاؤں آگ   لٹ کے جو گھر بجلا ہے سہاگ

راوی : اس پہ سب غم سے سر بہ سینہ تھے   کیا پڑی تھی کسی کو جان گنوائے
سنی ناصر نے شور کی آواز   اُس کی وارفتگی ہی تھی جانباز
سن کے بھاگا وہ جیسے دیوانہ   شمع کی سمت مثل پروانہ
سامنے تھا اک آتشیں سیلاب   آگ کی موجیں آگ کے گرداب
شعلوں کو چیرتا بڑھتا آگے   جیسے دل میں جوش جرأت تھے
دم کا ساتھ تھا عزم مردانہ   وہیں پہنچا جہاں تھی دردانہ
وہ بچا لایا اس کو آخرکار   وہ تھی بے ہوش اور زار و نزار

(شور)

آگ ادھر بارگاہ تک پہنچی   آگ اب حجلۂ عروس تک پہنچی
ارجمند اور اس کے سب ساتھی   آگ میں گھر چکے تھے باراتی
ناصر اب اس طرف بڑھا یکبار   لایا دولہا کو بھی وہ آخرکار
دیکھ کر اس کی جرأت و ہمت   متحیر تھے خود فلک رفعت
گر پڑا تھک کے ناصر جانباز   تھے مگر اس کے اب سب دمساز

ارجمند : ارے ناصر کو کیا ہوا دیکھو!
فلک رفعت : جلد جلد لا کے ان کو سنبھالو
ناصر : میں ہوں اچھا نہ فکر کچھ کیجئے ——— پہلے دردانہ کی خبر لیجئے!
راوی : بارے دردانہ ہوش میں آئی   ہونٹ کانپے نگاہ تھرائی
دردانہ : ناصر ——— ناصر
فلک رفعت : کیا ہے دردانہ ؟
ارجمند : یہ رہے ناصر

فلک رفعت: محسن خاندان ہیں ناصر   شکر ہے بن کے ہے زبان ناصر

ارجمند: بھائی ناصر مجھے معاف کرو
دل کدورت سے اپنا صاف کرو

ناصر: بھائی ارجمند مجھے شرمندہ نہ کیجیے

ارجمند: نواب صاحب! التجا میری آخری یہ ہے
یہ ہوں نوشہ مری خوشی یہ ہے

فلک رفعت: نواب صاحب سے ع۔ فیصلہ خوب ارجمند کیا
ع۔ ہم نے داماد یہ پسند کیا

ارجمند: آؤ ناصر یہ سہرا مبارک تمہیں

آواز: حق بحقدار رکھنا مبارک تمہیں

آوازیں: مبارک۔ سلامت

(نغمہ)

آوازیں: مبارک جشن شاہانہ
مبارک عقد فرزانہ

(فیڈ آوٹ)

جگر مراد آبادی

یہ ذکر ہے [illegible] کا۔ میں حساب میں کمزور ہوں مگر غالباً چھبیس برس گذرے۔ ایک عمر ہوتی ہے اور [illegible] اس عمر آدمی تو اگر احتیاط سے کام نہ لے تو صاحبِ اولاد تک ہو جاتا ہے۔ بہرحال معاف کیجئے گا یہ [illegible] بات ہے کہ یو پی کے شہر [illegible] میں ایک مشاعرہ تھا ایسا بے ہودہ مشاعرہ کہ [illegible] تھوڑی دیر [illegible] مشاعرہ اونگھتا رہا۔ میں نے [illegible] کہ شاعر کی آواز چونکہ [illegible] آواز معلوم ہوتی تھی [illegible] ہو جائے۔ میں بھی ایک طرف بیٹھا اونگھ رہا سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ یکایک طوفان آگیا۔ سب [illegible] بڑی حیرت [illegible] پڑا اور اب جو دیکھا ہوں تو ایک صاحب جن کا چہرہ غائب تھا شمع کے سامنے بیٹھے [illegible] رہے تھے۔ چہرہ غائب یوں تھا کہ سر کے تمام بال اپنی تمام ژولیدگی کے ساتھ اس طرح داڑھی سے الجھے ہوئے تھے گویا یہ ایک مسلسل داڑھی ہے جو سر سے شروع ہو کر منہ چہرے کو چھپاتی ہوئی گردن تک آئی تھی اور یہ داڑھی سیاہ [illegible] ٹوپی سے نکلی تھی جو ان صاحب کے سر پر نہایت بے ڈھنگے پن سے رکھی ہوئی تھی۔ گھسی سی شیروانی جس کے دامن [illegible] ہوئے۔ شیروانی سے قمیص جس کے رنگ کا صحیح اندازہ ناممکن تھا۔ چوڑی دار پاجامہ جو کسی زمانے میں غالباً سفید ہوگا اور اس وضع قطع کے ساتھ یہ صاحب غزل پڑھ رہے تھے۔ آواز ایسی کہ روح اس کی کھنک محسوس کرے اور کلام ایسا کہ اس مشاعرے کے سامعین جو داد دینے میں متانت کی حدود سے گذرتے ہوئے نظر آ رہے تھے خود بے تاب ہونے لگے۔ میں جس وقت ہوش میں آیا ہوں اس فضا پر یہ شعر برس رہا تھا ؎

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں زاہد
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

کتاب اٹھا۔ شباب اٹھا۔ شراب اٹھا ایسی زمین نہیں ہے کہ اس کو اس آسانی کے ساتھ آسمان بنایا جا سکے مگر یہاں تو عالم یہ تھا کہ ایک سے ایک ڈھلا ہوا شعر سماعت میں کھنک رہا تھا۔ ابھی اس شعر پر جھوم ہی رہے تھے کہ شاعر نے جھوم کر دوسرا شعر پڑھا ؎

مجھے اٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں
جو اٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اٹھا

اور پھر یہ شعر —

نشانِ منزلِ جذبِ تمام چھپ نہ سکا
اِدھر فنا ہُوا قطرہ اُدھر حباب اُٹھا

اور آخر میں مقطع —

کہاں یہ بار کہاں پاسِ نازکِ جاناں
اُٹھا سر، او جگر خانماں خراب اُٹھا

یہ تھے جگر۔ وہ جگر مراد آبادی جن کی دھوم سن چکے تھے اور ملاقات آج اس طرح ہوئی کہ جب آپ غزل پڑھ چکے اور چہرے پر چھائے ہوئے بال چہرے سے ہٹا کر اپنی سیاہ فر کی ٹوپی کے نیچے دباتے ہوئے آپ اپنی جگہ پر آکر بیٹھے تو بہت سے داد دینے والوں میں ایک میں بھی تھا۔ مین پوری کے صرف شاعر ترجمتی سرن شاد نے تعارف کرایا اور جگر صاحب بہت جلد تعارف کی رسموں سے گذر کر بے تکلف ہو گئے پان کی وہ گلوری جو خود کھانا چاہتے تھے مجھے دے دی اور قوام کھلانے کا وعدہ کر کے ایک صاحب کو اپنے ارد گرد ڈھونڈنے لگے جن کے پاس قوام کی شیشی دیکھ چکے تھے۔ اور پھر یہ اصرار کہ یہ شیشی آپ ہی رکھ لیں حالانکہ وہ شیشی خود آپ کی بھی نہیں بلکہ آپ کے ایک دوست کی تھی۔

مین پوری میں قیام کا ارادہ بالکل نہ تھا مگر جگر صاحب نے زبردستی ایک ہفتے تک اُسی گھر میں مہمان رکھا جہاں خود مہمان تھے اور مارے خلوص کے اپنے میزبان کو طاق پر بٹھا کر خود ان کی اور اپنے دوسرے مہمانوں کی مدارات میں مصروف ہو گئے۔ مین پوری میں جگر صاحب اُس زمانے میں منشی اصغر حسین صاحب اصغر مختار کے یہاں اپنا ہیڈ کوارٹر بنائے ہوئے تھے۔ فرخ آباد چلے گئے، اٹاوہ چلے گئے یا جہاں بھی کوئی پکڑ لے گیا چلے گئے، اور پھر اصغر صاحب کے یہاں واپس آگئے معلوم نہیں اصغر صاحب سے یہ تعلق حضرت اصغر گونڈوی کے ہم نام ہونے کی وجہ سے تھا یا جگر صاحب کی قسمت ہی میں محبت کرنے کے لیے ہر قسم کے اصغر لکھے ہوئے تھے مگر اصغر کی یہ مین پوری والی قسم بھی واقعی محبت کرنے کے قابل ایک چیز تھی سفید داڑھی اور لمبے قد کا یہ بھولا بھالا آدمی اپنی شخصیت میں اس قدر محبوبیت رکھتا تھا کہ اس "بزرگ بچے" کو دیکھ کر خواہ مخواہ پیار آتا تھا پھر جگر صاحب کو تو ان کے گھر پر ایسا اقتدار حاصل تھا کہ واقعی خود صاحبِ خانہ جگر صاحب ہی کے مہمان نظر آتے تھے۔ میرے لیے ایک نزاکت یہ بھی تھی کہ اس مین پوری کو میری سسرال کی حیثیت بھی حاصل تھی میرے خسر صاحب محترم حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب مرحوم و مغفور اس زمانے میں بھی بسلسلۂ ملازمت موجود تھے اور ملازمت کے علاوہ ایک مستقل حیثیت اُن کو یہ حاصل تھی کہ مین پوری کے مشاعروں کی صدارت کا گویا آپ ہی کے پاس ٹھیکہ تھا۔ ان کی موجودگی میں جگر صاحب کا مہمان بن کر رہنا ظاہر ہے کہ عجیب سی بات تھی مگر خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے خسر صاحب کو ان کو سوائے اس بات کے کوئی اعتراض نہ ہُوا کہ جگر کی صحبت بہرحال ایک رند کی صحبت تھی اور باوجود ضبط کرنے کے اتنا تو کہہ ہی دیا کہ "بھئی یہ جگر کمبخت شراب بہت پیتا ہے بس یہی نہایت لغو بات ہے اس میں" مطلب یہ تھا کہ اس لغویت سے دُور ہی رہنا چاہیئے۔ مگر داماد ہو تو ایسا سعادت مند کہ خود ان کے سایۂ رحمت سے زیادہ سے زیادہ دور اور اس لغویت سے قریب تر رہ کر ایک ہفتے کے بعد جگر کو اپنی روح پر طاری کئے اور ان ہی کے شعر گنگناتے مین پوری سے لکھنؤ واپس آگئے۔

دو ہفتے کے بعد پتہ چلا کہ جب [illegible] گئے اور یہ معلوم ہوا کہ جگر صاحب بھی موجود ہیں یہ جگر صاحب کے پاس پہنچا [illegible] آخر جا کر میرا سامان [illegible] کہ [illegible] اگر [illegible] شروع کر دی۔ مگر [illegible] میں صرف ایک [illegible] مشاعرہ [illegible] صاحب [illegible] کے [illegible] شوکت سے [illegible] ۔ میرا اور جگر صاحب کا [illegible] ایسی حالت [illegible] جگر صاحب [illegible] چلے جاتے۔ [illegible] کسی کا [illegible] تیسری بات ان کی حالت نازک ہو گئی۔ [illegible] شراب کے [illegible] وقت [illegible] ۔ [illegible] حضرت کا عالم [illegible] اگر شراب پیتے پیتے [illegible] مطلب [illegible] جگر صاحب کا [illegible] عالم [illegible] یہ تو ہرگز گوارا کر ہی نہیں سکتا کہ بھائی ہیں جہاں [illegible] صاحب۔ یہ شوق پیدا کرنے [illegible] ہماری [illegible] دونوں [illegible] جگر [illegible] ان دونوں کے علاوہ اور بھی بہت آدمی جمع ہو گئے مگر جب وجہ بتائی [illegible] کہ اپنی معصومیت کا خود بھی قائل ہونا پڑا۔

انجمن معین الادب لکھنؤ کا ایک سالانہ مشاعرہ تھا مجھے ہوا کہ جس طرح بھی ہو جگر مراد آبادی کو اس مشاعرے میں ضرور شریک کیا جائے مگر جگر جیسے کہاں؟ نہ ان کا کہیں پتہ نہ نشان۔ پتہ تو اس کا ہوتا ہے جس کا کہیں گھر ہو اور جگر اس زمانے میں خانہ بدوشی کی بلکہ مستانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ طے یہ کیا گیا یہ کام شوکت تھانوی اور اس زمانے کے شاعروں کے چودھری مولانا وصل بلگرامی مرحوم کر سکتے ہیں چنانچہ ہم دونوں انھیں ڈھونڈنے نکلے۔ مین پوری میں ڈھونڈھا۔ آگرہ میں ہر میخانہ چھان مارا اور ملے آپ کہاں فرخ آباد میں وہ بھی اس حالت میں کہ نہ ان کو اپنا ہوش تھا نہ اپنا۔ اسی حالت میں ان کو لے کر لکھنؤ روانہ ہو گئے اس لیے کہ اب وقت اتنا کم رہ گیا تھا کہ بمشکل مشاعرے کے وقت پر لکھنؤ پہنچ سکتے۔ اب مصیبت یہ تھی معین الادب کا یہ مشاعرہ طرحی تھا اور نہایت سختی سے اس ضابطہ کی پابندی ہو رہی تھی کہ خواہ کوئی بھی ہو کسی سے غیر طرحی کلام نہ سنا جائے گا۔ ادھر ان حضرت کا عالم یہ کہ شعر کہنا کیا معنی یہ بات بھی ڈھنگ سے نہ کر سکتے تھے۔ خدا خدا کر کے کانپور کے اسٹیشن پر آپ نے پوچھا کہ میں کہاں ہوں اور جب آپ کو بتایا گیا کہ آپ لکھنؤ جا رہے ہیں

بمشکل تمام آپ سمجھ سکے کہ واقعہ کیا ہے۔ موقع غنیمت جان کر وصل صاحب نے اور میں نے ان سے طرح میں کچھ کہنے کی خواہش کی اور آخر مشاعرے تک پہنچتے پہنچتے دو شعر آپ نے کہہ دیے جو آج تک مجھے یاد ہیں —

تھا عشق میں جو کچھ بھی تھا اک عالمِ دل تھا   اس ذرے میں دریا تھا اس قطرے میں ساحل تھا
خوشا وہ دور جب آغازِ دردِ عشق کامل تھا   مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں ہوتا ہے مائل تھا

اور یہ واقعہ ہے کہ یہی دو شعر حاصلِ مشاعرہ تھے۔ جگر اس خود فراموشی کے زمانے میں بھی عالم یہ تھا کہ مشاعرے کے لیے غزل کہی ہے کہ کوئی صاحب جن کو کسی حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے کہ شاعری ضرور کرو خواہ کہہ سکو یا نہ کہہ سکو تشریف لے آئے اور چپکے سے کہہ دیا کہ طرح میں فکر نہیں کر سکا آپ نے اپنی غزل ان کے سامنے رکھ دی وہ سنبھال لے گئے۔ کوئی اور صاحب اسی قسم کے آئے وہ بھی ایک آدھ شعر لے بھاگے کسی کو کوئی مطلع پسند آگیا وہ لے گئے اور [illegible] ان کے حصے میں مقطع رہ گیا۔ میں اس بات پر بہت جز بز ہوتا تھا اور اکثر فوجداری کی نوبت آگئی۔ مگر اس معاملہ میں مجھ سے چوریاں ہونے لگیں مگر یہ سلسلہ جاری رہا اور اب بھی جاری ہے حالانکہ ان سے پوچھئے تو نہایت برہمی کے ساتھ انکار کر جائیں گے۔

اردو کے اس حافظ نے ہندوستان ہی میں اپنے لیے شیراز بھی تلاش کر لیا تھا۔ اپنے بے تکلف دوست کو شیراز کی سیر کرانے لے جاتے۔ جہاں جاتے تھے جذبۂ پرستش لے کر مگر واپس آتے تھے مسرور بن کر۔ اس شیراز کا نام آپ بھی ٹھہری۔ کہا تھا اور صاحبانِ طرب سے تعلقات اس قسم کے تھے کہ خود تو کبھی موسیٰ بنے نہ ان حضور کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ کلیم کی تاب نظر لا سکے۔ معلوم نہیں اسے کلیم سے دلچسپی تھی یا کلام سے بہرحال جگر صاحب کی حیثیت میرے نزدیک صرف آنریری مجسٹریٹ کی تھی۔

اب تو اللہ رکھے جگر صاحب گھر گرہست ہو گئے ہیں۔ سخت جان ایسے کہ شراب پی پی کر شراب نے ان کو پیا آخر شراب ان سے چھوٹی اور یہ شراب سے مدت سے پیتے نہیں مگر عارفانہ رندانہ ادائیں آج بھی موجود ہیں۔ بچوں کا سا معصوم دل جس سے کہیے ذرا سی بات پر لڑوا دیں مگر لڑا کر ہی۔ دشمنی نہیں جانتے جس سے لڑتے ہیں اسی کو مناتے بھی خود ہیں۔ سب کہتے ہیں جگر بہت بڑا شاعر ہے مگر میں کہتا ہوں جگر بہت بڑا انسان ہے اور شاعری اس کی شخصیت کا صرف ایک جزو۔

ڈاکٹر صاحب

(صبح: ٹرین کی آواز کچھ دیر کے بعد [illegible] پڑھنے میں مشغول
[illegible] غائب آتی ہے)

ریاض: خالد خالد! خوش ہو۔ اسٹیشن آ رہا ہے سنبھل جاؤ۔

خالد: (انگڑائی لیتے ہوئے) کیا ہوا۔

ریاض: [illegible] ہوگا کچھ نہیں ذرا سامان درست کرو گاڑی صرف ایک منٹ ٹھہرتی ہے۔

خالد: تو یہ کہو نا۔ لو میں بستر لپیٹ لیتا ہوں۔

ریاض: ذرا دیکھنا ادھر میرا سوٹ کیس تو نہیں، ادھر ٹھیک ہے۔

خالد: نہیں ادھر تو میرا سوٹ کیس ہے۔ ارے! یہ کیا۔ یہاں تو نہ میرا سوٹ کیس ہے نہ تمہارا۔

ریاض: یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ذرا آگے بڑھ کر دیکھو۔

خالد: نہ کوئی سوٹ کیس ہے نہ میرا ہینڈ بیگ۔ یہ تو بڑا غضب ہوا۔ دیکھو نا کسی اور برتھ کے نیچے۔

ریاض: کیا فائدہ اب دیکھنے سے ظاہر ہے کہ دونوں غافل سو رہے تھے کسی نے ہاتھ صاف کر دیا۔

خالد: مگر اب ہوگا کیا۔ اس پردیس میں میرے پاس نہ تو پہننے کو کپڑے ہیں نہ جیب میں دھیلا۔

ریاض: گویا میرے پاس سب کچھ ہے۔ شامت کی مار گھڑی اور پیسوں کا پرس بھی بیٹھتے وقت سوٹ کیس میں رکھ دیا تھا۔

(ٹرین آہستہ ہوتی ہے)

خالد: غالباً اسٹیشن آگیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مرے بے موت۔

ریاض: اور ٹکٹ؟ ٹکٹ بھی تو پرس ہی میں تھا۔

خالد: مانگنا پڑی بھیک برادرم۔ بہرحال اللہ مالک ہے۔

(ٹرین ٹھہرتی ہے کچھ اسٹیشن کی چہل پہل)

ریاض : مگر یہ حرکت کیا کی ہے تم نے ایک تو سفر میں لٹ گئے دوسرے تم نے جو نجانے کس کا [illegible] آخر یہ ہینڈ بیگ ہے کس کا۔

خالد : تو بھلا مجھے کیا معلوم کس کا ہے میں نے تو بس ٹرین سے اترتے وقت یونہی اٹھا لیا تھا کہ جب اتنا سامان گیا ہے تو ہم کیا ایک ہینڈ بیگ بھی نہ اٹھائیں۔ خیال یہ تھا کہ کچھ نہ کچھ تو نکلے ہی گا اس میں سے۔

ریاض : اس میں سے نکلے گا گرفتاری کا وارنٹ۔ دیکھ لینا اگلے ہی اسٹیشن سے ہینڈ بیگ کا مالک ٹیلیفون کرے گا تار کھڑکائے گا اور ہم یہاں اس ہینڈ بیگ کے دھر لیے جائیں گے۔

خالد : دھر لیے تو جب جائیں گے کہ یہ سوٹ کیس میرا مطلب یہ ہے کہ یہ ہینڈ بیگ ہمارے پاس سے برآمد کر لیا جائے۔ ہم تو اس کو ابھی سامان نکالنے کے بعد پھینکے دیتے ہیں کسی طرف۔ کچھ نہ کچھ تو اس میں نکلے ہی گا۔ ایسا بھی کیا۔ جو ایسا شاندار ہینڈ بیگ رکھ سکتا ہے وہ تھوڑا بہت تو رکھتا ہی ہوگا۔

ریاض : خدا کے لیے جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آنے ہی والی ہے شامت ہماری اسی ویٹنگ روم میں۔

خالد : دل کو مضبوط رکھو۔ اور چوروں والی گھبراہٹ خواہ مخواہ اپنے اوپر طاری نہ کرو۔

ریاض : اچھا تو تم غسل خانے میں یہ ہینڈ بیگ لے جا کر دیکھ بھال لو۔ میرا تو خون خشک ہوا جاتا ہے۔

خالد : خواہ مخواہ بھی، جتنا ہم اپنے کو چھپانے کی کوشش کریں گے اتنے ہی مشکوک سمجھے جائیں گے۔ یہیں کھولے لیتے ہیں ہینڈ بیگ (ہینڈ بیگ کھول کر) یہ کیا۔ یہ تو کسی ڈاکٹر کا بیگ معلوم ہوتا ہے یہ دیکھو اسٹیتھسکوپ (STHETHIS COPE) ہے ڈاکٹر کا ہینڈ بیگ تو ہے ہی، یہ دیکھو، انجکشن دینے کا سامان البتہ کچھ ہے۔

ریاض : چھوڑ اسے جی یہ بلڈ پریشر دیکھنے کا آلہ ہے۔ باقی یہ سب دواؤں کی ڈبیاں اور شیشیاں ہیں۔ کچھ نہیں ہے اس میں دفع کرو۔

خالد : ٹھہر تو جاؤ شاید ڈاکٹر صاحب کی ایک آدھ فیس بھی نکل آئے۔ یہ کیا ہے غالباً پرس۔

ریاض : جی نہیں نشتر دینے کے چاقوؤں کا پاکٹ سٹ ہے۔ لے یہ دیکھو۔

(ایک دم ویٹنگ روم کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک صاحب داخل ہوتے ہوئے کہتے ہیں)

محمود : وہی مثل کہ جہاں جائیے بھوکا وہیں پڑے سوکھا۔ روز یہ ٹرین لیٹ ہوا کرتی تھی آج ہی اس کو ٹھیک وقت پر آنا تھا تاکہ مجھے نہ مل سکے۔ کیوں صاحب معاف کیجیے گا۔ آپ کو کچھ پتہ ہے کہ دوسری ٹرین اب کس وقت چلے گی۔

ریاض : جی ہاں۔ یعنی جی نہیں ہم کو کچھ پتہ نہیں۔

خالد: کس جانب جانے والی ٹرین کے متعلق آپ پوچھ رہے ہیں۔

محمود: کسی طرف جانے والی ہو۔ ملتان جانے والی مل جائے تو ادھر چلا جاؤں، وہ پور جانے والی مل جائے تو ادھر چلا جاؤں۔ مگر آج ہی کسی نہ کسی شہر تک پہنچنا ہے۔ اس پر تھوڑی دیر پہلے پہنچ جاتا اور مجھ کو گاڑی مل جاتی۔ کاش میں کامیاب ہو جاتا... یہ کیا؟ یہ آپ کا سامان ہے؟

ریاض: جی نہیں، خدا کے لیے میرا سامان نہیں ہے۔ میں تو آپ سے بالکل یہ کہنے کو تھا کہ اٹھا دو یہ سامان۔

محمود: تو پھر یہ سامان آپ کا ہوگا۔ آپ ڈاکٹر ہیں۔ یہ صندوق ڈاکٹری کا سب اسباب ہے۔ بے شک آپ ڈاکٹر ضرور ہیں۔ کہیں وہ بھی جاتے۔ ڈاکٹر صاحب مجھ کو گاڑی نہ ملی۔ میں اس وقت ڈاکٹر کو لینے ملتان یا وہ پور جانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میری بچی اس وقت موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ میری زندگی کی کمائی صرف یہی لڑکی ہے۔ خدا کے لیے اس کو بچائیے۔

خالد: یہ تو درست ہے مگر بندہ نواز۔

محمود: اب اگر مگر کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب، آپ مجھ کو خرید لیں گے اگر اس وقت میرے ساتھ چلے چلیں۔ میں زندگی بھر آپ کا غلام رہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب بس اب چلیے، ہاں آئیے میرے ساتھ۔

خالد: خدا را بات تو سن لیجیے۔

محمود: بات میں سن لوں گا مگر پہلے آپ چلے چلیے۔ آپ کی جو فیس ہو اس سے دوگنی لیجیے چاہے تگنی لیجیے ڈاکٹر صاحب میری بچی کو چل کر بچا لیجیے۔ خیر بچانے والا تو خدا ہے مگر اسی خدا نے آپ کو رحمت کا فرشتہ بنا کر یہاں بھیجا تھا۔ مجھ کو ڈاکٹر کی تلاش تھی۔ آپ مجھ کو مل گئے ہیں۔ اس کو اتفاق نہیں کہنا بلکہ یہ قدرت کا انتظام تھا اور اب میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ میری بچی بچ جائے گی اور آپ ہی کے علاج سے بچے گی۔ لائیے یہ ہینڈ بیگ مجھے دیجیے۔ یہ بستر بھی میں ہی لاد کے لیتا ہوں۔

ریاض: نہیں صاحب یہ رہنے دیجیے میں خود اٹھاؤں گا۔

محمود: اب آپ بھی کچھ نہ کہیے ذرا جلدی کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ میرا تانگہ واپس لوٹ جائے۔ بس آ ہی جائیے۔ وہ ابھی موجود ہوگا۔ لائیے نا یہ بستر میں ہی لیے لیتا ہوں۔

خالد: جی نہیں ٹھیک ہے اسی کو لانے دیجیے مگر اس کمبخت نے اپنا ٹکٹ تک کہیں پھینک دیا ہے۔

محمود: وہ سب ٹھیک ہے کوئی نہیں پوچھتا آپ سے ٹکٹ۔ آئیے باہر میں ذمہ دار ہوں۔ خدا نے آپ کو واقعی رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔

(موسیقی)

محمود: دیکھو ذرا جلدی سے پردہ کرا دو۔ ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ آپ آ جائیے ڈاکٹر صاحب پردہ خود ہی ہو جائے گا ادھر تشریف لائیے۔ اس کمرے میں۔ یہ دیکھیے ڈاکٹر صاحب۔ آپ تشریف تو رکھیے۔ اور آپ بھی بیٹھ جائیے

ڈاکٹر صاحب یہ میری بچی ہے۔ آج چوتھا دن ہے بخار کو۔ اور آج تو اس نے صبح سے آنکھ ہی نہیں کھولی ہے بالکل بے ہوش ہے۔ نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہی میری ایک بچی ہے ہم میاں بیوی اسی کو دیکھ دیکھ کر جی رہے ہیں۔

خالد : آپ گھبرائیے نہیں ذرا برف۔ مگر برف یہاں کہاں۔ کسی گھڑے کا باسی پانی منگائیے اور دو تین جھاڑن یا تولیے۔

محمود : ابھی لیجئے۔ (جاتا ہے)

ریاض : خدا جانے تم اب اور کیا گل کھلانے والے ہو۔

خالد : شش۔ دیوار گوش دارد۔ انشاء اللہ یہ لڑکی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ ذرا بیگ مجھے اٹھا دو۔

محمود : (آتے ہوئے) یہ لیجئے ڈاکٹر صاحب پانی اور یہ جھاڑن۔

خالد : دیکھو کمپاؤنڈر تم یہ جھاڑن اس پانی میں تر کر کے مریضہ کے سر پہ رکھو۔

ریاض : کیا مجھ سے کہا۔

خالد : تم پہ سفر کی اتنی تھکن ہے کہ دماغ ہی حاضر نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ جھاڑن پانی میں تر کر کے مریضہ کے سر پہ مسلسل رکھتے رہو۔ اور دیکھیے صاحب آپ تھوڑا سا پانی گرم کرائیے۔ باقاعدہ ابلوائیے پانی۔

محمود : ابھی لیجئے۔ ارے بھئی ذرا پانی جوش کراؤ جلدی سے اور چائے کے لیے بھی پانی رکھواؤ۔ بلکہ میں خود جاتا ہوں ابھی، پانی ابھی حاضر ہوا۔ (جاتا ہے)

ریاض : یعنی میں کمپاؤنڈر بھی ہو گیا۔

محمود : (لوٹتے ہوئے) جی مجھ سے کچھ فرمایا۔

خالد : جی نہیں آپ تشریف لے جائیے۔ میں کمپاؤنڈر سے بات کر رہا تھا (وقفہ) تم سے کچھ دیر چپ نہیں رہا جا سکتا۔

ریاض : مگر میں کہتا ہوں کوئی الٹی سیدھی بات نہ ہو جائے کہ دھر لیے جائیں۔

خالد : دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔ ذرا کھولو یہ بیگ۔ وہ انجکشن کے سیٹ کی ڈبیا کہاں ہے۔ ہاں یہ رہی۔

ریاض : خدا کے لیے اب کوئی انجکشن نہ دے بیٹھنا۔ (محمود آتا ہے)

محمود : بس ابھی ابلا جاتا ہے پانی ڈاکٹر صاحب۔ اس کی حالت کچھ بہت خطرناک تو نہیں ہے۔

خالد : مرض بڑھ تو چکا ہے مگر خدا کی ذات سے امید ہے کہ فائدہ ہوگا اور مریضہ ٹھیک ہو جائیگی۔ آپ یہ انجکشن کی پچکاری ابلتے ہوئے پانی میں رکھ دیجئے اور پھر وہ پانی یوں ہی اٹھا لائیے۔

محمود : ابھی لیجئے۔ اب تو شاید ابل رہا ہوگا پانی۔ (جاتا ہے)

خالد : (ہینڈ بیگ میں کھڑ بڑ کر کے ٹٹولتے ہوئے) نہ جانے کیا کیا آخر بھرا ہوا ہے اس میں۔

[illegible] خطرناک ہے۔ جب [illegible] مرتبہ کسی پیسے کے بچے نہ [illegible] جائیں۔
اض: [illegible] جلسہ وغیرہ رہا [illegible] ہیں۔ [illegible] ہے۔ ان [illegible]
[illegible] صاحب ڈالڈا [illegible]
یہی تو پچھلا جلسہ خود سب نے [illegible] تھا۔
[illegible] مجھے [illegible]۔
مو: [illegible]
[illegible] ہو گا۔
الد: شکریہ۔ بس اب [illegible]
حمود: اچھا آپ کی [illegible]
خالد: [illegible] دیجیے۔ جی ہاں۔ [illegible] تھوڑی سی اور بس ٹھیک ہے [illegible]
[illegible]
[illegible]

محمود: یہی [illegible]
خالد: جی ہاں یہی ٹھیک۔ وہ [illegible] تھوڑی
جائیں۔ [illegible] اور جب بچے ٹھنڈے ہونے لگیں [illegible]
تھوڑی دیر کے بعد۔ یہ سیاہ ہو جائیں گے [illegible]
عمل ختم کر دیجیے۔

محمود: بہت بہتر ہے۔ اب آپ لوگ [illegible] ٹھیک کر دے۔

خالد: جی ہاں۔ آپ بھی [illegible] اطمینان رکھیے ہمارا انشاءاللہ کچھ نہ بگڑے گا۔

محمود: انشاءاللہ۔ بہرحال تشریف رکھیے۔ [illegible] مجھے دیجیے یہ ہینڈ بیگ۔ آپ کے [illegible]
ہے۔ تشریف رکھیے۔ ادھر آئیے یہ آپ کا کمرہ۔ یہ ملا ہوا غسل خانہ ہے۔ ضرورت کی ہر چیز موجود ہے
اور جس چیز کی ضرورت ہو فرما دیجیے۔ اور چائے تو پہلے ہی سے [illegible] ہوئی ہے۔

خالد: بس شکریہ اب آپ تشریف لے جائیں۔ ہم لوگ خود چائے پی لیں گے دیکھیے آپ وہ سوڈے کے چند
منگوا کر پاشویہ کرائیے۔

محمود: بہت اچھا۔ خدا حافظ (جاتا ہے)

خالد: بناؤ ریاض چائے بناؤ۔ سخت تھکن ہے چائے پی کر جان میں جان آئے گی۔

ریاض: تم کو جان میں جان آنے کی امید ہے اور تمھاری حرکتوں سے میری جان نکل جا رہی ہے کہ نہ جانے تم کیسے
والے کیا ہو۔

خالد: تو آخر میں کیا کروں تم ہی بتاؤ۔ کوئی اپنی خوشی سے تو میں پھنسا نہیں ہوں اس خطرے میں۔

ریاض: خوشی سے تو نہیں پھنسے ہو۔ مگر اپنے لیے خطروں میں اضافے پر اضافہ جو کرتے جا رہے ہو۔ اول یہ کہ اس

نامراد ہینڈ بیگ کو اُٹھانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ خیر فرض کر لیجئے کہ یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ تو اب ڈاکٹر ہی بن بیٹھے سچ مچ۔

خالد : کون بن بیٹھا ہے! بخدا مجھ کو زبردستی ڈاکٹر بنایا گیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیسے کہہ دیتا کہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ اور یہ ڈاکٹری کا سامان چوری کا ہے۔

ریاض : خیر یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ اور مجبوراً ڈاکٹر بننا بھی پڑا تھا۔ تو یہ آپ سے کس نے کہا تھا کہ آپ انجکشن دینا بھی شروع کر دیں اور جو یہ لڑکی مر وَر گئی تو۔

خالد : جس کی موت آتی ہے وہ سچ مچ کے ڈاکٹر کی دوا سے بھی مر جاتا ہے اگر دعویٰ ہی کیا ہے تو ڈاکٹری کا کیا ہے خدائی کا تو نہیں کیا ہے۔

ریاض : اب تک تو صرف یہ دھڑکا تھا کہ ہینڈ بیگ کی چوری کے سلسلے میں پولیس آتی ہی ہوگی گرفتار کرنے اب دیکھ لینا یہ ہوگا کہ مرے گی یہ لونڈیا اور یہ جو اس کا باپ ہے بندھوائے گا ہم دونوں کو۔

خالد : خیر مرتی نہیں وہ اس کا ذمہ تو میں لیتا ہوں۔ میں نے صحیح انجکشن دیا ہے۔ بھئی میں تم کو کیسے یقین دلاؤں اسی انجکشن سے میرا بخار اُترا تھا۔ مگر ایک بات بتاؤ کہ ایسی خوبصورت لڑکی اگر واقعی مر گئی تو خود تم کو افسوس نہ ہوگا۔

ریاض : اللہ رے اطمینان۔ یعنی آپ نے اُس کی خوبصورتی بھی تاڑ لی۔ یہاں کس کافر کو گھبراہٹ کی وجہ سے یہ خیال بھی آیا ہو کہ اس لڑکی کی صورت شکل بھی دیکھنا چاہیے۔

خالد : یہی مجھ میں تم میں فرق ہے تم گھبراتے زیادہ ہو حالانکہ خطرے میں زیادہ مبتلا میں ہوں۔ اس لیے کہ اگر پولیس وغیرہ کی تحقیقات کی نوبت آئی تو تم کھٹ سے کہہ دو گے کہ سب کچھ کیا دھرا اس شخص کا ہے بلکہ تم تو ویٹنگ روم ہی میں کہنے والے تھے ان حضرت سے۔

ریاض : جھوٹ کیوں کہوں میں سمجھا تھا کہ یہ پولیس کا آدمی ہے۔

خالد : آپ کی اسی سمجھداری کا تو ماتم ہے۔ خیر چائے تو بناؤ ٹھنڈی ہو جائے گی۔

ریاض : (چائے انڈیلتے ہوئے) بخدا میرا دل دھڑک رہا ہے۔ کہ نہ جانے تم نے کس دوا کا انجکشن دے دیا ہے! اور ابھی آتی ہے یہ خبر کہ وہ چھوکری چل بسی۔ لو پیو چائے۔

خالد : چائے پی کر تھوڑی دیر سو لو گے تو دماغ کا یہ بار ہلکا ہو جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے مزاج میں اس قدر وحشت ہے۔

ریاض : میں تو بھائی صاحب سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے تو دو گیارہ ہو جاؤں۔

خالد : خدا تمہیں جیتا رکھے اگر یہ احسان کر جاؤ تو کیا کہنا ہے۔ میں صاف بچ جاؤں گا۔ اس لیے کہ مفرور ہی جرم کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ شاید جناب کو یہ نہیں معلوم کہ فرار اقبالِ جرم کا دوسرا نام ہے۔

ریاض: بہرحال مجھے گھسا کر تم اپنے ساتھ مجھ کو پھنسوا کر رہو گے۔

خالد: جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔ مگر میں اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ ایسی حسین لڑکی کو واقعی مرنا ہرگز نہ چاہئے۔ حالانکہ بیچاری بیمار ہے۔ مگر پھر بھی سبحان اللہ، بہرحال تھوڑی دیر سو رہو۔ غالباً دو بج رہے ہیں۔

ریاض: دو؟ ——— دماغ خراب ہے چار سے کم نہ ہوں گے۔ ڈیڑھ بجے تو ہم ٹرین سے اترے تھے۔

خالد: خیر چار ہی سہی اب کون بے وقت جگائے۔ مطلب یہ ہے کہ سو جانا چاہئے۔ اچھا بھئی شب بخیر۔

(خاموشی۔ گھڑی کی مسلسل ٹک ٹک۔ کچھ وقفے کے
بعد دروازے پر دستک)

خالد: (انگڑائی لے کر) کون ہے۔ آ جائیے اندر۔

محمود: (آتے ہوئے) معاف کیجئے گا شاید میں نے آپ کو جگا دیا۔ دن چڑھ آیا تھا۔ میں نے کہا ناشتہ میں دیر نہ ہو۔

خالد: پہلے مریضہ کا حال بتائیے۔

محمود: اس کا حال مجھ سے نہ پوچھئے۔ اس بستی کے ایک ایک آدمی سے پوچھئے۔ ساری بستی میں اس وقت آپ ہی کی مسیحائی کے چرچے ہیں میرے گھر میں تو سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا ڈاکٹر صاحب۔ میری رضیہ اس وقت ہوشیار ہے بخار بھی میرے خیال میں نہیں ہے اور وہ ماشاءاللہ بالکل ہشاش ہے۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

ریاض: (انگڑائی لیتے ہوئے) السلام علیکم۔

محمود: آئیے کمپونڈر صاحب دن چڑھ آیا ہے ہاتھ منہ دھو لیجئے۔ ناشتہ تیار ہے۔

خالد: میں ناشتے سے قبل رضیہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔

محمود: تو آپ تشریف لے چلئے ناشتہ بھی تو وہیں ہو گا۔ ڈاکٹر صاحب میری رضیہ کو بچا کر آپ نے مجھ کو خرید لیا ہے۔ زندگی بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھول سکتا۔

ریاض: یعنی۔ وہ گویا ٹھیک ہیں اب۔

خالد: ہاں بخار اتر گیا ہے اور وہ ہوشیار ہیں آپ نے کچھ کھانے کو بھی دیا ان کو۔

محمود: جی ابھی تو نہیں آپ سے پوچھے بغیر کیسے دیتا۔

خالد: بہرحال چلئے میں خود دیکھ کر کچھ تجویز کروں گا۔

محمود: تو پھر تشریف لائیے۔

ریاض: ابھی حاضر ہوا ذرا منہ دھو لیتا۔

محمود: جی ہاں شوق سے۔ وہ رہا غسل خانہ وہیں تولیہ بھی ہے صابن بھی۔ منجن بھی۔

خالد: اچھا تو تم آؤ میں چل رہا ہوں۔ تشریف لائیے صاحب۔

محمود: اسی دروازہ سے نکل چلیے۔ ارے بھئی ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ تشریف لائیے نا اپنے مریضوں سے کون پردہ کرتا ہے۔ رضیہ تمھارے ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں جنھوں نے تم کو بچا لیا ہے۔

خالد: کہیے صاحب کیا حال ہے آپ کا۔

رضیہ: اچھی ہوں بالکل۔

خالد: کچھ سر میں درد ورد۔ کچھ بیماری کا اثر وغیرہ۔

رضیہ: جی کچھ بھی نہیں ہے بس بھوک کی شدت ہے۔

خالد: ابھی لیجیے۔ کھانے کو جی چاہتا ہے کوئی میٹھی چیز یا چٹپٹی چیز۔ بلکہ ٹھہریے ناشتہ آ جانے دیجیے آپ کے ساتھ ہم سب ناشتہ کریں گے۔ آئیے ریاض صاحب دیکھیے میری مریضہ کو جس پر آپ سب جیا رہنے کی تہمت رکھ رہے تھے۔ رضیہ صاحبہ یہ ہیں میرے کمپاؤنڈر ریاض صاحب ان بچارے نے بھی رات آپ کے لیے بڑی محنت کی ہے۔

ریاض: حیرت ہو رہی ہے آپ کو اس قدر جلد تندرست دیکھ کر۔

محمود: مجھے بالکل حیرت نہیں۔ مجھے تو اسی وقت رضیہ کی صحت کا یقین ہو گیا تھا جب عین مایوسی کے عالم میں آپ لوگ اچانک ویٹنگ روم میں مل گئے۔ یہ سب خدا کی طرف کے انتظام تھے۔ (آواز دے کر) ارے بھئی ناشتہ لاؤ نا۔

خالد: ہاں بھئی رضیہ اب یہ بتاؤ کہ بستر سے اٹھ کر ہم مہمانوں کی خاطر تواضع کا ارادہ کب سے ہے۔

رضیہ: میں تو ابھی بستر سے اٹھنے کو تیار ہوں اگر آپ اجازت دیں۔

محمود: بلکہ یہ تو مارے باندھے پڑی ہوئی ہیں صبح ہی ان کا ارادہ ہوا تھا کہ بستر سے اٹھ کر حسب معمول گھرداری شروع کر دیں۔ لے آئے ناشتہ ادھر رکھ دو۔ یہ دونوں چھوٹی میزیں ادھر لگا دو۔ ایک عجیب تماشہ یہ ہوا ہے ڈاکٹر صاحب کہ آپ کے تشریف لانے کی خبر سن کر اور رضیہ کے اتنی جلدی صحت پانے کے چرچے سے بہت سے مریض صبح ہی سے آپ کے لیے جمع کر دیے ہیں۔ میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب لمبی چوڑی فیس لیتے ہیں۔

خالد: لاحول ولا قوۃ۔ فیس کا کیا سوال ہے میں آپ کا مہمان ہوں۔ ہاں بھئی رضیہ اس ناشتے میں سے کیا چیز پسند ہے سوائے اس ابلے ہوئے انڈے کے جو غالباً پورا ابلا ہوا ہوگا۔ اور باقی سب کچھ تم کو مل سکتا ہے۔ میری رائے میں تم کھاؤ۔ رس مکھن اور بس ایک پیالی چائے۔

رضیہ: جی ہاں ٹھیک ہے ٹوسٹ ہی کا ارادہ تھا۔

خالد: اچھا یعنی رس نہیں بلکہ ٹوسٹ کہتی ہو کافی عالم فاضل معلوم ہوتی ہو۔

محمود: جی ہاں ان کا شوق ہی اور کیا ہے سوائے پڑھنے کے میٹرک کرنے کے بعد میں نے کہا بیٹی اب کیا کرو گی آگے پڑھ کر مگر ان کا نہ جانے کیا ارادہ ہے گھر سے دور لاہور میں ہوسٹل کی زندگی بسر کرتی ہیں اور پڑھ رہی ہیں۔

خالد: خوب خوب۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے اگر میرے دوست شفیع جو نہ ہو جاتا تو میں کچھ دلچسپ لطیفہ آپ
[illegible] دیتا۔

محمود: مسلمان بچہ ہی ہو گیا آپ کا۔

ریاض: وہی تو رونا [illegible] تھے ہم لوگ جب آپ سے [illegible] ملاقات ہو گئی۔

محمود: تو کچھ بہت زیادہ نقصان ہو گیا خدانخواستہ۔

ریاض: صرف ایک بستر کے اور وہ بھی آیا

خالد: اور وہ بھی اس لیے کہ ہم اس پر سو رہے تھے۔ بس یہی ایک بستر رہا ہے۔

ریاض: جی ہاں جی ہاں گویا ہینڈ بیگ ہیں۔ ورنہ بلوؤں کے سوٹ کیس۔ جس میں نقد روپیہ جو بھی تھا کچھ ضروری
کاغذات تھے گھروں [illegible] سب کا سب تو صاف ہو گیا۔

محمود: کوئی بات نہیں جان کا صدقہ مال ہے۔ سب کچھ مہیا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب دیکھیے آپ [illegible] طرف
کے نہیں معلوم ہوتے۔

خالد: جی ہاں تو نہیں یہاں کا مگر اب تو مغربی پاکستان میں اطراف باقی ہی نہیں رہے۔

محمود: جی ہاں مگر میرا مطلب ہے کہ شاید ہندوستان سے تعلق رہا ہے آپ کا۔

خالد: اس اعتبار سے تو واقعی مہاجر ہوں۔ حالانکہ آج تک یہ بات مجھ پر نہیں آئی کہ اپنے گھر میں آنے والے
کو مہاجر کیوں کہا جاتا ہے۔

ریاض: شکر ہے کہ اب ایک وحدت ہے اور کوئی یہ نہیں پوچھ سکتا ہے کہ ہندوستانی ہو یا پنجابی، سندھی ہو یا
سرحدی اب تو واقعی کسی کو مہاجر کہنا یا کسی کا اپنے کو مہاجر سمجھنا بھی غلط ہے۔

محمود: بالکل غلط ہے۔ صاحب ہم سب مل جل کر ایک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں تو طے کر چکا ہوں اپنی بچی کی شادی کے
یہ سوال ہی نہ اٹھاؤں گا کہ لڑکا کہاں کا ہے بس پاکستان کا ہونا کافی ہے۔

خالد: جی ہاں یگانگت تو اسی صورت سے پیدا ہو گی۔ کیوں بھئی رضیہ ایک پیالی اور منگائی جائے۔

رضیہ: جی نہیں بس کافی ہے اب کھانا ہی کھاؤں گی تھوڑی دیر میں۔

خالد: صاحب آپ ذرا زحمت فرما کر ان کے لیے مرغی کے چوزوں کا انتظام کریں تاکہ ان کو کھانے میں مرغ کا شوربا مل
سکے اور اگر زحمت نہ ہو تو ان مریضوں سے بھی فرما دیں جو میرے منتظر ہوں گے کہ شام کو آ جائیں تو اچھا ہے۔

محمود: بیشک میں بھی یہی چاہتا تھا کہ آپ ذرا آرام فرما لیں۔ کیوں بھئی یہ کیا لائے ہو کشتی میں۔ اچھا اچھا
نذرانہ ہو گا رکھو یہ کشتی۔ ڈاکٹر صاحب یہ نہ کوئی معاوضہ ہے نہ آپ کے احسانِ عظیم کا کوئی بدل بلکہ ایک
حقیر سی نذر ہے۔ یہ کچھ پارچہ جات یہ ایک ادنیٰ سی گھڑی اور یہ ایک حقیر سی رقم۔

خالد: یہ نوٹوں کی گڈی۔ اس کو آپ حقیر سی رقم کہہ رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ میرا فرض تھا اور میں ان

بھی کوئی چیز قبول کر کے اپنے اس فرض کو کاروبار بنانا نہیں چاہتا۔

محمود: ڈاکٹر صاحب، دنیا اسی طرح چلتی ہے آپ نے مجھ کو میری کھوئی ہوئی بیٹی دلوا دی ہے آپ کا کھویا ہوا سا؟ اگر نہیں دلوا سکتا۔ تو حسب توفیق جو کچھ پیش کر سکتا ہوں اس سے تو انکار نہ کیجئے۔

خالد: اچھا اس کو چھوڑ دیجیے۔ فی الحال جو انتظامات میں نے کیے ہیں وہ کر دیجئے۔

محمود: بہتر ہے یہ بات بھی میں آپ سے نہیں کمپاؤنڈر صاحب سے طے کیے لیتا ہوں۔ آپ تشریف لائیے ادھر کمپاؤنڈر صاحب۔

(دونوں جاتے ہیں)

خالد: دیکھا آپ نے رضیہ بیگم آپ کے والد مجھ کو معاوضہ دے کر اس خوشی سے محروم کرنا چاہتے تھے کہ میں نے ایک مرجھانے والے پھول کو پھر سے شگفتہ کر دیا ہے۔

رضیہ: جی — پھول! —— اچھا گویا آپ ڈاکٹر کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔

خالد: میں شاعر ہوں یا نہیں مگر آپ سخن فہم ضرور ہیں۔

رضیہ: شکریہ۔ مگر آپ کو اس نذرانہ کے قبول کرنے سے انکار کیوں ہے۔ آپ نے مجھ کو دوبارہ زندگی دے کر میرے گھر بھر کو نئی زندگی بخشی ہے کاش ابا جان آپ کی خدمت میں وہ نذر پیش کر سکتے جو در اصل ان کو پیش کرنا چاہیئے۔

خالد: مگر مجھ سے یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں آپ کے علاج کا معاوضہ وصول کر لوں۔ میرا بہترین معاوضہ یہ ہے کہ مجھ کو اپنے تصور کے لیے ایک ایسا نقش مل گیا ہے جس کے سہارے تنہائیوں کو آباد رکھا جا سکتا ہے۔ اب میں یہاں سے تنہا نہ جاؤں گا۔

رضیہ: سوال یہ ہے کہ جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

خالد: کاش یہ سوال واقعی پیدا ہو سکتا۔

ریاض: (دور ہی سے) خالد۔ یعنی میں نے کہا ڈاکٹر صاحب ذرا بات سنیئے۔

(خالد جاتا ہے)

خالد: (قریب آتے ہوئے) کیا بات ہے۔

ریاض: ادھر آئیے۔ میں نے کہا یہ کیا حماقت ہے کہ اتنا روپیہ اور اتنے کپڑے ایسی قیمتی گھڑی اور یہ پُر تکلف سامان چھوڑ رہے ہو معلوم بھی ہے ایک ہزار کے نوٹ ہیں۔

خالد: میں ایک اس سے بھی زیادہ قیمتی چیز چھوڑ کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ فوراً اسی وقت بس ہینڈ بیگ اٹھاؤ اور چل دو۔

ریاض: وحشت کیا ہے آخر۔

خالد: میں سب کچھ کر سکتا ہوں [illegible] نہیں کر سکتا۔ مجھ کو ڈاکٹر [illegible] جا رہا ہے۔ وہ نہایت خطرناک طرح
پر میرے قریب آ رہا ہے [illegible] نہیں کر سکتا۔

ریاض: تو پھر یہ چیزیں چھوڑ دو اور چلے چلو۔

خالد: میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ میں اس کو چھوڑ کر جا سکتا ہوں مگر یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ مجھ کو نفرت سے
یاد کرے۔

ریاض: [illegible] سے بھاگنا تو اس سے بھی برا ہے کہ اب کس کس کا علاج کرو گے۔ [illegible] قسمت تمہارا
ساتھ دے گی۔ مگر یہ چیزیں —

خالد: لعنت بھیجو ان چیزوں پر۔ [illegible] کے
دروازے سے نکل سکتے ہیں [illegible]۔

ریاض: [illegible]

خالد: مفلسی اور مجبوری سب کچھ کرا سکتی ہے [illegible] صرف دو نوٹ جیب میں ہیں
بس کافی ہیں۔ اب جلدی [illegible] میں چلا، تم بھی جلدی نکلو یہاں سے۔

ریاض: چل تو رہا ہوں [illegible] جلدی نکلو۔

خالد: بند کر دو یہ دروازہ

(ختم)

وہمی

ملازمہ : حکیم صاحب آئے ہیں۔ بیگم صاب!

بیگم : اچھا۔ دیکھنا! نجمہ وہ ان کی طرف نہ نکل جائیں، بلا لو یہاں، جلدی سے!

نجمہ : میں نے بیرے سے کہہ دیا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے مل کر جائیں ابا جان کو دیکھنے۔ لیجئے وہ تو آ رہے ہیں اسی طرف حکیم صاحب!

حکیم صاحب : (کمرے کے باہر ہی سے آواز دے کر) میں حاضر ہو سکتا ہوں بندہ نواز!

نجمہ : تشریف لے آیئے حکیم صاحب!

حکیم صاحب : (آتے ہوئے) آداب بجا لاتا ہوں بیگم صاحبہ۔ جیتی رہو نجمہ بیٹی۔ کہیئے صاحب کیا حال ہے خان بہادر صاحب کا۔

بیگم : حال کیا ہوتا حکیم صاحب جس مرض کا آپ علاج کر رہے ہیں، سچ پوچھئے تو اس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔

حکیم صاحب : یہ تو آپ نے عجیب بات فرمائی۔ میرے خیال میں تو دنیا میں کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کی دوا حق تعالیٰ نے بقول مولانا حالی کے پیدا نہ کی ہو۔

بیگم : یہ تو ٹھیک ہے مگر وہم کا علاج نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں تو ان کو سوائے وہم کے کوئی بیماری نہیں ہے۔ خوراک ماشاءاللہ اچھی ہے۔ نیند خوب آتی ہے۔ وزن اللہ رکھے بڑھ ہی رہا ہے۔ بخار ان کو نہیں۔ کھانسی اللہ نہ کرے ان کو نہیں۔ سر درد یا کہیں درد بھی نہیں۔ پھر آخر بیماری کیا ہے۔

حکیم : بیگم صاحبہ! بعض امراض ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف مریض محسوس کر سکتا ہے۔ اور اگر عقل سے کام نہ لیا تو طبیب بھی کہہ سکتا ہے۔ تھوڑا بہت میرے نزدیک آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ خان بہادر صاحب ہر طرح تندرست ہیں اور صرف وہم میں مبتلا ہیں۔

بیگم : تو آپ کے نزدیک ان کو شکایت کیا ہے۔

حکیم : وہی تمام شکایات جن کا اظہار خان بہادر صاحب کرتے رہتے ہیں کہ بخار نہیں ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہے، بھوک لگتی ہے مگر جتنا کھانا چاہتے ہیں نہیں کھا سکتے۔ دل جوان ہے اور خود روز بروز ضعیف ہو رہے ہیں۔

بیگم : کمال کرتے ہیں حکیم صاحب آپ بھی! میں کہتی ہوں عمر بھی آخر کوئی چیز ہے۔ آپ کے خیال میں کیا ہوگی ان کی عمر!

حکیم : بیگم صاحبہ یہ نسخہ [illegible] ان کی طرف [illegible] خان بہادر صاحب کو لڑکی کی [illegible]۔

بیگم : تو آپ کا خیال ہے کہ اس طرح بھی ان کی تسکین کی شکایت نہ رہنی چاہیئے۔

(خان بہادر کی آواز آتی ہے)

خان بہادر : (دور سے) اسے جی کرنی ہے۔

نازو : جی سرکار۔

خان بہادر : بیگم صاحبہ کو بلاؤ۔

نازو : بہت بہتر۔

(بیگم سے) بیگم صاحبہ۔ سرکار یاد فرماتے ہیں۔

بیگم : (اٹھ کر) میں ذرا ہی [illegible] حکیم صاحب لے کر دیکھ جاتی ہے) حکیم صاحب آپ آنکھوں کی [illegible] صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ بالکل تندرست ہیں۔

حکیم : ہاں ہاں آپ یہ باور کی ہوں گی کہ میں اپنی فیس اور دواؤں کی قیمت وصول کرنے کی وجہ سے خان بہادر صاحب کو خواہ مخواہ بیمار ٹھہراتا ہوں۔ مگر یہ غلط ہے بیگم صاحبہ وہ واقعی علیل ہیں۔ علالت کا تعلق جسم ہی سے نہیں ذہن سے بھی ہوتا ہے۔

بیگم : تو یہ کہئے کہ ذہنی بیماری ہے۔

حکیم : ذہنی بیماری نتیجہ ہوتی ہے جسمانی علالت کا۔ ان کے عناصر میں اعتدال نہیں ہے۔ قویٰ مختل ہو گئے ہیں۔

بیگم : میں غالب کا شعر پڑھ کر نہیں کہہ رہی ہوں۔ حکیم صاحب میں ان کی صحت کے متعلق کسی قطعی نتیجے پر پہنچنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے میں نے آج اپنے بھانجے ڈاکٹر اکبر کو بھی بلوایا ہے۔ خدا کرے وہ آپ کی موجودگی ہی میں آ جائیں۔ وہ کل ہی دلی پہنچے ہیں۔

حکیم : ڈاکٹر اکبر۔ وہ صاحبزادے گویا جن سے بچی کی نسبت بھی ہو رہی ہے۔

بیگم : جی ہاں وہی۔ ماشاءاللہ بڑا ہونہار ڈاکٹر ہے۔ ہزار بارہ سو کی پریکٹس تو ابھی سے ہو گئی ہے اس کی۔

حکیم : یہ درست ہے مگر شاید آپ کو معلوم نہیں کہ خان بہادر صاحب یونانی امراض میں مبتلا ہیں۔ ان امراض کو طبِ انگریزی کے حکیم مشکل ہی سے سمجھ سکیں گے۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔

بیگم : جی ہاں اب اسی اختیار سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ ہے۔ آپ تشریف رکھیئے۔ وہ آپ کے لیے کچھ اور امراض تصنیف کئے بیٹھے ہوں گے۔

حکیم : بسم اللہ!

(دونوں جاتے ہیں ذرا سے وقفے کے بعد خان بہادر کی آواز قریب آنا شروع ہوتی ہے)

خان بہادر : نسخے میں صاف لکھا ہے کہ مربہ سیب، ورق نقرہ پیچیدہ اول بکند۔ اور بعد کو چاندی کی [illegible] گویا جو چیز اول [illegible]

تھی وہ غضب ان ہو گئی۔ خوب ہو رہی ہے تیمارداری۔ اب نہ جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔

نجمہ : غلطی تو ضرور ہو گئی مگر یہ کوئی اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے ابو جان!

خان بہادر : اے بیٹا بیمار کے لیے اتنی ہی سی بات بہت ہوتی ہے۔ دیکھ رہی ہو میری حالت۔ گرمی میں تو لکڑی میں ماشہ سادہ وہ ہوئی معجون!

نجمہ : اُس کی دوائیں تو دی جا رہی ہیں، چٹنی بھی تیار ہے۔ لعوق بھی بن گیا ہے۔

خان بہادر : ذرا دیکھنا بیٹی میرا جسم تو گرم نہیں ہے۔ آنکھیں کچھ جل سی رہی ہیں۔ نتھنے کی ہوا بھی گرم ہے۔

نجمہ : نہ نہیں ابو جان۔ جسم تو اچھا خاصہ ہے۔

خان بہادر : مگر یہ تمھاری ہتھیلیاں کیوں جل رہی ہیں۔ دکھانا ذرا۔ ہوں۔ ہوں دوسرا ہاتھ دو۔ ٹھیک ٹھیک۔ ضرور حرارت ہے۔ جسم گنگنا ہے۔ چہرہ بھی تمتمایا ہوا ہے۔ حکیم صاحب آئیں تو نبض دکھا دینا۔ آئیے حضور۔ یادش بخیر۔ بھئی بڑی عمر ہے۔ نام لیا ہی تھا کہ تشریف لے آئے۔

حکیم : کہئے حضور مزاج مبارک۔ کیا حال رہا۔

خان بہادر : میرا حال تو بعد میں پوچھئے گا پہلے ذرا صاحبزادی کی نبض دیکھئے۔ میرے خیال میں حرارت ہے اور بخار کی آمد آمد ہے آنکھوں کا اضمحلال اور چہرے کی بھربھراہٹ ملاحظہ فرمائیے۔

حکیم : دکھانا بیٹی ذرا اپنی نبض!

بیگم : چھوڑیئے بھی حکیم صاحب اچھی خاصی ہے۔ یہ ان کو تو اپنے متعلق بھی طرح طرح کے شک گھیرے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی وہم میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

خان بہادر : کمال کرتی ہیں صاحب آپ بھی۔ یعنی میں کہہ رہا ہوں کہ لڑکی بیمار ہے اور آپ فرماتی ہیں وہم ہے۔ آخر عمر بھر کی کچھ نہ کچھ تجربہ تو ہے ہی۔ جو شخص اتنے دن سے بیمار ہو وہ خود بھی چھوٹا موٹا طبیب تو ہو ہی جاتا ہے۔ کیا رائے ہے حکیم صاحب۔

حکیم : بجا فرمایا غریب پرور۔ صاحبزادی کے چہرے پر علالت کی تمام علامتیں موجود ہیں۔ کیوں بیٹی نزلہ کی شکایت تو نہیں ہے۔ مثلاً چھینکیں یا گلے میں کچھ سرسراہٹ۔

نجمہ : جی نہیں مجھے اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ ابو جان ہی کو دیکھئے۔

خان بہادر : اب ہو گی بھی کوئی شکایت تو وہ ظاہر تھوڑی کرے گی۔ ماں کی نگاہیں پہچانتی ہے۔ اس کو اپنی عاقبت تھوڑی خطرے میں ڈالنا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ یہی چھوٹی چھوٹی شکایتیں بڑھ کر مہلک امراض کی صورت اختیار کر لیں۔

حکیم : درست فرمایا غریب پرور۔ اگر ان معمولی شکایات کا ابتدا ہی میں سدِ باب ہو جایا کرے تو علالت طوالت اختیار نہ کرے۔

بیگم : حکیم صاحب آپ اس قصے کو چھوڑیئے فی الحال۔ آپ ان کا حال سنئے اور ان ہی کا معائنہ فرمائیے۔ کل ڈاکٹر اکبر نے ان کو دیکھ کر آپ کی ہر تشخیص سے اختلاف کیا ہے۔

خان بہادر : جی ہاں وہ صاحبزادے بھی عجیب اناڑی نکلے۔ میں تو سمجھا کہ اتنے دنوں تک میڈیکل کالج میں پڑھا ہے۔ دو تین سال فیل

چکا ہوں بلکہ اسے پھر دو بہت لگا لیجیے صاحب پرسوں۔ یہی بھی حاضر کر رہا ہے۔ ہم نے ابھی سنا ہی ہوگا۔ مگر وہ تو صحت ہی ایسی ہے
معلوم ہوتا ہے بالکل جیسے آپ کی [illegible] معلوم ہوتا ہے۔

بیگم : اصل میں یہ ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر کی بات مانی ہی نہیں حکیم۔ انہوں نے تو [illegible] ہونے دی۔

خان بہادر : اجی آپ کا قصہ تو یہ ہے کہ گھٹنے پیٹ کی طرف جاتے ہیں۔ وہ آپ جانتے ہیں جب سے ان کی حجامت کی آپ نے
ٹھیک طرح پر تجزیہ کیا ہے ہمیشہ گھٹنے ہی پیٹ کی طرف رکھنے [illegible] ذرا پوچھئے گا۔ [illegible] جملہ آپ سے
کہے ہوں یا نہیں۔

بیگم : حکیم صاحب ابھی یہ تو ہے کہ انہوں نے [illegible] کر دو چپاتیاں نہیں ہیں [illegible] کروں۔

خان بہادر : جی حکیم صاحب یہ کمال دیکھئے ان صاحبزادے کا کہ میں نے ان سے کہا کہ [illegible] صحت ہے۔ وہ صاحبزادے ذرا اس
قدر پہنچے کہ گویا میں بھونا ہوں۔ اور وہ شیشے کا [illegible] ایک قطرہ [illegible] کرتا ہے۔
میرے مقابلے میں جانتے ہیں [illegible] ان حضرات نے ایک سند [illegible] ایک
سیاہ پٹی باندھی۔ میرے بازو پر اور ایک چشتا دینا شروع کیا۔ آخر میں کہہ دیا کہ [illegible] ضعیف ہے۔ سرخ شہادت
کی تو بازو پر پٹی باندھی اور صندوقچے کے [illegible] سے [illegible] نکال لیا۔ اس کو [illegible] چنڈو
میں ایک ٹکی [illegible] زندگی تباہ کر دوں گا۔ ناممکن۔

حکیم : عجب شخص ہے یہ تو خوب [illegible] قصہ کر۔ یہ فرمائیے کہ رات کو نیند کیسی آئی؟

خان بہادر : ویسے تو میں خوب سویا مگر جو شخص رات بھر سوتے میں بیداری کے خواب دیکھے وہ بھلا ٹھیک [illegible] ہے۔ چنانچہ
صبح جو میں بیدار ہوا تو معلوم ایسا ہوتا تھا۔ حکیم صاحب کہ گویا رات بھر سفر میں رہا ہوں۔

حکیم : وہ خستگی تو میں آپ کے چہرے پر بھی دیکھ رہا ہوں۔

بیگم : بالکل غلط مجھے تو کوئی خستگی نظر نہیں آتی۔ اچھا خاصا بشاش چہرہ ہے۔ ڈاکٹر اکبر کی رائے پر عمل کرکے اگر صبح غسل کیا ہوتا
اور ہوا خوری کو گئے ہوتے تو طبیعت اور بھی چاق ہوتی۔

خان بہادر : صاحب آپ کے ڈاکٹر اکبر کی رائے پر عمل تو میں جب کرتا اگر مجھ کو ان پر اعتقاد ہوتا۔ آپ کو کیا معلوم کہ کل میں نے
ان صاحبزادے کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے۔ میرے خیال میں تو اس نے ڈاکٹری کو دوں دے کر پڑھی ہے۔ اسے معلوم
ہی نہیں کہ کس مرض کا سر کدھر ہوتا ہے اور دم کدھر ہوتی ہے۔ بہرحال تو میں یہ عرض کر رہا تھا حکیم صاحب کہ صبح کچھ مضمحل
زیادہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناشتہ بھی حسب دلخواہ نہ کر سکا۔

بیگم : حکیم صاحب ان سے سنئے۔ ناشتے میں حسب معمول دلیا اور دودھ تھا۔ پھر دو تلے ہوئے انڈے۔ دو مکھن لگے توس جن پر [illegible] بھی
بھی خاصی مقدار میں چپڑی گئی تھی۔ اور دو چائے کی پیالیاں اور آخر ناشتہ کس کو کہتے ہیں۔

خان بہادر : ارے بھئی حکیم صاحب نے خود فرمایا ہے کہ پرندوں کا گوشت ناشتے میں کھایا جا سکتا ہے۔ بھنے ہوئے گردوں کی بھی
اجازت دی ہے۔ بہرحال تو جناب والا اس ناشتے کے بعد ہی کچھ اختلاج کی سی کیفیت محسوس ہوئی تو میں نے تھوڑے تھوڑے

ناشتے سے تین گلاس مالٹوں کے رس پیے۔

بیگم: اور وہ چٹنیاں۔ معجونیں۔ لعوق۔ مربے اور حریرے الگ سے استعمال کے جو حکیم صاحب نے دوا کے طور پر بتائے ہیں۔

خان بہادر: خیر۔ خیر۔ یارب وہ نہ سمجھی ہیں نہ سمجھیں گے میری بات — تو میں یہ عرض کر رہا تھا حکیم صاحب کہ اب کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ مگر بھوک کا جیسے کوسوں پتہ نہیں۔ مجھے تو اب یہ شبہ ہو گیا ہے کہ میرے پیٹ میں معدہ ہے بھی یا نہیں۔ اور ہاں صاحب کچھ دنوں سے ایک عجیب شکایت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پیر سو جاتا ہے۔ یہ فالج کا مقدمہ تو نہیں ہے حکیم صاحب۔

بیگم: جب چوبیس گھنٹے پڑے رہوگے تو اور کیا ہوگا

خان بہادر: صاحب یہ عجیب مصیبت ہے جو بات میں حکیم صاحب سے کرتا ہوں جواب آپ دیتی ہیں۔ ان کو بھی تو کوئی رائے قائم کرنے دیجئے۔ یہ پیر کا سُن ہو جانا یا سو جانا معمولی بات نہیں ہے۔ مجھے تو بڑا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

حکیم: یہ بھی خطرناک بات ہے۔ میں اس کی رعایت نسخے میں کر دوں گا اور آپ بھی پرندوں میں کبوتر کا اضافہ کر دیجئے۔

(موٹر کار کا ہارن)

بیگم: ارے دیکھو۔ میرا خیال ہے اکبر میاں آئے ہیں۔ تم انھیں یہاں لے آؤ۔

لڑکی: بہتر بیگم صاحبہ۔

حکیم: تو میں اب اجازت چاہوں گا۔

خان بہادر: نہیں صاحب۔ آپ تشریف رکھیے۔ آپ نے دیکھئے ان صاحبزادے کو، ایسے ایسے لونڈوں کو حاضری میں کون لاتا ہے۔ کہاں آپ ایسا طبیب حاذق کہاں وہ کل کا چھوکرا۔ اور میں نے کہا سن لیجئے۔ بیگم صاحبہ میری طرف اُن صاحبزادے کو متوجہ نہ فرمائیے گا۔ ورنہ آج میں ان کی قلعی کھول کر رکھ دوں گا۔ آیا وہاں سے ڈاکٹر بن کر۔

بیگم: خدا کے لیے اب اُس کے منہ پر نہ کچھ کہہ بیٹھنا۔ سُن لے تو وہ یہی سمجھے کہ خوب قدر ہو رہی ہے ہونے والی سسرال میں۔

خان بہادر: خیر یہ تو ابھی غور طلب مسئلہ ہے۔

(دستک)

نجمہ: (دوڑتے ہوئے، دروازے کا پاٹ کھولتے ہوئے) تشریف لائیے۔

اکبر: السلام علیکم۔ مزاج کے متعلق اگر کچھ فرمانا ہو تو فرما دیجئے۔

نجمہ: مجھے مزاج کے متعلق تو نہیں البتہ اور کچھ عرض کرنا ہے اور سنجیدگی سے عرض کرنا ہے۔

اکبر: بالکل ٹھیک۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان اب سنجیدہ گفتگو عام طور پر ہوا کرے۔ وہ کھلنڈرے پن کا زمانہ گیا۔ اب بقول خالہ جان کے اللہ رکھے ہم دونوں سمجھدار ہیں۔

نجمہ: میں تو خیر ہوں سمجھدار۔ مگر فریق ثانی کی طرف سے مجھے شبہ ہے۔

اکبر: فریق ثانی! — وہ تو — وہ تو غالباً میں ہوا۔

نجمہ: غالباً نہیں بلکہ یقیناً آپ ہی ہیں اور آپ ہی کی عقل سلیم کی طرف سے مجھ کو شبہ ہے۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ جناب کو ابّا جان کی

[illegible] کی کچھ ضرورت تھی

[illegible] ہے۔

اکبر: واقعی [illegible]

نجمہ: جی ہاں۔ تو یہ آپ نے [illegible]

[illegible]

ان کی بیماری [illegible]

[illegible]

اکبر: [illegible]

نجمہ: بیٹھیے بیٹھیے [illegible]

اکبر: [illegible] بتائیں یا نہیں؟ جی

نجمہ: جی ہاں ہی کہہ دیجئے۔

اکبر: [illegible]

نجمہ: طبیعت کا [illegible]

اکبر: بس تو ٹھیک ہے۔ [illegible] آؤ میرے ساتھ آؤ

نجمہ: سنئے تو۔ صبح جب [illegible] ناشتہ [illegible] ہے۔

اکبر: بس بس سمجھ گیا میں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔

(جاتے ہیں۔ خان بہادر صاحب کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی ہے۔)

خان بہادر: بات جو غلام میرے کمرے میں دودھ لے کر آیا تھا۔ اس کو چھینک آگئی تھی۔ نزلے کی وجہ تو یہی ایک بیہودگی ہو سکتی ہے

حکیم: درست فرمایا غریب پرور۔ نزلہ چھینک ہی کے ذریعے پھیلتا ہے۔

اکبر: (داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض کرتا ہوں خالو جان۔ خالہ جان تسلیم۔ اور آپ کی تعریف۔

خان بہادر: یہ میرے طبیب خاص عمدۃ الحکماء حکیم اشرفی صاحب ہیں۔ کیا سوجھ بوجھ ہے اور کیا تشخیص ہے

اکبر: (ہاتھ ملاتے ہوئے) میرا نام اکبر ہے۔ بڑی مسرت ہوئی حکیم صاحب آپ سے مل کر۔ صاحب کل میں نے آپ کے مریض کا معائنہ کیا تھا اور چند معمولی شکایات محسوس کرنے کے بعد ہی خالو جان کو مطمئن کر دیا تھا کہ آپ کو کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔ مگر میں جو خون ٹسٹ کرنے کے لیے لے گیا تھا اس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مریض سے بیماری چھپانا نہیں چاہیے تاکہ وہ زیادہ احتیاط برت سکے۔

خان بہادر: کیا مطلب۔ گویا آپ کے خیال میں کچھ امراض ہیں نا مجھے؟

اکبر: وہ میں ابھی عرض کرتا ہوں آپ کو دیکھ کر۔ ذرا نبض تو دیجئے مجھے۔ ہوں۔ ہوں۔ کبھی ایسی کوئی بات تو نہیں ہوئی کہ مثلاً آپ رات کو خوب سوئے بھی مگر صبح اس طرح اٹھے گویا سخت تھکن سی ہو۔

خان بہادر: بالکل۔ بالکل۔ وہ تو بھئی آج ہی ہوا ہے۔ کیوں بھئی حکیم صاحب میں کہہ رہا تھا نا؟

حکیم : جی ہاں آپ فرما رہے تھے اور مجھے بھی چہرہ پر خستگی نظر آئی تھی۔

اکبر : ٹھیک ہے میرا خیال۔ اچھا یہ بتائیے خالو جان کبھی آپ کے ہاتھ یا پیر سُن تو نہیں ہو جاتے یعنی سو تو نہیں جاتے۔

خان بہادر : ارے بھئی ہیں! کل بھی تکلیف بیان کر رہا تھا ابھی۔

بیگم : یہ تو آج ہی، ان کو شکایات پیدا ہوئی ہے۔

خان بہادر : میرا خیال یہ ہے کہ تم اب مرض کی تہہ کو پہنچ گئے ہو۔

بیگم : کوئی خطرناک بات تو نہیں ہے اکبر میاں۔

اکبر : خالہ جان احتیاط شرط ہے انشاء اللہ خالو جان بالکل تندرست ہو جائیں گے۔ ان کو دو مرض ہیں ایک کا نام ہے انسائیکلوپیڈیا اور دوسرے کا نام ہے کانسٹینٹی نوپل۔

حکیم : بجا ارشاد ہوا غریب پرور۔ میری تشخیص بھی یہی تھی۔

خان بہادر : تشخیص تو آپ کی ضرور ہوگی۔ مگر علاج اب میں اکبر میاں ہی کا کروں گا۔ گھر کی مرغی دال برابر ضرور ہوتی ہے۔ مگر کیا سوجھ بوجھ ہے۔ یعنی پیروں کا سُن ہونا بوجھ گئے۔ صبح کا اضمحلال بوجھ گئے۔

اکبر : آپ اطمینان رکھیے۔ میں ابھی آپ کے لیے دوا منگواتا ہوں۔ خالہ جان آپ ذرا میرے ساتھ آئیے۔

حکیم : میں گویا اب اجازت چاہتا ہوں۔

خان بہادر : (بلند آواز سے) ارے بھئی حکیم صاحب کی فیس بھی بھیج دینا بیگم۔

بیگم : (دُور سے) بھیجے دیتی ہوں (آہستہ آواز میں) اکبر میاں۔ یہ ان کو آخر ہو کیا گیا ہے۔

اکبر : چپ بھی رہیے خالہ جان۔ کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ وہم کا علاج اس طرح ہوتا ہے۔ نجمہ سے جو حال سُنا تھا وہ اُن پر ظاہر کر دیا وہ معتقد بھی ہو گئے اور میری ساکھ بھی قائم ہو گئی اور رشتہ بھی گڑبڑ نہیں ہوا۔

بیگم : توبہ ہے میرا تو دم ہی نکال لیا تم نے۔ مگر تم نے ٹھیک کیا ان کا علاج یہی ہے۔ ٹھہرو میں حکیم صاحب کو فیس تو بھیج دوں۔

اکبر : بھیجئے یا نہ بھیجئے (آہستہ سے) میں نے تو اپنی فیس کھری کر لی کیوں نجمہ؟

نجمہ : چُپ بھی رہیے گا کہ نہیں ـــ شرم نہیں......؟

اکبر : (بات کاٹ کر) شرم کس کی تمہاری! اس کا بھی علاج کرنا پڑے گا مجھے ـــ ٹھہرو! (ہنستا ہے)

مرقع

شیخ صاحب خوشی سے بدحواس گھر میں داخل ہوتے ہیں۔

شیخ صاحب: ارے منّی میں نے کہا اطلاع لو [illegible] میں نے [illegible] منّی کو بلا لو [illegible] ارے بھئی کدھر گئیں سب۔ [illegible] ادھر
اصغر! ارے منّی! سب [illegible] ادھر بھی ماں۔

اصغر: ابھی نکلتا ہوں ابا جان۔ خیریت ہے آپ کے ہاتھ میں؟

شیخ صاحب: تم کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ مگر پہلے تمہاری ماں کو معلوم ہونا چاہئیے۔ [illegible] تم سے ہی بھلا کوئی کام ہوتا ہے۔ وہ خود آ رہی ہیں۔ ہم نے کہا بھلا پوچھو تو سہی کہ کیا ہے۔ اچھا فرض کرو کہ یہ تار ہے تو بھلا کس کا ہے۔ اور اس میں کیا لکھا ہے۔

بیوی: کتنا اچھا موقع نکالا ہے پہیلیاں بجھانے کا۔ کہ ہاتھ میں تار ہے۔ اور گھر سے تو سارے ہیں۔

شیخ صاحب: پہلے مٹھائی کھلاؤ۔ پھر بتاؤں گا کہ بیٹا نجم الحسن کا تار ہے۔

بیوی: نجمو کا تار ہے۔ لکھا کیا ہے۔ خدا کے لیے کسی طرح بتا بھی چکو۔

اصغر: بہرحال ہے کوئی خوشی کی بات۔ ابا جان خوش نظر آ رہے ہیں۔

شیخ صاحب: خوش تو خیر میں اس لیے نظر آ رہا ہوں۔ کہ ہوں ہی خوش مزاج میری خندہ پیشانی کو تو ایک دنیا مانتی ہے۔ مصیبتوں پر بھی مسکراؤں۔ آزمائشوں پر بھی ہنسوں۔ ابا جان مرحوم کا جب انتقال ہوا ہے۔

بیوی: بھئی خدا کے لیے اصغر میاں تم ہی ان سے تار لے کر ذرا پڑھ لو۔

شیخ صاحب: نا۔ خبردار۔ یہ تار بغیر مٹھائی کھائے ہرگز نہ سنایا جائے گا۔

بیوی: کھلا دوں گی مٹھائی۔ کھلا دوں گی۔ خدا کے لیے اب تو بتا دو۔

شیخ صاحب: ہاں بات ہوئی نا اب۔ جناب والا۔ یہ تار ہے نجم الحسن کا۔ اس کی شادی ۲۵ کو ہو رہی ہے۔

بیوی: مجھے بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کہ بس ایک دم سے تار آ جائے گا کسی نہ کسی دن۔

شیخ صاحب: دھڑکا لگا ہوا تھا۔ یعنی۔ بھئی دھڑکا کیسا؟ بھائی کی شادی کی خوشی ہوتی ہے یا دھڑکا ہوتا ہے اتنی بڑی خوشخبری سنائی اور وہ کہتی ہیں دھڑکا لگا ہوا تھا صاحب یہ میری شادی کا تار نہیں ہے جس کا آپ کو دھڑکا ہو سکتا ہے یہ آپ کے حقیقی برادرِ عزیز کی شادی کا مژدہ ہے۔

بیوی: مژدہ تو ہے مگر میرے تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ اب اتنی جلدی میں کیسے سارا انتظام کروں گی۔

شیخ صاحب: عجب چیز واقع ہوئی ہیں آپ بھی۔ انتظام سے تم کو کیا مطلب۔ انتظام اصغر نے خود کیا ہو گا ہم تو صرف شرکت کرنا ہے۔

بیوی: اسی شرکت ہی کے انتظام کو کہہ رہی ہوں۔ کچھ نہیں کچھ نہیں پھر بھی پانچ سو روپیہ سے کم کا خرچ نہیں ہے

شیخ صاحب: پانچ۔ سو۔ روپے تو کیا تمہارا خیال ہے کہ یہ دراصل ہم دونوں کی شادی ہے۔ ایک روپیہ دس آنے ہے ریل کا ٹکٹ۔ تم ہو۔ میں ہوں۔ اور چار پانچ بچے ہیں۔ اس کے لیے پانچ سو روپے آخر کس حساب سے جوڑ لیے۔

بیوی: بس لنگوٹیاں باندھ کر سب ریل پر بیٹھ جائیں۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ جمیل کی دلہن تمہاری کون ہے۔

شیخ صاحب: کون نفیسہ۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور میری۔

بیوی: وہ خالہ زاد بہن ہے تمہاری۔ لہٰذا ہمیں اسے بھی جوڑا دینا ہے۔ جمیل میرا بھائی ہے لہٰذا اس کی دلہن کو منہ دکھائی میں ہاتھ گلے کی کوئی چیز تو دی جائے۔ پھر جمیل کی سلام کرائی۔ ڈومنیوں کو دینے کے لیے بھی اور شادی کے پچاس خرچ ہوتے ہیں۔ پھر کسی بچے کے پاس ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں دو دو جوڑے تو نئے ہوں سب کے۔ نجمہ کی سینڈل آئے گی ——— الطاف کے پاس ٹوپی نہیں ہے۔ نیاز کے پاس بھی جوتا نہیں ہے۔

اصغر: ذرا اس جوتے کو بھی دیکھ لیجئے۔ جو دانت نکالے اس شادی کی خوشی میں ہنس رہا ہے۔

شیخ صاحب: قصہ مختصر یہ کہ شادی میں جانا تقریباً ناممکن۔

بیوی: لو اور سنو۔ جائیں گے کیسے نہیں۔ میرے کوئی دس پانچ بھائی نہیں ہیں۔ کہ میں جمیل کی شادی میں نہ جاؤں۔

شیخ صاحب: اچھا بھئی تو جاؤ۔ خدا مبارک کرے جانا۔ مگر یہ پانچ سو روپے کہاں سے آئیں گے۔

بیوی: جہاں سے بھی آئیں۔ کرو نا کچھ انتظام۔ وہ تو کہو دلہن کو منہ دکھائی میں دینے کے لیے میں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر کلائی کی گھڑی خرید رکھی تھی۔ نہیں تو دو ڈھائی سو روپے یہ بھی جا ہوتے۔

شیخ صاحب: بھئی صاف بات یہ ہے۔ کہ اب تو پانچ سو روپے خود میری بھی قیمت نہیں رہی ہے۔ کہ میں اپنے کو نیلام پر چڑھا دوں۔

اصغر: مگر ابا جان شادی میں جانا تو بہرحال ہے ہی۔

شیخ صاحب: تو یہ بھی ہے ہی کہ میں کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ کہیں ڈاکہ ڈالوں۔

بیوی: تمہارا مطلب یہ ہے کہ اپنے بھائی کی شادی میں بھی میں شرکت نہ کروں۔ اور کیا تم یہ چاہتے ہو کہ بھائی

کی شادی میں جیسا چاہتا [illegible] روپیہ بچا جاؤں۔ اے میں کہتی ہوں: سنا آپ کا لڑکے کی بیوی [illegible]

شیخ صاحب: [illegible] صاحب [illegible] کہ اس طرح کے [illegible] کا [illegible] تو یہاں سے [illegible] مجھے ذرا قرض بھی دے گا۔

بیوی: [illegible] حمیدہ کی شادی پر [illegible] بھی [illegible] میرے بھائی کی شادی ہے۔

شیخ صاحب: بھلا یہی میں کہتا ہوں کہ [illegible] حمیدہ میاں [illegible] نے [illegible] حمیدہ کی شادی کے اخراجات کے اٹھنے تھے [illegible] قرض ہی تھا۔ جانے [illegible] تھا۔ [illegible] قرض ہی تھا۔

بیوی: [illegible] اس وقت تو خوب قرض لیا تھا۔ [illegible] ایک کا [illegible] تھا [illegible] بار [illegible] کے ایک جلد [illegible] ہے۔ [illegible] بھی دیئے تھے [illegible] کی میز بھی دی تھی۔ [illegible] نہ دی تھی۔

شیخ صاحب: اگر وہ قرض ادا ہو گیا ہوتا تو خدا [illegible] بھی قرض مل جاتا۔ [illegible] کون دے گا۔ [illegible] ہوئے مریض کو قرض۔

بیوی: اچھا بس رہنے دیجئے [illegible] ہماری بہن مر چکی ہے بھائی کی ساری [illegible] سدھار گئی۔ اس دنیا سے۔

شیخ صاحب: لیجئے رونا شروع ہو گیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ ارے صاحب خدا کے لیے بس میرا مطلب یہ کہ میں تو یونہی چھیڑ رہا تھا۔ قرض کیسے نہ دیں گے لوگ مجھے۔ بخدا مزاج ٹھکانے کر دوں۔ جو قرض دینے سے انکار کرے۔ ابھی ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنا کس بل ہے کہ قرض دینے سے انکار کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ لو اب تو پونچھ ڈالو یہ آنسو۔ بخدا جب تم روتی ہو تو مجھے اپنی زندگی پر طرح طرح کے شک گزرنے لگتے ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ روپیہ کا انتظام کرنے۔

بیوی: کچھ روپیہ زیادہ ہی لینا خود تمہارے پاس بھی کپڑے نہیں ہیں۔

شیخ صاحب: ہاں ہاں۔ زیادہ سے زیادہ لو۔ قرض ہی تو لینا ہے کوئی اپنی کمائی کا خرچ ہے۔ بہرحال تم چلنے کی تیاری کرو۔

جعفر: میرا جوتا نہ بھولیے گا۔ ورنہ میں ہرگز نہ جاؤں گا۔

شیخ صاحب: نہیں صاحب نہیں۔ میں کچھ نہ بھولوں گا (زیر لب بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے) کاش آپ لوگ مجھ کو بھول سکتے میرا کیا ہے۔ انشاء اللہ اتنا قرض چھوڑ کے مروں گا کہ طبیعت صاف ہو جائے۔ میرے پسماندگان کی قرض بانٹتے بانٹتے بدھیا بیٹھ جائے۔

(بڑے میاں کی آواز فیڈ آؤٹ۔ ٹرین کی آواز فیڈ اِن ہوتی ہے)

اس ٹرین میں جھگڑا ہو رہا ہے ؛

ایک مسافر: جی نہیں۔ یہ میرے باپ کی تو ریل گاڑی ہے نہیں۔ مگر جناب کے والد محترم کی بھی نہیں ہے۔ آپ کو اٹھ کر بیٹھنا ہوگا۔

دوسرا مسافر: خواہ مخواہ ہی اُٹھنا ہوگا۔ میں نے پیر سمیٹ تو لیے ہیں بیٹھ جاؤ نا۔

ایک مسافر: ایسا ہی تو میں تمھارے پیر تلے پیدا ہوا ہوں کہ تمھارے قدموں میں بیٹھ جاؤں۔

دوسرا مسافر. کتنی مرتبہ میں تم سے کہوں کہ مجھے لیٹنے کا شوق نہیں ہے۔ بیمار ہوں

شیخ صاحب: ارے بھئی یہ کاہے کا جھگڑا ہے۔ حضرت یہاں تم کھڑے ہو جاؤ۔ ان کو جگہ دے دو مگر کچھ پتہ تو چلے کہ آخر بات کیا ہے۔

ایک مسافر: صاحب اصل قصہ یہ ہے کہ۔

دوسرا: جی نہیں اصل قصہ وہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ۔

ایک مسافر: آپ مجھ سے سنیئے۔

دوسرا: ان سے نہیں مجھ سے سنیئے۔

شیخ صاحب: میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں سے کچھ نہ سنوں بلکہ آپ دونوں مجھ سے سنیں۔ آپ کو شکایت ہے کہ یہ لیٹے ہیں۔ یہی نا۔

ایک مسافر: جی ہاں، معلوم ہوتا ہے کہ جناب کا دولت خانہ ہے۔

شیخ صاحب: بہرحال، اور آپ کو شکایت یہ ہے کہ اگر آپ لیٹے ہیں تو یہ اُٹھا کیوں رہے ہیں۔

دوسرا: نہیں صاحب۔ میں بیمار ہوں اس لیے لیٹا ہوں۔

شیخ صاحب: کیا تکلیف ہے آپ کو۔ ذرا دکھائیے نبض اپنی۔ بخار تو نہیں۔ ہے البتہ تبخیری کیفیت ضرور ہے۔ ذرا زبان تو نکالیے۔

دوسرا: (زبان نکال کر) آ آ آ۔

شیخ صاحب: کس کا علاج کر رہے ہیں آپ اور کیا مرض تجویز کیا ہے آپ کے معالج نے۔

دوسرا: میں حکیم ابو الشفا کے زیرِ علاج ہوں ان کا خیال ہے کہ مجھے ہڈیوں کا بخار ہے۔

شیخ صاحب: غلط۔ اور جب تشخیص ہی غلط ہے تو علاج یقیناً غلط ہوگا۔ آپ کو دراصل تپ۔

پہلا: (گھبرا کر) دق ؟ تپِ دق ؟ آپ نے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ آپ آرام سے لیٹیے۔ میں اگلے سٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔ باپ رے باپ، تپِ دق۔

شیخ صاحب: نہیں صاحب تپِ دق نہیں ہے بلکہ تپِ محرقہ ہے اور اس کا علاج حکیم شیخ ابو البرکات ہی کر سکتا ہے۔

دوسرا: حکیم شیخ ابو البرکات ؟ یہ کون بزرگ ہیں۔

شیخ صاحب: اب میں اپنی زبان سے کیا عرض کروں۔ بہرحال اگر آپ سنجیدگی سے اپنا علاج کرانا چاہتے ہیں اور اس مرض سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مجھ سے خط و کتابت کیجیے گا۔

دوسرا: جناب کا اسم مبارک؟

شیخ صاحب: اس خاکسار کو حکیم شیخ ابرار برکات کہتے ہیں۔

دوسرا: یعنی آپ خود ہی، گویا حکیم بھی شیخ، مطب بھی، دوا برکات بھی۔

(گاڑی اسٹیشن پر رکی ہے۔ قلیوں اور اسٹیشن کا ہنگامہ فیڈ ان ہوتا ہے۔ یہ شور رفتہ رفتہ فیڈ آؤٹ ہو کر موٹر کے چلنے کی آواز فیڈ ان ہوتی ہے اور پھر شہنائی کی آواز میں گم ہو جاتی ہے۔ شہنائی کی آواز فیڈ آؤٹ ہوتی ہے اور ڈھولک کی آواز میں شباب آجاتی ہے۔ لڑکیاں ڈھولک پر گا رہی ہیں)

گوری تیری گھونگھٹ میں چندا براجے
گوری تورے مکھڑے پہ تارا سا جے

بیوی: (ڈانٹتے ہوئے) توبہ ہے تم سے بھی لڑکیو، بس اب ہٹاؤ نا۔ جانا بند کرو گی ڈھولکی۔ دیکھو ادھر برات آنے ہی والی ہے۔

ایک لڑکی: ہم تو اسی وقت سے برات آتی ہوئی سمجھ رہے ہیں جب سے آپ آگئی ہیں۔

بیوی: ان کا یوں آنا تو چاہیے تھا مجھے سمدھن ہی بن کر برات کے ساتھ مگر انھوں نے یہی کہا کہ میں تو دوں گا برات کے ساتھ تم شرکت کرو لڑکی والوں کی طرف سے۔ گھر کی گھر میں شادی ہو تو یہی کچھ ہوتا ہے۔

دوسری لڑکی: مگر اب ایسا بھی نہیں ہوتا کہ سگی نند بھی سمدھن بن کر نہ آئے۔

بیوی: ارے تو یہ بھی تو میری صرف بھاوج نہیں ہے، میں اس سے پہلے کی اس کی بھاوج ہوں تو یہ ہے لڑکیو مجھے بھی باتوں میں لگا لیا اور برات اب پہنچنے ہی والی ہے۔ میں نے کہا بس یہی جہیز ہے۔

ایک لڑکی: جو کچھ تھا وہ رکھ تو دیا ہے سامنے۔

دوسری: رکھ تو دیا ہے مگر ان کی نظر میں کیوں آئے گا۔ مگر وہ بھی مجبور ہوں ان کا رشتہ ہی ہے نام دھرنے کا۔

ایک لڑکی: شادی لڑکی کے لیے تھوڑی کرتے ہیں۔ جہیز کے لیے کرتے ہیں۔

بیوی: بس صاحبزادی بس۔ بہت ہوئی۔ لو اور سنو بات پوچھ کر میں گنہگار ہو گئی۔ میں نے تو یہ پوچھا کہ سب چیزیں رکھ دی ہیں یا کچھ رہ گیا ہے۔ مگر تم تو جیسے بہانہ ہی ڈھونڈ رہی تھیں لڑنے کا۔

دلھن کی ماں: کیا بات کیا ہے، دلھن بیگم کس پر خفا ہو رہی ہو۔

ایک لڑکی: آتا جور کر دال کو ڈانٹ رہا ہے جہیز پر اعتراض کر رہی تھیں کہ بس اتنا ہی ہے۔

دلھن کی ماں: عزاس درنہ ہوا ہماری غریبی کا مذاق اڑانا ہو گیا مگر میں تو یہ پوچھتی ہوں بتاؤ تم جہیز میں کونسے گھوڑے لائی تھیں

بیوی: یہ ہے نہ یہی سہی۔ جب نہیں کہا تھا تو اب کہتی ہوں کہ اس سے زیادہ جہیز تو اللہ میری توبہ ہے میرے باورچی کی بہو بھی لے آئی تھی۔

دلھن کی ماں: اے ہے دیکھے ہیں۔ جو نے تمھارے باورچی بھی وہی باورچی نا جو چھ مہینے کی تنخواہ کے پیسے اٹھا کر روتا ہوا چلا گیا

بیوی: خیر میں تمھارے منہ تو لگتی نہیں مجھے خوب معلوم ہے کہ تمھارے ہی بہکائے میں آ کر وہ موا نکل گیا یہ سے یہاں

ایک لڑکی: خیر ان جھگڑوں کا یہ کونسا موقع ہے۔

بیوی: او بیچیں مجھے کہ تم دلھن والوں کی طرف سے شرکت کرو۔ یہ ہیں کہاں۔ ذرا بلواؤں تو سہی میں ان کو۔

دوسری لڑکی: چھوڑیے بھی ان باتوں کو۔ جو سنے گا وہ بھی کیا کہے گا۔ مہمان سے گھر بھرا ہوا ہے۔

بیوی: گھر بھرا ہوا ہے تو سب ہی دیکھ لیں گے یہ تماشہ میں تو اب ایک منٹ کے لیے بھی نہ ٹھہروں۔ اس گھر میں (آواز دے کر) اے میں نے کہا: لطاف او الطاف کے بچے ذرا دیکھ تیرے ابا جان کہاں ہیں۔ ڈیوڑھی میں بلا ذرا ان کو۔

الطاف: (جاتے ہوئے) ابھی لاتا ہوں۔ ابھی لایا۔

(اس کے ساتھ ہی منظر باہر کا قریب آ جاتا ہے)

شیخ صاحب: نہ نہ نہ۔ میری بات سنیئے۔

الطاف: ابا جان۔ امی جان بلاتی ہیں۔

شیخ صاحب: خیر بلاتی ہوں گی۔ چپ رہ ذرا۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ مہر دراصل لڑنے کی چیز ہے ہی نہیں۔ اب مثلاً میرا مہر بندھا تھا سوا لاکھ روپیہ دینار سرخ، پاؤ بھر چڑیا کا دودھ۔ آدھ سیر گولر کے پھول۔

نظام: جی کیا فرمایا۔ چڑیا کا دودھ۔ گولر کے پھول۔

شیخ صاحب: جی ہاں جناب عرض تو کر رہا ہوں کہ چڑیا کا دودھ گولر کا پھول۔ مقصد یہ تھا کہ نہ چڑیا کا دودھ ملے گا نہ طلاق ممکن ہو گا نہ گولر کے پھول دستیاب ہوں گے نہ فارغ خطی کی نوبت آئے گی تو جناب۔ الا یکیس ہزار سکہ رائج الوقت تو گویا کچھ بھی نہ ہوا۔ میرے خیال میں ٹھیک ہے، حساب دوستاں در دل کے معاملات میں سے ہیں یہ باتیں۔

نظام: جی نہیں یہ غلط ہے شرعی نقطۂ نظر سے نیت ہونا چاہیے ادائیگی مہر کی۔

شیخ صاحب: درست ہے مگر میں جو کہہ رہا ہوں وہ بھی درست ہے چلئے میں ہوا وکیل اور دوسرے سہرا پڑھے۔

کی آواز آتی ہے [illegible]

نظام : [illegible] پڑھیے [illegible]

شیخ صاحب : [illegible] سہرا [illegible] سہرا [illegible] پڑھا [illegible]
پڑھنے والے کی آواز)

[illegible]

متعدد لوگ : سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ واہ واہ ارشاد ہو

شاعر : تسلیمات عرض ہے۔ عرض ہے۔

[illegible]
[illegible]

شیخ صاحب : خوب خوب [illegible]

واہ واہ کیا شعر

شاعر : آداب عرض کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو

ہیں عکس پہ یہ پھول [illegible] یہ خیال ہی ہے
[illegible] باندھ آئے قمر [illegible] کا سہرا

واہ کیا کہنا۔

شیخ صاحب : ارے بھئی میری بات تو سنو۔ سبحان اللہ کہہ صاحبزادے۔

شاعر : حسن سماعت ہے آپ کا عرض ہے

تو حسن کا ہے کا ایک صورت تو دیکھ اپنی
اس چاند کے لیے ہے بجرے گہن کا سہرا

(لوگوں کے قہقہے اور داد)

شیخ صاحب : استغفر اللہ۔ اپنی کہے جاتے ہو میری نہیں سنتے۔

شاعر : میں کس قابل ہوں حوصلہ بڑھاتے ہیں آپ سماعت فرمائیے۔

ہے جانگوش دولہا جنگل کا رہنے والا
گلشن کا کیا کرو گے منگواؤ بن کا سہرا

(لوگوں کے قہقہے اور داد)

شیخ صاحب : میں کہتا ہوں میری بات سنو۔

شاعر : قدر افزائی ہے آپ کی پیش کرتا ہوں۔

سہرا کسے بنائیں اور کیوں بنائیں آخر
کس چال ڈھال کا ہے اور کس چلن کا سہرا
(داور کا شعر)

شیخ صاحب: ارے بھئی حضرت سہرا۔ کمال کر دیا تم نے بھی سارا سہرا پڑھ گئے اور میری ایک بات نہ سنی عزیزم سہرا نکاح کے بعد پڑھا جاتا ہے۔

نظام: بہرحال اب تو پڑھ ہی دیا گیا۔ اب نکاح کی جلدی ہونا چاہیئے بہرحال۔ طے ہے کہ مہر گیارہ سو سے زیادہ نہ ہوگا۔

شیخ صاحب: پھر وہی۔ اگر بزرگ سمجھ کر مجھ کو بلایا ہے تو میری بات مانو ورنہ مجھے کیا میں اپنا راستہ لوں عجب بات ہے وہ اودھم، بابا آدم ہی نرالا ہے یہاں کا چار شادیاں، اپنی بھی ہوئیں سو شادیاں دوسروں کی دیکھیں مگر یہ اندھیر کہیں نظر نہ آیا۔

نظام: بہرحال یہ طے ہے قبلہ و کعبہ کہ مہر گیارہ سو۔

شیخ صاحب: تو یہ بھی طے ہے کہ میں نہیں بنتا وکیل۔

نظام: اس کا آپ کو اختیار ہے۔

شیخ صاحب: تو اس کا بھی اختیار ہے کہ میں واپس چلا جاؤں۔ اب منہ کیا دیکھ رہا ہے الطاف میاں جا کر اپنی ماں سے کہہ دے کہ بھر پایا میں نے میں جا رہا ہوں واپس۔

الطاف: وہ اسی لیے تو بلا رہی ہیں کہ وہ بھی واپس جا رہی ہیں۔

شیخ صاحب: بیشک جانا چاہیئے واپس کم سے کم اتنا تو متحد الخیال ہونا ہی چاہیئے میاں بیوی کو۔ جا کر بلاؤ اُن کو۔

نظام: قبلہ میری بات سن لیجئے۔

شیخ صاحب: جی کچھ نہیں بس ہو چکی بات ختم۔ ۲ ۔ بس اب خانہ آباد دولت زیادہ۔

الطاف: امی جان تانگہ پہ بیٹھ چکی ہیں۔

شیخ صاحب: بیٹھ چکنا چاہیئے تھا اُن کو چلو تم سب بھی، صغرا کہاں ہے نیاز۔ محمد سب آ گئے نا۔ بس ٹھیک ہے چلو۔

صغرا: آپ چل تو رہے ہیں مگر ———

شیخ صاحب: اگر مگر کچھ نہیں قرض کے بارے بھی بچے اور آن بھی قائم رہی یعنی وہ کیا ہے مصرعہ کہ جنت کی جنت اور رند کے رند خیر ہوگا کچھ مصرعہ گھر چل کر کہیں گے کہ ۲ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

(تانگہ چلنے کی آواز قریب سے دور جا کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

آم اور جامن

(تیز ہوا کے مسلسل جھونکے۔ درختوں کے ہلنے کی آواز۔ پرندوں کی چہچہاہٹ
کے بعد جامن کی آواز آتی ہے)

جامن: آم ... میں نے کہا آم کیا سو گئے؟

آم: ارے ہیں! نہیں تو جامن۔ بھلا یہ سونے کا وقت ہے۔ میں تو ابھی ایک ڈال پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کی جوڑی کے راز و نیاز سن رہا تھا۔

جامن: اور میں نے سمجھا کہ اس لیے آواز دی تھی کہ میری ایک جھکتی ہوئی شاخ پر طوطوں کا ایک جوڑا عجیب طرح کی باتیں کر رہا تھا۔

آم: عجیب طرح کی باتیں! وہ کیا!

جامن: وہی انسان کا دکھڑا۔ وہی اشرف المخلوقات کا رونا۔

آم: بڑی بھولی ہو تم بھی جامن۔ انسان کی باتوں کو تم عجیب و غریب کہتی ہو۔ حالانکہ روز دیکھتی ہو کہ انسان اس کثرت سے عجیب باتیں کرتا ہے کہ اب میرے نزدیک تو اس کی کوئی بات عجیب نہیں رہی ہے۔ وہ یقیناً اپنے کو اشرف المخلوقات کہتا ہے مگر میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ عجیب المخلوقات ہے۔ بہرحال وہ کیا باتیں تھیں۔

جامن: طوطوں کا جوڑا اپنے کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کی المناک داستان ایک دوسرے کو سنا رہا تھا۔ جس کو اس اشرف المخلوقات نے گرفتار کر لیا ہے۔ طوطا کہہ رہا تھا کہ اس بیچارے کو ایک خوبصورت سے پنجرے میں پر کاٹ کر بند کر دیا ہے۔ اور اسی پنجرے میں اس کو کھانے کے لیے چنے کی بھیگی ہوئی دال۔ کچھ پھل۔ کچھ ترکاریاں اور جانے کیا کیا دیا جاتا ہے۔

آم: اور وہ انسان یہ سمجھتا ہوگا کہ جس طرح وہ خود پیٹ کا غلام ہے اسی طرح یہ طوطا بھی۔ اس پنجرے میں کھانے پینے کی یہ چیزیں پا کر خوش ہوگا۔

جامن: اسی پر تو مجھ کو بھی تعجب ہے کہ اتنی بے ہودہ بات سوچنے والا اپنے کو اشرف المخلوقات کیوں کہتا ہے۔

آم: وہ خود کہتا ہے نا، خود ہی کہتا ہے۔ اور خود ہی سن کر خوش ہو لیتا ہے اور ہنستا ہے۔ طوطوں پر کہ یہ اپنے کو میاں مٹھو کہنے کے عادی ہیں۔ مگر جامن مجھ کو طوطوں کی یہ بات سن کر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ مجھ کو تو انسان سے ہر قسم کی بیہودگی کی امید ہے

(دُور سے کچھ لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز قریب آتی ہے)

جامن : چُپ رہو آم۔ وہ دیکھئے سامنے کچھ لڑکیاں ایک موٹی سی رسی لیے اسی طرف آ رہی ہیں۔

آم : خدا خیر کرے۔ ان کے ارادے مجھے اپنے حق میں کچھ نیک نظر نہیں آتے۔

(لڑکیاں ہنستی ہوئی قریب آتی ہیں)

ایک لڑکی : اری دیکھو تو سہی تارا۔ یہ درخت ٹھیک رہے گا جھولے کے لیے۔

دوسری : بس ٹھیک ہے۔ اس کی اس موٹی سی ڈال میں جھولا ڈال دو

ایک لڑکی : بھیا کو چڑھاؤ درخت پر۔ وہی جھولا ڈالیں گے۔

لڑکا : لاؤ رسی ادھر لاؤ۔ میں ابھی ڈالے دیتا ہوں جھولا۔ تم جب تک پٹڑا اٹھا لاؤ۔

دوسری : ابھی لیجئے، یار چل جلدی سے۔

ایک لڑکی : ٹھہر تو سہی پٹڑا وہ لا رہی ہیں نجمہ اور سلمیٰ۔

لڑکا : (درخت پر سے) لو دیکھو ٹھیک ہے نا جھولا۔

ایک لڑکی : بس ٹھیک ہے۔ آؤ نجمہ اس رسی میں ادھر سے تم ڈالو، پٹڑہ اُدھر سے تارا اور سلمیٰ ڈالیں گی۔

دوسری : بس ٹھیک ہے۔ اب آؤ بیٹھو۔ میں اور سلمیٰ پینگ دیں پھر تمھاری باری آئے گی تارا۔

ایک لڑکی : چلو یہی سہی۔ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی ساز چھیڑ دیں۔

(جھولے کا کورس گانا)

(گانے کے بعد لڑکیاں ہنستی ہوئی فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہیں)

(سناٹا، ہوا کا شور، پرندوں کی چہچہاہٹ، پھر آم کے کراہنے کی آواز.....)

آم : (کراہتا ہے) آہ۔ اُف۔ ہائے۔ آہ۔

جامن : آم کیا بات ہے۔ کیسی طبیعت ہے۔

آم : سخت درد ہے میری اُس ڈال میں جس پر ابھی جھولے کی مصیبت آئی تھی۔

جامن : مجھے بڑا ترس آ رہا تھا تم پر، جب تمھاری وہ ڈال مسلسل چرچرا رہی تھی۔

آم : میں تو سمجھتا تھا کہ آج میری یہ ہری بھری ڈال ٹوٹ جائے گی۔ اتنا بوجھ۔ ایسے ہچکولے۔ جان نکل کر رہ گئی میری تو۔

جامن : مگر آم تم نے یہ بھی غور کیا کہ یہ گانا تھا اس انسان کا۔

آم : جی ہاں یہ حق کی ٹھیکہ دار مخلوق گانا بھی اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے گاتی ہے یعنی گاتی اتنا نہیں ہے جتنا سناتی ہے۔

جامن : ہم تو اپنی موسیقی صرف اپنے لیے سمجھتے ہیں۔

آم : موسیقی ہوتی ہی صرف اپنے لیے ہے کہ اس کو خود محسوس کیا جائے، خود اُس پر وجد کیا جائے، خود اس کا لطف لیا جائے۔ یہ تو غذائے روح ہے۔ اور غذا کے سلسلہ میں میری سمجھ میں تو آتی نہیں، یہ ترکیب کہ کھائے کوئی اور پیٹ کسی کا بھرے۔

جامن : یہی وجہ ہے کہ ان کی موسیقی ہم کو بھی ایک بے معنی اور کھوکھلی سی معلوم ہوتی ہے۔

آدم : ٹھیک ہے جہاں صرف بیٹھ ہی تو کیا ہو۔ ہم تو موسیقی کو ایک مقدس چیز سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری موسیقی ہمارے اندر ہے اور ہم اس کو کسی قیمت پر باہر نہیں لا سکتے۔

جامن : ہم تو اگر اپنی موسیقی کو باہر کی کسی صورت سے ملا دیں تو ہماری موسیقی ختم ہو جائے۔

آدم : بات یہ ہے کہ ہمارے تو ذہن ہی سے بیشتر موسیقی بھی ہے۔ اگر وہ صدیوں کی طرح ہم ایک سکوت سے ہم تک پہنچائے گئے تو ہماری زندگی ہی کے حصے بن جاتے ہیں۔ ہم تو ان کو اپنا ایک ذاتی وجدان سمجھتے ہیں۔ سیکڑوں کی چیز نہیں جانتے۔ مگر انسان میں اتنا ظرف کہاں کہ وہ اپنی موسیقی کو سمیٹ کر رکھے۔

جامن : مگر ہم کو تو تعجب ہے کہ تم بھی موسیقی کی نقل کر رہے ہو جو ہم سے ہے۔ آج سے وہ موسیقی ہماری بھی نہیں۔

آدم : میں سمجھتا ہوں تمہارے نقطۂ نظر سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ مسائل غلط فہمی کا شکار ہو۔ یہی سمجھ کیا میں خود نہیں جانتا کہ وہ موسیقی جو پہلے سب سے مل کے دوسرے تک پہنچائی جائے۔ وہ موسیقی جو دوسرے سے حاصل کر کے اپنے ہجر میں ڈھالی جائے موسیقی تو خیر کیا ہوتی کوئی کاروباری معاملہ معلوم ہوتی ہے۔

جامن : اور تم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ انسان کو اپنی موسیقی کے لیے سازوں کا کس بری طرح محتاج ہونا پڑتا ہے

آدم : ہر طرح اپنی مردہ موسیقی میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بیچارے کوئی پوچھے ان سے کہ راگ تو بھی کوئی گانے یا سننے سنانے کی چیز ہے۔ اس کو تو بس ہماری طرح محسوس کرنا چاہئے اور اس کے کیف کو اپنے اوپر طاری کر کے خود سراپا نغمہ بن جانا چاہئے۔ ہم تو خود ہی اپنا نغمہ ہیں۔ خود ہی اپنا ساز ہیں۔ خود ہی مغنی ہیں اور خود ہی اپنے سامع۔

جامن : تو پھر آخر ان کی موسیقی کو تم کیا کہو گے۔

آدم : چھچھورا پن اشرف المخلوقات کا۔ ادھورا پن اس کا جو اپنے کو انسان کہتا ہے۔

جامن : دیکھنا سامنے والے بنگلے سے وہ دونوں پھر اسی طرف آ رہے ہیں جو روز آیا کرتے ہیں۔

آدم : اور پھر وہی باتیں دہرائیں گے، جو روز دہرایا کرتے ہیں۔ کل میری ڈال پر بیٹھے ہوئے ایک اُلو کی نیند ان دونوں کی باتوں سے اُچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ رات جاگنے کے بعد اپنی مادہ سے ہنس ہنس کر ان دونوں کی بیوقوفی کا ذکر کر رہا تھا۔

جامن : چپ رہو وہ قریب آ گئے ہیں۔

(ہوا کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ)

خالد : محبت نہ کرتے بڑا کام کرتے۔

طلعت : محبت سے لیکن بڑا کام کیا تھا۔

خالد : مگر طلعت، تم خود ہی انصاف کرو۔ کہ زندگی کو کب تک اس شیریں خواب کے سپرد کر کے ہم یوں ہی لوریاں سناتے رہیں گے۔

طلعت : ابھی سے گھبرا گئے خالد۔

خالد : تم اضطراب کو گھبراہٹ کہتی ہو۔

طلعت : میں نے تو اضطراب کے یہی معنی پڑھے ہیں۔

خالد : میں کتابی دنیا کی باتیں نہیں کر رہا ہوں، محبت کی اصطلاحیں کتابوں میں نہیں ملتیں۔ تم جس کو صبر جانتی ہو وہ میرے دل کے [illegible] ہیں۔ خود میرے لیے تو صرف اتنا ہی کافی ہے کہ تم مجھ کو اپنی وفا کا یقین دلا چکی ہو۔

طلعت : مگر آپ کے دل ناصبور کو یقین نہیں آتا۔ یہی نا!

خالد : اُس کو بھی یقین ہے۔ مگر صرف یہ یقین ہی تو ہماری آخری منزل نہیں۔

طلعت : وہ آخری منزل کونسی ہے۔ کیا میں معلوم کر سکتی ہوں۔

خالد : جہاں امید و بیم کی جنگ نہ ہو۔ جہاں شک اور یقین کی کشمکش نہ ہو۔ جہاں مجھ کو تمہارے والد کے انکار اور تمہاری مجبوری کا دھڑکا نہ ہو۔ جہاں مجھے مسعود سے تمہاری منگنی کا دھڑکا نہ ہو۔

طلعت : خالد۔ میں نے تم سے پچاس مرتبہ کہا ہے کہ مسعود کا نام میرے سامنے نہ لیا کرو۔ میں اس کا نام برداشت نہیں کر سکتی۔

خالد : تم سے زیادہ یہ نام میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ مگر میں کیا کروں کہ اس کے امکان روز بروز قوی سے قوی تر ہوتے جا رہے ہیں۔

طلعت : مگر آخر میں اُسے ناکام ہونا پڑے گا۔ اس لیے کہ مجھے تم سے ۔

خالد : ہاں ہاں مجھ سے کیا؟ کہہ دو طلعت۔ خدا کے لیے اپنی زبان کو آزاد چھوڑ دو۔ طلعت میں وہی بات سننا چاہتا ہوں۔ جو تم سنانے سے کترا رہی ہو۔ جو تم نہیں کہنا چاہتیں۔ میں وہی سننا چاہتا ہوں۔

طلعت : تم خود جانتے ہو تو پھر پوچھتے کیوں ہو۔

خالد : جانتے ہوئے بھی جاننا چاہتا ہوں۔ اپنی روح میں بالیدگی پیدا کرنے کے لیے۔ امیدوں پر سے یاس کا زنگ اتارنے کے لیے دل کی مردہ امنگوں کو آبِ حیات پلانے کے لیے میں تم سے وہی سننا چاہتا ہوں۔ جو تم سنانے سے پرہیز کر رہی ہو۔ کہہ دو اچھی طلعت

طلعت : ہزار مرتبہ تو کہہ چکی ہوں۔

خالد : اس بات کو حدودِ شمار کا پابند نہ بناؤ۔ پھر کہہ دو۔ اچھی طلعت تمہیں مجھ سے کیا ہے؟

طلعت : میں کہہ تو چکی ہوں کہ مجھے تم سے۔ تم سے مجھے، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

خالد : طلعت یقین دلاؤ کہ میں جاگ رہا ہوں۔ قسم کھاؤ کہ یہ خواب نہیں ہے۔

طلعت : پاگل ہوئے جا رہے ہو تم تو۔

خالد : ہاں اس لیے کہ اسی کو محبت کا ہوش کہتے ہیں۔ طلعت ابھی تم نے کہا تھا۔

طلعت : کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے تم سے کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ اچھا اب اجازت دو مجھے بس اتنی ہی مہلت تھی

خالد : نہیں ابھی نہیں۔ اتنی جلدی نہیں۔ ان چند منٹ کے انتظار میں مَیں نے پہاڑ سی رات اور سست رفتار رینگنے والا دن کاٹا ہے۔

طلعت : پھر وہی۔ تم چاہتے ہو کہ یہ مہلت بھی نہ ملے۔

خالد : اچھا کل۔

سلمیٰ : ٹھیک ہے، اسی وقت، دو بجے۔

(دوسرا منظر۔ پھولوں کا باغیچہ)

آم : (زخمی لہجہ) عجیب خرافات ہے، یہ کتاب ہے کہ خرافات۔

جامن : مگر تم بھی تو ایک ہی بیٹھک میں سارا ہی پڑھ گئے۔ بیچارے تو باتیں لکھ رہے تھے۔

آم : یہ باتیں اتنی آسانی سے سمجھنے کی نہیں ہیں جامن۔ یہ لوگ آپس میں محبت کر رہے تھے۔

جامن : (بے تکلفی سے) کیا یہاں محبت بھی ہوتی نہیں بلکہ کی جاتی ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی پیسے لے کر محبت کر رہا ہوں، بیگار کر رہا ہوں، ملازمت کر رہا ہوں۔

جامن : واقعی عجیب بات ہے تو کیا ان بیچاروں کو محبت کا بھی مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔

آم : یہ سب اس لیے ہے کہ ان میں محبت ہوتی نہیں بلکہ محبت کرنے والے ہوتے آیا کرتے تھے۔ ہم میں سے تو کسی کو بھی نہیں دیکھا۔ جس نے محبت کا اظہار کیے بغیر محبت کا اظہار کیا ہو۔ ایسے میں تو مجھ کو بڑی ہنسی آئی جب ایک شخص نے اپنی محبوبہ سے کہہ رہا تھا کہ ـــ

محبت حسن کے الفاظ میں ڈھالی نہیں جاتی
یہ وہ نازک حقیقت ہے جو سمجھائی نہیں جاتی

جامن : (بے ساختہ ہنس کر) اچھا۔ تو گویا یوں سمجھا رہے تھے۔

آم : بات یہ ہے کہ کچھ حقیقتیں اس بے چاری مخلوق تک رفتہ رفتہ پہنچ تو رہی ہیں۔ مگر ابھی ان حقیقتوں کے رموز پا لینے کی صلاحیت ان میں نہیں ہے۔ وہ ان لطیف باتوں کو اپنے کرخت ماحول میں لا کر عجیب مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔

جامن : مجھے تو بڑی ہنسی آ رہی تھی۔ آم جب وہ شخص اپنی محبوبہ سے بار بار کہہ رہا تھا کہ تم اپنی زبان سے کہہ دو کہ تم کو مجھ سے محبت ہے۔ کیا اس کی آنکھ میں اتنا نور بھی نہ تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کی آنکھ میں اپنے لیے محبت دیکھ لیتا؟

آم : تم نہیں جانتیں جامن جو محبت پیدا نہ ہو بلکہ کی جائے وہ اسی قسم کی باتیں چاہتی ہے۔ اس مصنوعی محبت کے لیے صرف ایک دل کافی نہیں ہوتا۔ آنکھ بھی کچھ دیکھنا چاہتی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ محبت نہ ہوتی ہے۔ بلکہ بقول انسان کے کی جاتی ہے بلکہ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ جتائی جائے۔

جامن : خیر یہ تو میں سمجھ گئی مگر فرض کر لو کہ محبت ہوئی نہیں تھی۔ بلکہ کی ہی گئی تھی، تو بھی محبت کے بعد اس شخص کو آخر اتنے اندیشے اور اتنے خطرے کس بات کے تھے۔

آم : بڑی بھولی ہو تم جامن۔ نقل اصل تو نہیں ہو سکتی، نقل کو لاکھ اصل کے مطابق بنایا جائے۔ مگر اس کی طرف سے ہمیشہ یہ دھڑکا ہے کہ ملمع اتر نہ جائے، اصلیت بے نقاب نہ ہو جائے۔ اس قسم کی نقلی محبت کرنے والا ظاہر ہے کہ وہ خود اعتماد نہیں ہو سکتا۔

جامن : یہ تو ٹھیک ہے آم۔ مگر مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کو محبت کے بعد کچھ اس قسم کا انتظار ہو جیسے امتحان دینے کے

طالب علموں کو کامیابی اور ناکامی کا انتظار رہتا ہے۔

آم : ٹھیک ہے بالکل اسی طرح انسان محبت میں بھی سود و زیاں دیکھتا ہے۔ ہماری تمہاری طرح انسان کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ محبت پیدا ہو گئی، تو اس کے لطف کو اس کا حاصل سمجھ کر اسی میں گم ہو گئے۔ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ جس سے وہ محبت کرتا ہے، وہ بھی اس سے محبت کرے۔

جامن : ٹھیک ہے یہ سب فتور اس میں محبت کرنے کا ہے۔ اگر محبت خود بخود ہو جایا کرتی ہم لوگوں کی طرح تو انسان کو بھی دوسری طرف سے اس کے جواب کا انتظار نہ ہوتا۔

آم : عجب کی بات ہیں جامن۔ انسان تو محبت باہر سے اپنے لیے حاصل کرتا ہے بجائے اس کے کہ یہ طوفان خود اس کے اندر سے امنڈے۔ اس کے یہاں دو نگاہوں کے تصادم اور دو دلوں کے ٹکراؤ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ گویا یہ بھی تالی ہے۔ جو ایک ہاتھ سے بج نہ سکے

جامن : واقعی عجیب مخلوقات ہے انسان بھی۔ ہمارے یہاں تو محبت کی خبر کبھی کسی کو نہیں ہوتی ہم تو اس نعمت کے سلسلے میں اتنے خود غرض ہیں کہ اس میں اپنا شریک بھی کسی کو بنا ہی نہیں سکتے اور یہ دلِ ناصبور کیا چیز ہوتی ہے آم۔

آم : (قہقہہ لگا کر) اچھا تم یہ بھی نہیں سمجھیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں جس وقت جذبۂ محبت پیدا ہو جاتا ہے پھر ہم کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہمارا دل مستغنی ہو جاتا ہے۔ گویا اس کو سب کچھ مل گیا۔ اس کے برعکس انسان نے جہاں محبت پائی، اس کا دل اچھا خاصہ دلِ ناصبور بنا۔ پھر اس کو نہ دن چین رہتا ہے، نہ رات آرام۔

جامن : ہائے ہائے۔ ارے آم۔ کہیں یہ کم بخت کسی عارضہ کو تو اپنی زبان میں محبت نہیں کہتے۔

آم : نہیں نہیں کہتے۔ تو یہ بھی محبت ہی کو محبت ہیں، مگر محبت کی روح سے بے خبر ہیں۔ ان کے یہاں تو محبت کو غمِ محبت تک کہا جاتا ہے

جامن : کیا کہا غمِ محبت۔ لو اور سنو۔ نشاطِ محبت شروع ہوئی۔ اور ان کی حالت غیر ہو گئی۔ سرد آہیں، گرم آنسو۔ بیماروں کی سی صورت۔ وحشیوں کی سی وضع قطع۔ وہ جو اس روز ایک شخص میرے گھنیرے سائے میں بیٹھا اپنے لمبے لمبے الجھے ہوئے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ کبھی ہنستا تھا کبھی روتا تھا، کبھی شاعری کرتا تھا۔ وہ بھی کوئی پاگل نہیں اہلِ محبت تھا۔

جامن : محبت کی طرح شاعری بھی انسان کے یہاں کی جاتی ہے۔

آم : جی ہاں جو ادا ہو جائے۔ یہ عقلمند اس کو شعر کہتا ہے۔

جامن : حالانکہ جو ادا نہ ہو سکے وہ شعر ہے۔ ارے دیکھنا آم یہ دو آدمی کون آ رہے ہیں ادھر۔ میرے خیال میں تو ڈاکو ہیں۔

آم : ہاں ایک قسم کے ڈاکو ہی ہیں۔ وہ خوفناک سا شخص اس باغ کا ٹھیکہ دار ہے اور دوسرا شاید کوئی نیا گاہک پھانسا ہے۔

جامن : چُپ رہو وہ قریب آ گئے ہیں۔

(ہوا کا شور۔ پرندوں کی چہچہاہٹ)

ٹھیکیدار : یہ دیکھئے شیخ جی۔ ایک اسی درخت کو دیکھ لیجئے۔ لدا ہوا ہے۔ اور قوم بھی جو کچھ ہے اس آم کی وہ ظاہر ہی ہے۔ مگر میں ایک ایک درخت کا سودا نہیں کروں گا۔ باغ کا باغ لینا پڑے گا۔

ذیب : ہاہا [illegible] پیڑ پہلے ہی [illegible]

سپیدار : [illegible]

ذیب : [illegible]

سپیدار : [illegible] ہو گیا۔

ذیب : تم اپنے دشمنوں [illegible] بھی تو دیکھنا ہے

سپیدار : جاؤ آؤ جامن کی بھی بات ہو جائے۔

(دونوں جاتے ہیں۔)

([illegible])

آم : [illegible]

جامن : ہاں بھائی آم۔ تم تو ایک دم [illegible]

آم : [illegible]

جامن : تمہارا سودا ہو رہا تھا کیا۔

آم : ہاں میرے ننھے ننھے بچے [illegible] میری آنکھوں کے [illegible] سودا ہو رہا تھا۔ اب [illegible] توڑ کر [illegible] جائیں گے۔ [illegible] اور ہر سال [illegible] ہے۔

جامن : میری گود بھی ہمیشہ اسی طرح خالی ہوتی ہے۔

آم : اپنے کو اشرف المخلوقات کہنے والا یہ انسان ہماری [illegible] ہم سے چھین کر [illegible] کیا کرتا ہے۔ یہ کس قدر محتاج ہے ہمارا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کاروبار، اس کی ادنیٰ اور اعلیٰ ضرورتیں ہم ہی سب سے وابستہ ہیں ورنہ یہ خود ہمارے کسی کام کا نہیں۔ اب یہ دیکھو ہمارے ننھے ننھے بچوں کو ہم سے چھین لے جانے کا اس کا [illegible] بھنبوڑ کھائے گا (رو دیتا ہے)

جامن : صبر سے کام لو آم۔ یہ آنسو تمہارے رخسار پر بہتان معلوم ہوتے ہیں۔

آم : یہ آنسو میں نے انسان کے لیے تھوڑی بہائے ہیں۔ جو بہتان نظر آئیں۔ یہ تو میں اپنے اوپر بہا رہا ہوں۔

جامن : بات یہی ہے انسان پر بھی آنسو بہانے آم۔

آم : تم نے۔ وہ کیوں؟

جامن : رات میرے نیچے ڈاکو اپنا چوری کا مال آپس میں بانٹ رہے تھے۔ اور پھر ان میں ایسی لڑائی ہوئی کہ ایک نے دوسرے کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا۔

آم : یعنی مار ڈالا۔ بالکل۔

جامن : مقتول بےچارہ مر گیا اور قاتل مال لے کر بھاگ گیا۔ میں پھر دیر تک سو نہ سکی۔ میں نے سوچا کہ خدا نے یہ بھی کیا مخلوق بنائی ہے کہ سونے چاندی ایسی حقیر دھاتوں کے لیے جن کا خالق وہ خود ہے۔ یہ انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔

آم : سونے اور چاندی۔ ارے یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ سونا اور چاندی تو انسان کے لیے سب ہی کچھ ہے۔ وہ اپنی بڑائی اور چھوٹائی اسی معیار پر جانچتا ہے۔ جس کے پاس یہ زیادہ ہے وہ بڑا ہے، اور جس کے پاس کم وہ چھوٹا ہے۔

جامن : خواہ وہ زیادہ طاقتور ہو۔

آم : طاقتور کمزور سمجھا جائے گا۔ بغیر سیم و زر کے اور کمزور طاقتور گنا جائیگا اگر اس کے پاس سونا چاندی ہے۔

جامن : خواہ وہ حسین ہو۔ عقلمند ہو۔ ہوش گوش کا آدمی ہو۔

آم : عقلمند اور ہوش گوش کا تو خیر اس مخلوق سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ مگر کوئی بھی وصف بغیر دولت کے بیکار ہے۔

جامن : دولت ؛ وہ کیا چیز ہے ؟

آم : یہی سونا چاندی وغیرہ۔ اسی سے وہ اپنی شان بڑھاتا ہے۔ اسی سے زیب و زینت کو فروغ دیتا ہے۔

جامن : تو یہ شان اور یہ زیب و زینت اس کی کب ہوئی یہ تو سونا چاندی کی ہوئی۔

آم : یہی باتیں تو یہ جانور سمجھتا نہیں۔ جس کو ہم انسان کہتے ہیں اور جو اپنے کو اشرف المخلوقات کہتا ہے، اگر اسی حقیقت کو یہ سمجھ پا جائے۔ تو اور چاہیے ہی کیا مگر اسی سے وہ کوسوں دور ہے، اس کی آنکھ باہر بنائی گئی ہے۔ جو اپنے اندر نہ اپنا حسن دیکھ سکتی ہے، نہ اپنی بدصورتی، وہ دوسروں کا حسن دیکھتی ہے۔ دوسروں کے عیب اس کو نظر آتے ہیں۔ وہ تحقیق اور تجسس میں بہت دور نکل گیا ہے سوائے اپنی تحقیق اور تجسس کے۔ سن رہی ہو جامن۔ جامن۔ ..... ارے سو گئیں تم تو۔ واقعی رات بھی زیادہ آگئی ہے۔ پرندے بھی بسیرا لے رہے ہیں۔ اُلّو کی بیداری کا وقت آگیا ہے۔

اچھا شب بخیر!

نقش و نگار

رحیم سو رہا ہے۔ اس کے خراٹوں کی آواز پر عورت کی آواز غالب آتی ہے)

بیوی۔ اللہ کی سو ... اس طرح پڑے ہے۔ عجب غضب خدا کا، دھوپ سر پر آ گئی اور یہ ابھی تک پڑے اینڈ رہے ہیں۔ یہی نحوست
گھر میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جگاتے جگاتے میں تو تھک گئی ہوں۔ خدا کے لئے اب اٹھ بیٹھو۔ دوپہر
ہونے کو آئی سورج سر پہ آیا ۔۔ میں نے تو سیکھ لیا۔

رحیم۔ (کروٹ بدل کر) کیا غضب ہو رہا ہے۔ دو گھڑی سونا بھی دوبھر ہو گیا ہے۔

بیوی۔ ذرا اٹھ کر دیکھو تو۔ سورج کہاں کا کہاں پہنچا۔ دھوپ میں ڈھیر پڑے ہو۔

رحیم۔ بھلی واہ، کل رات تو۔ کم سے کم ہی سونے دیا ہوتا کہ رات بھر محنت سے کس وقت تھا۔ ایک بجے شو ختم ہوا۔ دو بجے تک
حساب کتاب کیا۔ تین بجے گھر پہنچا۔ آخر انسان ہوں۔ کوئی بھوت تو نہیں ہوں۔

بیوی۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں بھی آخر کیا کروں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں۔ کہو اٹھیں تو خرچ دیں۔ سودا سلف
منگا دوں۔ پھر چولہا ہانڈی کروں۔ وقت پر کھانا نہ دوں تو ابھی قیامت برپا ہو گی۔ مجھے خرچ دے دو۔ چاہے دن چڑھے تک
پڑے اینٹھتے رہنا

رحیم۔ دن بھر پڑے اینٹھتے رہنا گویا مجھے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ابھی جانا ہے ریہرسل کرانے آج کے شو کا۔

بیوی۔ اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ خرچ دے دو۔ تاکہ وقت پر کھانا تو مل جائے۔

رحیم۔ اب مجھے بیچ کر کہیں نیلام کر دو۔ تو شاید خرچ مل جائے۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں۔

بیوی۔ لو اور سنو! ان کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں، اور گھر میں جیسے قارون کا خزانہ گڑا ہوا ہے۔ میں کہتی ہوں آخر کل
کچھ آمدنی ہوتی تھی یا نہیں؟

رحیم۔ خاک آمدنی ہوتی تھی۔ کل چودہ روپے کے ٹکٹ بکے باقی سارا منڈوا فری پاس والوں سے بھرا ہوا تھا۔ کل کا حساب
ابھی اپنے سر قرض ہے۔ جو آج کی آمدنی سے ادا ہو گا۔

بیوی۔ میں تو پہلے جانتی تھی کہ اس موئی گانے بجانے، ناچنے تھرکنے کی کمائی میں برکت نہیں ہے۔ زندگی بھر یہی بھاڑ جھونکا

اور رہے بھڑبھونجے کے بھڑبھونجے۔

رحیم:۔ یہ تم کہہ رہی ہو بھول گئیں، وہ دن جب ماسٹر رحیم ماسٹر رحیم کے ڈنکے پٹے ہوئے تھے۔ آج بھی تمہارے پاس وہ سارے تمغے موجود ہوں گے۔ جن سے یہ چٹان کا چٹان سینہ ڈھک جاتا تھا۔

بیوی:۔ وہاں ہاں پڑے ہوئے ہیں وہ موٹے ٹھولی چاندی، گلٹ اور پیتل کے تمغے کیا کروں۔ ان کا اوڑھوں، بچھاؤں، چاٹوں، چباؤں، آخر یہ ہیں وہ کس مصرف کے، کس مرض کی دوا ہیں موئے ٹھیکرے؟

رحیم:۔ میری عزت کے نشان ہیں وہ۔ میری مقبولیت کی سند ہیں وہ۔ اب میں کیا کروں۔ کم بخت کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ورنہ آج دھن برس رہا ہوتا۔

بیوی:۔ ہاں اور کیا۔ جب بڑا دور دورہ تھا ناٹک کا، تب تو بس، وقت بھی بستے نہ دیکھا۔ جو جیسے دیکھ رہی ہوں۔ جب ڈنکے بجتے تھے اور آج بھی بج رہے ہیں۔ جو رہے سہے دو چار تار تھے ہاتھ پان میں وہ بھی لے جا کر اس مرنے منڈوے پر لگا آئے۔ جس میں چودہ روپے کے ٹکٹ بکتے ہیں۔

رحیم:۔ اس کی تو خیر وجہ یہ ہے۔ ابھی لوگوں کو معلوم ہی نہیں اس منڈوے میں ہوتا کیا ہے۔ ذرا چرچا ہونے دو۔ پھر دیکھنا کہ خلقت کیسی ٹوٹتی ہے۔ اور روپیہ کیسا برستا ہے۔

بیوی:۔ بادل کو دیکھ کر گھڑے توڑتے تم کو دیکھا ہے کہ روپیہ برسنے کی امید پر میرے جہیز تک کا زیور ٹھکانے لگا آئے۔

رحیم:۔ جہیز کا طعنہ مجھ کو تو دے رہی ہو۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ میری زبان کھلواؤ، وہ جو کچھ تم جہیز میں لائی تھیں۔ وہ میں ابھی بھولا نہیں ہوں۔ وہی مثل کہ نام بڑے اور درشن چھوٹے مشہور تو تھے۔ بڑے ٹھیکیدار صاحب اور بیٹی کو رخصت کیا اس طرح کہ کوئی خانساماں رخصت کرے گا۔ ان مسکینوں کی بیٹیاں بھی یوں رخصت نہ ہوتی ہوں گی۔

بیوی:۔ خیر میرے باپ بھائی تو خانساماں، کن میلے تھے، مگر جناب کے در دولت پر کون سے ہاتھی جھوم رہے تھے۔ تو یہ ہے میرے اللہ بخشے ابا میاں کو خبر بھی ہو جاتی کہ ان کو رئیس لڑکے کو وہ ناٹک کا منیجر سمجھ رہے ہیں وہ تھیٹر کا مسخرا ہے۔ تو ادھر کی دنیا ادھر ہو جاتی، کبھی جو وہ منظور کرتے یہ رشتہ۔

رحیم:۔ بکواس بند کرو۔ ورنہ ساری قلعی کھول کر رکھ دوں گا۔ سوائے اس کے وہ جو سائیکلوں کے پنچر جوڑا کرتا تھا، تمہاری نسبت ہی اور کونسی آئی تھی۔ انھوں نے تو شکر کیا ہوگا کہ ایک معزز گھرانے سے نسبت آئی تو سہی۔

بیوی:۔ ہائے رے معزز گھرانے۔ دیکھا ہے میں نے وہ معزز گھرانا۔ ایک بھائی جادو کے کرتب دکھاتے پھرتے ہیں۔ گولی منہ سے کھائی۔ کان سے نکالی۔ دوسرے جیٹھ اللہ میری توبہ ہے، در در گھوم کر کٹھ پتلیوں کا تماشہ دکھاتے پھرتے ہیں۔ یہی کام تو ہوتا ہے معزز گھرانوں کا۔

رحیم:۔ خیر وہ جادو کے کرتب دکھائیں یا کٹھ پتلیوں کا تماشہ تمہارے یہاں کی طرح چوری تو نہیں کرتے۔ ڈاکے تو نہیں ڈالتے۔ جیب تو نہیں کترتے۔ تمہارے بھائی قمر کی طرح۔

بیوی:۔ تو کس نے کہا تھا۔ کہ چوروں اور ڈاکوؤں کے یہاں نسبت کے لیے دوڑو، دوڑ کر جوتیاں توڑو،

رحیم :- [illegible] کر لیجئے

بیوی :- خدا کے لئے [illegible] اور

[illegible]

[illegible] ہو چکے۔

رحیم :- [illegible] آپ [illegible]

بیوی :- [illegible] ہو گا۔

رحیم :- [illegible]

بیوی :- تو مجھے بھی [illegible] میں

[illegible] ہے۔

رحیم :- [illegible] ہیں۔

بیوی :- تو تم کیا کر لو گے میرا؟

رحیم :- [illegible] بدل دینے۔

بیوی :- اونچی آواز سے [illegible] تو [illegible]

رحیم :- میں کہتا ہوں، زبان قابو میں رکھو۔ ورنہ گدی سے کھینچ لوں گا۔ [illegible]

بیوی :- بس بس بہت ہو چکی۔ خانہ آباد [illegible] زیادہ [illegible] میں بھی [illegible] تو [illegible] دروازے پہ تھوکنے بھی نہ آؤں گی۔

رحیم :- برداشت کی حد ہو گئی، جو قدم نکالا اس گھر کے باہر۔

بیوی :- تم مجھ کو نہیں روک سکتے۔

رحیم :- تم نہیں جا سکتیں۔

بیوی :- میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی، ہمت ہے تو روک دو۔

رحیم :- (دھکا دے کر) بیٹھو ادھر۔ لاتوں کا بھوت باتوں سے نہیں مانتا۔

(بیوی بلند آواز میں رونا شروع کرتی ہے، ہائے مجھے مار ڈالا)

(دروازے پر دستکیں)

ایک اہل محلہ :- ماسٹر رحیم۔

دوسرا :- رحیم خان صاحب

پہلا :- ماسٹر رحیم دروازہ کھولو	}	بیوی کے رونے کی آواز مسلسل
دوسرا :- خان صاحب باہر تو آؤ خان صاحب	}	آ رہی ہے۔

رحیم :- (دروازہ کھول کر) فرمایئے کیا بات ہے۔

ایک اہلِ محلہ :- یہ کیا آفت مچا رکھی ہے ماسٹر تم نے۔ آخر بات کیا ہے؟

رحیم :- آفت ابھی کہاں مچائی ہے۔ آفت تو اب مچاؤں گا۔ میں اس کی جان لے کر چھوڑوں گا۔ اس نے اندھیر مچا رکھا ہے۔

دوسرا :- بڑی بات ہے خان صاحب۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا بھی کوئی شرافت ہے۔

پہلا :- مگر سوال یہ ہے کہ آخر ہوا کیا۔ سارا محلہ اپنے دروازے پر جمع کر لیا تم نے۔

رحیم :- ابھی تو یہ تماشہ ساری خلقت دیکھے گی۔ جب میں اسے ختم کر کے پھانسی چڑھنے جاؤں گا۔

پہلا :- مگر کچھ معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے۔

رحیم :- دیکھئے صاحب میری سنی نہ سنیئے گا۔ خدا لگتی کہیئے گا۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ میں اپنے زمانے کا منجھا ہوا ایکٹر رہ چکا ہوں ناٹک کا۔ کمپنی والے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے۔ مگر اب اس مقدر کو کیا کروں۔ کہ ناٹک کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ نہ وہ قدر رہی نہ وہ روزی۔ جب فاقوں پر نوبت آگئی۔ تو ادھر اُدھر ہاتھ پیر مار کر خود اپنا چھوٹا سا منڈوا بنایا۔ پرانے ساتھیوں کو جمع کیا۔ ٹوٹا پھوٹا سامان اکٹھا کیا۔ کہ جیسی چار پیسے کی صورت دکھائی دے۔

دوسرا :- یہ تو ماسٹر ہم خود دیکھ رہے ہیں۔ کہ بڑی محنت کر رہے ہو تم۔

رحیم :- ایسی ویسی محنت۔ اللہ جانتا ہے۔ رات کو رات اور دن کو دن نہیں سمجھا میں نے۔ اپنے کو مٹا دیا میں نے۔ یہ منڈوا بنانے کے لئے اور آپ لوگوں کو میری قسم ذرا میرے ساتھ چل کر دیکھئے کہ میں نے تیاری کیسی کی ہے۔ بس اب مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔ خود ہی چل کر دیکھ لیجئے۔ یہ سامنے ہی تو ہے کون سا دور ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ذرا سی دیر کے لئے چلے چلئے۔

پہلا :- خان صاحب ہم کو آپ کی بات کا یقین ہے۔ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہی ہوگا۔

رحیم :- یہ بات نہیں۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لئے ذرا چل کر دیکھ لیجئے۔ آیئے مرزا جی۔ آیئے نا آپ سب آیئے۔

دوسرا :- چلو بھئی چلو۔ ان کی خوشی ہو جائے۔

(سب چلتے ہیں)

رحیم :- تشریف لایئے۔ مرزا جی سچ کہتا ہوں غلامی قبول کروں گا۔ اگر اتنی جلدی ایسی تیاری کوئی مائی کا لال کر دکھائے ذرا ایک منٹ۔ [illegible] نکل نہ جائے کم بخت۔

(فیڈ آؤٹ ہوتا ہے اور جلدی گھنگروؤں کی آواز نمایاں ہوتی ہے۔

رحیم :- (قریب آ کر) بند کر دو باجہ۔ تشریف رکھئے آپ لوگ۔ ماسٹر غزالی ذرا جلدی کرو۔ اور وہ سین دکھاؤ آپ لوگوں کو جب شہزادی محل کے باغ میں سپاہی زادے سے ملتی ہے۔ اور دونوں میں محبت کا عہد و پیمان ہوتا ہے۔ جلدی کرو۔ (اپنے اہلِ محلہ سے) آپکے تماشے میں یہ محبت کا سین ایک ٹکڑا ہے۔ ہمارے آج کے کھیل کا۔ مگر اسی سے آپ کو

دیتے ہو چلے گا اس پہلے سے مشاعرے میں ہم اپنی جانب سے کتنی بڑی چیز پیش کر رہے ہیں۔
یہ زمانہ سے کیسا اچھا منظر ہو رہا ہو۔
ڈراپ اٹھتا ہے،

گلنار۔ شہباز!

شہباز۔ شہزادیٔ عالم۔

گلنار۔ جو تم نے مجھے شہزادی زبان میں مخاطب کیا۔ تو تم مجھے گلنار کیوں نہیں کہتے۔

شہباز۔ ایاز اپنی جگہ پہچانتا ہے۔ شہزادیٔ عالم۔

گلنار۔ یہ تو کر اب محبت چھین جو کہ گلنار تمہارے سامنے شہزادی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بیزار حیثیت سے آئی ہے۔

شہباز۔ افق پر زمین اور آسمان ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر کون نہیں جانتا کہ یہ نگاہوں کا دھوکا ہے۔

گلنار۔ تو میری محبت کو دھوکا کہہ رہے ہو۔

شہباز۔ یہ میری جرأت نہیں شہزادیٔ عالم۔ مگر میں اپنی حقیقت سے بھی ناواقف نہیں ہوں۔

گلنار۔ تمہاری حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کہ میں تم کو چاہتی ہوں۔ تمہارے لئے سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔ اپنا شاہانہ اقتدار اپنے محل کے ناز و نعم، تخت و تاج کے تمام حقوق تم ایک مرتبہ مجھ کو اپنا کر کے تو دیکھو۔

شہباز۔ مگر میں حق نمک کیسے قربان کردوں شہزادیٔ عالم۔

گلنار۔ کیا تم کو مجھ سے محبت نہیں۔

شہباز۔ اگر میں انکار کروں تو یہ جھوٹ ہوگا۔ مگر غریب کی بیشمار تمناؤں کی طرح محبت بھی اس لئے ہوتی ہے۔ کہ اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ میں اپنی محبت کو اپنے دل میں دفن کر سکتا ہوں۔ مگر مجھ سے یہ ناممکن ہے کہ شہنشاہِ عالم کا مجھ پر جو اعتماد ہے اس کا خون اپنے ہاتھوں سے کردوں، میں غریب سپاہی زادہ ہوں۔ مگر میری رگوں میں شرافت کا خون بھی ہے۔ یہ خون اس وقت جم جائے گا۔ جب ناموسِ شاہی پر ہاتھ ڈالنے کا ناپاک خیال بھی میرے ذہن میں آیا۔

گلنار۔ اور اگر خود بادشاہ بابا میرا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیں۔

شہباز۔ تو میں سمجھوں گا کہ شانِ خسروی نے ایک ذرے کو آفتاب بنا دیا۔

گلنار۔ اچھا تو تم اپنی شرافت کی قسم کھاؤ اور میں اپنی محبت کی قسم کھاتی ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے سوا کسی کے نہ ہوں گے۔

شہباز۔ آپ قسم کھاتی ہیں تو یہ قسم اسی دن کھا چکا ہوں جب آپ کے محل پر آنے سے بیشتر یہ پیام آپ کی نگاہوں میں تھا۔

ایک اہل محلہ۔ سبحان اللہ۔ کیا کہنا ہے ماسٹر صاحب۔

دوسرا :- محبت کا سین ہے۔ مگر کس قدر پاکیزہ ہے۔ اور کیا کیریکٹر پیش کیا ہے۔ سپاہی زادے کا واہ۔ واہ واہ۔

رحیم :- صاحب یہ تو ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور ملاحظہ فرمائیے۔ (آواز دے کر) ادھر آؤ اب وہ سین پیش کرو۔ جب شہباز کے قتل کے بعد شہنشاہ محل سرا میں ملکہ کے پاس آتا ہے۔ (ان لوگوں سے) ذرا اس سین میں شہنشاہ کی ایکٹنگ دیکھئے اور یہ اندازہ کیجئے کہ یہ چند دن کی محنت کا نتیجہ ہے (آواز دے کر) ملکہ اپنی جگہ پر جاؤ گئیں؟ چلو۔ (پردہ) شہنشاہ تالی بجاتا ہے۔

ملکہ :- جہاں پناہ۔

شہنشاہ :- بس ملکہ۔ مجھ سے دور رہو۔ میں خونی ہوں۔ (جلدی سے) (اونچی آواز میں) میرے یہ ہاتھ ایک بے گناہ کے خون سے تھڑے ہوئے ہیں میرے دامن پر خود میرے ہی ایک نمک خوار کے خون کا ایسا دھبہ ہے جس کو میرا عرقِ انفعال بھی نہ دھو سکے گا۔ میں نے محبت کا خون کیا ہے۔ میں نے بے زبانوں کا صبر سمیٹا ہے۔ دیکھو، میں قاتل ہوں خود اپنی اولاد کی تمناؤں کا قاتل۔ گنہگاروں کی بے بسی کے آنسو مجھ کو غرق کرتے رہیں گے۔ شہباز کی بدنصیب روح آ آ کر مجھ کو بھسم کر دے گی۔ انصاف اور رحم دونوں میرے منہ پر تھوکیں گے۔ تاریخ میرے گلے میں لعنت کا طوق ڈالے گی۔ اور میرا ضمیر اگر زندہ رہا۔ تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔

ملکہ :- دیکھئے، جہاں پناہ کے دشمن۔ ایسی بات تو زبان پر نہ لائیں۔

شہنشاہ :- مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو ملکہ۔ خوب جشن مناؤ۔ سوتیلی اولاد کو تڑپا کر رقص کی محفل آراستہ کرو۔ میری معصوم بچی کا دل توڑ کر اپنی دلبستگی کے سامان کرو۔ کسی کے گھر کا چراغ بجھا کر اپنے محل میں چراغاں کرو۔ میں تم کو مبارک باد دینے آیا ہوں کہ اپنی آتشِ انتقام کو سرد کر کے تم نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیا۔

ملکہ :- عالم پناہ! میں نے سب کچھ ناموسِ شاہی کے لئے کیا تھا۔

شہنشاہ :- ناموسِ شاہی! لعنت اور صد ہزار لعنت اُس شاہی پر جو انسانیت سے گزر جائے۔ اگر بادشاہ کے سینے میں انسان کا دل نہیں ہے۔ تو وہ ایک خونخوار درندہ ہے۔ میں ایک خونخوار درندہ ہوں۔ میرے جبڑوں سے انسانیت کا لہو ٹپک رہا ہے۔ اس سے قبل کہ یہ درندہ تم پر جھپٹ پڑے۔ دور ہو جاؤ میرے سامنے سے —— آتشِ انتقام کو اگر کچھ چھینٹوں کی ضرورت ہے تو جاؤ گلنار کی طرف اور رقصِ بسمل کا تماشا دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈا کرو۔

ملکہ :- عالم پناہ۔ میں سوتیلی سہی مگر اُس کی ماں ہوں

شہنشاہ :- ماں کا مقدس نام اپنی زبان سے لے کر شفقت کو درندگی کی شکل نہ دو۔ جاؤ اُس بدنصیب شہزادی کو دیکھو جو اپنی ہچکیوں اور سسکیوں میں ڈھل کر رہ گئی ہے۔ جس کے آنسوؤں کا سیلاب شہباز کے خونِ ناحق کے ساتھ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں اس سیلاب میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔ اپنے اس تخت و تاج کو غرق کر دینا چاہتا ہوں اسی سیلاب میں۔ (جاتا ہے) اسی سیلاب میں۔ اسی سیلاب میں۔

ملکہ :- (اس کے پیچھے دوڑتی ہے) عالم پناہ! سلطانِ اعظم! ظلِ اللہ! (رفیق آتا ہے)

ایک اہل محفل۔ واہ صاحب۔ کیا گانا بھی پیدا کر دینے والا ہے۔

دوسرا۔ واللہ [illegible] آپ نے [illegible] کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔

نذیر۔ واقعی آپ بات کے [illegible] ہیں۔ یہ تو ادھر ادھر سے چند ٹکڑے آپ ارشاد فرماتے ہیں۔ بھلا ذرا ٹھہریے۔ [illegible] ایک [illegible] آپ [illegible] ہوں۔ [illegible] شہلا اور جھونڈو [illegible] ساتھ [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] سب [illegible] شہلا۔ بڑا آیا میرا خریدار۔

(گانا ہوتا ہے)

(گانا)

شہلا۔ بڑا آیا میرا خریدار۔ تیرا میرا میل کیا۔

جھونڈو۔ میں ہوں دل سے تجھ ہی پہ نثار۔ میرا تیرا میل ہے۔

شہلا۔ تم ہو نہیں زمانے۔

جھونڈو۔ آن میں جتانے۔

شہلا۔ میرے آیا تو ہی سا ہرکار۔ تیرا میرا میل کیا۔

جھونڈو۔ میں ہوں تیار ان ہی سے اُدھار۔ میرا تیرا میل ہے۔

شہلا۔ ان کے پاس ہے دولت۔

جھونڈو۔ میرے پاس محبت۔

شہلا۔ تجھ پہ شامت ہوئی ہے سوار۔ تیرا میرا میل کیا۔

جھونڈو۔ اپنی شامت کا میں راہوار۔ تیرا میرا میل ہے۔

شہلا۔ دور موئے نکھٹو۔

جھونڈو۔ میں ہوں اڑیل ٹٹو۔

شہلا۔ تجھ پہ اللہ کی ہو سنوار۔ تیرا میرا میل کیا۔

جھونڈو۔ ہو سنوار اور ہو بیشمار۔ تیرا میرا میل ہے۔

شہلا۔ بڑا آیا میرا خریدار۔ تیرا میرا میل کیا۔

جھونڈو۔ میں ہوں تجھ ہی پہ نثار۔ تیرا میرا میل ہے۔

ایک اہل محفل۔ مرزا اچھا ماسٹر رحیم۔ کیا بات۔

دوسرا۔ دھن بھی لاجواب ہے۔ اور گایا بھی خوب دونوں نے۔ اس گانے پر ونس مور ہوگا

رحیم۔ کیا عرض کروں وقت نہیں ہے۔ مجھے ریہرسل کرانا ہے۔ ورنہ گانے تو سب ایسے ہیں۔ کہ گلی کوچوں میں نہ گاتے

جائیں تو بہ از تہ۔ اچھا میں آپ کو اسی کامک کا ایک سین دکھاتا ہوں (آواز دے کر) ماسٹر خیراتی ذرا ملک کا وہ سین دکھاؤ۔ جس میں پھلجھڑی کو گھن چکر شادی کا پیام دیتا ہے۔ (اہلِ محلہ سے) ذرا دیکھئے گا اس سین کو کیا آغاز دے کر) ہاں بھی شروع کرو (تالی بجاتا ہے۔

پھلجھڑی:۔ ہلو۔

گھنچکر:۔ اے لو۔

پھلجھڑی:۔ آپ ہی کا نام ہے ڈاکٹر ایکس، وائی۔ زیڈ، ڈنٹسٹ۔

گھنچکر:۔ درست فرمایا آپ نے۔ اسی خاکسار کو اے، بی، سی، ڈی گھن چکر کہتے ہیں۔

پھلجھڑی:۔ گھنچکر؟ مگر کارڈ میں تو۔

گھنچکر:۔ ذرا بلند آواز سے فرمائیے۔

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

پھلجھڑی:۔ آپ ڈنٹسٹ ہیں یعنی دندان ساز۔

گھنچکر:۔ ساز یہ کینہ ساز کیا جانے۔ اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیکھا تھا۔ ضرورت لاحق تھی۔ لہٰذا حاضر ہوں۔

پھلجھڑی:۔ یہ کارڈ کس کا ہے۔؟

گھنچکر:۔ خود ہی پڑھ لیجئے۔ اس کارڈ کو پڑھنے کے لئے جس نمبر کی عینک درکار ہے۔ وہ عینک ابھی میں نے بنوائی نہیں ہے۔

پھلجھڑی:۔ (چیخ کر) ڈاکٹر ایکس وائی زیڈ، ڈنٹسٹ۔

گھنچکر:۔ ارے نہیں۔ نہیں نہیں۔ یہ تو اُن ڈاکٹر صاحب کا کارڈ ہے۔ جن سے بڑھوے میں آنے کے سلسلے میں نے دانت لگوائے ہیں۔

پھلجھڑی:۔ بڑھوے میں جناب والا خود تشریف لائے ہیں۔ یا کسی برخوردار کے ساتھ آئے ہیں۔

گھنچکر:۔ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے۔ وہ درست ہی ہوگا۔ مگر میری نگاہ کی کمزوری، کان کی گرانی، بالوں کی سفیدی، اور دانتوں کی عدم موجودگی پر غور کرنے کے بجائے قابلِ غور ہے۔ صرف میرا دلِ بیتاب۔

پھلجھڑی:۔ اور دماغ کا ذکر ہی نہیں کرتے جو سب سے زیادہ خراب ہے۔

گھنچکر:۔ مجھے آپ سے یہی امید تھی۔ اب آپ کے والد سے ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب خود آپ ہی نے پسند کر لیا۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

پھلجھڑی:۔ آپ نے وہ دروازہ دیکھا ہے۔ اس سے قبل کہ گھر کا راستہ یاد نہ رہے۔ اس دروازے سے نکل جائیے۔

گھنچکر:۔ باہر۔ اگر آپ باہر تشریف لے چلنا چاہتی ہیں تو بسم اللہ۔ واقعی راز و نیاز کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں ہیں۔ میں

سب گردن ہلا ہلا کر داد دیں۔

بیوی: چوکری میں بیٹھی ہوں زمانہ ہوا۔

منجھو: کیا ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ میں ٹھیک گیارہ بجے باغیچہ میں انتظار کروں گا۔

بیوی: اچھا ٹھیک۔

منجھو: ٹھیک ہے۔ میرا مطلب ہے ہاں ہاں۔

(بجلی جلتی ہے)

پہلا اہلِ محلہ: کمال کر دیا ماسٹر جی۔ ماشاءاللہ بہت خوب سنے

دوسرا: بیٹھے ہی بیٹھے کس قدر زندہ ڈرامہ ہے۔

رحیم: کیا عرض کروں۔ وقت ہی نہیں ہے۔ ورنہ اور بھی بہت چیزیں ہیں۔ کتاب چھوا دیتے۔ مگر کیجئے کیا ایسے دم سے

روپیہ پیسہ تو ہے نہیں سکتا۔ وہ نیک بخت ہے کہ اتنی حیل پر برسوں سے جا رہی ہے۔

پہلا محلہ دار: رحیم ماسٹر ایسے ناٹک کے لئے روپیہ کہاں کی ہے۔ ہزار پانچ سو سے تو ہم بھی شرکت کر سکتے ہیں۔

رحیم: شکریہ۔ شکریہ۔

دوسرا: ابھی نقد نہ تیرہ ادھار وہ میری شرکت کی رقم رکھ لیجئے یہ حاضر ہے۔ دیکھئے انکار نہ کریں۔ اور ختم کیجئے گھر کا فساد۔

رحیم: شکریہ شکریہ۔ اس کے بارے میں دیکھا جائے گا۔ تشریف لائیے۔

پہلا اہلِ محلہ: نہیں صاحب اس ڈرامے میں کھانے کا سوال ہی نہیں ہے۔

(دروازے پر دستک)

دوسرا: میں نے کہا بھابی صاحبہ ذرا دروازے پر آئیے۔

بیوی: ذرا دروازے پر کون ہے۔ میں گھوڑا گاڑی تو قید نہیں ہوں۔ میں کیسے آؤں دروازے پر۔

پہلا اہلِ محلہ: قفل کھل گیا ہے۔ یہ لیجئے ماسٹر رحیم۔ یہ روپے بھیجے ہیں۔ آپ کیسے جا رہی ہیں۔ اسی کے لئے غرفہ ہے۔

بیوی: بھیا میں کہاں جاؤں گی میکے۔ عورت ذات کا گھر تو یہاں ہی کا گھر ہے۔ جہاں سے بس جنازہ نکلتا ہے۔

رحیم: لیجئے سن لی حقیقت۔ اب تجہیز و تکفین کے لئے اور روپے کا انتظام کیجئے۔

(ہنستا ہے)

بیوی: بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں بچارے۔

(سب ہنستے ہیں)

دو رُخ

(دروازے پر کوئی آہستہ سے دستک دیتا ہے)

شیخ صاحب: کون ہے۔ معلوم ہے۔ سب کو کہ آج میرا خضاب کا دن ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ میں خضاب کے دن کسی سے نہیں ملتا۔ پھر بھی دروازہ بجایا جا رہا ہے۔

ناہید: (دروازے سے جھانک کر) میں آ سکتی ہوں ماموں جان:

شیخ: کون؟ ناہید۔ آؤ آؤ۔ میں سمجھا کہ جانے کون ہے، بیٹا تم اس وقت کہاں۔

ناہید: (قریب آتے ہوئے) تسلیم! امی جان کے ساتھ آئی ہوں۔

شیخ: خوب خوب، کہاں ہیں فرخندہ؟ بیٹی ذرا دیکھنا جلد پر سیاہی نہیں آئی خضاب کی۔ یہ بھی بڑھاپے کا ایک عذاب ہے۔

ناہید: جی نہیں بالوں ہی پر ہے۔

شیخ: بالوں پہ تو ہونا ہی چاہیے۔ تو ہیں کہاں بی فرخندہ جب میں تم کو دیکھتا ہوں۔ فرخندہ کا بچپن یاد آتا ہے ہو بہو ماں کی تصویر ہو، وہ تمھاری عمر میں بالکل ایسی ہی تھیں اور تم ان کی عمر میں بالکل ویسی ہی ہو جاؤ گی۔ بلاؤ نا فرخندہ کو۔ ذرا ٹھہرو یہ آئینہ میرے چہرے کی سیدھ میں لے کر بیٹھو۔ ہاں یوں۔ مگر یہ کیا اس میں تو گھڑی نظر آ رہی ہے۔ اسے بھی چہرے کی سیدھ میں رکھو۔ ہاں یہ بس بس یوں ہی رہنا۔

فرخندہ: (باہر سے آواز آتی ہے) ناہید!

ناہید: (اندر ہی سے) آجائیے امی جان ماموں جان یہاں ہیں۔

فرخندہ: (آتے ہوئے) بھیا تسلیم!

شیخ: (خضاب لگاتے ہوئے بند منہ سے) جیتی رہو۔ ہوں، ہوں...... (صاف آواز میں) تم نہ ہلو بیٹی ورنہ مونچھوں کے بجائے بھنوؤں میں لگ گیا ہوتا ابھی خضاب۔ بس ایک منٹ۔ ہوں ہوں۔ شاباش بیٹھو نا فرخندہ بس ایک منٹ۔

فرخندہ: نسرین کہاں ہے بھیا؟

شیخ: بس ایک منٹ یہ چھوٹا سا ایک مونچھ رہ گئی ہے۔ شاباش۔ ہوں۔ ہوں۔ بس اب ٹھیک ہے۔ ہاں کیا پوچھ رہی تھیں فرخندہ۔

فرخندہ: نسرین نظر نہیں آئی۔

شیخ: جب ہوگی یہاں تو نظر آ جائے گی۔ ارے بھئی فرخندہ یہ جاوید میاں۔ کیا نکھر آئے ہیں۔ ولایت سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی دباغت سے دھلی ہوئی ہے

فرخندہ: بھیا میری عقل تو خود حیران ہے مگر اب ہوگا کیا۔ یہاں نسرین بی بی تو کچھ کی کچھ بن چکی ہیں۔

شیخ: دونوں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں صاحب دونوں۔ اب میری سمجھ میں تو آتا نہیں یہ جوگ۔

فرخندہ: بھیا خدا لگتی ہے یہ تو کہیے اچھی لگتی ہے۔ میں نے اس دن کے لیے دن گن گن کر برس گزارے ہیں کہ جاوید ولایت سے آئے تو ان دونوں کے سہرے کے پھول کھلیں۔ دونوں پروان چڑھیں۔

شیخ: انتظار تو مجھ کو بھی تھا۔ مگر اب تم خود دیکھ لو کہ کوئی بھی مناسبت ہے ان دونوں میں۔ تم کو معلوم ہے کہ تمھارے بھائی مرحوم کے اور میرے مزاج میں کس قدر فرق تھا۔ ان کو چقندر پسند مجھ کو نفرت شدید۔ وہ خس کا عطر لگائیں اور میں بھاگوں اس کمبخت کی خوشبو سے۔ میری جان جائے، بھنڈیوں پر اور وہ ابکائیاں لیں بھنڈی کے نام پر، مجھے شوق کہ ان کے صاف دانت دیکھوں اور وہ بغیر مسّی کے رہ نہ سکیں نتیجہ کیا ہوا۔ وہ جا کر بیٹھ رہیں میکے اور میں نے کہا خس کم جہاں پاک ان کے جانے سے واقعی خس کے عطر کی خوشبو بلکہ بدبو سے نجات مل گئی لہٰذا خس کم جہاں پاک میں نے بالکل صحیح کہا۔

فرخندہ: مگر بھیا! نسرین اور جاوید تو ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

شیخ: میرا بھی یہی خیال تھا۔ مگر اب حالات کچھ اور نظر آ رہے ہیں۔ نسرین کو جس شدت سے انتظار تھا جاوید کا، اُسی قدر وہ جاوید کو دیکھ کر مایوس ہوئی ہے۔

فرخندہ: اور جاوید بھی کچھ چپ چپ سا ہے البتہ ایک دن یونہی کہہ رہا تھا کہ امی جان نسرین تو ایک دم میم بن کر رہ گئی ہے۔

شیخ: بے وقوف لڑکا۔ تم کو کہنا چاہیے تھا کہ اے عقل کے دشمن صاحبزادے وہ آپ کے لیے میم بن کر رہ گئی ہے۔ میں نے اس کو میم بنایا ہے کہ ولایت میں تعلیم پانے والے ایک لڑکے کی صحیح شریکِ حیات بن سکے مجھ کو کیا معلوم تھا کہ یہ صاحبزادے ولایت سے اس طرح آئیں گے گویا گاؤں سے غلہ جمع کر کے آئے ہیں۔ دیکھنا بیٹی ناہید سیاہی جلد پر تو نہیں آئی۔

ناہید: جی نہیں۔ ماموں جان بالوں ہی پر ہے۔

شیخ: بالوں پر تو ہونا ہی چاہیے۔ بیٹی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ولایت جا کر جاوید کو آخر

ہُوا کیا۔

فرخندہ: وہ جو باتیں کرتا ہے، ان کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں، وہ کہتا ہے کہ میں انگریز بننے نہیں گیا تھا پڑھنے گیا تھا۔ ایمانداری کے ساتھ پڑھا اور امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کر کے آیا ہوں۔

شیخ: تم کو معلوم ہے نسرین کیا کہہ رہی تھی۔ اس کے سامنے تو میں اس طرح چپ رہ گیا تھا۔ گویا مجھے ناگوار ہوا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بڑا برمحل مصرع پڑھا تھا اس نے کہنے لگی کہ ع

لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

فرخندہ: بڑا غضب ہو جائے گا بھیا۔ اگر ان دونوں میں یہی اختلاف رہا۔

شیخ: غضب تو جو کچھ ہونا تھا میرے نزدیک ہو چکا ہے، اب تو حالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

فرخندہ: میری زندگی بھر کے ارمان کا یہ حشر ہوگا۔

شیخ: اپنے ارمان سے زیادہ ان دونوں کے ارمانوں کا خیال کرو۔

نسرین: ڈیڈی۔ ہلو آنٹی۔ ہلو ناہید۔ آپ لوگ کب آئیں؟

فرخندہ: بیٹی ہم تو تم کو پوچھ رہی تھی بھیا سے۔

ناہید: میں آپ کے کمرے میں بھی آپ کو ڈھونڈ آئی۔

نسرین: میں پکچر گئی تھی، ہلو ڈیڈی I say it is a wonderful Picture آپ نہیں گئے I missed you very badly

شیخ: بیٹی میرا خضاب کا دن تھا آج۔ ذرا دیکھنا Is it alright?

نسرین: کیوں لگاتے ہیں ڈیڈی آخر آپ خضاب Why do you dye. اچھا میں جا رہی ہوں۔ پکچر سے میرے ساتھ میرے فرینڈ مسعود۔ ریاض اور خالد آئے ہیں۔ ان کو چائے پلانا ہے۔

شیخ: خانساماں سے کہہ دینا ذرا تمیز سے چائے دے اور وہ بڑا کیک استعمال کر ڈالو۔

نسرین: O.k. Daddy، ناہید ڈیئر ابھی تو ہو نا۔ یا چلو تم بھی سب کے ساتھ چائے پی لو۔

فرخندہ: نہیں بیٹی اس کو رہنے دو۔ وہ لڑکوں میں کیا جائے گی۔

نسرین: ممی، Why is this یہ کیا بات ہوئی؟ لڑکوں میں جانے سے کیا ہو جاتا ہے۔ میں جو جا رہی ہوں۔

شیخ: ناہید کو رہنے دو بیٹا تم جاؤ۔ خانساماں سے کہہ دو یہاں بھی چائے بھیج دے۔

نسرین: O.k. Daddy (چلی جاتی ہے)

فرخندہ: بھیا سچ مچ آپ نے بہت آزاد کر دیا ہے۔

شیخ: مجھے معلوم ہے کہ میں نے ضرورت سے زیادہ آزاد کر دیا ہے مگر تم کو بھی معلوم ہے کہ میں نے کیوں آزاد کیا

ہے۔ بار بار یہ بات مجھ سے کیوں کہلوائی ہو کہیں سے انہیں کو جاوید کے قابل بنانے کی کوشش کی۔ وہ جاوید جو ولایت گیا تھا اور جس کے لیے یہ خیال تھا کہ وہ بہت سی نئی قسم کی تہذیب حیات کا عقیدہ لایا ہوگا آئے گا۔ تم کو معلوم ہے کہ جاوید کے ولایت جانے سے پہلے نسرین ابھی بچی تھی۔ نسرین ناہید ہی کی قسم کی ایک لڑکی تھی۔ جیسی کہ میرے خواب ہیں وہ لڑکا ابھی پسند نہیں کر سکتا جس نے سالہا سال ولایت میں گزارے ہیں۔ لہٰذا جاوید کے لیے میں نے نسرین کو ہی تیار کیا ہے۔

جاوید: (باہر سے آواز دیتا ہے) میں آ سکتا ہوں۔

ناہید: بھائی جان آ گئے۔

شیخ: کون؟ جاوید میاں۔ آ جاؤ بچے۔

جاوید: (آتے ہوئے) آداب عرض۔ ماموں جان۔ میں کچھ بے وقت تو معلوم ہوا۔ ممانی جان اور ناہید یہاں ہیں۔

شیخ: اگر یہ معلوم ہوتا تو بھی تم یہاں آ سکتے تھے۔ بیٹھو۔ ادھر تم آؤ میرے پاس۔ آج برخوردار مجھے تم سے کچھ صاف باتیں کرنا ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں آدمی ہوں ایک صاف قسم کا۔ میرے ذہن میں جو الجھنیں تمہارے متعلق ہیں انھیں تم تک نہ پہنچانا میرے نزدیک دیانت کے بھی خلاف ہے اور مروت سے بھی زیادتی ہے۔ کیوں بھئی فرزند، مجھے صاف بات کرنا چاہیئے نا۔

جاوید: آپ امی جان سے کیا پوچھ رہے ہیں۔ اگر مجھ پر ان سے کچھ کم حق آپ کو حاصل ہے تو بے شک ان سے اجازت لے لیجئے۔ ورنہ میرے نزدیک تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

شیخ: میں بغیر کسی تمہید کے براہ راست یہ سوال کرتا ہوں، کہ تم ولایت سے آخر کیا بن کر آ گئے ہو؟

جاوید: ماموں جان اپنے نزدیک تو میں وہی بن کر آیا ہوں، جو مجھے بن کر آنا چاہیئے تھا۔

شیخ: ہم نے آج تک ولایت سے پلٹنے والے کسی طالب علم کو نہیں دیکھا کہ وہ سوٹ پہن کر جائے اور شیروانی پاجامے میں واپس آئے۔ میرے تصور میں تم اس طرح آیا کرتے تھے۔ کہ ولایت کی اعلیٰ تراش کے اسٹوڈنٹ سوٹ میں موٹی سی کمانی کی فیشن ایبل عینک لگائے تم ٹرین سے اترو گے، خالص انگریزی قسم کا مصافحہ کرو گے اور گھر پہنچ کر گھر کی فضائیں ہی بدل دو گے۔

جاوید: مگر میں آپ کی امید کے خلاف شیروانی، پاجامہ اور دیسی جوتے میں ٹرین سے اترا اور السلام علیکم کہہ کر آپ کے سامنے ادب سے جھک گیا۔

شیخ: برخوردار اس میں سعادت مندی تو ضرور تھی۔ مگر یہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ تم لندن سے آ رہے ہو یا چھانگا مانگا سے، انگلستان سے آئے ہو یا قصور سے۔

جاوید: میں سمجھتا تھا کہ میری اس سادگی اور میری اس شرقیت کو آپ پسند فرمائیں گے۔ میں بے شک یہاں سے سوٹ پہن کر ان لوگوں کے ملک میں گیا تھا جو یہاں آ کر نہ شیروانی پہنتے ہیں نہ پاجامہ بلکہ اپنے ملکی لباس

میں رہتے ہیں۔ اور اپنی ہی معاشرت یہاں پیدا کر لیتے ہیں۔

شیخ: بات تو تم معقول کہہ رہے ہو مگر میں ذرا وضاحت سے سمجھنا چاہتا ہوں۔

جاوید: ماموں جان اس بات کا اندازہ تو مجھے وہاں جا کر ہوا کہ ہم ذہنی طور پر کس حد تک اُن کی غلامی کے کھلونے ہو چکے ہیں۔ ہم اُن کا کلچر اس طرح اوڑھ لیتے ہیں گویا خود ہمارا کوئی کلچر ہی نہیں اور ہم اُن کو بجا طور پر ناز کرنے کا موقعہ دیتے ہیں۔ کہ اُن کے کلچر نے ہم کو آدمی بننے کے قابل بنایا ہے۔ میرے ذہن میں صرف یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم اپنے وطن میں بیٹھے اُن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور وہ ہمارے یہاں آکر بھی اصلیت نہیں بھولتے۔ اس خیال نے مجھ کو خود مشرقی کلچر کی طرف متوجہ کیا اور میں نے وہاں رہ کر بجائے غلامی کرنے کے اپنا کلچر ان کے سامنے پیش کیا۔

شیخ: دیکھنا بیٹا مغرب کی سیاہی جلد پر تو نہیں آئی۔

جاوید: جی نہیں۔ ٹھیک ہے۔ ماموں جان آپ کو حیرت ہوگی کہ میں نے وہاں کے درزیوں کو شیروانی کا نمونہ دے کر شیروانیاں اُس سے زیادہ دام صرف کر کے بنوائیں جتنے میں سوٹ بنتا ہے مگر پہنی صرف شیروانی۔ میں صبح کے ناشتے میں بجائے دلیہ اور دودھ پینے کے اور بجائے ٹوسٹ میٹ اور انڈے کے خود پوریاں پکاتا تھا۔ اور آلو کی چٹپٹی ترکاری کے ساتھ نہ صرف خود کھاتا تھا بلکہ اکثر انگریز دوستوں کو اس ناشتے کا دلدادہ بنا آیا ہوں۔

شیخ: مگر برخوردار اس سے تو تم بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اِن لوگوں میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔

جاوید: میں ان کی خوبیاں چھوڑ کر نہیں آیا ہوں۔ آپ مجھ کو وقت کا پابند پائیں گے۔ آپ مجھ کو محنتی اور جفاکش دیکھیں گے۔ کام کے وقت کام اور تفریح کے وقت صرف تفریح میرا بھی اصول ہے۔ معاملت میں صفائی اور دیانت کا میں بھی قائل ہوں مگر ان باتوں پر صرف سوٹ پہن کر اور سگار پی کر ہی عمل نہیں ہو سکتا۔

شیخ: برخوردار مجھے تمہاری باتوں کی معقولیت کا اعتراف ہے مگر یہ بھی ملاحظہ ہو کہ میں نے محض تمہارے لیے نسرین کو خدا جانے کیا کا کیا بنا دیا ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ولایت سے واپس آکر تم جس قسم کی شریک حیات چاہو وہ تمام صفات تم کو نسرین میں مل سکیں۔ میں نے اُس کو نہ صرف کالج میں پڑھوایا بلکہ خاص یورپین ماحول میں رکھا۔ میں نے اس کو پیانو سکھوایا۔ میں نے اُس کو ڈانس کی تعلیم دلوائی۔ وہ رائیڈنگ کر سکتی ہے۔ وہ سوئمنگ جانتی ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں بے جوڑ معلوم نہ ہوگی۔ وہ اس فراٹے سے انگریزی بولتی ہے اور اس کا لب و لہجہ اس قدر انگریزیت لیے ہوئے ہے کہ انگریزی اس کی مادری زبان معلوم ہوتی ہے۔

جاوید: میں یہ سب اندازہ کر چکا ہوں اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آپ نے یہ سب کچھ میرے ہی لیے کیا ہے

کہ حیرت صرف یہ ہے کہ اگر مجھ کو ان ہی تمام صفات کی ضرورت ہوتی تو اس نقل کی کیا ضرورت تھی۔ میں اصل ہی اپنے ساتھ ولایت سے کیوں نہ لے آتا۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ولایت میں اتنا زمانہ گزارنے کے بعد بھی نسائیت کے اس رنگ سے محبت اجنبی ہی رہی اور ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ اس ولایتی حسن اور ان ولایتی اداؤں میں میرے لیے کوئی ہم جنسی نہیں ہے۔

فرخندہ: مگر بڑا سوال تو یہ ہے کہ اب کیا ہو گا۔

شیخ: اس کو بات کہنے دو وہ بڑی گہری باتیں کر رہا ہے۔ ہاں برخوردار۔

جاوید: ماموں جان۔ وہاں رہ کر میں نے یہی چاہا کہ نسرین نے اسی طور کو حاصل رکھا ہو جیسا میں اس کو چھوڑ گیا تھا وہی ایک آپ سے پاک معصوم چہرہ۔ وہی دوپٹہ۔ وہی غرارہ۔ وہی شلوار اور وہی جھومر ماتھے پر ٹیکہ۔ ماموں جان ہماری مشرقی لڑکیوں میں جو ایک بے ساختہ جھجک اور جھینپ ہے اس کا خدا کی قسم میں نے کہیں جواب نہیں دیکھا۔ وہ شرم اور وہ لاج جو مشرقی نسائیت کی روح ہے اسی کے بغیر مغربی نسائیت بے روح نظر آتی ہے۔

شیخ: کیا تمہارے خیال میں کوئی ایسی صورت ہے کہ نسرین کو پھر مشرقیت کی طرف واپس لایا جا سکے۔

جاوید: مجھ کو پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکا کہ نسرین اپنے موجودہ رنگ میں کس حد تک ڈوب چکی ہے اگر اس نے اپنی اصلیت کی تجہیز ابھی شروع نہیں کی ہے تو واپسی ناممکن نہیں ہے۔

فرخندہ: نہیں بیٹا وہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ اس غریب کو جیسا بنا دیا ہے وہ بن گئی ہے۔

شیخ: خیر۔ خیر میں اس قسم کی باتیں نہیں کرتا برخوردار تم خود اس کا جائزہ لو اور اگر اس کو واپس لا سکو تو مجھ سے زیادہ شاید کسی کو مسرت نہ ہو۔

جاوید: آپ سے کم خود مجھ کو بھی مسرت نہ ہو گی۔

شیخ: ذرا اس سے بات کر کے اندازہ تو کرو۔ ناہید بیٹی دیکھنا ذرا نسرین کے دوست گئے یا نہیں۔ یہ بات تم نے لاکھ روپے کی کہی ہے کہ اگر تم کو یہی وضع قطع اور یہی معاشرت پسند ہوتی تو اس نقل کی کیا ضرورت تھی اصل ساتھ ہی لاتے۔ میں اس بات کی سچائی کا قائل ہو چکا ہوں۔

فرخندہ: اگر کوشش کی جائے اور شادی کے بعد رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔

جاوید: امی جان بس یہی بات غلط ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نسرین کے لیے میرے احساسات کیا ہیں مگر بغیر سمجھے بوجھے دو زندگیاں تلخ نہیں بنائی جا سکتیں۔

شیخ: بالکل ٹھیک ہے۔ بھئی معاف کرنا نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر معقول انسان بن کر آئے ہو۔ میں تو تمہاری ظاہری وضع قطع کو تمہاری نامعقولیت ہی سمجھ رہا تھا۔

ناہید: (آتے ہوئے) نسرین آپا اپنے کمرے میں اکیلی ہیں پیانو بجا رہی ہیں۔

شیخ : میرے خیال میں تو تم پہنچ جاؤ برخوردار، خدا کرے تمہارے دلائل اس کو بھی اتنا ہی قائل کر دیں جتنا مجھ کو کیا ہے۔

جاوید : دیکھئے کوشش کرتا ہوں۔

(جاتا ہے۔ کچھ وقفہ۔ پھر پیانو کی آواز رفتہ رفتہ قریب
آتی ہے۔ جاوید اجازت چاہتا ہے)

میں آسکتا ہوں۔

نسرین : (پیانو بند کرتے ہوئے) او منشی محمد جاوید صاحب Who is there ? (قہقہہ لگاتی ہے) By jow یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے جاوید۔ پیروں میں بندشوں کے خلاف پہنے ہوئے ہیں اور یہ کیا نام ہے اس کوٹ کا شیروانی۔ کس قدر عجیب چیز ہے یہ بھی۔ اور معلوم نہیں بغیر (سوکس) موزوں کے تم یہ بیڈ روم سلیپر قسم کا جوتا کیسے پہن لیتے ہو۔

جاوید : آپ کے دوست گئے۔

نسرین : جب وہ چلنے ہی لگے تھے میں نے تم کو جاتے دیکھا تھا۔ مگر میں نے بلایا نہیں وہ لوگ مذاق اڑاتے تمہارا بلکہ مسعود پوچھ بھی رہا تھا کہ تمہارے جو Causin ولایت سے آئے ہیں وہ کہاں ہیں۔ اب میں کیا بتاتی کہ وہ چیز تم ہو۔ چیز (قہقہہ)

جاوید : تم نے اچھا کیا کہ نہیں بتایا ورنہ میرے ساتھ تمہارا بھی مذاق اڑتا۔

نسرین : But, I don't know، یہ تم بن کر کیا رہ گئے ہو۔ یہ تم کو ہوا کیا آخر۔ What's wrong

جاوید : کچھ نہیں نسرین۔ صرف یہ ہوا ہے کہ ولایت جا کر میری آنکھیں تھوڑی سی کھل گئی ہیں کہ ہم انگریزوں کی کس شدت سے ذہنی غلامی کر رہے ہیں۔ تم نے کبھی انگریز کو بھی دیکھا ہے کہ اس نے تمہارا ملکی لباس تمہارے ملک میں بھی آ کر پہنا ہو۔

نسرین : یہ تو بالکل ویسی ہی بات ہوئی کہ جیسے کوئی افریقہ جا کر کوڑیوں کے ہار پہن لے۔

جاوید : کیا تمہارے خیال میں تمہارا کلچر ایسا گیا گزرا ہے۔

نسرین : What are you talking. ہمارا کلچر ہی کیا ہے یہی کلچر جس کا تم نمونہ بنے ہوئے ہو؟

جاوید : ہاں بیشک۔ یہ جیسا کچھ بھی ہے مگر اپنا کلچر ہے۔ اور جس رنگ میں تم رنگی ہوئی ہو وہ خواہ کچھ بھی ہو تمہارا نہیں دوسروں کا ہے اور تم پر تہمت معلوم ہوتا ہے۔

نسرین : میں سمجھتی تھی کہ تم صرف وضع قطع ہی میں بدلے ہو مگر معلوم ہوا کہ تم ہر اعتبار سے اب سے سو سال پیچھے جا پڑے ہو۔ I wonder what is wrong with you

جاوید : ممکن ہے میرا قصور ہو مگر میں تمہارا قصور بالکل نہیں سمجھتا تم وہی بن گئی ہو جو تم کو بنا دیا گیا ہے۔ اور جو کچھ

تم کو بنا گیا ہے۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ ماموں جان کا خیال تھا کہ میں بھی ولایت سے وہی بن کر آؤں گا جو عام قسم کے نوجوان بن کر آتے ہیں جو اپنی اصلیت کو بھول جاتے ہیں، اپنے وقار کو خود اپنی نظروں سے گرا کر خود انگریزوں کے بجائے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر دوسروں کے قالب میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ ماموں جان نے تم کو میری نصف بہتر بنانے کی کوشش کی۔

نسرین: مگر تم وہاں سے نصف بدتر بن کر آئے۔ worst half (قہقہہ لگاتی ہے)

جاوید: ہاں نسرین مجھے یہ فقرہ ضرور برا لگا ہے لیکن یہ بھولنا نہیں کاش تم کو معلوم ہوتا کہ میں سات سال تک میں تمہارے اس بت کی کیسی پرستش کی ہے جسے میں تم کو چھوڑ گیا تھا۔ میں بے صبری سے منتظر تھا اس وقت کا جب میں آؤں گا اور میری نسرین کی شرم آمیز تبسم میں ڈوبی ہوئی تعارف جانے کیا کیا مجھ سے کہہ ڈالیں گی۔

نسرین: Good Gracious، یہ تم کس دنیا کی باتیں کر رہے ہو جاوید کاش تم کو بھی معلوم ہوتا کہ میں نے اس عرصے میں تمہارا کیا تصور قائم کر رکھا تھا کہ ایک شستہ زیبل مہذب Upto-date نوجوان جو اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنے منہ میں پائپ لگائے ٹرین سے اترے گا۔ اور جو کچھ کہ میری طرف دوڑے گا تو میں کہ حسرت ہو جائے گی کہ جس سر پر کہ وہ ایک جاہل گنوار اور دقیانوسی لڑکی چھوڑ کر گیا تھا وہ اب اس کے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر بن چکی ہے۔

جاوید: ہاں نسرین میں تم کو دیکھ کر قائل ہو گیا ہوں کہ واقعی خواب کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔

نسرین: مجھ کو بات ختم کر لینے دو۔ تم ٹرین سے اس طرح اترے کہ میں سکتے میں آ گئی I was shaked تم نے ایک ٹھنڈا سا سلام علیکم کیا اور میری تمام امیدوں پر اوس ڈال دی میں ایک دم بجھ کر رہ گئی۔ اب میں تم کو چھپاتی پھرتی ہوں اپنے کسی دوست سے تم کو ملا بھی نہیں سکتی میرے دوست تمہارا ذکر کرتے ہیں اور میں ٹال جاتی ہوں کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھ کو کچھ کم شوک پہنچا ہے مجھ کو تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم اپنے کو کھو کر آ گئے You have lost yourself تم نے اپنے کو گنوا دیا ہے۔

جاوید: اچھا اب ایک بات بتاؤ نسرین جہاں تک میں محبت کو سمجھ چکا ہوں یا یہ کہو کہ سمجھ سکا ہوں وہ تو اتنی کمزور چیز نہیں کہ ان سطحی اور ان ظاہری تبدیلیوں سے گھٹ بڑھ سکے۔

نسرین: No, No, No: تم ناولوں اور افسانوں والی محبت کی بات مجھ سے نہ کرو۔ جب میں اپنی کھلی آنکھوں سے تم کو دیکھ رہی ہوں کہ تم اپنے کو مہذب دنیا کے لیے Laughing stock بنا چکے ہو جتنا میں آگے بڑھی ہوں اتنا ہی تم پیچھے ہٹ چکے ہو تو میرے خیال میں میرا دماغ اتنا خراب نہیں ہونا چاہیے کہ میں اب بھی تم سے محبت کا دعویٰ کروں۔ میں اتنا بڑا جھوٹ کبھی نہیں بول سکتی۔

جاوید: تو پھر اس بات کو مانو نا کہ تم کو مجھ سے میری ذات سے محبت یا وابستگی نہ تھی بلکہ میری وضع قطع سے تھی۔

نسرین My God میں تم کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے تم اب بھی عزیز ہو مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر میں کسی آئی سے بچے کو چپکا رہنے لگوں تو اس کو حیثیت شوہر کے بھی قبول کروں گی۔ جاوید تم یہ خیال تو اپنے دل سے نکال دو کہ ہم دونوں میں شادی بھی ہو سکتی ہے۔

جاوید : اچھا اگر میں اپنے اوپر جبر کر کے تمھاری مرضی کے مطابق Upto—date بن جاؤں تو۔

نسرین : تو مجھ کو یہ معلوم ہوگا جیسے کھویا ہوا جاوید مل گیا مجھ کو I assure you I will be too glad

جاوید : نسرین اب مجھ سے سنو کہ تم جاوید سے نہیں بلکہ کسی درزی کی دکان میں رکھے ہوئے اس مجسمے سے دل لگی چاہتی ہو جس کو درزی نے سوٹ پہنا کر گاہکوں کو دکھلانے کے لیے رکھ چھوڑا ہو۔ جاوید کی جستجو ہوتی تو وہ تم کو مل جاتا مگر اب جاوید تم کو نہ مل سکے گا۔ اپنے تصور میں جو سوٹ تم نے اس کو پہنا رکھے تھے وہ ضرور مل جائیں گے، تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ میں اپنے کو ولایت جا کر کھو آیا مگر اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ تم نے گھر بیٹھے اپنے کو گم کر دیا۔

نسرین : تم شاید برا مان گئے ہو مگر مجھے امید ہے کہ اتنی عقل تم میں ضرور ہوگی کہ تم یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے دور ہو چکے ہیں۔

جاوید : بہت دور۔ اتنی دور کہ میں تم کو واپس نہیں لا سکتا۔

نسرین : نہ تم واپس لا سکتے ہو نہ میں واپس آنا چاہتی ہوں جاوید تم بہت پیچھے ہٹ گئے ہو۔

(شیخ صاحب مع فرخندہ اور ناہید کے داخل ہوتے ہیں۔)

شیخ : بس میں یہی فیصلہ سننا چاہتا تھا۔ میں نے تم دونوں کی تمام گفتگو سن لی اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

فرخندہ : میری زندگی بھر کی تمنا کا یوں خون ہونا قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ (رونے لگتی ہے)

جاوید : امی جان ایسے حالات پیدا نہ کیجیے کہ آپ سے تعلقات بھی ختم ہو جائیں باوجود ان تمام باتوں کے میں نسرین کا قصور نہیں سمجھتا۔

فرخندہ : نہیں بیٹا قصور تو ہے میرے مقدر کا۔

شیخ : قصور دراصل صرف میرا ہے مگر اس قصور میں نیک نیتی تھی کہ میں نے نسرین کو اس معیار پر لانا چاہا کہ ولایت سے واپس آنے والا جاوید اپنے کو کسی گھاٹے میں نہ سمجھے میرے حالات اگر مجھ کو اجازت دیتے تو شاید میں نسرین کو بھی ولایت بھیج دیتا۔

نسرین : مگر ڈیڈی مجھ کو یقین ہے کہ میں انگلینڈ جاؤں گی ضرور اور یورپ کی سیر ضرور کروں گی۔

فرخندہ : بیٹی تم یہ غور کرو کہ تم ایک مشرقی لڑکی ہو۔

جاوید : امی جان اب سمجھانا بیکار ہے۔ میں تو نسرین کا ممنون ہوں کہ اس نے نہایت صفائی کے ساتھ مجھ سے گفتگو

کی ہے۔

شیخ: اس قدر صاف گوئی کے ساتھ کہ میری طبیعت بھی صاف ہو گئی۔ مجھ کو خود بھی اتنا اندازہ نہ تھا کہ میری تربیت نے نسرین کو اس حد تک بدل دیا ہوگا کہ جنس کی حیا جاتی رہی اور بیٹی بھی بول چال بھول گئی۔

نسرین: ڈیڈی Are you talking seriously

شیخ: جی صاحبزادی آئندہ مجھ سے سرسید ہی کی زبان میں گفتگو فرمایا کیجئے۔ میں اگر تم کو نسبتاً آزادی دے کر پچھتا سکتا ہوں تو مجھ کو یہ بھی آتا ہے کہ میں تم کو اپنے ماحول میں واپس لاؤں۔

نسرین: ......But I mean to say that یہ بات کیا ہوئی ہے۔

شیخ: بیٹی جسے تم کو اتنی آزادی دی تھی میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ حسب دستور اپنے اختیارات سے کام لوں اور تمہاری شادی زبردستی جاوید سے کروں۔

جاوید: اگر ماموں جان معاف فرمائیے گا میں نسرین پر یہ ظلم نہیں کر سکتا۔

فرخندہ: تم سے کیا مطلب بزرگوں کی باتوں میں کہیں بھی لڑکا اور لڑکی دخل دیتے ہیں۔

نسرین: آنٹی وہ زمانہ گزر گیا اب لڑکا اور لڑکی یہ اندھا جوا نہیں کھیل سکتے۔

شیخ: (روتے ہوئے) یہ دن دیکھنے کے لیے میں زندہ رہ گیا تھا۔ میری لڑکی اور میرے سامنے اس طرح زبان چلائے۔

جاوید: یہ بات آپ کو اس لیے بری معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی معاشرت اور آپ کے ماحول کے خلاف ہے مگر نسرین کو آپ ہی کی تربیت نے اس صاف گوئی کا عادی بنایا ہے۔ تو اب اس کا رنج فضول ہے۔

فرخندہ: بھیا آپ کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہے ہیں۔

نسرین: (جلتے ہوئے) شادی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے بیچ کسی کو اس طرح دبایا جا سکے I cannot tolerate this (چلی جاتی ہے)

شیخ: کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت آجاتی۔

فرخندہ: اللہ نہ کرے، مجھ بدنصیب کا آپ کے اور جاوید کے سوا ہے ہی کون؟

شیخ: ناہید بیٹی دیکھنا جلد پر تو نہیں آئی خضاب کی سیاہی۔

ناہید: جی ہاں شاید آنسوؤں سے پھیل گئی ہے سیاہی۔

شیخ: بس تو پھر ٹھیک ہے۔ شکر ہے پروردگار تیرا۔ خود کردہ علاج نیست۔ (ایک آہ سرد)

ہم اور وہ

لڑکوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ لڑکیوں کے غلام بن کر رہتے ہیں ہم سب۔ نہ جانے اللہ میاں نے ہم کو لڑکا بنا کر کیا پیدا کیا ہے کہ نہ پہننے کا مزہ نہ اوڑھنے کا۔ آخر ہمارے ہی ماں باپ کی بیٹی فرخندہ بھی تو ہے۔ دیکھیے اُس کے ٹھاٹھ۔ [illegible] کی عید تو جیسے سچ مچ اُسی کے لیے آئی تھی کہ کل رات کو چاند دیکھتے ہی اُس کے نخرے شروع کر دیے گئے۔ ہاتھ پیر کی بیسوں انگلیوں کو رنگا گیا۔ بال گیلے کر کے مینڈھیاں گوندھ دی گئیں کہ صبح عید کے دن جب یہ مینڈھیاں کھولی جائیں تو بال گھونگھر والے دکھائی دیں۔ جگمگ جگمگ کرتے ہوئے کپڑے آج کے لیے نکالے گئے۔ اور جوتا تو اس کے لیے اتنا قیمتی آیا ہے کہ ان داموں کے ہمارے چار جوڑے جوتے آجاتے۔ اور آج عید کے دن سے تو سویرے ہی سے اُس کے ایسے بناؤ سنگھار شروع کیے گئے کہ جیسے عید بس فرخندہ ہی کے لیے آئی ہے۔ جانے کتنے تو زیور اس کے لیے نکالے گئے ماتھے کا ٹیکہ۔ سر کا چھپکا۔ کانوں کے کرن۔ ہاتھوں کی چوڑیاں۔ گلے کا نکلس۔ پھر جب کر سُرمہ لگ چکا تو نہ جانے کتنی کریمیں اُس کے منہ پر رگڑی گئیں۔ پھر پاؤڈر ملا گیا۔ گالوں پر سُرخی لگائی گئی، ہونٹوں پر لالی رگڑی گئی۔ ہماری طرح تھوڑی کہ بس نہا کر جو نکلے تو سفید کرتہ پاجامہ پہن کر وہ شیروانی البتہ پہن لی جو عید کے لیے نئی سلوائی گئی ہے مگر حساب لگائیے تو جتنے کا ایک دوپٹہ ہے فرخندہ کا اتنے کا ہمارا پورا جوڑا بھی نہ ہوگا جوتوں سمیت ٹوپی بھی ملا کر۔

ہم دن بھر اسی بے انصافی پر کڑھتے رہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں میں آخر اتنا فرق کیوں ہے اور اگر فرق ہے تو آخر ہم نے کیا گناہ کیا تھا کہ ہم کو لڑکا بنا کر پیدا کر دیا گیا ہے جلنے اور کڑھنے کے لیے۔ لڑکی بنا کر پیدا نہیں کیا گیا کہ ہم بھی سر سے لے کر پیر تک آج سونے سے لدے چھم چھم کرتے پھرتے۔ ریشمی اور کامدار کپڑے پہنے جگمگ جگمگ نظر آتے سب کو۔ انگلیاں کیسی خوبصورت معلوم ہوتیں اگر ان کے ناخنوں پر وہی رنگ لگا ہوا ہوتا جو فرخندہ کے ناخنوں پر لگایا گیا ہے۔ یہ ڈنڈا جیسی کلائیاں کیسی اچھی لگتیں اگر ان میں چوڑیاں کھنکتی ہوتیں مگر یہ بھی اپنی اپنی قسمت ہے کہ وہ اپنی قسمت میں ریشم اور سونا لکھوا کر پیدا ہوئی ہے اور ہم اُس کے سامنے سچ مچ ٹھیٹے نظر آتے ہیں۔

آج ہم دن بھر اپنے اور فرخندہ کے اسی فرق پر جلتے بھنتے رہے۔ عید کا سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا۔ اور رات کو بھی جب سب کے سب دن بھر کے تھکے ہوئے سونے کی تیاریاں کر رہے تھے جب امی جان نے فرخندہ سے کہا کہ "لو بیٹی اب زیور اور کپڑے

[illegible] ادھم کرو۔ تو اس نے ایک مرتبہ پھر سے اندر آ پہنچا [illegible] کا [illegible] کیا اور میرے پیچھے [illegible] کر کے کہا: "امی جان میں [illegible] میں بیٹھ کر دیکھو ذرا [illegible] سب کچھ [illegible] بے سبب ہنسنے لگی ہم اور ہم چل کر [illegible] پھر [illegible] دیکھتے اور ایک ہم [illegible] سامنے جانے پر شرم آتی ہے مگر۔ وہ اس وقت [illegible] کر کروٹ بدل لی۔

پھر خیال آیا کہ [illegible] دیکھیں تو سہی [illegible] کا ذوق [illegible] ہے۔ یہ خیال آتے ہی [illegible] دل ہی دل میں [illegible] مگر جب جو آئینہ کے سامنے [illegible] ہو کر ہم [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] نظر [illegible] میں پہلے طرف [illegible] دل ہی دل میں کہا کہ [illegible] ہیں۔ [illegible] دیکھے [illegible] بندھا ہوا تھا۔ سر پہ جھومر تھا۔ کانوں میں [illegible] تھے۔ گلے میں [illegible] تھا۔ [illegible] دیکھے تو [illegible] میں انگوٹھیاں دیکھ کر ناخنوں پر جو نظر پڑی تو وہ بھی رنگے ہوئے تھے۔ ان پیروں کو دیکھ کر میں خوش ہو گیا کہ [illegible] پڑا سا دوپٹہ۔ جھلمل کرتی ہوئی قمیص اور غرارہ تو ایسا تھا [illegible] کا غرارہ کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی [illegible] چپکی ہوئی سینڈل۔ میں نے چاہا کہ [illegible] کے ناچنے کو [illegible] ——— مگر [illegible] کہوں [illegible] ہوں۔ اب تو کہنا چاہیے کہ ناچی تو [illegible] خوشی سے تالی بجاتی دوڑی امی جان کو [illegible] سب کو دکھانے کہ اب دیکھیے بھی۔

مگر ابھی میں کمرے سے نکل کر انگنائی میں پہنچی ہی تھی کہ نانی اماں نے ایک ڈانٹ دی۔

"صاحبزادی۔ صاحبزادی۔ حواسوں میں ہو کہ نہیں۔ بھلا یہ لڑکیوں کے ڈھنگ ہیں کہ لڑکوں کی طرح ایک دم سے اچھلتی پھر رہی ہو۔"

امی جان نے بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا: "کیا مجال جو یہ صاحبزادی سیدھی چال کبھی چلیں۔ آخر ہم بھی تو تھے [illegible] ہیں پھونک پھونک کر نپے تلے قدم رکھتے تھے کہ باپ بھائی آئے گئے کسی کو نام دھرنے کا موقع نہ ملے۔"

نانی اماں نے کہا: "یہ دوپٹہ اوڑھنے کا انداز ہے کہ جیسے گلے میں [illegible] پڑی ہو نگوڑ ماری۔ بیوی یہ پرائے گھر جانے کے ڈھنگ نہیں ہیں۔"

امی جان نے ہاں میں ہاں ملائی: "پرائے گھر جا کر بھی اماں باوا کے نام دھروائیں گی کہ اچھی تربیت دی ہے بیٹی کو۔ میں بکتی رہوں میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اب تمہاری عمر ان ہڑدنگوں کی نہیں ہے چولہا ہانڈی دیکھو۔ یہ عمر [illegible] اور سوئی میں دھاگہ تک ڈالنے کی لاڈلی کو تمیز نہیں ہے۔ اب کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو جاؤ جا کر بوا نصیبن کا ہاتھ بٹاؤ باورچی خانہ میں۔ آٹا گوندھوا کر۔"

اور یہ کہہ کر بوا نصیبن کو آواز دے کر امی جان نے کہہ دیا کہ یہ آ رہی ہیں محمودہ بی بی ان سے کام لو۔ گویا محمود میاں سے محمودہ بی بی بنتے ہی یہ قدر ہوئی ہماری کہ بوا نصیبن کی ماتحتی کرنا پڑی۔ مگر اب ہو ہی کیا سکتا تھا خود ہی تو لڑکی بننے کی دعائیں مانگیں تھیں وہی مثل کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی، جانا پڑا باورچی خانہ میں جہاں بوا نصیبن حکم چلانے کے لیے تیار ہی بیٹھی تھیں ہماری

صورت دیکھتے ہی کہا :

"یہ لیجیے بی بی لگن اور اس میں لا دیجیے کوٹھڑی میں سے آٹا اور بیٹھ کر گوندھیے میرے سامنے۔ لڑکی ذات کے لیے یہی کام ہیں۔ شکر ہے کہ بیگم صاحبہ کو اب ہوش آیا ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ بیٹی کو وہ یوں ہی لاڈ پیار میں رکھ کر کھانا ہانڈی سینا پرونا کچھ بھی نہ سکھائیں گی۔"

میں نے امی جان اور نانی اماں کا غصہ بوا نصیبن پر اتارا: "خیر تم یہ فکر رہنے دو مجھے بتاؤ کتنا آٹا نکالوں۔"

بوا نصیبن نے آنکھیں مٹکا کر کہا: "واہ صاحبزادی واہ کیا میٹھی زبان ہے۔ جیسی ہمارے لائق ہو۔ ذرا سنو یہ ٹھسکا کیا ہے جو آپ ابھی وہاں سے مجھ پر نہ جانے کس کس کا غصہ اتارنے۔ میری بلا سے تم کرو یا نہ کرو کام۔"

بوا نصیبن نے یہ بات اتنی اونچی آواز میں کہی تھی کہ امی جان اور ان کے پیچھے پیچھے نانی اماں دونوں باورچی خانہ میں آموجود ہوئیں اور امی جان نے آتے ہی کہا: "کیا بات ہے آخر؟"

بوا نصیبن نے خوب نمک مرچ لگا کر کہنا شروع کیا: "سرکار میں نے بس اتنا کہا تھا کہ بی بی کوٹھڑی سے آٹا نکال لاؤ تو میں تم کو گوندھنا سکھا دوں۔ چار دن میں چولہے ہانڈی کا سارا کام سکھا دوں گی۔ بس اتنی سی بات پر خفا ہو گئیں کہ میں یہ شوشہ سننے نہیں آئی ہوں یہ بکھیڑ ختم کرو۔"

نانی اماں نے کہا: "یہ صاحبزادی نواب خدا ہی ہے جو لڑکیوں کے ڈھنگ سیکھیں۔"

امی جان نے غصہ سے کہا: "ڈھنگ تو سیکھیں گے ان کے رشتے، نہیں تو مجھے گلا گھونٹ دینا بھی آتا ہے۔ یہ بارہ ہاتھ کی زبان جس وقت سسرال لے کر جائیں گی وہاں تھوکا تو جائے گا ان کی اوقات پر۔"

میری یہاں یہ گت بن رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ صحن میں فرخ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک زخندہ تھا آدھی آستینوں کی سفید قمیص اور نکر پہنے چھلانگیں مارتا پھر رہا ہے اور اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا کہ یہ کیا ڈھنگ ہیں یہ ننگا پہناوا۔ یہ اچھل کود ننگے سر بال اچھال اچھال کر اس کا کودنا کس قدر آزاد ہے وہ بھی میری طرح نہیں کہ دوپٹہ سر سے سرکا نہیں کہ آفت آ گئی۔ چال میں ذرا تیزی آئی نہیں کہ روک ٹوک شروع ہو گئی۔ میں ابھی اسے رشک کی نظروں سے دیکھ ہی رہی تھی کہ امی جان نے ڈانٹنا شروع کیا :

"اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیا بیٹھی ہے۔ آٹا آخر کب گندھے گا فرخ غریب بھوکا پھر رہا ہے۔ تیسرے پہر کو بھی اسے ڈھنگ سے ناشتہ نصیب نہیں ہوا۔"

نانی اماں نے کہا: "وہ تو اس لیے نصیب نہیں ہوا کہ لڑکی ذات ہو کر ان کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ ابھی بھائی نے ناشتہ نہیں کیا ہے وہ کھیل کود کر تھکا ہارا واپس آئے گا تو کیا کھائے گا خود ناشتہ کر کے بیٹھ رہیں۔"

امی جان نے کلمہ کی انگلی ہلا کر کہا: "دیکھو کان کھول کر سن لو شریف بہو بیٹیوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مرد کے لیے چاہے وہ باپ ہو یا بھائی یا کوئی اور پہلے چیز نکال کر رکھ دی پھر خود کھائی۔ آج تو میں نے کچھ نہیں کہا ہے مگر اب نہ ہو ایسی بدتمیزی۔ چلو گوندھو آٹا۔"

یہ سنتے ہی میں آٹا [illegible] رکھا پھر دل ہی دل میں [illegible] اماں ایک [illegible] تھیں - [illegible] بڑی خوش [illegible]
کی ساری آٹے کی ؟

امی جان نے کہا: بات یہ ہے کہ [illegible] بوا نصیبن [illegible] صبح [illegible] کو دو
[illegible] آٹا گوندھنا [illegible] تا کہ [illegible] ہو گی۔

بوا نصیبن [illegible] آٹے [illegible] اور اس آٹے میں [illegible]
میں نے دونوں ہاتھ اس آٹے میں [illegible] اب مصیبت یہ تھی کہ آٹا ہاتھوں میں چپک رہا ہے اور کچھ آٹے سے بھی جاتی ہے
بہت گوندھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ جیسے میں آٹے کو نہیں بلکہ آٹا مجھے گوندھ رہا ہے۔ امی جان الگ بیٹھی ہنس رہی ہیں۔

بھلا یہ لڑکی ذات کے دھندے ہیں [illegible] بڑی ہو گئی اور اب تک آٹا گوندھنا نہیں آیا۔

نانی اماں بولیں: [illegible] کچھ شوق ہی نہیں ہے [illegible] نہیں تو [illegible] کے کھیل ہی ایسے ہوتے ہیں کہ کھیل ہی کھیل میں [illegible] سب آ جاتا ہے [illegible]

امی جان نے کہا: تو دیکھئے [illegible] کبھی چولہے کا رخ نہیں کرتی۔ ہزار مرتبہ کہا کہ اپنی گڑیا کی شادی کرو اور اس کا جہیز [illegible] پکڑنے اور [illegible] کا دھندا تو [illegible] گا۔

نانی اماں نے کہا: نہیں [illegible] ان باتوں کا شوق ہی نہیں ہے۔ [illegible] آٹے کی کیا گت بنائی ہے؟

امی جان نے مجھے میرے سامنے سے [illegible] طرف کھسکا کر کہا: یہ آٹا گوندھنے کے [illegible] تو معلوم ہوتا ہے جیسے [illegible] نہیں ہے یوں چاہے سارے زمانے میں [illegible] دیکھو [illegible] اس طرح سے یوں چلتے جاتے ہیں ہاتھ؟

اور یہ کہہ کر امی جان نے آٹے میں [illegible] چند ہی [illegible] مار کر [illegible] آٹا گوندھ دیا۔ اور اب میرے سر پر آفت یہ لگ گئی کہ صبح ناشتہ کی پوریوں کے لیے مجھ ہی سے آٹا گندھوایا جاتا تھا۔ [illegible] آٹا گوندھنے کی مہارت [illegible] کے لیے پھر بوا نصیبن کی شاگردی میں آٹا گوندھنا پڑا تھا۔ آٹا گوندھنے کی [illegible] مشق کے بعد بوا نصیبن نے پیڑے بنانا سکھائے۔ پھر [illegible] روٹی بنانا اور روٹی کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے چپاتی بنانا سکھایا۔ شروع شروع میں تو کبھی میں نے ملک کا نقشہ بنا دیا تو کبھی روٹی کی شکل ایسی ہوتی جیسے دوپلی ٹوپی [illegible] رہ گئی مگر رفتہ رفتہ مجھ کو چپاتی توے تک پہنچانا آ گیا مگر [illegible] توے پر چپاتی ڈالنے کے بعد اس کو الٹنے [illegible] یہ کوشش جب کبھی کی انگلیاں توے سے لگ کر جل گئیں۔ ایک طرف تو یہ تکلیف دوسری طرف خدا بچائے ان بوا نصیبن سے ایسے کڑے تیوروں سے بات کرتی تھیں کہ جی چاہتا تھا کہ کبھی جلتا ہوا توا اس چڑیل کے منہ پر مار کر باورچی خانہ سے نکل جاؤں مگر بوا نصیبن کو خدا نے یہ موقع دیا تھا کہ وہ مجھ سے اگلا پچھلا سارا حساب چکا لیں۔ اس لیے ان کی باتیں بھی سننا اور سہنا پڑتی تھیں۔

[illegible] سارا رشک آتا تھا فرخ کو دیکھ کر جو شام کو اپنی ہاکی اسٹک لیے کھیل کود کر گھر میں آتا تھا اور پھر پنکھے کے نیچے بیٹھ کر سب سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا تھا۔ کبھی کیرم کھیلتا۔ کبھی بیڈمنٹن اور کبھی امی جان سے اجازت لے کر سینما چلا جاتا تھا اور

ایک میں تھی کہ اسی وقت اس قیامت کی گرمی میں چولھے کے سامنے بیٹھی جھُک کرتی تھی۔ ایک مرتبہ کہیں میرے منہ سے بھی نکل گیا تھا کہ امی جان میں بھی سینما دیکھوں گی۔ بس کچھ نہ پوچھئے سارا گھر ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا کہ اس نے آخر یہ بات کہی کیسے۔ امی جان باتیں سنا چکیں تو نانی اماں نے خبر لینا شروع کی۔ وہ تھک گئیں تو پھر امی جان شروع ہو گئیں۔ وہ تو کہئے کہ اسی وقت کہیں ابا جان کو اللہ میاں نے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیج دیا اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے سینما جانے کے لیے کہا تھا تو وہ بجائے خفا ہونے کے کہنے لگے کہ "میں خود لے کر جاؤں گا اپنی بیٹی کو"۔ اور اس کے بعد پھر جو ان میں اور امی جان میں لڑائی شروع ہوئی ہے تو سچ مجھ کو رونا آ گیا کہ یہ سب کچھ مجھ کمبخت ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھ گئی کہ ابا جان نے امی جان سے کہہ دیا کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ لڑکیوں کو لونڈیوں کی طرح رکھا جائے۔ اور امی جان نے اس کے جواب میں ان سے کہہ دیا کہ زندگی بھر بیٹی کو گھٹنے سے لگائے بیٹھے رہنا۔ اسی لاڈ پیار نے تو لونڈیا کا ناس مار کر رکھ دیا ہے یہ عمر ہونے کو آئی اور ان صاحبزادی کو ٹانکہ بھرنا آیا نہ ہانڈی میں نمک ڈالنا"۔ ابا جان کے منہ سے نکل گیا کہ میں نے دیکھی ہیں تمہاری بہنوں کی لڑکیاں بھی جن کو بیگم بننے کی نہیں بلکہ کنیز بننے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ اس بات پر امی جان نے بھی میری تمام پھوپھی زاد اور چچا زاد بہنوں پر ایسے نام دھرے کہ ابا جان غصے میں تاؤ کھاتے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نانی اماں نے سارا غصہ مجھ پر اتارا۔

"اب تو کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ اماں باوا میں پھوٹ ڈلوا کر جی خوش ہو گیا۔ گھر بیٹھے سینما دیکھ لیا۔"

امی جان نے کہا: "ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ وہ غصہ کریں مگر میں ان صاحبزادی کو ذبح کر دوں گی اگر یہ اپنے چچاؤں کی لڑکیوں کے ڈھنگ پر گئیں یا ان کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ ان کا کیا ہے وہ تو لڑکیوں کو لڑکوں کی اٹھان اٹھا رہے ہیں۔ سائیکل ان کی لڑکیاں چلائیں۔ گیند بلا ان کی لڑکیاں کھیلیں۔ رسیاں تان تان کر وہ پھاندیں۔ دوڑ ایسی لگائیں کہ جیسے تانگے کی گھوڑیاں۔ مگر میرے یہاں یہ نہ ہوگا۔"

اس تمام آفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں بھوکی پیاسی روتی کڑھتی جان دیتی رہی اور اسی طرح سو گئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ابا جان نے بھی فاقہ کیا اور امی جان نے بھی نانی اماں کا البتہ دل گھٹ رہا تھا اس لیے دو چار نوالے کھا کر انھوں نے پانی پی لیا تھا۔

میری شامت کہ اسی دن میرے چچا کی لڑکیاں نوشابہ اور رخسانہ بھی آ گئیں۔ سچ پوچھئے تو مجھے ان کے سامنے بڑی شرم آئی کہ میں بوا نصیبن کی ماتحتی میں بیٹھی چولھا پھونک رہی تھی اور یہ دونوں مس بابا بنی اعلیٰ درجے کے کپڑے پہنے بنی سنوری آئی تھیں مجھے دیکھ کر ان دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا نوشابہ نے کہا:

"اوہ محمودہ یہ تم کو کیا ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم کو محمودہ بوا کہنا چاہیے۔"

رخسانہ نے کہا: "چھوڑو یہ چولھا ہانڈی چلو تم کو اپنے اسکول لے چلیں وہاں آج فینسی فیئر ہے۔"

نوشابہ نے کہا: "میرے خیال میں ان کو اسی طرح لے چلیں۔ فینسی فیئر تو ہے ہی کہہ دیں گے کہ یہ ماما بن کر آئی ہیں۔"

یہ دونوں اسی قسم کی باتیں بنا رہی تھیں کہ امی جان نے آ کر کہا: "جلدی کرو آٹا گوندھ کر روٹی ڈالو اس کے بعد کام

[illegible] اسلام [illegible] :

[illegible] کا [illegible] بڑا [illegible] سمجھ کے [illegible] :

[illegible] ہیں [illegible] :

[illegible] کہا : [illegible] بات ہے [illegible] :

[illegible] کہا : [illegible] :

[illegible] کہا : [illegible] :

[illegible] کہا : [illegible] گھر [illegible]

[illegible] :

تائی اماں نے قطعی فیصلہ کر دیا : [illegible] ایک مرتبہ [illegible] سکتی ہے

[illegible] اماں کے خراٹوں سے : [illegible] ملے ہیں کہ ع

ع [illegible] کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

[illegible] آئینے کے سامنے [illegible] کہیں [illegible] پر مجبور ہوئے کہ کہیں شرمندہ ہو کر [illegible] کہ ع

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے

واقعہ یہ ہے کہ ہم، ہم ہیں اور وہ، وہ : آخر لاحول پڑھ کر ہم اس [illegible] کی گردش کرتے ہوئے [illegible] کر کے رہ گئے ع

عورت کے خدا کتنے ہیں مرد کا خدا ایک

(خدیجہ مستور)

(قاضی جی)

قائدِ اعظم میموریل فنڈ

(قاضی جی تشریف لاتے ہیں)

قاضی جی:- ارے بھئی! ہم نے کہا سنتی ہو۔ عجیب خدا کی رحمت ہے اس گھر پر کہ گھر والی کا ہر وقت ہمیشہ غائب رہتی ہیں۔ اب کبھی جو پتہ چلے۔ ارے صاحب کہاں ہیں آپ منہ جواب دے دیجئے۔

بیوی:- توبہ ہے! منہ کے سامنے کھڑی ہوں، تو چیخ رہے ہیں۔

قاضی جی:- کیا خوب یہ گویا آپ تشریف فرما ہیں۔ اس طرح دھوپ سے منہ چھپا کر بیٹھی ہو کہ میں سمجھا کسی نے بستر و بستر دھوپ کھانے کے لیے رکھ دیے ہیں۔ یہ حال ہے یہ کہنے کو جو رہا تھا کہ میرے ایک بہت پرانے دوست جن کے متعلق میں سمجھا تھا کہ وہ اس بحث ہو چکے ہوں گے اتفاق سے آگئے ہیں۔ ارے بھئی تم جانتی ہو گی، ان کو بھلا سا نام ہے ان کا نام ہی پر لب آ رہا ہے۔ لاحول ولا قوۃ! یعنی ابھی میں کہہ رہا تھا اور [illegible] ذہن سے نکل گیا۔ ارے بھئی وہی جو بڑے اچھے شاعر بھی ہیں۔ مشاعرے اکثر کیا کرتے تھے

بیوی:- انجم صاحب تو نہیں؟

قاضی جی:- انجم۔ لاحول ولا قوۃ! اس کا تو میرے سامنے نام بھی نہ لو۔ خود غرض۔ دوست مار۔ ابن الوقت۔ ایسے مطلبی دوست تو خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان ہی حضرت کی وجہ سے آج تک میں بازار کا دودھ دہی گھی وغیرہ استعمال کرتا ہوں۔ میری بھینس کو گم کرانے میں ان ہی بزرگ کا ہاتھ تھا۔

بیوی:- توبہ ہے اب وہ بھینس یاد آگئی ہوتی دس برس کی بات۔

قاضی جی:- دس برس کی بات ہو یا سو برس کی جو بات دل میں رہ جاتی ہے وہ گرہ بن جاتی ہے۔ ارے بھئی آپ پولیس میں تھے۔ اپنے ہر وقت کے ساتھی تھے۔ اگر ذرا بھینس کو ڈھونڈ دیتے تو کیسی بڑی بات تھی مگر اس بندۂ خدا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ارے بھئی سنو۔ ذرا میرے پشتو کا [illegible] دوں، تم دھوپ میں تو بیٹھی ہی ہو ذرا دیکھو تو کم بخت کوئی جوں وغیرہ تو نہیں ہے۔ رات بھر کھجلی ہوتی رہی ہے۔

[illegible] آپ کے بس سے

بیوی :- [illegible]

بیوی :- [illegible]

قاضی جی :- [illegible]

[illegible]

[illegible]

ہاں [illegible] ہیں۔ [illegible] واقعی [illegible] آ رہے ہو؟

بیوی :- وہ ۔۔۔ [illegible] ہیں۔

سراج :- جناب [illegible]

قاضی جی :- وہ حال وہ وقت [illegible] ہے۔ [illegible]

ہے۔ یہ ہی تو [illegible] کے گھر سے [illegible] نہیں [illegible]۔

سراج :- بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جب تو [illegible] تمام [illegible] تو طبیعت [illegible] ہوتی ہے۔

قاضی جی :- اور میرا یہ عالم ہے کہ اس موسم [illegible] کا نام سن کر میری [illegible] زندگی [illegible] کی کوشش [illegible] شروع کر دیتی ہے۔ دیکھیے آپ نے بھی اپنی طبیعت کا [illegible] شاعرانہ بات عرض کی ہے۔ اسے [illegible] آتے ہی ان کا ذکر پھر [illegible] گیا۔ [illegible] وہ میرے نہایت عزیز دوست ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے [illegible] ہے۔

سراج :- کون عزیز؟ وہ [illegible] تو نہیں جن کے دیوان کا نام ہے کسب کمال

قاضی جی :- جی ہاں! یہ نام میں ہی نے تو رکھا تھا ان کے دیوان کا اور [illegible] یہ حق کہ کا کسب کمال [illegible] بڑا خوش فکر شاعر ہے اور [illegible] ایک مشاعرہ [illegible] بھی ہوا ہے۔ اس کی غزل [illegible] کہتا ہے اور میں [illegible] ایک مشاعرہ۔

بیوی :- میرے یہاں اب مشاعرہ وشاعرہ نہیں ہو سکتا۔ لو اور سنو [illegible] روز مرہ کے اخراجات گھٹا رہی ہوں وہ آئے مشاعرہ کرنے۔

قاضی جی :- اخراجات ہی کی وجہ سے تو تم سے پوچھنے کی ضرورت پیش آئی ورنہ [illegible] آپ نے جھٹ کہہ دیا کہ مشاعرہ وشاعرہ نہیں ہو سکتا۔ اتنا بڑا شاعر میرا دوست، مدت کے بعد آیا ہے۔ میں تو واقعی یہ سمجھا تھا کہ بیچارہ چل بسا ہو گا مگر وہ زندہ سلامت آ گیا۔ دوسرے مشاعرے میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے۔ پان، سگرٹ، چائے۔ اور دری، چاندنی، قالین وغیرہ سب میرے ساتھ یہاں سے آ جائیں گے۔ شہرت کی شہرت اور نوازش کی نوازش۔

بیوی :- وہ تو ٹھیک ہے مگر میں طے کر چکی ہوں کہ اس وقت جتنے اخراجات ہیں سب میں کمی کر کے قائد اعظم میموریل فنڈ میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ مجھ سے دیا جائے گا وہ میں دوں گی۔

قاضی جی :- قائد اعظم کا کونسا فنڈ کہا تم نے؟ اللہ مجھ سے انگریزی نہ بولا کرو۔ معلوم ہے کہ میں نہ گریجویٹ ہوں نہ ایف۔ اے، بی۔ اے

مگر بیگم صاحبہ یہ کیا اپنی انگریزی دانی کی وجہ سے زندگی اجیرن کیے ہوئے ہیں۔

زبیدہ :- بھائی جان! انہوں نے کہا ہے قائداعظم میموریل فنڈ یعنی ـــــ

قاضی جی :- بھئی تم چپ رہو۔ میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں۔ ایک گریجویٹ چپ ہو جائیں تو دوسری ایل۔ ایل ڈی جیسی [illegible] آپ بتائیے سراج میاں یہ کیا بات ہے۔ بات یہ ہے کہ جہاں قائداعظم کا نام آجاتا ہے وہاں میرا سر عقیدت کے مارے جھک جاتا ہے اور پھر اس نام کے آنے کے بعد پھر اپنے دل کو قابو میں نہیں رکھ سکتا مگر اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ [illegible] کے نام سے دھوکے دیے جائیں۔

سراج :- الحمدللہ کہ آپ کے دل میں ہمارے محسنِ اعظم اور پاکستان کے معمار کا اتنا احترام موجود ہے۔ بات یہ ہے بھائی جان کہ [illegible] ہمارے محبوب قائداعظم کی پیدائش کا دن ہے اور اسی دن سے ہمارے گورنر جنرل ہز ایکسیلنسی الحاج خواجہ ناظم الدین [illegible] کا افتتاح فرما رہے ہیں۔

قاضی جی :- اہا! یہ کوئی نہایت اہم بات ہے۔ للہ انگریزی نہ بولو مجھ کو سمجھ لینے دو کہ یہ ہے کیا۔

سراج :- میں عرض تو کر رہا ہوں بھائی جان کہ میموریل فنڈ کا مطلب یہ ہے کہ ایسا چندہ جس سے یادگار قائم ہو سکے۔ حضرت قائداعظمؒ کے احسانات قوم کبھی نہیں بھول سکتی۔

بیوی :- غلامی سے نجات دلانے والے کو کون بھول سکتا ہے۔

زبیدہ :- دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے بانی کو تاریخ کبھی نہیں بھول سکتی۔

قاضی جی :- صاحب آپ دونوں کی قابلیت کے سامنے میں سر جھکاتا ہوں۔ آپ کی قابلیت مسلّم۔ آپ کی ماہری تسلیم مگر ہاتھ جوڑتا ہوں کہ مجھ کو بھی ذرا سمجھ لینے دیجیے کہ یہ واقعہ کیا ہے میں اس وقت نہایت سنجیدگی سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

بیوی :- سمجھنا ہی کیا ہے۔ بس کہہ تو دیا کہ قائداعظم کی یادگار ان کی احسان مند قوم کو ایسی بنانا چاہیے جو ان کے شایانِ شان ہو اور اس یادگار میں قوم کے ہر فرد کا بڑے سے بڑا حصہ ہونا چاہیے۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ تین کروڑ روپیہ جمع کیا جائے جس میں ایک عالی شان مقبرہ تعمیر ہو، ایک جامع مسجد، ایک دارالعلوم اور ایک ٹیکنیکل درسگاہ۔

قاضی جی :- فرما چکیں آپ؟ اچھا بھائی سراج میاں آپ فرمائیے کیا کہہ رہے تھے؟

سراج :- بس میں یہی عرض کر رہا تھا کہ ۲۵ دسمبر سے یہ فنڈ کھولا جا رہا ہے اور ضرورت اس کی ہے کہ ہم سب مل کر قائداعظم کے اس احسانِ عظیم کو یاد کریں جو قیامِ پاکستان کی صورت میں ملتِ اسلامیہ پر عموماً اور اس برِعظیم کے مسلمانوں پر خصوصاً قائداعظم نے فرمایا ہے۔

قاضی جی :- کس کو انکار ہو سکتا ہے اس سے اور کون قائداعظم کی یادگار قائم کرنے کی مہم میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینا چاہے گا۔ یہ تو سخت احسان فراموشی ہوگی اگر اس وقت بھی ہم اپنی غیر ضروری اور فضول خرچیوں پر اس فنڈ کو ترجیح نہ دیں۔

بیوی :- یا اللہ تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج تو ایک بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ آج میں نذرانہ دوں گی۔

قاضی جی :- یہ تو جناب آپ کی زبردستی ہے کہ آپ نے مجھ کو ایک سرے سے بالکل ہی ناسمجھ طے کر رکھا ہے۔ جو بات معقول ہوگی

اس کا ہی عروج [illegible] اثر ہے جس سے مسالے کا آپ رنگ بھی پرخوشبو اور ذائقہ کی لذت کا لطف بھی دوبالا ہو جاتا ہے آپ کو اس تو ہیں باتوں کا قائل ہو جاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اتنا کام کرنے کے لیے تو ہنر کو زیر ہونا چاہیے کاٹ کر جو پہلے پک کر وہ ملے۔

زبیدہ :۔ ہم جو کہتے ہیں آپ کی لطافت کا ذوق نہیں کہ فہرست سے صرف اس [illegible] کی کر

قاضی جی :۔ بس انہیں باتوں سے بھول گئی ہے کہ اب آپ کا بھی احساس اور اس کی نزاکت کا اندازہ کر کے پہچانتے ہیں کل کتابوں کو یہ معاذ اللہ اتنے بڑے بڑے الفاظ برتی ہو۔ شفتہ مرچ وغیرہ کا مقید تک نہ کا یاد ہے جو بڑی ایک بار انہیں بتایا تھا۔ میں بھی یہ تو کہہ رہا ہوں بھول گیا تھا۔ آج گوشت کتنا مزیدار آیا ہے۔ رات کو [illegible] بھی پھر ایک بار پھر سالن کھانے کو جی چاہتا ہے۔

بیوی :۔ واقعی رات کا گوشت اچھا تھا مگر تعجب ہے کہ تم پہچان گئے۔

قاضی جی :۔ پہچانا اور سنئے۔ اب گریا میں ایسا کیا بتاؤں کہ گوشت کا بھاؤ بڑا ہی ہو رہا ہے [illegible]۔ بیگم صاحبہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس قسم کی طبع نا قابل ہوں جس کے لئے تو دو دو کا مزہ [illegible] کرنے کا نمک بتا دیا کرتے تھے۔

زبیدہ :۔ لیجئے میرے اللہ! آپ بھی جب بات کرنے پر آتے ہیں تو بڑی ہی [illegible] لمبی چھوڑتے جاتے ہیں۔

بیوی :۔ اور حال یہ ہے کہ پھر اس پر بیگم اور گوردہ وغیرہ کے کباب بالکل ہی کھا چکی ہوں اور یہ جو کر کا چکے ہیں ان پر گوشت کا۔

قاضی جی :۔ جو کہ تم نے بیچنے بیٹھے بازاروں سے نہیں کھایا۔ یہ عورتوں کی بات ہے کہ [illegible] کے لیے جان بوجھ کر انجان بن گیا ہوں۔ ورنہ یہ واقعہ ہے کہ ترکاریوں کے کباب بنانے میں تم کو ملکہ حاصل ہے۔ سراج میاں! ہماری بیگم کو یہ کمال ضرور حاصل ہے کہ ان کے پکائے ہوئے کھانے میں ہر چیز [illegible] ان کا مزا کبھی نہیں آتا۔ گوشت پکا ہوگا تو ترکاری کا مزا آئے گا اور ترکاری پکائیں گی تو گوشت کا دھوکہ ہوگا۔ اس روز فیرنی پکائی گئی تھی [illegible] سب بیٹھنے والے سمجھے کہ اس میں شکر پڑی ہے۔

سراج :۔ کیسی ہی نہیں بھائی جان! فیرنی تو وہ نہایت لذیذ تھی۔

بیوی :۔ اس وقت کیا معلوم جھوم جھوم کر چٹخارے لے لے کر کھا رہے تھے اور اب وہ فیرنی غضب ہو گئی۔

قاضی جی :۔ افسوس تو یہ ہے سراج میاں کہ آپ نے فیرنی کبھی کھائی نہیں۔ بس اسی قسم کی کھائی ہے جیسی انہوں نے پکائی تھی اس دن ورنہ فیرنی پکانا تھا اچھو [illegible] دادا جان کا خاصہ تیار کرتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ ایک ہفتہ قبل اس سے کہہ دیا جائے کہ فیرنی کھانا ہے۔ بس جناب اسی دن سے وہ بھینس کو اپنے کمرے کے پچھواڑے باندھ لیتا تھا۔

بیوی :۔ بھینس کو؟

قاضی جی :۔ جی ہاں! بھینس کو باندھ لیتا تھا اپنے کمرے میں اور ہفتہ بھر تک اس کو زعفران اور مشک و عنبر کھلاتا رہتا تھا یہاں تک کہ تیسرے چوتھے دن کے بعد سے وہ زعفرانی رنگ کا نہایت معطر دودھ دینا شروع کر دیتی تھی اور اس کا کھویا بنا رہتا تھا۔

بیوی :۔ پھر تم کہو گے کہ میں جھوٹ کہہ رہی ہوں ان باتوں کو۔

سراج :- جھوٹ نہیں آپا! ان ہی باتوں کے پیچھے تو ہم لوگ اتنے دنوں تک غلامی کو پالا پوسا کیے ہیں۔

زبیدہ :- اللہ کا شکر کہ وہ زمانہ گیا۔

قاضی جی :- کیا کہتی چلی جا رہی ہو۔ یہاں یہ عالم کہ نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں اس زمانے کو اور بیگم صاحبہ ادا کر رہی ہیں شکر خدا کا اب وہ زمانہ کہاں آسکتا ہے۔

بیوی :- اور نہ خدا کرے آئے۔ ہم کو نہیں چاہیئے وہ زمانہ۔ اب ہم اپنا زمانہ خود بنا رہے ہیں۔

قاضی جی :- خیر خیر! بات سنو بیوی، تو سراج میاں! اس وقت کی فیری کا مزا آج تک نہیں بھولے ہیں۔ ایک مرتبہ ماماجان نے ایک مخصوص مشاعرہ کیا تھا۔ ہاں بھئی تو میں نے کہا سنتی ہو! وہ مشاعرے کی بات تو رہ ہی گئی۔

زبیدہ :- میں بتاؤں بھائی جان: وہ مشاعرہ آپ اس فنڈ ہی کے لیے کیوں نہ کریں؟

سراج :- بات تو معقول ہے۔

بیوی :- توبہ کرو۔ یہ بھلا ان کے بس کا روگ ہے۔ ان میں بھلا اتنی عقل کہاں!

قاضی جی :- ارے صاحب! اللہ مجھ کو سمجھ تو لینے دو کہ فنڈ میں مشاعرہ کیسے دے سکتا ہوں۔ یہ بات تو سمجھا دو مجھ کو۔ میری عقل کا ماتم بعد میں کرنا مگر مجھے عقل سے کام لینے کا موقع تو دو۔ سراج میاں یہ بات کیا ہے۔ اس تجویز کو سمجھائیے تو ذرا مشاعرے کا فنڈ۔ فنڈ کا مشاعرہ۔

سراج :- بات یہ ہے بھائی جان کہ قائداعظم میموریل فنڈ میں جن جن صورتوں سے روپیہ دیا جاسکے دیا جائے۔ اب چونکہ آپ کے یہ دوست آئے ہوئے ہیں آپ مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں تو اس میں ٹکٹ لگا دیجیے اور مشاعرہ کا انتظام ذرا دھوم دھام سے کیجیے تاکہ ٹکٹ زیادہ سے زیادہ بکیں۔

قاضی جی :- اور جو آمدنی ہو وہ فنڈ میں دے دی جائے۔ بھئی کیا لاجواب ترکیب ہے یعنی آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔ تو اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ اب میں ایسا بھی نکما نہیں ہوں کہ اتنا سا انتظام نہ کرسکوں۔ شہناز کی شادی کا سارا انتظام میں نے کیا تھا۔

بیوی :- جی ہاں! جس کے بدولت برات واپس گئی تھی۔

قاضی جی :- وہ خیر دوسری بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ کھانے میں دیر تھی۔ بھوک پر غصہ آ رہا تھا وہ اترا مہر کے سوال پر۔ اس میں میرے انتظام کی کیا گڑبڑ۔

بیوی :- خیر میں نے کہہ دیا ہے کہ اتنا بڑا مشاعرہ تم نہیں کرسکتے۔

سراج :- اگر بھائی جان دخل نہ دیں تو انتظام میں کر دوں گا۔

قاضی جی :- یہ تو عجیب شرط ہے کہ میں دخل نہ دوں۔ یعنی میں شاعر اور مشاعرہ میرا خاص میدان آپ اس کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔

سراج :- بس آپ شاعروں کو جمع کیجیے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ٹکٹ وغیرہ اور سننے والوں کے معاملات میں آپ دخل نہ دیں۔

قاضی جی :- چلیے منظور! مصرع طرح پہلے طے کرو، پھر صدر مشاعرہ طے کرو۔

زبیدہ۔ [illegible] صاحب۔

باسی بی۔ [illegible] ساعت [illegible] لے۔ [illegible]

[illegible] [illegible] لے

[illegible] صاحب [illegible] حاصل کرنے کے [illegible] ہو۔

[illegible] [illegible] جائے۔

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] نہیں ہو سکتیں آپ [illegible]

[illegible] [illegible] ہی۔

(قاضی جی)

گداگری

(قاضی جی نجمہ کو لے کر داخل ہوتے ہیں)

قاضی جی :- آؤ۔ شاباش! آجاؤ تم سے کون پردہ کرتا ہے۔ ارے بھئی ایک تو تم بچہ ہو ابھی دوسرے تم تو لڑکی ہو۔ لڑکیوں سے تھوڑی کوئی پردہ کرتا ہے۔ لڑکیاں تو خود پردہ کرنے لگتی ہیں۔ سلام کرو ان کو، یہ چچی ہیں تمہاری۔ ایں جی! چچی ہوئیں نا تم اس کی۔ ارے بھئی میں چچا ہوں تو میرے رشتے سے تم چچی ہی ہو سکتی ہو زیادہ سے زیادہ۔ سلام کرو بیٹی ان کو اور ان کو بھی یہ پھوپی ہیں تمہاری۔

نجمہ :- تسلیم! تسلیم!

بیوی :- جیتی رہو۔

زبیدہ :- کس کی بچی ہے یہ بھائی جان؟

قاضی جی :- ارے بھئی چھٹن خاں کی لڑکی ہے۔ نجمہ اس کا نام ہے۔ آج ان کے ہاں جا کر ہوش آیا تو کہنے لگے کہ قاضی جی! دن بھونڈا ہڑانگے مارتی ہے نہ پڑھنے کی نہ لکھنے کی۔ اگر آپ کے یہاں چلی جایا کرے تو گھر میں سب ہی پڑھے لکھے ہیں بس کوئی بھی چھوٹا ہلکا دو حرف پڑھا دے گا اور شاید گھرداری کے بھی ڈھنگ آ جائیں۔ چنانچہ میں ساتھ لیتا آیا۔

بیوی :- لڑکی تو صورت سے بھولی بھالی نظر آتی ہے۔ کیا پڑھتی ہو بیٹیا تم؟

نجمہ :- الف سے انڈا، بے سے بکری، تے سے تتلی۔

قاضی جی :- ہائیں ہائیں ہائیں۔ تے سے تربوز یا تتلی۔ کہاں ہے کتاب تمہاری؟

بیوی :- تے سے تتلی ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو بی بی! شاباش۔ اپنی کتاب لاؤ بہنا!

نجمہ :- یہ لیجے کتاب اور یہ تختی ہے۔

قاضی جی :- اچھا، ادھر بیٹھو تم میری طرف منہ کر کے۔ نکالو کتاب۔ یہ۔ یہ۔ رکھو انگلی اس پر، پڑھو اس کو۔ دیکھو میں پڑھتا ہوں پہلے، غور سے سنو۔ الف سے انڈا، بے سے بکری، تے سے تتلی۔ مگر مجھ کو خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جو قاعدہ میں نے پڑھا تھا اس میں تے سے تربوز تھا۔ اچھا خیر! تے سے بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ ذرا بتاؤ تو نجمہ! تم کو یہاں کون کون سی چیزیں تے سے نظر آ رہی ہیں؟

بتاؤ۔ شاباش

[illegible] :۔ [illegible]

[illegible] :۔ [illegible] شاباش

قاضی جی :۔ واہ جی واہ! [illegible]

بیوی :۔ [illegible]

قاضی جی :۔ اور سنیے [illegible]

[illegible]

بیوی :۔ بس تو پھر [illegible]

قاضی جی :۔ جی ہاں ارشاد ہوا [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک مرتبہ [illegible] ہے۔

(دروازے پر دستک کے ساتھ جمیل کی آواز)

جمیل :۔ جناب قاضی صاحب!

قاضی جی :۔ آگے بڑھو بھائی برکت ہے۔

بیوی :۔ ارے ارے جمیل بھائی ہیں۔

قاضی جی :۔ ایں جمیل میاں۔ ارے بھئی جمیل میاں آؤ نا۔ استغفراللہ۔ آج صبح سے اتنے فقیر آئے ہیں کہ [illegible] فقیرانہ صدا [illegible]

جمیل :۔ (ہنستے ہوئے) میں تو یہ کہہ کر واپس جانے والا تھا کہ فقیرانہ آئے صدا کر چلے

قاضی جی :۔ [illegible] بھلا ہوگا۔ مگر نہیں۔ یہ تو۔ یہ تو شاید اس کا مصرعہ ہے کہ اور درویش کی صدا کیا ہے۔ اس کا مصرع کیا ہے فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ کچھ ہے ضرور دوسرا مصرع اس کا۔

جمیل :۔ جی ہاں! وہ شعر یہ ہے ــ فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔ آپ نے جب کہا کہ برکت ہے آگے بڑھو تو میں یہی کہہ کر جانے ہی والا تھا۔

قاضی جی :۔ مگر بھئی یہ قصہ کیا ہے آخر یا تو وہ زور شور تھا فقیروں کی روک تھام اور گداگری کے خاتمہ کا یا پھر وہی رنگ نظر آ رہا ہے یعنی صبح سے چھ سات تو بھکاری ناطقہ بند کر چکے ہیں بلکہ صاحب اب تو مصیبت یہ ہے کہ یہ لوگ غالباً ڈر کے مارے قرض کے تقاضے کے طور پر تو بھیک مانگتے ہیں۔ کچھ عجیب رازداری کے ساتھ سوال کرتے ہیں مثلاً صبح ایک بزرگ نے دستک دی۔ میں نے پوچھا کون ہے تو ارشاد ہوا باہر تشریف لے آئیے۔ میں [illegible] کو سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور تشریف آوری کا مقصد پوچھا تو بولے کہ میں مہاجر ہوں۔

زبیدہ :۔ (ہنس کر) مہاجرین کی بھی ایک ہی کہی۔

قاضی جی :- جی ہاں! یہ جتنے مانگنے والے ہیں ان کو اچھے بھلے عجب و غریب نام مل گئے ہیں اور لطیفہ یہ کہ صاحب جی میں بھی [illegible] معاہدین تو بجا ہے، مہاجر کی؟ مگر خیر اللہ کی اس غلطی کو وہ کیا سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ کی نہیں بلکہ ... بلکہ قواعد کی غلطی کہ۔ تو خیر بہرحال ان صاحب نے نہایت سرگوشی میں سوال کیا اور مجھ کو ان سے معافی مانگنی پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر راستے میں ایک صاحب نے سلام علیکم کر کے روک لیا اور اللہ کے نام پر کچھ مانگنے کے بجائے پاکستان کے حوالے سے مانگ شروع کیا تو مطلب یہ کہ آخر یہ مانگنے والے تو بدستور موجود ہیں۔

بیوی :- بدستور تو خیر نہیں البتہ اب وقت جتنا جتنا گزرتا جاتا ہے اتنے اتنے یہ مانگنے والے پھر پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

قاضی جی :- یہ تو خیر غلط ہے پیدا ہو کر اتنی جلدی اتنے بڑے وہ ہرگز نہیں ہو سکتے کہ مانگنے کے قابل ہی ہو جائیں مثلاً آج ہی جو صاحب سب سے پہلے تشریف لائے تھے وہ تو عمر میں بڑے ہی بڑی صاحب قبلہ معلوم ہوتے تھے، آپ کہتی ہیں کہ یہ نئے پیدا ہونے والے ہیں۔ چہ خوش۔

جمیل :- (ہنس کر) پیدا ہونے کا مطلب آپ نے تو ایک دم ولادت ہی سمجھ لیا۔ مطلب بھابی کا یہ ہے کہ یہ طبقہ پھر رفتہ رفتہ [illegible]

قاضی جی :- ہاں! یہ ایک حد تک ٹھیک ہے۔ ارے بھئی اس لڑکی کو فی الحال چھٹی دے دو نا۔ یہ ڈبی تو کھیلو گو دو۔ وہ دیکھو گھوڑا بچی ہے، اس میں کوئی ازار بند باندھ کر گھوڑے تانگے کا کھیل کھیلو۔ مونڈھے کو بناؤ تانگہ اور گڑیا کو بناؤ گھوڑا اور یہ مونڈھی اس کا بناؤ چابک۔ جاؤ بیٹی کھیلو شاباش۔

جمیل :- آپ کی تعریف؟ کس کی بچی ہے یہ؟

قاضی جی :- یہ صاحبزادی ہیں چھٹو خاں کی اور شاگرد ہیں آج سے میری۔ ان چھٹن خاں کے نام پر یاد آیا کہ وہ جو غنڈوں کو ختم کرنے کی مہم شروع ہوئی تھی اس کا بھی کچھ پتہ نہیں چلا۔ مجھ کو تو سب غنڈے جوں کے توں نظر آ رہے ہیں۔ اب مثلاً چھٹو خاں نہ جیل گئے نہ حوالات نہ ان سے کسی نے کچھ پوچھا گچھا۔

بیوی :- ہاں جمیل بھائی آپ تو کہتے تھے کہ یہ چھٹن خاں وغیرہ سب پکڑے جائیں گے یہ آخر ہوا کیا؟

قاضی جی :- تم کو تو بس چھٹو خاں کی گرفتاری کا انتظار ہے۔ میں نے خود اس سے بھی پوچھا تھا کہ بھئی اب تک گئے نہیں حوالات کی حجامت میں تو نہایت اطمینان سے مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا کہ ؎

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

جمیل :- قاضی جی اصل میں قصہ یہ ہے کہ کوئی بھی اصلاحی قدم حکومت اٹھائے اس میں کامیابی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ عوام بھی حکومت کا ہاتھ نہ بٹائیں اور اس قسم کے کاموں کو سرکاری نہیں بلکہ قومی کام سمجھیں۔ اب مثلاً یہ آپ کا کام تھا کہ چھٹو خاں کو گرفتار کراتے۔

قاضی جی :- جی ہاں کیا مطلب جناب کا۔ یعنی میں یہ حق دوستی ادا کرتا کہ اسے جیل بھجواتا۔ بھئی جمیل میاں بعض اوقات تو تم ایسی بے سر پیر کی بات کہہ دیتے ہو کہ مجھ کو حیرت ہوتی ہے کہ تمہارا دماغ آخر جسم کے کس حصے میں واقع ہے۔ ارے بھئی وہ لاکھ لفنگا سہی،

[illegible]

[illegible]

قاضی جی: [illegible]

[illegible]

جمیل: قاضی جی [illegible]

بہت سے لوگ محض یہ خیال [illegible]

بیوی: [illegible] تو غضب ہے۔ [illegible] کا مسئلہ بھی [illegible]

اور بزدلی ہی نہیں بلکہ خود ان کا ایک طرح سے [illegible] دیتا ہے۔

قاضی جی: اللہ اکبر بیان بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی جیسی بات ہے۔ [illegible] بیوی ہونے کی جگہ اگر ایڈووکیٹ [illegible]

[illegible] الفاظ پہ زور دینا [illegible]

کو زبردستی منوا لینے کی دھن یہ سب وکالت کی علامتیں ہیں۔ [illegible]

سائن بورڈ — مسز قاضی جی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی وکیل ایڈووکیٹ

بیوی: اب دیکھ رہے ہیں جمیل بھائی آپ ایک بات منہ میں آگئی ہے تو خیر کی نہیں ہوتی کسی طرح۔ ذکر کیا ہو رہا تھا بات نکل گئی کہاں کی کہاں۔

جمیل: قاضی جی! یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اس قسم کی کوئی اسکیم عوام کے تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ حکومت کے سامنے اس وقت بے شمار کام ہیں اور ظاہر ہے کہ حکومت کے انتظامی شعبوں کو سب ہی کام کرنا ہیں اور اپنی توجہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنا ہے۔ اب اگر ہمارے عوام حکومت کا ساتھ نہ دیں گے تو یہ بڑا [illegible] ہوگا۔

قاضی جی: بہتر ہے ٹھہریے۔ ضرورت اس کی ہے کہ آپ لوگوں کی باتیں پہلے تو میں لکھ لیا کروں اس کے بعد غور کیا کروں کہ آپ نے کیا فرمایا ہے؟ میں قسم سے کہتا ہوں جو ایک بات بھی میرے پلے پڑی ہو۔ انتظامی شعبے، توجہ، حصے، تقسیم، خدا جانے کیا کیا کہہ گئے ایک سانس میں اور بیچارا آستینوں میں کیسی جا رہی تھی ایک چیونٹی میں اسی میں الجھا رہ گیا۔ دنیا جہان کی چیونٹیوں کو مُردوں سے دلچسپی لیتے دیکھا ہے مگر لاہور کی چیونٹیاں زندوں کو ستا رہی ہیں اور وہ کثرت ہے اس نسل کی کہ الامان والحفیظ۔

زبیدہ : جمیل بھائی آج صبح جو فقیر آیا تھا تو میں نے بھائی جان سے خود کہا کہ اس سے جا کر کہئے کہ پولیس کے حوالے کرتا ہوں ابھی۔

بیوی :۔ اجی تو یہ سمجھتے اس روز کہہ رہے تھے کہ فقیر جو اگر ایک آدھ دعا دے جاتے تھے اب ان کے لیے بھی تدبیریں کرنے لگے۔ یہ بھی حوالے کریں گے پولیس کے۔

قاضی جی:۔ ان صاحب تو مجھ سے تو یہ ناممکن ہے کہ میں فقیر کی بددعائیں سمیٹتا پھروں۔ ان لوگوں کی دعائیں بعض اوقات ایسی لگتی ہیں کہ پھر ان کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔ ایک چچا تھے صاحب ہمارے وہ ایک مرتبہ کسی فقیر سے الجھ گئے تھے۔ سنا ہے کہ کہتا تھا وہ فقیر تو آج [illegible] کہ جو بچہ ہوا تو اس نے کہہ دیا کہ جا بابا یہ گنجا کر دے۔ یقین مانئے جمیل میاں کہ آج کل بارہ ان چچا کے پوتے پڑپوتے ہیں اور سب اللہ کے فضل سے گنجے یعنی اس خاندان میں جو بچہ پیدا ہوتا ہے گنجا ہوتا ہے۔

جمیل :۔ کیا باتیں ہیں قاضی جی آپ کی بھی۔ یہ سب وہم ہے۔ جو ایسے پہنچے ہوئے فقیر ہوتے ہیں وہ یوں مانگتے نہیں پھرتے۔

قاضی جی: اسے جناب تراب یہ شناخت کون کر سکتا ہے کہ ان میں سے کون سے شاہ جی پہنچے ہوتے ہیں اور کون سے بیرنگ واقع ہوئے ہیں۔ وہی مثل کہ خاکساران جہاں را بہ سوارے باشد۔

جمیل :۔ (ہنس کر) خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر   تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

قاضی جی :۔ جی ہاں یہی شعر پڑھنا چاہتا تھا۔ کیا مطلب ہوا جمیل میاں اس کا۔ غضب کا ہے تو موقع کا شعر۔ دادا جان اسی قسم کے موقعوں پر یہ شعر عموماً پڑھا کرتے تھے۔ ہاں تو کیا مطلب ہوا گویا اس کا۔

جمیل :۔ یعنی یہ جو خاکسار بنے ہوئے نظر آتے ہیں ان کو حقارت سے نہ دیکھو تم کو کیا معلوم کہ اسی گرد کے پردے میں کوئی شہسوار چھپا ہوا ہو۔

قاضی جی :۔ بس اتنا ہی سا مطلب تھا۔ میں تو سمجھتا تھا نہ جانے کتنی بڑی بات کہہ دی ہوگی۔ تو بہرحال مطلب صرف یہ ہے کہ میں ان فقیروں سے ہمیشہ ڈرتا رہتا ہوں کہ خدا جانے ان میں سے کون سوارے باشد ہو۔

بیوی :۔ لیجئے فقیروں کا ذکر کرتے کرتے غنڈوں کے لیے یہ شعر بنا دیا اور میں نے کہا کیا تم فارسی پڑھے ہوئے نہیں ہو؟

قاضی جی :۔ سبحان اللہ فارسی نہیں تو اور آخر کیا پڑھا ہوا ہوں۔ شعر کا مطلب پوچھنے سے آپ یہ سمجھیں کہ گویا میں فارسی داں ہی نہیں ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب محاورہ نہیں رہا ہے ورنہ آمد نامہ ازبر تھا گلستان تو دوسری شادی کے بعد تک پڑھتا رہا ہوں۔ یہ آپ نے کیا کہی کہ فارسی پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ مگر صاحب فارسی میں چھٹن خاں کو اچھی مہارت ہے۔

بیوی :۔ آگ لگے اس کی صورت کو۔ اب ملی باتوں میں بھی اس جھاڑو پھرے کا ذکر آنے لگا۔

قاضی جی :۔ ہائیں ہائیں یعنی اس کی لڑکی سن لے گی تو کیا کہے گی؟

بیوی :۔ کیا کہے۔ میں تو اس کو اسی طرح کہوں گی۔ واہ اور سنو اب وہ فارسی بھی جاننے لگے۔ جو اڑائیں گے ایسی ہی اڑائیں گے۔

قاضی جی :۔ اڑائیں گے؟ کیا مطلب اڑائیں گے سے۔ گویا میں جھوٹا ہوں، دروغ باف ہوں، کذاب ہوں، زبان باف ہوں۔ مگر نہیں، زبان باف تو دوسری چیز ہوا۔ مطلب یہ کہ میں جھوٹا ہوں۔ چلو میں جھوٹا ہی سہی۔ تم ہی سچی سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے۔ یہ عزت ہے ہماری اس گھر میں کہ ہماری بلی اور ہم ہی سے میاؤں۔ ہماری بیوی اور ہم ہی کو جھوٹا کہیں۔ واہ رے ہمارے مقدر۔

نقوش کے نقاش

کہتے ہیں کہ اس زمانے کا جب سب [illegible] مرجھا گئے اور ملک [illegible] نئے بہت ہے۔ معاشی کے [illegible] [illegible] آئے گی اور ان کو بھی مزا چکھنا پڑے گا۔ غیرت زوجہ کبھی ہو گا دیکھ جائے گا [illegible] پیش آیا ہے [illegible] رسالہ نقوش کے اڈیٹر اور اپنے وقت کے ملکوں میں جانے پہچانے ناشر محمد طفیل صاحب کی ایک کتاب چھپ کر بازار میں آئی ہے اور دوسرے مصنفوں کو چھاپنے والے حضرت خود بھی چھپ کر رہ گئے ہیں۔ کسی شاعر نے اسی قسم کے موقع کے لیے غالباً یہ مصرعہ کہا ہے۔

پھانس کر دو چار جب پھنس گیا صیاد بھی

طفیل صاحب کی اس تصنیف کا نام ہے "صاحب" اور اس میں ان کے وہ سات مضامین ہیں جو سات صاحبان کی شخصیت پر لکھے گئے ہیں اور ان ساتوں میں جو ایک شخصیت دوسروں کی نقاب کشائی کی کوشش میں خود بے نقاب ہوئی ہے وہ خود طفیل صاحب کی شخصیت ہے۔ ان سات مضامین میں سے چھ نقوش کے پچھلے شماروں میں نکل چکے ہیں صرف ایک ایسا مضمون ہے جو اسی مجموعے میں چھپا ہے۔ یہ ساتوں مضامین طفیل صاحب کے ذاتی مطالعے اور مشاہدے کے آئینہ دار ہیں جو وہ ان ساتوں سے ملنے والوں کے متعلق کر سکے ہیں اور نہایت سادگی اور صفائی کے ساتھ اپنے ان ساتوں کو معزز ناظرین کے سامنے طفیل صاحب کا آئینہ پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ خود بھی اپنے کو طفیل صاحب کی نظر سے دیکھ لیں۔ اس ہفت پیکر کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:

۱۔ سعادت حسن منٹو۔ ۲۔ احمد ندیم قاسمی۔ ۳۔ شوکت تھانوی۔ ۴۔ جگر مراد آبادی۔ ۵۔ فراق گورکھپوری۔ ۶۔ عابد علی عابد۔ اور ۷۔ احسان دانش۔

باقی چھ حضرات کے متعلق تو میں وثوق سے کچھ عرض نہ کر سکوں گا مگر جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے جو خود میرے متعلق لکھا گیا ہے۔ مجھ کو ایمانداری کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں نے اپنی اتنی جامع تصویر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ تصویر وہ نہیں ہے جو ہونے والی سسرال بھیجنے کے لیے لوگ خاص طور پر کھنچوانے کے بعد بنواتے ہیں کہ گال اگر پچکے ہوئے ہیں تو ذرا بھر دیئے جائیں آنکھیں اگر چندھی ہیں تو ذرا روشن کر دی جائیں رنگ اگر کالا ہے تو ذرا گورا کر دیا جائے۔ بلکہ یہ تصویر اصل

خدوخال کے ساتھ حرفوں کی ترتیب پیش کر دی گئی ہے ۔

خود اپنے متعلق اس قسم کا منہ پھٹ پن اس مضمون سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک آدھ مقام پر البتہ شبہ بھی ہوا تو مجھ کو مجھ سے زیادہ سمجھنے والوں نے یہ کہہ کر اس شبہ کو دور کر دیا کہ آپ مانیں یا نہ مانیں بات سچی لکھی ہے۔ ایک مقام پر مجھے شدید اختلاف تھا جہاں طفیل صاحب نے لکھا ہے :

" میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام ان کے ترنم سمیت سن چکا
ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں
بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوٹ ہوئے "

میں یہ کہہ رہا تھا کہ صرف دو مشاعروں میں ہوٹ ہوا ہوں ایک میں اس لیے کہ سخن فہم متعصب تھے اور ہوٹنگ کرنے والے فیاض، اور دوسرے میں اس لیے کہ تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس دونوں شباب پر تھے۔ مگر یہ تو ایک ہی بات ہوئی بہرحال میں صرف دو مرتبہ ہوٹ ہوا ہوں مگر بیگم صاحبہ نے طفیل صاحب کی گواہی دی کہ خود آپ کو اندازہ نہیں ہے میں بڑے شوق سے مشاعروں میں جایا کرتی تھی مگر محض آپ کی غزل سرائی نے مجھ سے مشاعرے ترک کرائے ہیں۔ کاش آپ اپنی آواز خویش پروری سے باہر ہو کر بھی سن سکتے۔ پھر مجھ کو اس مضمون کے اس مقام پر غصہ آتے آتے رہا جہاں طفیل صاحب نے مجھے خبطی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

" ان کی طبیعت کی ایک اچھائی یہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے ناراض ہو جاتے ہیں
نہ ناراض ہونے کا پلاٹ بناتے ہیں نہ کوئی اسکیم۔ نہ ہی دوسرے کو یہ موقع
دیتے ہیں کہ وہ بیچارہ مدافعت میں کچھ کہہ سکے ——"

میں نے جھنجھلا کر کہا "یہ غلط ہے۔ ستم کرتے ہیں۔ تہمت لگاتے ہیں۔ اتہام ہے سراسر"

وہ بولیں "حرف بہ حرف صحیح ہے۔"

میں نے کہا "صحیح کیسے ہے یہ تو پاگل پن ہوا کہ بے وجہ کوئی ناراض ہو جائے میں بغیر کسی وجہ کے کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوا۔"

وہ بولیں "کبھی شاید نہ ہوئے ہوں مگر اکثر ہو جاتے ہیں"

میں نے واقعی مشتعل ہو کر کہا "مثلاً۔ مثلاً کب ناراض ہوا ہوں میں"

وہ بولیں "مثلاً اسی وقت ہو رہے ہیں"

اور مجھ کو واقعی اندازہ ہوا کہ میں خود اس دعوے کی دلیل پیش کر رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے یہ صفحہ اُلٹ دیا اور ایک مقام پہ بے ساختہ داد دی۔

" ذرا بادل گرجے۔ بجلی چمکے پھر دیکھئے آپ کا مزا۔ نادری حکم کے ماتحت تمام
دروازے اور کھڑکیاں بند کرا دیں گے۔ اس کے بعد خود اٹھیں گے چٹخنیاں

دیکھیں [illegible] [illegible] کتنی [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible]
کہ اس [illegible] علم [illegible] [illegible] ابھی [illegible] [illegible] خیالات [illegible] :

میں اس [illegible] خیالات کو [illegible] [illegible] [illegible] شوکت صاحب نے [illegible] [illegible] :

"بات لکھنے والی نہیں ہے لیکن آپ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
کو [illegible] جاتے ہیں ۔ [illegible] یوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں :
[illegible] : دیکھیں یہ آپ [illegible] ہیں ۔ [illegible] [illegible] [illegible]

میں نے یہ سطریں خود [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] یہ اقتباس دیکھئے کہ [illegible] ہے :

"مجھے [illegible] [illegible] نہیں [illegible] لغزشوں پر [illegible] [illegible] وہ [illegible]
اعلانیہ لکھنے میں [illegible] آپ جیسا ایک [illegible] [illegible] آپ [illegible] اور مجھ میں فرق
اتنا ہے کہ آپ مجھ سے [illegible] کی [illegible] [illegible] کچھ [illegible] جو آپ [illegible] [illegible]
کھلی ہوئی کتاب ہوں جہاں سے چاہو پڑھ لو ۔"

اور پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ [illegible] [illegible] لغزشوں کو جب میں خود [illegible] بیان کرکے دنیا کے سامنے پیش کر چکا ہوں تو اب ان کو کسی کا ڈر ہے ۔ لہٰذا چاہیے کہ [illegible] کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں ۔ شوکت صاحب جو کچھ جانتے تھے اس سے سب ہی کو آگاہ کر چکے ہیں اس خوفناک اعتراف کے بعد بے شک [illegible] زیادتی [illegible] [illegible] لکھنے لگیں گے ۔ بس یہ نہ ہی دیکھئے ایک مقدمے میں سرکاری گواہ بن جانے کے معنی یہ ہیں [illegible] [illegible] چوری بھی گیا اور ہیرا پھیری سے بھی ۔ یہ چالاکی بھی تو ہو سکتی ہے کہ اس طرح اپنا جرم تسلیم کرکے پھر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے کہ جو چاہیں کریں ۔"

میں نے کہا کہ خیر آپ کا اور میرا رشتہ تو ہے ہی ایسا کہ اس میں اگر بدگمانی نہ ہو تو محبت ہی مشکوک ہو کر رہ جائے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل صاحب کس رشتے سے اس قدر بدگمان ہوتے ہیں ۔"

خیر چھوڑیئے اس ذکر کو میں تو اپنے ہی مضمون میں الجھ کر رہ گیا اس کتاب میں اور مضامین بھی تو ہیں اور جس طرح اور مضامین کو پڑھ کر میرا یہ حال ہوا ہے کہ ۔ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی طرح میرے متعلق جو مضمون ہے اس کو پڑھ کر دوسروں نے بھی یہی کہا ہوگا ۔ اور یہی طفیل صاحب کی سیرت نگاری کا کمال ہے ۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون جو منٹو کے متعلق ہے اس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں منٹو اپنی زندگی کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ چلتا پھرتا سامنے آجاتا ہے اور اس کو مردہ سمجھ کر کسنے کو جی نہیں چاہتا ۔ وہی منٹو کی ہلکی ہلکی حرکتیں وہی اس کی سرشاریاں اور وہی اس کے لغزیدہ قدم ۔ وہی اس کا انداز بیان کہ مضمون پڑھتے جائیے اور منٹو کو سامنے بٹھا کر باتیں کرتے جائیے مگر دوسرے

حصے میں منٹو کی معرفت جو خط طفیل صاحب نے لکھا ہے وہ منٹو کے اسلوبِ تحریر کا ایسا جامع چربہ ہے کہ منٹو کی موت بھی ذی روح نظر آتی ہے۔ اگر یہ خط منٹو کے نام سے نہ بھی ہوتا تو بجائے خود ایک اہم ادبی دستاویز کی حیثیت اس کو حاصل ہوتی۔ طفیل صاحب نے اگر اپنی اس صلاحیت کو اب تک چھپایا ہے تو خیانت سے کام لیا ہے اور اب اگر اس میں بخل برتا تو مزید خیانت ہوگی۔

دوسرا مضمون جو احمد ندیم قاسمی کے متعلق ہے ندیم صاحب کو رفتہ رفتہ میرے قریب لا رہا تھا کہ یہ حصہ آگیا:-

"اگر یہ چارپائی پر بیٹھے ہوں تکیے سے ٹیک بھی لگا رکھی ہو اور یہ ایک دم اکڑوں بیٹھ جائیں تو سمجھ لیجیے کہ یہ افسانہ لکھنے والے ہیں۔ اس وقت یہ سگریٹ پہ سگریٹ پئیں گے۔ خوبصورت سا کاغذ لیں گے۔ پنسل کو باریک بنائیں گے۔ مدھم مدھم خط میں افسانہ شروع کر دیں گے۔ آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے۔"

میں نے کہا "حیرت ہے ندیم صاحب کی یہ ادائیں مجھ سے کس قدر ملتی جلتی ہیں۔"

بیگم نے کہا "مگر آپ اکڑوں نہیں بیٹھتے۔"

میں نے کہا "خوبصورت سا کاغذ تو لیتا ہوں۔"

وہ بولیں "جی ہاں مگر آپ چارپائی پر کب بیٹھتے ہیں۔"

میں نے کہا "چلو نہ سہی مگر پنسل تو باریک بناتا ہوں۔"

وہ بولیں "عموماً قلم کا باریک نب تلاش کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "مطلب یہ ہے کہ مدھم مدھم خط میں تو مضمون شروع کرتا ہوں۔"

وہ اگلی سطریں پڑھوانا چاہتی تھیں "آگے تو پڑھیے۔"

میں نے پڑھنا شروع کیا:-

"——آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے البتہ شعر کہنے کے لیے تنہائی چاہتے ہیں اس لیے کہ انھیں ہلکا ہلکا گنگنانا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ اپنے ترنم کا مرتبہ جانتے ہیں اس لیے اس خداداد دھن کا حال سب پر آشکار کرنا نہیں چاہتے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "دیکھیے اس کو کہتے ہیں غیرت داری۔"

میں نے جل کر کہا "پھر آپ کا روئے سخن میرے ترنم کی طرف ہے۔ یہ تعصب کی عجیب گھریلو قسم آپ نے نکالی ہے۔"

احمد ندیم صاحب قاسمی والے مضمون میں طفیل صاحب اپنے اس احترام کو باوجود کوشش کے چھپا نہیں سکے جو ندیم صاحب کے لیے ان کے دل میں موجود ہے۔ جب خود طفیل صاحب نے ندیم صاحب پر مضمون لکھنے کے لیے ہاجرہ بہن سے درخواست کی تھی تو ان بیچاری نے بڑی سچی بات کہی تھی کہ:-

"اگر میں سچ سچ لکھ دوں تو یہ مضمون کتنے صفحوں پر پھیلے گا اور پھر سب سے بڑی بات

یہ سچ ہے کہ اتنی سچائی کا، سبھی کیا درجہ ہوگا ... تو مجھے ... دل پایا ... بات کو
ٹال دیں گے۔"

کہ جگر صاحب بھی جانی کی پیار والی بات سے کام لیا ہے۔ اور صرف طفیل صاحب ہی نہیں اگر میں خود بھی جگر صاحب کے متعلق لکھتا تو وہ بھی پیار والی بات ہی ہوتی اس لیے کہ اس شخص میں سوائے پیار کے اور ہے ہی کیا۔

جگر صاحب کے متعلق طفیل صاحب کا جو مضمون ہے وہ ایک حد تک مجھے منقول بھی ہے اس لیے کہ طفیل صاحب جگر صاحب کے مرحوم کی ابتدا ایسے ہی کر پر ہوتی تھی۔ مگر جیسے جیسے مضمون آگے چل کر صرف جگر صاحب کے متعلق ہوتا ہے وہ بہت ہوتی ہے کہ طفیل صاحب نے بھی ان دنوں میں جگر صاحب کو اتنا ہی سمجھا ہے جتنا میں ساری زندگی کے بعد یہ کہہ سکتا ہوں۔ اس مضمون میں جہاں کہیں طفیل صاحب نے جگر صاحب کے انداز گفتگو کا چربہ اتارا ہے وہاں وہ بے کو بھی چاہتا ہے۔ اس معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب کے یہ الفاظ ان کے ذہن میں محفوظ تھے جبکہ دستاویزی صورت میں موجود ہیں مثلاً لکھتے ہیں جگر صاحب کی باتیں عموماً اس قسم کی ہوتی تھیں:-

> "اگر میں آپ کے کہنے کے مطابق یہ مان لوں اور مجھے اس کا بھی یقین کامل ہو جائے
> کہ فلاں صاحب شعر اچھے لکھتے ہیں۔ پھر بھی میں کہوں گا کہ ان میں وہی ایک چیز نہیں ہے
> اور وہ چیز پیدا تو ہوتی نہیں وہ تو انسان کامل اور مرد خود آگاہ میں خود ہی ہوتی ہے
> میری مراد خلوص باصفا ہے۔ وہ شعر بڑے بد اعمال ہوتے ہیں جو ایسے ذہنی نابالغوں
> پیداوار ہو جاتے ہیں۔"

میں جانتا ہوں کہ یہ جگر صاحب کا انداز بیان ہے۔ یہی الفاظ یہی ترکیبیں یہی بندشیں۔ اس مضمون کا کونسا حصہ ایسا ہے جہاں جگر صاحب کی اپنی اصلی شخصیت کے متحرک نقوش نہ آتے ہوں۔

فراق والا مضمون شخصیاتی بھی ہے اور دستاویزی بھی۔ اس مضمون میں فراق کے چند نہایت اہم خطوط ہیں کہ طفیل صاحب نے ہر ایک سے فراق کو نہایت سلیقے کے ساتھ ملا دیا ہے بلکہ یوں فراق سے ملنے والا شاید فراق کو نہ پا سکتا البتہ ان خطوط کے آئینے میں اور پھر طفیل صاحب کی حاشیہ آرائیوں نے فراق کو اس مضمون کے پڑھنے والوں کے بالکل قریب کر دیا ہے۔ اسی مضمون میں ایک جگہ طفیل صاحب لکھتے ہیں:

> "الہ آباد تین چیزوں کی وجہ سے مشہور ہے ان میں سے ایک جواہر لال نہرو، دوسرے
> فراق، تیسرے امرود"

یہ بات اکبر الہ آبادی بہت پہلے بڑے مزے میں کہہ گئے ہیں ؎

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

مگر یہ اس وقت کا ذکر ہے جب پنڈت نہرو اور فراق نہ تھے صرف اکبر اور امرود تھے اور طفیل صاحب نے آج کل کا ذکر کیا ہے

جب اکبر نہیں ہیں پنڈت نہرو۔ فراق اور امرود ہیں۔

سید عابد علی عابدؔ کے متعلق مضمون لکھتے لکھتے طفیل صاحب کے ان فقروں نے چونکا دیا:-

> "مجھے ان سے یہ شکایت رہی ہے کہ اتنی ٹھوس علمی شخصیت ہونے کے باوجود انھوں نے کوئی قابلِ ذکر ادبی کام نہیں کیا۔ یہ "فضیلت" صرف انہی میں نہیں ہے بلکہ یہاں کی کئی اور بڑی بڑی شخصیتوں میں تھی اور ہے۔ اگر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر (بعض زندہ کرم فرماؤں کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کا نام لوں تو میرے کرم فرما مجھے معاف فرمائیں۔"

طفیل صاحب زندہ کرم فرماؤں سے ڈر جائیں مگر میں ان کا نام لیتا ہوں۔ ابھی چند ہی دن ہوئے کہ صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسمؔ کے گھر سید ذوالفقار علی بخاری نے یہی بحث چھیڑی تھی۔ سید احمد شاہ بخاری پطرسؔ کا علم و تبحر دیکھئے اور ایک کتابچہ دیکھئے "پطرس کے مضامین"۔ اس قابلیت، اس ذہانت اور اس تبحر کے اہلِ قلم سے امید تھی کہ نہ جانے ادبِ اُردو کو کیا کچھ دے دے گا۔ ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرتؔ اپنی صلاحیتیں لیے اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ صوفی تبسمؔ ہیں خدا کرے وہ اب بھی کوئی ادبی کارنامہ پیش کر دیں۔ سید عابد علی عابدؔ کی صحت اگر اجازت دے تو ان میں عزم بھی ہے ہمت بھی اور ان کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ خود اب تک کی غفلتوں کی تلافی کے لیے بے قرار ہیں۔ اس موقع پر ان کی صحت کے لیے دل سے دُعا نکلتی ہے۔ عابد کے پاس بہت کچھ ہے اور ان کی نیت بھی بخل کی نہیں۔ دیر میں سہی مگر ان کی توجہ اس طرف ضرور ہوئی ہے اور امید ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر دکھائیں گے

آخری مضمون احسان دانش پر ہے اور بہت ہی کامیاب مصوّری ہے۔ احسانؔ اپنی تمام بےساختگی اور تمام سادہ پُرکاری اور تمام پُرکارِ سادگی کے ساتھ اس مضمون میں سمٹ آئے ہیں۔ ان کا بینک کی عمارت پر قبضہ کرنا، ان کا کبوتروں سے شغف، ان کی موت کے متعلق وہ اسکیم جو تقسیمِ ملک کی وجہ سے ناکام ہو گئی، ان کا مشاعروں سے شیخوپورے کی طرف فرار، ان کے تابوتِ مرحوم سے مراسم کی داستانیں اس حسن سے بیان ہوئی ہیں کہ طفیل صاحب پر محمد حسین آزاد کی افسانہ طرازی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ یہ مضمون بقولِ طفیل صاحب کے نامکمل بھی ہے اور ناکام بھی مگر احسان صاحب کا ذکر تمام کر ہی گیا ہے۔

رہ گئی اس کتاب کی زبان، اندازِ بیان اور باقی ادبی نزاکتیں، ان کے متعلق خود مصنف کا دیباچہ پڑھ لینا کافی ہوگا جو "اعترافِ جرم" کے نام سے کتاب کے شروع میں دیا گیا ہے۔

خواہ مخواہ

وہ بھی صاحب کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ اِن کی گلی کوچوں سے واقف نہ تھے۔ کہ پولیس سے پوچھا اور رکشا کرایہ ٹیکسی کو دوا کرایا پڑا۔ اب میں جا کر جبار ممتاز صاحب ٹھیکیدار کا وہ مکان ملا جس کا ایک حصہ انھوں نے کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ بعد آٹھ بجے تو ملے تھے۔ انھوں نے یہ بات کہی۔

"سید صاحب پتہ تھا اگر ذرا عقل سے کام لیتے تو یہ پریشانی ہرگز نہ ہوتی۔"

میں نے جل کر کہا "کیا جناب کا خیال یہ ہے کہ میں نجومی ہوں یا ڈاکیہ ہوں؟ یا یہ کہ اس پتہ پر کس طرح پہنچ جاؤں جو خط پر درج ہو سکتا ہے۔ یہ تو ڈاکیوں کا خاص آرٹ ہے کہ وہ ۱-۲-۱۱ کا مطلب سمجھ لیتے ہیں کہ بلاک نمبر، سب بلاک نمبر، گلی نمبر اور مکان نمبر۔"

انھوں نے غالباً رفع شر کے لیے کہا۔ "اچھا خیر۔ اب سامان رکھو۔ غسل وغیرہ کر کے آدمی بنو تاکہ تم کو چائے پلا کر صحیح الدماغ بننے کے بعد بات کی جائے۔"

میں خود بھی فوراً نہانا چاہتا تھا اس لیے کہ لاہور سے کراچی آنے والے کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جنازے میں شرکت کرنے گیا تھا جہاں گورکنوں نے بجائے مُردے کے خود اسی کو دفن کر دیا تھا غلطی سے اور وہ اپنی اس تدفین کے بعد بمشکل تمام قبر سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہوا ہے۔ گرد میں اٹا ہوا تھا چنانچہ آئینہ کے سامنے پہنچ کر خود اپنے ہی عکس پر جبار ممتاز صاحب ٹھیکیدار کا شبہ ہوا، جو ٹھیکیداری کی مناسبت سے اس حلیہ میں نظر آ سکتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ میں خود اپنے ہی عکس کو سلام کرتا گرد آلود عینک کو جھاڑا تو اپنے عکس کی اسی حرکت سے فوراً سمجھ میں آ گیا کہ یہ کوئی اور نہیں "خاکسار" ہی ہے۔ ورنہ اگر کوئی پوچھے تو آج ہی "خاکسار" کے معنی بھی سمجھ میں آئے کہ بغیر لاہور سے کراچی آئے ہوئے کوئی شخص صحیح معنوں میں "خاکسار" بن ہی نہیں سکتا۔ میں نے جلدی جلدی شیو کیا۔ کپڑے نکالے اور غسلخانے میں نل کے نیچے جا بیٹھا تھا ابھی سر اور چہرے پر صابن لگایا ہی تھا کہ نل غائب اور میں پریشان کہ اب کیا کروں۔ صابن تمام سر پر لگا ہوا ہے۔ آنکھیں بھی بند ہیں یہ تو کچھ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" والا قصہ ہوا ہے۔ ایک آدھ منٹ تو تقریباً خاموش رہا۔ اس کے بعد غسلخانے ہی سے اسلم کو آواز دی کہ دوڑو مدد کو۔ اسلم نے اس کے جواب میں چیخنا شروع کیا۔

"صاحب یہ میں نہیں ہوں ایک اور صاحب ہیں خدا کے لیے نل کھول دیجئے۔"

اور عجیب بات ہے کہ اس کے بعد ہی نل چلنے لگا۔ چنانچہ میں نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر جب پھر آئینہ کے سامنے آیا تو اب

آئینہ میں عبدالغفور صاحب ٹھیک طور نظر نہیں آئے بلکہ یہ دیکھ کر اطمینان ہوگیا کہ جب کچھ بھی بُرا بھلا ہوں یہ میں خود ہی ہوں۔ ابھی کنگھا ہی پھیر رہا تھا کہ اسلم نے چیخنا شروع کر دیا :۔

"صاحب سولہ سنگھار بعد میں کر لیجئے گا مگر چائے ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے۔"

چنانچہ میں اُس برآمدے میں آگیا جہاں ایک چھوٹی سی میز پر اسلم چائے کے برتن رکھے خود مکھیوں کے شکار میں مصروف تھے۔

میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہی پہلا سوال کیا :۔

"بھئی یہ نل کا بند ہونا پھر تمہارے ایک مجذوبانہ نعرے کے بعد یکایک چل دینا سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ قصہ کیا تھا آخر؟"

اسلم نے کہا ۔۔ "ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"

میں نے کہا "سبحان اللہ لیکن اگر اس شعر کا سلیس اُردو میں آپ ترجمہ بھی کر دیتے تو اچھا ہوتا۔ میں اتنا سخن فہم تو کبھی نہ تھا کہ اپنے تفصیل طلب سوالات کا جواب اشعار میں سُن کر مطمئن ہو جاتا۔ پھر اس وقت تو ابھی دماغ سے ریل کی گھڑگھڑاہٹ ہی نہیں نکلی ہے۔"

اسلم نے کیتلی میں چینی کا ایک چمچہ ڈال کر چلاتے ہوئے کہا "مطلب یہ کہ یہ تو ابتدا تھی ایسی ایسی بہت سی باتیں ہوں گی۔ کرایہ کے مکان میں رہنا آپ معمولی بات سمجھتے ہیں۔ کرایہ کے علاوہ اور بھی بہت سے ٹیکس دینا پڑتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو جی چاہتا ہے کہ سامان بھی اسی گھر میں چھوڑ دوں اور جا کر سمندر میں چھلانگ لگا دوں۔"

میں نے کہا "وہ تو خیر ٹھیک ہے کہ جب سمندر ہی میں چھلانگ لگانا ٹھہری تو سامان کی کیا ضرورت ہے۔ مگر کچھ بتاؤ تو سہی بات کیا ہے آخر۔"

اسلم نے چائے کی پیالی کھسکاتے ہوئے کہا "بات نہیں ہے چیتا ہے یہ۔ اجمال میں سنائے دیتا ہوں۔ تفصیل خود دیکھئے رہنا اب تو رہنا ہی ہے اس گھر میں۔"

میں نے کہا "اچھا فی الحال تم اجمال ہی سنا دو۔"

اسلم نے ایک گہری سانس لے کر کہا "کراچی میں مکان حاصل کرنا اتنا مشکل کام ہے کہ اگر یہ مرحلہ ان سائنسدانوں کو پیش آ جائے جو چاند اور مریخ وغیرہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں تو ان کے سارے اسپوتنک اور طفیلی سیارے دھرے رہ جائیں۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ میں نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہیں یہ مکان حاصل کرنے کے لیے۔"

میں نے کہا "شکر ہے کہ مل ہی گیا۔ اور ہے بھی اچھا خاصا بظاہر۔"

اسلم نے کہا "جی ہاں۔ مگر بباطن جیسا کچھ بھی ہے۔ بس دعا مانگنا چاہیئے کہ خدا دشمن کو بھی ایسا مکان نہ دے۔ معلوم نہیں میرے کن گناہوں کی پاداش میں یہ مکان مجھ کو مل گیا ہے اور اللہ جانے تمہاری تقدیر کی وہ کونسی گردش تھی جو تم کو بھی یہاں رہنے کے لیے لے آئی ہے۔ خدا کے لیے پرویز کوئی اور مکان ڈھونڈھو ورنہ اس مکان میں کل ہی سے تم بھی خودکشی کے امکانات پر غور کرنا شروع کر دوگے۔ جس طرح میں اس حرام زندگی اور اس حرام موت کا موازنہ کرتا رہتا ہوں۔"

وہ واقعی رو دینے کے قریب تھا لہٰذا میں نے اس کو چمکارتے ہوئے کہا "ہمت اور حوصلے سے کام لو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ۔۔۔"

میں نے شرارت سے کہا: "کیوں نہ تم کو نصیحت سنا دوں، بھائی صاحب! [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] پوچھے:

میں نے [illegible] کر کہا: [illegible] آؤ۔"

اسلم نے جز بز ہو کر کہا: "تم [illegible] کی جاتی ہے

میری پوری بات تو سن لو۔"

میں نے پوری بات سننے کا وعدہ [illegible]

اسلم نے کہا: "تو صاحب [illegible] ایک لڑکی ہے [illegible] کا افسانہ ہے۔ [illegible] اور [illegible] زندگی کا سہارا [illegible] کوئی ہوئی ایک [illegible] روانہ کر دیتا ہے [illegible] شروع ہو جاتی ہے [illegible] جو کسی کے لیے نہیں ہے [illegible] مگر کوئی کام تو ہوئی نہیں سکتا [illegible] لکھنے کی کوشش کی جانے تو [illegible] دیکھیے میں ایک اور اس کا نمونہ دکھائے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے کے اندر گیا اور اپنے ہاتھ میں ایک کاپی لیے ہوئے واپس آ گیا۔

"یہ ایک افسانہ تھا۔ [illegible] اس کے [illegible] یہ فقرہ نظر آیا۔ ملاحظہ ہو:"

میں نے پڑھنا شروع کیا: "تقسیم ملک کے بعد سوکھی ہوئی پتیوں کے مانند [illegible] تھے۔ ان کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ ان کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ان کی منزل کہاں ہے۔ وہ [illegible] تھے۔ [illegible] جن کا کوئی جادہ ہو نہ کوئی منزل اور وہ سفر کرتے رہیں ٹکٹ نہ خریدیں تو جیل اور ٹکٹ خریدیں تو کہاں کا خریدیں ——"

میں نے چونک کر کہا: "ایں یہ کیا۔ یہ ٹکٹ کیسا؟"

اسلم نے کہا: "[illegible] رہا ہوں آپ کو۔ مسافر تھے جن کا کوئی جادہ ہو نہ کوئی منزل اور وہ سفر کرتے رہیں۔ بس یہاں تک میں لکھ کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ خرافات لکھی ہوئی دیکھیں۔ دیکھیے نا خط بدلا ہوا ہے۔"

میں نے کہا: "زنانہ خط ہے۔"

اسلم نے بیزاری سے کہا: "جی ہاں زنانہ خط ہے اور جس محترمہ کا یہ خط ہے وہی میرے لیے وبالِ جان بنی ہوئی ہیں۔"

میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا: "مگر وہ ہیں کون؟ جملہ مہمل سہی مگر خط تو بڑا پاکیزہ ہے۔"

اسلم نے منہ بنا کر کہا: "صاحب ناک میں دم کر رکھا ہے اس لڑکی نے۔ بخدا اگر میری بہن یا بیٹی ہو خدا نخواستہ اس قسم کی تو گولی مار کر پھانسی پر لٹک جاؤں۔"

میں نے پھر پوچھا: "مگر بتایا نہیں تم نے کہ یہ لڑکی ہے کون؟"

اسلم نے کہا: "صاحبزادی ہیں ٹھیکہ دار صاحب کی۔ اچھی خاصی جوان جہان لڑکی ہے۔ میٹرک پاس کر چکی ہے۔ باوا جان شادی کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں اور میں یہ غور کیا کرتا ہوں کہ جس کے پلّے بندھ گئی یہ بلا اس کے دونوں کانوں کے بیچ میں سر کر دے گی۔ صاحب چھلاوا ہے اچھی خاصی۔"

میں نے کہا "دیکھی ہے تم نے؟ عمر کیا ہوگی؟ صورت شکل کی کیسی ہے؟"

ایک ہی سانس میں اتنے سوال جو کئے تو اسلم نے گھبرا کر کہا: "نہ دیکھا ہے نہ خدا دکھائے۔ عمر ان کے باوا جان کے حساب سے سولہ سال ہے لہٰذا ہوگی اٹھارہ انیس سال کی۔"

میں نے کہا: "میٹرک فرسٹ ڈویژن میں کیا ہوگا اس نے۔"

اسلم نے مجھ کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا: "یہ جناب کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا: "اندازہ ہے میرا۔ خط نہایت اچھا ہے۔ ان عام فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہین بھی ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ لڑکی ہے۔ آجکل تو ڈویژن مارنا لڑکیوں ہی کا کام رہ گیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ تم نے دیکھا نہیں اب تک۔"

اسلم نے کہا: "جی ہاں اب تک تو خدا نے محفوظ ہی رکھا ہے مگر اب آپ کے تیوروں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ غالباً آپ یہ کوشش بھی کریں گے۔"

میں نے کہا: "نہیں خیر میں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے البتہ جو حالات تم نے سنائے ہیں وہ اتنے دردناک نہیں ہیں جتنے تم ستم رسیدہ بنے ہوئے ہو۔ بہرصورت میں حالات کا جائزہ لے کر کوئی رائے قائم کروں گا۔"

چنانچہ میں فی الحال اس کمرے میں سامان ترتیب سے لگانے لگا جو میرے لیے اسلم نے مخصوص کیا تھا۔

۲

میں ابھی سو کر اٹھا ہی تھا اور ایک آدھ انگڑائی لے کر "گذشتہ سے پیوستہ" کہہ کر پھر سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسلم نے کمرے میں داخل ہو کر کہا:۔

"چلو ان سے بھی مل لو وہ آ گئے ہیں ہمارے اور تمہارے دونوں کے گارجین۔"

میں نے حیرت سے پوچھا: "گارجین؟ گارجین کون؟"

اسلم نے پڑوس کی طرف اشارہ کر کے کہا: "وہ ــــ مالک مکان۔ عبدالغفور صاحب ٹھیکہ دار۔ اچھے خاصے دردِ سر ہیں یہ حضرت بھی۔"

اور دیوار کے اُس پار سے ایک کھنکتی ہوئی زنانہ آواز آئی: "امی جان۔ دردِ سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید ــ کیا یہ سچ ہے؟"

اور میں نے [illegible] کہا: [illegible]

میں نے [illegible] بتایا [illegible]

اسلم نے [illegible] کہا: [illegible] کر [illegible] رہے ہیں:

یہ بزرگوار اُٹھ بیٹھا [illegible] اخبار [illegible] کا مطالعہ [illegible] ہم لوگوں کی آہٹ پا کر ان بزرگ محترم نے عینک کا [illegible] کے لیے وقت [illegible] دیا۔ اسلم نے کہا:۔

"ٹھیکہ دار صاحب یہ ہیں میرے [illegible] دوست پروفیسر صاحب"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا: جی ہاں غائبانہ تعارف تو کافی سے زیادہ ہو چکا ہے۔ بہرحال بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ بیٹھے حقہ نوش فرمائیے مگر آپ کو ذرا زحمت [illegible] ہے"

میں نے عرض کیا: شکریہ۔ مگر میں محروم ہوں:

ٹھیکہ دار صاحب نے حقہ کی نے میری طرف کرتے ہوئے کہا: غالباً سگریٹ پیتے ہوں گے آپ:

میں نے کہا: جی نہیں سگریٹ بھی نہیں پیتا:

عجیب بات پوچھی ٹھیکہ دار صاحب نے: تو پھر کیا پیتے ہیں آپ:

مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے جیسا سوال تھا ویسا ہی جواب بھی دے دیا کہ: پانی پیتا ہوں۔ چائے پیتا ہوں۔ کافی پیتا ہوں شربت وغیرہ پی لیتا ہوں:

اور ٹھیکہ دار صاحب نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر آواز لگائی: منی سے کہنا بھئی ذرا چائے بنوا دینا:

اسلم نے لاکھ کہا کہ چائے یہاں بھی تیار ہے مگر وہ "کوئی مضائقہ نہیں کوئی مضائقہ نہیں" کہہ کہہ کر اپنے یہاں کی چائے پلانے پر مصر ہی رہے چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد اِدھر ہمارا ملازم چائے اور ناشتہ لے کر آیا اُدھر ایک نہایت خوبصورت سی کشتی میں نہایت دیدہ زیب ٹی کوزی سے ڈھکی ہوئی کیتلی اور نہایت سلیقہ سے رکھی ہوئی پیالیاں لیے ٹھیکہ دار صاحب کی ملازمہ داخل ہوئی اور وہ چائے بھی ہمارے ملازم نے اس سے لے کر میز پر لگا دی مگر ابھی وہ چائے لگا ہی رہا تھا کہ ٹھیکہ دار صاحب نے اپنے یہاں سے آئی ہوئی چائے [illegible]تنوں میں سے ایک طشتری اٹھا کر کہا:۔

"ارے! یہ کیا ہے؟ درد سر کی گولیاں۔ یہ کس نے منگائی تھیں۔ ارے بھئی درد سر میں کون مبتلا ہے۔ یعنی خواہ مخواہ بھی۔ یہ کس کے لیے لائی ہے تو کامنی؟"

کامنی نے اپنا دوپٹہ منہ پر رکھ کر ہنستے ہوئے کہا: بٹیا نے بھیجی ہیں:

ٹھیکہ دار صاحب نے عینک آنکھوں سے ہٹا کر ماتھے پر لگا کر گولی کو بغور دیکھا گویا ان گولیوں کو وہ آنکھوں سے نہیں بلکہ ماتھے

سے دیکھتے رہتے۔ یہ ڈبیاں تو بھیجی ہیں مگر کس کے لیے بھیجی ہیں۔ میرے تو پرسوں ہوا تھا سر میں درد۔ گولیاں آج بھیجی گئی ہیں۔ پوچھ تو سہی ذرا جا کر بھتیجی سے کہ یہ معمہ کیا ہے:

کامنی تو ہنستی ہوئی اندر چلی گئی مگر میں اور اسلم دونوں سمجھ چکے تھے کہ یہ اسی قصہ کا سلسلہ اب تک چل رہا ہے وہ جو اسلم نے ٹھیکہ دار صاحب کو دردِ سر کہہ دیا تھا چنانچہ اب گولیاں بھیجی گئی ہیں کہ اگر میرے باپ دردِ سر ہیں تو یہ دردِ سر کی گولیاں کھا کر ان سے سر کھپاؤ۔ یہ دونوں ٹھیکہ دار صاحب سے آنکھ بچا بچا کر ابھی مسکرا ہی رہے تھے کہ ٹھیکہ دار صاحب نے کشتی پر سے ٹی کوزی اتار کر اس کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:۔

"جو منظر اِس میں دکھایا گیا ہے اُسے سمجھے آپ؟"

میں نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا: "غالباً مالن دکھائی گئی ہے جو پھول چن رہی ہے باغ میں۔"

ٹھیکہ دار صاحب بڑے معلمانہ انداز سے کہا: "غلط ——— آپ بتائیے اسلم صاحب:"

اسلم نے کہا: "میں بھی بس اتنا ہی سمجھا ہوں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا: "تو آپ بھی غلط سمجھے ہیں۔ یہ دراصل چائے کا باغ ہے اور اس میں یہ لڑکی جو اپنی دھج سے مشرقی پاکستان کی لڑکی دکھائی گئی ہے، اوپر کی کلی اور دو کونپلیں پتی چٹکی سے توڑ رہی ہے۔ آپ کو کسی چائے کے باغ میں جانے کا کبھی اتفاق ہوا ہے؟"

ہم دونوں نے ایک ساتھ انکار کر دیا تو وہ بولے: "پچھلے سال اہل و عیال کو لے کر میں سلہٹ گیا تھا وہاں بہت سے چائے کے باغات دیکھنے کا اتفاق ہوا چنانچہ عزیزہ بھتیجی سلمہا نے وہاں سے واپسی کے بعد ہی یہ ٹی کوزی بنائی تھی اور اس پر یہ منظر دکھایا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے کہ سوئی سے بنائی ہوئی اس تصویر میں بھی کتنی زندگی ہے۔"

میں نے بھی داد دی: "واقعی میں تو اس کو مشین کا کام سمجھا تھا۔ بڑی صفائی ہے ہاتھ میں ماشاءاللہ اور یہ خوش سلیقگی ہے کہ ٹی کوزی کے لیے مناسب ترین منظر کا انتخاب کیا ہے۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے بڑی خاکساری کے ساتھ سر جھکا کر کہا: "جی ہاں اس کو ہمیشہ اسی قسم کی اُپج سوجھتی ہے۔ آپ کی دعا سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا ہے۔ تقریروں کے مقابلہ میں اول آئی تھی اس کا کپ بھی لائی ہے۔ اسکول میں مشاعرہ ہوا تو اللہ جانے شاعری اس نے کہاں سے سیکھ لی ہے کہ مشاعرے کے لیے غزل بھی کہہ کر مجھے دکھائی، میں نے کہا کہ بٹیا میرے تو باپ دادا نے بھی کبھی شعر نہیں کہے۔ ٹھیکہ دار ہوں جیسی کہو عمارت بنوا دوں۔ پُل بنوا دوں۔ مسجد اور تالاب بنوا دوں مگر یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ مگر جناب وہ اسی غزل کو پڑھ کر تمغہ بھی لے آئی۔"

اسی وقت ٹھیکہ دار صاحب کی ملازمہ کامنی ایک دوسری کشتی لے کر آ موجود ہوئی جس پر کروشیا کے کام کا نہایت نفیس خوان پوش ڈھکا ہوا تھا۔ ٹھیکہ دار صاحب نے کامنی سے پوچھا:۔

"یہ کیا ہے۔ اچھا گویا ناشتہ ہے۔ میں بھی غور کر رہا تھا کہ کیا کہیں گے یہ لوگ بھی اپنے دل میں کہ چائے بھی پلائی تو محض چائے۔ مگر یہ ہے کیا؟"

یہ کہہ کر خوان پوش جو ہٹایا تو اس کے نیچے واقعی نہایت پُرتکلف ناشتہ چنا ہوا تھا سرخ سرخ سیب۔ ٹوسٹ۔ مکھن۔ انڈے۔

[illegible] اور ایک طشتری میں نہایت نفیس قسم کا حلوہ [illegible] پر چاندی کے ورق لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان چیزوں کو دیکھ کر کہا:-

"یہ تو آپ نے تکلف کیا ٹھیکہ دار صاحب:"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا [illegible] بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ کے سامنے بچی کو صرف یہ آرزو ہی تھی کہ چائے [illegible] پڑھ کے وہ خود موقع اور [illegible] رکھتی ہے اور یہ [illegible] کسی کو چلنے پاتا نہ جلنے [illegible] مٹھائیاں [illegible] خدا [illegible] ہے۔ [illegible] مجھے لگاتے [illegible] پروفیسر صاحب۔"

میں نے غور سے حلوہ [illegible] خصوصیت کے ساتھ لگوا [illegible] وہ طلب انداز سے [illegible] کو کھلایا [illegible] مطابق بچی تھا کہ کہا۔

"[illegible] خوشبو [illegible] سے بچایا گیا ہے [illegible] نہیں جاسکتے۔"

ٹھیکہ دار صاحب [illegible] گھر [illegible] پستہ کا حلوہ:" ظاہر ہے کہ گاجر کا حلوہ [illegible] گھر میں نے ٹھیکہ دار صاحب کو خوش کرنے [illegible] سیب کا معلوم ہوتا ہے یا شاید کسی کا ہو"

ٹھیکہ دار صاحب نے ایک قہقہہ لگا کر کہا: "کس قدر [illegible] ہے سیب [illegible] سیب کا معلوم ہوتا ہے نہ کسی کا بلکہ محض گاجر کا حلوہ ہے۔"

میں نے گویا حیرت سے کہا: [illegible] باوجود اس قدر [illegible] ہے۔ اور مزہ کس قدر ہے۔ تم نے کیا ڈالا ہے؟"

انہوں نے سیب چھیلتے ہوئے کہا: "جی ہاں میں سیب کے بعد کسی اور طرف متوجہ ہوں گا۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا: "ٹھیک ہے۔ صاحبزادی بھی یہی کہتی ہیں کہ نہار منہ پہلے سیب کھانا چاہیے اور انگریزی میں نہ جانے کیا فرماتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سیب کھاؤ بیمار بھاگ جاؤ۔ پروفیسر صاحب یہ بسکٹ بھی گھر ہی کے بنے ہوئے ہیں۔ بچی نے خود ہی بنائے ہیں۔ بھئی مجھے تو بیحد پسند ہیں۔"

میں نے جلدی سے ایک بسکٹ کھا کر کہا: "ماشاء اللہ۔ بھلا بازار کے بسکٹوں میں یہ بات کہاں۔ مگر آپ نہ فرماتے تو میں ان کو ولایتی بسکٹ سمجھتا۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا: "اور ہیں بھی یہ اس اعتبار سے ولایتی کہ بلقیس نے ان کو بنانا ایک میم ہی سے سیکھا ہے جس کی کوٹھی کا ٹھیکہ میرے پاس تھا اور بلقیس سے اس میم کو بیحد دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ صاحب کیا ہنرمند اور سلیقہ شعار لیڈی تھی وہ بھی۔ یہ جو خوان پوش ہے بلقیس نے جب کروشیا سے اس کو بنا ہے تو وہ میم ایک ایک کو دکھاتی پھرتی تھی کہ بلقیس کے ہاتھ میں کس قدر صفائی ہے اور کتنی بڑی آرٹسٹ ہے یہ لڑکی وہ تو میرے سر تھی کہ میں بلقیس کو اس کے ساتھ ولایت بھیج دوں۔ مگر ناکتخدا لڑکی کو سات سمندر پار

میرے پیچھے بھیج دیتا۔"

میں نے کہا "ہاں صاحب ہم لوگوں میں اس قسم کی آزادیاں کہاں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا "اور وہ خود بھی پسند نہیں کرتی اس قسم کی آزادی۔ آپ کی دعا سے کالج میں پڑھ رہی ہے مگر کیا مجال کہ برقعے کے باہر چشم فلک نے بھی اس کو دیکھا ہو۔"

ٹھیکہ دار صاحب اسی طرح اپنی صاحبزادی کی شان میں قصیدہ پڑھتے رہے، میں داد دیتا رہا مگر اسلم بیٹھا ہوا مسلسل کھاتا رہا اور ایسا خستہ ناشتہ پر ہاتھ مارتا رہا کہ سیب کھا چکا تو حلوے کی پلیٹ پر حملہ کر دیا اس سے فارغ ہوا تو مکھن ہی ٹوسٹ پر موٹی موٹی تہیں جما کر صاف کر گیا اور پراٹھوں کی شامت لے آیا۔ وہ تو معلوم ہو رہا تھا کہ انتقاماً ناشتہ کھا نہیں بلکہ واقعی ٹھونس رہا ہے البتہ کبھی کبھی قہر آلود نگاہوں سے ٹھیکہ دار صاحب کو دیکھ لیتا اور پھر دانت پیس کر بے زبان ناشتہ سے بدلہ لینا شروع کر دیتا تھا۔ خدا خدا کر کے ناشتہ ختم ہوا اور چونکہ ہم دونوں کو دفتر جانا تھا لہذا ٹھیکہ دار صاحب سے رہائی نصیب ہو سکی۔

۳

وہ مصیبت جو ہر مردانے گھر میں ہوتی ہے جہاں کوئی عورت نہ ہو اُس میں ہم دونوں بھی مبتلا تھے کہ مثلاً کپڑے بدلنے جو بیٹھے تو پتہ چلا کہ قمیص میں بٹن ہی ندارد ہیں۔ اب ڈھونڈھ رہے ہیں سوئی دھاگہ اور فرض کر لیجئے کہ مل بھی گیا سوئی دھاگہ تو سوئی میں دھاگہ پرونا کیا آپ کے خیال میں کوئی معمولی کام ہے۔ نہ جانے کتنے وار خالی جاتے ہیں تب کہیں جا کر سوئی کے ناکہ سے دھاگہ گذر سکتا ہے۔ مثلاً آج ہی مصیبت میں اسلم غریب مبتلا تھا۔ خدا جانے بیچارے نے کتنی کوشش کی ہو گی کہ آخرکار اس کو میری مدد کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس نے میرے کمرے میں آ کر کہا:۔

"سوئی میں دھاگہ پرونا آتا ہے تم کو؟"

میں نے کہا "کسی درزی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ تو نہیں کیا ہے مگر لاؤ کوشش کرتا ہوں۔"

اور خدا کو میری شرم رکھنا منظور تھی کہ پہلی ہی کوشش میں دھاگہ سوئی کے ناکے سے گذر گیا اور جب میں نے نہایت فخر کے ساتھ اسلم کو اپنا یہ کمال دکھایا تو وہ حیران ہی تو رہ گیا:۔

"کمال کر دیا بخدا۔ یقیناً تم نے اس فن پر ریاض کر رکھا ہے ورنہ اتنا صحیح نشانہ کسی اناڑی کے بس کا نہیں ہے۔"

اور وہ میرے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر قمیص میں بٹن ٹانکنے کی کوشش کرنے لگا اور غالباً دو ہی تین ہاتھ چلائے ہوں گے کہ ایک مرتبہ "سی سی سی" کرتا ہوا یکدم کھڑا ہو گیا اور قمیص فرش پر جا گری۔ اب جو میں اس کو دیکھتا ہوں تو وہ ایک ہاتھ سے اپنے دوسرے ہاتھ کی انگلی پکڑے کھڑا ہے اور انگلی کے سرے پر خون کا ایک موٹا سا قطرہ کانپ رہا ہے۔ میں نے کہا:۔

"کیا چبھو لی سوئی انگلی میں؟"

اور اسی وقت دیوار کے اس پار سے بلقیس کی آواز آئی "امی جان۔ کیا ہم اس انگلی کو انگشتِ شہادت کہتے ہیں جس میں

دکھاتے ہوئے:

اسلم نے ہاتھ جھٹک کر زیر لب کہا: "دیکھیے"

اور میں نے ہنس کر داد دی: "[illegible]"

اسلم نے واقعی خفت سے کہا: "جی چاہتا ہے کہ دھوبی سامنے آجائے تو [illegible] اس کمبخت کو

یہ خیال کہ کسی قمیص ہی کی کوئی بٹن اس نے سلامت چھوڑا ہو [illegible] یا کسی دھوبی کے [illegible]

بٹن سلامت رہ جائیں:

میں نے تڑپ کر کہا: "لاؤ میں لگا دوں [illegible] جب سوئی چبھ جاتی [illegible]

[illegible] یہ کونسا بڑا کام ہے:

اور اسی وقت کامنی نے دونوں [illegible] ایک چھری اور ٹنکچر آئیوڈین کی شیشی لا کر دیتے ہوئے کہا:۔

"یہ لیجیے آپ کے لیے چھری ہے اور قمیص [illegible]:

میں نے چھری اور ٹنکچر دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا: "قمیص [illegible] ہیں ان کو یہاں [illegible]:

کامنی کو بھی یہ سن کر ہنسی آگئی اور وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر ہنستی ہوئی قمیص لے کر جا رہی تو [illegible] نے کہا: "دیکھا آپ نے اس طرح

مذاق اڑایا جاتا ہے بات بات پر:"

میں نے کہا: "معاف کیجیے گا بندہ نواز یہ مذاق تو آپ خود اڑواتے ہیں۔ ذرا سی سوئی چبھ گئی تو [illegible] ہوتے ہوئے کھڑے

ہو گئے اور دھوبی کو گولی مار دینے کا ارادہ کر لیا:"

اسلم نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا: "اچھا خیر ادھر آجاؤ۔ یہاں تو دیوار کے بھی کان ہیں:"

میں نے اس کے ساتھ جاتے ہوئے کہا: "صرف کان نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ آنکھیں بھی ہیں:"

مگر ابھی ہم دونوں برآمدے میں جا کر بیٹھے بھی نہ پائے تھے کہ ٹھیکیدار صاحب کچھ سراسیمہ سے داخل ہو کر نہایت گھبرائے ہوئے

انداز سے بولے:۔

"خیریت تو ہے میں نے تو ابھی سنا کہ خدا نخواستہ اسلم میاں کچھ زخمی ہو گئے ہیں:"

میں نے ہنس کر کہا: "استغفراللہ۔ اگر زخمی ہونا اسی کو کہتے ہیں تو نہ جانے زخمی ہونے کو کیا کہا جائے گا۔ قمیص میں بٹن ٹانک رہے

تھے یہ حضرت کہ ذرا سی سوئی انگلی میں چبھ گئی تھی:"

ٹھیکیدار صاحب نے بدستور تشویش کے ساتھ کہا: "یہ ذرا سی بات بھی خطرناک ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے کہ وہ سوئی زنگ آلود ہو تو

اس کا زہر جسم میں داخل ہو سکتا ہے۔ ذرا دکھلائیے تو مجھے:"

اور کچھ نہ پوچھیے کہ اسلم کا کیا حال تھا اس وقت۔ دراصل اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا مگر وہ کھسیانی ہنسی ہنس ہنس کر اپنی اس

انگلی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر ٹھیکیدار صاحب نے بڑھ کر خود ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی دیکھتے ہوئے بولے:۔

"بھلا یہ کون سا موقع ہے اس تکلف کا۔ بظاہر تو کوئی خاص بات نہیں مگر احتیاطاً ٹنکچر لگا ہی دینا چاہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر

آپ بٹن ٹانکنے بیٹھے ہی کیوں۔ ارے بھئی سیدھی سی بات تھی کہ قمیص اندر بھیج دی ہوتی، بٹن ٹنک کر آجاتے۔ یہ آپ کو تکلف کی سزا ملی ہے کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔ ؎

اے ذوقِ تکلف میں ہے تکلیف سراسر

چنانچہ آپ نے تکلف برتا اور آپ کو سراسر تکلیف پہنچی۔"

میں ابھی اس لطیفہ کے نشہ ہی میں سرشار تھا کہ مصرعہ میں ذوق موجود ہے اور وہ فرما رہے ہیں کہ کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔ ؎ ——— اے ذوقِ تکلف میں ہے تکلیف سراسر

کہ ٹھیکیدار صاحب نے مجھ کو بھی مخاطب کر لیا:۔

"کان کھول کر آپ دونوں صاحبان سن لیں کہ یہ خانہ بے تکلف ہے اور میں آپ دونوں کو بخدا اپنا کرایہ دار نہیں بلکہ عزیز سمجھتا ہوں لہٰذا آئندہ اس قسم کا تکلف نہ ہو ورنہ مجھے صدمہ ہوگا میں نے تو پہلے ہی دن اسلم میاں سے کہہ دیا تھا کہ اس گھر کو آپ اپنا گھر سمجھ کر رہیں اور اگر محض کرایہ دار بن کر رہنا ہے تو اس شہر میں بے شمار گھر اور بھی مل سکتے ہیں بلکہ میں تو اکثر اسی پر نادم ہوا کرتا ہوں کہ آپ کو علیحدہ چولہا ہانڈی کرنا پڑتا ہے مگر قیس کی والدہ کی یہ رائے بھی صائب ہے کہ بہت زیادہ یگانگت سے بھی پھوٹ پڑ جایا کرتی ہے۔"

اسی وقت کامنی اندر سے قمیص لے کر آگئی اور اس نے کہا:۔

"بٹیا نے کہا ہے کہ باقی قمیصیں اور مرمت کرنے والے کپڑے بھی دے دیجئے۔"

اسلم نے کہا "شکریہ۔ کہہ دیجئے گا باقی سب کپڑے ٹھیک ہیں۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "پھر وہی تکلف۔ بہتر ہے میں اس کی دوسری ہی صورت اختیار کروں گا۔"

ہم دونوں نے اس دوسری صورت پر غور کرنے کے بجائے دفتر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور ٹھیکیدار صاحب سے رخصت ہو کر ہم دونوں دفتر روانہ ہو گئے۔ گھر سے نکلنے کے بعد میں نے اسلم سے کہا:۔

"اللہ جانے یہ بڑے میاں وہ دوسری صورت کونسی اختیار کریں گے۔"

اسلم نے کہا "خیر یہ بیچارہ بڈھا تو نہایت پُرخلوص قسم کا آدمی ہے مگر ان بڑے میاں کی صاحبزادی کی تیزیوں سے میں بہت گھبراتا ہوں۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں تو تمہاری یہ گھبراہٹ آتی نہیں، اچھی خاصی ذہین قسم کی تیز طرار لڑکی ہے اور خدا کرے یہ میں اس پر الزام نہ رکھ رہا ہوں مگر میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ تم میں غیر معمولی دلچسپی بھی لے رہی ہے۔"

اسلم جیسے سہم کر کھڑا ہو گیا "یہ کیوں دہلا رہے ہو مجھے۔ یہ تیزی طراری اور ذہانت ایسی ہی پسند ہے تو اس شامت کا رُخ اپنی ہی طرف کیوں نہیں کر لیتے۔"

میں نے کہا "گویا میں بھی آپ کی طرح ——— برائے فروخت ——— کی تختی لگائے پھر رہا ہوں۔ اگر میں تمہاری طرح آزاد ہوتا تو اس اعلان پر پھولا نہ سماتا مگر خدا سلامت رکھے میرے متعدد بچوں کی والدہ کو جن کے نام میرے جملہ حقوق نہ جانے کب کے محفوظ ہو چکے ہیں۔"

اسلم نے کہا "تو گویا میں ہی فالتو رہ گیا ہوں۔ یہ تو عجیب خودغرضی کی باتیں کر رہے ہیں آپ۔"

میں نے کہا: "تو جناب صاحب آپ [illegible] وہ آپ کی [illegible] [illegible] آپ نے سب سے پہلے کا [illegible] پہنچ گئے۔"

اسلم نے گھبرا کر کہا: "مادام [illegible]"

میں نے کہا: "وہی مادام جن سے بظاہر [illegible] بیزار رہتے ہیں۔"

اسلم نے [illegible] سے کہا: "بظاہر سے کیا مطلب ہے آپ کا؟"

میں نے کہا: "بظاہر سے میرا مطلب ہے بظاہر — ذرا غور کرنے کی بات ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]"

اسلم نے کہا: "یہ تو [illegible] ہے۔ [illegible] معلوم ہی ہے کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

میں نے کہا: "اسی پر تو مجھ کو حیرت ہے۔"

اسلم نے کہا: "اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ دلچسپی ہونا تو [illegible] مجھے تو وحشت ہوتی ہے اس عورت سے میں اور بھلا میں تو [illegible] سے سخت بیزار ہوں۔"

میں نے کہا: "اس کی دلچسپی اور تمہاری بیزاری کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔"

اسلم نے بڑے تعجب سے پوچھا: "وہ کیا؟"

میں نے کہا: "وہ یہ کہ تم نے اس کو اب تک نہیں دیکھا ہے اور وہ تم کو برابر دیکھتی رہتی ہے۔"

اسلم نے منہ بنا کر کہا: "جی اور کیا ایسا ہی تو میں گلفام ہوں کہ وہ مجھ کو دیکھ کر اس طرح بے قابو ہو گئی ہیں اور [illegible] دلچسپی لے رہی ہیں۔"

میں نے کہا: "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ایسی قابلِ نفرت نہ ہو جیسی بغیر دیکھے آپ اس کو سمجھ رہے ہیں۔"

اسلم نے جز بز ہو کر کہا: "نہیں صاحب وہ محض بیوقوف بنا رہی ہے۔ آج کل کی اسکولوں اور کالجوں کی بعض لڑکیوں کو بیوقوف سازی کا بھی بے حد شوق ہو گیا ہے وہ خواہ مخواہ بھی اچھے خاصے نوجوانوں کو اپنے ان ہی ہتھکنڈوں سے بیوقوف بنا دیا کرتی ہیں مگر میں ایسا چغد نہیں ہوں۔"

میں نے کہا: "بعض اوقات نہایت مسلم الثبوت قسم کے چغدوں کو بھی اپنے متعلق یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ وہ چغد نہیں ہیں بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک کسی چغد نے اپنے کو چغد نہیں سمجھا ہے اس لیے کہ یہ احساس ہی چغدیت کے منافی ہے۔"

اسلم نے پہلے تو غور کیا پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "اچھا خیر — مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ صرف بیوقوف بنا رہی ہے۔"

میں نے کہا: "مگر اس بیوقوفی کا جواب ہے کہ آپ نے نہ اس غریب کو دیکھا نہ اس سے براہ راست کوئی واسطہ پڑا اور خواہ مخواہ بھی اس سے بیزار بنے بیٹھے ہیں۔"

اسلم نے کہا: "سوال یہ ہے کہ میں اس سے کیوں دلچسپی لوں۔"

میں نے کہا: "جناب! اسی سوال سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دلچسپی کیوں نہ لیں آپ۔"

اسلم نے الجھ کر کہا: "بھئی تم اور بھی پریشان کر رہے ہو۔ مگر میں بخدا عاجز آچکا ہوں، ان باتوں سے اور یہ بڑے میاں اور بھی اپنی صاحبزادی کے قصیدے سنا سنا کر بور کرتے رہتے ہیں کوئی پوچھے کہ آپ کی صاحبزادی بڑی ہنرمند۔ بڑی سلیقہ شعار، بڑی لائق فائق، اور بڑی وغیرہ وغیرہ ہیں تو ہم کیا کریں، دلوا دیجئے ان کو نوبل پرائز۔ ہمارا سر کیوں کھاتے ہیں آپ اور ہم کو کیوں مرعوب کرتے ہیں۔"

میں نے کہا: "اس بیچارے کا شاہکار اس کی یہی بیٹی ہے لہٰذا وہ اسی کا سرخروئی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ شاعر ہوتا تو شعر سناتا سیاستدان ہوتا تو سیاسی داؤں پیچ سناتا اپنے مگر وہ تو محض باپ واقع ہوا ہے۔"

اسلم کا دفتر آچکا تھا لہٰذا وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا اور میں اپنی راہ ہو لیا۔

۴

یہ اسی دن کا قصہ ہے کہ میں جو شام کو دفتر سے واپس آیا تو اسلم صاحب برآمدے میں ایک کرسی پر سر تھامے بیٹھے تھے مجھ کو دیکھتے ہی کہنے لگے:-

"میں تو خیر صاف ہو گیا ہوں بالکل، اب ذرا آپ بھی اپنا کمرہ کھول کر دیکھ لیجئے کہ آپ کی کیا کیا چیزیں غائب ہوئی ہیں۔"

میں نے سناٹے میں آکر کہا: "صاف ہو گئے ہو بالکل؟ مطلب کیا ہے تمہارا؟"

اسلم نے نہایت پسپائی کے انداز سے کہا: "چوری ہو گئی اور کیا ہوتا۔ ایک چیز نہیں چھوڑی ہے۔ دیکھو تو سہی ذرا اپنا کمرہ۔"

میں نے لپک کر اپنا کمرہ کھولا تو میری تمام چیزیں بجنسہٖ رکھی ہوئی تھیں۔ تمام سوٹ کیس اپنی جگہ پر رکھے ہوئے تھے بلکہ کھول کر دیکھی تو کپڑے سب کے سب موجود تھے۔ حد یہ ہے کہ آج میں تکیہ کے نیچے اپنی گھڑی بھول گیا تھا وہ بھی اسی جگہ رکھی ہوئی ملی۔ مگر اپنے کمرے سے جا کر اسلم کے کمرے کو جو دیکھا تو وہاں اصطلاحاً نہیں بلکہ واقعی جھاڑو پھری ہوئی نظر آئی۔ بستر وغیرہ تو خیر نہایت سلیقہ سے لگا ہوا تھا مگر الماری میں ایک کپڑا موجود نہ تھا۔ تین سوٹ کیس تھے غریب کے وہ ندارد تھے۔ بجلی کی استری میز پر رکھی رہتی تھی وہ ندارد تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں یہ سب کچھ دیکھ کر اسلم سے کہا۔

"رحمان سے پوچھا"

اسلم نے کہا: "وہ تو آج صبح ہی اجازت لے چکا تھا کہ اپنے بھائی سے ملنے جاؤں گا۔"

میں نے کہا: "اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ پہلے ہی پروگرام بنا چکا تھا کہ ہم لوگ دفتر جائیں اور وہ یہاں ہاتھ صاف کر جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ میرا سامان اس نے کیوں نہیں چھوا۔"

اسلم نے کہا: "جلدی میں صرف ایک ہی کمرے کا سامان اٹھا سکا ہوگا۔"

میں نے کہا: "مگر بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ سامان سمیٹتا رہا اور ٹھیکیدار صاحب کے یہاں کسی نے اس کو ٹوکا بھی نہیں پوچھا تو ہوتا ذرا کامنی کو بلا کر۔"

میں نے کہا: [illegible] ٹھیکیدار صاحب [illegible]

[illegible] چیزیں [illegible]

[illegible] موجود ہے [illegible]

میں نے کہا: [illegible]

میں ابھی یہ کسی کو [illegible]

[illegible] جیسے کوئی بات [illegible]

[illegible] میں دیر ہو گئی [illegible]

[illegible]

کمال نے [illegible]

اور وہ دونوں [illegible]

[illegible] حیرت کا اظہار [illegible]

[illegible] آ کر کہا ۔

"مگر صاحب یہ کیسا چور تھا جو کپڑے لے گیا ہے تو کوٹ بھی لے جاتا [illegible] پیچھے لٹکے ہوں؟"

ہم دونوں نے تقریباً ایک ساتھ کہا: "[illegible]!"

اور وہ [illegible] کمرے کے اندر جہاں واقعی دونوں دروازوں اور دونوں کھڑکیوں پر نہایت خوبصورت پردے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے قریب جا کر ایک کھڑکی کے پردے کو جو [illegible] سے کر دیکھا تو [illegible] کے ایک سوٹ کیس کی جھلک نظر آئی۔ [illegible] یہ تو تینوں سوٹ کیس نہایت سلیقہ سے اس پردے کے پیچھے رکھے ہوئے نظر آئے۔ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

"تو بھئی مبارک ہو تمہارا سامان چوری نہیں ہوا بلکہ پردہ نشین ہو گیا ہے۔ یہ رہے تینوں سوٹ کیس۔"

کمال نے قریب آتے ہوئے کہا: "اس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی چیزیں بھی اسی طرح کسی نہ کسی پردے میں ہوں گی۔"

اور یہ کہہ کر [illegible] جا کر دیکھنا شروع کیا۔ مگر اس کو اپنے وہ کپڑے کہیں نہ مل سکے جو الماری میں [illegible] ہوئے تھے جیسے گھڑی کا [illegible] اس لئے کہ وہ ان کپڑوں کے متعلق تحقیقات کرتا۔ ٹھیکیدار صاحب کچھ پریشان سے کمرے میں داخل ہو کر بولے:۔

"کمال کرتے ہیں آپ لوگ بھی کہ نہ کسی سے پوچھا نہ گھریلو طور پر تحقیقات کی اور تھانہ چوکی بھی شروع کر دی۔ بھلا بتائیے میرے گھر پر پولیس آ موجود ہوگی اور مال مسروقہ میرے گھر کے اندر سے برآمد ہوگا تو میری کتنی بے عزتی ہوگی۔ صاحب آپ کے تمام کپڑے اندر اٹھا لیے گئے ہیں تاکہ ان کو درست کر دیا جائے گودڑ کی طرح الماری میں ٹھنسے ہوئے تھے کسی قمیص میں بٹن ندارد تھے تو کوئی پتلون بغیر استری کے ملا دلا پڑا تھا۔ کسی کوٹ کا کالر مرمت طلب تھا تو کسی شیروانی کی جیبیں کٹی ہوئی تھیں۔ بچی نے اگر

وہ سب کپڑے نکال لیے ہیں تاکہ ان کو درست کر دیا جائے۔"

میں نے کہا: "یہ تو درست ہے مگر یہ تھانہ چوکی کی کیا بات فرما رہے تھے آپ؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "یہی کہہ رہا تھا میں کہ بلاوجہ پولیس نے آ کر تحقیقات شروع کر دی تو کس قدر بدنامی کی بات ہے صاحب۔"

اسلم نے کہا: "مگر پولیس کا یہاں کیا ذکر تھا؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "اور ذکر کس کو کہتے ہیں کہ آپ جا رہے تھے رپورٹ درج کرانے۔ حالانکہ پہلے آپ کو مجھ سے دریافت کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں کہیں گیا ہوا تھا۔"

اسلم نے کہا: "مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں پولیس میں رپورٹ درج کرانے جا رہا تھا؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "مجھے نہایت وثوق سے معلوم ہوا ہے۔"

اسلم نے کہا: "اور میں نہایت وثوق سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ غلط اطلاع آپ کو پہنچائی گئی ہے البتہ میں ڈھونڈھ ضرور رہا تھا کہ سوٹ کیسوں کی طرح یہ کپڑے کس پردے میں رکھے گئے ہیں۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "کیسے رہتے ہیں یہ لوگ، اس کمرے کے رنگ اور اس صوفے کی وضع سے میں سمجھا تھا یہی کہ پرویز صاحب نے پسند کیا ہے۔ مگر پرویز صاحب کے کمرے کے سب جو پردے آئے ہیں ان کا تو جواب ہی نہیں۔ کل دیکھئے گا پرویز صاحب۔ آپ بتائیے! بھئی۔ آپ کا کمرہ آج اس لیے درست نہیں کیا کہ ان حضرت سے تو اجازت لینے کی گویا ضرورت ہی نہ سمجھی گئی مگر آپ سے اجازت لینے کے علاوہ کنجی لینا بھی ضروری تھی اس لیے کہ آپ تو اپنا کمرہ مقفل کر جاتے ہیں نا اور میں نیک نیتی کے ساتھ بھی قفل شکنی کو اخلاقی جرم سمجھتا ہوں۔"

میں نے کہا: "مگر یہ زحمت آپ اٹھا ہی کیوں رہے ہیں؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "یہ زحمت اس لیے اٹھائی جا رہی ہے کہ آپ لوگ نہیں اٹھاتے۔ اب تک انتظار کیا گیا کہ شاید آپ لوگ خود اپنے رہنے کے ٹھکانے کو آراستہ کریں گے مگر آپ لوگ تو عجیب درویش صفت واقع ہوئے ہیں کہ گھر میں بھی اس طرح رہتے ہیں کہ کیا کوئی ویٹنگ روم میں رہتا ہوگا۔ حد یہ ہے کہ ان اسلم صاحب کے بستر کے نیچے سے ہولڈال تک معہ تسموں کے برآمد ہوا ہے۔"

اسلم نے کہا: "مگر ہماری اس بدسلیقگی کی سزا آخر آپ کیوں بھگتیں؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "میاں سچی بات تو یہ ہے کہ مردوں کی اکثریت اسی قسم کی اوٹ پٹانگ ہوتی ہے جیسے آپ ثابت ہوئے ہیں مثلاً میں خود بجدا کباڑیا ہوتا اگر بلقیس میرا خیال نہ رکھتی چنانچہ باہر سے آ کر میں خود کوٹ ایک طرف اچھال دیتا ہوں۔ ٹوپی گھڑونچی پر رکھ آتا ہوں، جوتوں کے اندر موزے ٹھونس کر ان کو پلنگ کے نیچے کھسکا دیتا ہوں، چھڑی پلنگ پر لٹا دیتا ہوں اور نہ جانے کیا کیا کرتا ہوں مگر دوسرے دن ہر چیز نہایت سلیقہ سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ملتی ہے۔ خیال آتا ہے تو صرف یہ کہ چار دن میں جب بلقیس کی شادی ہو جائے گی تو میرا کیا حشر ہوگا؟"

میں نے کہا: "کیوں کیا بیگم صاحبہ محترمہ سے آپ کو اس دستگیری کی توقع نہیں ہے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے منہ بنا کر کہا: "ابی توبہ کیجیے ان کی ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی تک تو میں خود اڑاتا ہوں وہ کیا کریں گی میرا کوئی

...اس قسم کی طاقت جاتی ہو گئی ہیں ان کی تندرستی ہی بیچاری ایک الگ پڑ گئی ہے:"

ہم نے کہا: "تمہارا مدعا [illegible] تو آ ذ تم پتہ ہی سمجھ کر سب شخصوں کو جعفت [illegible] ہے ان کی"

شیلدار صاحب نے کہا: "طبیعت نہیں۔ عادت خراب کر دی ہے جس نے زبان کو ایسا کر دیا ہے کہ ہی نہیں بیٹھنے دیتی۔ نتیجہ یہ کہ بیٹھے بیٹھے طبی چولتی ہی جاری ہیں اور اسی تیزی سے مولی ہو [illegible] زمانہ لگے تو ہر وقت [illegible] بات ہے کہ [illegible] ہو گئی۔ چودھری صاحب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے گھر میں سے نہایت چھریرے اور سڈول جسم کی خاتون تھیں اور بڑی [illegible] تھی ان کی جسامت میں مگر اب تو یہ حال ہے کہ [illegible] میں سے بند کر رکھے ہیں۔ آواز ان کو کھلنے نہیں دیتا۔ مرض [illegible] سے جات [illegible] بیزار کرتا ہوں وہ خود ڈانسنگ کرتی ہیں۔"

میں نے حیرت سے پوچھا: "کیا ڈانسنگ؟ یعنی رقص وہ کرتی ہیں"

اور کمرے کی دیوار کے پیچھے سے "کھی کھی کھی" قسم کی ہنسی کی آواز دور جاتی ہوئی محسوس ہوئی اور شیلدار صاحب نے بے ساختہ مسکرا کر کہا:

"رقص یعنی ناچ! استغفراللہ۔ جی نہیں بندہ نواز میں نے ڈانس سے [illegible] میں جو مراد لیا ہوں کہ [illegible] شروع کر دیں جیسی اس چیز کو کہہ رہا تھا جس کا مفہوم ہے [illegible] کا:"

اسلم نے کہا: "اچھا اچھا ڈانسنگ کو کہہ رہے تھے آپ۔ میں خود حیران تھا کہ بیگم صاحبہ! [illegible] سے کیا تعلق تو کیا [illegible] بھی کرتی ہیں وہ:"

شیلدار صاحب نے کہا: "وہ بیچاری خود اپنے موٹاپے سے عاجز ہیں اور اس کو مستقل مرض سمجھتی ہیں بلکہ میں تو ارادہ [illegible] ہے کہ اب ان سے چکی پسوایا کروں گا۔ مگر سنا ہے کہ تیرنے سے بھی جسم سڈول اور چھریرا ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو تیرنے کا انتظام کہاں کیا جائے۔ جی نہیں بس چکی پسوانا ٹھیک رہے گا:"

اسلم نے کہا: "اس کے لیے کچھ ورزشیں بھی تو ہوتی ہیں:"

شیلدار صاحب نے بڑی تشویش سے کہا: "چہ خوش یعنی آپ کا مطلب ہے ان کو باقاعدہ پہلوان بنا دیا جائے۔ یہ غلط ہے اور نہ یہ عورت ذات کو زیب دیتا ہے کہ وہ بیٹھکیں نکالتی رہے اور ڈنٹر مگدر وغیرہ کا شغل کرے بس چکی والی تجویز نہایت مناسب ہے ایک تو یہ کہ گھر کا پسا ہوا آٹا ملے گا کھانے کو، دوسرے ان کا وزن بھی کم ہو گا جاتی وہ تو اب [illegible] نظر آنے لگی ہیں:"

میں نے ان کو ایک اور ترکیب بتائی کہ آپ ان کو نہار منہ ایک لیمو گھول کر ایک پیالی دودھ پلا دیا کیجئے۔ بس یہی ان کا ناشتہ ہو اور اس کے بعد خواہ کتنی ہی بھوک لگے وہ کچھ نہ کھائیں۔ تکلیف تو بہت ہو گی یعنی کلیجہ کٹ کر رہ جائے گا۔ بھوک سے برا حال ہو گا مگر یہ تکلیف ان کو برداشت کرنا پڑے گی اور جب بھوک بالکل ہی ناقابل برداشت ہو جائے تو مغرب کے وقت کوئی ہلکی سی غذا آدھی بھوک باقی رکھ کر کھایا کریں پھر دیکھئے کہ چند ہی دن میں کیا ہوتا ہے:"

اسلم نے کہا: "مگر میرا خیال ہے کہ اس طرح بھوک مارنے کا نتیجہ بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوتا جسم تو ضرور گھٹتا ہے مگر کمزوری بھی بڑھتی ہے:"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: ”ابھی بڑھنے دیجئے کمندی جسم تو گھٹے کس طرح۔ تو کیا فرمایا آپ نے کیلا! یعنی یہی کیلا جو کیلا کہلاتا ہے ہری چھال کا ہو یا کوئی خاص قسم کا کیلا؟“

میں نے کہا: ”جی ہاں ہری چھال کا ایک کیلا کھلا کر ایک پیالی دودھ پلا دیا کیجئے۔“

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: ”کوئی دعا وغیرہ تو نہیں پڑھنا ہے اس کے ساتھ۔؟“

میں نے کہا: ”نہیں صاحب یہ کوئی روحانی عمل نہیں بلکہ مٹاپا دُور کرنے کی دوا ہے۔“

ٹھیکیدار صاحب نے زیر لب کئی مرتبہ دہرایا ایک کیلا ایک پیالی دودھ اور یہی کہتے ہوئے وہ اس طرح کمرے کے باہر چلے گئے گویا اگر یہ نسخہ حفظ نہ کیا تو کیلے کی جگہ کٹھل کھلا دیں گے۔

۵

میں تو چند ہی دن اس مکان میں رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ سوائے اسلم کی ناشکر گزاری اور احسان فراموشی کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ اس مکان سے عاجز تھا اور دوسرا مکان تلاش کرنا چاہتا تھا حالانکہ اس کو شاید اپنے گھر میں بھی اتنا آرام نصیب نہ ہو سکتا جتنا اس گھر میں اس کو حاصل تھا کہ تھا تو کرایہ دار مگر کیا کسی مہمان کی کوئی میزبان آؤ بھگت کر سکتا ہے جو خاطر تواضع اس کی اور اس کے طفیل میں میری ہو رہی تھی۔ ہم دونوں کے کمرے تو خیر آراستہ کر ہی دیئے گئے تھے مگر اب تو کیفیت یہ تھی کہ بلا طلب ہم کو ہماری ضرورت کی ہر چیز موجود ملتی تھی مجھے تو حیرت اس بات پر ہوئی کہ میری شیونگ اسٹک ختم ہو چکی تھی اور میں ارادہ ہی کر رہا تھا کہ آج دفتر سے واپسی پر لیتا آؤں گا کہ دیکھتا کیا ہوں کہ میز پر نئی شیونگ اسٹک موجود ہے۔ بات بظاہر یہ کوئی مہتم بالشان نہ تھی مگر مجھ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ میں وہ شیونگ اسٹک لیے اسلم کے کمرے میں جا پہنچا اور اس سے کہا:۔

”یہ شیونگ اسٹک کیا تم نے لا کر میری میز پر رکھی ہے؟“

اسلم نے کہا: ”یہ غالباً میرے ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ لائی گئی ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ ہم کو اس طرح کیوں زیر بار احسان کیا جا رہا ہے اور ہم کب تک یہ بار اٹھا سکتے ہیں؟“

میں نے کہا: ”یہ بات اس ناگواری کے ساتھ کہنے کی نہیں ہے بلکہ حسن سلوک کا جواب بھی حسن سلوک ہی سے دینے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے موقع کی تلاش میں رہنا چاہئے۔“

اسلم نے کہا: ”وہ موقع کبھی ہاتھ نہ آنے گا اور اس طرف سے یہ احسانات ہوتے ہی رہیں گے مگر یہ آخر کیوں ہو رہے ہیں احسانات۔ کیا مطلب ہے اس کا؟“

میں نے کہا: ”بغیر کسی مطلب کے بے لوث خلوص بھی تو ہو سکتا ہے۔“

اسلم نے کہا: ”خواہ مخواہ کی شرمندگی میں مبتلا کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ میرے پاس اتفاق سے رومال ختم ہو گئے تھے۔ کچھ دھوبی نے کھوئے کچھ خود میں نے کھوئے۔ ایک دن دفتر جانے کے لیے میں نے اپنا میلا رومال دھو کر سوکھنے کے لیے باہر پھیلا دیا بس یہ غلطی مجھ سے سرزد

"ذرا بیگم صاحبہ جا کر دیکھیں کہ کپڑوں کی الماری میں ایک سو درجن کیلے وہاں رکھے ہوئے ہیں۔ آخر۔ زیادہ آئے یا نہیں؟"

اور اسی وقت وہی مانوس لچکتی ہوئی آواز باہر کے کمرے میں گونجی۔

"امی جان۔ یہ شیو کرنے کے صابن سے ناک صاف کر رہا ہے اس سے کہئے رومال رکھا کرے:"

میں تو بمشکل تمام اپنی ہنسی ضبط کر سکا مگر اسلم کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا جو غصے سے تمتما اٹھا تھا۔ میری ہنسی پر اسلم نے جھلا کر کہا۔

"تم کو ہنسی آ رہی ہے اور میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے ان باتوں سے:"

ابھی میں اسلم کو سمجھانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ٹھیکیدار صاحب نہایت سراسیمہ تشریف لائے۔

"کہاں؟ کدھر؟ ارے میاں کہاں آگ لگ گئی کیسے لگی۔ کس نے لگائی؟"

اسلم اور بھی جھلا کر رہ گئے مگر میں نے ٹھیکیدار صاحب کو مطمئن کر دیا کہ کوئی آگ واگ نہیں لگی ہے۔ آپ مطمئن رہے۔ اور جب انھوں نے بحث شروع کر دی کہ میں نے نہایت وثوق سے سنا ہے کہ آگ لگی ہے تو آخر مجھ کو کہنا ہی پڑا کہ آگ واقعتاً نہیں بلکہ محاورتاً لگی تھی۔ یہ اسلم صاحب ایک صاحب کا ذکر کر رہے تھے کہ ان کی باتوں سے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے

ٹھیکیدار صاحب نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا: "لاحول ولا قوۃ۔ میں سمجھا کہ خدا ناخواستہ آتشزدگی ہو گئی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ بعض لوگوں کی باتوں سے خواہ مخواہ تن بدن میں آگ لگ جایا کرتی ہے مثلاً آج صبح سے بچوں کی والدہ مجھ کو جلا رہی ہیں۔ آپ نے صرف ایک کیلا کھانے کو بتایا تھا وہ پورا درجن صاف کر گئیں۔ ان کا علاج تو صرف یہی ہے کہ [illegible]۔ یہ کیلا وغیرہ مسمنات ہے اس سے تو جسم اور بھی بڑھے گا:"

میں نے کہا: "جی نہیں یہ نہایت آزمودہ نسخہ ہے کہ نہار منہ ایک کیلا کھا کر ایک پیالی دودھ پی لیا جائے اور پھر بھوک کو برداشت کیا جائے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "مگر بندہ نواز میری بیوی تو نادر شاہ درانی کی ہمشیرہ عزیزہ ہیں:"

اسلم نے حیرت سے پوچھا: "نادر شاہ درانی کی بہن! یہ کیسے ہو سکتا ہے"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جیسے نادر شاہ نے گلقند کا پورا مرتبان شاہی حکیم سے چھین کر صاف کر دیا تھا اور پھر کہا تھا کہ — حلوائے خوب است دیگر بیار۔ اسی طرح یہ محترمہ بھی ایک کے بجائے ایک درجن کیلے کھا گئیں۔"

اسلم نے بدستور سوالیہ نشان بن کر پوچھا: "واقعی"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "جی ہاں واقعی بلکہ واقعتاً"

اسلم پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ جب ماں کا یہ حال ہے تو صاحبزادی بھی کچھ کم ثابت نہ ہوں گی۔ ٹھیکیدار صاحب کے پاس تو اتنی گنجائش تھی کہ وہ درجنوں کیلے لا سکتے تھے۔ مگر غریب اسلم کیلوں کا باغ کیسے خریدتا! — یہی سوچ کر اس نے اپنا بوریا بستر باندھا اور ناک کی سیدھ میں اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

لاحول ولا قوۃ

۱

نواب سکندر بخت کو آپ نہیں جانتے؟

لاحول ولا قوۃ۔ تو پھر آپ جانتے ہی کیا ہیں۔ مل لیجئے ان سے یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ، اور عنقریب فسانہ بننے والے ہیں۔ پھر ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ ہمارے عجائب خانوں میں بھی تو یہ انتظام نہیں ہے کہ اس قسم کے نمونے محفوظ کر لیے جائیں۔ ماتھے پر یہ چُنی ہوئی دوپلی ٹوپی۔ سر پر یہ عنبریں لہریا پٹے۔ لبوں میں دبی ہوئی ابابیلوں جیسی گھنی کالی بھونرا سی مونچھیں۔ ہر چند کہ یہ کاریگری خضاب کی ہے مگر کہاں ملتے ہیں ہر ایک کو خضاب کے یہ خاندانی نسخے کہ اس عمر میں جیسے شباب پھٹا پڑتا ہے۔ جالی دار بنیائن پر خورد بین سے دیکھا جائے تو کُرتہ بھی نظر آ سکتا ہے مگر اس طرح کہ جیسے سبزے پر اوس پڑی ہو۔ اس کُرتے کے گریبان پر مُرّی پھندے کا ایسا نفیس اور باریک کام ہے کہ جس کمبخت نے یہ کام بنایا ہوگا، وہ اب آنکھیں مانگتا پھر رہا ہوگا۔ اور کُرتے ہی پر کیا منحصر ہے جس نے یہ چوڑی دار پاجامہ بنایا ہے اُس کے فن کا کیا جواب ہے۔ پنڈلیوں پر کیسی لہریا تراش ہے اور کس قدر باریک جالی کھول کر ایسا چُست بٹھایا ہے پنڈلیوں پر کہ گویا لئی سے چپکا دیا ہو ظالم نے۔ معلوم نہیں نواب صاحب نے اپنے اس درزی کی زندگی کا بیمہ بھی کرا رکھا ہے یا نہیں۔ ایسے فنکاروں کے متعلق تو سنا ہے کہ وہ اپنا فن بھی اپنے ساتھ ہی قبر میں لے جاتے ہیں۔ شیطان کے کان بہرے اگر کسی کی نظر کھا گئی اس درزی کو تو کیا کریں گے آخر ہمارے نواب صاحب اور کون سی کر لیا کرے گا ان بیچارے کے لیے ایسا انگرکھا جیسا ابھی یہ سی کر لایا ہے جسے پہن کر نواب صاحب قدِ آدم آئینے کے سامنے اس طرح اپنا اور اس انگرکھے کا جائزہ لے رہے ہیں جیسے کتھک ناچ کے مختلف بھاؤ بتا رہے ہوں۔ اس پر طرہ ان کے حاضر باشوں کی داد کا شور کہ نواب صاحب نے ایک ہاتھ پھیلا کر دوسرا سینہ کی طرف سمیٹا اور ایک شور بلند ہوا کہ: "اے سبحان اللہ۔ جواب نہیں ہے حضور والا۔ اور کیا کہنا ہے مجنو استاد انگرکھا کیا سیا ہے بخدا مرقع کھینچ دیا ہے مرقع ـــ"

ایک صاحب نے الگ سے مصرعہ لگایا: "مجنو صاحب کا کمال تو ہے ہی مگر اپنی قسم ہے دُہائی ہے کیا جامہ زیبی پائی ہے میری آنکھوں میں خاک۔"

دوسرے نے کہا: "یہ تو ہے ہی یہی انگرکھا مجھے پہنا دیجئے بخدا معلوم ہوگا ڈفلی پر کھال منڈھ دی ہے۔"

تیسرا بولا: "اجی سارنگی پر غلاف کہو ا"

مجھو دوسری سے کان پکڑ کر عرض کیا: "حضور، اپنی قسم [illegible] تو ہے مگر نہیں [illegible] قسمت [illegible] ایک [illegible] نواب آغا جانی صاحب [illegible] عرض کروں کہ [illegible] کے خواب دیکھنے کا [illegible] جو [illegible] پر جا کر"

نواب [illegible] ساتھ [illegible] اس طرح [illegible] خود آپ ہی سے [illegible] ہوں۔ خیر خیر۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ [illegible] تو کوئی عیب نکال سکتے۔ [illegible] ہاتھ پاؤں ہے اس کا [illegible] نہیں جو [illegible]

مجھو نے ہاتھ جوڑ کر کہا: [illegible] نواب صاحب نے ایک مصاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا: "شبن صاحب [illegible] جتنا اس سے بھی روپے زیادہ دے دیجئے گا اس فکر کے کا انعام"

مجھو دوزی فرشی سلام کرتا ہوا جب شبن صاحب کے ساتھ چلا گیا تو نواب صاحب نے [illegible] میں سے ایک سے کہا۔

"لاحول ولا قوة۔ اسی وقت مجھو کو بھی آنا تھا فکر کھائے کر۔ ہاں بھائی شبن صاحب تو لو، آپ کو [illegible] کیا حال تکلف فرما رہے ہیں؟"

شبن صاحب نے کہا: "تکلف بھی نہیں حضور والا مگر رواج ہی ہے کہ لڑکی والے ایک دم سے کوئی نسبت بھی منظور نہیں کرتے خواہ وہ اس نسبت کو دل ہی دل میں کتنا ہی اچھا کیوں نہ سمجھیں اور دلوں میں کیسے ہی لڈو کیوں نہ چھوٹ رہے ہوں [illegible] منہ [illegible] جائے"

نواب صاحب نے دوسرے مصاحب ابن صاحب سے کہا: "آپ کا خیال کیا ہے ابن صاحب آپ کی نظر بڑی گہری ہے آپ نے کیا اندازہ کیا حکیم صاحب سے مل کر اور یہ ذکر چھیڑ کر؟"

ابن صاحب نے بڑے مفکرانہ انداز سے کہا: "مجھے شبن بھائی کی رائے سے ذرا اختلاف ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ بڈھا نہایت خرانٹ ہے۔ شیشہ میں تو خیر ہم اس کے باپ کو بھی اتاریں گے مگر میرا خیال یہ ہے کہ اتنے بڑے گھرانے سے جو نسبت گئی ہے تو اس کا دماغ بھی عرش معلے پر پہنچ گیا اور غالباً وہ چاہتا ہے کہ پہلے آپ کی اولوالعزمیوں کے تماشے دیکھے آپ کی آتش شوق کو بھڑکائے اور اندازہ کرے کہ آپ کا ایسا رئیس اس معاملہ میں اپنی ریاست کے کیا نمونے پیش کرتا ہے اس کے بعد وہ راضی تو ہو ہی جائے گا۔ فی الحال اس کو یہ بھی تو ظاہر کرنا تھا کہ گویا دولت پر ایک دم گر نہیں پڑا ہے وہ۔"

نواب صاحب نے بڑی تشویش سے پوچھا: "آپ میں سے کسی نے یہ تو نہیں کہہ دیا کہ میں ان کی دختر نیک اختر کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہوں؟"

شبن صاحب نے اُچھلتے ہوئے کہا "کمال ہے بخدا۔ ہاں سُنا ابن صاحب دختر نیک اختر فرمایا ہے نواب صاحب نے۔ آپ کو ہماری قسم سرکار یہ بتا دیجئے کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اُن صاحبزادی کا نام اختر ہے۔"

نواب صاحب نے بڑی معصومیت سے کہا "آپ کے سر عزیز کی قسم میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ اس کا نام اختر ہے۔ مگر آپ کو کیسے پتہ چلا، اختر نام ہے اُس کا؟"

ابن صاحب نے کہا "جناب جب ہم کو آپ نے اس خدمت پر مامور کیا ہے تو یہ نہ پوچھیے کہ ہم کیا کچھ کر چکے ہیں اب تو تمام ہی معاملے پر حیران ہیں، ہم تو بہت کچھ معلوم کر چکے ہیں وہاں بھی کسی کا نام معلوم کرنے کی کھوج جاری تھی۔"

نواب صاحب نے ذرا دبے دبے ہنستے ہوئے کہا "تمہیں میری قسم، مگر ان لوگوں کا نام معلوم کرنے کی کھوج تھی۔"

شبن نے کہا "ہائے ہائے — چچ — اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا —— اسی کا نام حسن [illegible] بیمار ہونے بھی پائے برقِ تبسم گرائی گئی تھی۔ نگاہیں لرز کر جھک گئی تھیں اور چہرہ زرد ہونا ہی شروع ہو گیا تھا۔ برقعہ کا باریک نقاب چہرے پر آ گیا تھا، ورنہ بیڑا تب اُٹھ دیا گیا تھا۔"

نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا "مگر شبن بھائی وہ برقعہ کا باریک نقاب بھی کیا قیامت تھا۔ شربتِ دیدار کیسا چھان چھان کر پلایا جا رہا تھا اور ابر کی ہلکی چادر سے ماہتاب کیسا نظر فریب معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں تو یہ معلوم کیسے ہوا کہ میرا نام گویا معلوم کرنے کی فکر تھی۔"

ابن نے کہا "چھوڑیے بھی میں کہتا ہوں کہ آپ کو تو آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے لگے بیٹھ کر۔ ان تفصیلات میں آپ کیوں جا رہے ہیں۔ ہم نے نہ جانے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ حکیم صاحب ہیں تو بڑے حرفوں کے بنے ہوئے مگر ان کو بھی خبر نہیں کہ خود ان ہی کے گھر میں ہمارے پہنچائے ہوئے گھر کے بھیدی موجود ہیں۔"

شبن صاحب نے لقمہ دیا "حضور ہم نے تو اب تک آپ کو یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ ہم اس سلسلہ میں کتنا پیسہ پانی کی طرح بہا چکے ہیں اور اس قسم کے معاملات میں پیسہ تو خیر صرف ہونا ہی ہے مگر ہم نے کیسے کیسے جرأت مندانہ قدم اٹھائے ہیں۔"

نواب صاحب نے کہا "یہ تو گویا آپ لوگوں نے سراسر تکلف برتا ہے کہ اخراجات تک مجھ کو نہ بتائے بغیر جرأت مندانہ قدم تو آپ نے اٹھائے ہوں گے مگر بھائی جو کچھ صرف ہوا ہے وہ تو لے لیا ہوتا۔"

ابن صاحب نے بُرا مان کر کہا "جواب نہیں شبن بھائی آپ کا بھی۔ منع کر دیا تھا میں نے کہ یہ بات زبان پر نہ لائیے گا مگر آپ تو بخدا کئے دھرے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔"

شبن صاحب نے کہا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر میں نے یہ بات اس لیے جان بوجھ کر کہہ دی ہے کہ ابھی تو خیر چار پانچ سو روپے ہی صرف ہوئے ہیں مگر اس معاملہ میں اگر تکلف برتا گیا تو اپنی اتنی حیثیت کہاں ہے کہ بغیر نواب صاحب کو بتائے ہوئے ہم روپیہ پانی کی طرح بہاتے رہیں گے۔"

نواب صاحب نے کہا "نہیں صاحب یہ غلط ہے اور بخدا اگر اس قسم کا تکلف آپ لوگوں نے کیا تو مجھے سخت تکلیف ہوگی۔"

شبن صاحب نے کہا "اب میں آپ سے عرض کروں حضور والا کہ بھائی ابن صاحب نے بھابی صاحبہ کے زیور رکھ کر اس روپے کا انتظام

[illegible] دعا کی ضرورت ہے تو صرف اس عورت کو دیکھئے جو شمیم صاحب کے یہاں ملازم [illegible] ہے وہ ایک ہے، اچھے خاصے [illegible] عورت کسی بڑی اماں کی سوجھ بوجھ [illegible] کہ آپ کی سمجھ [illegible] ہونا چاہئے تھی

شمیم صاحب نے کہا: جناب والا یہ اس عورت کا کرشمہ ہے کہ [illegible] جانتے ہیں ان سے حضور ہی سے [illegible] سنئے میں کہ اب وہ چاہے نواب صاحب [illegible] کہنے لگیں:

نواب صاحب نے [illegible] اگر میرے متعلق [illegible]

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

ابن [illegible] صاحب نے کہا: ابھی تو صرف اتنی سی بات ہوئی ہے کہ [illegible] یہ پوچھا تھا کہ [illegible] والی کوٹھی میں جو نواب صاحب آئے ہیں [illegible] نواب صاحب کے یہاں ملازم [illegible] ان کو

نواب صاحب نے بے صبری سے پوچھا: پھر کیا ہوا؟

ابن صاحب نے کہا: پھر کیا ہوتا ابھی آج ہی کی تو بات ہے اب یہ [illegible] جا رہی ہیں وہ آئے گی تو اس سے [illegible] معلوم ہوگا:

نواب صاحب نے ان دونوں کو [illegible] مناسب سمجھ کر ایک لفافہ میں پانچ سو کے نوٹ بند کر کے [illegible] اور ان کو رخصت کر دیا۔

۲

بات صرف اتنی ہے کہ جامن والی کوٹھی میں نواب سکندر بخت کو آئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ ایک دن اسکول جاتی ہوئی برقعہ پوش لڑکیاں جو اُدھر سے گذریں تو نواب صاحب اپنی ٹوپی کا زاویہ درست کرتے ہوئے کوٹھی کے پھاٹک پر آ گئے۔ وہ لڑکیاں آپس میں چہلیں کرتی ہنستی بولتی جا رہی تھیں۔ کسی کے برقعہ کا نقاب اُٹھا ہوا تھا۔ کوئی زیر نقاب نمک مرچ لگا کر املی کھانے میں مصروف تھی کوئی کسی ہمجولی پر آوازے کس رہی تھی کہ ان حضرت کو اس طرح کھا جانے والی نظروں سے گھورتا ہوا دیکھ کر سب یکدم سنبھل گئیں مگر خدا بچائے ناہید سے ایک ہی بلا ہے وہ تو، اُس نے اختر کو ٹہوکا دے کر کہا:۔

"بھلا پہچان تو سہی تاش کا کونسا پتا ہے یہ"

اختر نے بے ساختہ نواب صاحب کو دیکھا اور برقعہ کا باریک نقاب چہرے پر ڈال کر دبیز نقاب الٹ لیا بس یہ ادا تھی جو نواب صاحب کو ختم کر گئی سان کے حرفوں کے بنے ہوئے مصاحب ایک ہی نظر میں بھانپ گئے کہ معاملہ کیا ہے اور پھر جو ان مصاحبوں نے اس ذرا سی بات کا بتنگڑ بنایا ہے تو نواب صاحب نے واقعی انتقال فرمانا شروع کر دیا۔ نواب صاحب حدِ نظر تک ان لڑکیوں کو گھورتے رہے اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں تو ایک آہ بھر کر جیسے ہی پلٹے ہیں شبن صاحب نے نہایت خوبی سے شعر پڑھا ؎

ہمارے واسطے اب موت بن کے پلٹی ہے
وہی نگاہ جو ان کو گئی تھی پہنچانے

اور ابن صاحب اور بھی قیامت برپا کرنے لگے: "جی ہاں مگر میں نے تو اس وقت یہ عالم دیکھا ہے کہ ؎

گزر گئے وہ نگاہِ کرم بچاتے ہوئے
ہم انتظار میں تھے کوئی ہم کو پہچانے

آخر نواب صاحب نے تڑپ کر کہا: "کاش یہ تیر چلانے کے بجائے آپ لوگوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہوتی کہ وہ ہے کون اور کہاں ہوتی ہے یہیں کھڑے کھڑے مشاعرہ کر رہے ہیں آپ لوگ۔"

ابن صاحب نے کہا: "حضور والا ہم اپنے فرض سے غافل نہیں ہیں۔ لڈن صاحب کو پہلے ہی روانہ کر چکے ہیں کہ وہ جا کر دیکھیں کہ یہ لڑکیاں کہاں جاتی ہیں خصوصاً وہ لڑکی جو تبسم کی بجلیاں گرا کر گئی ہے اور پلٹ پلٹ کر نیم بسمل کی تڑپ دیکھتی گئی ہے۔"

نواب صاحب نے کہا: "بخدا ۔ ع ۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں ۔۔۔ خوب سمجھے آپ کہ مجھ کو دراصل اسی کی کھوج ہے کہ آخر وہ ہے کون۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ پلٹ پلٹ کر کیوں دیکھتی گئی ہے دُور تک۔"

شبن صاحب نے کہا: "اب یہ تو آپ جانیں کہ آپ کی نگاہوں نے اس سے کیا کہہ دیا ہے مگر اتنا ہم نے بھی سُن رکھا ہے کہ یہ تیر دو طرفہ ہی چلتے ہیں۔"

ابن صاحب نے کہا: "ابی صاف کیوں نہیں کہتے آپ کہ ۔ ع ۔

تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

لڈن صاحب کو آتا ہوا دیکھ کر شبن صاحب نے جلدی سے پوچھا: "کیوں بھئی کیا پتہ چلا ۔۔۔"

لڈن صاحب نے قریب آ کر کہا: "کچھ لڑکیاں تو مڑ گئیں چھاپہ خانہ کی گلی میں مگر وہ لڑکی آگے بڑھتی چلی گئی اور میں نے اسی کا پیچھا کیا آخر پتہ چلا لیا کہ وہ حکیم احسان علی کے گھر میں گئی ہے غالباً حکیم صاحب ہی کی لڑکی ہے۔"

شبن نے کہا: "ظاہر ہے دوائے دردِ دل دینے والی کسی حکیم ہی کی لڑکی ہو سکتی ہے۔ مگر تم اسی کو کہہ رہے ہو نا وہ جو دُور تک مڑ مڑ کر ادھر ہی دیکھتی گئی ہے۔"

لڈن صاحب نے کہا: "جی ہاں وہی۔ اس بے چاری کو تو باقی سب لڑکیوں نے آگے بڑھ کر گھیر لیا تھا اور غالباً سب اسی کا مذاق اڑا رہی تھیں۔"

نواب صاحب نے دریافت کیا: "یہ حکیم احسان علی کون صاحب ہیں؟"

ابن صاحب نے کہا: "یہاں سے قریب ہی رہتے ہیں اور طبابت کرتے ہیں مگر مریض وریض تو میں نے کبھی دیکھے نہیں کوئی ان کے مطب میں البتہ بیٹھے ضرور رہیں نہایت باقاعدگی سے حقہ وقہ لگا کر۔ اور اگر کبھی کوئی بھولا بھٹکا مریض آ نکلے تو اس کو دوا بھی خود ہی بنا کر دیتے ہیں اپنے دواخانہ سے جو اسی مطب کی چند طاقوں پر مشتمل ہے جن پر کچھ ڈبے اور کچھ شیشیاں رکھی رہتی ہیں۔"

شبن صاحب نے کہا: "توبہ ہے آپ سے بھی ابن بھائی اتنی تفصیل کون پوچھ رہا ہے آپ سے، بس یہ کہہ دینا کافی ہے کہ

شبہ ہونے سے حکیم جی بچا سکے۔"

زیبا صاحب نے کہا: "ظاہر ہے کہ یہ جوڑ کی شادی ہے تو ہو نہیں سکتی البتہ یہ ہمیں معلوم کہ نہیں نسبت ٹھہری ہوئی ہے یا منگنی ہی سہی تو بھی اس بات کا یقین کہ اگر یہ نسبت ٹھہری تو وہ منظور بھی کریں۔"

اتن صاحب نے کہا: "ماشاء اللہ یہی صنم۔ مطلب آپ بھی نگاہ میں چڑھ چلے۔"

شبن صاحب نے کہا: "نہیں یہ آخر شوخ نے غلط تو نہیں کہا ہے۔ ع

کس کی نگاہ پہ ٹھہرے ہیں

نواب صاحب نے کہا: "اتن بھائی ارے واہ رے میرا۔ کاش تم کو معلوم ہوتا کہ یہی ایک نگاہ ہے کہ واقعی کس سے کس پہنچی ہے۔ ہماری قسم اتن صاحب مجھ کو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرے اندر گویا جوانی خواہ مخواہ سی جاگتی جیسے آج میری نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ بخدا اس نگاہ میں میرے پیچھے پڑ جانے کیا کیا پیغام تھے مگر میں غور کرتا ہوں کہ کہاں میں اور کہاں وہ۔"

مٹھن صاحب نے گویا چونک کر پوچھا: "یہ کیا بات ہوئی حضور والا کہ کہاں میں اور کہاں وہ۔ میں ہوتا تو ان کی طرح چہرہ نہ کھا جاتا۔"

شبن صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "آپ ہوتے اس کی جگہ تو ہمارے نواب صاحب کی کیفیت ہی کچھ ہوتی۔ مگر واقعی یہ کہا گیا ہے نواب صاحب نے کہ کہاں میں اور کہاں وہ۔"

نواب صاحب نے کہا: "ٹھیک تو کہا ہے میں نے کہ کہاں وہ نوخیز لڑکی کہاں میں بڈھا آدمی۔"

اتن صاحب نے بڑی قابلیت سے کہا: "دیکھئے حضور والا ایک بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ اگر فرض کر لیجئے آپ بقول خود بہت بوڑھے بھی سہی حالانکہ یہ غلط ہے مگر میں ایک بات کہہ رہا ہوں اور مان لیتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہیں تو بھی آجکل کی لڑکیوں کا عجیب عالم ہے کہ وہ نوجوانوں میں اپنے لیے کوئی کشش نہیں پاتیں اس کی کئی وجوہ ہیں ایک یہ کہ آج کل کے نوجوان خود اس حد تک محبوبیت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ بجائے محبت کرنے کے وہ چاہتے ہیں کہ خود ان سے محبت کی جائے گویا اس قسم کی شادیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میاں اور بیوی دونوں آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور بیچ میں شمع جلا دیتے ہیں پھر دونوں انتظار کرتے ہیں کہ۔ ع

ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

شبن صاحب نے داد دی: "اے سبحان اللہ کیا بات کہی ہے۔ ایمان کی کہوں گا میں تو کہ اتن بھائی کی نظر جس قدر گہری ہے اتنی ہم میں سے ایک کی نہیں ہے۔"

اتن صاحب نے بات کاٹ کر کہا: "بات سنئے میری۔ محبوبیت دراصل عورت کا حق ہے وہ چاہتی ہے کہ وہ چاہی جائے اور آج کل یہ نوعمر صاحبزادے چاہتے ہیں کہ بیوی ان سے اظہار عشق کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان نوجوانوں سے آج کل کی لڑکیاں یہ بھی ڈرتی ہیں کہ وہ کہیں دوسری شادی نہ کر لیں۔ سوکن نہ سر پر لا بٹھائیں۔ ایک پکی عمر کے آدمی سے ایک نوجوان لڑکی کو یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ کے نخرے نہ کریگا۔ یہ نہ چاہے گا کہ اس کو چاہا جائے دوسرے وہ دوسری شادی ذرا مشکل ہی سے کرے گا۔"

للن صاحب نے کہا: "بخدا دل میں اتر گئی یہ بات۔ کیا سوجھ بوجھ پائی ہمارے اتن بھائی نے۔"

ابن صاحب نے جسارت کی: "آپ کا قطع کلام ہوتا ہے۔ میں آپ لوگوں کو یورپ اور امریکہ تک کی مثالیں دے سکتا ہوں کہ وہاں بھی آجکل کی لڑکیاں ان نوخیز صاحبزادوں کے بجائے ان لوگوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں جن کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے ہوں اور جو ہیرو بننے کے شوق میں مبتلا نہ ہوں بلکہ صحیح معنوں میں پجاری ثابت ہو سکیں۔"

نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا: "بات تو آپ کچھ خدا لگتی کہہ رہے ہیں تو گویا آپ کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ وہ لڑکی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور تعلیم نے اس کی عقل پر بھی جلا کر دی ہے لہٰذا وہ جانتی ہے کہ اس کی پرستش آج کل کے یہ نوعمر لڑکے اتنی نہیں کر سکتے جتنی میری عمر کے لوگ کر سکتے ہیں۔"

ابن صاحب نے کہا: "جی اور کیا۔ اب میں آپ سے عرض کروں کہ اپنی عمر کے متعلق بھی آپ کو کچھ غلط فہمی ہے۔ عمر دراصل ماہ و سال کے اعداد و شمار کا نام نہیں ہے بلکہ عمر نام ہے ولولے کا۔ اگر آپ کی عمر جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں واقعی زیادہ ہوتی تو آپ میں اس لڑکی کے لیے کوئی کشش باقی نہ ہوتی۔ آپ کا دل اس کی طرف کیوں کھنچا اس لیے کہ آپ کا ولولہ ابھی جوان ہے۔"

نواب صاحب نے بے حد خوش ہو کر کہا: "بھئی ابن صاحب میں تو قائل ہوں بخدا آپ کی ذہانت اور طباعی کا۔ اس کے علاوہ چونکہ مطالعہ ماشاءاللہ وسیع ہے لہٰذا آپ سے بات کر کے بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے ہم خوشہ چینوں کو۔"

ابن صاحب نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا: "استغفراللہ، حد کر دی بخدا آپ نے بھی یعنی آپ خوشہ چین ہیں۔ حضور یہ جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ ان ہی قدموں کا فیض ہے۔"

نواب صاحب نے یہ ذکر گول کرتے ہوئے کہا: "قصہ مختصر یہ کہ اب آپ حضرات سے کیا چوری۔ میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ جب سے میں نے اس کو دیکھا ہے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میری روح جس کے لیے بھٹک رہی تھی وہ سوائے اس لڑکی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اب آپ حضرات مجھ کو یہ مشورہ دیں کہ اس کو حاصل کیسے کیا جائے؟"

شبن صاحب نے جو گویا اس سوال کے جواب کے لیے پہلے سے تیار تھے کہا: "اس میں سوچنے کی کیا بات۔ باقاعدہ نسبت بھیج دینا چاہیے حکیم صاحب کے پاس۔ ظاہر ہے کہ حکیم صاحب کی اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کو ایسا عالی مرتبت داماد مل جائے۔"

ابن صاحب نے کہا: "جی نہیں یہ غلط ہے۔ نسبت بھیجنے سے کام نہ چلے گا بلکہ ہم خود لے کر جائیں گے نسبت تاکہ ان کو تفصیل سے سب کچھ سمجھا سکیں اور ان پر واضح کر سکیں کہ ان کی قسمت کا ستارہ واقعی کس قدر بلند ہو چکا ہے۔"

نواب صاحب نے تائید کی: "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آپ حضرات خود نسبت لے کر جائیں۔ مگر نسبت لے جانے سے پہلے کسی طرح اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ خود اُن صاحبزادی کو بھی یہ نسبت منظور ہے یا نہیں تو بڑی اچھی بات ہوتی۔"

ابن صاحب نے کہا: "آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی میں دراصل پہلے یہی سراغ لگواؤں گا۔ بہرحال اب آپ سے کوئی مطلب نہیں ہم لوگ انشاءاللہ سب کچھ کر لیں گے۔ اب آپ ہم کو اجازت دیں۔ انشاءاللہ کل مٹھائی کھائیں گے کوئی خوش خبری سنا کر۔"

اور اس قرارداد کے بعد وہ سب کچھ ہوا تھا جس کا پہلے باب میں ذکر آ چکا ہے کہ حکیم صاحب کے یہاں ایک ماما لگوائی گئی اور یہ گرگے نواب صاحب کی نسبت بھی لے گئے۔

۲

[illegible] جو ابھی حال ہی میں کالج کے سامنے سے گزرتے ہوئے [illegible] لطیفہ [illegible] اختر نے چٹکلہ [illegible] اس لطیفہ پر [illegible] ہنسی [illegible] ایک مدت ہو کر ختم نہیں ہو گیا تھا [illegible] کالج جایا کرتی تھیں [illegible] ہوتی تھی [illegible] اپنی کوٹھی سے [illegible] پہنچتے ہوئے [illegible] لڑکیوں کو [illegible] کبھی آنکھوں میں [illegible] کوشش کر رہے ہیں تو کبھی [illegible] کبھی ٹوپی [illegible] آج [illegible] ہاتھ میں ہے [illegible] کالج میں پہنچ چکے تھے [illegible] جیسے ہی اختر، ناہید، سلمیٰ اور زرینہ کالج پہنچی تھیں [illegible] ان حضرت کی خیریت [illegible] ان سے متعلق آج کے موسمی حالات [illegible] داخل ہوئیں خود یہ تو ہنسی کے [illegible] سوالات کی ہر طرف سے بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

"آج کیا ہوا۔ آج لیلیٰ بھی مجنوں بنے ہوئے تھے۔ آج کا کیا مفہوم تھا۔ آج ان کا [illegible] بہت تھا۔"

اختر نے ہنستے ہوئے ناہید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ان ہی سے پوچھو۔"

ناہید نے ایک آہ سرد بھر کر کہا: "کچھ نہ پوچھو آج کا عالم۔ دلیپ کمار نظر آ رہے تھے۔"

سلمیٰ نے کہا: "غلط۔ مسرت نذیر یکے والی۔"

زرینہ نے تالی بجا کر کہا: "ہاں ہاں ٹھیک ٹھیک ویسی ہی ٹوپی تھی اور ویسی ہی صدری۔"

اختر نے کہا: "اور آج آپ کا غلام سیٹی بجانے کی کوشش میں نقلی دانت کس احتیاط سے ٹھیک کرتا جا رہا تھا۔"

ناہید نے کہا: "بھئی میں تو یہ کہتی ہوں کہ اب اس عشاق کے جد امجد کو کچھ ٹھیک کرنا چاہیے ہم لوگوں کو بھی۔"

اختر نے کہا: "نہیں بھئی خدا کے لیے ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ مجھے تم سے بس یہی ڈر لگتا ہے۔"

ناہید نے اور لڑکیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا: "گواہ رہنا تم سب۔ پھر کہتی ہے کہ میں اس بڈھے کی طرفداری کیوں کروں گی۔ طرفداری نہیں تو اور کیا ہے۔"

اختر نے ڈانٹا: "دماغ خراب ہے تیرا تو۔ میرا مطلب یہ کہ اس کو منہ لگانے سے کیا فائدہ نہ جانے وہ اور کیا رنگ لائے۔"

ناہید نے کہا: "تو میں کچھ اور تھوڑی کرنا چاہتی ہوں بس ذرا ٹھٹھا شروع کر دوں گی دادا میاں کہہ کر۔"

زرینہ نے کہا: "جی ہاں ایسے بے حیاؤں پر ان باتوں کا اثر نہیں ہوتا۔"

سلمیٰ بولی: "دوسرے یہ کہ دادا میاں کہتا ہی ہے تو تم کیوں کہو یہ کہیں اختر۔"

اختر نے بُرا مان کر کہا: "لو اور سنو مجھ سے کیا مطلب اس رنگے ہوئے سیارے کا۔"

ناہید نے طنز سے کہا: "جی بجا ارشاد۔ میں پوچھ سکتی ہوں کہ اور کس سے مطلب ہے۔ دیکھو بھئی خود سے سنو سب [illegible] جان کر فیصلہ کرنا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ پہلے تو کئی دن ہم کو پتہ ہی نہ چلا کہ ان مرحوم و مغفور کا خون ہم میں سے کس کے دامن پہ ہے بلکہ ہم بھی عقلمندی سے یہی سمجھتے رہے کہ یہ ایک نیلامی مال ہے جو بھی بولی بول کر چھوڑ اسے اُسی کا ہے مگر ایک دن یہ ہو گئیں بیمار، اس دن یہ راز کھلا کہ دراصل وہ قبلہ و کعبہ گاہک صرف ان ہی کے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو غور سے دیکھا اور اس کے بعد نہایت مایوس ہو کر واپس گئے گھر کے اندر ورنہ یہ حضرت بھلا لوٹنے والے، حد نظر تک گھورا کرتے ہیں کھڑے ہوئے بلکہ خود اپنے دروازے ہی پر کھڑے رہتے ہیں اور دیدے اُن کے ہمارے قریب ہوتے ہیں۔ اچھا صاحب اس دن تو یہ ہوا دوسرے دن جب یہ بھی ہمارے ساتھ تھیں ان کو دیکھ کر اُس کی نگاہوں نے اسی طرح دُم ہلانا شروع کر دی جیسے کتا کسی اجتماع میں مالک کو پہچان کر دُم ہلانا شروع کر دیتا ہے۔ اس دن یہ حضرت ہنسے بھی مسکرائے بھی۔ لال رومال سے رُخِ روشن کو بھی صاف کیا اور جب ہم قریب سے گزرے تو کچھ گنگنا بھی رہے تھے حضور اب بتائیے کس سے مطلب ہے ان کو؟"

زرینہ نے کہا: "نہیں خیر یہ تو طے ہے کہ سوائے ان کے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔"

اختر نے کہا: "تم سب رشک کر رہی ہو میری قسمت پر، حسد کی آگ میں جلی جا رہی ہو۔"

ناہید نے کہا: "تو بھلا حسد نہ کریں گے، ہم کس کو ملتا ہے اس قدر کہنہ مشق عاشق جانباز۔"

سلمیٰ نے کہا: "کیوپڈ کے بزرگوں میں بس اب یہی مدظلہ العالی رہ گئے ہیں۔"

ناہید نے بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا: "بوا بزرگوں کا سایہ بڑا غنیمت ہے۔"

اختر نے کہا: "سچ مچ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھوسٹ پر غصہ کیا جائے یا ہنسا جائے۔"

زرینہ نے کہا: "میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کی ذرا حوصلہ افزائی کی جائے اس کی نگاہوں کی رسید دی جائے۔"

اختر نے کہا: "بھئی وہ جو ہمارے یہاں نئی ماما آئی ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا ہے کہ ان بڑے میاں کا نام نواب سکندر بخت ہے۔"

ناہید نے کہا: "حالانکہ مونچھیں دیکھ کر میں سمجھی تھی کہ نام نامی ہوگا نواب مچھندر بخت۔"

زرینہ نے کہا: "نواب کم بخت ٹھیک رہے گا ان کا نام۔"

اختر نے کہا: "اس ماما سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب کے ایک صاحبزادے بھی ہیں جن کو ولایت بھیج رکھا ہے اور اب یہاں یہ بڑے میاں عیش و عشرت میں دونوں ہاتھوں سے خوب دولت لٹا رہے ہیں۔ دن رات مصاحبوں کا مجمع رہتا ہے اور رنگ رلیاں رہتی ہیں۔ یہ ماما پہلے ان ہی کے گھر میں ملازم تھی۔"

زرینہ نے کہا: "بس تو اسی کے ذریعہ کسی دن ان بڑے میاں کو نہایت سعادتمندی سے خط لکھ کر بھیجو کہ قبلہ و کعبہ کیوں موت آئی ہے آپ کی۔"

اختر نے آنکھیں نکال کر کہا: "لو اور سنو اب یہ خط بھی لکھوائے گی خط لکھے ہماری جوتی۔"

[illegible] نے کہا: [illegible]

[illegible] کا بھی ذکر کیا ہے:

[illegible] نے تالی بجا کر ہنستے ہوئے کہا: [illegible]

[illegible] واقعہ:

اختر نے ترکی بہ ترکی کہا: جی ہاں [illegible]

[illegible] لگے:

ماہجبیں نے [illegible]

[illegible] سکتا ہے تو اس کے نوجوان بیٹے ہیں:

زرینہ نے اختر سے پوچھا: نام کیا ہے ان برخوردار کا؟

اختر نے اِترا کر کہا: تو جیسے مجھے کیا معلوم۔ میری بلا سے جو کچھ بھی نام ہے۔

ماہجبیں نے ہنستے ہنستے کے انداز سے کہا: مطلب یہ کہ اس وقت پوچھو تو [illegible] آید بکار:

اختر نے جل کر کہا: میں اس ماما کو تمہارے گھر بھیج دوں گی تم ہی تو [illegible] نقشہ کا عہد شباب ہے تصور میں [illegible] لڑکے کا نام بے تکلفی کے ساتھ اس سے پوچھ لینا بلکہ اس سے کہنا وہ شاید پتہ بھی دے سکے۔

ماہجبیں نے بڑی سنجیدگی سے کہا: بس پتہ یہ کہ مجھے اپنا دل تو دی-پی کرنا ہے نہیں۔ میں تو تمہارے ہی لیے پوچھ رہی تھی تاکہ تمہارے [illegible] یہ مثل صادق آسکے کہ۔ کہ

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

اختر نے بُرا مانتے مانتے ایک دم ہنس کر کہا: "سچ سچ قینچی کی طرح چلتی ہے اس کی زبان اور میں تو حیران ہوں کہ اللہ جانے اس کو یہ باتیں آ کہاں سے گئیں کہ دل دی-پی کرنا بھی جانتی ہیں اور باپ کے ناک نقشہ سے بیٹے کے چہرے مہرے کا اندازہ بھی کر لیتی ہیں۔ ماماؤں کے ذریعہ نامہ و پیام کی ترکیبیں بھی چشم بد دور جانتی ہیں۔ توبہ ہے بس! سچ سچ ہم لوگ کیسی بیہودہ باتیں کرنے لگے ہیں۔ نہ زبان میں لگام ہے نہ دیدوں میں پانی باقی ہے۔ چھوڑو بھی اس واہیات بکواس کو۔"

زرینہ نے کہا: "پھر تم ہی اُلجھنے لگتی ہو کہ زندگی میں پہلا تو رومان کیا ہے اور اسی سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔"

اختر نے چیخ کر کہا: "حد ہوتی ہے مذاق کی، لو اور سنو۔ رومان کرے میری بلا۔ جو منہ میں آتا ہے بکتی چلی جاتی ہو۔"

اور وہ واقعی اپنا موڈ خراب کر کے وہاں سے چلی ہی تھی کہ سب لڑکیوں نے قہقہہ بلند کر کے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ اور سلمیٰ نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا: "سچ سچ تم تو بُرا ہی مان گئیں۔ صدقہ کروں اس موٹے لنگور کو تم پر سے [illegible]

ہوا کارٹون ہے۔ یہ بات ہنسی کی ہے یا اس طرح بُرا ماننے کی۔"

ناہید نے کہا: "ذرا اس برہمی کی سنجیدگی تو دیکھیے کوئی میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم اس لطیفہ پر بُرا بھی مان سکتی ہو۔"

اختر نے اُسی بھولے سوچے انداز سے کہا: "آپ کا تو مذاق ہو گیا مگر اللہ جانے کون عقلمند اس کو کیا سمجھ بیٹھے۔"

اُدھر حلیمہ صاحبہ نے بھی لڑکیوں کی ساری گفتگو سُن لی تھی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح انہیں نواب سکندر بخت مل جائیں تاکہ ان کے دماغ کا علاج کر دیا جائے۔ مگر نواب صاحب غائب تھے۔ اس لیے حلیمہ صاحب لاحول پڑھنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

خالہ حسینہ

معلوم نہیں اس کو [illegible] خیر یہ بھی لکھتے [illegible] حسینہ کا [illegible] حسینہ نہ تھا کہ وہ تھیں ہی [illegible] ایک [illegible] کا نام ہی [illegible] آنے لگا [illegible] تھی اور یہ [illegible] بڑی بات ہے کہ [illegible] رکھے تھے [illegible] پیدا کر رہے تھے اور ان کی کوشش تو یہ [illegible] رہا تھا کہ رشتہ داروں کا ایک سیلاب [illegible] آتا تھا۔ کوئی صاحب [illegible] مشکل ہی ہے۔ اب سے میں بائیس سال پہلے جب آپ [illegible] نکلے [illegible] زندگی میں [illegible] والدہ صاحبہ مرحومہ [illegible] تھا اس وقت میں والدہ صاحبہ مرحومہ کی گود میں انگوٹھا چوس رہا تھا۔ کسی نے آکر نہایت قریبی رشتہ بتا دیا کہ آگرہ میں جب آپ کی والدہ اور میری نانی دونوں کا بچپن گزر رہا تھا اور نانی کی منڈی میں آمنے سامنے دونوں کا مکان تھا۔ اس وقت ان دونوں خاندانوں میں ایک رشتہ داری قائم ہوئی تھی کہ آپ کی والدہ کی گڑیا تھی اور میری نانی کا گڈا ان دونوں کی نہایت دھوم سے شادی ہوئی تھی۔ خالہ حسینہ ان تمام رشتوں کو فوراً تسلیم کر لیتی تھیں اور اس قسم کے رشتہ داروں کی بھرتی مسلسل جاری رہتی تھی۔ مگر [illegible] اس [illegible] سے بہت جلد گھبرا اٹھیں اس لیے کہ یہ ریل پیل تو کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور خالہ حسینہ کی حویلی مفت خوروں کی چھاؤنی بن کر رہ گئی تھی جس سے مارے اخلاق کے وہ کچھ کہتی تو نہ تھیں لیکن مزاجی طور پر بے حد [illegible] چلی جا رہی تھیں اور انھوں نے سب ہی سے سیدھے منہ بات کرنا چھوڑ دیا تھا یعنی اس طرح گیہوں کے ساتھ وہ گھن بھی پس رہے تھے جو ان کے واقعی قریب ترین بھانجے بھتیجے تھے۔

میرا اور خالہ حسینہ کا رشتہ اتنی دور کا ضرور تھا کہ میں براہ راست ان کا بیٹا نہ تھا لیکن ان کی سگی بہن کا سگا بیٹا تو تھا ہی اور میری حیثیت ان تمام بناسپتی بھانجوں بھتیجوں سے قطعاً مختلف تھی جو "جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام" کے مصداق نہ جانے کہاں کہاں سے پھٹ پڑے تھے اور اپنے ساتھ تمام محلے کے رشتہ داروں کی بھی مٹی پلید کرائے ہوئے تھے کہ خالہ کی تیوریاں ہم کو دیکھ کر بھی وہی بل پڑ جاتے تھے جو ان سب کو دیکھ کر پڑتے تھے مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کمبخت اشفاق نے ان پر کیا جادو کر رکھا تھا کہ اگر ان کی جبین کی شکنیں ہموار ہوتی تھیں تو صرف اسی کو دیکھ کر۔ یہ حضرت خالہ حسینہ کی ایک ایسی بہن کے فرزند ارجمند تھے جن کو وہ آج تک بھلا نہ پائی تھیں کہ ان کی یہ پیاری بہن کہاں تھیں

مگر یہ عزیز از جان بھانجے خالہ کے مزاج میں ایسے دخیل ہوگئے تھے کہ ان کے مقابلہ میں کسی کی دال نہ گلتی تھی اور اگر کہا جائے تو ان ہی کو خالہ کے معین المہام کی حیثیت حاصل تھی، ان ہی کے ہاتھ میں سارا انتظام تھا۔ وہی سب سے بڑے ہی خواہ سمجھے جاتے تھے۔ وہی سب سے بڑے ایماندار تھے۔ ان ہی کی باتوں پر خالہ کو بے ساختہ ہنسی آتی تھی، ان ہی سے خالہ خندہ پیشانی کے ساتھ بات کرتی تھیں، ان ہی سے دوسروں کی شکایتیں کرتی تھیں اور ان ہی سے دوسروں کی شکایتیں سنتی تھیں، لیکن کسی کی یہ مجال نہ تھی۔ کہ ان سے اشفاق کی کوئی شکایت کر سکے۔ اس سلسلہ میں خود میں نے ایک مرتبہ خالہ کی ایسی ناراضگی خریدی تھی کہ مہینوں وہ مجھ کو دیکھ کر منہ پھیرتی رہیں۔ مجھ سے تو جب سے کان پکڑ رکھے کہ اب کبھی جو اشفاق کے بارے میں خالہ سے کچھ کہوں۔ مجھے یہ [illegible] ہے کہ اشفاق کے پاس وہ کوئی عمل تسخیر ہے جس نے خالہ کو رام کر رکھا ہے۔

یہ تو خیر ہم کو معلوم تھا کہ خالہ کی سب سے بڑی کمزوری ان کی خوشامد پسندی ہے چنانچہ ان کے بھانجوں بھتیجوں کے اس لشکر جرار میں درباریوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ایک سے ایک خوشامدی ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا مگر اشفاق کی بات ہی کچھ اور تھی

(ناتمام)

سرپنچ کی ایک جھلک

ہفت روزہ

مزاحیہ شرح دیوان غالب

ذیل میں ہم مولانا شوکت تھانوی کی [illegible] مزاحیہ شرح دیوان غالب [illegible]
[illegible] ہے اور جس کی اشاعت [illegible] ایک مکمل جامع کتاب کی صورت میں شائع ہو رہی ہے
مدیر

دیباچہ

منظور ہے گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں خبر
کچھ شرح لکھنا باعث شہرت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
غالب سے کیا کسی سے عداوت نہیں مجھے
میں شرح لکھ رہا ہوں شرف کچھ یہ کم نہیں
مانا اسد کا مرتبہ شوکت نہیں مجھے
غالب۔ اور مجھ کو ہو تشبیہ کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
میرا مزاج آپ ہے جام جہاں نما
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
ہیں اور شرح لکھنا مگر اس سے مدعا
جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے
یوں ہی سا اک مذاق تھا جو شرح بن گیا
دیکھا کہ چارہ غیر طباعت نہیں مجھے
اس میں جو آپڑی ہو سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے ترک محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
حرکت تو یہ بری ہے پہ نیت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں شوکت خدا گواہ
سچ بولتا ہوں گو کہ یہ عادت نہیں مجھے

شوکت تھانوی

[illegible] لکھنؤ
[illegible]

(۱)

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا　　قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

آج کل ننگی تصویریں فروخت ہونا جرم ہے لیکن مرزا غالب نے شاید مجنوں کی کوئی ننگی تصویر ضرور دیکھی ہے ورنہ وہ کیوں کہتے کہ قیس نے جو تصویر کھنچوائی تو وہ بھی ننگی آئی سچ ہے کہ عشق واقعی سر و سامان کا دشمن ہے چنانچہ اس سے مجنوں کی لنگوٹی بھی نہ دیکھی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ تصویر میں لنگوٹی بھی غائب ہو کر رہی۔

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب　　تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

"یارب" اس میں تخلص بھی ہے ورنہ شعر نکالنے تو نذر رحمٰن کے برابر ہے رحمٰن کا ہو جائے۔ پہلے مصرع کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ باقاعدہ یہ اظہار ہے کہ تنگیٔ دل کے باوجود زخم نے داد کی صورت اختیار نہیں کی لیکن دوسرے مصرع سے مطلب کچھ اور ہی ہو جاتا ہے جو غالباً یہ ہے کہ میرے زخم نے میرے دل کی تنگی کی داد نہیں دی یعنی اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں بیٹھ کر زخم کا ملوطا بھی پالا اور پھر یہ تیر بھی خواہ مخواہ ٹھونس دیا جو پھڑپھڑاتا ہوا اس طرح نکلا کہ گویا دل میں بہت زیادہ جگہ تھی۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہ شعر دراصل شکایت ہے یعنی دیکھو نا حضور صاحب تمہاری بہت بدنامی ہو رہی ہے اپنی اصلاح کر لو ورنہ ہم نہیں جانتے کہ دنیا بھر میں تمہاری رسوائی ہو گی۔ غضب خدا کا کہ تمہاری محفل سے جو نکلتا ہے سخت پریشان اور شاکی نکلتا ہے بوئے گل بیچاری نکلی تو سخت پریشان، نالۂ دل غریب نکلا تو وہ پریشان، چراغِ محفل کا دھواں پریشان ہو کر نکلا، مختصر یہ بات کیا ہے کہ ۔ ع

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد　　کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

اگر پہلے مصرع کے معنی نہ کیے جائیں تو دوسرے کے صرف یہ ہیں کہ یاروں سے صرف یہ ہو سکا کہ ہونٹ چڑھا کر اور دانت نکال کر رہ گئے لیکن چونکہ پہلے مصرع سے سلسلہ قرابت ملاتا ہے لہذا مکمل شعر کے معنی یہ ہوئے میرے شہید حسرت دل کو دیکھیے کہ ہر مختلف اقسام کے درد کا دسترخوان تھا تاکہ احباب ماحضر تناول فرما کر بندہ کو رہینِ منت کریں لیکن افسوس ہے کہ دوستوں نے پیٹ بھر کر یہ ماحضر نہیں کھایا اور تکلف سے کام لیا۔

اے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند　　سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

الہ دین کے چراغ کے موکلوں کا یہ حال تھا کہ جو مشکل سے مشکل کام دے دیجیے فوراً انجام دے دیتے تھے اور ناطقہ بند کر رکھا تھا بالکل یہی مرزا کی ہمت دشوار پسند کا تھا کہ مشکل سے مشکل کام کو آسان کر کے پھر ایک دشواری پیدا کر دیتی تھی یہاں تک کہ مرنے کو بہت زیادہ مشکل سمجھا تھا لیکن تو نے اس کو بھی یاد کیے ہوئے آموختہ کی طرح آسان بنا دیا اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسا مشکل کام تیرے لیے تجویز کیا جائے۔ ہم مرزا کی جگہ پر ہوتے تو اپنی ہمت دشوار پسند کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتے مثلاً یہی کام کہنے کو کہتے کہ اُلٹی گنتی گن یعنی مرنے کے بعد زندگی عطا کر اور زندگی کے بعد ولادت ہو یہ نہیں کہ ولادت ہوئی زندہ رہے اور مر گئے۔

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب　　آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

غم جو اس کے ماہر ہیں ہر جذبہ کو سمجھ کر غم کا ساز جذبوں تک سب اسی سے واقف ہوں گے ارمان حسرت کو بھی دبا دبا کے کبھی چھوڑنا ممکن ہی نہیں اگر تم ہمیں کبھی غمزدہ بھی ہونا پڑ جاتا ہے اور غم واقف نہ ہو جاتا ہے تو وہی سب غم پھر پھوڑا بن کر نمودار ہوتا ہے اسی سے مرزا صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رونے سے انتہائی ضبط کیا تو سینے میں رہ گیا چنانچہ وہ طوفان بن کر نمودار ہوا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ غم کا مواد ہو یا آنسو کا قطرہ ان سب کا نکل ہی جانا اچھا ہوتا ہے۔ نہ نکل رہ جانے کا وہی نتیجہ ہوتا ہے جو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

(۲)

دھمکی سے مر گیا جو نہ باب نبرد تھا　　عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک لالہ صاحب کو فوج میں نوکری کی سوجھی چنانچہ پہنچے آپ افسر اعلیٰ کے پاس اس نے آپ کی بہادری اور فوجی اہلیت کا امتحان اس طرح لیا کہ ریوالور لالہ جی کے سینے پر رکھ کر لبلبی دبا دی گولی کوٹ کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی اور لالہ صاحب اٹینشن کھڑے رہے۔ افسر ان کی اس بہادری سے بہت خوش ہوا اور علاوہ پروانہ تقرر دینے کے بیس روپیہ اور بھی دیئے کہ اس کا کوٹ بنوا لو جو ریوالور کی گولی سے خراب ہوا ہے۔ لالہ صاحب نے فرمایا کہ حضور پتلون کا دام؟ کہا وہ کیوں؟ کہنے لگے۔ حضور وہ بھی خراب ہو گیا ہے یہی مضمون اس شعر میں ادا کیا گیا ہے کہ عشق کی جنگجوئی کے لیے پتلون کے دام مانگنے والوں یا گولی کی آواز ہی کر رہ جانے والے بزدلوں کی ضرورت نہیں ہے اس کے لیے تو سینہ پر حسن کی گولی کھانے والے جانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا　　اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

اگر کھٹکے کے معنی قفل والے کھٹکے کے لیے جائیں تو پہلے مصرع کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی کے قفل میں موت کا کھٹکا لگا ہوا تھا لیکن دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا نہیں کیا گیا۔ ملک الموت کے پاس اس قفل کی کنجی تھی بلکہ ایک بالکل بے جوڑ سا مصرع کہہ دیا ہے۔ یعنی۔ م

اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

اب دونوں مصرعوں کو ملا کر یہ مطلب بیان کیا جائے گا۔ مرنے کے بعد تو خیر رنگ کا زرد ہونا ایک معقول سی بات ہے لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ زندگی میں بھی موت کے ڈر کے مارے آپ کی دعا سے رنگ زرد ہی تھا اور مرنے کے بعد وہی رنگ ہے یعنی ہماری موت اور زندگی باعتبار رنگ یکساں ہیں۔ مرزا غالب کا یہ شعر ان اشعار میں سے ہے جو مرزا کو کبھی مرنے نہ دیں گے اور ہمارے ایسے ایسے سیکڑوں شوکت تھانوی شرح لکھتے رہیں گے۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں　　مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

بچے کے پیر پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں اب دیکھیے نا کہ مرزا صاحب اپنے بچپن کا ذکر فرماتے ہیں کہ جب مجموعۂ خیال فرد فرد تھا یعنی کسی بات کا کوئی ٹھیک شعور نہ تھا اسی وقت آپ کا یہ عالم تھا کہ طریق وفا اسی وقت سے یاد کر رہے تھے اور وفا کے نسخے جمع

کرنے کا آپ کو جب بھی شوق تھا۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

یعنی دل سے لے کر جگر تک جو قطعۂ اراضی اب ساحلِ دریائے خوں بنا ہوا ہے جب ساحل نہ بنا تھا تو یہاں باغ لگے ہوئے تھے اور ایسے ایسے تھے کہ گلوں کی رنگینی کے تمام جلوے اس کے آگے گرد ہو کر رہ گئے تھے لیکن اب وہی جگہ ساحل کا کام دے رہی ہے اور ساحل بھی دریائے خون کا ساحل۔ ایسے دریائے خون کو دنیا کے نقشہ میں تلاش نہ کیجئے یہ صرف شاعروں کے تخیل میں مل سکتا ہے۔

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

یہ مضمون بھی عجیب و غریب قسم کا رفاہِ عام طلب ہے خدا جھوٹ نہ بلائے تو سینکڑوں شعرا اسی مضمون کے ہم نے خود سنے ہیں اور سنے کیا ہیں ایک شعر تو خود کہا بھی ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

نظر کے سامنے اک بت تو مجاز رہے
بلا سے دل نہ رہے دردِ دل گداز رہے

مولانا آسی مدنی مدظلہ کا شعر ہے ؎

دھوکا نہ کھاؤ چارہ گرو درد ساتھ ہے
بیٹھو یہ دل نہیں ہے تو کیا درد بھی نہیں

حضرت جگر مراد آبادی کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

اب زباں بھی دے ادائے شکر کے قابل مجھے
درد بخشا ہے اگر تو نے بجائے دل مجھے

بہرحال ان تمام اشعار اور مرزا غالب کے شعر کے یہی معنی ہیں کہ دل کے مرجانے کے بعد اس کا بھوت درد بن کر سینہ میں رہ جاتا ہے۔

حبابِ چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

واقعی وحشت کا یہی ایک علاج تھا جو مرزا کے دوستوں نے کیا کہ پکڑ کر بڑے گھر کی سیر کرا دی اس لیے۔ اس زمانہ میں آگرہ یا دہلی میں کوئی انتظام نہ تھا لیکن تخیلات پر ان کا کب بس تھا اور اس کا کیا علاج تھا جو یہ حضرت زنداں میں بیٹھے بیٹھے خاک چھاننے اور جنگل جنگل پھرنے کے خیالات میں کھوئے رہتے ہیں۔

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے، خدا پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ یہ شعر مرنے کے بعد کا ہے لیکن اس سے ڈرئیے نہیں یہ شاعروں کا طبقہ ہمیشہ مرنے کے بعد بھی شعر کہتا رہتا ہے چنانچہ ہمارے استاد حضرت ناطق مدظلہ بالائے مدظلہٗ کا شعر ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ ناطق بیٹھا بیٹھا چل بسا
ہائے کیا کمبخت کو رکھی ہوئی سی آ گئی

[illegible] کا ہے —

[illegible]

[illegible]

[illegible] اقبال [illegible]

[illegible] آزاد [illegible] حکومت کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

قلمی تصویر: پنڈت مدن موہن مالوی [illegible]

آپ مالویہ [illegible] صاحبزادوں میں سے ایک ہیں [illegible] [illegible] اس طرح آپ اپنی زندگی [illegible] ہندوؤں [illegible] مسلمانوں [illegible] جاتے ہیں بہرحال یہ تو طے ہی ہے کہ آپ پنڈت جی [illegible] ہندوستانی ہیں۔

برہمن ہیں اور خطرناک قسم کے برہمن ہیں۔ لندن تک گنگا جل لے گئے تھے اور جہاز کے تختہ پر بھی آپ کی سوئیوں کا مجموعہ [illegible] تھا اور جیل میں بھی یہ ضابطہ برقرار رہا۔ [illegible] کے کنارے اپنے دھرم کی [illegible] ایک طرف تو شدت پسندی ہے دوسری طرف کا دعویٰ [illegible] تحریک [illegible] اور گاندھی جی [illegible] سے جہاں تک زبانی ہمدردی اور قومی بھائی چارہ کا تعلق ہے وہاں تک تو [illegible] ہے لیکن [illegible] میں قائل ہیں [illegible] کے قائل ہیں کہ ہریجنوں سے معانقہ یا مصافحہ قسم کی بے تکلفی شروع کر دی جائے [illegible] رام رام رام رام کا قصہ شروع ہو جاتا ہے اور گنگا جل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لہٰذا آپ نہیں چاہتے کہ گوبر اور گنگا جل سے پاک بنائے ہوئے دھرم کو اچھوتوں کی وجہ سے نشٹ کریں اور ہریجنوں سے بھائی چارہ کر کے مجبور ہو جائیں۔

آپ ویسے بہت زیادہ قابل بہت زیادہ سمجھدار اور بہت زیادہ اچھے آدمی ہیں البتہ بس یہی دقیانوسیت اور مذہبی شدت پسندی نہ ہوتی تو کیا کہنا تھا۔

سفید مونچھیں ہیں سفید لباس پہنتے ہیں اور سر سے پیر تک کالا آدمی ہونے کے باوجود سفید فام رہتے ہیں تقریر بھی خوب کرتے ہیں مگر جیل والے نکات بچا بچا کر تحریر بھی ماشاء اللہ اچھی ہے ہندو یونیورسٹی کے آپ سر راس مسعود ہیں بنارس کے رہنے والے ہیں لہٰذا پنڈت جی بنارسی بھی کہلاتے ہیں۔ جہاں تک خود ہماری ذات کا تعلق ہے ہم پنڈت جی کے اس چھوت چھات کو بھی اچھا

سمجھتے ہیں اور راسخ الاعتقادی کی بھی قدر کرتے ہیں بشرطیکہ وہ وسیع النظر اور روشن خیال وغیرہ ہونے کا دعوے نہ کریں۔

نئی روشنی کے میاں بیوی

از جناب محوی لکھنوی

ایک شوہر نے یہ بیوی سے کہا ڈر ڈر کر   اپنی زلفوں کو مری جان کٹایا نہ کرو
پوڈر اور سینٹ سے چہرے کو بھی محبت کرنا   ہے قلیل آمدنی خرچ بڑھایا نہ کرو
مضحکہ دوست اڑاتے ہیں مرا مجلس میں   صورت اپنی کس و ناکس کو دکھایا نہ کرو
آگ غیرت کی مرے دل میں بھڑک اٹھے گی   ہاتھ غیروں سے سرِ بزم ملایا نہ کرو
خبریں اغوا کی بہت آتی ہیں اخباروں میں   سیر کرنے تنِ تنہا کبھی جایا نہ کرو

بھر کے غصہ میں لگی کہنے وہ بنتِ تہذیب   کہہ دیا ہے تمہیں بس باتیں بنایا نہ کرو
خرچ بڑھتا ہو۔ اگر کھانے پہننے سے مرے   بھیج دو میکے شب و روز جلایا نہ کرو
ہم نکالیں گے قدم گھر سے نہ ہرگز اپنا   تم سینما کی طرف بھول کے جایا نہ کرو
بوجھ بالوں کا اٹھائیں گے سرِ نازک پر   داڑھی مونچھوں کا مگر تم بھی صفایا نہ کرو
اپنی عادات میں تبدیلی جو منظور نہیں   میرے کاموں میں بھی پھر ٹانگ پھنسایا نہ کرو

تم ہو ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تم نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی

غالبؔ اور وہمیؔ

(مندرجہ ذیل غزل میں ہر شعر کا ایک مصرع مرزا غالبؔ کا ہے اور ایک مصرع حضرت وہمیؔ دہلوی کا ہے لہذا یہ غزل دونوں کی مشترکہ سمجھی جائے۔) ایڈیٹر

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصالِ یار ہوتا   شبِ وعدہ آ بھی جاتی تو ہمیں بخار ہوتا
تجھے ہم ازل سے جھوٹا مری جان جانتے تھے   کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جاناں کہ بندھا تھا عہد بودا   ترے ہاتھ ٹوٹ جاتے جو وہ پائدار ہوتا
یہ خلش تو اس لیے ہے کہ جگر کے اس طرف ہے   یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — [illegible] تو وہ [illegible] ہوتا
[illegible] پہ پہرہ — مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
[illegible] — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
[illegible] — غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
[illegible] — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
[illegible] کہ دوئی کی بو ہیں — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہماری شرارتیں

جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی

جب ہم وقت ختم کر کے وہاں پہنچے جہاں سب [illegible] حقیقت یہ [illegible] شوکت [illegible] کے ختم مختصر ہم سائیکلیں [illegible] کر دیں اس سے فارغ ہی ہونے نہ پائے تھے [illegible] جی اکثر کرتا تھا اور شوکت کے [illegible] کھلاڑیوں کو واپس کر دیتے تھے جب بھی ایک مرتبہ [illegible] سینٹ پال کی طرف اس جگہ [illegible] سے [illegible] لگے ہوئے تھے کہ وہ [illegible] وہی حشر کیا پہلے [illegible] ہم نے بہتر یہی کہ وہاں سے کھسک آئیں [illegible] ہم دیر [illegible] ہو گیا اور اس لطف تو جب آیا جب سب [illegible] پر چڑھ کر فوراً اترنے پر مجبور ہوئے۔ اب ہم [illegible] کے [illegible] میں سے گزر کر اس کے دوسرے پھاٹک پہ پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی کپڑے کی دکان لگائے ہوئے ہے اس دکان کی اس نے چادریں تان کر کپڑے کی دیواریں اور کپڑے کی چھت بنائی تھی ہم اس کی پشت پر سے ہو کر گزرے کہ ہم کو ایک چھوٹا سا ٹیلہ نظر پڑا جس پہ وہ کپڑے گھر سے لا کر ڈال دیا تھا ہم نے فوراً [illegible] کر [illegible] جا کر زور سے دوڑ کر دکان کی پشت میں اس زور سے ریلا کہ وہ کپڑے کی دیوار پھاڑتا ہوا دکان کے اندر اس طرح گھس گیا کہ ساری دکان بیٹھ گئی اندر سے دو آدمیوں کے چیخنے کی آواز آئی مگر ہم بھاگ گئے۔ اب مٹھائی کی ٹھہری ہم روپیہ لے کر مٹھائی لینے ایک ساتھی کے ساتھ گئے اور [illegible] چھوڑا ہر دکان پہ ہر قسم کی مٹھائی چکھی اور وہ بھی اس طرح کہ آخر کو انھوں نے چکھانے سے انکار کر دیا، ہم نے بنگالی مٹھائی پسند کی حالانکہ ہمارے ساتھی کشمیری برہمن تھے مگر دکاندار ہم دونوں کو بنگالی سمجھا تھا اور کہا الگ کھڑے ہو ہم کو پتا معلوم ہوا اس نے سیر بھر مٹھائی ہماری فرمائش سے تولی اور بجائے ہاتھ میں دینے کے ہم سے کہنے لگا ہاتھ پھیلاؤ ہم نے ہاتھ پھیلا دیے اس نے [illegible] ہی سے دونا مٹھائی کا ہمارے ہاتھ پر چھوڑا ہم نے فوراً ہاتھ ڈھیلے کر دیے اور دونا مٹھائی کا نیچے گرا۔ ہم کھسک گئے دکاندار ہم پر برس پڑے اور ادھر وہ دکان سے اتر پڑا کہ میں اپنے پورے دام لوں گا، پورا فتنہ کھڑا ہو گیا مگر ہم

نے دام نہ دینا تھے نہ دیئے۔ دوسری جگہ سے مٹھائی خریدی اور کھا کر پان والے کی دکان پر پہنچے یہ پان کی دکان بھی دیکھنے کے لائق تھی، پان والا صدر دروازہ کے بائیں جانب قد آدم اونچی چوکی پر ایک بازو باندھ کر بیٹھا تھا اور دکان کو ایسا سجایا تھا کہ لوگ اس دکان پر ٹوٹے پڑتے تھے، پان والے صاحب اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھے ہوئے تھے، دکان پر بہت سی رنگ رنگ کی بوتلیں اور سجاوٹ کا سامان بنا ہوا پڑا تھا، چوکی ایک طلائی گتا لگا تھا اور کپڑے کی چھت لگی تھی جس میں قندیلیں اور گلدستے آویزاں تھے بہت سی تصویریں چاروں طرف لگی تھیں، ان ہی میں مولوی صاحب کی ایک ٹہنی تھی جو وہ ہر ایسے ویسے کے رسید کرتے تھے جو ان کے پان کے کھمبے کے پاس آتا تھا ہم کو۔ بہت برا معلوم ہوا، ہم نے ان سے کہا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو انھوں نے کہا کہ صاحب یہ اس کا کھمبا جس پر کہ مچان ڈٹا ہوا ہے زمین میں یوں ہی رکھا ہوا ہے اور مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں کھمبا لگ کر ساری دکان ہی دھم سے آ پڑے۔ ہم نے کہا کہ یہ تو زمین پر گڑا ہوا ہے بھلا کیسے گرے گا تو انھوں نے فرمایا کہ صاحب یہ یوں ہی رکھا ہے اور پھر طرہ یہ کہ مچان کے نیچے ہیں بندھا بھی نہیں ہے اس وجہ سے مجھ کو بہت اندیشہ ہے۔

اب یاد آیا، ہم نے جو دوستوں سے صلاح لی کہ بھئی لاؤ اب رات ہے اس پان والے کی دکان کیوں نہ گرائی جائے تو ہمارے کسی ساتھی نے حامی نہ بھری، دکان گرانا بھی پورا تعزیہ تھا۔ مچان پر بوجہ سامان آرائش تل دھرنے کی جگہ نہ تھی اور مجمع یہاں ایسا تھا کہ پکڑا جانا قطعی تھا مگر ہم نے کہا کہ خواہ کچھ بھی ہو ہم یہ کام ضرور کریں گے ہمارے ساتھیوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے ہم نے بھاگنے کی راہ وغیرہ خوب غور سے دیکھ لی اور گھوم پھر کر اس جگہ پہنچے جہاں احاطہ کی چھوٹی سی کچی دیوار تھی یہ جگہ الگ سی تھی اور یہاں لوگ پیشاب کرنے آتے تھے ہم نے ساتھیوں کے ساتھ دو تین گھنٹے بسر کیے اور پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے، گھومتے پھرتے دکان کے پاس آ کر ہم نے ہمت کر کے مجمع کے دباؤ میں کھمبے سے لگ کر جو ڈنڈے کو گھسیٹا تو ایک شور بے ہنگام برپا ہوا اور دکان مع چھت و سامان سجاوٹ اور پان والے اور بوتلوں کے آن پڑی، کتھے اور چونے کی کلھیاں سب ایک ہو گئیں اور غضب یہ ہوا کہ وہ برتن بھی گرا جس میں کہ پان والا پیسے رکھتا جا رہا تھا پیسے جو مجمع میں گرے لوگوں نے دست اندازی کرنا شروع کی ہم کو اس میں یہ ترکیب فرار عمل کی اور اس شور و غل میں ہم مع ساتھیوں کے دیوار پھاند کر گلی میں کود کر اس بری طرح بھاگے کہ نہ معلوم کہاں آ کر نکلے ہم کو سخت اندیشہ پکڑے جانے کا تھا کیونکہ دروازہ پر جو کانسٹبل تھا اس نے ہم کو شرارت کرتے ہوئے شاید دیکھ لیا تھا اور ہم عجب نہیں پکڑے جاتے اگر کہیں دکان نہ لٹنے لگی ہوتی۔

رات کافی آ گئی تھی اور ہم نہ معلوم کہاں تھے جہاں نسبتاً سناٹا تھا جگہ جگہ لوگ سڑک کے کنارے چارپائیوں پر سو رہے تھے ایک لالہ ننگے بدن پلنگ پر لیٹے ایک موڑ پر اس طرح توند پھیلائے لیٹے ہوئے تھے کہ ہم کو مجبوراً اپنا سگریٹ جو قریب الختم تھا ان کے پیٹ پر رکھ دینا پڑا، وہ ایسے تڑپ کر پیٹ پیٹتے ہوئے اٹھے کہ ہم کو لطف ہی آ گیا اور ہم بھاگ کر دوسری جگہ پہنچے کچھ آگے پہنچ کر ہم نے ایک چارپائی مع سونے والے کے لوٹی اور گھر واپس ہونے سے پہلے پہلے ہم نے ایک برہنہ بدن سونے والے کے پیٹ پر سگریٹ جلتا ہوا رکھ کر بہترین تماشہ دیکھا۔

رات گئے گھر واپس آئے مگر چونکہ صبح ہم گھر سے اجازت لے کر نہیں نکلے تھے اس لیے دوسرے روز صبح ہی جرم ہمارے

[illegible] مجھ کیوں غائب ہے [illegible] اپنے [illegible] دوست
[illegible] افسوس [illegible] کا خیال [illegible]
[illegible] کر دیا
[illegible]

غسل

خواجہ حسن نظامی

[illegible]

[illegible]

[illegible] چاہئے صحیح نہیں ہے کیونکہ [illegible] احساس کا نام [illegible] ہے [illegible] اگر شباب [illegible] کسی شخص سے [illegible] کتنا گناہ ہے۔

[illegible] الہ آبادی [illegible] شادی کرتے ہیں [illegible] آغوش میں آ گئے [illegible] دن عالم بالا کو چل دیئے [illegible] معلوم ہو [illegible] ہوتے ہیں کہ وہ لوگ [illegible] بیگم سے عشق شروع کر دیا [illegible] لئے تو ساتھ ہی تھوڑی سی افیون بھی آئی اور [illegible] سے افیون [illegible] اور محلے کے دوستوں کے [illegible] بڑی مقدار میں شروع کر دی گئی۔ افیون اور ضعف کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے، یہاں تک کہ [illegible] کا نام زبان پر آنے کی [illegible] ایک سستی اور کاہلی سی چھا جاتی ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ شیخ جی جوان کب ہوئے؟

تھوڑے دنوں تک تو خیر کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ علیم کے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور آپ نے [illegible] کو الگ بلا کر تاکید کر دی کہ اگر بچی کی زندگی اور تندرستی کا کچھ بھی خیال ہے تو ایک مٹر کے برابر افیون دیا کرو (دادی کا یہی ٹوٹکا ہے لیکن غالباً سرسوں کہا ہوگا) افیونی کو دو تین چیزوں سے عشق ہوتا ہے لیکن ساتھ کی چیزوں سے عداوت بھی ہو جاتی ہے۔ سنا ہے کہ اگر کسی افیونی کو سانپ کاٹ لے تو سانپ خود ہی اناللہ ہو جاتا ہے اس کی وجہ جو کچھ بھی ہو لیکن ہمارا تو یہ خیال ہے کہ ایسا نہ نہانے کی وجہ سے ہوتا ہے جسم پر میل کے ساتھ ہی ساتھ زہریلے جراثیم بھی جمتے چلے جاتے ہیں۔ ہم لوگ غلطی کرتے ہیں اکثر غسل کر کے انھیں دھو دیتے ہیں ایک افیونی اس کا خاص خیال رکھتا ہے اس کے جسم پر کبھی پانی نہیں پڑنے پاتا۔ جس طرح عام طور پر لوگوں کو بچھو کے ڈنک سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح افیونی کو پانی سے ایذا پہنچتی ہے۔

شیخ جی نے نہانا بالکل ترک کر دیا۔ بیوی نے بہت سمجھایا لیکن اُن کے فلسفے کے آگے کسی طرح بس نہ چلا۔ ہر بڈھا بغیر درس و تدریس کے ایک بہترین عالم ہوتا ہے اُس کے پاس چھوٹے تاریخی افسانوں کا گرانبہا خزانہ ہوتا ہے، ہر بڈھا وہ [illegible] کر سکتا ہے سیاست حاضرہ پر اُس کی رائے اُس کے حلقۂ احباب میں بڑی وقعت رکھتی ہے یہی حال علیم کا تھا۔ انھوں نے شجاتی کو ہمیشہ سمجھایا کہ نہانا بالکل جائز نہیں کیونکہ قرآن کا حکم اس کے خلاف ہے۔ بیوی نے سر پیٹ لیا اور پوچھا "تو کیا جو لوگ نہاتے ہیں وہ قرآن شریف کے خلاف عمل کرتے ہیں؟" مرزا مرزا علیم نے افیون کی گولی کو چائے کی پیالی میں گھولتے ہوئے کہ پھر سر اُٹھا کر بولے "آخر قرآن میں یہ تو لکھا ہے کہ اسراف بیجا جائز نہیں پھر اگر میں نہاؤں تو پانی بہت خرچ ہوگا جبکہ نہانے کی کوئی ضرورت نہیں تو کیا یہ اسراف بیجا نہ ہوگا؟ اب بولو۔"

بیوی کی سمجھ کے باہر تھا کہ اس تخففات کا جواب دیں۔ انھوں نے ٹالنے کے طور پر کہا "ائے تو کبھی کبھی تو نہا لیا کرو تب تو اسراف نہ ہوگا۔"

"کیا کہا؟ کبھی کبھی؟ ارے تم بھی بھول گئیں ابھی جس سال ہاجرہ پیدا ہوئی ہے اُسی سال عید میں تو میں جب نہایا تھا۔ ابھی یہ کہتے ہوئے ہاجرہ قریب ہی کھڑی ہوئی تھی اُس نے کہا "ابا میری عمر کیا دس برس سے کم ہے؟"

"ہاں تو دس برس تو دیکھتے گزرتے ہیں دیکھو جس طرح امریکہ لڑائی میں ہار کر کمزور ہو گیا تھا اُسی حال میں پڑا ہوا ہے روس کے بادشاہ اُسی طرح حکومت کر رہے ہیں ایک تنکا بھی تو اپنی جگہ سے نہیں ہلا اور تم لوگوں کے نزدیک بڑا زمانہ ہوگیا۔

(۲)

جاڑے کا موسم تھا علیم نے کسی خیال سے اپنے کپڑے اُتار کر دھوپ میں ڈال دیئے تھے اور خود بھی وہیں دھوپ میں بیٹھ کر سجدے کی رسم ادا کر رہے تھے۔ بدن کی رنگت تبدیل ہو چکی تھی کیونکہ جلد بدن پر ایک تہہ گرد و غبار کی جمی ہوئی تھی، کھانا سامنے لایا گیا اور شیخ جی نے کھانا کھایا۔ ایک چُلو پانی سے ہاتھ منہ بھی دھو لیا اور برتن بھی قریب قریب صاف کر دیا۔ بیوی کو اُن کی حالت پر ترس آگیا اُس نے نہایت منت و سماجت سے کہا "دیکھو کل جمعہ ہے میں پانی گرم کر دوں گی نہا ڈالنا۔"

شیخ جی نے غصہ سے آنکھ اُٹھا کر دیکھا جیسے کسی دشمن کو گھور رہے تھے، "کیا چاہتی ہو کہ مر جاؤں؟" شجاتی حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہی تھیں کہ انھوں نے اپنا سوال پھر دہرا دیا۔ بیوی نے دبی زبان سے پوچھا کہ "آخر مطلب کیا ہے؟"

خالہ کی لڈو

ڈاکٹر سید نادم رضوی المناظری بھٹاپوری

جہاں تک ہم نے اندازہ لگایا ہے خالہ کسی وقت بھی ان "مرغیات" اور "بکریات" وغیرہ کے موافق نہیں تھے۔ مگر صرف خالہ کی ہمنوائی میں تائید کر دیا کرتے تھے خیالی اور زبانی تائید ہوتی تو ہم سمجھتے کہ خیر! لیکن خالو جان عملاً مؤید بن جایا کرتے تھے ہم نے خود اکثر دیکھا کہ خالہ جان کی عدم موجودگی میں اُن کی مرغیوں کے چارہ پانی کی فکر کیا کرتے تھے۔ کوئی تین چار برس ہوئے ہوں گے جب جاڑوں میں خالہ نے حسب معمول لوگوں سے چند انڈوں "کی فرمائش کی اور اللہ میاں کی عنایت سے کامیاب بھی ہو گئیں یعنی کوئی دو درجن انڈے مل گئے اور کڑک مرغیوں کی تلاش ہونے لگی جہاں انڈے مل گئے تھے مرغیوں کا مل جانا بھی کوئی

[illegible] بہت بڑے جالے میں [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک [illegible] خالہ کی [illegible] ہو گیا اور ظاہر ہے کہ طوطی کا بچہ کسی کو پیارا ہوتا ہے [illegible] کو دونا منگوا کر [illegible] میں [illegible] بچھو کا بھی اسکیم بنائی گئی تھی لیکن چونکہ خالو صاحب کو [illegible] خالہ جان [illegible] تحریک کی مخالف بن گئیں اور اسکیم فیل ہو گئی۔ خالو نے تاریخی نام رکھا لیکن خالہ نے ناراضگی کی وجہ سے اُن کے نام کو رائج نہ ہونے دیا۔ خود اپنے رکھے ہوئے نام "لاڈو خانم" پر عقیقہ کروایا اور یہی نام محبت اور پیار میں "میری لاڈو" سے "میری للدو" بن گیا۔

اس فخرِ خاندان تحفہ پر خالہ کے بعد اگر کسی شخص کو محبت تھی تو وہ میاں بچو تھے جو اکثر روٹیاں پکے بچے آٹے کی لوندیاں بنا کر "للدو" کو کھلایا کرتے تھے۔ مثل ہے "جس کا کھائیں گے اُسی کا گائیں گے" للدو نا سمجھ سہی مگر اس مثل کو ضرور سمجھتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اُسے بھی فطرتاً انھیں دو آدمیوں یعنی خالہ اور میاں بچو سے محبت ہونی چاہیے تھی۔

جب خالو کا تبادلہ لکھنؤ ہو گیا اور کئی مہینے ٹال مٹول کے بعد خالہ مع اپنے "کورٹ آف وارڈس" کے لکھنؤ گئیں تو میاں بچو اور یہ مرغی خانہ یعنی "پولٹری فارم" بھی ساتھ تھا ریل کے کرایہ کا تو کوئی غم نہ تھا اگرچہ ایک ایک مرغی کا کرایہ ایک آدمی کا دونا چارج ہوا مگر سب کچھ برداشت ہے صرف "للدو" کے لیے۔

"للدو" اگرچہ حیوان تھی مگر اُس میں خالہ شناسی کا بہت مادہ تھا اور جس وقت خالہ چھالیاں کترنے کے لیے ہاتھ میں سروتا لیتیں بی "للدو" بھی ایک زانو داب کر جا بیٹھتیں اور ٹکٹکی باندھے ہوئے پیار و محبت سے خالہ کے اس مشغلہ کو دیکھا کرتی تھی خالہ جب طلب کے لیے پان کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھ لیتیں تو "للدو" کا فرض تھا کہ وہ بھی بچے ہوئے ٹکڑے

کو خالہ کی موجودگی میں بھی وہ نوش کرتے حالانکہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک مرغی کو مہوبہ کے پانوں سے کیا تعلق۔

یہ تو میری آنکھوں کا دیکھا ہوا واقعہ ہے اور میں فخریہ کہنے کے قابل ہوں کہ مجھے بھی اکثر لڈو کے ساتھ ناشتہ اتفاق ہوا ہے آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ڈاکٹر نادر اور ایک مرغی کی ہم جلیسی لیکن کوئی حیرت کی بات نہیں سنیے جب ہم لوگ ناشتے کے لیے بیٹھے تو خالہ "لڈو" کو پکار کر آواز دیتیں اور وہ دوڑتی ہوئی آ کر خالہ کی پہلو نشین ہو جاتی خالہ جب پیالی میں چائے انڈیلتیں اور پرچ میں ٹھنڈی کرتیں تو بی لڈو پہلے چکھ لیا کرتیں اور بعد میں کچھ روغنی روٹی ٹوسٹ کے بچے کھچے ٹکڑے بھی نوش فرماتیں اور حسب معمول پان۔

اسی طرح جب میاں بیچو کھانا پکانے کے لیے باورچی خانے جاتے تو لڈو بھی پہنچ جاتیں اور بیچو کچھ گوشت کے ٹکڑے وغیرہ کھلاتا کوئی گیارہ بجے تک یہ پروگرام رہتا اور ٹھنڈی دوپہر میں بی لڈو خالہ والے پلنگ پر آرام فرماتیں

لکھنؤ کے زمانہ قیام میں چند نیولے خالہ کی پولٹری فارم کے دشمن ہو گئے تھے اور انھوں نے لڈو کے دو چار بھائی بہنوں پر ہاتھ بھی صاف کر دیا کرتا تھا مگر اللہ کو بچانا منظور تھا "لڈو" ان موذیوں کے ہاتھ سے بال بال محفوظ رہیں مگر میاں بیچو کی دور اندیشی نے اس کا بھی خدشہ مٹا دیا یعنی بیچو نے رفتہ رفتہ سات نیولوں کا کام تمام کر کے تمام گھر کو مطمئن کر دیا کہ اب "لڈو" کا خدا حافظ ہے "بلی" کا خدشہ نہ کبھی خالہ کو ہوا نہ ہونا چاہیے کیونکہ "بجلی" اس کے دفعیہ کے لیے موجود۔

مراجعتِ وطن پر جب خالہ کا پولٹری فارم بھی آ گیا تو خالہ نے کچھ اور مرغیوں کا بھی اضافہ کر دیا اور پہلے سے کہیں زیادہ دلچسپیوں کا اضافہ ہو گیا "لڈو" کے ناز و نعم اور جاہ و پیار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہی ہوتی گئی اور پروگرام میں کچھ فرق نہ آیا وہی لیل و نہار رہے "لڈو" کے انڈے بھی بٹھائے گئے اور بچے بھی نکلے مگر ؎

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اور حکمِ خدا سے کوئی بچہ زندہ نہ رہا خالہ کو بھی کچھ شک سا ہو گیا تھا اس لیے انھوں نے "لڈو" کے انڈے بٹھا لینے بھی بند کر دیئے ——؟

(۱۹۳۳ء)

شوکت تھانوی کا اپنا روزنامہ

طوفان

اور اس کے چند مندرجات

ڈوبنے کے واسطے کافی ہے اک چلو کی موج
اور ابھرنے کے لئے موجوں کا طوفان چاہیے

روزنامہ طوفان کا اجرا دراصل میرے اس مسلسل خواب کی ایک خوشگوار تعبیر ہے جو اپنی صحافتی زندگی میں اپنی بیداری کی صورت میں یہ دیکھتا رہا ہوں۔ اور اخبار نویسی کا ہر تلخ تجربہ جب شیریں ترین تھا اور جب خوشگوار مستقبل کے بہت سے خواب ان شگفتہ دور برسنے سے پیشتر۔ ۔ ۔ یہ تلخ اور وہ شیریں ترین تلخ آج پوری ہو رہی ہے اور وہ خوشگوار مستقبل آج میرے پیش نظر ہے۔ آج میرے ہاتھ میں میرا اپنا قلم ہے۔ اور میرے دماغ میں میرے اپنے خیالات۔ میں آج مسلم لیگ کا ادنیٰ ہوں یا کانگریس کا [illegible] کانگریس کے مقاصد پر ایمان رکھتے ہوئے مسلم لیگ کی حمایت کی ہے مجھ کو کوئی مجبور کرتا ہے۔ شاید اپنی صحافتی زندگی کے بیس برس اپنے قلم سے دوسروں کے خیالات کی ترجمانی میں بسر کئے۔ مجھ کو ضمیر فروشی بھی کرنی پڑی۔ [illegible] سے بھی زیادہ ذلیل قسم کی قلمی تجارت۔ مگر میں جانتا تھا کہ یہ تو دراصل تجارت نہیں بلکہ [illegible] ہے اور یہ [illegible] کہ دماغ کو بالکل معطل کر کے محض اپنے سرمایہ دار کے اشارے پر چلوں اور قلم کو چلاؤں۔ اس میں شک نہیں کہ حصول معاش کا یہ طریقہ اخلاقی اور اعتباری حیثیت سے خواہ بظاہر کیسا ہی مناسب کیوں نہ ہو مگر حقیقتاً اس میں اور [illegible] کسی کی قسم کے اخلاقی جرائم میں کوئی فرق نہیں۔ مگر دنیا نام ہے اعتبارات کے ایک وسیع دام کا اور میں بھی کاروباری حیثیت سے نہایت جائز طریقہ پر اس ناجائز ذریعہ معاش کو بارہ سال تک اختیار کئے رہا۔ اس لئے کہ میرے حالات نے مجھ کو اس کے لئے مجبور کیا تھا اور میں اپنی مجبوریوں کے احترام کے لئے بھی مجبور تھا۔

بہرحال بارہ سال کی اس ضمیر فروشی نے مجھ کو بہت سے قیمتی سبق بھی پڑھائے ہیں۔ اور ان ہی قیمتی اسباق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں سیاسی عقائد کے اعتبار سے ایک اخبار کا اپنے کسی ایک عقیدے کے لئے وقف کر دینا اصول صحافت کے قطعاً منافی سمجھتا ہوں۔ کسی اخبار کا اپنے کو کسی جماعت کا آرگن کہنا اس کی اخباری شان کے شایان نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس قسم کے جماعتی آرگن اخبار کی تعریف سے علیحدہ ہو کر اشتہار کی تعریف میں آتے ہیں۔ ایک مشتہر تو بے شک یہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنے تمام عیوب کو بھی محاسن کی صورت

میں پیش کرے۔ مگر اخبارات کے لئے یہ ذرا مشکل ہے اور جب وہ اپنی مخصوص جماعت کی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کیا اپنی صحافتی دیانت کو پوری طرح برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی سیاسی جماعت خواہ وہ اپنے مقاصد اپنے افراد اور اپنے اقتدار کے اعتبار سے کیسی ہی مکمل کیوں نہ ہو گی وہ گوشت پوست کے انسانوں کی ہی ایک جماعت ہوگی۔ کوئی خدائی جماعت نہیں ہو سکتی۔ اور ہر انسانی جماعت کے ہر فرد میں خامیاں اور کوتاہیاں بھی قدرتی طور پر ممکن ہیں۔ ایسی حالت میں اس جماعت کے نام پر اخبار کے لئے صرف دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو وہ ان خامیوں کو نظر انداز کر دے یا ان خامیوں کا زبردستی جواز ڈھونڈھے اور درست ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

اب اگر اخبار نے سکوت اختیار کیا ہے تو یہ اس کی مجرمانہ خاموشی ہے اور اگر ناجائز طریقہ پر حمایت کی ہے تو اخبار اپنی اخباری حیثیت سے گر کر اشتہار کے درجہ پر آجاتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ان تمام جماعتی اخباروں کی ہے جو مختلف سیاسی جماعتوں سے اپنے کو منسوب کرتے ہیں۔ عام اس کے کہ وہ کانگریس کے اخبار ہوں، لیگ کے، مہاسبھا کے اخبار ہوں یا جمعیۃ العلمائے ہند کے۔ مگر ان میں سے کسی جماعت نے آج تک یہ دعوے نہیں کیا ہے کہ یہ خدائی جماعت ہے۔ اور جب ان میں سے ہر جماعت انسانوں ہی سے متعلق ہے۔ تو وہ غلطیوں اور خامیوں اور لغزشوں اور کوتاہیوں سے کیونکر غیر متعلق ہو سکتی ہے۔ مگر جماعتی اخبارات اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی جماعت کو تمام عیوب سے پاک اور تمام ممکن خامیوں سے بے نیاز ثابت کرنے میں مصروف ہیں۔ حالات و واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ کاش بجائے اس کے یہ ہوتا کہ اخبارات اپنے ذمہ صرف یہی خدمت سمجھتے کہ ہر جماعت کو اس کی برائیوں اور بھلائیوں سے نہایت دیانتداری کے ساتھ آگاہ کرتے رہتے تاکہ ان کی اصلاح بھی ہو سکے اور وہ اپنی حقیقت سے بھی باخبر رہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تہذیب اور تمدن کے گہوارہ ممالک میں بھی صحافتی دیانت، سیاسی مصلحت کوشیوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہر گتھی بجائے سلجھنے کے الجھتی ہی جاتی ہے۔ ہر حزب فریب تیرہ میں مبتلا ہے۔ اور سیاست نام ہے دروغ مصلحت آمیز کا۔

طوفان اسی ماحول میں نکل رہا ہے۔ مگر اس ماحول سے علیحدہ رہنے کے لئے عزم بھی ہے۔ مگر اس عزم کی تکمیل کا علم خدا کو ہے۔ شعلوں سے کھیل کر دامن کو بچانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر انسان کا ہر ارادہ بشرطِ خلوص اگر خدا پر منحصر ہو کر ذہن میں آئے تو اس کے تکمیل تک نہ پہنچنے کا اندیشہ بھی ایمانی کمزوری ہے۔ اور کم سے کم میں اس وقت جبکہ طوفان کا اجراء خدا کے نام سے ہو رہا ہے۔ اس ایمانی کمزوری کے لئے تیار نہیں ہوں۔

طوفان ہر جماعت کا اخبار ہے اور ہر جماعت کے جائز حقوق کا محافظ مگر اس کے ساتھ ہر جماعت کی خامیوں اور کوتاہیوں کا آئینہ بھی ہے۔ طوفان کے نزدیک ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت واجب احترام ہے۔ مگر طوفان ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی قائل نہیں ہے۔ کہ ان میں سے ہر جماعت یا ان جماعتوں میں سے کوئی جماعت بالکل پاک اور بے عیب ہو سکتی ہے۔ طوفان کے تمام تبصرے اور تمام نکتہ چینیاں بالکل نیک نیتی کے ساتھ محض اصلاحی مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہمیشہ ہوں گی۔ اسی کے ساتھ ہر جماعت کے جائز حقوق کا تحفظ طوفان کا سب سے پہلا صحافتی فرض ہوگا۔ اور اگر اس ارادہ میں نیک نیتی کو دخل ہے تو میرا ایمان ہے کہ خدا مجھ کو اسی جادہ پر استقلال اور ہمت عطا کر کے کامیابی کی منزل کی طرف سلامت روی کے ساتھ گامزن رکھے گا۔

آمین ـ

اس کو طوفان حوادث سے بچاتا ہے سدا
زندہ قوموں سے چھڑی ہے وہ ازل سے

درمیانی خلیج

مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں میں اتحاد و مفاہمت [illegible] کانگریس کا مخالف ہے اور ہندو مسلم اتحاد کی خاطر ملاقات ہوئی تو ہر محب وطن کو خوشی ہوئی [illegible] صورت حال ایسی ہے کہ اخبارات اس ملاقات کے متعلق عجیب عجیب واقعات پیش کئے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلے [illegible] کانگریسی اخبارات کی جانب سے شائع ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے متعلق [illegible] مہاتما گاندھی کی حیثیت سے [illegible] آپ کی روحانی اور اخلاقی پیشوا کی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے [illegible] گاندھی جی کی بلند شخصیت سے خود ہم کو بھی انکار نہیں ہے۔ مگر اس مقالہ کی [illegible] مسٹر جناح سے ملاقات کر کے [illegible] مہاتما گاندھی کا ایثار ہے [illegible] الفاظ دیگر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ گاندھی جی محض وطن کی خاطر اس وقت اس [illegible] بات [illegible] کے لئے بھی تیار ہو گئے کہ وہ مسٹر جناح سے [illegible] مقابلہ گاندھی جی کی [illegible] خصوصیات کا اظہار بھی اسی [illegible] کیا گیا ہے۔ کہ وہ مسٹر جناح سے [illegible] نہیں رکھتے تھے [illegible] جبکہ اس مقالہ کا صرف ایک نتیجہ ہو سکتا ہے کہ لیگ کے اخبارات مسٹر جناح کے متعلق اس قسم کے مقالات لکھیں [illegible] ان کا ایثار قرار دیا جائے۔ چونکہ کانگریسی اخبار اس لیگ والوں کا تعصب [illegible] لیگ والے کانگریسی اخبارات سے شدت کے ساتھ الجھ جاتے۔ یعنی ادھر گاندھی جناح ملاقات ہو رہی ہے اور ادھر درمیانی خلیج کو اخبارات وسیع بنا رہے [illegible] کیا اخباروں کو اس سے بہتر طریقہ ملک کی خدمت کرنے کا نہیں مل سکتا کہ وہ محض اپنی گرمی بازار رکھنے کے لئے ملک میں آگ لگاتے رہیں۔

۱۱ مئی [illegible]

سورج کی جامع تصویر اور مغل آرٹ کا ایک نمونہ

ہندوستان کا وہ زمانہ جب انگلستان ہندوستان کے کپڑے کا محتاج تھا۔ کیا ہندوستان کا مستقبل اس کے گزرے ہوئے دور سے زیادہ شاندار ہو سکتا ہے؟

ہندوستان میں اسلامی دور حکومت کے متعلق متعصب مؤرخین خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانہ کا ہندوستان موجودہ ہندوستان سے کہیں زیادہ خوشحال تھا۔ اس زمانہ میں نہ لوگوں کو فاقہ کشی کرنی پڑتی تھی۔ اور نہ تن ڈھانکنے کے لئے ملک کے باشندے کپڑوں کے لئے ترستے تھے۔

مغلوں کے عہد حکومت میں ہندوستان کی خوشحالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ مغلوں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اس لئے

ہندوستان کا روپیہ ہندوستان سے باہر کسی ولایت کو نہیں جاتا تھا۔ بلکہ ہندوستان ہی میں رہتا تھا۔

مغلوں کے زمانہ میں ہندوستان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جتنے اچھے تعلقات ہندو مسلمانوں کے مغلوں کے دورِ حکومت میں رہے۔ اتنے پھر کبھی نہیں رہے۔ اس زمانہ میں نہ دنگے نہ فسادات ہوتے تھے۔ نہ باجہ اور مسجد کا جھگڑا تھا۔ نہ گائے کی قربانی کا تنازعہ تھا۔ ہندو مسلمان اس طرح رہتے تھے جیسے ایک ماں کے دو بیٹے۔ یا ایک خاندان کے دو ہونہار فرزند۔

مغلوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمانوں میں رواداری کس درجہ بڑھ گئی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہندو اور مسلمانوں میں مذہب کے اختلاف کے باوجود شادی بیاہ کا باہمی سلسلہ بھی قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ مغلوں کے بیشتر حکمران ایسے گزرے ہیں جو ہندو عورتوں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ یہی باہمی شادی بیاہ کا سلسلہ قومی اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کی مثالیں موجودہ دور میں بھی جب کہ لوگ بہت زیادہ آزاد ہو گئے ہیں بہت کم ملتی ہیں۔ غرضیکہ خوشحالی اور رواداری کے اعتبار سے اس زمانہ کا ہندوستان قابلِ رشک تھا

مغلوں کے زمانہ میں ہندوستان کس قدر دولت مند اور خوش حال تھا۔ اس کا اندازہ مغربی مورخین کے مندرجہ ذیل بیانات سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی صنعت و حرفت پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور مغربی مورخ ایچ۔ ڈبلیو۔ ولسن لکھتا ہے کہ

"اٹھارہویں صدی تک ہندوستان کے سوتی اور ریشمی کپڑے۔ انگلستان کے تیار کردہ کپڑوں کی نسبت برطانوی منڈیوں میں پچاس ساٹھ فی صدی کی کفایت سے فروخت ہوتے تھے۔ جب برطانیہ نے دیکھا کہ ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی انگلستان کی صنعت کو برباد کئے دیتی ہے تو برطانیہ میں بعض ہندوستانی کپڑوں کی درآمد قطعاً ممنوع قرار دے دی گئی۔ اور بعض کپڑوں پر ستر، اسی فی صدی تک محصول لگا دیا گیا۔"

گویا اس زمانہ میں انگلستان کو ہندوستانی مال کی روک تھام کے لئے وہی ذرائع اختیار کرنے پڑے جو آج جاپانی مال کے لئے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہندوستانی مال انگلستان کی منڈیوں میں برابر بکتا رہا کیونکہ ہندوستانی کپڑا انگلستان کے امرا کے طبقہ میں فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔

ایک دوسرا یوروپین سیاح ہندوستان کی خوشحالی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"ہندوستان نہایت شاداب ملک ہے۔ اس کے باشندے سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن بہت زیادہ خوشحال ہیں۔ ان کے تمول کا اندازہ ان کی شاندار عمارتوں اور مندروں سے کیا جا سکتا ہے جن میں کروڑوں روپیہ کی دولت پوشیدہ ہے۔"

یہ ہے قدیم ہندوستان کی خوشحالی کی داستان لیکن یہ افسانہ اس وقت کا ہے جب ہندوستان پر ہندوستانیوں کی حکومت تھی اور ہندوستان کا روپیہ ہندوستان ہی میں رہتا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی ہر ایک چیز کس قدر ارزاں تھی۔ اس کی تفصیل کپتان ہملٹن کے سفرنامہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کپتان ہملٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

" گوشت تین فاردجک یعنی چند کوڑیوں میں نصف سیر ملتا ہے۔ ایک ٹن یعنی کئی من نمک ایک کراؤن (۲½ ڈھائی روپیہ)

[illegible] ہوا تھا۔ [illegible] کا رسالہ [illegible] میں ایک پرانی تصنیف سے نقل تھا۔ وہ زمانے میں ایک سوداگر کی چھپائی فروخت ہیں۔ جو ہمیشہ ایک قابل اعتبار شخص سے سنی ہے کہ [illegible] وہ چند چاول جن کا [illegible] ہے۔ وہ چند چیزوں کے نرخوں سے اندازہ لگا لیجئے کہ اس زمانہ کا ہندوستان کس قدر ارزاں تھا۔ دولت کے لحاظ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کا اس زمانہ کا ہر فرد موجودہ زمانے کے دولت مندوں سے بھی بہتر حالت میں تھا۔

ہندوستان کی خوشحالی اور فارغ البالی سے بڑھ کر جب اس زمانہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ہندوستان کا مغلیہ دور ایک ایسا [illegible] دور نظر آتا ہے جس کی مثال [illegible] ملنی ناممکن ہے۔ اکبر نے اور حکومت [illegible] ہندوؤں کو جو اعزازات دیئے گئے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ چنانچہ اس وقت ہندوستان کی تقریباً ہندو ریاستیں موجود ہیں وہ اکبر اور اس کے جانشینوں کی رواداری کی یادگار ہیں۔ مسلمانوں نے ساتھ ہندو عورتوں [illegible] اور وہ اس ماتحت حکومتوں کی صورت [illegible] جو آج بھی [illegible] ریاستوں کی صورت میں نظر آ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ تمام بڑے بڑے عہدوں پر ہندو حکام قابض اور متصرف رہے۔ مشہور ہے کہ [illegible] نہیں ہوا۔ اس زمانہ میں عہدے ہندو اور مسلمان سب سے نہیں دیئے جاتے تھے بلکہ قابلیت اور خدمت گزاری کے صلے میں [illegible] عہدے دیئے جاتے تھے۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور یہاں تک کہ اورنگ زیب بھی اسی دستور پر عامل رہا۔ عہد اورنگ زیب کی ہندو مسلمانوں کی رواداری پر روشنی ڈالتے ہوئے کپتان ہیملٹن لکھتا ہے کہ:

"حکومت کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں۔ اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں۔ جس طرح کہ سابق بادشاہت میں مناتے تھے۔"

یہ تھی ہیملٹن کی رائے اس عہد اورنگ زیب کے بارے میں ہے جس کو متعصب کہا جاتا ہے۔ کپتان ہیملٹن ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ:

"یہاں پارسی بھی رہتے ہیں۔ اور وہ اپنی رسوم زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ وہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں۔ لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں کیا ان کے خیالات اس شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے بڑھے ہوئے ہیں؟"

گویا نہ صرف مغلیہ دور میں مذہبی آزادی تھی۔ بلکہ ہر مذہب کے باشندوں کو اس کی بھی اجازت تھی کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت بھی کریں۔ یہ تھا۔ ہندوستان مغلیہ دور اور اس کی خصوصیت۔

۱۱ مئی ۱۹۳۸ء

مدوجزر

جس وقت لوگ یہ سنیں گے کہ طوفان آگیا۔ خدا جانے بیچاروں کا کیا حال ہوگا۔ بہت سے ایسے ہوں گے۔ جو اس کو دیکھنے کے بجائے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں گے۔ اور تمام اوراد و وظائف بغیر کسی ترتیب کے پڑھ جائیں گے۔ تاکہ طوفان سے محفوظ رہ سکیں۔ بہت سے ایسے ہوں گے۔ جو طوفان کے آنے کا شور سُن کر اپنے بچوں کو کلیجے سے لگا لیں گے۔ اور بہت سے اپنی جورؤں کو۔ کسی کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں گی۔ اور کسی کو یکایک اختناق الرحم کا دورہ شروع ہو جائے گا۔ مگر بعد میں جب سب کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ طوفان دراصل کیا طوفان ہے۔ تو سب ایک دوسرے کا منہ اس طرح دیکھیں گے کہ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ ہم زیادہ بے وقوف بنے یا تم حالانکہ بنے دونوں رہ گئی کمی بیشی وہ حساب دوستاں در دل کے ماتحت آتی ہے

ہر چند کہ یہ طوفان طوفانِ نوح نہیں ہے مگر اس کے مدوجزر سے خدا ہی ود۔ سُواع۔ یغوث۔ یعوق اور نسر کے پرستاروں کو محفوظ رکھے۔ حضرت نوحؑ نے تو اپنی کشتی پر ان باطل پرستوں کو محض اس لئے جگہ نہ دی تھی کہ حق کشتی پر محفوظ رہے گا۔ اور باطل اس طرح غرق طوفان ہو جائے گا۔ کہ نہ کہیں جنازہ اٹھے گا۔ نہ مزار بنے گا۔ مگر اس طوفان میں انتظام یہ کیا گیا ہے کہ کاغذ کی ناؤ ہے۔ جس میں یہ تمام باطل پرست محض اس لئے بھرے جا رہے ہیں کہ ان کو بیچ سمندر لے جا کر ڈبو دیا جائے۔ ایسی صورت میں حق پرستوں کو ڈرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ البتہ باطل پرستوں کو ہر طوفان طوفانِ نوح ہی سمجھنا چاہیئے۔ خواہ وہ کاغذی طوفان ہو یا بحری۔

خیر یہ باتیں تو ذرا ٹھوس قسم کی سنجیدہ تھیں حالانکہ "مدوجزر" کے لکھنے والے جناب کیمون ہارٹ کو ان سنجیدہ باتوں سے کیا تعلق یہاں تو مقولہ یہ ہے کہ ؎

ہر گھڑی پیش نظر اک تازہ طوفان چاہیئے

اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہمیشہ طوفان کا تازہ پیپہ چاہیئے جو جناب کیمون ہارٹ کو چائے کی پیالی سے طوفان اٹھانے کا موقع دے۔ یہ تو ہمارا جلنے کی محض ہے۔ یہاں سلامت روی۔ متانت سنجیدگی اور اسی قسم کی دیگر مصیبتوں کی کیا ضرورت ہے ہمارا کام گدگدانا ہے خواہ "گدگدی ایسی کہ ہنسی آئے یا گدگدی کی شدت سے رونا بہرحال اس کا ذمہ دار "گدگدانندہ" تو ہو ہی نہیں سکتا۔

سیاسی رونا رونے کے لئے اس اخبار کے باقی تمام کالم پڑے ہوتے ہیں بلکہ رونے کے لئے تو تمام ہندوستان ہی پڑا ہوا ہے۔ اور ہندوستان ہی کو کیوں لیجئے، یہ کہیئے کہ اگر کسی کو رونا ہی ہے تو ملک خدا تنگ نیست" مگر اس کالم میں تو رونے والوں کو بھی ہنسنا ہی پڑے گا۔ اور ہنسنے والے تو ہنسیں ہی گے۔ ان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ہم تو اس کالم میں اشکوں کو بھی تبسم کی تعلیم دیا

... ہندوستان کی آدھی سے زیادہ کے تمام مصائب انگریزوں کے پیدا ہونے کا [illegible] ہیں کے جزو ہماری اس [illegible]
[illegible] بے حیا [illegible] ہیں۔ [illegible] ہے۔

مخلص شوکت

(۲)

ہندوستان کے مردوں کا عجیب حال ہے کہ اپنی بہو بیٹیوں کو تو سب پردہ کراتے ہیں۔ مگر اپنی بیوی کے علاوہ دوسری [illegible] نظروں سے دیکھتے ہیں گویا [illegible] زبان سے بھی کہتے ہیں کہ

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے۔

مگر ان کا حال ہے کہ ان کی ہر نظر یہ اعلان کرتی ہے کہ دنیا کی عزت تم سے ہو یا نہ ہو مگر [illegible] عزت [illegible] ہر وقت خطرہ میں ہے۔ بہت سے مغرب زدہ ہندوستانیوں کا خیال ہے کہ مردوں کی اس بدتمیزی کی وجہ پردہ ہے اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو مردوں کی نگاہیں سیدھی [illegible] پردہ عورتوں کو عجیب و غریب چیز بنا رکھا ہے۔ [illegible] کی وجہ سے ان کی نظریں ترسی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب وہ ہر بے نقاب عورت کو [illegible] کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہیں گویا [illegible] نظروں سے ہیں۔

یہ نظریہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر [illegible] تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ہر وہ کام جو چھپ کر کیا جائے عیب ہے [illegible] وہ عیب جو علانیہ کیا جائے اس تہذیب اور تمدن کے دور میں ہنر بن جاتا ہے۔ چنانچہ عورتوں کے سلسلے میں دیکھا گیا ہے کہ کسی برقعہ پوش عورت سے بات کرنا بھی برا سمجھا جاتا ہے مگر ایک بے پردہ عورت کے ساتھ باغ کے تنہا گوشوں میں تنہائی [illegible] طریقہ پر چہل قدمی کرنا سوسائٹی کی نظروں میں کوئی عیب نہیں۔ بلکہ اس کو تہذیب [illegible] میں تفریح کہتے ہیں۔ عورتوں سے بغل گیر ہو کر منظر عام پر ناچنا بھی کوئی غیر شریفانہ حرکت نہیں ہے۔ بلکہ اس کو بڑے آدمی نہایت فخر کے ساتھ ڈانس کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس تہذیب اور تمدن کے دور میں دراصل شرافت ہی انتہائی کمینہ پن ہے۔ چونکہ شرافت کمینہ پن ہے۔ لہٰذا شریف بہو بیٹیوں کا پردہ بھی برا ہے۔ اور اس پردے کے محافظ بھی ایسے مجرم ہیں جن کو پولیس شک و شبہ کی بنا پر گرفتار کر سکتی ہے۔

ہمارے ہندوستانی خیال اور مغرب زدہ ذہنیت میں جو زبردست اختلافات اس سلسلہ میں موجود ہے۔ اس کی تشریح بیکار ہے نئی روشنی کے سودیشی صاحب بہادر لوگ پردہ کو ہر برائی کی جڑ کہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عورت اور مرد کا معاملہ کچھ اور ہی ہے پرچھائیں کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر اس سے خود بھاگ گئے تو وہ آپ کے پیچھے دوڑتی ہے۔ اور اس کے پیچھے بھاگ گئے تو وہ آپ کو برابر و عدت تعاقب دیتی رہے گی۔ بعینہٖ یہی حال عورتوں کا ہے کہ چونکہ مردوں نے خود ان کو گھورنا ان کے حسن پر للچائی نظر ڈالنا اپنے عشق کرنا، اپنے دل کو پھینکنا اور اپنے جذبات اچھالنا اپنا شعار بنا لیا ہے۔ لہٰذا عورتیں ان ناز برداروں سے ناز برداریاں کراتی ہیں۔

اپنی جوانی کی ترنگ پر اُن کے تمام جذبات کا استقبال کرتی ہیں اور اپنی ہر جنبشِ ابرو پر اُن کو نچاتی ہیں حالانکہ اگر مرد یہ خودبینی اور ہیجان انگیزی ذرا بھی چھوڑ دے تو یہی عورتیں اپنے حسن میں چار چاند لگائے ہوئے مردوں کے قدموں پہ آ گریں

پانامہ کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ وہاں اتفاق سے مردوں کی تعداد بہت کم اور عورتوں کی بہت زیادہ ہے۔ اس وجہ سے زیادہ تر عورتوں کو شوہر نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ جو مرد وہاں ہیں۔ وہ چونکہ عورتوں کو بہت پسند نہیں کرتے ان کے حضور اپنا دل پیش کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے حسن سے مغلوب نہیں ہوتے اور اُن کے نسائی تیوروں سے مرعوب ہونا مردانگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہاں کی عورتوں کا حال یہ ہے کہ وہ عورتیں کیا ہیں۔ گویا ہندوستان کے مرد ہیں۔ وہ مردوں کا اعزاز کرتی ہیں مردوں سے اظہارِ عشق کرتی ہیں۔ مردوں کی ناز برداری کرتی ہیں۔ اور اگر ان کو کبھی کوئی مرد دستیاب ہو جاتا ہے تو وہ اس کو تحفہ سمجھتی ہیں۔ گویا بھوکے گِدھوں کے غول میں کوئی لاش آ کر گرے۔ ہندوستان کے مردوں کے منہ میں اس جزیرہ کا حال سن کر پانی بھر آیا ہوگا اور ہم خود ہندوستانی مردوں اور اس جزیرہ کی عورتوں کی باہمی اصلاح کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے مرد اور اس جزیرے کی عورتیں تھوڑے دنوں کے لئے یکجا کر دی جائیں۔ تاکہ ان کی ذہنیت اور ان کی ہوس کا میل جول ہو جس سے مستقل قسم کی آبادی پیدا ہو سکے جو دنیا بھر کے مردوں اور عورتوں کے لئے معیاری قسم کے جذبات پیش کر سکے گی۔

یکم جون ۱۹۳۸ء

(۳)

یہ تو محض ایک شاعرانہ خیال ہے کہ وہ آنسو جو محبوب کے دامن پر گر جائیں۔ ان کی قیمت لعل و گہر سے بھی زیادہ ہوتی ہے ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ آنکھ سے گرا ہوا آنسو بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا ہے۔ اور اگر قیمت ہی رکھتا ہوتا تو یقین جانیے کہ اس بے روزگاری کے زمانہ میں جتنے بیکار گریجویٹ ہیں۔ وہ سب بیٹھے ہوئے رویا کرتے اور اپنے آنسوؤں کی آمدنی سے پیٹ پالتے۔ بلکہ بہت سے باکار انسان جو ہاتھ پیر کی مزدوری کرتے ہیں مزے سے گھر بیٹھے آنکھوں کے اس پانی کی تجارت کرتے اور چین کی بنسی بجاتے مگر اب تک تو آنسو کو نامبارک قسم کا عرق سمجھا گیا ہے۔ البتہ آج یہ سننے میں آیا ہے کہ کوئی بزرگ سر المرتھ رائٹ ہیں جن کی دریافت یہ ہے کہ آنسو میں نہایت قیمتی جوہر ہوتا ہے جو ہر قسم کے جراثیم کو مار سکتا ہے۔

سر المرتھ رائٹ کا یہ روتا ہوا بسورتا نظریہ ممکن ہے کہ غلط ہو مگر قرینِ قیاس ضرور ہے اس لئے کہ فطرت کا انتظام ہی رکھا گیا ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہے۔ تو اس کے پسماندگان اظہارِ غم میں آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دیتے ہیں۔ وہ اپنے نزدیک تو صرف روتے ہیں۔ مگر دراصل ہوتا یہ ہے کہ مرنے والے کے بعد اس کے مرض کے جراثیم کو مارنے کے لئے اشکوں کی کثرت سے ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ یہی جراثیم پسماندگان کو بھی مرحوم و مغفور بنا دیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا اب ان آنسوؤں پر ہی غور کیجئے۔ تو معلوم ہوگا کہ رونا اظہارِ غم کا طریقہ بھی ہے۔ اور ایک لاجواب قسم کا ڈس انفیکٹنٹ یعنی جراثیم بھی

[illegible] آنسو [illegible] ہے [illegible] تجارت [illegible] ہوتے [illegible] ہو جاتا۔

اگر [illegible] ریاست [illegible] درست ہے تو [illegible] بھی تجارت [illegible] امید [illegible] آنسو [illegible] آنسوؤں سے [illegible] ہندوستانیوں کے لئے [illegible] ہندوستان کی صورت ہی رونی [illegible] ہے۔ [illegible] ایسی صورت میں [illegible] سب [illegible] قیمت [illegible] ہندوستان [illegible] جائے گا۔

ضرورت ہے کہ اس ملک کی عورتیں اس تجارت میں خاص حصہ لیں [illegible] آنسو گرا سکتی ہی رہتی ہیں۔ [illegible] پیدا [illegible] بارش [illegible] تجارت [illegible] حاصل ہوگا۔ اور امید ہے کہ اگر آنسوؤں سے جرائم کشی شروع کی گئی تو بہت جلد مختلف [illegible] جرائم [illegible] حالانکہ حقیقت اس انتظام کی ہے کہ دوسرے ملک میں جرائم پیدا ہوتے رہیں۔ اور ہندوستان کے [illegible] تو یہ تجارت کامیاب ہو سکتی ہے۔ مگر امید ہے کہ جس وقت آنسوؤں کی یہ تجارت شروع ہوگی اس تجارت سے [illegible] پیدا ہو جائیں گے۔

۲۰ جون ۱۹۳۶ء

(۴)

امرتسر سے ایک اطلاع موصول ہوئی ہے کہ سیکرٹری صاحب مجلس، اتحادِ ملت نے رستمِ زمان گاماں پہلوان اور رستمِ ہند حمیدہ پہلوان کو دعوت دی ہے کہ وہ نیلی پوش مجاہدین بن کر اپنی سیاسی حیثیت کو بھی نمایاں کر دیں۔ غالباً اس خبر سے اتحادِ ملت کی دوسری حریف جماعتوں میں عجیب کھلبلی پیدا ہو گئی ہو گی۔ اس لئے کہ اگر واقعی یہ دونوں پہلوان لنگوٹ باندھ کر نیلی پوش ہو گئے تو باقی جتنے سفید پوش ہیں۔ ان سب کی خیریت نہیں۔ اور اتحادِ ملت کی حریف جماعتوں کو تو وہ ایسا اٹھا اٹھا کر پٹخیں گے کہ دو ہی دن میں سوائے اتحادِ ملت کے اور کوئی اکھاڑہ باقی ہی نہ رہے گا۔

اب اگر ان سیاسی جماعتوں میں پہلوان بھرتی کئے گئے۔ تو سیاسی کاٹ چھانٹ کی جگہ پر کشتی کے عجیب عجیب داؤں پیچ دیکھنے میں آئیں گے اور جماعت کی طاقت کا اندازہ اُن کے پہلوانوں کی طاقت سے ہوگا اس کے علاوہ اب سیاسی اختلافات اس طرح نہ ہوں گے کہ اخبارات میں مضامین بازی ہو رہی ہے۔ یا پلیٹ فارموں پر تقریر کے جوہر دکھائے جا رہے ہیں۔ بلکہ اب یہ ہوگا کہ اگر اقلیت کو اکثریت سے کوئی شکایت ہے تو ادھر سے گاماں نے خم ٹھونک کر "یا علی" کا نعرہ بلند کیا ادھر سے گونگا پہلوان اپنا کس بل دکھاتا ہوا اکھاڑے میں کودا۔ تھوڑی ہی دیر میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ یعنی کوئی نہ کوئی فیصلہ ہوگا۔ یہ کیا کہ زبان چل رہی ہے۔ اور قلم چل رہا ہے۔ مگر کچھ طے نہیں پاتا۔

پہلوانوں کی سیاسی بیداری کا نتیجہ یہ بھی ہوگا۔ کہ اگر کوئی جماعت عوام میں یا دیہاتیوں میں اپنی تحریک پھیلانا چاہے گی تو اس کا طریقہ صرف یہ ہوگا کہ اس جماعت کے نامی گرامی پہلوان اس طبقہ کو جس میں تحریک پھیلانا ہوگی۔ بیٹھک ڈنڈ مگدر کرائیں گے اور جب وہ کچھ زور کر جائیں گے تو ان کو استادی کا ایک آدھ داؤں بتا کر چھوڑ دیا جائے گا۔ جاؤ جس کو چاہو اٹھا کر دے مارو اور اپنی جماعت کی طاقت کا اعتراف کراؤ۔ پہلوانوں کی سیاسی بیداری کے بعد یہ آل انڈیا کانگریس اور مسلم لیگ سیشن کی قسم کے جلسے نہ ہوا کریں گے۔ بلکہ عظیم الشان دنگل منعقد کئے جائیں گے جن کا اعلان اس طرح ہوا کرے گا کہ:

عظیم الشان دنگل

جس میں اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ طے کرنے کے لئے ہندوستان کے مشہور لیڈر مثلاً رستم زماں گاماں پہلوان۔ رستم ہند حمیدا پہلوان رستم اودھ صادق پہلوان۔ اکھاڑہ جوالا مست۔ رحمن پہلوان جھنڈا سنگھ وغیرہ حصہ لیں گے۔ اور ان ہی کی کشتیوں سے یہ طے پایا جائے گا کہ کونسی جماعت کن حقوق کی مستحق ہے۔ اور کس جماعت کے لئے نیابت کا تناسب کیا ہونا چاہیئے۔

ابھی تو کانگریس کو باوجود گاندھی کا سا سینک سلائی لیڈر ہونے کے اپنی اکثریت پر ناز ہے۔ مسلم لیگ کو مسٹر محمد علی جناح ایسے جوانی رہنما کی طاقت پر فخر ہے۔ اور ہندو مہا سبھا کو ڈاکٹر مونجے ایسے دہان پان لیڈر پر گھمنڈ ہے مگر پہلوانوں کی سیاسی بیداری کے بعد یہ تمام اپنی ہڈیاں پسلیاں بچانے کے لئے سیاسیات سے خود ہی کنارہ کش ہو کر کوئی اور کاروبار شروع کر دیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا جب نہ سہ رنگا جھنڈا لہرا سکے گا۔ نہ ہلال بلکہ قومی جھنڈا محض لنگوٹ ہوگا اور اس کا احترام سب پر واجب ہوگا۔

۳ جون ۱۹۳۸ء

(۵)

حیدرآباد سے ایک اطلاع موصول ہوئی ہے کہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر میونسپل کمشنر اپنے رفقائے کار کی ایک جماعت کے ساتھ ۲ جون کی صبح کو جھاڑو، پنجرا اور ٹوکری لے کر نکلے اور سڑکوں کی صفائی اپنے دستِ مبارک سے شروع کر دی۔ اس منظر کو

[illegible] یہ کہ ہر ایک نے تعجب سے دیکھا ہوگا کہ ایک جنگ بہادر [illegible] ایک میونسپل کمشنر اور [illegible] خاندانی اور عالی [illegible] ہوگیا ہے۔ اور [illegible] افتادہ پڑی ہے [illegible] جھاڑو [illegible] کی ضرورت [illegible] اور جناب [illegible] کشتی کے لئے مجبور ہو پڑا۔ مگر جب [illegible] معلوم ہوا کہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر کا مقصد [illegible] امیر [illegible] سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور [illegible] فرض ہے کہ بہت [illegible] اور ایک ایک جھاڑو دے کر [illegible] ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اپنے اس طرز عمل سے نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے ایک [illegible] ہے اور [illegible] کا نمونہ صرف حیدرآباد ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے میونسپل کمشنروں کے لئے باعث تقلید ہونا چاہیئے۔ میونسپل کمشنری [illegible] سمجھ کر [illegible] روپیہ پانے والے یہ سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔ ہم آج چاہیں گے کہ ہر میونسپل کمشنر نواب مہدی نواز جنگ بہادر کے نقش قدم پر چل کر [illegible] جذبۂ خدمت اور [illegible] ہے [illegible] کمشنر [illegible] ہیں کہ ان کے ۴۰ [illegible] اور [illegible] لوگ [illegible] خدمات [illegible] نہیں [illegible] بلکہ اس [illegible] ہیں کہ [illegible] خدمت خلق کرے۔

نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی قسم کے میونسپل کمشنروں کا ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ صحیح معنوں میں میونسپل کمشنر وہی ہو سکتا ہے۔ جو اسی قسم کے نمونے پیش کر سکتا ہو۔ بلکہ ہماری تو یہ رائے ہے کہ میونسپل کمشنروں کے لئے انتخاب کا طریقہ ہی غلط ہے۔ انتخاب کے بجائے اگر مقابلہ کا امتحان ہوا کرے تو زیادہ مفید ہو سکتا ہے اور اس امتحان میں اسی قسم کے تحریری اور عملی سوالات امیدواروں سے ہوا کریں کہ۔

۱۔ ایک نالی میں چالیس مقامات سے پانی آ کر گرتا ہے۔ اور وہ نالی اس پانی کو چار گھنٹے سے پہلے بڑے نالے تک نہیں پہنچا سکتی تو تم اس کی صفائی کا کیا انتظام کرو گے۔ اور اس کے جراثیم کو مارنے میں کتنی فنائل صرف کرو گے؟

۲۔ اپنے وارڈ کی وصفات کا خط لکھو جس میں دن بھر کا پروگرام واضح کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنی جاروب کشی کے واقعہ کو نمایاں طور پر ظاہر کرو اور اس بات پر روشنی ڈالو کہ جھاڑو دینے سے تمہارا ضمیر کیسا درست رہتا ہے اور جھاڑو دینا کیسی مفید قسم کی ورزش ہے۔

۳۔ تم ایک جھاڑو سے چار فرلانگ کی ایک گلی پندرہ روز تک جھاڑ سکتے ہو تو بتاؤ کہ بیس فرلانگ کی ایک گلی کو جھاڑنے کے لئے اسی مدت میں تم کو کتنی جھاڑوؤں کی ضرورت ہوگی؟

۴۔ اگر تم روزانہ ایک نالی کو صاف کرنے کے بعد چار سو اٹھائیس جراثیم سے پاک کرتے ہو تو بتاؤ کہ تمہارے سات دن کام نہ کرنے سے اس نالی میں کتنے جراثیم پیدا ہو جائیں گے۔

مختصر یہ کہ اسی قسم کے پرچے اور اسی قسم کے عملی امتحان کے بعد جس کے نمبر زیادہ آئیں وہ میونسپل کمشنر ہو جایا کرے یہ کیا کہ انتخاب ہوا روپیہ پانی کی طرح بہا اور ریچرڈ ناٹ صاحب کی قسم کے ممبر منتخب ہو گئے جو بعد میں اپنے ووٹروں کو منہ لگانا تک پسند نہیں کرتے سڑکوں پر جھاڑو دینا یہ معنی!

۰ جون ۱۹۳۳ء

(۶)

کسان زمینداروں کی دولت ہیں۔ اپنی دولت کس کو عزیز نہیں ہوتی اور کون یہ چاہتا ہے کہ اس کی دولت لٹے اور وہ تباہ و برباد ہو جائے مگر خدا بچائے اس نیند سے کہ انسان غفلت کے ساتھ سو جاتا ہے۔ اور اس لئے گھر میں چوری ہو جاتی ہے صاحب خانہ جتنی گہری نیند سوئے گا۔ اسی قدر چور کو چرانے میں آسانی ہوگی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سونے والا یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ سوتا رہے۔ اور اس کی دولت لٹ جائے۔ البتہ یہ تو ایک قسم کی ناگہانی مصیبت ہے کہ ادھر سے نیند آئے اور ادھر سے چور۔ اگر وہ جاگتا ہی رہتا تو چوری کیوں ہوتی۔ اور جب چور نہ آتا تو چوری خود بخود تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ انسان کچھ کھو کر ہی سیکھتا ہے۔

زمیندار غفلت کی نیند سوتے رہے کانگریس نے کسانوں کو اپنانا شروع کر دیا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زمینداروں کی یہ دولت ان کے قبضہ سے نکلنا شروع ہوئی یہاں تک کہ جب کانگریس کے چڑھائے ہوئے کسان اپنے زمینداروں کی جان تک کے دشمن ہو گئے۔ تو زمینداروں نے پہلے تو کچھ کروٹیں لیں پھر کچھ اینٹھے سے ایک آدھ مرتبہ ہاں ہوں کی اور آخر انگڑائی لے کر جو اٹھے ہیں تو دیکھتے کیا ہیں کہ چراغ گل پگڑی غائب ان کی نیند سے فائدہ اٹھا کر کانگریسیوں نے ان کی دولت یعنی کسانوں کو اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے۔ اب تو یہ حضرات بھی گھبرائے اور دوڑے اپنے کسانوں کے لئے کانگریس کے پیچھے۔

کانگریس نے زمینداروں کی نیند سے فائدہ اٹھا کر نہایت آسانی کے ساتھ کسانوں کو اپنایا تھا۔ مگر اب زمینداروں کی بیداری سے وہ اس طرح سٹپٹا گئی ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو ایسے سمجھدار شخص کی سمجھ میں بھی کوئی بات نہیں آتی۔ اور وہ سوائے جز بز ہونے اور زمینداروں پر کٹکٹانے کے اور کچھ نہیں کہتے۔ ان کا جو بیان شائع ہوا ہے۔ اس میں الفاظ تو بہت ہیں۔ مگر مطلب صرف یہ ہے کہ سونے والے آخر کیوں جاگ اٹھے۔ اگر یہ ذرا اور سوتے تو کانگریس ان کو کبھی سو کر اٹھنے کے قابل نہ رہنے دیتی۔ اور یہ نیند موت کی نیند بن جاتی۔ وہ تو یہ کہیے کہ زندگی تھی جو یہ بیچارے جاگ اٹھے۔

کانگریس والے جو زمینداروں کو حلوا سمجھ کر عرصہ سے تناول فرما رہے تھے اور ڈکار تک لینے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ وہی زمیندار اب ایسے کمربستہ ہوتے ہیں کہ کانگریس اپنا کھایا پیا اگلنے کے خطرہ میں مبتلا ہے۔ زمینداروں نے یہ طے

یہ ہے ایک دائرہ کو رہا ہے تاکہ زمیندار ان کے جب ان دونوں واقف رہیں۔ اسلامی لیگ پر پروپیگنڈے سے جو تعصب پیدا ہو گیا ہے اس کا سدباب کرنے۔ ان [illegible] کی تحریک نے کانگریس والوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا ہے۔ اس لئے کھل کر اپنے ہندو لیڈروں کی [illegible] تاکہ ادھر ہی کانگریس [illegible] کا اثر۔ اصل سب کچھ کرتے دھرتے تھے۔ وہ [illegible] کی جمعیت کا نام ہے جو مسلم پشت پناہ [illegible] کے جانے [illegible] سے [illegible] سمجھتے ہیں۔ وہ کل [illegible] سے بے پروا رکھتے ہیں۔ لیکن اب کانگریس [illegible] ۔ [illegible] ۔ ہی جب [illegible] آتے تو [illegible] کانگریس نے ان کے سامنے [illegible] وقت [illegible] اس وقت [illegible] کانگریس والوں کے متعلق [illegible] کیا قائم کر لئے گئے اور کانگریس والے [illegible] چھپ [illegible] گئے۔ شہروں سے [illegible] گئے تھے۔ اب دیہات سے دیکھنا ہے کہ کدھر جاتے ہیں

۰ جون ۱۹۴۳ء

طوفان کی آمد

(طوفان کے خاص شاعر کے قلم سے)

طوفان آتے ہیں گو مٹانے کے لیے
بنیادِ زمانہ کو ہلانے کے لیے
لیکن یہ ہے اپنی نوعیت کا طوفاں
آیا ہے یہ سوتوں کو جگانے کے لیے

(۱۱- مئی ۱۹۳۸ء)

اُردو، ہندی اور ہندوستانی

کہو "آب" اور "جل" کو تم صرف "پانی"
وہ اُردو، وہ ہندی یہ ہندوستانی
زباں ایک ہو گی تو دل ایک ہو گا
یہ کوشش تو اچھی ہے لیکن زبانی

(۱۴- جون ۱۹۳۶ء)

کانپور کی ہڑتال

یہ پٹی عجب کانگریس نے پڑھائی
کہ بھوکے رہو میرے مزدور بھائی
قسم ہے تمھیں اب جو تم مِل میں جاؤ
تم ہڑتا لیے ہو دکھاؤ ڈھٹائی
خود اپنی ہی روزی میں بٹہ لگا کر
بہادر اگر ہو تو چھوڑ دو کمائی
مگر اب تو ہر فاقہ کش چیختا ہے
مرے جاتے ہیں کانگریس کی دہائی

(۱۰- جون ۱۹۳۶ء)

سُوبھاش بابو کا مسلمانوں کو پیغام

اے مسلمانوں کرو تم ایک کام
پہلے تو چپکے سے بن جاؤ غلام
پھر یہ دیکھو ہم تمھیں دیتے ہیں کیا
تم لگاتے کیوں ہو آخر اپنے دام
گھاس کھاؤ یا چنا حاضر ہے سب
ہاتھ میں رکھیں گے ہم لیکن لگام

(۱۵- جون ۱۹۳۶ء)

جناح نہرو خط و کتابت

صلح کی کوشش ہو کیونکر کامیاب
سلطنت جب ہے حجاب اندر حجاب
لیگ نے جو کانگریس کو خط لکھے
آئیں بائیں شائیں ہے اُن کا جواب
(۱۰ جون ۱۹۳۸ء)

مخالفین طوفان سے

تم سے پامال میں ہو جاؤں یہ آسان نہیں
میں کوئی چین نہیں تم کوئی جاپان نہیں
یہ وہ طوفاں ہے جو گنگا بہا لے جائے
خس و خاشاک سے رُک جائے وہ طوفان نہیں
(۲۰ جون ۱۹۳۸ء)

کانگریس والنٹیر کور

جنگجوئی سے ہے نفرت صلح کی تعلیم ہے
کانگریس اک گربۂ مسکیں ہے یہ تسلیم ہے
ہاں مگر کچھ قول میں اور فعل میں ہے اختلاف
امن کا دعوےٰ ہے اور افواج کی تنظیم ہے
(۲۱ جون ۱۹۳۸ء)

بے روزگار شماری

ہونے والا ہے حکم یہ جاری
ایسی فہرست کی ہو تیاری
درج ہوں جس میں سب جو ہیں بیکار
یہ بھی ہے ایک شغل بے کاری
(۲۸ جولائی ۱۹۳۸ء)

منظومات

(گہرستان* کے بعد کا کلام)

دل اب دنیا و مافیہا سے غافل ہوتا جاتا ہے   یگانہ بن کے بیگانوں میں شامل ہوتا جاتا ہے
نظر کو اب ترا نظارہ مشکل ہوتا جاتا ہے   نگہ کے سامنے پردہ سا حائل ہوتا جاتا ہے
مرا ہر رنج اب راحت میں شامل ہوتا جاتا ہے   جسے میں درد سمجھا تھا وہی دل ہوتا جاتا ہے
ہر انساں فرضِ انسانی سے غافل ہوتا جاتا ہے   زمانہ آگ دے دینے کے قابل ہوتا جاتا ہے
مذاقِ بے خودی کا لطف حاصل ہوتا جاتا ہے   دلِ دیوانہ اب ان سے بھی غافل ہوتا جاتا ہے
زمانہ آخر آخر میرا قائل ہوتا جاتا ہے   یہ کل عالم سمٹ کر اب مرا دل ہوتا جاتا ہے
خودی پر بیخودی کا رنگ غالب آتا جاتا ہے   مرا دل رفتہ رفتہ ان کے قابل ہوتا جاتا ہے
جہاں تک امتیازِ حق و باطل اٹھتا جاتا ہے   جنونِ شوق گویا اور کامل ہوتا جاتا ہے
نتیجہ چارہ گر کی کوششِ بیکار کا یہ ہے   کہ محرومی کا میری وہ بھی قائل ہوتا جاتا ہے
سناتا جا رہا ہے ناخدا روداد بچنے کی   سفینہ میرا گویا غرقِ ساحل ہوتا جاتا ہے
میں کرتا جا رہا ہوں جس قدر آسانیاں پیدا   محبت کا معمہ اور مشکل ہوتا جاتا ہے

جہاں تک ڈوبتی جاتی ہے کشتی میری اے شوکت
اسی رفتار سے نزدیک ساحل ہوتا جاتا ہے

---

* مجموعہ کلام

بے حجابی کا تری بزم میں دستور نہیں
ورنہ وہ کون سا ذرہ ہے جو خود طور نہیں

ذوقِ نظارہ کا اس دور میں دستور نہیں
آج موسیٰ بھی وہاں پر ہیں جہاں طور نہیں

موت منظور ہے آ جائے اگر حسبِ مراد
نامرادی ہو تو پھر زیست بھی منظور نہیں

کبھی ویراں کبھی آشوبِ خیالات سے دل
کبھی معمور ہے دنیا کبھی معمور نہیں

دیدنی ہے کششِ ذوقِ ستم کا اعجاز
میں زمیں پر ہوں مگر مجھ سے فلک دور نہیں

جوش کہتا ہے کہ ہر بات انا الحق بن جائے
لیکن اس راز کا افشا مجھے منظور نہیں

صورتِ حال خود افسانہ ہے میرا شوکت
ضبط وہ رازِ محبت ہے جو مستور نہیں

وفا نا آشناؤں سے وفا کی　　خطا کی اور بڑی ہم نے خطا کی
جہاں تک ہو سکا دل کی دوا کی　　اب اس کے بعد جو مرضی خدا کی
بڑھا جاتا ہے جتنا زورِ طوفاں　　گھٹی جاتی ہے ہمت ناخدا کی
خدا جانے اب اس کے بعد کیا ہے　　بقا تو پہلی منزل ہے فنا کی
جسے منزل سمجھ کر میں بڑھا تھا　　وہ گمراہی تھی میرے رہنما کی
کہیں گے حالِ دل اک روز تم سے　　قسم ہے جذبِ جرأت آزما کی
مرادِ عاشقی ہے نامرادی　　دعا کی طرح ہم نے بددعا کی
خدا کی مصلحت سے لڑ رہا ہے　　ذرا ہمت تو دیکھو ناخدا کی
ملی جنت ترے کوچے کے بدلے　　جزا میں بھی ہے نوعیت سزا کی
مگر اب کیا کرے طوفانِ غم کو　　جہاں تک بہہ سکی کشتی بہا کی
سفینے کی تباہی دیکھتی ہے　　خدائی سے لڑائی ناخدا کی

یہی اک مدعا باقی ہے شوکت
ضرورت ہے دلِ بے مدعا کی

شبِ غم فسانۂ غمِ دل کہانی
نہ یہ جاودانی نہ وہ جاودانی

عطا کر گئے مجھ کو مری عمرِ فانی
محبت نے بخشا غمِ جاودانی

نہ گرداب ہے اور نہ موجیں نہ طوفاں
کہاں لے کے ڈوبی ہے مجھ کو جوانی

نہ سُنیے ذرا آج مجھ سے فسانہ
زمانہ سُنائے گا میری کہانی

یہ سب ہے ماتم اور الفت کا سودا
نہ دل میں لہو ہے نہ آنکھوں میں پانی

تم اپنی جفاؤں کی شدت بڑھاؤ
ستم آزما ہے مری سخت جانی

خموشی ہے پردہ درِ رازِ الفت
تکلم بنی ہے مری بے زبانی

مری موت کو جانتے ہی ہو کیا ہے
شبابِ محبت وفا کی جوانی

ہر اک سانس ہے مستقل موت گویا
بسر ہو رہی ہے مگر زندگانی

محبت ہے میری تو سب کچھ ہے شوکت
مری نامرادی مری کامرانی

تخیل سے دامن بچاؤ تو جانیں
تصور میں بھی تم نہ آؤ تو جانیں

محبت کا اک کھیل ہے ناز اُٹھانا
محبت کے تم ناز اُٹھاؤ تو جانیں

میں اپنے فسانہ پہ خود ہنس رہا ہوں
سنو اور اب مسکراؤ تو جانیں

تمھارا بھلانا تو ہے دوسری شے
ہمیں تم ہی خود بھول جاؤ تو جانیں

بھلانے ہو شوکت کو اچھا بھلا دو
اسے بھی نہ تم یاد آؤ تو جانیں

نہ وہ رقصِ ساغر نہ وہ دورِ بادہ
زمانے کا ہے اور ہی کچھ ارادہ
محبت نے گو لاکھ رنگیں بنایا
یہ پھر کا یہ دل میرا اب تک ہے سادہ
ہجومِ مسرت سے گھبرا کے دل نے
غمِ عشق سے کر لیا استفادہ
مسافر ہوں مجھ کو سفر سے غرض ہے
نہ کچھ ہوشِ منزل نہ کچھ فکرِ جادہ
فریبِ نظر سے مفر کب ہے ممکن
محبت کا پھر کر رہے ہیں اعادہ
مرا دل بھی رخصت ہوا مجھ سے کہہ کر
بس اب خانہ آباد دولت زیادہ
تری بزم میں اس طرح آئے شوکت
لبِ مدعا بستہ و دل کشادہ

اثرِ جذبِ دل کو دکھانا پڑے گا
وہ آئیں گے اور اُن کو آنا پڑے گا

محبت کا وہ دَور بھی آ رہا ہے
کہ ہر حال میں مسکرانا پڑے گا

بھلایا تھا جس کے لیے ہم نے سب کچھ
ارے کیا اسے بھول جانا پڑے گا

وہ اپنے کو شاید سمجھنے لگے ہیں
انھیں بھی اب اُن سے چھپانا پڑے گا

خدا ہم کو توفیق دے روٹھنے کی
انھیں آ کے ہم کو منانا پڑے گا

خودداریٔ جنوں کو رسوا نہ کیجیے
ان کا بھی التفات گوارا نہ کیجیے
بیگانہ بن کے بزم میں دیکھا نہ کیجیے
نظروں سے دل کے راز کو افشا نہ کیجیے

جور و جفا تو حسن کے جائز حقوق ہیں
جور و جفا کا شکوہ بیجا نہ کیجیے

امروز کے طلسم کو رہنے ہی دیجیے
للہ آپ وعدۂ فردا نہ کیجیے

زاہد کی ضد ہے کالی گھٹاؤں کو بھول جا
کالی گھٹائیں کہتی ہیں توبہ نہ کیجیے

خود اپنا حسن دیکھ کے انصاف کیجیے
خود اپنی ہی نظر سے تو پردہ نہ کیجیے

کب تک یونہی بہار کا موسم گزاریے
کب تک نہ عزم جانبِ میخانہ کیجیے

دھوکے نہ دیجیے نظرِ التفات سے
سرسبز پھر سے داغِ تمنا نہ کیجیے

محبت کے موئے محبت کے مارے
تم ہی جب نہیں تو جئیں کس سہارے

مجھے ناخدا تیرے احساں نے مارا
میں طوفاں سے بچ کے ڈوبا کنارے

محبت میں اتنا تو دل کو مٹا لوں
جدھر سے میں گزروں مجھے دل پکارے

اگر ہو یہ سودا تو منظور ہم کو
کہ ان کا ہو سب کچھ مگر وہ ہمارے

ذرا دیکھئے موت کترا رہی ہے
میں دریا میں ہوں اور طوفاں کنارے

محبت کی بازی عجب طرح کھیلی
رہا کھیل قائم نہ جیتے نہ ہارے

یہ ہے فرقِ ناز و نیازِ محبت
کہ تم ہو ہر اک کے مگر ہم تمہارے

میں شوکت اسی فکر میں چپ ہوا ہوں
کہ کب تک کوئی چپ رہے دم نہ مارے

پاک نخوت سے کبھی شیخ کا ایماں نہ ہوا
مجھ کو یہ ناز ہے میں معتقدِ یزداں نہ ہوا
موت کا شکر یہی آپ کا احساں نہ ہوا
یہی کیا کم ہے کہ میں طالبِ درماں نہ ہوا
دل میں گھٹ گھٹ کے رہا درد نمایاں نہ ہوا
وہ یہ سمجھے کہ پریشان پریشاں نہ ہوا
اپنی ہستی کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوئی
دل میں جب درد ترا سلسلہ جنباں نہ ہوا
حشر میں بھی مجھے شرم آئی شکوہ کرتے
جس کو ہونا تھا پشیماں وہ پشیماں نہ ہوا
اے غمِ دل تری کس طرح تلافی ہوگی
قبر میں بھی جو کوئی داغ نمایاں نہ ہوا
میری ہستی بھی عجب عقدۂ لاینحل تھی
زیست دشوار تھی مرنا مجھے آساں نہ ہوا
ہم گلستاں میں ہر اک گل کو سکھاتے کھلنا
ہائے اے جوشِ جنوں آج گریباں نہ ہوا
اعتبارات کا پردہ جو اٹھا کر دیکھا
حسن اور عشق میں کچھ فرق نمایاں نہ ہوا
گل و گلزار کی کیا اس کو حقیقت معلوم
گل بداماں جو ہوا شعلہ بداماں نہ ہوا
دستِ وحشت میں خود اپنا ہی گریباں ہوگا
دستِ شوکت میں اگر آپ کا داماں نہ ہوا

ہوش میں آپ نہ اب لائیے دیوانے کو
یہ بدل دے نہ کہیں عشق کے افسانے کو
آپ بیکار نہ سمجھیں مرے مر جانے کو
ختم کرنا تھا یہیں پر مجھے افسانے کو
لوگ ترغیبِ چمن دیتے ہیں دیوانے کو
عالمِ ہوش سمجھتا ہے جو ویرانے کو
آ گیا جب کبھی بدمست ہوا کا جھونکا
توبہ کے ہاتھ میں لرزش ہوئی پیمانے کو
خونِ حسرت ہی سہی خونِ تمنا ہی سہی
ہم نے رنگین بنایا ترے افسانے کو
فصلِ گل آئی تو صحرا میں ہوا جشنِ جنوں
وحشتیں ڈھونڈنے نکلیں ترے دیوانے کو
عشق سے ہم کو ملے تو کہیں فرصت شوکت
انقلاب اور بھی باقی ہیں کئی آنے کو

کاش اس سوز میں کچھ ساز بھی شامل ہو جائے
دل کبھی درد بنے، درد کبھی دل ہو جائے

واں سے اتنی ہی تسلی مجھے حاصل ہو جائے
ان کے قابل نہ سہی میرے تو قابل ہو جائے

جس کو تو دیکھ لے سرتا بہ قدم دل ہو جائے
میں تو میں سارا زمانہ ترا قائل ہو جائے

مجھ کو بیکس نہ سمجھ میری تباہی پہ نہ جا
آج چاہوں تو ترا دل بھی مرا دل ہو جائے

زندگی کیف محبت میں ہے سرشار مگر
موت سے کس نے کہا ہے کہ وہ غافل ہو جائے

ناخدا دیکھ خدائی میں کوئی دخل نہ دے
کیا عجب ہے کہ یہ طوفان بھی ساحل ہو جائے

شمع کا سوز ہے فطرت کی غلط بخشی سے
میں تو کہتا ہوں کہ یہ بھی مجھے حاصل ہو جائے

سانحہ عشق کا وہ عقدۂ لاینحل ہے
کوئی پوچھے تو بتانا مجھے مشکل ہو جائے

جستجو جس کی ہے وہ مل نہیں سکتا شوکت
دل مگر کہتا ہے شاید کبھی حاصل ہو جائے

میں کافر ہوں میں کافر ہوں قسم کھاتا ہوں ایماں کی
کوئی پوچھے مرے دل سے جو ہے توقیر عصیاں کی
مری مایوسیوں نے لاج رکھ لی میرے ارماں کی
جو مشکل پڑ گئی مشکل پسندی ہی نے آساں کی
ذرا عظمت تو دیکھو اس جنونِ فتنہ ساماں کی
بہاریں لے کے آیا ہوں بیاباں میں گلستاں کی
بہار آئی بلاتی ہیں فضائیں اب گلستاں کی
اگر روکے تو بڑھ کر روک لے دیوارِ زنداں کی
پشیمانی نہ دیکھی جائے گی مجھ سے پشیماں کی
اڑا دے جوشِ رحمت دھجیاں تو فردِ عصیاں کی
ذرا سے جام میں کیا غرق ہو جاتا ہے کُل ایماں
جنابِ شیخ کیا قیمت یہی ہے اک مسلماں کی
خدا اور ناخدا ہیں دیکھئے اب کون کام آئے
ادھر میرا عقیدہ ہے ادھر شدت ہے طوفاں کی
اگر صیاد نے میرے نشیمن پر نظر ڈالی
بہاریں لے کے اُڑ جاؤں گا میں صحنِ گلستاں کی

ذوقِ عصیاں دیجئے پھر دوزخی کہہ لیجئے
اپنی کوتاہی کو بھی میری کمی کہہ لیجئے
زندگی کا ہے فسانہ لطف دے گا ہر طرح
میں جو کہنا چاہتا ہوں آپ ہی کہہ لیجئے
یہ خوشامد ہے مرے مذہب میں کفر
سرکشی ہے آپ اس کو بندگی کہہ لیجئے
زیست کی دشواریوں نے ہم کو یہ سمجھا دیا
جو بسر ہو جائے اس کو زندگی کہہ لیجئے
مبتلائے پیچ و خم ہے آج بھی زلفِ ایاز
ہے کوئی ایسا کہ جس کو غزنوی کہہ لیجئے
لب ہلانے کی اجازت ہی نہیں دیتی حیات
وہ غنیمت جانئے جو کچھ کبھی کہہ لیجئے
اک سرور اس میں بھی ہے بے کیفیوں کے کیف کا
تشنگی کو آپ میری مے کشی کہہ لیجئے
پھر لبِ خاموش سے کہنا ہے مجھ کو داستاں
آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے ابھی کہہ لیجئے
اب نیا رخ ہے نئی دنیا نئے علم و ادب
ان نئی تاریکیوں کو روشنی کہہ لیجئے
ماورائے عالمِ ہستی ہیں ان کے واردات
شیخ جی کو اصطلاحاً آدمی کہہ لیجئے
دیکھئے کافور ہو جائے گا دورِ حال بھی
اس کو شوکت چار دن کی چاندنی کہہ لیجئے

خدا کو اب بھول جائیں گے ہم خودی کا سجدہ ادا کریں گے
جنوں کی انتہا یہی ہے یہیں سے ہم ابتدا کریں گے
جفائیں تم آزمائے جاؤ وفا کے خوگر وفا کریں گے
ہمارے سینے میں دل نہیں ہے تو ہم ہی دل کا کہا کریں گے
غرورِ دیوانگی سلامت تو عرض کیوں مدعا کریں گے
طلب کی توہین خود طلب ہے کبھی نہ ہم التجا کریں گے
تم اپنے وعدوں کو بھول کر بھی اگر ہمیں یاد رکھ سکو گے
یہ دل سلامت تو ہم اسے پھر فریب میں مبتلا کریں گے
اگر محبت میں کچھ کشش ہے اگر جنوں کی ہے کچھ حقیقت
ہمارا قصہ جو سن رہے ہیں وہ خود ہم ہی سے کہا کریں گے
خوشی کا تو خیر ذکر کیا ہے ہمارا غم بھی نہ غم رہے گا
ہمارے رونے پہ دیکھ لینا ہمارے آنسو ہنسا کریں گے
محبت اک راز منکشف ہے مگر یہ افشا نہ ہوگا شوکت
یہ ایک پردہ نہ اٹھ سکے گا ہزار پردے اٹھا کریں گے

یہ کس نے کہہ دیا وہ آ رہا ہے   کہ دل ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے
سنبھالو ہوش مجھ کو آ رہا ہے   یہ پردہ بھی اب اُٹھتا جا رہا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کسی کی   میں دل کو دل مجھے سمجھا رہا ہے
وہ عرضِ مدعا پر سرنگوں ہیں   کہ جیسے چاند ڈوبا جا رہا ہے
دہائی ہے فریبِ آرزو کی   توجہ پھر کوئی فرما رہا ہے
بھروسہ ہے مجھے رحمت پہ زاہد   تو پھر تو کیوں مجھے بہکا رہا ہے
میں اپنے دل کی دھڑکن سن رہا ہوں   کہ جیسے دور کوئی گا رہا ہے
قیامت ہے مری مرگِ جوانی   پسینہ موت کو بھی آ رہا ہے
گھٹا توبہ پہ چھائی جا رہی ہے   اور ایماں ڈگمگایا جا رہا ہے
بڑھے آتے ہیں ساحل میری جانب   سفینہ ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

گواہی کون دے محشر میں شوکت

ہمارا دل ہمیں جھٹلا رہا ہے

مری وفا کا کوئی زمانہ کسی زمانے سے کم نہیں ہے
سکون جس کو سمجھ رہے ہو وہ غم اُٹھانے سے کم نہیں ہے
بلا بلا بے قراریوں کو کہ اب وہی ہیں سکونِ خاطر
تری تسلی تری تشفی بھی دل دُکھانے سے کم نہیں ہے
یہ کونسا میکدہ ہے آخر جہاں مجھے لائی ہے محبت
کہ اس جگہ کا ہر ایک ساغر شراب خانے سے کم نہیں ہے
خدا ہی جانے کہ کیا سمجھ کر ہوئی یہ فطرت کی دستکاری
میں کہہ رہا تھا مرا بنانا مرے مٹانے سے کم نہیں ہے
نہ کھاؤ دھوکہ نہ کھاؤ دھوکہ کہ غم کی موجوں میں غرق ہوں میں
فلک کو یوں بار بار تکنا بھی سر جھکانے سے کم نہیں ہے
سمجھ کے آ جا رہِ وفا پر سنبھل کے چل راہِ زندگی پر
کہ اس جگہ ہوشیار رہنا فریب کھانے سے کم نہیں ہے
مصیبتوں کا مقابلہ کر مصیبتوں ہی میں زندگی ہے
کنارِ ساحل میں جا کے چھپنا بھی ڈوب جانے سے کم نہیں ہے
جنابِ شوکت خموش کیوں ہیں کھُلا نہیں ہے یہ راز اب تک
خود ان کا افسانۂ محبت کسی فسانے سے کم نہیں ہے

خموشی کہہ رہی ہے جانے کیا کیا
لب بے مدعا کا مدعا کیا

محبت کیا، وفا کیا اور جفا کیا
یہ سب دھوکے ہیں دھوکوں کے سوا کیا

نہ وہ سمجھے نہ میں سمجھا ہوا کیا
نگاہوں نے نگاہوں سے کہا کیا

جبیں کیا، سجدہ کیا، وہ نقش پا کیا
ان ہی رسموں سے ہوگا حق ادا کیا

علاج اس کا بتا اے رہنما کیا
اگر یہ درد دل ہے تو دوا کیا

میں خود کشتی ڈبونے جا رہا ہوں
ارادہ ہے ترا اے ناخدا کیا

نقاب اٹھنے ہی تک تھی سب پہ حیرت
نقاب اٹھی تو کوئی دیکھتا کیا

جفا ہے اور جفائے دوست ہے یہ
روا کیا اور اس میں ناروا کیا

وہ رہ رہ کر ہر اک سے پوچھتے ہیں
یہ شوکت تھانوی کو ہوگیا کیا

درِ جاناں پہ جبہ سائی ہے
اب خدائی مری خدائی ہے
بے قراری ہے جو نوائی ہے
زندگی موت بن کے آئی ہے
لاکھ پردوں میں اس کو دیکھ لیا
عشق نے کب نگاہ پائی ہے
کعبہ اور عرش کس کو کہتے ہیں
ان کے در تک مری رسائی ہے
جس پہ ہنستی ہے دوریٔ منزل
وہ ہماری شکستہ پائی ہے
شب کو دورِ سرود و ساغر و مے
صبح ہنگامِ پارسائی ہے
وعدۂ دید اور حشر مگر
یہ خبر بھی سنی سنائی ہے
بارِ ہستی کا شکوہ کیا شوکتؔ
یہ ہوا کس کو راس آئی ہے

خیال و خواب میں دنیا بسا رہا ہے کوئی
بچھڑ کے سے مگر یاد آ رہا ہے کوئی
نگاہِ شوق سے بچ بچ کے جا رہا ہے کوئی
سکونِ زیست کو طوفاں بنا رہا ہے کوئی
وفائے عشق کو ان بے اصولیوں سے کیا
کہ حق کسی کا ہے اور داد پا رہا ہے کوئی
غرورِ حسن و وفا قابلِ پرستش ہے
لبوں پہ آہ ہے اور مسکرا رہا ہے کوئی
یہ ہو نہ ہو مرا افسانۂ محبت ہے
سنا رہا ہے کوئی مسکرا رہا ہے کوئی
یہ وصل ہے کہ جدائی میں کیا کہوں اس کو
قریب تر ہے مگر بچ کے جا رہا ہے کوئی
خدا ہی جانے کہ کانٹوں سے کیا شکایت ہے
کہ اب گلوں سے بھی دامن بچا رہا ہے کوئی
فلک حریفِ وفا بدنصیب دلِ بیتاب
نئے نئے مجھے منظر دکھا رہا ہے کوئی
تمام حسن و جوانی تمام رنگینی !
بری طرح سے مجھے یاد آ رہا ہے کوئی
فریبِ کشتی و ساحل نہ کھائیے شوکت
کہ ساتھ ساتھ ہی طوفاں بھی آ رہا ہے کوئی

بدلیاں دن کی گھٹائیں رات کی
زندگی ہے زندگی برسات کی
توبہ کی آتے ہی رُت برسات کی
کی مگر اک بے محل سی بات کی
میرے دیوانے نے جس سے بات کی
پوچھی گردن کی تو سن لی رات کی
تم تصور میں ہوئے تھے ہمکلام
سوچتا ہوں میں نے کس سے بات کی
رو رہا ہوں میں ہنسے دیتے ہیں وہ
کتنی پیاری ہے فضا برسات کی
یاالٰہی کونسا عالم ہے یہ
چھائی ہے دن پر سیاہی رات کی
حشر میں کیا آتے خالی ہاتھ ہم
لائے ہیں اک فرد الزامات کی
کیا ہوا دل کو الٰہی خیر ہو
کچھ کمی پاتا ہوں محسوسات کی
مستقل جذبات بن کر رہ گئی
یاد اک غارت گر جذبات کی

اس طرف بحر ندامت موج زن
اس طرف اک فرد الزامات کی
میں ہوں شوکتؔ اور مری تنہائیاں
حد نہیں ہے ان کے احسانات کی

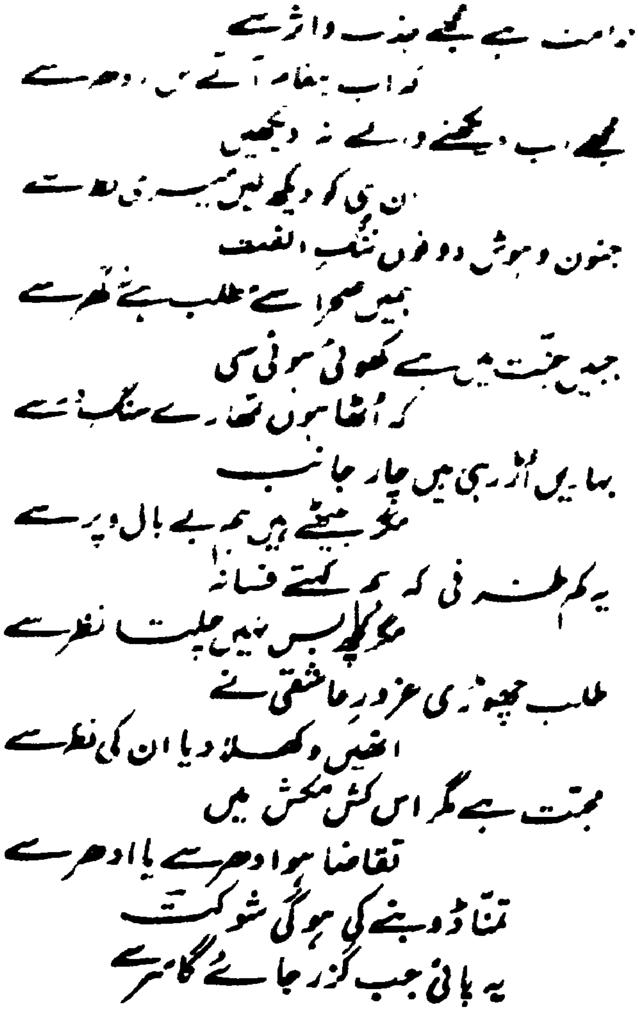

ندامت ہے مجھے جذب و اثر سے
کہ وہ اب بے اختیار آتے ہیں ادھر سے
مجھے اب دیکھنے دو یہ نہ دیکھیں
ان ہی کو دیکھ لیں میری نظر سے
جنون و ہوش دونوں تنگِ الفت
ہمیں صحرا سے مطلب ہے نہ گھر سے
جبیں جنت میں ہے کھوئی ہوئی سی
کہ اٹھا ہوں تمہارے سنگِ در سے
ہمائیں اُڑ رہی ہیں چار جانب
مگر بیٹھے ہیں ہم بے بال و پر سے
یہ کم ظرفی کہ ہم کہتے فسانہ
مگر کچھ بس نہیں چلتا نظر سے
طلب چھوڑی غرورِ عاشقی نے
انھیں دکھلا دیا ان کی نظر سے
محبت ہے مگر اس کشمکش میں
تقاضا ہو ادھر سے یا اُدھر سے
تمنا ڈوبنے کی ہو گی شوکت
یہ پانی جب گزر جائے گا سر سے

تجھ سے اب اپنے سے بھی بیگانہ ہونا چاہیے
بس ترے دیوانہ کو دیوانہ ہونا چاہیے
حشر کے دن ہاتھ میں پیمانہ ہونا چاہیے
کم سے کم یہ جرأت رندانہ ہونا چاہیے
تم ہو عنوان محبت تم ہو عنوان حیات
اب مرے افسانہ کو افسانہ ہونا چاہیے
جب کبھی برسے تو دنیا غرق مے ہو کر رہے
ہر گھٹا کے ساتھ اک مے خانہ ہونا چاہیے
میں ترا دیوانہ بن کر تجھ سے بیگانہ بنا
اب تجھے میرے لیے دیوانہ ہونا چاہیے
ہر نظر میں تم ہی تم ہو ہر طرف ہو تم ہی تم
جب تم ہی تم ہو تو پھر پروانہ ہونا چاہیے
طالب دیدار بننا ننگ ہے اے جذب عشق
خود نظر کو جلوۂ جانانہ ہونا چاہیے
شیخ تو واقف بھی ہے آداب میخانہ سے کچھ
توبہ کرتے وقت بھی پیمانہ ہونا چاہیے
یاد فرماتے ہیں شوکت کو وہ اپنی بزم میں
ہر قدم پر سجدۂ شکرانہ ہونا چاہیے

ہوں بے حسیٔ عشق کا ساماں لیے ہوئے حسرت لیے ہوئے ہوں نہ ارماں لیے ہوئے
وہ جس طرف گئے رخِ تاباں لیے ہوئے ہم دیکھتے رہے دلِ حیراں لیے ہوئے
کس کی طرف اٹھاؤں نظر کس کو چھوڑ دوں اک زندگی ہے سیکڑوں ارماں لیے ہوئے
کم مائیگیٔ اشکِ ونت پر نہ جائے قطرہ ہے بحر، بحر ہے طوفاں لیے ہوئے
اے زاہد و گناہ مجھے بخشوائیں گے بیٹھے رہو تقدسِ ایماں لیے ہوئے
ہر پھول دے رہا ہے مجھے دعوتِ جنوں عریانیاں بجائے گریباں لیے ہوئے
آئینہ دیکھتے ہیں ہمیں دیکھتے رہو ہم بھی کھڑے ہیں دیدۂ حیراں لیے ہوئے
سوغات لے کے آئے ہیں دیوانگانِ شوق ہاتھوں میں چند تارِ گریباں لیے ہوئے
ہوتا ہے لمحہ لمحہ سکوتِ فراق کا نیرنگیٔ حیات کے عنواں لیے ہوئے
کانٹوں سے تصفیہ ہے یہ اب اہلِ ذوق کا دامن دئے ہوئے ہیں گریباں لیے ہوئے

دن کٹ گیا بلاؤں کا شوکت تو کیا ہوا
آئی ہے رات خوابِ پریشاں لیے ہوئے

نیم باز آنکھوں میں بیداریِ خواب آلودہ
ہائے یہ نرگسِ بدمستِ شراب آلودہ
دل میں ایک موج ہے اور پائے طلب میں چھالے
ایک سیلاب ہے اور وہ بھی حباب آلودہ
ہائے وہ پہلے پہل قول و قرارِ الفت
تیری آواز تھی اس وقت رباب آلودہ
اسی صیاد کو بلبل نہ بنا دوں تو سہی
ایک ایسی ہی بہار اور گلاب آلودہ
اپنے ہر گام پہ منزل کا گماں ہوتا ہے
میری منزل بھی ہے کس درجہ سراب آلودہ
شرم رکھ لی ہے مرے ذوقِ نظر کی تو نے
مجھ کو جلوہ بھی دکھایا تو نقاب آلودہ
عمر بھر کے لیے پیمانِ وفا لیتی ہے
اک تری چشمِ کرم وہ بھی عتاب آلودہ
ہیچ دنیا ہے کرم اس کی نظر میں اے دوست
جس نے دیکھی ہے تری چشمِ عتاب آلودہ

شاعر کی بیوی

شاعری اور پیٹ کا دھندا عجب ڈھب جان سے تنگ ہیں بیوی اور بچے سب کے سب
فاعلاتن فاعلاتن بیٹھ کر کرتے ہیں جب اہلیہ کو یاد آتی ہے بیماری بے سبب
اک سروتا ہاتھ میں اور پاندان اپنا لیے
سر پہ آ جاتی ہیں لڑنے خاندان اپنا لیے
ایک لڑکا جس کو پچھلے چار دن سے ہے بخار ایک لڑکی جس کی آنکھیں دکھ چکی ہیں بار بار
تیسرا جو ٹھیک ہے وہ رو رہا ہے نابکار شامتِ اعمال کی ہر قسم ہے سر پہ سوار
شاعرِ شیریں بیاں بیٹھا ہے گھبرایا ہوا
ذہن میں ہے طرح کا مصرع بھی بولایا ہوا
وہ یہ کہتی ہیں کہ جائے بھاڑ میں یہ شاعری ایڑی چوٹی پر کروں قربان یہ کاریگری
اتنے دن سے کوئی بھی پیسہ ملا سوچو ذری یاد کر لو خود دسمبر، جنوری پھر فروری
تم ہی سوچو کس طرح ہوگا ہمارا اب نباہ
مجھ کو روٹی چاہیے اور تم کو خالی واہ وا

میں یہ کہتا ہوں کہ اے شمعِ شبستانِ حرم   تو ہے اک شاعر کی بیوی کیا ہے یہ اعزاز کم
تجھ کو کیا معلوم میرا مرتبہ میرا حشم   گھر کے باہر دیکھ چل کر کس قدر ہوں محترم
تو سمجھتی ہے مجھے یوں ہی سا اک انسان ہوں
اے مری نادان بیوی میں ادب کی جان ہوں

جان وہ اپنی جلا کر منہ چڑھاتی ہیں مجھے   منہ چڑھا کر میرا آئینہ دکھاتی ہیں مجھے
گھر کی جو حالت ہے وہ سب کچھ بتاتی ہیں مجھے   شرم میری شاعری پہ پھر دلاتی ہیں مجھے
وہ یہ کہتی ہیں کہ شاعر تو یقیناً آپ ہیں
لیکن ان بچوں کے بھی تھوڑے بہت تو باپ ہیں

شاعری کرتے ہیں اور بھولے ہوئے ہیں شوہری   کوئی دھندہ بھی نہیں کرتے نہ کوئی نوکری
باپ دادا کی کمائی بھی نہیں گھر میں دھری   میں تو پلے بندھ کے اک شاعر کے جیتے جی مری
یہ نحوست شاعری جس کلموہی کا نام ہے
مجھ سے پوچھو یہ نکھٹو مردوؤں کا کام ہے

میں گئی چولہے میں حلیہ دیکھئے اپنا ذرا   جیسے خود رو گھاس ہو خط اس طرح سے ہے بڑھا
جیسے اک قیدی جو کاٹے کوئی لمبی سی سزا   مرحبا اے شاعرِ رنگیں بیاں صد مرحبا
بھاڑ میں جائے یہ تیری شاعری یہ تیرا فن
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

مری

اے مری اے گرمیوں میں اہلِ دولت کے وطن　　اے چمن اندر چمن اور اے چمن در پے چمن
اف تری رعنائیاں اللہ رے یہ بانکپن　　جنتِ کشمیر کی بیشک ہے تو چھوٹی بہن
یوں تو کہنے کو زمانہ میں ترا ثانی بھی ہے
تجھ میں خوباں بھی بہت ہیں اور خوبانی بھی ہے

عاشقوں کی سرد آہیں مفت کی ملتی ہیں یہاں　　سرد مہری سیکھنے آتے ہیں سیمنان جواں
سیکھتی ہیں آسماں سے ظلم تیری چوٹیاں　　کجروی میں خود ہی ماہر ہیں تری پگڈنڈیاں
اہلِ دل کے واسطے المختصر تو موت ہے
بلکہ جنت تک یہ کہتی ہے کہ میری سوت ہے

حسن بھی گو حسن ہے لیکن عجب مردانہ وار　　وہ حسیں جو ہیں سمندِ ناز کے گویا سوار
لے کے اب ٹھوکر اٹھانے کے وہی سب گلعذار　　کھیلتے پھرتے ہیں تیرے گوشہ گوشہ میں شکار
ایسا عالم تیرا ہوتا ہے مئی اور جون میں
بیبیاں بھی چلتی پھرتی ہیں یہاں پتلون میں

وہ حسینائیں قمیصوں میں جو ہوتی ہیں بھلی　　وہ لیڈی بوائز جو صاحب تو ہیں لیکن چلبلی
چال بے ڈھنگی ادائیں بے تکی [illegible]　　اس جگہ کثرت سے ملتی ہے ان ہی کی فیملی
یہ مری کے واسطے خود مستقل جنجال ہیں
اے مری کی مال تیرے سب یہی تو مال ہیں

زندگی ہی زندگی ہے نام ہے لیکن مری　　خود ہی کوہِ قاف ہے تو اور خود اس کی پری
مال پر اللہ اکبر حسن کی کاریگری　　عشق پر طاری ہے جس کو دیکھ کر اک تھرتھری
یہ بناوٹ یہ سجاوٹ یہ نکھار اور یہ پھبن
اے مری اے گرمیوں میں اہلِ دولت کے وطن

آٹا

حضرتِ آدم پہ جو گزری ہے سب کو یاد ہے   دانۂ گندم کی زندہ آج تک بیداد ہے
آج پھر اولادِ آدم پر وہی افتاد ہے   اس کا بانی بھی فرشتوں کا وہی اُستاد ہے
دور دورہ آج اس کا چور بازاروں میں ہے
ماہرینِ چور بازاری کے غم خواروں میں ہے
اُن میں دیکھا اس کا جلوہ جو ذخیرہ باز ہیں   دفن تہ خانوں میں جن کے بوریوں کے راز ہیں
بوریوں سے ملتے جلتے توند کے انداز ہیں   اور فریاد و بکا میں سب کے ہم آواز ہیں
توند پر ہے ہاتھ اور فاقوں سے حالت زار ہے
ان کو ایندھن اس جہنم کے لیے درکار ہے
ہو گیا بازار سے آٹے کا ایسا انتقال   اب کھلے بازار میں آٹے کا ملنا ہے محال
لہلہاتی کھیتیوں کے دیس میں کیسا یہ کال   کال کی حیرت ہے پاکستان میں گل جائے دال
دستِ قدرت سے چھنا آزار کا ہر اختیار
فقر و فاقہ کا بنا انسان خود پروردگار

اک ذخیرہ بازِ مولانا نما دوکاں دار   قوم تھی اس ابتلا سے کل بہت تھے بیقرار
آہ اس قلت کا کیوں گیہوں پہ ہے دارومدار   کوش خالی باجرا یا کاش یہ کھائی جوار
جس کے کھانے کے لیے نعمت ہزار موجود ہے
دانۂ گندم جسے گیہوں کہو بد مقصود ہے

کچھ جو پوچھو تو گیہوں شیطان کا راشن ہے یہ   جس نے جنت لوٹ لی انساں کا وہ دشمن ہے یہ
حضرت آدم کے تو شان کا مدفن ہے یہ   الغرض اجداد انساں کا فقط بدظن ہے یہ
حیف ہے انسان کر دے جس پہ جنت تک نثار
سب کو گندم سے بچانا اے مرے پروردگار

سیکڑوں من ہوں تو گیہوں میرے تہ خانے میں ہے   اور مزا بھی کیا مجھے آزار پہنچانے میں ہے
میرے حصے کی وہی مے ہے جو پیمانے میں ہے   ہاں مگر دوزخ جو ہے گیہوں کے پروانے میں ہے
جس نے گیہوں کھا لیا دوزخ میں گولے کھائے گا
جس کو جنت چاہیے وہ صرف چھولے کھائے گا

کراچی کی بسیں

دلربا اے نازنینو! اے کراچی کی بسو
تم پہ صدقہ ہو کے ہم مر جائیں بسیں تم جیو
کج روی بھولے فلک اب چال تم ایسی چلو
ہم تو خود ہی چل بسیں گے تم مگر چلتی رہو

تم پہ ہم عشاق کا چلتا نہیں جب کوئی بس
بیٹھ کر پڑھتے ہیں ہم اللہ بس باقی ہوس

کاش اپنے عشق کے ماروں کا کرتیں تم شمار
جو ہر اک اڈے پہ لٹکے ہیں قطار اندر قطار
اپنے پہلو میں دبائے اک دلِ بے اختیار
اور نظروں سے گرائے زندگی کا اعتبار

اس قدر لمبی قطار اور زندگانی مختصر
گھر پہنچنے سے تو ہے آسان دنیا سے سفر

اور اگر گھل مل کے ہو جائیں کبھی ہم باریاب
گھر پہنچنے کی دعا گڑبڑ میں ہو کر مستجاب
شرم سے شائستگی گرمی سے ہم ہوں آب آب
زندہ باد اس بس کے اندر آئے دیکھیں انقلاب

دیکھنا چاہیں اُسے گردن میں بانہیں جس کی ہیں
جسم تو اپنا ہے لیکن اس میں ٹانگیں کس کی ہیں

منہ لٹکے ہیں ہر کسی کے سر او پر ہیں سوار ہو جو گنجی [illegible] تو [illegible]
دو لب پہ جو بیٹھے کانوں سے [illegible] تک ہو تکرار [illegible]

آ رہا ہے [illegible] طرح خانہ [illegible] سے چپے

وہ [illegible] جس طرح بوتل [illegible] سے چپے

سامنے والے کی میری ٹھوڑی [illegible] ہے جس جگہ [illegible] ہوں وہ کمرا [illegible] ہے
تم نشیمن تم سے [illegible] ہے جب کوئی [illegible] ہے تو مطلع صاف ہے

پڑ گئے پار کرنے والا ہجوم سے گیت

اور کنڈکٹر یہ کہتا ہے کرایہ کر ادا

ہو کے چلتا چور اترے بس سے بادل خراب جیسے بندر کود جھپٹے منڈیری سے کتاب
اس زبوں حالی پہ بھی خوش ہیں کہ ہم ہیں کامیاب مل گئی ہے گویا جنت جیسے کہ یوم الحساب

رات بھر یہ بس رہے گی ذہن پر اپنے سوار

صبح دم ہم پھر وہی ہوں گے وہی اپنی قطار

الوداع

چور بازاری گرانی الوداع
دودھ میں سے نل کے پانی الوداع
گھی کے اندر موبل آئل الفراق
تیری معدوں میں روانی الوداع
اب کہاں مکھن پہ مرہم کا گماں
اے گمان بدگمانی الوداع
اے پسی اینٹو نہیں مرچوں میں تم
تم نے بھی رحلت کی ٹھانی الوداع
اے انیس بے کساں آٹے کی ریت
ہو گئی تو بھی کہانی الوداع
الفراق اے شورہ پشتی الفراق
خندہ گردی آنجہانی الوداع
کیسی بے بس ہو گئی کنڈکٹری
ہائے وہ چنگیز خانی الوداع
دم بخود ہیں ٹکسی والے سب کے سب
اُف وہ اُن کی بدزبانی الوداع
اب صفائی خود ہمارا فرض ہے
الوداع اے مہترانی الوداع
سچ تو یہ ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس
الوداع اے من کی مانی الوداع

شہادتِ عظمیٰ

آندھی تھی وہ یہاں کہ ہو قرآن منتشر   عصیاں کا ایسا دور کہ ایمان منتشر
مقصد تھا یہ کہ اب ہوں مسلمان منتشر   ازبس کہ سب تھے سخت پریشان منتشر
رشتے تمام توڑ کے پروردگار سے
سب لو لگا چکے تھے فقط شہریار سے

وہ شہریار نشۂ نخوت میں جو تھا چور   باطل پرست حق و صداقت سے دور دور
جام و سبو میں غرق کیے اپنا ہر شعور   معبودیت کے زعم میں اک پیکرِ غرور
اس کو تھا یہ گھمنڈ کہ فرمانروا ہوں میں
سودا یہ ہو گیا تھا کہ شاید خدا ہوں میں

وہ چاہتا تھا کوئی نہ ہو اس کا نکتہ چیں   اس کے حضورِ عجز سے سب کی جھکے جبیں
اس کے اثر سے کوئی بھی باہر نہ ہو کہیں   ڈر تھا کہ اک حسینؑ ہیں اور کوئی بھی نہیں
بیعت طلب تھا سبطِ رسالتمآب سے
ذرہ خراج خواہ بنا آفتاب سے

کس طرح کوئی کفر کو ایمان سونپ دے   شیطاں کو کون وہ ہے جو قرآن سونپ دے
فاسق کو کعبہ اس کا نگہبان سونپ دے   فاجر کو دین اپنا مسلمان سونپ دے

یہ حوصلہ کہ دینِ محمدؐ خرید لے !
بیعت حسینؑ ابنِ علیؑ سے یزید لے

یہ دستِ حق پرست ہو دستِ یزید میں   اسلام کی شکست ہو دستِ یزید میں
کعبہ کا بند و بست ہو دستِ یزید میں   اسلام جا کے پست ہو دستِ یزید میں
ان ذلتوں کا اور ہو یارا حسینؑ کو
تھی موت ان کے بدلے گوارا حسینؑ کو

وہ سوچتے تھے آج جو ہوتے یہاں رسولؐ   کیا ان مطالبات کو کر لیتے وہ قبول
واقف ہے خود یزید بتایا ہے کیا اصول   پھر بحث اس نے چھیڑی ہے یہ ہم سے کیا فضول
کیا واقعی نہیں ہیں ٹھکانے اب اس کے ہوش
سمجھا ہے اس نے ہم کو بھی شاید خدا فروش

میں بیچ دوں رسول کی غیرت، نہیں نہیں   قرآں کی اور ختم ہو عظمت، نہیں نہیں
ہو داغ دار کعبہ کی حرمت، نہیں نہیں   میں اور کروں یزید سے بیعت، نہیں نہیں
سن لے بگوشِ ہوش کہ انکار ہے مجھے
اور ایک بار ہی نہیں سو بار ہے مجھے

اب کیا تھا اک گھٹا سی اٹھی فوجِ شام کی   کوندی افق پہ برق سی اک انتقام کی
ہر چند تھی وہ فوج بڑے احتشام کی   خاطر میں اس کو لائی نہ عظمت امامؑ کی
کثرت سے کیا ڈرے کہ جو وحدت پرست ہو
یہ عزم وہ نہ تھا کہ جو اس طرح [illegible]

دشمن نے اپنے مورچے پیچھے لگا دیے مورچے جہاں تھے وہاں کچھ بڑھا دیے
مجبور کر چکے ہیں یہ تیور بتا دیے پانی پہ بھی لعین نے پہرے بٹھا دیے
کوئی نہ بوند جائے کسی نونہال تک
سیرابیوں کا آسرا نہ ان کو خیال تک

عباسؑ کو تھا ضبط دلاور بپھر گئے اکبرؑ بھی جنگ چھیڑنے کو سنور گئے
قاسمؑ کچھ ایسے طیش میں آئے ٹھہر گئے اب بھی مگر حسینؑ تھے جو ضبط کر گئے
سب کو دیا یہ حکم کہ دیکھو پہل نہ ہو
ہو ابتدا ادھر سے تو بیشک جواب دو

تیر اس طرف سے اور ادھر سے جری چلے خیبر شکن کا عزم لیے حیدری چلے
شایانِ شاں بھی جن کے لیے سروری چلے کس شان سے حسینؑ کے یہ عسکری چلے
ایک ایک جائے ہونے لگا رن میں سرخرو
دل کا حسینؑ اپنے نچوڑا کیے لہو

قاسمؑ نے گر کے رن سے پکارا حسینؑ کو جیسے کسی نے تیر سا مارا حسینؑ کو
ہر چند تھا نہ ضبط کا یارا حسینؑ کو دیتی تھی بے کسی ہی سہارا حسینؑ کو
غلطاں تھا خاک و خوں میں بیٹی کا اب سہاگ
لب پر خدا کا شکر تھا سینہ میں ایک آگ

بھائی کی لاش پر بھی کیا شکر ہی ادا دل کا ہو جو بھی حال زباں پر تھا مرحبا
عباسؑ میرے بھائی جو کرنا تھا وہ کیا دیکھو تو مجھ کو تم کو سکینہ کا واسطا

بے شک سلام کے لیے اب مت اٹھاؤ ہاتھ
لیکن خدا کے واسطے چھوڑو نہ میرا ساتھ
ہم شکلِ مصطفےٰؐ کی اٹھا لائے جا کے لاش　　محکم تھا اب بھی عزم نہ تھا اب بھی ارتعاش
وہ مر چکے تھے اور یہ کہتے تھے زندہ باش　　ہوتا مرا شباب سرافرازیاں ہی کاش
یا رب تو جانتا ہے یہ میری کمائی ہے
اور یہ کمائی نام پہ تیرے لٹائی ہے
جب مرتبہ شہید کا اکبرؑ بھی پا گئے　　اصغرؑ ہمک کے باپ کی گودی میں آ گئے
کس خاندان سے ہیں یہ سب کو بتا گئے　　ہنس ہنس کے رن میں تیرِ قضا وہ بھی کھا گئے
بولے حسینؑ آخری میرے چمن کا پھول
پروردگار نذر ہے تیرے جو ہو قبول
سب کچھ لٹا کے رن کی طرف اب چلے ہیں شاہ　　آراستہ ہے ان کے لیے خود رضا کی راہ
ان کے ثباتِ عزم کا ہے خود خدا گواہ　　پہنچانے جا رہی ہے سکینہ کی ایک آہ
خیمہ میں لاڈلی کو بلکتا ہی چھوڑ کے
دنیا سے جا رہے ہیں یہ منہ اپنا موڑ کے
مقتل میں آئے حشر سا آ کر بپا کیا　　بچپن میں جو کیا تھا وہ وعدہ وفا کیا
حاصل ہے جو سجود کا سجدہ ادا کیا　　شمرِ لعیں نے جسم سے سر کو جدا کیا
خیمہ میں شور اٹھا کہ سکینہ بھی کھو گئیں
وہ آ کے اپنے باپ کے لاشہ پہ سو گئیں

بڑا سانحہ

چودھری خلیق الزمان

مکرمی جناب جمیل صاحب:

آپ نے شوکت تھانوی مرحوم پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ شاید آپ بھول گئے کہ میں بستر کی نذر ہوں کہ اپنے ہاتھ سے لکھنا کاہ برآوردن کے مصداق ہے۔

یوں تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ باپ کے اوصاف اولاد میں بھی نظر آتے ہیں مگر جس طرح شوکت تھانوی اپنے والد بزرگوار سے مزاح اور معاصر جوابی کا ورثہ لے کر آئے اس کی کم مثالیں ملیں گی۔ میرے دوستانہ تعلقات محمد صدیق صاحب ان کے والد مرحوم سے تھے جن سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور ان کی صحبت میں چند لمحے ہنسی مذاق میں گذر جاتے تھے۔ جو بے پناہ آمد ان کے مزاح میں تھی وہ میں نے کسی میں بھی نہیں دیکھی سوائے ملا بھوتی اور چودھری محمد علی ردولوی مرحومین جو خود بھی اعلیٰ پایہ کا مذاق رکھتے تھے اور محمد صدیق صاحب کا لوہا مانتے تھے۔ محمد صدیق صاحب کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ کچھ لکھنے سے قاصر تھے مگر شوکت تھانوی نے ان تینوں مرحومین کا رنگ اڑا لیا تھا۔ اور جو دلکشی و نازک خیالی اپنے انداز مزاح میں پیدا کی تھی وہ کب کسی ایک انسان کو نصیب ہوتی ہے۔

شوکت تھانوی مرحوم اپنے پیچھے بہت سی تصانیف یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں مگر جتنا مواد بے شمار لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے وہ بھی ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ غضب تو یہ تھا کہ تیغ سے تیز پھبتی کو بھی وہ ایسے شیریں الفاظ و انداز سے ادا کرتا تھا کہ کسی کو خلش تک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ہر بات میں آمد تھی اور جو کچھ کہہ جاتا تھا قبل اس کے کہ آدمی سمجھے بیسیوں اور پھبتیاں اڑا دیتا تھا اور سب ہنس ہنس کر بیٹھے اور رو گداز انداز ہیں۔

ہندی راج میں ریلوں کا کیا حشر ہوگا اکثر لوگ سوچتے رہتے ہوں گے، مگر اس نے سودیشی ریل لکھ کر ایک دنیا کے اندازے کو چند صفحات میں منتقل کر دیا۔ قاضی جی کا شاہکار اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ خود ہی قاضی جی خود ہی ان کی بیگم اور مسلسل ان کا پروگرام ریڈیو پاکستان میں نشر ہوتا رہا اور اکثر ناواقف قاضی جی اور ان کی بیگم کو دو مختلف افراد سمجھتے رہے۔*

سچ پوچھئے تو میں اس کی اچانک موت کو ایک بڑا سانحہ سمجھتا ہوں۔ "پطرس" پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ سالک مرحوم بھی جا چکے تھے۔ ان کے بعد شوکت کی جدائی قوم و ملک کے لیے ناقابلِ تلافی سانحہ ہے۔

(چودھری خلیق الزمان)

---

* شوکت صاحب ضرورت پڑنے پر بیگم کا پارٹ بھی ادا کر لیتے تھے

شوکت تھانوی مرحوم

عبدالماجد دریابادی

"شوکت تھانوی" کے ساتھ مرحوم کا لفظ لگانا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ گویا اجتماع ضدین! لیکن مالآخر جو ہونا تھا واقع ہو کر رہا! ——— زندگی اور زندہ دلی اگر کبھی مجسم ہو کر گوشت و پوست کی شکل میں سامنے آسکتے۔ تو وہ شاید شوکت تھانوی ہوتے۔ اور یہ اگر کہیں یونانیوں کے دور میں ہوئے ہوتے، تو عجب کیا کہ زندہ دلی و ظرافت کے ایک چھوٹے موٹے دیوتا مان لئے گئے ہوتے: موت کے بس سے اگر کسی کا باہر رہنا ممکن تھا تو ہماری تخیل کی دنیا میں یہی تھے ——— وقت آیا تو جس کے وجود کا جیسے مقصد ہی ہنسنا ہنسانا، لوگوں کا دل خوش کرنا تھا، خود ایک خاک کا ڈھیر تھا۔ دوسروں کے لیے سرمایۂ ماتم سامان حسرت و غم!

یونانیوں میں کسی نے انسان کی تعریف کی تھی۔ کہ وہ حیوان ضاحک ہے۔ عجب نہیں کہ انھیں سابقہ وقت کے کسی شوکت تھانوی ہی سے پڑا ہو۔ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ذہانت کا خزانہ آج کل کے محاورہ میں بے پناہ تھا ——— انشا کے لیے مشہور ہے کہ جب بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک لطیفہ روز نیا سنایا کرو۔ تو ہمت جواب دے گئی۔ اور پسینہ آنے لگا ——— یہ فرمائش اگر شوکت سے کی جاتی تو بے تکلف تیار ہو جاتے۔ اور عمر چاہے سو سال کی ہو جاتی۔ یہ ہر روز بلاناغہ نئی ہی سناتے رہتے! اپنے صیغہ میں، اتنا حاضر دماغ میں نے تو دیکھا نہیں۔ خدا جانے کتنی کتابیں، کتنے رسالے، کتنے مضمون، کتنے خاکے لکھ ڈالے۔ اور تھکن یا ماندگی کا پتہ نہیں۔ ہر وقت آمد ہی آمد۔ آورد جیسے ان کی طبیعت جانتی ہی نہ تھی ——— دوسروں کو جو لکھ لکھ کر بڑی فیاضی اولوالعزمی سے دے دیتے تھے۔ اس کا حساب الگ! اور پھر آخر میں تو کئی سال سے ایک روزنامہ میں ہر روز لطائف کا کالم پوری لطافت کے ساتھ پورا کیا کرتے!

یہ ہنسوڑ پن تمامتر بے مقصد نہ ہوتا۔ بلکہ ریڈیائی تقریریں ہوں، یا اخباری تحریریں سب میں ہلکی پھلکی تعلیم تبلیغ مشرقیت و شرافت کی ہوتی۔ بلکہ کبھی کبھی تو عین دین و اخلاق کی بھی! ——— خود بھی عقیدۃً پختہ مسلمان تھے اور اعمال کی کوتاہیوں پر نادم و شرمسار۔ آخر تھانہ بھون ہی کے تو تھے۔ ؎

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!

سے پہلی بار [illegible] بھی [illegible] [illegible] [illegible] میں [illegible] [illegible] ہی [illegible] [illegible] بیٹے ہیں

جو اعزاز خود ساختہ [illegible] ہونے والا [illegible] [illegible] بہت کچھ کہنے والا ہے۔

سب سے پہلے شاید [illegible] [illegible] محسن [illegible] [illegible] جو [illegible] [illegible] زمانے میں آ گئے ہیں اخبار رسالہ [illegible] کے نام سے [illegible] لکھنؤ [illegible] [illegible] پہلا قدم [illegible] لکھ کر غالباً ۱۹۲۹ء میں [illegible] بعد سے [illegible] ہونے چلے گئے [illegible] ترقی پسندی [illegible] ہوئے نہ جدیدیت کے کسی [illegible] لکھنؤ [illegible] [illegible] منشی جی [illegible] [illegible] [illegible] تقسیم کے بعد ہی پاکستان منتقل ہو گئے۔ تو لاہور [illegible] منشی جی کی [illegible] کے حضور میں [illegible] اور دونوں کی معصوم [illegible] تکلیفوں نے [illegible] [illegible] صرف [illegible] ورنہ [illegible] لکھنؤ [illegible] اور جوانی کا بیشتر زمانہ بھی گزرا۔ اس لیے زبان کے لحاظ سے پورے لکھنوی تھے۔ یہاں کے محاورہ [illegible] پر عبور رکھنے والے۔ [illegible] نستعلیق زبان لکھنے والے۔ خدائے آمرزگار لغزشوں کو [illegible] سے درگزر فرمائے۔ اور مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ [illegible] باقی ہو۔ مرض آخر کینسر سا موذی نصیب ہوا۔ اس کی ناقابل بیان اذیتیں خود ہی [illegible] بڑا سبب [illegible] کا بن گئی ہوں گی۔ پھر سفر آخرت کے لیے ذی الحجہ کے متبرک عشرہ اول میں بھی متبرک ترین تاریخ [illegible] [illegible] یہ تاریخ کیا ملی۔ گویا غیبی بشارت مغفرت کاملہ کی ہاتھ آ گئی۔ وما یلقٰہا الا ذو حظ عظیم۔

ایک مہذب ظرافت نگار

قرۃ العین حیدر

مدتیں گزریں جب میں نے "سودیشی ریل" پڑھی تھی۔ مگر اس کے بہت سے جملے آج تک اس طرح یاد ہیں جیسے یہ مضمون ابھی ابھی پڑھ کر ختم کیا ہو ——

بابو جی لائیے —— نہ ہماری بات نہ آپ کی۔ بوہنی کا وقت ہے، لائیے تیرہ آنے ہی دے دیجئے۔" ٹکٹ بابو نے کہا اور ایک پرچے پر کچھ لکھ کر دے دیا۔

"ٹکٹ کہاں ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"نئے ٹکٹ چھپنے گئے۔"

ریل چلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

"ارے صاحب جب مسافر پورے ہو جائیں گے تب ہی تو ریل چھوڑیں گے یا ایسے ہی چھوڑ دیں۔"

مسافر کھچا کھچ بھر گئے۔ ریل پھر بھی نہ چلی۔

"لٹو فائرمین کوئلہ لینے شہر گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا جلدی آجائیو —— اسی لیے چھٹنے میں دیر ہو رہی ہے۔" گارڈ صاحب نے فرمایا۔

اتنے میں لٹو فائرمین بھاگتا ہوا آیا۔ "اپنے باپ کا نوکر سمجھ رکھا ہے؟ سوراج کی خوشی میں شہر کی ساری دوکانیں بند ہیں۔ کہیں کوئلہ نہیں ملا۔ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے پانچ سیر لایا ہوں" —— اس نے کوئلے کی بوری غصے سے پٹخ دی۔

یہ جملے ممکن ہے بالکل اسی طرح نہ ہوں۔ میں نے حافظے کی مدد سے لکھ دیئے ہیں۔ لیکن کتنے مضامین یا افسانے ایسے ہوں گے بچپن م پڑھے ہوئے جن کے پورے پیراگراف یاد رہ جائیں؟

لکھنؤ میں جب ریڈیو اسٹیشن کھلا تو "بچوں کا پروگرام" بھی شروع ہوا۔ اس پروگرام کے تین کردار تھے۔ آپا جان۔ ان کا ڈ "بدھو" اور تیسرے ایک پوپلی سی آواز والے بزرگ "چاچا"

بلحاظ عمر وہ حقیقت تھی اور اصل حقیقت یہ تھا کہ آپا اور بھائی آپا جان ہیں۔ بہرحال ان کا اتفاقی پہلو ذکر ہے (جو شائع ہو چکا تھا اور جو "شوکت" کا فرضی نام تھا جسے وہ "ذل شور" کہتا تھا) جو چاہے مستقل طور پر آ رہتا ہے۔ اور "آپا" ایک بے حد دلچسپ شخصیات ہیں۔

کچھ عرصے بعد جب مجھے اس پروگرام میں شرکت کے لیے بلایا گیا تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یعنی یہ کہ ہم آپا جان، منّو اور چاچا کو نہ صرف زندہ جیتا جاگتا اور بولتا دیکھیں گے بلکہ ان کے ساتھ پروگرام میں شرکت کا فخر بھی حاصل کریں گے۔ ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپا جان کا اصل نام تو عرش منیر ہے (جو ایک اسٹاف آرٹسٹ تھیں۔ ان کی بے حد خوبصورت آواز تھی اور برسوں یہ لکھنؤ اسٹیشن کے ڈراموں کی "اسٹار" صداکار رہیں اور بہت عرصے سے کراچی کی ایک دُور افتادہ مہاجر بستی میں بڑی تکلیف اور تنگدستی کی زندگی گزار رہی ہیں)۔ منّو کے متعلق انکشاف ہوا کہ یہ آپا جان کے کوئی عزیز نہیں ہیں بلکہ ریڈیو کے ملازم ہیں (یہ اب ریڈیو پاکستان کے اعلیٰ افسر ہیں اور کئی برس سے اقوام متحدہ نیویارک میں تعینات ہیں) اور چاچا کے لیے پتہ چلا کہ ارے یہ تو شوکت تھانوی ہیں۔

آئندہ برسوں میں ہم بچوں کے پروگرام کے زمرے سے نکل کر "بڑوں" کے پروگرام میں شامل ہونے لگے اور کچھ تھوڑی بہت "ٹوں ٹاں" بھی شروع کر دی۔ یعنی یہ کہ عورتوں کے پروگرام کے لیے ایک آدھ "اسکٹ" تصنیف فرمایا۔ سکول سے نکل کر کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچے۔ ریڈیو اسٹیشن کی فضا وہی رہی۔ وہی سب جانے پہچانے لوگ اور آوازیں۔ مگر جو سماں ان دنوں لکھنؤ ریڈیو کے ڈرامے خاصے کی چیز ہوتے تھے اور لاہور ریڈیو سے دوستانہ مقابلہ اور چشمک رہتی تھی کیونکہ لاہور والوں کو بھی اپنے فنکاروں پر بہت ناز تھا۔ شاید اسی دوران میں شوکت تھانوی کسی فلم کمپنی میں مکالمے لکھنے کے لیے لاہور چلے گئے اور کچھ عرصے بعد لکھنؤ واپس آ گئے۔

غالباً اگست ۱۹۴۷ء کی ایک شام، ریڈیو اسٹیشن اُجڑا اُجڑا سا لگ رہا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشن نئے نئے ریڈیو پاکستان میں شامل ہو جانے کی وجہ سے تازہ انڈین لسنر بالکل بے حد دُبلا اور بے رونق سا معلوم ہو رہا تھا۔ لکھنؤ سے سعیدہ بانو اور آل حسن پہلے ہی تبدیل ہو کر دہلی جا چکے تھے۔ بیشتر مسلمان اراکین لاہور، پشاور، ڈھاکہ اور کراچی روانہ ہو گئے تھے۔ گوہر سلطان، حفیظ جاوید اور عقیلہ حبیب اللہ انگلستان جا چکی تھیں۔ وہ پرانا ماحول راتوں رات بدل سا گیا تھا۔ عرش منیر نے بتایا کہ جگل کشور مہرہ، شیخ احمد حسان بھی تبدیل ہو کر پاکستان چلے گئے۔ شمشیر سنگھ بترہ بھی (شاید یہی نام تھا) سمیع شاہد ہو کر لاہور گئے۔ شوکت صاحب بھی لاہور میں ہیں اور عنقریب اپنے گھر والوں کو وہاں بلانے والے ہیں۔

اس کے فوراً بعد ہی لاہور سے "پاکستان ہمارا ہے" کا پروگرام شروع ہو گیا جسے امتیاز علی تاج اور شوکت صاحب مرتب کرتے تھے۔ اس کے بعد "قاضی جی" کا سلسلہ شروع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔

—

لاہور ریڈیو اسٹیشن پر شوکت صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہی۔ ۱۹۵۶ء میں ایک مرتبہ کرشنا آل حسن میرے ساتھ ریڈیو اسٹیشن گئیں کیونکہ وہ آل حسن سے شوکت صاحب سے پرانی دوستی کی وجہ سے مرحوم سے خاص طور پر ملنا چاہتی تھیں۔

شوکت صاحب ریڈیو اسٹیشن کے پیلو والے کمرے میں اپنی میز پر بیٹھے تھے۔ کرشنا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے کہا: "شوکت صاحب آپ کا وہ ترکہ اب تک نہیں ملا، ہم لوگ بے تابی سے اس کے منتظر ہیں۔"

قصہ یہ تھا کہ چند برس قبل صدیق احمد صدیقی نے بتلایا تھا کہ شوکت صاحب کے ساتھ ایک بڑی ڈرامائی بات ہوئی ہے، وہ یہ کہ ان کے ایک چچا انگلستان میں بس گئے تھے اور مشہور ہنٹلے اینڈ پامر بسکٹ کمپنی کے ڈائرکٹر یا مالک یا جانے کیا، بہرحال بہت سخت کروڑپتی ہو گئے تھے۔ انھوں نے لاولد وہاں انتقال کیا اور شوکت تھانوی ان کے واحد قانونی وارث ہیں اور عنقریب یہ لاکھوں پونڈ کا ورثہ حاصل کرنے کے لیے ولایت آنے والے ہیں۔ یہ واقعی ایکسائٹنگ بات تھی۔ ظاہر ہے کہ شوکت تھانوی مع انگلستان کے ایک کروڑپتی بن جائیں گے تو کریجز یا ڈورچیسٹر میں رہا کریں گے۔ ایک آدھ قلعہ وغیرہ خرید لیں گے اور ایک عدد رولس رائس تو لامحالہ رکھیں گے ہی۔ تو ہم سب پر کیا لازم آیا ـــ؟ ہم سب پر یہ لازم آیا کہ ہم لوگ موصوف کو ابھی سے "کلٹی ویٹ" شروع کر دیں اور اہلِ ولایت پر ثابت کریں کہ شوکت تھانوی مدظلہٗ کے نہایت قریبی رشتے دار ہیں، تاکہ موصوف کے ڈورچیسٹر ہوٹل اور رولس رائس کار وغیرہ سے ہم صوفیا کو بھی فیض حاصل ہو سکے۔

چنانچہ میں نے شوکت صاحب سے پوچھا کہ وہ ترکہ آپ کو اب تک کیوں نہیں ملا۔ ہم لوگ آخر کب تک انتظار کریں؟ واقعی میں نے کہا ـــ ہم مقبول انگریزی ناولوں میں پڑھا کرتے تھے کہ فلاں کا چچا آسٹریلیا میں بے اندازہ دولت چھوڑ کر مرا، یا افریقہ میں ہیرے کی کانیں، یہ کسی دور افتادہ اور گمنام بھتیجے کے نام منتقل کر کے دوسری دنیا کو سدھارا۔ آپ کے چچا نے یہ روایت سچ کر دکھائی۔

شوکت صاحب نے جواب دیا کہ بھئی، اس میں ایک شاخسانہ نکل آیا۔ اس ترکے کی لندن میں ایک انگریز خاتون دعویدار پیدا ہو گئی ہیں اور انھوں نے وصیت کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ اب میرے پاس اتنا پیسہ کہاں ہے کہ میں اتنا مہنگا مقدمہ لڑتا پھروں لہٰذا میں نے اس کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

اسی وقت ن۔م۔ راشد آ گئے۔ جو ان دنوں نیویارک میں تعینات تھے اور رخصت پر پاکستان آئے ہوئے تھے۔ اس سے قبل میں راشد صاحب سے نہیں ملی تھی۔ شوکت صاحب نے بڑی برجستگی سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ ریڈیو کی بیٹی ہیں۔"

اور کرشنا کو متعارف کیا۔ "یہ ریڈیو کی بہو ہیں۔" (یعنی آلِ حسن کے رشتے سے وہ ریڈیو کی بہو تھی!)

کل کی بات ہے کہ صدیق احمد صدیقی، شوکت صاحب کے کروڑپتی ہونے کی بشارت دے رہے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن پر محمود نظامی نہایت جوش و خروش اور نفاست سے مارچ کا سالانہ جشنِ موسیقی منعقد کر رہے ہیں اور شوکت صاحب باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔ اے بھتیجے ـــــ آج نہ صدیق احمد صدیقی ہیں نہ محمود نظامی نہ شوکت تھانوی ـــــ کمال ہے واقعی ـــــ

—

مجاز کے لطیفوں جتنے تو نہیں مگر شوکت صاحب کے بھی بہت سے لطائف و ظرائف مشہور ہیں کہ کیسے انھوں نے انتہائی رنج و الم کے موقعے پر اپنے ایک جملے سے روتوں کو ہنسا دیا۔ یا کسی بے ڈھب اور نازک صورت حال کو ایک برجستہ فقرے اور بذلہ سنجی کے

[illegible] خوبصورتی سے نبھایا۔ پیدا نہیں [illegible] تیزی [illegible] شوکت تھانوی [illegible] کی صورت اختیار نہ کر لیتے [illegible] مزاح نگاروں کے برعکس شوکت صاحب [illegible] جہاں تک میرا خیال ہے [illegible] غیر معمولی پیچ و خم یا ضیائی الجھنیں نہ تھیں [illegible] حالات میں تبدیل ہو جاتا [illegible] مشکل ہے۔ محض یہ بات کہ وہ [illegible] کے بعد فوت ہوئے [illegible] ادبی شخصیت کے [illegible] اور جان پیدا اور [illegible] کا عادی ہونا بھی ضروری ہے۔

شوکت تھانوی بے حد پر گو [illegible] آج سے تیس پینتیس [illegible] سے اب تک ان کی ہر تحریر ہی [illegible] ہوتا [illegible] وقت یہ مقبولیت انھیں دونوں ملکوں میں حاصل تھی۔ [illegible] ہندوستان میں ان کی تصنیفات کا ہندی میں ترجمہ ہوتا رہا ہے اور وہ ہندی داں حلقے میں بھی بہت مقبول تھے۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ ناول، افسانے، ڈرامے، خاکے، کالم، ریڈیو فیچر، [illegible] سے لکھتے تھے۔ ایک پیشے [illegible] سے ان کا تعلق تھا جہاں ادیب کو اخبار نویس کی مانند متواتر لکھنا ہوتا ہے۔ [illegible] لکھنا [illegible] عادت ثانیہ اور میکانکی عمل بن جاتا ہے۔

مگر اس زود نویسی کے باوجود شوکت صاحب کی زیادہ تر تحریریں [illegible] پر مبنی ہوتی تھیں۔ [illegible] شگفتگی اور برجستگی کی وجہ سے پڑھنے کے لائق ہوتی تھیں۔ سوائے روزنامہ جنگ کے اس کالم کے جو انھوں نے مجید لاہوری کے انتقال کے بعد لکھنا شروع کیا تھا اور جس میں آمد کے بجائے محض آورد ہوتی تھی۔

”عظیم فنکار“، ”عظیم ناول نگار“، ”عظیم شاعر“، ”عظیم مزاح نگار“ ــــ میں اس لفظ ”عظیم“ کو ہمیشہ شک و شبہے کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ عظمت کا فیصلہ صرف تاریخ کے ہاتھ میں ہے اور یہ سوال بہت بعد کا ہے کہ ادب کی تاریخ کس لکھنے والے کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرے گی۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ برنارڈ شا مرنے کے فوراً بعد بھلا دیئے گئے۔ دور کیوں جائیے خود ہمارے یہاں مزاح کے سلسلے میں جوش و خروش اب مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ بہت سے اچھے ادیب اپنے دور کے بعد مختلف وجوہ کی بنا پر محض ”DATED“ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کا آج وہ غلغلہ نہیں رہا جو آج سے تیس سال قبل ”نیرنگ خیال“ کے دور میں تھا۔ وقت اور تاریخ دونوں انتہائی ظالم اور ستم پیشہ ہیں۔ وقت کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ نہ وہ خود ستائی، گروہ بندی، من ترا حاجی بگویم، ”[illegible] بنام بھائی منی“، سستی خیزی، یا ”فقرہ بازی“ کے چکر میں آتا ہے۔ آپ اپنے فن کے متعلق خود کتنے ہی مقالے لکھ بیٹھیے، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پچاس برس کے اُلٹ پھیر کے بعد معلوم ہوگا کہ کس ادیب کی تخلیقات کا کتنا حصہ باقی بچ گیا اور کتنا زمانہ برد ہو گیا۔ ادبی [illegible]، تنقید کی ٹکسالوں، نظریاتی بحثوں اور وقتی مقبولیت سے بالاتر کوئی چیز ہے۔ ادیب کی اپنی صلاحیت اس کا فنی اور نظریاتی خلوص اور ARTISTIC CONSISTENCY جو اسے زندہ رکھتی ہے اور اس کے لیے وقت کی کسوٹی درکار ہے۔

ادب کی دنیا بڑی انوکھی دنیا ہے۔ میرے نزدیک سید ابو تمیم فریدآبادی ایک بہت اچھے مزاح نگار ہیں۔ لیکن میں نے کسی تذکرے یا جائزے میں ان کا نام نہیں دیکھا۔ بلکہ بہت سے لوگ تو ان کی تحریروں ہی سے ناواقف ہوں گے۔ عظیم بیگ چغتائی بہت بڑے مزاح نگار تھے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا آج وہ اتنے مقبول نہیں رہے اور بعض اوقات بعض گمنام ادبی شخصیتوں کو

"ڈسکور" کر لیا جاتا ہے اور فراموش شدہ فنکاروں کی "تجدید" بھی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ مرزا رسوا اور نظیر اکبر آبادی کے ساتھ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سی چیزیں جن کو ہم ادب عالیہ کہہ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ ان کی محض ایک دستاویزی حیثیت ہے۔ یہیں یہ بھی سوچیے کہ ۱۹۳۰ء سے پہلے کا بیشتر نثری اور افسانوی ادب خاصا کثیف تھا۔ لیکن شوکت تھانوی نے "سودیشی ریل" اسی زمانے میں لکھی اور پطرس کے مضامین بھی لکھے گئے۔ لہٰذا ہم قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کسی ایک دور میں صرف دوسرے درجے کا ادب تخلیق کیا گیا۔ دوسرے "ترقی یافتہ" اور "درخشندہ" زمانوں یا "تنزل پذیر" اور "کمزور" زمانوں سے بڑے ادیب کا کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنا کام کرکے چلا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے ادبی رواج، معاشرے اور قارئین کے تبدیل شدہ تعصبات، مزاج اور مذاق، یا بعض اوقات چند نقادوں کی نظرِ کرم اور مبالغہ آمیز تعریف یا نقادوں کا عتاب، یا لاعلمی یا جہالت، تعصب یا بے نیازی، یہ ساری چیزیں مل کر ایک عرصے کے لیے کسی ایک ادبی شخصیت کو یا آسمان پر چڑھا دیتی ہیں یا پاتال میں گرا دیتی ہیں۔ مگر بات وہی رہتی ہے۔ اگر اس لکھنے والے میں کوئی "چیز" تھی تو وہ وقت گزر جانے پر بھی زندہ رہے گا اور بھلا دیئے جانے کے بعد پھر یاد کیا جائے گا۔

لہٰذا میں شوکت صاحب کے متعلق یہ حکم لگانے کا کوئی حق نہیں رکھتی کہ وہ کس قدر عظیم ظرافت نگار تھے اور کتنے بلند پایہ فنکار تھے اور ان کا مزاحیہ ادب زندگی کی کن اعلیٰ ترین قدروں کا حامل تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں بحیثیت ایک قاری کے اتنا جانتی ہوں کہ زندگی کا بھرپور احساس اور ایک لطیف اور مہذب ظرافت ان کی تحریروں میں جاری و ساری تھی۔ ایک اچھے ظرافت نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ روزمرہ کے معمولی واقعات میں، زندگی کے بے تکے پن اور بدصورتی اور لیپے میں، صورتِ حالات کی شدید نامعقولیت میں ملاحت کا رُخ دیکھے اور اس پر ہنس اور ہنسا سکے۔ اچھا مزاح نگار زور سے قہقہہ نہیں لگاتا، صرف مسکراتا رہتا ہے۔ وہ پھکڑ اور سوقیانہ باتوں یا محض ضلع جگت یا چند بندھے ٹکے جملوں یا چند STOCK مسخرے کرداروں کی تکرار سے مزاح پیدا نہیں کرتا۔ وہ زندگی کی گھمسان میں اُتر کر زندگی کا مضحک پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ اسی وجہ سے شوکت تھانوی کی تحریروں میں طنز کی تلخی یا خاص مسخرے پن کے ابتذال کے بجائے محض مزاح کی شگفتگی ملتی ہے۔ یہ فرحت بخش ظرافت نکتہ سنجی، خوش طبعی، ذہین زندہ دلی، پُرمذاق اور لطیف فقروں اور الفاظ کے نفیس اور مہذب استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور شوکت تھانوی ہمیشہ ایک مہذب ظرافت نگار رہے۔ یہی تہذیب اور متانت ہمیں رشید احمد صدیقی کے یہاں ایک بہت اونچی اور فلسفیانہ سطح پر ملتی ہے۔

شوکت تھانوی اپنی زندگی میں ایک طویل عرصے تک اپنے الفاظ اور اپنی آواز کے ذریعے لاکھوں انسانوں کو ہنساتے رہے اور اس روتی بسورتی اعصاب زدہ دنیا میں اگر کوئی انسان اپنی فطری شگفتگی کے ذریعے دوسروں کو تھوڑی دیر کے لیے محظوظ اور بشاش کر سکے تو ہمیں اس کا شکرگزار ہونا چاہئے۔

کوئی دوسرے شوکت تھانوی اب دنیا میں نہیں آئیں گے۔

میرا رفیق

قدرت اللہ شہاب

شوکت تھانوی کے ساتھ مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ایک عجیب جھجک محسوس ہوتی ہے۔ جس باغ و بہار شخصیت نے اپنی تحریر اور گفتار سے لاکھوں کا دل خوش کیا ہو وہ یوں دفعتاً موت کی آغوش میں سو جائے گا، اس کا کبھی وہم و گمان میں نہ تھا۔

شوکت تھانوی نے بے شمار لوگوں کو ہنسایا ہے لیکن اس کے اپنے دکھ اندر ہی اندر ناسور بنتے گئے۔ یہاں تک کہ اس ناسور نے چپکے چپکے گھن کی طرح اس کی زندگی کو کھا لیا۔

ایسے بندوں کی بخشش کا یہی ایک نشان ہے کہ ان کی موت پر ایک زمانہ سوگوار ہوتا ہے۔ آج بھی اردو داں طبقے کا ہر فرد شوکت تھانوی کی وفات پر اشک بار ہے۔ شوکت کے اٹھ جانے سے اردو ادب کی محفل ویران ہو گئی ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ اپنے ایک محترم اور بزرگ ممبر سے محروم ہو گیا ہے۔ اور ذاتی طور پر میرا ایک عزیز دوست اور رفیق مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ اس کی روح کو جنت میں اسی طرح ہنستا رکھے جس طرح اس دنیا میں اس نے لاکھوں ہزاروں انسانوں کو اپنی شگفتہ تحریروں اور تقریروں سے ہنسایا ——

آمین

باغ و بہار شخصیت

حفیظ جالندھری

شوکت سے مل کر ہنستے ہم
یہ کیا خبر تھی رونا پڑے گا

شوکت تھانوی کو آج اردو کی ساری دنیائے ادب رو رہی ہے۔ شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ضاحک و ظریف، شوکت اخبار و رسائل کا مدیر، صحیفہ نویس، لطیفہ گو شوکت بزم ادب شعر و فن کی ایک باغ و بہار شخصیت ہم سے جسمانی طور پر رخصت ہو گئی ہے۔ وہ شخصیت جو زندگی کے اذیت دہ پھوڑوں پر اپنی خوش گفتاری کا مرہم رکھا کرتی تھی۔ آج شوکت جن کو ہنسایا کرتے تھے، وہ سب روتے رہ گئے ہیں۔ شوکت کے رخصت ہو جانے کے بعد بزم یاراں کو اب سارا عالم کچھ عجیب سا نظر آ رہا ہے ؎

کس قدر آباد ہے دنیائے دوں   مردہ و افسردہ و خوار و زبوں
خاک کا پیوند ہونے سے یہ   صورتِ اشکِ ندامت سرنگوں

اور یہ بالکل سچ ہے۔ صورت حال اب یہی ہے کیونکہ

اہلِ دل کی زندگی ہے زندگی   روح کی تابندگی ہے زندگی
ہو گئے رخصت جہاں نور و سرور   کچھ نہیں شرمندگی ہے زندگی

شوکت تھانوی ایک کثیر الاحباب شخصیت تھے، پاکستان میں بھی اور بھارت میں بھی ان کے بے شمار ذاتی دوست موجود ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے تاکہ وہ شوکت کے لطائف سے خود بھی مزید لطف حاصل کرتے رہیں اور دوسروں کو بھی ایسے ظرائف سے باخبر کریں جو ابھی تک ذاتی دوستوں ہی کو معلوم ہیں۔

ان کی تحریروں سے شگفتگی حاصل کرنے والے قدردان یا ریڈیو اور مشاعروں میں ان کی زبان سے بذلہ کے موتی چننے والے ان گنت ہیں۔ اپنے ذوق کے مطابق شوکت کی رحلت پر سب ماتم کناں ہیں۔ سب اس جدائی سے متاثر ہیں۔ سب اپنے ذہن کی تسکین کے معاملے میں اردو مزاح نگاری اور خندہ گفتاری کی فضا میں ایسا خلا دیکھ رہے ہیں جو شوکت کے بعد آسانی سے پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔

ذاتی دوست احباب سے ان کے مراسم انتہائی مخلصانہ بھی تھے اور شرارتِ معصومانہ سے بھی بندھے ہوئے تھے۔ شوکت کی زبانی چٹکلے اور شرارتیں جو سب دوستوں کو زندہ دلی عطا کرتی تھیں ——— اب موت نے ان کو قبر میں دفن کر دیا ہے، شوکت کے ساتھ ہی ———!

پچھلی کشمکش حیات کے ہر قدم پر زندہ رہے تھے [illegible] ہے کہ جو دو سے فردوس بہت موہوم [illegible] کے لیے شوکت کے پاس [illegible] ہی گئے [illegible] شوکت کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، ظرافت [illegible] رکھنے والی [illegible] شاید کسی کو حاصل ہو، اس لیے کہ شوکت [illegible] مقام [illegible] حیات [illegible] جس مقام اور جس دور [illegible] آ پہنچے تھے [illegible] فرصت [illegible] بھی اور حماقتیں بھی" اُن کے ذہن پر [illegible] حماقتوں کو [illegible] دونوں کو [illegible] مجھ سے بولتے چالتے لکھتے رہتے [illegible] ہر بات میں ایک خاص [illegible] سرزد ہوتا تھا۔ دوست ہو یا دشمن [illegible] ہے اور فقرہ بھی کیسا کہ باید و شاید!

مجھے تو کچھ ایسا نظر آیا کہ اُن کے صدر و سینہ میں کوئی مقناطیس ہے جو لطیفہ ہو یا کوئی شرارت اس مقناطیس کی آمیزش تیار ہوتی رہتی ہے۔ یہ مقناطیس بڑی بزم ہو یا محض ایک ہی دوست کے ساتھ صحبت کی نشست کسی نہ کسی زبان سے یہ مقناطیس ایسی باتیں کہلوا دیتا تھا۔ کوئی ایسی حرکت یہ مقناطیس دوسروں سے سرزد کرا دیتا۔ جس پر فوراً وہ چھپا ہوا لطیفہ شوکت کی زبان سے نکل کر فضا میں قہقہوں کا لالہ زار سجا دیتا تھا۔ لطیفے کے لیے غور و فکر یا اُدھڑی ہوئی شرارت کے لیے کسی مقام اور مرحلے کی ضرورت شوکت کو نہیں تھی۔ جو بات دوسروں سے غائب رہنا چاہتی، شوکت کے لیے حاضر تھی لیکن اُن کے لطیفے یا شرارت میں کبھی کوئی زہر، کبھی کسی کی دل شکنی یا دل آزاری نہ موجود تھی نہ شوکت کا مقصود!

شوکت کی ظرافت زندہ دلی تھی۔ یہ دل لگی ہوتی تھی۔ دل کی لگی نہیں۔ لگاوٹ کا رنگ نہ تھی ——— اس لیے جس پر وہ فقرہ کستا تھا، وہ روتے روتے قہقہے لگا کر ہنستا تھا۔ اس کے ذہن سے نکلے ہوئے الفاظ کے ہر حرف کو لکھتے ہوئے صدف سے موتی ملتے تھے۔ اس کی تراوشِ بذلہ سے سوکھے ہوئے بھی پھلتے تھے۔ افسوس آج وہ ذہن بند ہو گیا ہے! آہ آج وہ اپنی رنگینیٔ بیان سے زبان کی لذت کو بیدار کرنے والا خود ہی سو گیا ہے!

جو قیامت اٹھائے پھرتے تھے
سو رہے ہیں وہ لمبیاں تانے

شوکت پرانے دور اور پرانے مقام سے چلتا ہوا جس نئے مقام اور جس نئے دور میں آگیا تھا، ہماری طرح وہ پرانی یادوں پر بسورتا نہیں تھا۔ کیونکہ اس دور کی حماقتوں پر ہنسنے ہنسانے کا ملکہ اسے ودیعت تھا۔ نئے ماحول کی حماقتوں اور پرانے دور کی حماقتوں کو ہم آہنگ کر لینے اور پھر دونوں تصویروں کو ایک تصویر میں بھر دینے کی لیاقت شوکت میں جس ڈھنگ سے نظر آئی وہ دوسرے میں نہیں پائی گئی۔ رنگ برنگ قہقہوں کو ایک ہی جنبشِ قلم سے ہر پس منظر کے ساتھ فضائے عالم پر ثبت کر دینا شوکت کے لیے آسان تھا۔ دوسروں کے لیے محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

دل سمجھتے ہیں کہ جو لوگ دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ وہ خود لازماً خوش و خرم بھی ہوں گے۔ تو معاملہ اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں کہ میں شوکت کے خاص الخاص حلقۂ احباب میں سے نہیں ہوں۔ خاص الخاص احباب تو واقعی ان کو بہت زیادہ جانتے ہوں گے۔ تاہم میری پچیس برس سے ایسی خاص شناسائی کہئے یا دوستی پر محمول کیجئے۔ شوکت سے گہری محبت رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کے قلب پر بہت سے رِستے ہوئے ناسور تھے، زندگی کی ذمہ داریوں کے دو پاٹ جن کو پیسے ڈال رہے تھے۔ تاہم وہ باتوں کو بلند مرتبہ دوستوں اور متعدد افسروں کے دن کھانے پر بلائے جاتے۔ عام مشاعروں پر پے بہ پے بلائے جاتے تھے اور رات رات بھر جگا کے ہنساتے تھے۔ مشاعروں سے مالی منفعت ضرور حاصل ہوتی ہوگی۔ لیکن چھینٹوں سے گزر اوقات بصد مشکل ہوتی تھی۔

جامہ زیب آدمی۔ وضعداری کا رسیا۔ اپنے زخم ہائے داخلی کو چھپاتا رہا اور خارجی دنیا کو اپنے انداز گفتار سے پُربہار بناتا رہا۔— معاش کے لیے شوکت کی محنت کا اندازہ شاید آپ نہیں کر سکیں گے۔ جس پر ایسی ہی بیت رہی ہو۔ اس کے سوا کون جانتا ہے کہ یہ ہنسانے والی مشین اپنے ایندھن کے لیے کیا کیا جتن کر رہی ہے۔ اس نے بارہا مجھے میرے استفسار پر اشک آلود آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے آپ بیتی سنائی تو مزاح اور ظرافت کے پیچھے شوکت کی اصل خونچکاں صورت نظر آئی ——— !

جنگ کے زمانے میں شوکت نے میرے اسٹاف میں صوبہ متحدہ کے اندر تبلیغ مقاصد جنگ کے سلسلے میں بطور ڈائرکٹر اہتمام بھی کام کیا تھا اور میں نے لکھنؤ میں اس کی قیام گاہ پر بھی اس کی میزبانی کے چند مرتبہ طور طریق دیکھے ——— مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔ لیکن میں تحسین کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے پہلے فرزندوں کی تربیت اور پسران کو برسر روزگار بنانے میں کس قدر پدرانہ شفقت اور ذمہ داری اختیار کئے رکھی اور اپنی پہلی بیگم کو آخری دم تک باقاعدہ وہ جس قدر روپیہ مہیا کرتے تھے، وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ الحمدللہ ان کے دو فرزند اچھا خاصا کما رہے ہیں تیسرا تعلیم کے آخری مدارج طے کر لینے کے قریب ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ مرحوم شوکت کے احساس ذمہ داری نے پہلی بیوی اور بچوں کے سلسلے میں وہ سب کچھ کیا ہے۔ جو ایک شریف ترین مسلمان کو کرنا چاہئے تھا۔ یہ بچے سعید اور سعادت مند ہیں۔ ماشاءاللہ برسر روزگار ہیں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی کریں۔ وہ اپنی والدہ کو تو بے نیاز کر ہی چکے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی دوسری والدہ کو بھی نہ بھولیں گے۔

آہ ——— دوسری بیوی جو شوکت کے بڑھاپے کا سہارا تھی۔ جس کو میں نے ایک لمحہ بھی شوکت کی خدمت سے غافل نہیں دیکھا

اور اس بیوی سے تین بچیاں ——— !

شوکت کو بیماری کے عالم میں جس نے بھی دیکھا ہے، وہ شاہد عادل ہے کہ اپنی موت پر تو وہ ہنستا ہی تھا۔ بلکہ شاید عزرائیل کو بھی کوئی فقرہ چُست کئے بغیر اُس نے نہ چھوڑا ہوگا۔ لیکن وہ روتا تھا۔ روتا کیوں تھا۔ اس لیے کہ اس بیوی کی بیچارگی اور ان تین بچیوں کی یتیمی اُس کو کھائے جا رہی تھی۔ میں نے اسی لیے اخبار جنگ کے ذریعے پاکستان کے اہلِ دل سے استدعا کی تھی۔ مگر اللہ کریم جو سننے والا ہے اُس نے سنی تو، لیکن بندے کے لیے بہتر کیا ہے جاننے والا بھی تو وہی ہے ——— !

میر خلیل اور میر جمیل تک میری رسائی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ دونوں بھائی جان و مال ایمان کے ساتھ کوشاں رہے اور اب یتیم بیٹیوں اور ناچار بیوہ کے سلسلہ میں بھی جنگ کے ادارے کے ساتھ شوکت سے وابستگی سے بھی بہت زیادہ شوکت کی شخصیت اور

[illegible] [illegible] کا [illegible] کی [illegible] خبر دے رہے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ دوبارہ [illegible] لکھیں گے۔ یہ عجز [illegible] بہت بہتر لوگوں نے یا تو [illegible] کے ذریعے سے ہی [illegible] شوکت کی زنجیریں بنائی ہیں اور [illegible] سے بھی [illegible] [illegible] شوکت کی [illegible] شوکت کے تین ستاروں کو [illegible] نہیں ہو سکے

[illegible] ہو گئے ہیں آپ شوکت کی [illegible] قریب [illegible] اور لذت لینے والے ان کے تازہ بتازہ لطائف و ظرائف سے تو [illegible] محروم ہو گئے لیکن یہی چاہئے کہ ان کی شائع شدہ کتابوں کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کے لیے منتخب کریں اور جو [illegible] ایسی کتابی صورت اختیار نہیں کر سکے [illegible] کتابی صورت میں [illegible] [illegible] [illegible] حالت تو یہی ہے [illegible]

مخلص [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

شوکت تھانوی کی یاد میں

فیض احمد فیض

شوکت تھانوی مرحوم بھی ایک محفل سے اُٹھ گئے۔ اس ہمدمِ دیرینہ کی جدائی پر احباب کے دل پر جو گزری سو گزری لیکن ذاتی غم سے زیادہ اس بات کا دُکھ ہے کہ محفلِ وطن میں جہاں رُلانے کو بہت کچھ ہے۔ لیکن ہنسانے کو شوکت تھانوی تھے و ان کی جگہ اب کون سنبھالے گا۔ برسوں سے اُن کا نام تکیۂ کلام کی صورت گھر گھر وردِ زبان تھا۔ یہ فقرہ، وہ لطیفہ، وہ نقل۔ ہزار جگہ ہزار بات شوکت تھانوی سے روایت تھی۔ پھر اُن کے لطفِ صحبت پر مستزاد، آنکھ اوجھل یاد سے دُور، وہ بیسیوں محفلیں۔ بیسیوں صورتیں اور طرح طرح کے بزرگ بھی تھے۔ جنھیں مرحوم اپنی شعبدہ بازی سے دم بھر کو زندہ کر لیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کا کوئی مشاعرہ۔ پنجاب کے کسی رئیس کی بیٹھک۔ دہلی میں کسی حکیم کا مطب۔ یہ ثاقب لکھنوی ہیں۔ یہ نوح ناروی ہیں۔ یہ احسن مارہروی ہیں۔ یہ فلاں حکیم صاحب ہیں۔ اور یہ فلاں نواب صاحب۔ شوکت مرحوم اپنے ممدوح کی نقل نہیں اتارتے تھے۔ خود وہی بن جاتے تھے۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ جس صحبت کا تذکرہ کرتے اس کی فضا اُس کا سماں، اس کا پورا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا یوں تھا کہ اُن کے دم سے صرف شوکت ہی ایک عالم زندہ تھا۔ اب جو وہ رخصت ہوئے تو اِن اَن گنت محفلوں کا لطف بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن یہ تو ان کے گوناگوں کمالات کا بہت چھوٹا سا جزو تھا۔ اُن کی ذہین اور بوقلموں شخصیت نے جولانیٔ طبع کے لیے جو بھی میدان منتخب کیا اس میں یکساں جوہر دکھائے۔ نظم، نثر، تمثیل، افسانہ، شخصیت نگاری، نامہ نویسی، ریڈیو، صحافت، بذلہ سنجی، بدیہہ گوئی اُن کی طبع زبان اور قلم یکساں۔ ہر میدان میں یکساں طراری سے رواں رہتے۔ اُن کی ظرافت میں تکلف اور آورد کو دخل نہ تھا۔ بے تکلف اور بے تکان، جیسے بولتے ویسے لکھتے۔ نہ گفتار میں اُن کی طبع کو غیر حاضر پایا نہ تحریر میں کبھی انھیں قلم پر زور دیتے دیکھا اور اس مشاقی کا راز ریاضت نہ تھی، ان کی خداداد ذہانت تھی جو اکتساب کی محتاج نہیں ہوتی۔

شوکت مرحوم اپنی ہمعصر دنیا کے ان محسنوں میں سے تھے جنھیں زندگی کی آسائشوں میں بہت کم حصہ ملا لیکن وہ اپنے سوا سب کے لیے فرحت اور انبساط کے اسباب بہم کرتے رہے۔ اب جو وہ نہیں ہیں تو اپنی محرومی پر رنج ہے کہ ان کی باغ و بہار صحبت اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گی اور اس سے زیادہ رنج ان کی محرومی پر ہے جو اس لطف سے کبھی بھی آشنا نہ ہو سکیں گے۔

افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

گوہرِ مخزنِ ظرافت

کنہیالال کپور

شوکت تھانوی، جو جب تک بقیدِ حیات رہے، عوام اُن سے خوش اور نقاد نالاں رہے۔ مؤخر الذکر کو مرحوم سے طرح طرح کی شکایتیں تھیں۔ مثلاً شوکت تھانوی شوکت تھانوی کیوں تھے؟ رشید احمد صدیقی، پطرس، عظیم بیگ چغتائی یا فرحت اللہ بیگ کیوں نہیں تھے؟ شوکت تھانوی عوام میں ہردلعزیز کیوں تھے؟ شوکت مزاح نگار ہونے کے علاوہ فلسفی کیوں نہیں تھے؟ شوکت [illegible] کیوں تھے؟ شوکت اپنے عہد کے [illegible] کیوں نہیں تھے؟ بلاشبہ یہ سب خامیاں شوکت میں تھیں۔ لیکن اگر خدا لگتی کہی جائے تو وہ ان میں سے کسی خامی کے لیے مطلقاً ذمہ دار نہیں تھے۔ اگر وہ شوکت تھانوی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے۔ تو یہ امر ان کی خود اعتمادی اور دیانتداری پر دلالت کرتا ہے۔ آخر یہ کہاں کی منطق ہے کہ کسی مزاح نگار سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنی انفرادیت کو ترک کر کے اپنے کو دوسروں میں مدغم کر دے۔

خدا کا شکر ہے کہ قریب قریب سب نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ شوکت عوام میں حد درجہ مقبول تھے۔ وہ شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں یا دیدہ و دانستہ اس سے آنکھیں چرانا چاہتے ہیں کہ شوکت خواص میں بھی اتنے ہی ہردلعزیز تھے۔ کیونکہ رؤسا، علما اور ادبا بھی ان کے اتنے ہی مداح تھے جتنے کہ عوام۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی ہردلعزیزی کا خمیازہ ان کے مداحوں کو اٹھانا پڑتا تھا۔ وہ جب بھی شوکت کی تازہ تصنیف خریدتے۔ ان کا کوئی نہ کوئی دوست اسے اٹھا کر لے جاتا۔ مجھے اس بات کا ذاتی تجربہ ہے کہ شوکت کی تصانیف دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا۔ کہ میری میز پر مشہور ادبا کی تازہ ترین تصانیف پڑی ہیں ان میں سے ایک کا مصنف شوکت بھی ہے۔ میرے احباب جن میں سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں کسی اور کتاب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن شوکت کی تازہ تخلیق پر اس طرح جھپٹتے ہیں جیسے بھوکا آدمی خوانِ نعمت پر۔ اور ان کی اس حرکت کو دیکھ کر مجھے ان پر غصہ اور شوکت پر پیار آنے لگتا ہے۔ اور اسی وقت فوراً مجھے ایک بھولا بسرا واقعہ یاد آ جاتا ہے۔

یہ شاید ۱۹۴۵ء کی بات ہے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور میں کافی ہاؤس میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ ایک مشہور ناشر جو اپنی بھاری بھرکم جسامت کی وجہ سے مولوی اور پہلوان کا مرکب معلوم ہوتا تھا۔ ہماری میز کے قریب

آیا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے ہم تینوں سے درخواست کی ”ہمیں بھی کبھی خدمت کا موقع دیجئے۔“

منٹو نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔ ”بس آپ شوکت تھانوی کی کتابیں چھاپا کیجئے۔“ کرشن اور میں نے منٹو کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ”منٹو صاحب ٹھیک فرما رہے ہیں۔“ ایک لمحہ کے لیے ناشر دم بخود ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ہم تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”گستاخی معاف۔ ایک بات عرض کر سکتا ہوں؟“

”ہاں ہاں بڑے شوق سے۔“

”آپ اپنے کو عظیم ادیب سمجھتے ہیں اور شاید عوام کے علمبردار بھی۔ لیکن معاف کیجئے گا آپ کی تصنیفات عوام نہیں خریدتے۔ کالج کے چھوکرے اور چھوکریاں خریدتی ہیں۔ لیکن وہ تو عوام میں سے نہیں ہیں۔ ادھر شوکت تھانوی کی تخلیقات کا یہ حال ہے کہ ہم صرف اس کی نئی کتاب کے نام کا اعلان کرتے ہیں کہ پانچ ہزار جلدیں بُک (BOOK) ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ آپ کی کسی کتاب کا ایڈیشن ایک ہزار سے تجاوز نہیں کرتا۔ شوکت تھانوی کچھ بھی ہوں۔ عوام کے ادیب ہیں۔ وہ عوام کے لیے لکھتے ہیں..... اچھا السلام علیکم۔“

وہ کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔ اور ہم تینوں پر گویا برف گر گئی۔ دل ہی دل میں ہمیں شدید خفت کا احساس ہوا۔ کیونکہ اس کی بات صداقت پر مبنی تھی۔ شوکت کو عوام سے اور عوام کو شوکت سے والہانہ عشق تھا۔ وہ صحیح معنوں میں عوامی ادیب تھے۔ اور ہم جو بزعم خویش اپنے کو عوام کا حامی سمجھتے تھے۔ ان سے اتنے ہی دور رہے جتنا کفر ایمان سے ہوتا ہے۔

شوکت کی یہی خوبی کچھ نقادوں کے نزدیک ان کی سب سے بڑی خامی ہے۔ میری رائے میں عوام کے لیے لکھنا جرم ہے نہ گناہ۔ آج تمام اشتراکی ممالک میں عوام کے لیے لکھنا باعثِ فخر خیال کیا جاتا ہے۔ استالین (STALIN) نے ایک بار ادیبوں سے خطاب کرتے وقت ایک یونانی دیوی کی مثال دی تھی۔ جسے کوئی شخص اس وقت تک پچھاڑ نہیں سکتا تھا جب تک اس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہتے۔ آخر ایک پہلوان نے اسے ہوا میں اچھالا۔ اور اس پر کاری وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ استالین نے اس کہانی سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا تھا ”یاد رکھیے۔ وہ ادیب کبھی فنا نہیں ہو سکتا جس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہیں گے۔“ شوکت تھانوی خدانخواستہ اشتراکی ادیب تو نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ زمین سے اپنا رابطہ قائم رکھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ نقادوں کی کڑی تنقید کے باوجود زندہ رہے۔ اور اپنی زندگی میں زندہ جاوید بھی ہو گئے۔

کچھ نقادوں کو شکوہ تھا کہ شوکت کی ذہنیت خام تھی۔ ان کا شعور ناپختہ تھا۔ وہ دوسرے یا تیسرے درجے کی چیزیں لکھا کرتے تھے۔ مجھے اس رائے سے بھی اتفاق نہیں۔ جو شخص اتنا کچھ لکھے چاہے وہ ٹیگور ہو منشی پریم چند یا اقبال ہو ہمیشہ اعلیٰ پائے کے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ ٹیگور کو ہی لے لیجئے۔ آپ کو اس کے کلیات میں ایسی چیزیں مل جائیں گی جنھیں پڑھ کر آپ کا سر ندامت سے جھک جائے گا۔ خود ٹیگور نے اپنی مشہور عالم تصنیف ”گیتانجلی“ کے بارے میں کہ جس پر اسے نوبل پرائز ملا لکھا ہے ”میں یہ نظمیں رات کے وقت چھپ کر لکھا کرتا تھا۔ کیونکہ ان میں ادبیت کا فقدان

انھیں لکھتے وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کسی نے آ کے دیکھ لیا تو"

اس میں مطلقاً شک نہیں کہ شوکت نے دوسرے ادیبوں اور بے لاگ جملے بھی لکھے ہیں بعض اوقات بچکانے مضامین میں فرسودہ یا عامیانہ اشعار بھی نقل کیے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے اعلیٰ قسم کے ادب کی بھی تخلیق کی ہے۔ میرے اس دعوے کے ثبوت میں "مضامین شوکت"، "شیش محل"، "بار خاطر" اور "قاعدہ بے قاعدہ" پیش کی جا سکتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے "شیش محل" پہلی بار پڑھی تو میری ملاقات ایک نئے شوکت سے ہوئی۔ یہ شوکت جو محض ایک فقرے کے شیشے میں پری اتار سکتا تھا۔ وہ جس کے اسلوب بیان کے ایجاز و اختصار کا یہ عالم تھا کہ اس کا ایک ایک جملہ دوسروں کے پورے مضمون پر بھاری تھا۔ کوزے میں دریا کو بند کرنے کی بہتوں نے کوشش کی ہے لیکن یا تو انھیں کوزہ دستیاب نہیں آیا یا وہ "ذرا سی آبجو" کو "بحر بیکراں" کے ساتھ خلط ملط کر گئے ہے۔ اس محاورے کو عملی جامہ پہنانے کی سعادت صرف شوکت کے حصے میں آئی۔ اور اُن کے قلم سے اتنے خوبصورت پھول جھڑے جن کی تازگی اور رعنائی ابدالآباد تک قائم رہے گی۔ "بار خاطر" شوکت کا شاہکار ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ اس کو لکھنے کے بعد اپنا قلم توڑ دیتے تو بھی محض اِس تصنیف کی بدولت اُن کا نام زندہ رہتا۔ "بار خاطر" سے زیادہ کامیاب تحریف ابھی تک نہیں لکھی گئی اور نہ مستقبل قریب میں اس کے لکھے جانے کا امکان ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شوکت کے طنز و مزاح میں شائستگی یا گہرائی نہیں۔ انھیں چاہیے "بار خاطر" کا بار بار مطالعہ کریں۔

عموماً دیکھا گیا ہے کبھی کبھی ایک اچھا مضمون مصنف کے حق میں رحمت کی بجائے زحمت ثابت ہوتا ہے۔ اسی قسم کا سانحہ شوکت کے ساتھ بھی پیش آیا۔ انھوں نے ایک مضمون بعنوان "سودیشی ریل" لکھا۔ اور "سودیشی ریل والے شوکت" کے لقب سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ اس مضمون کے بعد انھوں نے سینکڑوں کامیاب مضامین لکھے جنھیں بیشتر نقادوں نے اس بنا پر پڑھنے سے انکار کر دیا کہ سودیشی ریل سے بھلا بہتر مضمون اب شوکت صاحب کیا لکھیں گے۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ "سودیشی ریل" اُن کی ابتدا تھی نہ کہ انتہا۔ میں ایسے نقادوں کو بھی جانتا ہوں جنھوں نے "سودیشی ریل" بھی نہیں پڑھا۔ لیکن جو اس امر کے باوجود یہ فتوے صادر کرنے کو تیار ہیں کہ شوکت کا مزاح سطحی ہے۔ تنقیدی سطحی پن کی اِس سے بدتر مثال مشکل سے ملے گی!

اور پھر وہ نقاد ہیں جو تنہائی میں شوکت کے مضامین مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ لیکن کھلے بندوں اُس کی مذمت کرتے ہیں کیونکہ ایسا کرنا فیشن میں داخل ہے ان لوگوں پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزہ بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

شوکت صاحب تعریف و تنقیص سے بے نیاز تھے۔ میں نے انھیں کبھی کسی نقاد کی شکایت کرتے نہیں سنا۔ وہ جانتے تھے کہ سب سے بڑا نقاد "وقت" ہے اور اگر وہ اُن کے مضامین پر سبحان اللہ کے ڈونگرے برسا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آنے والی نسلیں انھیں فراموش کر سکیں گی۔ انھیں نہ کرم کی خواہش تھی نہ ستم کا شکوہ۔ فطرتاً وہ ظریف اور

بذلہ سنج واقع ہوئے تھے اور انھیں خیال، واقعہ یا کردار سے مزاح پیدا کرنے کے فن میں قابلِ رشک مہارت حاصل تھی۔ چونکہ انھوں نے کسی مغربی ادیب کا تتبع نہیں کیا اس لیے ان کی ظرافت کے نمونے سو فیصد مشرقی تھے۔ ان کے تمسخر و استہزا کا مقصد دل جوئی تھا، دل شکنی نہیں۔ وہ نہ کسی "ازم" (ism) سے تعلق رکھتے تھے اور نہ انھوں نے کبھی اپنے طنز و ظرافت کو اصلاح و تربیت کا ذریعہ بنایا۔ ان کی زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے ہنسانا تھا۔ وہ مجسم "اودھ پنچ" تھے۔ اور شاید اسی لیے "اودھ پنچ" کی شان میں کہا گیا اکبر الٰہ آبادی کا قصیدہ مرحوم شوکت کا بہترین مرثیہ ہے:-

اے گوہرِ مخزنِ ظرافت — اے جوہرِ معدنِ لطافت
سرمایۂ انبساطِ خاطر — تسکینِ دل و نشاطِ خاطر
دیباچۂ دفترِ فصاحت — عنوانِ صحیفۂ بلاغت
رنگینی میں غیرتِ گلستاں — شوخی میں حریفِ برقِ تاباں
معقول مزاح ہے تو یہ ہے — شرعاً مباح ہے تو یہ ہے
ہے خلقِ خدا قتیل اس کی — حاسد کا حسد دلیل اس کی
ہر کس کہ بدید گفت خوب است — باللہ مفرحِ القلوب است

صاحبِ طرز ادیب

سید ہاشم رضا

شوکت تھانوی کو مرحوم لکھتے ہوئے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے جب وہ راولپنڈی کلب کی ایک تقریب میں جو عید اضحیٰ کے سلسلے منعقد کی گئی تھی بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہک رہے تھے میں نے ان سے "عیدکارڈ" کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا آپ کے کارڈ کی طباعت، لطافت اور نفاست دیکھ کر گمان گزرا کہ یہ کسی والیٔ ریاست کا کارڈ ہے تو کہنے لگے کہ ہاں مجھے محسوس بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے آتش کا شعر پڑھا ؎

بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں ۔۔۔ حواسِ خمسہ سے بڑھ کر کوئی سپاہ نہیں

اس دن جب یہ خوش گپیاں ہو رہی تھیں کسے خبر تھی کہ ان کے حواسِ خمسہ کی سپاہ میں ایسی افراتفری پیدا ہو چلی تھی کہ ان کا آخری وقت عیدِ قرباں کے ایک دو دن پہلے ہی آ جائے گا۔ ان کی بیماری کی خبریں اخباروں میں پڑھیں لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ آج سے پہلے نہ ہوا اور آج جبکہ بہت سے دلوں میں اُن کی یاد میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اُن کی شخصیت کا بھی اندازہ ہو رہا ہے، اُن کی ذات ایک انجمن تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، نواسنج بھی تھے اور بذلہ سنج بھی۔ حقیقت نگار بھی تھے اور افسانہ نگار بھی۔ ڈرامہ نویس بھی تھے اور ایکٹر بھی۔ قصہ گو بھی تھے اور تمثیل نگار بھی۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی، قطعات بھی لکھے اور مرثیے بھی، اُن کی نثر اور نظم میں ایک چیز جو سب سے زیادہ نمایاں تھی وہ ان کی اسٹائل تھی۔ صد حیف کہ آں ساقی نماند و آں قدح بشکست

ان کی تصنیف میں ہندوستان اور پاکستان کی بہترین روایات اور قدروں کا تذکرہ ملے گا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ملک اور ملت کی کمزوریوں کا بھی پتہ چلے گا۔ "سودیشی ریل" کی روانی کو کون پڑھنے والا بھلا سکے گا۔ "قاضی جی" کی شگفتہ بیانی کو کون سننے والا بھول سکے گا۔

انھوں نے جنت نگاہ اور فردوس گوش دونوں کے لیے سامان مہیا کیا۔

اُن کی وفات کی خبر سن کر مجھے ایک اور صاحبِ طرز کی یاد آئی یعنی ظریف لکھنوی۔ ان کے دمِ آخر کا نقشہ ان کے بھائی ستم لکھنوی نے یوں کھینچا تھا۔ ؎

جو اُٹھ نہ سکتا بے سہارے وہ شورِ محشر اٹھا کے اُٹھا ۔۔۔ ستم ظریفی تو دیکھئے گا، ہنسانے والا رُلا کے اُٹھا

اور بالکل یہی تاثر شوکت تھانوی کی موت کا بھی ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

شوکت تھانوی

شاہد احمد دھلوی

خدا بخشے شوکت تھانوی ان لوگوں میں سے تھے جو روتوں کو ہنساتے تھے۔ ان کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی تھی۔ عجب زعفران زار شخصیت تھی مرحوم کی۔ چلبلے آدمی تھے، ٹکے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کی رگوں میں خون کے بدلے پارہ دوڑتا تھا۔ تڑت پھڑت، یہ آئے وہ گئے۔ آدمی کیا تھا چھلاوا تھا۔ بڑی جان تھی مرنے والے میں۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ اب بھی وہ آنکھوں ہی، آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ بھلا جس میں اتنی زندگی اور زندہ دلی ہو وہ بھی مر سکتا ہے؟ مگر یقین کرو یارو کہ شوکت واقعی مر گیا۔ روتوں کو ہنسانے والا ہنستوں کو رونا چھوڑ گیا۔ میں اس کے حد سے بڑھے ہوئے خلوص کو دیکھ کر کہا کرتا تھا "دیکھ لینا یہ شخص ایک نہ ایک دن ایسا دھوکہ دے گا کہ بلبلاتے ہی رہ جاؤ گے۔" دیکھ لیا نا؟ تیس سال کے تعلقات کا ذرا سا بھی خیال نہیں کیا اور اکیلا ہی سدھار گیا۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ ساتھ ہی چلتا۔ ہر کام میں جلدی، زندگی میں بھی جلدی، مرنے میں بھی جلدی —

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

شوکت تھانوی کا نام پہلی بار اُس وقت سنا جب ۳۵ سال اُدھر کسی نے بتایا کہ "نیرنگ خیال" کے سالنامہ میں ان کا ایک مضمون "سودیشی ریل" پڑھنے کے لائق چھپا ہے۔ رسالہ منگا کر پڑھا، واقعی طبیعت پھڑک گئی۔ اب بھی جب کبھی وہ مضمون یاد آجاتا ہے تو ہنسی آجاتی ہے۔ جب اِس مضمون کی شہرت عام ہوئی تو کسی حاسد نے پتہ چلایا کہ کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون چھپا تھا، یہ مضمون اُس کا ترجمہ ہے۔ ہمیں بھی اس کی ٹوہ لگ گئی۔ اصل مضمون کا تراشہ حاصل کیا۔ ترجمہ تو ترجمہ اِن دونوں مضمونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ بہت سے بہت یہ کہا جا سکتا تھا کہ مرکزی تصور اُس مختصر خاکے سے لیا گیا تھا۔ شوکت تھانوی نے اِس تصور کو اپنے رنگ میں اِس خوبی سے پیش کیا تھا کہ یہ سولہ آنے (یا سو پیسے؟) انہی کی تخلیق ہو گئی تھی۔ اور جو خوردہ گیری ہی پہ آؤ تو شیکسپیر کا کونسا ڈرامہ طبعزاد کہلانے کا مستحق ٹھہرے گا؟ یونہی چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے، اور بڑا فنکار غاصب ہی ہوتا ہے۔

اس مضمون کے لکھنے سے پہلے بھی شوکت تھانوی بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ پہلے لکھنؤ کے ایک اُردو اخبار میں کالم لکھتے

یہ پرچہ اخباروں میں چھپنے لگے۔ مہر و ماہ بھی [illegible] جب [illegible] کے اصلی [illegible] پائی۔ ان کے والد ایک بڑے پولیس افسر تھے۔ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شوکت [illegible] میں بھرتی ہو گئے تھے [illegible] شعر و ادب کے چکر میں پڑ جاتے ہیں [illegible] ہوتے ہیں؟ [illegible] کے ساتھ زیادہ گندا۔ یہ بڑی ہی خوش قسمتی والی [illegible] ہیں اور یہ خاتون وہ ہیں جن کے شوہر [illegible] شدہ خاتون ہیں جو شوکت تھانوی کے چار [illegible] ہیں۔ [illegible] شوکت کو شاعر و ادیب اور [illegible] بنا کر چھوڑا۔ ورنہ [illegible] سے شوکت [illegible] بیٹھے مجبور [illegible] لکھنؤ میں [illegible] اصل نام محمد عمر، تخلص شوکت [illegible] تھانوی کا اضافہ [illegible] ان کی مقبول [illegible] جانتے ہیں۔

کہ چہرہ [illegible]

۳۲ء کے اوائل میں ایک دن صبح ہی صبح اطلاع ملی کہ دو صاحب ملنے آئے ہیں۔ نام پوچھے تو نام نہیں بتائے۔ ان کی یہ بد اخلاقی طبیعت کو ناگوار گزری۔ میں نے کہا، مردانہ گھر کی بیٹھک میں انھیں بٹھا دو۔ میں اسی وقت [illegible] میں نے دل میں سوچا کہ انھیں سویرے آنے اور نام نہ بتانے کی سزا ملنی چاہئے۔ چنانچہ نہا دھو کر ناشتہ کیا اور آدھ گھنٹہ بعد مردانے میں آیا۔ دونوں انتظار میں شاید اکتا گئے تھے۔ میرے داخل ہونے پر وہ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ یہ دو نوجوان تھے جنھیں دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد کے مرزا ظاہر دار بیگ یاد آ گئے۔ دونوں چھیلے بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک جو زیادہ چونچال تھے ذرا آگے بڑھ کر بولے "ہمیں پہچانیے"۔

میں نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی، لمبا قد، تنگ جسمانی، گورا چہرہ، آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، شریر سی نڈر آنکھیں، [illegible]، لبوں پر پان کی ہلکی سی سرخی، ترشی ہوئی مونچھیں، [illegible] ہوئی بے شکن اچکن، چست پاجامہ، وارنش کا پمپ شو، داہنے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی۔ ان کی تصویریں دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا——

"شوکت تھانوی"۔ مسکرا کر بولے۔ "آپ نے ٹھیک پہچانا"۔ یہ کہہ کر معانقہ کیا۔ پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے بولے "اور یہ؟"

میں نے انھیں بھی سر سے پیر تک جانچا۔ تقریباً ایک ہی سا حلیہ تھا دونوں کا، سوائے اس کے کہ ان کے چہرے پر عینک نہیں تھی۔ میں نے کہا "یہ آپ کے نفسِ ناطقہ نسیم انہونوی ہو سکتے ہیں"۔ شوکت نے کہا "بھئی خوب اندازہ لگایا"۔ نسیم صاحب بھی آگے بڑھ کر گلے ملے۔ ان کا پرچہ "حریم" نکلتا تھا اور ساقی کے تبادلہ میں آتا تھا۔ اب شوکت اور نسیم دونوں نے مل کر "سرپنچ" ایک مزاحیہ اخبار (ہفتہ وار) نکالنا شروع کیا تھا۔ نسیم صاحب بھی مضامین لکھتے تھے مگر کوئی مضمون ان کا مشہور نہیں ہوا تھا۔ محنتی آدمی تھے۔ ان کی محنت اور شوکت کی ذہانت نے مل کر بڑا کام کیا۔ اور اب تو خود نسیم صاحب بھی ایک بھاری بھرکم مصنف ہیں۔

جاڑوں کے دن تھے۔ میں نے اِن حضرات سے کہا کہ آپ کل صبح ہمارے ساتھ نہاری کھائیے۔ یہ دلی کی ایک خاص چیز ہے۔ سارے دلی والے ہی اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر اس کے کھانے کا لطف علی الصبح کا ہے۔ اس لیے آپ حضرات چھ بجے آجائیے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے ماموں چشتی صاحب سے کہا کہ کل صبح کے لیے نہاری کا انتظام کر دیجیے۔ میں خود چونکہ رات کو دیر سے سوتا ہوں اس لیے صبح دیر سے اٹھتا ہوں۔ اس دن الارم لگا رکھا تھا۔ چشتی صاحب نہاری کا دیگچہ اور دوسرے لوازمے لیے ہوئے چھ بجے سے پہلے پہنچ گئے۔ انگیٹھی دہکا دی گئی۔ اس پر گھی کڑکڑا دیا گیا۔ نہاری پر سے تار اتار کر الگ کر دیا گیا اور جب گھی میں پیاز سرخ ہو گئی تو پیاز الگ ایک پلیٹ میں نکال لی اور گھی سے نہاری کو داغ دیا۔ چھ بجے، ساڑھے چھ بجے، سات بجنے لگے۔ چشتی صاحب نے کہا "ابھی تمھارے مہمان نہیں آئے"۔ میں نے کہا "تکلف میں کہیں رہ گئے۔ بس آتے ہی ہوں گے"۔ وہ صاحب سات بجے تک نہ آئے، ساڑھے سات ہوئے مگر نہ آئے۔ انتظار میں طبیعت بڑی بدمزہ ہوئی۔ جوانی کی ترنگ، اُس زمانے میں میں ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ جب آٹھ بجے تو میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے چشتی صاحب سے کہا "ماموں جان، یہ سب سامان زنانہ میں بھیج دیجیے"۔ وہ گھبرا کر بولے "کیوں بھلا کیوں؟ تھوڑا سا انتظار اور کر لو"۔ مگر میرا پارہ چڑھ چکا تھا۔ میں نے کہا "اب اگر وہ آئیں گے بھی تو میں نہیں کھلاؤں گا"۔ ماموں جان نے کہا "یہ بڑی نامناسب بات ہوگی"۔ مگر میں نے سارا سامان اٹھوا کر اندر بھیج دیا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ کوئی نو بجے دونوں حضرات تشریف لائے۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ مہمان آگئے۔ میں نے بیوی سے کہا "چائے اور پان بھیجنا"۔ انھوں نے پوچھا "اور نہاری؟" میں نے کہا "اب وہ نہاری کہاں رہی، وہ تو باسی قورمہ ہو گیا۔ اسے مت بھیجنا"۔ انھوں نے سر کو حرکت دی جیسے کہہ رہی ہوں "عجب اوندھی مت کا آدمی ہے"؟ اور باورچی خانہ میں خاموش چلی گئیں۔ میں مردانے میں آیا تو شوکت صاحب نے کہا "ہمیں کچھ دیر ہو گئی"۔ میں نے کہا "جی ہاں۔ م

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند"

بولے "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ سے ملانے کے لیے جن احباب کو بلایا تھا انھوں نے دو گھنٹے تک آپ کا انتظار کیا۔ اس کے بعد کھا پی کر رخصت ہو گئے"۔

"یعنی نہاری ختم؟"

"جی ہاں۔ دلی کے شرفا سورج نکلنے سے پہلے ہی نہاری کھا چکتے ہیں۔ ویسے بازاروں میں مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کے لیے دن چڑھے تک بکتی رہتی ہے"۔

"یہ تو بُرا ہُوا"۔

"وقت کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ بُرا ہی ہوتا ہے۔ اب آپ کچھ اور باتیں کیجیے۔ کہیے کل کس کس سے ملے؟"

شوکت صاحب نے بتایا کہ سردار دیوان سنگھ، ایڈیٹر ریاست سے ملے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب سے ملے اور پروفیسر اکبر حیدری سے ملے جو اس قدر تپاک سے ملے کہ گھنٹوں اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ حکیم یوسف حسن صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال

جی [illegible] وہاں تشریف رکھتے تھے۔ اُن سے بھی ملاقات ہوئی [illegible] کے کہنے پر ہی پروفیسر صاحب نے اخبار

یہ پروفیسر صاحب تھے تو [illegible] انبالے کے مگر دلی ہی میں آ کر بس گئے تھے۔ اس زمانے میں بعض لوگ [illegible] فاضل اور منشی [illegible] تھے۔ بہت پڑھنے لکھنے [illegible] استاد [illegible] تھے [illegible] کے باعث اس پیشے کو [illegible] چکے تھے۔ اکبر حیدری اچھے وجیہہ آدمی تھے۔ ان کی تعلیم شاید [illegible] مگر ذہانت اور [illegible] اس پیشے میں گھس گئے تھے اور [illegible] بہت بہت پڑھے [illegible] تھے اور [illegible] کے لیے وہ ایک [illegible] جو [illegible] داخل ہو جانے کی وجہ سے خوب بکتی تھیں۔ چنانچہ منشی [illegible] دلی میں آنے کے بعد چند برس کی [illegible] ان کا ایک مکان بھی بن گیا تھا۔ شعر اچھے خاصے کہہ لیتے تھے [illegible] جن میں کسی قدر [illegible] غزل کے سوا ان کے قصائد بھی [illegible] ہونے چلے گئے تھے اور وہ پروفیسر اکبر حیدری مشہور ہو گئے تھے۔ ویسے طبیعت کے جلے بھنے اور ملنے جلنے میں ترش اخلاق تھے۔ [illegible] ان کی میزان نہیں بنتی تھی۔

شوکت صاحب [illegible] ان کے ہاں دعوت میں گئے تو وہاں دو اور ادیب [illegible] سے بھی ملاقات ہوئی [illegible] عشرت رحمانی تھے اور دوسرے اخبار [illegible] حنیف ہاشمی۔ حکیم یوسف حسن صاحب [illegible] تو معمر اور قوی الجثہ آدمی تھے حنیف ہاشمی [illegible] نحیف الجثہ۔ ابھی خاص باتیں [illegible] تھیں کہ حنیف ہاشمی پنجاب اور یوپی کا قضیہ لے بیٹھے۔ اکبر حیدری انبالے کے تھے، نہ اِدھر کے اور نہ اُدھر کے بلکہ بیچ میں۔ بیچارے بار بار اس بحث کو ختم کرنے کی کوشش کرتے مگر حنیف ہاشمی کانپ کانپ کر [illegible] پھر کچھ [illegible] ۔ اِدھر یہ دونوں بھی کچھ کم بولنے والے نہیں تھے۔ پہلے تو انھوں نے کچھ ٹالا مگر جب [illegible] حد سے بڑھنے لگے تو یہ بھی لپٹ پڑے۔ غرض شوکت صاحب نے بتایا کہ فضا اتنی مکدر ہو گئی کہ ہم وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے مگر اکبر حیدری نے پکڑ کر بٹھا لیا اور فوراً کھانا منگوایا۔ مگر دلوں میں غبار بھرا ہوا تھا، کھانا کیا خاک کھایا جاتا۔ دو چار لقمے زہر مار کرکے وہاں سے پیچھا چھڑایا۔

میں نے کہا "مجھے یہ رُوداد سُن کر مطلق تعجب نہیں ہوا۔ اکبر حیدری جب اکیلے ہوتے ہیں تو نہایت معقول باتیں کرتے ہیں۔ مگر جب دو چار ادیب یا شاعر اُن کے ہاں جمع ہو جاتے ہیں تو پھر ایسے ہی ہنگامے ہوتے ہیں۔ اُن کے گھر کی رونق ہی ہنگاموں پر موقوف ہے۔"

اتنے میں چائے آ گئی۔

شوکت صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا "تو کیا واقعی نہاری نہیں ملے گی؟"

میں نے کہا "نہاری اب آئندہ کسی اور موقعہ پر۔ اب تو آپ چائے پیجیے اور پان کھائیے۔"

اس واقعہ کے بعد شوکت صاحب میری طبیعت سے واقف ہو گئے۔ مجھ سے وہ عمر میں دو تین سال بڑے تھے

مگر وہ مجھے ہمیشہ شاہد بھائی ہی کہتے رہے۔ وہ بڑے بڑوں پر فقرے کس جاتے تھے مگر انھوں نے میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں کیا۔ مذاق البتہ ہوتا رہتا تھا۔

شوکت تھانوی سے میرے تعلقات اڈیٹر اور مضمون نگار کے بھی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بلا معاوضہ نہیں لکھتے۔ جب کبھی ان سے مضمون لکھوانا ہوتا تھا تو انھیں معاوضہ منی آرڈر سے بھیج دیا جاتا تھا۔ اور اس زمانے میں معاوضہ ہی کیا ہوتا تھا؟ دس روپے۔ منشی پریم چند پندرہ روپے فی افسانہ لیتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ کسی نے پندرہ روپے انھیں دیے ہیں تو اُن پر بڑا احسان کیا ہے۔ سو وہ سو میں شوکت تھانوی اپنا ناول دینے پر تلے بیٹھے تھے۔ ایک دفعہ آغا عامر حسن کو زبردستی اپنا مسودہ دے کر کچھ روپے لے گئے۔ آغا صاحب نے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ کہا، "جو جی چاہے نام رکھ لو" آغا صاحب کو شوخی سوجھی۔ کتاب کے ٹائٹل پر ایک گیدڑ بنوایا اور اس گیدڑ کا چہرہ شوکت تھانوی کا بنوایا۔ گیدڑ کو پنجرے میں بند دکھایا اور کتاب کا نام رکھا "مجھے خرید لو"۔ یہ ادب کے عروج اور ادیبوں کی پستی کا وہ زمانہ تھا کہ اچھے خاصے مشہور ادیب اپنے مسودے کے ساتھ دو دو سو روپے بھی دیتے تھے کہ للہ ہماری کتاب اپنے مکتبے سے چھاپ دو۔

شوکت تھانوی میں جو بات کہئے یا عیب یہ تھا کہ اُن کے کسی کام میں استواری نہیں تھی۔ وہ اتنے بڑے آدمی تو تھے نہیں کہ زمانے کو اپنے ساتھ کر لیتے۔ اس لیے وہ زمانے کے ساتھ ہو جایا کرتے تھے۔ جب دلی سے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام ہونے لگے تو ایک دفعہ شوکت صاحب کو بھی تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اسے انھوں نے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا۔ اس زمانے میں احمد شاہ بخاری (پطرس) اسٹیشن ڈائرکٹر تھے اور ذوالفقار بخاری ڈائرکٹر پروگرام۔ شوکت صاحب ان دونوں بھائیوں سے مرعوب ہو گئے، کچھ کور بھی دبتی تھی۔ ایک ایک سے ان کی تعریف کرتے پھرتے تھے اور لکھنؤ واپس پہنچنے کے بعد انھوں نے ایک اُردو اخبار میں (جس سے وہ وابستہ تھے) ان دونوں بھائیوں کا نثری قصیدہ لکھا اور اس کا تراشہ انھیں بھیج دیا۔ اس کے بعد میں انھیں دلی مزید پروگراموں کے لیے بلایا گیا اور جب لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انھیں مسودہ نویس کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ ریڈیو میں انھیں اخبار کے مقابلے میں دُگنی بلکہ تگنی تنخواہ مل گئی اور ان کے دلدر دور ہو گئے۔ اخبار نویسی نے انھیں زود نویس بنا دیا تھا۔ ذہین آدمی تھے، فیچر اور ریڈیو ڈرامہ کی تکنیک کو سمجھ لینے کے بعد انھوں نے لکھ لکھ کر مسودوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور صلاحیت کا بھی انکشاف ہوا کہ ریڈیائی اداکاری اچھی کر سکتے تھے۔ نقالی کا مادہ تو ان میں شروع ہی سے تھا، کئی طرح کی آوازیں بنانے پر بھی قادر ہو گئے۔ لکھنے میں انھیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، قلم برداشتہ لکھتے تھے، اچھا لکھتے تھے اور خوش خط تھے۔ میں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں کاٹتے تھے اور سطریں موتی کی لڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لکھنؤ سے انھوں نے اپنا ایک ہفتہ وار فیچر "منشی جی" شروع کیا جس میں کسی معاشرتی خرابی یا وقت کے کسی اہم موضوع پر بڑی دلچسپ بحث ہوتی تھی۔ کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور نہایت کامیابی کے ساتھ۔ جب پاکستان بن گیا تو "منشی جی" نے "قاضی جی" کا روپ دھار لیا۔ یہ فیچر لاہور سے شروع ہوا، پھر شوکت صاحب کراچی آ گئے تو یہاں سے نشر ہونے لگا۔ اور جب وہ راولپنڈی چلے گئے تو راولپنڈی سے۔ اس ہفتہ وار فیچر کی روحِ رواں قاضی جی تھے جن کا پارٹ خود شوکت صاحب ادا کرتے تھے۔ مدتوں

یہ راز سننے والوں کو نہیں معلوم ہوا کہ قاضی جی کی صدا [illegible] قاضی جی [illegible] جو [illegible] وقت میں رہتے تھے [illegible] آپ کے [illegible] باتیں [illegible] شوکت صاحب کو قاضی جی [illegible] کمال کا ثبوت یہ ہے کہ [illegible] کے نقال پیدا ہو گئے تھے، اور حلقوں میں جو دوسرے [illegible] کرتے تھے وہ قاضی جی کی نقل کو [illegible] اور سننے [illegible] تھے۔ شوکت صاحب کے [illegible] اور قاضی جی کے سینکڑوں [illegible] لکھے اور میں نے ان [illegible] ان میں سے ایک کو بھی [illegible] سب میں ایک ہی جیسی شگفتگی اور تازگی پائی۔

بہر کیف ان کی کالم نویسی [illegible] چند [illegible] کے بعد شوکت صاحب [illegible] سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں روزانہ ایک [illegible] کالم [illegible] وغیرہ لکھنا ہوتا تھا [illegible] نواب سعادت علی خاں نے انشاء اللہ خاں سے [illegible] عالم ہو گیا [illegible] ایک ایک سے کہتے۔ کوئی [illegible] نواب کو خوش کرنا [illegible] شوکت کا شگفتہ قلم [illegible] روزانہ چھپتا رہا اور ظرافت کے پھول کھلاتا رہا۔ پنڈی چلنے کے بعد [illegible] اخبار کی ذمہ داری [illegible] مگر وہ بہار تھے [illegible] عنوان سے کام برابر لکھتے رہے۔ [illegible] کے علاوہ بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ [illegible] انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھنی شروع کی تھی۔ [illegible] اس کی چند قسطیں ہی چھپنے پائی تھیں کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پاکستان بننے سے [illegible] ڈھائی سال پہلے وہ [illegible] تنخواہ پر پنچولی فلم کمپنی [illegible] میں مکالمہ نویسی [illegible] چلے گئے تھے اسی کمپنی میں انھوں نے سید امتیاز علی تاج کے ساتھ کام کیا [illegible] بے تکلف لکھنے لگے تھے۔ [illegible] ایک فلم میں انھوں نے اداکاری بھی کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد [illegible]

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

تاج صاحب کے ساتھ وہ بھی لاہور ریڈیو میں آ گئے تھے۔ پاکستان کے تعمیری پروگرام میں انھوں نے "قاضی جی" لکھنا شروع کیا تھا اور سب سے زیادہ مقبول پروگرام انہی کا ہوتا تھا۔

یک در گیر و محکم گیر کے شوکت صاحب قائل نہیں تھے۔ پیسے کے مرید تھے۔ جس کام میں پیسہ زیادہ ملتا دیکھا اسی کو اختیار کر لیتے۔ کالم نویسی سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہاں سے ریڈیو میں آئے۔ ریڈیو چھوڑ کر پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں سانگ پبلسٹی کے محکمے میں چلے گئے۔ وہ محکمہ ختم ہوا تو پنچولی فلم کمپنی میں آ گئے۔ وہ بند ہوئی تو پھر ریڈیو میں آ گئے۔ پھر جنگ اخبار میں چلے گئے۔ پیسہ انھوں نے خوب کمایا، مضامین سے، کتابوں سے، ریڈیو سے، اخباروں سے، مشاعروں سے، مگر کبھی انھیں خرچ کرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو تنگ دست ظاہر کرتے تھے۔ پانوں کی ڈبیا تو وہ ضرور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ سگریٹ تک وہ نہیں پیتے تھے۔ سینما، تھیٹر، کلب، سیر سپاٹا، دعوتیں، ہوٹل بازی، یا کرتی اور بازی، کچھ نہیں۔ البتہ بڑے آدمیوں کے ساتھ لگے رہنے کا شوق تھا، اور انہی کے ساتھ ان کے شوق پورے ہو جاتے تھے۔

شوکت تھانوی کا کمزور پہلو ان کی شاعری تھی۔ وہ ساری عمر شعر کہتے رہے۔ آسی الدنی کی انھوں نے شاگردی بھی اختیار کی۔ مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنایا کرتے تھے، کوئی ۲۵ سال ہوئے انھوں نے اپنے منتخب کلام کا مجموعہ "گہرستان" کے نام سے شائع کیا تھا مگر شاعر کی حیثیت سے انھیں کوئی نمود حاصل نہیں ہوئی۔ شعر کلامِ موزوں کے علاوہ اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ "اور بہت کچھ" شوکت کے کلام میں نہیں تھا۔ چند سال سے انھوں نے مزاحیہ اشعار اور طنزیہ نظمیں بھی لکھنی شروع کر دی تھیں۔ یہ اثر تھا سید محمد جعفری کی صحبت کا جن کے سلسلے میں بھی انھوں نے دو ایک نظمیں کہی ہیں، مگر ان میں بھی وہی آورد اور بے رنگی ہے جو ان کے سنجیدہ کلام کا عیب ہے۔ شوکت صاحب کا معاملہ کچھ اکبر الٰہ آبادی سے ملتا جلتا تھا۔ اکبر کی شاعری کا آغاز سنجیدگی سے ہوا۔ مدتوں اس بحر میں شناوری کرتے رہے مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ پھر ایک روز اتفاق سے غوطہ مار کر جو نکلے تو گوہرِ مقصود ہاتھ آگیا۔ یہ موتی تھے طنز و مزاح کے جن کی مانگ چاروں طرف سے ہونے لگی۔ تب اکبر کو معلوم ہوا کہ ان کا فطری جوہر ظرافت ہے اور انھیں اسی جوہر کو اجالنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے اسے مشق کی سان پر چڑھایا اور مزاولت سے ایسے پہل تراشے کہ اس کی آب و تاب ایک دنیا کے دیکھنے کی چیز بن گئی۔ شوکت صاحب بھی برسوں اخباروں میں لکھتے رہے مگر جب حسنِ اتفاق سے "سودیشی ریل" ان کے قلم سے نکلی تو اس کی مقبولیت نے انھیں بتایا کہ ان کا جوہرِ اصلی مزاح ہے۔ اگر نمود چاہتے ہو تو اسی کو چمکاؤ۔ چنانچہ شوکت نے اپنے قلم کو اسی سے چمکایا اور اس تیز رفتاری سے کہ دو سال ہی میں موجِ تبسم، بحرِ تبسم اور دو اور تبسم، چار مجموعے ان کے مضامین کے شائع ہو گئے۔ مگر ان کی زود نویسی نے انھیں طنز و مزاح کی بلندیوں کو چھونے نہیں دیا۔ آج تک ایورسٹ کی چوٹی کسی نے دوڑ کر سر نہیں کی۔ یہ بڑا جان جوکھم کا کام ہے جس میں قدم قدم پر احتیاط کرنی ہوتی ہے۔ اور کوئی بڑا ہی خوش نصیب ہوتا ہے جو اپنا جھنڈا گاڑ کر لافانی ہو جاتا ہے۔ دوڑ کر ہانپ جانے والوں میں عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی ہیں۔ قدم قدم چل کر چوٹی تک پہنچنے والوں میں رشید احمد صدیقی اور پطرس۔ ثانی الذکر نے زندہ سلامت واپس آجانے کے بعد کوہ پیمائی کا سامان ایک طرف ڈال دیا۔ صدیقی صاحب بہت زیادہ سخت کوش ہیں۔ تن سنگھ کی طرح بار بار چوٹی پر دھاوا بولتے رہتے ہیں۔

شوکت تھانوی خوش اخلاق آدمی تھے، اور جن سے دوستی کا رشتہ قائم کر لیتے تھے ان سے تعلقات میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ مگر وہ دوست صرف انھیں بناتے تھے جن سے انھیں فائدہ پہنچتا رہتا تھا یا فائدہ پہنچنے کی امید ہوتی تھی۔

باتوں کے طوطا مینا بنانا یوں تو سبھی یو۔پی والوں کا شیوہ تھا مگر شوکت صاحب کو اس میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی اسی صلاحیت کے بل بوتے پر بڑے بڑے جنوں کو شیشے میں اتار رکھا تھا اور ان سے کماحقہٗ فائدہ اٹھاتے تھے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ تم بے ہڈی کے آدمی ہو۔ اپنے سے زبردست کے سامنے جاتے ہو تو سوائے جی ہاں جی ہاں کہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے تھے "نہیں، یہ بات تو نہیں ہے"

ایک دفعہ میں شوکت تھانوی کے پاس ریڈیو اسٹیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے شوکت صاحب ایک دم

یہ کہتے ہوئے اور بولے "ایک لطیفہ یاد آگیا۔ مختار صاحب [illegible] زردہ لطیفہ سنانے والے تھے ان کے دوست سے کہا "تم نے تو سوا سیر کی مد ہی نہیں دیکھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوتی ہے؟"
انھوں نے کہا۔ "قبلہ! یہاں اسی طرح کام چلتا ہے۔ پول سنگ بڑی چیز ہے۔"

"یہ نیا لفظ آپ نے کہاں سنا؟"

"پول سنگ۔"

"یعنی؟"

"بٹرنگ — مکھن لگانا — پولسن کا مکھن ہوتا ہے؟"

پول سنگ، بٹرنگ، مکھن لگانا، مکھن بازی کرنا، یہ سب محاورے اسی زمانے میں وضع ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے اسی زمانے میں کہا تھا "آج بازار میں مکھن ہی غائب ہے۔"

"کیوں؟ کیا مکھن بھی چور بازار میں چلا گیا؟"

"نہیں، مختار صاحب نے دن بھر کے لگا دیا سارا۔"

ایسی باتوں پر ہنسی بھی آتی تھی اور جی بھی جلتا تھا۔ مگر یہ عام دستور تھا اور شوکت صاحب کے متعلق کہا جاتا تھا انھوں نے اس کی ٹیکنیک کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا۔ بلکہ اس کے ایکسپرٹ ہو گئے تھے۔ جب عام شکایت یہ ہو کہ

ع تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

تو پھر کسی ایک کو ہدف ملامت کیوں بنایا جائے۔ اگر ایسا ہی خودی اور خودداری کا خیال ہے تو اپنے گھر بیٹھو یا دنیا چھوڑ دو۔

یہ آخر تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنی کمائی خرچ کہاں کرتے تھے۔ صرف دو عادتیں ایسی دکھائی دیں جن میں انھیں ضرور بنی گرہ ڈھیلی کرنی پڑتی تھی۔ ایک پان اور دوسرے لباس۔ پان وہ کھاتے کم تھے، کھلاتے زیادہ تھے۔ انھوں نے ایک بڑی ڈبیا کتاب کی شکل کی بنوائی تھی جس میں پان کا پورا لوازمہ ہوتا تھا۔ یہ ڈبیا تقریب بہر ملاقات بطور بہت کامیاب تھی۔ جو اس سے بچ نکلتا اس پر ڈبیا سے وار کیا جاتا۔ اس میں چھالیا، الائچی، لونگ، جاوتری، [illegible] کی ننھی سی شیشی، کبھی کچھ ہوتا تھا کہاں تک کوئی بچتا؟ مار کھا ہی جاتا۔ اس پر غضب ان کی سخن سازی و سخن بازی، فوراً رام ہو کر ان کا کلمہ پڑھنے لگتا۔

شوکت صاحب بڑے فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ریڈیو اسٹیشن، لاہور پر اپنے چپراسی کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگے "آپ کو دیکھئے، نیوی کٹ سگریٹ پر آپ ہی کی تصویر ہے۔" اور واقعی میں اس غریب کی ہیئت میں وہی شکل تھی جو نیوی کٹ کی ڈبیا پر ہوتی تھی۔ پھر اس سے کہا، "جائیے، جا کر چائے لائیے۔"

اس کے چند روز بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو سلام کے بعد شوکت صاحب نے پہلی بات یہ کہی "یہ جو بیٹھے ہوئے ہیں میرے صاحبزادے ہیں۔" اور ان صاحب سے کہا "انھیں تم جانتے ہی ہو گے، شاہد احمد دہلوی ہیں۔" انھوں نے اٹھ کر سلام کیا۔ میں وعلیکم السلام کہہ کر بیٹھ گیا۔ وہ صاحب "اچھا، میں چلتا ہوں" کہہ کر چلے گئے تو میں نے ہنس کر کہا

"جس جیسے آدمی کو دیکھئے ہر کسی کو اپنا بیٹا اور کسی کو اپنا باپ بنا لیتے ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی؟" بڑی سنجیدگی سے بولے "نہیں، وہ میرا بڑا لڑکا تھا، بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ہے، نوکر ہے۔" مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اتنے میں عشرت رحمانی آ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا "ان کا کوئی لڑکا ان سے بھی بڑا ہے؟" انھوں نے کہا "قد میں بڑا ہے۔ ان کی عمر آپ کیا سمجھے ہیں؟ مجھ سے آپ سے بڑے ہیں یہ حضرت۔ پچاس سے اوپر ہیں، ۳۰-۳۲ سال کا تو لڑکا ہی ہے۔" اس وقت شوکت صاحب کی صحت اتنی اچھی تھی کہ چالیس سے زیادہ کے نظر نہ آتے تھے۔ بال خوب لمبے اور کالے تھے، سفید بال نہ تو سر میں تھے اور نہ مونچھوں میں۔ چہرے پر کوئی جھری نہیں تھی اور نہ آنکھوں کے کونوں میں کوے کے پاؤں۔ دس بارہ سال بعد یعنی ۱۹۶۱ء میں بھی بالکل ایسے ہی تھے۔ عمر کے ساتھ مزاج میں بردباری اور سنجیدگی آ جایا کرتی ہے، مگر شوکت صاحب کی بات چیت کا انداز بالکل نہیں بدلا تھا۔ جوانی کا وہی چلبلا پن قائم تھا، بلکہ نخرا پن کچھ بڑھ ہی گیا تھا۔ مارچ ۱۹۶۱ء کے آخر میں پاکستان سے بھارت جو خیرسگالی کا ثقافتی وفد گیا تھا اس میں لاہور سے امرتسر تک اور امرتسر سے دلی تک ذوالفقار بخاری، سید محمد جعفری، شوکت تھانوی اور میں، ہم چاروں ایک ہی ڈبے میں تھے۔ بالعموم بخاری صاحب اپنی بذلہ سنجی اور چرب زبانی سے سب کو دبا لیا کرتے ہیں، مگر اس سفر میں شوکت تھانوی نے سب کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

پان کے خرچ کے علاوہ شوکت صاحب اپنے لباس پر بھی روپیہ صرف کرنے پر مجبور تھے۔ وہ روزانہ ایک جوڑا بدلتے تھے اور ٹیپ ٹاپ سے رہتے تھے۔ بعد میں سوٹ بھی سلوا لیے تھے۔ وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ آدمی کی عزت اس کے کپڑوں سے ہوتی ہے۔ جیسے الغریب خواہ مخواہ مردِ معقول ہوتا ہے اسی طرح بڑھیا لباس والا خواہ مخواہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ میرے پرانے ہم جماعت اور بے تکلف دوست ممتاز حسن صاحب نے مجھے کہلوا بھیجا کہ کسی دن شام کو ۵ بجے میرے دفتر آ جاؤ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ممتاز صاحب اس وقت سیکرٹری فنانس تھے۔ میں سیدھے سبھاؤ ان کے دفتر وقتِ مقررہ پر پہنچ گیا۔ ان کا چپراسی مرغِ زریں بنا باہر کھڑا تھا۔ میں نے پرچے پر اپنا نام لکھ کر اسے دیا کہ صاحب کو دے آئیے۔ اس نے بڑی بے مہری سے میری طرف دیکھا اور بولا "بنچ پر بیٹھ جاؤ۔ صاحب کام کر رہے ہیں۔" میں بیٹھ گیا، وہ بھی تھوڑی دیر بعد آ کر مجھ سے ذرا ہٹ کر اسی بنچ پر آ بیٹھا۔ دس منٹ گزر گئے، اس نے مجھ سے بات کرنی بھی گوارا نہیں کی۔ میں نے کہا "آپ جا کر میرا پرچہ تو دے آئیے، مناسب سمجھیں گے تو بلا لیں گے"۔ بولا "اندر کسی بڑے افسر کے ساتھ ضروری کام کر رہے ہیں۔ ابھی ٹھہرو۔" ٹھہرے رہے۔ جب پھر کچھ وقت گزر لیا تو میں نے کہا "صاحب نے مجھے بلایا ہے، میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا ہوں، آپ اطلاع تو کر دیجیے۔" وہ میری چٹ لے کر اندر چلا گیا اور وہاں سے چائے کے خالی برتن لے کر باہر نکلا۔ میری چٹ اس کے ہاتھ ہی میں تھی۔ برتن لے چلا گیا مجھ سے کچھ نہ بولا۔ جب واپس آیا تو آ کر خاموش بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا "چٹ نہیں دی؟" اس نے نہیں کہہ کر منہ پھیر لیا۔ میں جلتا رہا، جھلستا رہا۔ پون گھنٹے بعد جب ممتاز صاحب اپنے معزز مہمان کو رخصت کرنے دروازے پر آئے تو اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ چونک کر بولے "ارے! آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں، پون گھنٹے سے۔ اور آئندہ آپ مجھے کبھی اپنے دفتر نہ بلائیں، میں آنے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔" وہ "آئیے آئیے" کہہ کر گلے میں ہاتھ ڈال کر

[illegible] بارے میں پوچھنے لگے۔ بولے "آپ [illegible] نہیں آئے؟" میں نے کہا "وہ جو بات ہے [illegible] بھی مگر میں نے اندر نہیں جھانکا۔" "تو آپ نے وہاں بھی [illegible] مجھے نہیں، ایسا تو نہیں ہوتا۔" [illegible] جواب کا [illegible] کئے گھنٹوں کا کرشمہ [illegible] کی حالت۔ [illegible] صاحب [illegible] بہت [illegible] ہے [illegible] خاموش [illegible] ہوگا [illegible] صاحب [illegible] شرمندہ ہو کر [illegible] نہیں جانتی ہیں۔ تم مجھے معاف کر دو۔"

تو شوکت صاحب ہمیشہ [illegible] عمدہ لباس پہنا کرتے تھے۔ [illegible] ضرب المثل مشہور ہے "الناس بالباس" [illegible] کوئی آج کا دستور نہیں ہے، قدیم سے یہی چلا آتا ہے۔ شیخ سعدی [illegible] میں داخل ہونے لگے اور وہاں سے روک دیا گیا۔ جب وہ قیمتی لباس پہن کر گئے تو عزت و تکریم کے ساتھ [illegible] کر لیا گیا۔ جب کھانا سامنے آیا تو حضرت شیخ نے شوربے میں اپنی آستین ڈالتے ہوئے فرمایا "پہلے تو کھا۔" لوگوں نے [illegible] کیا تو فرمایا "اسی نے تو مجھے کھانے تک پہنچایا ہے۔" یہ بے رنگ [illegible] دیکھتے ہیں، [illegible] [illegible] بنے ہی میں عزت ہے۔

شوکت صاحب میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ شاعروں کے ساتھ [illegible] میں بیٹھنے کے باوجود شراب نہیں پیتے تھے۔ آئے دن غیر ملکی سفارت خانوں میں کاک ٹیل پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں، بلکہ ہمارے بڑے آدمیوں نے بھی سے ہی شانِ امارت میں داخل کر لیا ہے کہ جب ان کے ہاں "معزز مہمان" آ رہے ہوں تو [illegible] کا بھی اپنے ہاں اہتمام [illegible] مفت کی تو قاضی کو بھی حلال ہے۔ مگر ان "قاضی جی" نے اسے ہمیشہ حرام ہی سمجھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر میں نے اچھے اچھے ثقہ لوگوں کو چسکی لگاتے دیکھا ہے کہ بس دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔

عورتوں کے باب میں بھی شوکت صاحب ندیدے نہیں تھے۔ بلکہ خواتین سے ملنے میں بڑی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ ہمارے بعض شاعروں کی طرح جس عورت سے بھی تعارف ہوا چھوٹتے ہی سمجھ لیا کہ پہلی ہی نظر میں وہ ان پر عاشق ہو گئی اور لگے اس کی فرضی داستانیں سنانے۔ شاید اس وضع احتیاط کی وجہ یہ ہو کہ شوکت صاحب کی شادی نوجوانی ہی میں ہو گئی تھی۔ انہی کی بے تکلف گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ کبھی اوائل شباب میں "جنگلی جی بھی لو لیا کرتے تھے۔" مگر اس کا انھیں لپکا نہیں پڑا تھا سو وہ ایک مرحلہ جوان تھے، وہ اگر بگڑنا چاہتے تو خوب پیٹ بھر کے بگڑتے، مگر اللہ نے انھیں اس خرابی سے محفوظ رکھا ــــــ وہ بھی کسی حد تک!

عجیب و غریب ادبی شخصیت

محمد شعیب (وزیر خزانہ)

شوکت تھانوی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے میں اُن کے مجموعہ کلام کے ذریعے سے ایک مدت سے اُن سے تعارف رکھتا تھا۔

ادبی نقطۂ نظر سے اُن کے مضامین، اُن کے افسانوں اور ناولوں سے بہتر ہیں۔ طنز و مزاح کی جو چاشنی اُن کے مضامین میں ہے وہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں، پلاٹ سے قطع نظر نہیں ملتی۔ متعدد کتابوں کی تصنیف کے علاوہ مدت سے وہ ریڈیو پر ہفتہ وار مزاحیہ پروگرام بھی نشر کرتے تھے۔ پہلے لاہور سے اور پھر پنڈی سے۔ پنڈی میں دارالحکومت تبدیل ہونے کے بعد وہ اخبار "جنگ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور مغربی پنجاب میں "جنگ" کی مقبولیت کا انحصار خود شوکت تھانوی کی ذات تھی۔ وہ عجیب و غریب ادبی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور مضامین، افسانے اور ناولوں کی تصنیف کے علاوہ ایک فلم میں بہ حیثیت فنکار بھی حصہ لے چکے تھے۔ غرضیکہ ادب اور آرٹ کی ہر ایک صنعت پر اُن کو دسترس تھی۔ بہت کم لوگ ہیں جو بیک وقت شاعر بھی ہوں اور افسانہ نگار بھی۔ ناول نگار بھی ہوں اور فلمی فنکار بھی۔ یہ ہمہ گیری شوکت صاحب ہی میں پائی جاتی تھی۔ اُن کی قبل از وقت وفات سے جو خلا ادبی حلقے میں پیدا ہوا ہے وہ مشکل سے پورا ہوگا۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

حجاب امتیاز علی

[illegible] ہے ہوتے [illegible]

[illegible] میں بدل [illegible] وہ سنجیدگی [illegible]

جو آج ہم سب سے [illegible] چاہ [illegible] [illegible] ان کی [illegible]

[illegible] وہ تو بڑے انجمن پسند و مجلس آرا [illegible] تھے۔ [illegible]

میں ایک خفیہ [illegible] [illegible] محسوس ہوتی تھی [illegible]

[illegible] ہے [illegible]

یہ تقریباً غیر معمولی طور پر [illegible] جیسے [illegible]

[illegible] [illegible] شفا خانہ [illegible] لطیفہ [illegible] گفتگو

[illegible] میری حالت [illegible] کیا [illegible]

میرے چند منٹ بھی سکونِ قلب کے نصیب نہ ہوتے تھے۔

ایک دن اخبار دیکھ رہی تھی۔ وٹامن بی لے سینکڑوں انجکشن لے لیے۔ [illegible] جیسے شوکت

جی لگی ٹانک یا پیٹنٹ دوا کا نام ہو۔ میں نے ان کی رائے پر زیادہ توجہ نہ دی۔ طبیعت کی افسردگی کی وجہ سے میں اس زمانے

میں توہم بیزار سی رہتی تھی۔ اور کسی سے مطلق نہ ملتی تھی۔

لیکن ایک روشن سہ پہر امتیاز اور شوکت میری خواب گاہ کے دروازے میں کھڑے ہوئے نظر آئے۔ میں نے با دل ناخواستہ سلام کا جواب دے کر بیزاری کے عالم میں سر دیوار کی طرف پھیر لیا۔ شوکت صاحب آنِ واحد میں دیوار کے اور میرے درمیان آ کھڑے ہوئے۔ میں نے دائیں طرف سر پھیرا تو وہ لپک کر دائیں طرف آگئے۔ [illegible] طرف منہ کیا تو وہاں نازل ہوگئے۔ لیکن نہایت خاموشی اور سنجیدگی سے۔

ان کی ان حرکات پر میں مسکرائی تو فوراً پوچھنے لگے: "ہائیں۔ آپ مسکرائیں کس بات پر؟ آپ کی حالت نہایت مخدوش ہے یہ مسکرانے کا موقع نہیں ہے۔"

یہ سن کر میں نے بیزاری کے لہجے میں کہا: "مجھے ڈراتے ہیں۔"

کہنے لگے "یہ ڈرانے ورانے کی بات نہیں۔ یقین کیجیے۔ آپ کی حالت بہت نازک ہے۔"

ہم نے [illegible] ٹال کر کہا "آخر آپ [illegible] سب [illegible] لیا ہے کیوں؟"

اس نے [illegible] کی موجودہ حالت [illegible] کا ہے۔ بہت خوش ہو رہا ہوں [illegible] نہ ہو جائے۔ [illegible] کچھ ایسی محسوس ہوتی جیسے روئی کا [illegible] ذائقہ [illegible] کے پاس بیٹھتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک [illegible] کی نعش [illegible] جس [illegible] علاج [illegible] اور بے شمار [illegible] خالص [illegible] صاحب کی باتوں [illegible] مجھے ہنسی آتی تھی۔ اور وہ [illegible] افسردگی کی بجائے [illegible] گزرتی۔

[illegible] شوکت [illegible] باقاعدگی سے آتے۔ وہ بہت [illegible] شام کو چار پانچ [illegible] ہم سب کی [illegible] اور کھانا یا چائے [illegible] ختم کر دیتا۔

[illegible] مستقل مرض تھا [illegible] ڈرائیو پر نکل جاتے۔ شوکت [illegible] چپکے نہ رہتے مسلسل باتیں کرتے اور باتیں بھی [illegible] دلچسپ [illegible] مضحکہ خیز --- کہ مالیخولیا کا مریض بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جائے۔

ایک دفعہ ہم سب ایک ہی [illegible] ڈرائیو کو نکلے۔ سامنے [illegible] کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ میں نے [illegible] کو مخاطب کر کے کہا "اف! دیکھیے تو۔ چاند کتنا بڑا ہو گیا!"

فوراً شوکت کی آواز آئی۔ "مگر تمیز اب تک نہیں آئی۔"

ان کی باتوں نے آخر میرے اضمحلال کو کچھ کچھ کم کر دیا اور میری طبیعت نسبتاً پرسکون رہنے لگی۔ اس وقت سے ہم سب ان پر ایمان لے آئے۔ جب کوئی غمگین یا متاثر ہوتا تو شوکت صاحب کے لیے کار بھیج دی جاتی۔ وہ بھی ایسے [illegible] واقع ہوئے تھے کہ گرمیاں ہوں یا سردیاں کار کبھی خالی واپس نہ لی۔ ایک دفعہ اعتبار کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی۔ فون کر کے شوکت صاحب کو تاکید کی کہ فوری امداد کا کیس ہے نسخہ لیتے آئیے۔ گرمی کی تپتی ہوئی دوپہر تھی مگر شوکت صاحب آ گئے آتے ہی یاسمین سے کہا: "دیکھا جیجی۔ ساری دوپہر کوئی ٹھنڈی شے اور رقیق سی چیز مجھے مسلسل کھینچتی رہی ہے۔ میں تمہارے ابا کے علاج کے لیے آیا ہوں۔" اور پھر ساری دوپہر خس خانہ قہقہوں اور چہچہوں سے گونجتا رہا۔ اور شام کو اعتبار ہشاش بشاش باہر نکل آئے۔ اس طرح وہ ہمارے خاندانی طبیب بن گئے تھے۔

یاسمین کے امتحان کا زمانہ آیا تو ایک روز پہلے وہ بے حد متوحش اور غمگین ہو گئی۔ کہنے لگی "شوکت چچا کو بلائیے تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔" چنانچہ ہم سب شوکت کے ہاں پہنچے۔ انھیں ساتھ لے کر ایک لمبی ڈرائیو کو روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے ہمارے ساتھ ہمارے ایک اور دوست بھی تھے جن کے بال کسی قدر لمبے تھے اور وہ ان پر بہت نازاں تھے۔ اس غلط فہمی کا شکار بھی تھے کہ لمبے بال ان کے حسن میں چار چاند لگانے کے علاوہ انھیں آرٹسٹ ثابت کرنے میں بھی کارآمد ہیں۔ انھیں دیکھ کر شوکت نے کچھ دیر تو ضبط کیا پھر پوچھا "کیوں صاحب۔ آپ کی سالگرہ کس تاریخ کو ہو گی؟" انھوں نے مسکرا کر ایک ادائے محبوبی سے فرمایا "جی --- ۱۰؍ اگست کو" شوکت بولے "اس لیے پوچھا کہ اس موقع پر جب آپ کو بالوں میں لگانے کا فیتہ اور [illegible]

[illegible] دینا چاہتا ہوں تو چاندی کی۔ [illegible] کی حیثیت [illegible] گئی۔

وہ بڑے ایسے مشہور [illegible] تھے [illegible] شوکت [illegible]

[illegible] عبارت بھی نہیں پڑھی۔ [illegible] نظر آتے ہیں۔ [illegible] والا بھی۔

امتیاز اور شوکت دونوں [illegible] کو پان کھانے کی بہت بری عادت تھی۔ [illegible] صاحب کی یہ عادت اب چھوٹ چکی ہے، شوکت صاحب تو پان کھانے [illegible] حالت اس سے [illegible] آخری ہو جاتی تھی۔ اسی طرح تخریبوں کے بعد میرے ہاں [illegible] ایک اونچی میز پر رکھوا دیا اور اعلان کر دیا [illegible] جسے بھی پان کھانا ہو انھیں حدود میں رہ کر کھائے۔ اور پان کھانے کے بعد [illegible] رومال سے جو پاندان میں رکھ دیا گیا تھا صاف کر کے نیچے اُترے۔ مگر باوجود میرے اس احتیاط کے چند ہی ہفتوں میں پاندان کے قریب کی دیوار پر گز گز بھر تک کتھے کے چھینٹوں نے نقش و نگار بنا دیئے تھے۔ نہ معلوم پان کھانے میں کتھا کیونکر اُڑ اُڑ کر دیوار کی طرف جاتا اور اسے رنگین بنا جاتا تھا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو میں نے تہیہ کر لیا کہ پاندان ہی گھر سے اٹھا دینا چاہیئے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس کی اطلاع شوکت صاحب کو ملی تو فوراً آئے اور کہنے لگے کہ میں نے پاندان کے متعلق ایک ترکیب سوچ لی ہے۔ اس پر عمل کرنے سے بانس بھی رہے گا بانسری بھی بجے گی۔ یعنی پاندان بھی گھر سے نہ اٹھے گا اور دیوار بھی صاف ستھری رہے گی۔ میں نے پوچھا وہ کیا ترکیب ہے؟ کہنے لگے "رات بھر سوچتا رہا جب کہیں جا کر یہ تدبیر ہاتھ آئی ہے۔ آپ یوں کیجئے کہ پاندان کے قریب کی دیوار دو دو گز کتھے سے سیاہ کرا دیجئے۔"

کسی زمانے میں ہماری کوئی دعوت شوکت کے بغیر ہوتی نہ تھی۔ لوگ ان سے ملنے اور ان کے لطیفے سننے کے اتنے مشتاق رہتے تھے کہ صبح ہی فون کر کے پوچھا کرتے تھے "آج کے ڈنر میں آپ کے ہاں شوکت تو موجود ہوں گے نا؟"

اپنی اسی خوش مزاجی اور شگفتگی کی وجہ سے وہ تمام معیاری محفلوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔

جب وہ جنگ میں ملازم ہو کر پہلے کراچی اور وہاں سے پنڈی گئے تو تعلقات پر اوس سی پڑ گئی۔ ایک دو دفعہ دوستوں سے سنا کہ شوکت لاہور آئے ہیں۔ مگر وہ ہم سے ملے بغیر واپس چلے گئے۔ وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ مصروفیت؟ کوئی غلط فہمی؟ اتفاق؟ جو کچھ بھی تھا۔ دل مکدر سا ہو گیا۔

ان سے آخری مفصل ملاقات ۲۳ مارچ ۶۳ء یوم پاکستان کے موقع پر لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں ہوئی تھی۔

مہمانوں کا اژدہام تھا۔ دور سے انھوں نے سلام کیا۔ دوستوں میں گھرا ہوا پایا۔ ہم دونوں امتیاز سے باتیں کرتے ہوئے مہمانوں کے ہجوم میں جا ملے۔

اس کے دوسرے یا تیسرے ہی دن سنا کہ شوکت سخت بیمار ہیں۔ ان کا مرض بغیر معلوم ہوئے پیچیدہ اور المناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ ٹی۔بی؟ دل؟ کینسر؟ بلڈ پریشر؟ ——— ڈاکٹر سوچ رہے تھے کہ کون سا مرض تشخیص کریں۔ اور مرض دن بدن بڑھ رہا تھا۔

ہم انگشت بدنداں تھے۔ ابھی یوم پاکستان کے استقبالیہ میں تو وہ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اور آج ——— اتنی جلدی یہ حالت ہو گئی!

پھر روز بروز ان کی بیماری تشویشناک صورت اختیار کرتی گئی۔ وہ نہ جانے کتنے دوستوں اور خیر خواہوں سے، اصرار کر کے ان ہی کے آرام و سکون کے لیے انھیں البرٹ وکٹر ہاسپٹل میں داخل کرا دیا۔ ہم کو باقاعدگی سے اطلاعات ملا کرتیں کہ آج شوکت کو نیا خون دیا گیا۔ آج فلاں نئی دوا آزمائی گئی۔ آج طبیعت مقابلۃً بہتر رہی۔ میں اور امتیاز ہر روز ارادہ کرتے کہ شام کے وقت جا کر شوکت کو دیکھ آئیں۔ مگر سوار ہونے کے بعد کار سے اتر پڑتے۔ کسی طرح ہمت نہ پڑتی نہ طبیعت چاہتی کہ چہکنے والے شوکت کو بستر مرگ پر سسکتے دیکھیں۔ دل کہتا شوکت کی جگہ محفل و انجمن تھی ہسپتال نہیں۔ آخر اسی کشمکش و ذہنی انتشار میں ہم نے ایک ہفتہ ضائع کر دیا۔

آخر ایک دن دل کڑا کر کے اور ایک دوسرے کی ہمت بندھا کر ہم دونوں ہسپتال جا پہنچے۔ ہسپتال کے لمبے لمبے برآمدے سخت ویران نظر آ رہے تھے۔ شام بے حد افسردہ تھی اور ہوائیں خاموش۔ ان کے کمرے کے آگے جا کر تردد کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کیا معلوم آج طبیعت کیسی رہی ہو گی! اسی تگ و دو میں کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک ان کے صاحبزادے باہر نکل آئے اور ہمیں دیکھ کر دروازہ کھول دیا اور اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم اندر گئے۔ سر ایک طرف ڈھلکے شوکت چپ چاپ پڑے تھے۔ چند ہی روز میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر پہلے ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر وہ رو پڑے ——— دوستوں کو ہنسانے والے کا یوں رو پڑنا ناقابلِ برداشت تھا۔ کیا کہہ کر انھیں حوصلہ دلائیں۔ کس بات سے انھیں بشاش بنائیں۔ کچھ نہ سوجھتا تھا۔ اور سوجھتا بھی کیا۔ وہ اتنے ذہین تھے کہ ہماری جعلی تسلیاں انھیں اطمینان بخش نہ سکتی تھیں۔

میں کمرے سے چپ چاپ باہر نکل آئی۔ دوبارہ اندر نہیں گئی۔ باہر ان کی مغموم بیگم اور چاہنے والا بیٹا دم بخود کھڑے تھے۔

پھر ۴ مئی کی صبح اچانک سنا کہ شوکت نے ہم سے منہ موڑ لیا۔

امتیاز انتہائی اندوہ سے کہنے لگے: "کس کس کا صدمہ سہوں۔ راجہ غضنفر کا غم نہیں بھولا شوکت داغ دے گیا! پطرس گیا۔ سالک گیا۔ غضنفر گیا۔ اور اب شوکت بھی روٹھ گیا! ——— وہ اپنے ایک ایک دوست کا نام لینے لگے۔ جو اب ہم میں موجود نہیں لیکن جن کی یادوں کے چراغ نہاں خانۂ دل میں ہمیشہ روشن رہیں گے۔

[illegible] ... بات کا حادثہ مرگ بہت عظیم ہے ۔

[illegible] زندگی ایک [illegible] ... ہو جاتا ہے ۔ [illegible] ... ہو جاتے ہیں ۔ [illegible] ... اندھیرا ہے ۔

آہ! شوکت

محمد عبدالرؤف عباسی

سر کنم نالہ اگر تاب شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری

اواخر ۴۹ء یا اوائل ۵۰ء کی بات ہے دسمبر یا جنوری کا مہینہ ہے حد کا جاڑا پڑ رہا ہے کہ کاتب الحروف اپنی زندگی کا اہم ترین اقدام کر گزرا۔

سبب کو نظر انداز کیا۔ مسبب اعلیٰ کی کارسازی پر نگاہ رکھی اور طے کر لیا کہ قدم عشق پیشتر بہتر ہے حق۔ ہفتہ وار بہت نکل چکا اب یہ بھی ایک قدم آگے بڑھے۔

اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک بجز سرمایہ کارساز عالم کی کارسازی پر ہی یقین رہا اور آج بھی ہے۔ اس وقت نہ کوئی شریک معاون تھا نہ شریک کار، بہر نوع اللہ کا نام لے کر ؎

درین دریائے بے پایاں درین امواج شورافزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

ہفتہ وار حق بہت کامیاب تھا، روزنامہ ہوا تو کہنے والوں نے چار دن کی چاندنی کہہ کر تمسخر کیا۔ بہرصورت گزشتہ ۲۵ برس سے یہ چاندنی ضیاء بیز اور نور بار ہے بقولیکہ ؎

فانوس بن کے آپ حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ تھا کہ اسٹاف میں اضافہ ہو، آدمی ایسے ہوں کہ جو تنخواہ اتنی ہی لیں کہ جتنی حق کی وسعت کے اندر دیکھیں محنت اور تن دہی سے اپنا کام انجام دیں۔ نگاہِ انتخاب شوکت تھانوی پر پڑی اور اسی جگہ قائم ہو گئی۔

یہ وہ وقت ہے کہ سودیشی ریل چھوٹ چکی ہے۔ یہ اور اس قسم کے دیگر طنزیات دنیائے ادب سے خراج تحسین وصول کرنے لگے ہیں۔ اس کا دلکش اور ظرافت آمیز اندازِ تحریر مقبولِ عام ہی نہیں خواص پسند ہو چکا ہے۔

میں نے شوکت سے صرف اتنا کہا کہ سودیشی ریل بحمداللہ چل رہی ہے لیکن دنیا میں تم کو بہت کچھ کرنا ہے۔ اب اپنا اخبار

[illegible] اخبار کے کالموں میں جو بہت [illegible] مضامین چھپتے تھے وہ زیادہ تر [illegible] [illegible] جناب [illegible] آپ [illegible] [illegible] وقت [illegible]
وہ اس کے اوقات کیا ہوں گے

میں نے کہا کہ یہ اور اس قسم کی بہت سی [illegible] منتخب کر لی [illegible]

[illegible]

اس زمانہ میں شوکت [illegible]

[illegible] کرنا [illegible] ایک [illegible] تھا۔

صبح کا [illegible] بہت [illegible]

[illegible]

شام کی تفریح سب ساتھ [illegible]

میرے والد مغفور کی [illegible]

حضرت پیر و مرشد کے حضور میں پیش کر [illegible]

شوکت بجائے خود ایک [illegible] تھا۔ [illegible]
کسی دوسرے پر نہیں۔

اس کا جوہر اصل ظرافت تھا۔ بات میں بات پیدا کرنا [illegible] شگفتہ مزاجی محفل [illegible] کیونکہ لا انتہا تھی۔ ظرافت کی ایک شعر ایک انگریز ادیب پی۔ جی وڈ ہاؤس کے [illegible] کے الٹ پھیر سے ہر جگہ زعفران زار [illegible] بالکل یہی صورت شوکت کے [illegible] ہے۔ وڈ ہاؤس زندہ قوم کا فرد [illegible] سب ادب مدت تک زندہ رہے گا اور شوکت کو دنیا [illegible]

اخبار جنگ کے پنڈی ایڈیشن کا مدیر اعلیٰ شوکت تھا۔ خیال تھا کہ کچھ نہیں تو ہفتہ میں ایک روز اس کے مذاکرات سے اخبار کے صفحات لبریز نکلیں گے مگر یہ بھی نہ ہوا۔ رہے نام اللہ کا۔

اللہ نے شوکت کو وہ ذہن رسا دیا تھا کہ جو عجیب تھا۔ جدھر رخ کیا ایک نیا راستہ اپنے واسطے نکال لیا۔ شاعری ہو یا ادب سب میں اپنے جوہر دکھائے۔

شوکت من حیث الشاعر

افسوس یہ ہے کہ اس کا کلام پیش نظر نہیں ہے ورنہ یہ ثابت کرنا بہت دشوار نہیں تھا کہ اپنے ہم عصر شعرا میں بجز دو ایک

وہ کسی سے بہت پست نہیں تھا۔

انشا نصیر الدین حیدر کے دربار کا مایۂ صد ناز شاعر، علم و فضل، منطق، عروض اور فنِ شعر کی باریکیوں پر پوری طرح حاوی، میر کے مشفق خان آرزو ایسے مسلم الثبوت استاد نے کہ جس کے دامنِ تربیت سے میر و سودا وغیرہ نکلے اور شعر و نحو کے مطلع پر آفتاب بن کر چمکے اس بحر نے کہ انشا کے علم و فضل کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے۔ پر ایک معمہ تھا کہ سعادت علی خاں نے انشا کو موقع ہی نہ دیا کہ انشا غور و فکر سے شعر کہتے ورنہ جیسے جوہر دکھاتے۔

کسی سے مقابلہ نہیں ہے۔ شوکت انشا نہیں تھا۔ کہنا یہ ہے کہ شوکت نے کبھی غور و فکر سے شعر نہیں کہا اور سنجیدگی کے بعد فطرتِ ثانی بن جانے کے باوجود جو کچھ کہا خوب کہا۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ اس کا بے پناہ حافظہ ہی اس کی بیاض تھا جو کہا وہاں درج ہو گیا۔ متعدد غزلیں ہوں گی کہ جو کبھی کاغذ پر نہ آئیں۔

شوکت من حیث مصنف

اللہ نے شوکت کو بہت کچھ دیا مگر عمر نہ دی۔ جن لوگوں نے شوکت کو بہت قریب سے دیکھا ہے متحیر ہیں کہ اس ہنسنے ہنسانے والے کھلنڈرے کو اتنا وقت کہاں ملا کہ اتنی سی عمر میں کم و بیش پچاس کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان میں سے بیشتر چھپ چکی ہیں اور بہت ایسی بھی ہیں کہ جو مسودہ کی حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ ان کے پاکستانی احباب میں اگر کوئی صاحب اتنی ہمت کریں کہ مسودوں کو فراہم کر کے شائع کرا دیں تو اس کی معصوم خورد سال لڑکیاں کبھی کسی کی دست نگر نہ ہوں۔

ریڈیو کی طرف جھکا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کی صفِ اولین کی زینت ہو گیا۔ راقم الحروف کو کبھی یہ اندازہ نہ ہوا کہ شوکت کو موسیقی سے بھی کوئی مناسبت ہے۔ مشاعروں میں ترنم سے غزلیں پڑھتے ضرور رہا۔ نوخاستہ شعرا میں آج بھی بیسیوں ہیں کہ جو اس کی غزل سرائی کی نقالی کرتے ہیں۔

عالمگیر جنگِ ثانی میں حکومتِ وقت نے اپنے پروپیگنڈے کے واسطے دو آدمی منتخب کیے۔ پنجاب میں حفیظ جالندھری اور یو۔ پی میں شوکت، کام یہ تھا کہ شعر و نغمہ کے ذریعے عوام الناس کو حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھیں۔ ہزار روپیہ تنخواہ، بھتہ اور سفر خرچ مزید برآں مصارف کا بجٹ شاید زیرِ حلقہ کروڑ روپیہ سالانہ۔ اور بھی ہوں گے کہ جنہوں نے اتنے کم وقت میں ایسی محیر العقول ترقی کی مگر شوکت کا ایسا علوِ ظرف نہ دیکھا۔

شوکت کی ہردلعزیزی

یہ ہرگز نہیں تھا کہ شوکت کا قلم محض گلباری کے لیے وقف ہو، آتش باری پہ آجاتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ کہیں کاغذ آگ نہ پکڑ لے۔

حیرت یہ ہے کہ اس دریدہ دہنی کے باوجود میرے علم میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے کہ جو حقیقتاً اس کا بدخواہ ہو۔
کوئی پھبتی زیب برخود غلط آدمی اس کے منہ آیا، اس کے اعمال و افعال کا تجزیہ کر ڈالا۔ ہر فقرہ ایک طرف تو زعفران نامہ

دوسری طرف جوہر تھا۔

ایک صاحب کو میں جانتا ہوں [illegible] بڑے [illegible] ۔ حضرت [illegible] سے ملتے [illegible] وقت [illegible] بات [illegible] سے [illegible] ۔ دوری سے آواز [illegible] نصیب [illegible] ہوا ہے ۔ [illegible] بات [illegible] چہرہ پر کسی قدر [illegible] ہے ۔

[illegible]

[illegible] بے [illegible]

[illegible] ہے [illegible] ہوں سنئے

[illegible]

[illegible]

اس وقت بھی یہ صورت ہے کہ ان کا جو قطعہ جہاں [illegible] جائے وہاں تڑپ اٹھتا ہے ۔ شوکت [illegible] کا نہیں ہے ، [illegible] ۔ [illegible] ایک [illegible] اس طرح کہ جس طرف [illegible] کے پیرتے (خود ہی [illegible]) معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] جوتے کا جوڑا رکھا ہے ۔ [illegible] ۔

ہندوستان میں شوکت نے اپنی جگہ بنائی تھی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سوسائٹی کی صف اول میں پہنچ گیا ۔ [illegible] ہوگا اور نہ یہ جگہ پیدا ہوگی ۔ خیر! یہ تو رفتار زمانہ ہے اس کا گلہ نہیں ۔ صدیاں گزر گئیں [illegible] پیدا ہوا ، جو بیک وقت [illegible] امیر زادہ ، امیر ، ماہر موسیقی ، شاعر اعظم [illegible] کامل ہوتا ۔ قرن پہ قرن گزرتے جا رہے ہیں مگر [illegible] کا جواب نہیں پیدا ہوتا ۔

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ شوکت ان کا ہم رتبہ تھا ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک ۔ مگر [illegible] ضرور ہے کہ شوکت بھی کسی ایک راستہ کا پابند نہیں ہوا ۔ جس راستہ پہ چلا بڑھتا ہی چلا گیا ۔

شوکت پاکستان میں

شہرت ہے کہ

دو چیز آدمی را کشد زور زور یکے آب و دانہ دویم خاک گور

اس دوہری کشش سے شوکت کیسے نکلتا ۔ پاکستان معلوم ہوتا تھا کہ اس کا راستہ ہی دیکھ رہا تھا ۔ سوسائٹی میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ۔ اب معاشرت بھی امیرانہ تھی ۔ پاکستان کے عائدین میں کون تھا کہ جو اس کا مداح و گرویدہ نہ ہو ۔

راقم الحروف کے ساتھ شوکت کا انداز اس سے کہیں زیادہ پُرخلوص اور برادرانہ تھا کہ جس سے ۲۲ برس پہلے اس کی ابتدا ہوئی تھی ۔

۵۴ء میں راقم الحروف کا پاکستان جانا ہوا ۔ اس وقت شوکت لاہور ریڈیو سے وابستہ تھے ۔ غیر ممکن تھا کہ شوکت

کے ہاں قیام کیے بغیر ہی کراچی چلا جاتا۔ چنانچہ ان کے ہاں دو دن قیام ہو گیا۔ ایک روز ریڈیو کے ایک آفیسر مسٹر معین الدین نے اپنی ترقی کے سلسلے میں بہت بڑی دعوت دی کہ جس میں شوکت بھی مدعو تھے۔ اس نے ان کو لکھ دیا کہ لکھنؤ سے میرے مہمان آگئے ہیں، میں حاضری سے معذور ہوں۔ خط دیکھ کے مسٹر معین الدین خود دوڑ پڑے۔

شوکت کی خاطر سے مجھ کو جانا پڑا۔ دعوت میں اعلیٰ حکام و عمائدین کا اجتماع تھا اور شوکت ان میں شمعِ محفل۔

شوکت کی وضع داری اور ظرف کی انتہا ملاحظہ ہو کہ مجھ کو جس سے بھی متعارف کرایا یہی کہا کہ آپ جس حال میں مجھ کو دیکھتے ہیں وہ اسی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ سچ ہے۔ نہد شاخِ پُر میوہ سر بر زمیں۔

شوکت کی بیماری اور سفرِ آخرت

شوکت بیمار ہوا۔ مرض لاعلاج۔ جگر پر کینسر۔ علاج معالجے کے سلسلے میں تمام تر دوا دوش بے کار رہی۔ اس نے ہر طرح کی تکالیف اٹھا کے گناہوں کا کفارہ دیا اور رہگرائے عالمِ جاودانی ہوا۔ رہے نام اللہ کا۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تاریخِ انتقال

دلِ خوں گشتہ در فغاں آمد　　خاک بر فرقِ این و آں کردم
نالہ چوں گشت ہم ردیفِ زباں　　رخنہ در سقفِ آسماں کردم
بہرِ تاریخِ رحلتِ شوکت
سینہ از داغ گلستاں کردم

مسکراہٹوں کا سفیر

ماہرالقادری

اللہ تعالیٰ کی اس میں بڑی ہی مصلحت پنہاں ہے کہ انسان کو مستقبل کا علم نہیں ورنہ روز آنے والے کل کے بارے میں بھی قطعی طور پر علم ہوتا کہ کل کیا ہوگا؟ عالم غیب و شہود، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ منصب اللہ کے سوا اور کسی کو زیب نہیں دیتا۔ جوتشی، نجومی، دست شناس اور جفر داں جو انسانوں سے مستقبل کے حالات بتا کر خوب مال بٹورتے ہیں ادھر ادھر کی اٹکل سے تیر چلاتے ہیں۔ ہوشیار نے تُکّہ چلایا اور تیر نشانہ پر ٹھیک لگ گیا اور اس کی نشانہ بازی کی شہرت ہو جاتی ہے! کوئی بچہ بڑے ہو کر کیا بنے گا؟ اس کا حال کسی کو نہیں معلوم!

آج جو دنیا میں مشاہیر سمجھے جاتے ہیں، اپنی زندگی اور شعور کے آغاز میں وہ نہیں جانتے تھے کہ ہم بڑے ہو کر کیا بنے گے اور کیا ہو جائیں گے اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بلوغ و شعور کے بعد زندگی کا آغاز کسی پیشہ سے ہوتا ہے اور مستقبل میں جا کر زندگی کی یہ لائن ہی بدل جاتی ہے۔

شوکت تھانوی مرحوم تھانہ بھون کے رہنے والے تھے۔ یہ قصبہ حضرت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔ یہاں خانقاہِ امدادیہ بھی ہے جو کم و بیش نصف صدی سے دعوت ارشاد و اخلاق کا مرکز رہی ہے۔ شوکت مرحوم مجھ سے بیان کرتے تھے کہ وہ اپنے بچپن میں بارہا حضرت مولانا تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور ان کے دستِ شفقت سے مس ہونے کی سعادت انہیں حاصل ہوئی ہے۔ تھانہ بھون پہلے ہی سے مشہور تھا۔ شوکت تھانوی نے اسے اور زیادہ مشہور کر دیا۔ مولانا تھانوی قدس سرہ کی ہم وطنی اور زیارت و صحبت کا یہ اثر تھا کہ شوکت نے اسلامی قدروں پر بعض دوسرے غیر محتاط ادیبوں اور شاعروں کی طرح طنز نہیں کی۔ دین سے وہ ذہنی و فکری لگاؤ رکھتے ہیں۔ اُن کی خواب گاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کا نقشہ آویزاں رہتا تھا اور دفتر جانے سے پہلے وہ اُسے آنکھوں سے لگاتے تھے۔

شوکت تھانوی نے کئی مرثیے بھی کہے ہیں۔ ڈاکٹر یاور عباس صاحب کے یہاں کراچی میں ہر سال کے سال بڑی دھوم کی مجلسیں ہوتی ہیں۔ شوکت ایک دن اپنا کہا ہوا مرثیہ پڑھتے اور سننے والوں سے بہت کچھ داد تحسین وصول کرتے۔ انہوں نے لکھنؤ میں میر انیس کے پوتے دولہا صاحب عروج، پیارے صاحب رشید، فائق اور دوسرے مشہور و معروف مرثیہ خوانوں کو پڑھتے سنا تھا۔ اس لیے

شوکت صاحب کی مرثیہ خوانی میں وہی جھلک پائی جاتی تھی۔ تمہید کی تشریح کا بند پڑھتے تو اپنے ہاتھ کو اس طرح اٹھاتے جیسے پیچ پڑ تار کھنچی ہوتی ہے۔ آواز ہائے ماتمی جو تحت لفظ" کے لیے بہت موزوں تھی۔

قصبہ تھانہ بھون پیروں، مریدوں اور مولاناؤں کی مشہور بستی ہے۔ وہاں کے ایک پولیس افسر کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا ہے اس کے بارے میں یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ بڑے ہو کر یا تو مولوی بنے گا یا پولیس کا کوئی عہدیدار! عربی کی مشہور ضرب المثل بھی ہے "الولد سر لابیہ"۔ انگریزی میں یوں کہتے ہیں۔ ACHILD TAKES ATTER HIS FATHER.

اور

ہندی اردو میں یہ کہاوت اس طرح مشہور ہے۔ ---- باپ پر پوت پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا مگر —— شوکت تھانوی ایک صحافت نگار کی حیثیت سے منظر عام پر آتے ہیں۔ شروع شروع میں وہ اخباروں میں سنجیدہ کالم لکھا کرتے تھے۔ یہ ان کا ریحان شباب تھا یعنی جوانی کا اٹھان! جب وہ لکھنؤ پہنچے ہیں تو ابھی مسیں بھیگ چکی تھیں۔ ان دنوں روزنامہ "ہمدم" کے ایڈیٹر سید جالب دہلوی کی صحافت نگاری اور اخبار نویسی کی بڑی دھوم تھی۔ شوکت تھانوی کو اخباری دنیا میں سید جالب کی رفاقت میسر آئی اور اس رفاقت سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

شوکت تھانوی کی شاعری کا آغاز بھی سنجیدہ غزل گوئی سے ہوا اور دوسرے مشاعروں میں وہ غزلیں پڑھتے تھے۔ ان کی غزلیں کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔ جناب منظر صدیقی اکبر آبادی (سابق مدیر ماہنامہ "کنول" آگرہ) کا بیان ہے کہ ان کے والد حضرت یعقوب اکبر آبادی مرحوم نے شوکت تھانوی کے اس مجموعہ کلام کا تاریخی نام رکھا تھا۔

شوکت تھانوی شاعری میں مولانا عبدالباری آسی لکھنوی سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ آسی شاگرد تھے حضرت ناطق گلاؤٹھوی کے جو داغ کے شاگرد ہیں اور اللہ کے فضل سے ابھی تک بقید حیات ہیں ان کے نام کے ساتھ "پیر مغان سخن" لکھا جاتا ہے۔

مولانا عبدالباری آسی ضلع میرٹھ کی ایک بستی "الدن" کے رہنے والے تھے۔ وطن کی نسبت کے ساتھ ان کا نام یوں لکھا جاتا تھا "عبدالباری آسی الدنی"۔

آسی مرحوم کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ لوگ ان کے نام کو "آسی الدُّنی" پڑھتے ہیں یعنی "الدنی" کی بجائے عربی قاعدے کے تحت "ل" ساکت اور "دال" مشدد، اس طرح "دنی" تلفظ کرتے ہیں۔ "دنی" عربی میں سفلہ، کمینہ اور ناکس کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد آسی صاحب اپنے نام کے ساتھ "الدنی" کی بجائے "لکھنوی" لکھنے لگے۔ لکھنؤ ان کا وطن ثانی تھا۔ نولکشور بک ڈپو سے ملازمت کا تعلق تھا۔ شوکت تھانوی اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جناب آسی لکھنوی سے انہوں نے شعر و سخن میں مشورہ اور استفادہ کیا ہے۔

شوکت تھانوی مرحوم کا غالباً پہلا افسانہ جس سے وہ دنیائے اردو میں متعارف ہوئے "اُردو کا جوڑ" ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ملا رموزی کی "گلابی اردو" بہت پسند کی جاتی تھی۔ اور اردو زبان و ادب میں ملا رموزی شاید پہلے شخص ہیں جن کے مضامین کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔

شوکت تھانوی کے مزاحیہ افسانے اور تمثیلیں رسالوں اور اخباروں میں آنے لگے۔ یہاں تک کہ "سودیشی ریل" نے انہیں خاصا مشہور کر دیا اور اس کے بعد ان کی جو کتاب بھی مارکیٹ میں آتی وہ مقبول ہوتی اور ارباب ذوق ان کی نئی نئی کتابوں کے مشتاق اور منتظر رہتے

[illegible] ذرا ذرا سی باتوں میں [illegible] مزاح کا [illegible] شوکت تھانوی [illegible] کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط تھے [illegible] بنانے کی کوشش نہیں کرتے [illegible] شوکت کے مضامین پڑھتے وقت ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔ [illegible] قہقہہ کی [illegible] بھی نکل جاتی ہے۔ [illegible] سب عالم ہے۔

شوکت تھانوی ہر چیز کا مشاہدہ بڑی گہری نگاہ سے کرتے تھے۔ [illegible] مزاح نگاری اور طنز نگاری [illegible] ایک [illegible] کی صورت ملتی ہے: طنزیہ مضامین میں بعض مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لیلیٰ کے خطوط کے مصنف قاضی عبدالغفار بول [illegible] رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ طنز نگاری میں قاضی عبدالغفار کے مقلد تھے۔ [illegible] غیر شعوری طور پر لکھنے سے [illegible] کبھی کبھی ایسا ہو جاتا تھا۔ شوکت نے اپنی شخصیت، فن کاری اور شہرت و مقبولیت کی دنیا خود بنائی تھی۔ وہ کسی پروپیگنڈے کے سہارے مشہور نہیں ہوئے ان کا فن ان کی شہرت کا سبب ہے۔

بعض شاعروں اور انشا پردازوں کو دیکھا گیا ہے کہ ذرا سی شہرت ملی اور آپے سے باہر ہو گئے۔ ان کی عام زندگی کے توازن میں فرق آجاتا ہے۔ مگر شوکت تھانوی پاکستان و ہندوستان گیر شہرت حاصل کرنے کے باوجود اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔ یہ دلیل ہے ان کے اعلیٰ ظرف ہونے کی۔ اب رہی تھوڑی بہت انسانی کمزوریاں تو اس سے کون انسان خالی ہے۔ اس مضمون کا لکھنے والا سب سے پہلے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہے۔ شوکت تھانوی بھی انسان تھے فرشتے نہ تھے۔ اب سے سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے ملتان میں مشاعرہ تھا، شاعروں کو نذرانہ دینے میں مشاعرے والوں کی طرف سے تاخیر ہو گئی، شوکت تھانوی اس پر اس قدر برہم ہوئے اور اتنے بگڑے کہ ہم مدعو شاعروں کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ ان کی برہمی کے سبب ہمارے معاوضہ کی رقم میں کہیں کھنڈت نہ پڑ جائے۔

تقسیم ہند سے پہلے شوکت تھانوی مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے متعارف نہیں تھے۔ میں نے انہیں کسی مشاعرے میں نہیں دیکھا۔ انہوں نے اس زمانے میں لکھنؤ کے ایک بہت بڑے شیعہ مجتہد کی موت پر ایک طنزیہ مرثیہ البتہ کہا تھا جسے وہ پاکستان بننے کے بعد بھی خاص محفلوں میں سناتے تھے۔

یہ اُس دور کا ذکر ہے جب ہندوستان میں ظریف لکھنوی کے بھائی [illegible] لکھنوی اور احمق پھپھوندوی کی مزاحیہ شاعری کی بہت شہرت تھی۔ سر سیتارام جو برسوں یوپی لیجسلیٹو کونسل کے اسپیکر رہے ہیں اور پاکستان میں ہندوستان کے ہائی کمشنر بھی تھے۔ ان کی صدارت میں ایک مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرے میں [illegible] لکھنوی نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا ؎

نر ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اس نام کی
کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتا رام کی

پاکستان بننے کے بعد شوکت تھانوی ایک مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے اور دیکھتے دیکھتے مشہور اور مقبول ہو گئے۔ بمبئی اور دلی کے مشاعروں میں بھی ان کو بارہا بلایا گیا اور ہر مشاعرے میں کامیاب رہے۔

شوکت تھانوی شعر سنجیدہ، نغز اور سادہ ترنم سے پڑھتے تھے۔ ان کے ترنم میں قدرے غنائیت بھی ہوتی تھی۔ آواز قریب قریب پاٹ دار تھی۔ مشاعرے میں اپنا مزاحیہ کلام سناتے تو سننے والے ہنسی کے مارے "لوٹن کبوتر" بن جاتے۔ مگر شوکت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی نہ آتی۔ بڑے تجربے کی بات کہی تھی علامہ اقبال نے کہ اگر قوال میں قوال کو بھی حال آجائے تو قوالی کا لطف ہی جاتا رہے۔

مشاعروں میں شاعروں کے ناموں کی فہرست کی ترتیب پھر انہیں مشاعرے کا رنگ دیکھ کر شعر خوانی کے لئے اسٹیج پر بلوانا، یہ ایک طرح کا آرٹ ہے اور شوکت تھانوی کو یہ آرٹ آتا تھا۔ شاعروں کے وہ کامیاب کنڈکٹر تھے۔ مگر اس کی بدولت انہیں بعض شاعروں کی خفگی بھی برداشت کرنی پڑتی۔ جو شاعر مشاعرے میں کامیاب نہ رہتا وہ اپنی ناکامی کا الزام شوکت تھانوی کے سر دھرتا کہ انہوں نے مجھے غلط نمبر پر اور ناسازگار فضا میں پڑھنے کے لئے بلوایا۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ جس کسی سے عوام کی ذمہ داری متعلق ہوتی ہے۔ اسے کسی نہ کسی نوعیت سے ہدف ملامت ضرور بننا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں ہر کسی کو کوئی بھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ جس سے کوئی بھی ناراض اور شاکی نہیں، سمجھ لو کہ وہ آدمی منافق ہے۔ ہمہ شما کا ذکر کیا ہے۔ نبیوں اور رسولوں تک سے لوگوں کو شکایتیں رہی ہیں اور وہ سب کو خوش نہیں رکھ سکے۔ اولیاء، انبیاء اور رسول تو پھر انسان ہیں اللہ میاں تک سے بعض جہلا اور سفہا شکایتیں رکھتے ہیں۔

انشا پردازوں اور خاص طور سے شاعروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ رہنے سہنے اور لباس وغیرہ کے معاملے میں بے پروا بلکہ بدسلیقہ ہوتے ہیں۔ مگر شوکت تھانوی بڑے قرینہ اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ میں نے انہیں کبھی میلے تو کیا ملگجے کپڑے پہنے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ صاف ستھرا لباس۔ گلوری کی ڈبیہ سے لے کر عینک کی کمانیوں تک ہر چیز اُجلی اور خوش منظر۔ چوڑی دار پاجامہ پہنتے تو کس اہتمام اور سلیقہ کے ساتھ اس کی چُنٹیں کرواتے

محفلوں میں اُن کے دم سے رونق تھی، کیسے کیسے مزیدار لطیفے بیان کرتے اور دوسروں کے لہجہ، گفتگو اور طرز ادا کی نقلوں سے محفل کو دیوارِ قہقہہ بنا دیتے۔ نقل کرتے ہوئے وہ ایک ایک جزئیہ کا خیال رکھتے۔ اس فن میں وہ بڑے مشاق اور ورزیدہ تھے۔

شوکت تھانوی مرحوم کے لطائف تحریری بھی ہیں اور تقریری بھی۔ انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس تھا۔ سردار عبدالرب نشتر مرحوم جو اس وقت مغربی پاکستان کے گورنر تھے، اس کے صدر تھے شوکت نے اس اجلاس میں اپنا مضمون سنایا۔ ان کے اس ایک جملہ پر ———

"بعض لوگ پڑھنے میں املا کی غلطی کرتے ہیں"

سب لوگ مسکرانے لگے اور سردار نشتر مرحوم تو جھومنے لگے۔

مولانا سہا بھوپالی نے بچگانہ قد و قامت اور صورت پائی تھی۔ ان کے اس "بہ قامت کہتر" ہونے کی کس خوبصورتی اور پُر لطف انداز میں شوکت تھانوی نے ترجمانی کی ہے۔ ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک محفل میں بہت دیر تک گراموفون بجتا رہا۔ جب گراموفون کا ڈھکنا بند کیا گیا تو پتہ چلا کہ اس کی آڑ میں مولانا سہا بھوپالی بیٹھے تھے۔

شوکت نے اپنی مشہور کتاب "شیش محل" میں متعدد شخصیتوں کے خاکے مُوئے قلم سے بنائے ہیں۔ ایک بزرگ "افقر موہانی" ان کے نام کے ساتھ "لسان الطریقت" لکھا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے جو انہیں ایک بار دیکھ لے گا وہ دوسری بار دیکھنے کی تمنا کرے گا۔ شوکت تھانوی نے ان کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں لکھا، ان کا نام صفحہ کے سرنامہ پر لکھ کر اس کے نیچے چھوڑ

[illegible] —

سالبیدہ خواں وہ ہوا ۔ پیلن تر سب سے ۔ دیگری

فارسی کا مصرعہ کس قدر صحیح، موزوں اور برمحل استعمال ۔ اس ایک مصرعہ نے صاحب شخصیت کے اوصاف، اعمال، حسن رسم علم اور مسلمات و ممکنات کا مت نمایاں کر دیا ہے ۔ اس مصرعہ کو شوکت تھانوی نے منتخب کیا ہے اس سے وہ داد کا مستحق ہے ۔ اس کی تعریف بھی نہیں ہو سکتی ۔ گر اس سے ان کے وجدان و ذوق کی لطافت کا بھی اندازہ ہوتا ہے

شوکت تھانوی اور میں جس محفل میں یکجا ہوتے دونوں طرف سے خوب چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک رہتی ۔ بعض اوقات محفل میں وہ مجھے بھی تمامت کے ساتھ بلاتے : ـــ " حضرت ! بات بات پہ حضرت ماننے کے لئے سب حضرت ہوتا لائق آپ القاب میں کی عزت دی جاتی ہے ... " حضرت اسما کا ج کی ' ح ' کا قرأت کے ساتھ تلفظ ادا کرتے ہوئے ۔

ایک محفل میں بولے .... سب لوگ اعتراض سے تالیاں بجاتے ہیں اور یہ مولانا (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) پیروں سے تالیاں بجاتے ہیں ۔

مشاعروں میں اکثر و بیشتر مجھ سے " جنا کا کنارا " پڑھنے کی فرمائش ہوا کرتی ہے ۔ اس نظم کا آخری شعر ہے ؎

اے بت کدۂ ہند کے بے ترشے ہوئے بت !
بخشم بہ نگاہِ تو سمرقند و بخارا !

میں نے ایک ادبی نشست میں یہ نظم سنائی تو شوکت تھانوی بولے : " آپ نے تو فارسی مصرعہ پڑھ کر اس کی سیاسی، بیانی اردو کی کر جلا دیا ۔ " اس قسم کی پھلجھڑیاں تو وہ ہر محفل میں چھوڑتے رہتے تھے ۔

تیس سال پہلے کی بات ہے ـــ کراچی میں " اِنڈو پاک مشاعرہ " تھا ۔ میں نے باہر سے آئے ہوئے شاعروں کی دعوت کی ۔ شوکت تھانوی کو اس دعوت کا علم ہوا تو شکایت کی کہ تم نے مجھے نہیں بلایا ۔ میں نے کہا کہ بھائی ۔ میرے فلیٹ کا جو مردانہ کمرہ ہے اس میں پندرہ آدمیوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے، جگہ کی کمی کی وجہ سے آپ اور بعض دوسرے احباب کو بھی تکلیف نہ دے سکا ۔ اس دن کے بعد جب وہ ملتے تو مزاحاً کہا کرتے تھے ـــ " میرا شمار ان چودہ (۱۴) آدمیوں میں ہوا یا پندرھواں سولھواں نمبر ہے : "

سنہ [illegible] میں مظفرآباد (آزاد کشمیر) میں خاصا شاندار مشاعرہ ہوا ۔ سب شاعروں نے اسٹیشن ویگن میں سفر کیا ۔ یہ راستہ ہے تو بڑا دلچسپ اور مناظر خیز ۔ مگر جب جلدی جلدی موڑ آتے ہیں، ساتھ ہی نشیب فراز بھی، تو بعض مسافروں کو چکر آجاتے ہیں اور طبیعت مالش کرنے لگتی ہے ۔ کوہ مری اور کوہالہ کے درمیان میری طبیعت گڑبڑانی شروع ہوئی ۔ یہاں تک کہ ویگن کو رکوانا پڑا اور میں نے نیچے اتر کر قے کر ڈالی ۔ استفراغ کے بعد طبیعت ہلکی ہو گئی ۔ جب ہم سوار ہو کر روانہ ہونے لگے تو شوکت تھانوی مجھ سے بولے !

" تم نے بڑی ترلوت کے ساتھ قے کی "

سب لوگ ہنسنے لگے اور میں بھی کچھ تلملا کر اور کچھ مسکرا کر رہ گیا ۔

شوکت تھانوی خود اپنی ذات سے مجموعہ لطائف و ظرائف تھے اور ساتھ ہی لطیفہ ساز اور لطیفہ گو تھے ۔ دوسروں کی کیسی کیسی نقلیں محفلوں میں کرتے ۔ ایک دفعہ لکھنؤ کی پرانی صحبتوں کا ذکر چل پڑا ۔ یہاں تک کہ وصل بلگرامی کا تذکرہ بھی درمیان میں آگیا ۔ شوکت تھانوی

نے کہا یہ شخص بڑی رکیش وضع عجیب پرلطف حرکتیں کرتا تھا۔ ایک بار چند شعرا کسی مشاعرے میں جا رہے تھے۔ چار باغ جنکشن پر ایک نوجوان انگریز لڑکی ٹہل رہی تھی۔ سب دوستوں نے وصل بلگرامی سے کہا کہ اگر تم اس لڑکی کا منہ چوم لو تو دس روپیہ ہاتھ کے ہاتھ تمہاری نذر کئے جائیں گے۔ اس شخص نے ہامی بھر لی۔ سب لوگ حیران تھے کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ یہ سب اب سے چالیس برس پہلے کی بات ہے جب نیم انگریز رئیس بھی ذرا دیر سے ہاتھ ملانے میں ہندوستانیوں سے ہاتھ ملاتے جھجکتے تھے۔

وصل بلگرامی اس انگریز لڑکی کے پاس پہنچے۔ آگے بڑھے، دیکھتے جاتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ تھوڑی دور جا کر وہ پلٹ آتے۔ اور لڑکی کے ارد گرد چکر لگانے شروع کئے اور پھر ایکا ایکی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیا اور منہ چومنے کے بعد رونے لگے۔ پلیٹ فارم پر دوسرے مسافر اور اس لڑکی کے ساتھی سب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ وصل صاحب کی داڑھی آنسوؤں میں تر ہوئی جا رہی ہے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہے ہیں۔ میری لڑکی کا بعینہٖ یہی حلیہ تھا، بالکل اسی طرح کا ناک نقشہ، ایسا ہی بڑا سا قد، اس جان بہار کی اتنی ہی عمر ہوگی جب وہ اللہ کو پیاری ہوئی ہے۔ شوکت تھانوی کہتے تھے کہ وصل بلگرامی کی اس حرکت پر کسی قسم کا نوٹس لینا تو ایک طرف رہا اس لڑکی کے رشتہ دار وصل صاحب کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ وہ رو دھو کر پھر دوستوں کے پاس آئے۔ دس روپیہ کی نذر وصول کی۔ اور جن لبوں پر ابھی آہ و فریاد تھی ان پر اب ہنسی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

بے تکلفی کی محفلوں میں شوکت کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ اُن کے لطیفوں کی نقل بعض احباب کرتے ہیں مگر وہ بات کہاں آتی ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے دو بار ان سے ملاقات ہوئی تھی مگر یہ بہت ہی سرسری اور سرِ راہے کی ملاقات تھی۔ ان سے بے تکلفی پاکستان بننے کے بعد ہوئی۔ کیسا ہی سنجیدہ اور ثقہ آدمی کیوں نہ ہو اُسے بے تکلف کرنے میں شوکت تھانوی یدطولیٰ رکھتے تھے۔

ریل میں، لاری میں، بس میں اور ہوائی جہاز میں، نہ جانے کہاں کہاں میرا ان کا ساتھ اور ہمسفری رہی ہے۔ کبھی کبھی ایک جگہ ٹھیرے ہیں۔ کیا باغ و بہار آدمی تھا، مزاج میں کس درجہ شوخی اور طبیعت میں کس قدر شگفتگی تھی۔

ایک بار میں نے ان سے کہا کہ میں نے "بحرِ قلیل" (LITTLE - SEA) میں غزل کہی ہے۔ بہت دیر تک سوچتے رہے کہ میں نے "زبانِ راز" میں کیا کہہ دیا۔ یہ دیکھ کر کہ یہ معمہ ان سے حل نہیں ہو رہا ہے میں خود بول پڑا ——— "چھوٹی بحر"! میرے اس کہنے پر زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے پھر کہا میں نے تمہارے نام کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ بولے کیا؟ میں بولا (GRANDEUR-OF POLICE STATION) اپنے نام کا انگریزی ترجمہ سن کر وہ ہنسے ہیں تو ہنستے ہی رہے۔ روزنامہ "جنگ" کے فکاہی کالم میں اس واقعہ کا ذکر بھی کیا۔

شوکت تھانوی بہت ہنس مکھ، ملنسار اور خوش مزاج تھے۔ مگر خلافِ طبیعت بات سنتے تو چہرہ تمتما جاتا۔ اپنی ذات پر تنقید کم ہی برداشت کرتے۔

شوکت تھانوی مرحوم نے اُردو زبان و ادب کو قہقہے، مسکراہٹیں، چٹکیاں اور گدگدیاں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو پُر بہار اور ان کی آخرت کو تبسم زار بنا دے اور جنت میں بھی وہ حوروں کے ساتھ شوخیاں اور اٹھکیلیاں کرتے نظر آئیں (آمین)

آہ شوکت تھانوی

امین سلونی

اردو ادب کے مایہ ناز خدمت گزار، بے وقت، باغ و بہار زندگی گزارنے والے شوکت تھانوی ۴ مئی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ ہماری شمع انجمن خاموش ہو گئی اور ایک سناٹا چھا گیا ہے۔ اطلاع ٹھیک اس وقت ملی جب کہ ہم لوگ لکھنؤ میں عید قربان کے روز نماز عید کے لئے عیدگاہ میں موجود تھے۔ اس وقت ہم لوگوں پر کیا کیفیت طاری ہوئی اور میں کیسے گھر پہنچا اور اس سانحہ کو کیسے برداشت کیا۔ اب یہ بتانے کا وقت نہیں۔ مشیت خداوندی سے کون لڑ سکتا ہے۔ وہ اسی کا فیصلہ ہے۔

شوکت تھانوی ایک بلند پایہ مزاح نگار، اخبار نویس، ادیب اور شاعر تھے۔ یعنی ان کی رگ رگ میں مزاح رچا اور بسا ہوا تھا۔ ان کے قلم سے خواہ کتنا ہی سنجیدہ مضمون لکھا جائے۔ ان کی فطری مزاح نگاری کی صلاحیتیں نمایاں ہو جاتی تھیں۔ شادی ہو یا غم، ہر موقع پر شوکت کی متین مزاحی فطرت پژمردہ سے پژمردہ انسان کو بھی بغیر ہنسائے نہ رہتی تھی۔ مگر افسوس کہ وہی شوکت تھانوی کا ایک مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ کافی عرصہ ہوا جب کہ مرحوم نے ایک خط کے ذریعہ یہ اطلاع دی تھی کہ انہیں حکومت نے تمغۂ امتیاز عطا کیا ہے۔ اور اسی تمغۂ امتیاز کے حاصل کرنے کے لئے وہ غالباً راولپنڈی سے لاہور آئے۔ اور پھر واپس جانے کی مہلت موت نے نہ دی۔ جب وہ ہسپتال داخل ہوئے تو پھر ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ مختصر کہ حضرت زار زار ہنسانے والے، دوسروں کو ہنسانے والے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو سوگوار بنا کر رخصت ہو گئے۔

شوکت مرحوم کا آخری خط جو انہوں نے راولپنڈی سے ۸ فروری ۱۹۶۳ء کو لکھا تھا۔ وہ مجھے یہاں ۱۳ فروری ۱۹۶۳ء کو موصول ہوا۔ خط کا انداز ایسا تھا جو اب سمجھ میں آیا کہ وہ ان کا میرے نام آخری خط تھا۔ جس میں انہوں نے اپنی عادات کے مطابق "میاں پیارے امین" لکھ کر مخاطب کیا تھا اور اپنی آخری کتاب "کچھ یادیں اور کچھ باتیں" مرتب کرنے میں مجھ سے یہ خواہش کی تھی کہ اس کے لئے لکھنؤ کے وہ حضرات جن سے مرحوم بے تکلف تھے۔ اور اس میں اولیت میرے نام کر دی گئی تھی اور اس کے بعد نسیم انہونوی۔ مولانا آسی۔ سید جالب دہلوی۔ وصل بلگرامی، رفیع احمد خاں، سراج لکھنوی۔ قدیر لکھنوی، ظریف لکھنوی، حکیم ڈاکٹر محمد امین، عبد الرؤف عباسی ایڈیٹر حق۔ مسٹر انیس احمد عباسی، ایڈیٹر حقیقت، صباح الدین عمر وغیرہ حضرات کی تصاویر فوراً مہیا کروں۔ اور اپنی عادت کے مطابق خط میں لکھا تھا کہ پیارے امین۔ خیریت اور عافیت کے تمام تکلفات کو چھوڑ کر اپنے چند لمحات مجھ پر قربان کر دو اور ابھی یہ کام

کہ وہ کہاں ان حضرات کی تصاویر حاصل کریں۔ ان کے متعلق اور تفصیلات بھی جمع کریں۔ مرحوم ہمیشہ اسی قسم کے مذاق کرتے تھے اور چونکہ ہم دونوں میں کسی قسم کا تکلف نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ جب تک یہاں رہے ہم اور نسیم انہونوی اور مرحوم) [illegible] زبان پر رہا۔ جلد اُتنے لوگوں نے یہاں تک شہرت دی کہ بعض لوگوں نے باپ بیٹا ہونا مان لیا [illegible] بھی کہہ ڈالی۔ اور اگر ان کمپلیکس میں رہ جانے سے [illegible] تھوڑا سا رنج پڑا۔ مگر مجلہ یہ اتحاد شکست [illegible] ۱۹۲۸ء میں [illegible] کے اجرا سے ہوئی تھی۔ شوکت مرحوم میں اور نسیم انہونوی کو ایک دنیا [illegible] جانتی تھی اور [illegible] بھی ہیں۔

میری اور ان کی ملاقات بالکل دیہاتی انداز میں ہوئی تھی۔ یہ اس زمانہ میں رسالہ [illegible] کی ادارت کر رہا تھا اور شوکت سے بذریعہ ڈاک متعارف تھا اور دونوں ایک دوسرے کو بڑا بزرگ اور بڑا جہاندیدہ سمجھتے تھے۔ لیکن ایک دن یہ پردہ اٹھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ دراصل ملاقات سے پہلے سے خط و کتابت کے ذریعے تھا مگر پھر بھی جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو دونوں حیرت میں تھے۔ شوکت نے کہا کہ ارے آپ [illegible] ہیں۔ میں نے کہا اور آپ وہ شوکت تھانوی ہیں۔ روزنامہ میں کام کرنے والے لوگ بھی اس ملاقات کو دیکھ رہے تھے اور ہنستے تھے [illegible]۔ دونوں کی عمر ان دنوں میں [illegible] سال [illegible] بہرحال ایک دوسرے سے ملے اور پھر یہ دوستی رفاقت آخر دم تک قائم رہی۔ شوکت بڑے ذہین انسان تھے لکھنے پڑھنے میں وہ بالکل دیہاتی سے مطابقت رکھتے تھے۔ لیکن ان کا فطری ذوق شعر اور مزاح نگاری رسالہ [illegible] کے ذریعے پہلی دنیا کے سامنے آیا۔ اور پھر اس کے بعد جب [illegible] گئے تو نسیم انہونوی نے رسالہ انکشاف میں ان کے مضامین شائع کئے اور ان کا مجموعہ بھی مرتب ہوا۔ میں شوکت مرحوم اخباری دنیا میں ہم دونوں ایک ساتھ رہے۔ روزنامہ ہمدم میں سید جالب دہلوی مرحوم کی نیابت اور [illegible] دونوں پر یکساں رہی۔ شوکت نے وہاں [illegible] باتیں [illegible] اور میں نے مقامی خبروں کی ذمہ داری سنبھالی۔ اور اس کے بعد لکھنؤ کے سب سے بڑے اور [illegible] اخبار [illegible] میں ہم دونوں ایک ساتھ کام کرتے رہے۔ وہاں بھی شوکت مزاحیہ کالم لکھتے تھے اور مجھے اداریہ دیا گیا تھا۔ لکھنؤ میں مسٹر رام لال ورما جو روزنامہ [illegible] کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے لکھنؤ سے روزنامہ ہند کے نام سے اخبار جاری کیا میں اور شوکت دونوں وہاں بھی ساتھ رہے۔ اور سرپنچ میں تو مستقل طور پر ہم دونوں کام کرتے تھے۔ اور پھر شوکت نے خود بھی ایک روزنامہ طوفان کے نام سے جاری کیا ظاہر ہے کہ شوکت کا اخبار تھا میرے اوپر پوری ذمہ داری تھی۔ سرپنچ نے [illegible] ہم تینوں ایک ہی ساتھ سفر کرتے ایک ہی ساتھ [illegible] اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور دوسرے [illegible] مشاغل بھی عام طور پر ہم لوگ دہلی [illegible] سفر کرتے۔ اور بعض لوگوں کے واسطے ہوٹل میں بیٹھ کر رات بھر میں متعدد مضامین لکھ کر سپرد کرنے تھے وہ ایسے لوگ تھے جن سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور انکار کس سے کیا جاتا جنہیں دیکھنے اور ملنے لکھنؤ سے دہلی کا سفر کیا جاتا تھا۔ وہ دور یاد آتا ہے تو دل روتا ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے۔

لکھنؤ میں جب آل انڈیا ریڈیو کی بنیاد پڑی تو شوکت مرحوم مستقل طور پر آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہو گئے۔ اس زمانہ میں جو لوگ ریڈیو کے عملے اور اسٹاف میں تھے۔ سبھی ادیب، سبھی اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک لوگ تھے۔ انہوں نے اس اسٹیشن سے مزاح اور طنز کو کافی ترقی دی کبھی کبھی میرے اور شوکت کے درمیان آل انڈیا ریڈیو سے دو مزاحیہ مکالمے بھی نشر ہوتے تھے۔ اور ہم دونوں مختلف نوع کی تخلیقات برابر پیش کرتے رہتے تھے۔ جب تک لکھنؤ میں آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن قائم نہیں ہوا تھا ہم لوگ دہلی اسٹیشن پر [illegible]

[illegible] تھے کہ وہ [illegible] شیشی سے [illegible] پر پہلے پڑا [illegible] اور [illegible] پسند کیا اور شوکت نے [illegible] میں ایک [illegible] کا اضافہ پیش کیا تھا۔ یہ تھا کہ [illegible] ہم [illegible] غزلوں کے چار [illegible] مرتب کیا جاتا [illegible] کرتا اور یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔

آل انڈیا ریڈیو سے شوکت مرحوم کا تعلق [illegible] والوں نے لاہور [illegible] وہ دو ایک ہی سال رہے تھے کہ دوسری [illegible] عالمگیر جنگ شروع ہو گئی [illegible] تھا۔ ملک [illegible] ختم ہو گیا کیونکہ ابھی تک جاری [illegible] تھا۔ [illegible] میں [illegible] تھی۔ [illegible] اپنی قومی حکومت اور اپنی جیت کے [illegible] جنگ کے واسطے جنگ کے دوسرے سال [illegible] مرکزی حکومت نے عوام و خواص میں بیداری اور [illegible] سے آگاہی کے لئے سانگ پبلسٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا [illegible] کے لئے گئے [illegible] وسعت دی [illegible] اترپردیش میں بھی [illegible] سانگ پبلسٹی کی بنیاد [illegible] تھی۔ [illegible] کا کوئی [illegible] منتخب [illegible] تھا کل ہند سانگ پبلسٹی کا ڈائرکٹر [illegible] حفیظ جالندھری کو مقرر کیا گیا تھا۔ اور حفیظ صاحب [illegible] کی تنظیم میں لگے ہوئے تھے۔ ان کا ایک پیغام ہمارے پاس بھی پہنچا تھا۔ [illegible] شہرت [illegible] سے جدوجہد کر رہے تھے [illegible] کے واسطے مختلف مقامات کے دورے [illegible] اور حضرت قدر لکھنوی کر رہے تھے [illegible] اسی بزم اردو کے سلسلہ میں دہلی بھی جانے کا اتفاق ہوا اور حفیظ صاحب سے دہلی ہی میں ملاقات ہوئی۔ ان کی خواہش تھی کہ [illegible] اترپردیش کی [illegible] سنبھال لوں میں ساری زندگی سے جاگتا رہا اور [illegible] کے ساتھ تعاون کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ گرچہ میں کسی سیاسی پارٹی میں شامل نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ملک کی آزادی کی تڑپ میرے دل میں بھی تھی۔ اور ملک میں جو تحریکات جنم پا رہی تھیں میں پورے طور پر ان کے ساتھ [illegible] میں تھے۔ ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جب کہ ملک کی آزادی کی جدوجہد شدت کے ساتھ جاری تھی اور آل انڈیا کانگریس کے ۱۹۴۲ء [illegible] اجلاس کے موقع پر ایک قومی شاعر [illegible] اور پنڈت آنند نرائن ملا کہہ چکے تھے۔ اس لئے میں اس نظریہ کا نہ تھا کہ اس ادارہ میں شامل ہو جاتا۔ لیکن میں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ شوکت صاحب کو لاہور سے بلائیں وہ اس کے واسطے موزوں ثابت ہوں گے اور اس لئے بھی کہ ان کے اندر سانگ پبلسٹی کے سنبھالنے کی صلاحیت بھی تھی۔ اور یہ بھی میری خواہش تھی کہ شوکت پھر لکھنؤ آجائیں چنانچہ حفیظ صاحب نے میری اس تجویز کو پسند کیا اور شوکت مرحوم کو اترپردیش سانگ پبلسٹی کا ڈائرکٹر مقرر کر کے انہیں لاہور سے یہاں بلا لیا اور ہم دونوں پھر یکجا ہو گئے۔ انہوں نے لکھنؤ میں اس ادارہ کا دفتر قائم کیا۔ اور کام شروع ہو گیا سانگ پبلسٹی کے ذریعہ شعراء کو بھی کچھ [illegible] نوازا جاتا تھا [illegible] سے متعلق دو چار شعر لکھنے والے کو بھی دس بیس روپے ملتے تھے۔ گویا یہ سرکاری طور پر معاوضہ مقرر کیا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ اس ادارہ سے کون کون لوگ فیضیاب ہوئے مگر میں نے شوکت مرحوم سے ایک پیسہ بھی اس سلسلہ میں کبھی نہیں لیا۔ اس کے جاننے والے آج بھی وہ شعراء موجود ہیں جو مستقل طور پر اس ادارہ میں ملازم تھے۔ ان میں حضرت عیش لکھنوی اور بسمل الہ آبادی دونوں حضرات اس ادارہ سے متعلق تھے میں نے صاف [illegible] لینے سے انکار کر دیا۔ البتہ شوکت کی دوستی کی وجہ سے تعاون کا یقین دلایا اور وہ تعاون برابر دیتا رہا۔ اگرچہ حضرت حفیظ نے شوکت مرحوم سے شکوہ کیا کہ ان کے مخصوص دوست ان کے ساتھ اشتراک اور تعاون نہیں کر رہے ہیں لیکن جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے حفیظ صاحب سے [illegible]

کہ وہ انہیں بتایا کہ اشتراک اور تعاون کا مقصد معاوضہ حاصل کرنے سے نہیں پورا ہوتا ہے۔ میں شوکت سے تعاون کروں گا لیکن اپنے نظریات چند پیسوں کے واسطے فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اور میں نے ان کی غلط فہمی بھی دور کی۔ خود شوکت مرحوم کہا کرتے تھا کہ میرا تعاون انہیں رات دن حاصل رہتا ہے۔ بہرحال میرے اور شوکت مرحوم کے درمیان جو تعلقات قائم تھے وہ برابر قائم رہے۔ اس میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی

آج شوکت کی موت نے ایک زبردست خلا پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کا پر ہونا ممکن نہیں ہے۔ جب تک وہ لکھنؤ میں رہے طنز و مزاح کی دنیا میں کرشمے بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ اور سرپنچ کے ذریعہ مزاح نگاروں کا ایک وسیع حلقہ بن گیا تھا اور اس حلقہ کے لوگ کبھی کبھی عنوان مقرر کر کے مزاحیہ مضامین لکھتے اور حلقہ کے ممبران کو طبع آزمائی کی دعوت دی جاتی تھی۔ اور اکثر مضامین اسی سلسلہ میں لکھے گئے۔ سودیشی عنوان کے تحت شوکت نے سودیشی ریل لکھی میں نے سودیشی اردو لکھی کسی دوسرے نے سودیشی کونسل لکھی غرضیکہ ایک لمبا سلسلہ تھا ایک ڈپلیکیٹ شادی کا شروع ہوا اور اس کی ابتدا میں نے کی اور ختم شوکت نے کیا۔ اور درمیان میں اس سلسلہ میں نسیم انہونوی دیوانہ بریلوی۔ نظر بریلوی۔ شمیم جھبو۔ ی۔ سلیم سندیلوی وغیرہ نے حصہ لیا۔

لکھنؤ میں روز ہی شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ میں بھی شریک رہتا تھا۔ اور مولانا عبدالباری آسی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ جب شوکت مرحوم ابتدائی دور میں مجھ سے ملے تو انہوں نے بتایا کہ وہ کسی سے اصلاح نہیں لیتے۔ میں نے شوکت مرحوم سے کہا کہ شعر و شاعری کی دنیا میں اگر آدمی کوئی جگہ حاصل کرتا ہے۔ تو پھر یہ ضروری ہے کہ ہم کسی سے رجوع کریں۔ شوکت مرحوم نے دریافت کیا کہ پھر کس کے پاس جائیں۔ اس وقت بے اختیار میں نے مولانا آسی کا ایک شعر سنایا۔

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئین وفا بدلا

شوکت مرحوم نے یہ شعر سن کر چونک اٹھے۔ اور اسی وقت انہوں نے خواہش کی کہ مجھے انہیں کے پاس لے چلئے۔ یہ واقعہ مرحوم شوکت تھانوی نے اپنے آخری سلسلہ "کچھ یادیں اور باتیں" نے ابتدا ہی میں میرے حوالے سے اخباروں میں لکھا ہے۔ اور وہ شائع ہو چکا ہے کہ کس طرح وہ مولانا آسی کی خدمت میں پہنچے۔ اور اسے مرحوم شوکت نے اپنے مزاحیہ انداز میں اسے پیش کیا ہے۔ اور پھر یہ سلسلہ قائم رہا۔ شوکت اپنا تمام کلام مولانا آسی کی خدمت میں پیش کرتے اور اصلاح لیتے اور اپنا ایک مجموعہ گہرستان کے نام سے مرحوم نے چھپایا بھی۔

شوکت شاعر تھے۔ اور سنجیدہ اور طنز و مزاح دونوں ان کے حصہ میں آئی تھی۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اگر شوکت طنز و مزاح کی شاعری پر زور دیتے تو آج ان کا پایہ بہت بلند ہوتا۔ اس لئے وہ فطرتاً مزاح نگار تھے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے، جاگتے، سوتے طنز و مزاح کے موتی بکھیرتے رہتے تھے مجھے بھی مزاح سے دلچسپی تھی۔ مگر میں سست رفتار تھا۔ اور شوکت تیز رفتار قلم برداشتہ لکھنے کے عادی۔ اکثر مجھ سے انہوں نے سر پر سوار ہو کر لکھوایا ہے۔ آہ! اس دور کی سینکڑوں باتیں آج یاد آتی ہیں۔ اور اپنے دل و دماغ میں محفوظ ہیں لیکن یہ وقت ان تفصیلات کا نہیں ہے۔ کبھی انہیں یادوں پر ہنستا ہوں اور کبھی روتا ہوں میرے اور مرحوم شوکت کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا ایک دوسرے کے گھروں میں آمد و رفت تھی۔ اس لئے ہر ایک بے تکلف تھا۔ جن لوگوں سے ملا ہوں اس پر ایک کتاب مرتب کی

[illegible] تحریر [illegible] ایک [illegible] سے [illegible] ذکر [illegible] تحریروں [illegible] بعد میں [illegible] اور [illegible] کر دوں۔ میں فہرست مرتب کر رہی [illegible] نقوش [illegible] مرتب کر ڈالوں کہ فہرست [illegible] فہرست [illegible] اب [illegible] اپنے مرحوم دوست کی یاد میں [illegible] مرتب کر ڈالوں۔ کاش میرے دل و دماغ میرا ساتھ دے جائیں۔ شوکت کے ساتھ میرے تعلقات کی دنیا کافی وسیع تھی۔ لیکن اس مختصر فہرست میں اپنی یادوں کے تاج محل [illegible]!

شوکت اور نسیم

نسیم انہونوی

ستمبر ۳۱ء کی ایک شام ہم باپ بیٹے روح القدس یعنی امین سلونوی شوکت تھانوی اور راقم الحروف حسبِ معمول لکھنؤ کے امین آباد پارک میں بیٹھے تھے۔ کہ میں نے وہ منصوبہ شوکت تھانوی صاحب سے بیان کیا جو ان کی عدم موجودگی میں، میں نے امین صاحب کے مشورے سے بنایا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایک تثلیث قائم کی جائے۔

شوکت نے کہا ایسا ہی تثلیث پرستی کا شوق ہے تو سمجھ لو یہ تثلیث تو مدت سے قائم ہے۔

میں نے کہا: وہ تثلیث پرانی ہو چکی ہے۔ اور پھر ہماری تثلیث اس سے مختلف ہوگی۔ ہم کسی مذہب کی نہیں ایک ہفتہ وار اخبار کی اشاعت کریں گے اور جس کا کام لوگوں کو ہنسا کر ان کی زندگی بڑھانا ہوگا۔ اس وقت ایسے اخبار کی اشد ضرورت ہے جو ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ طنز و مزاح کو پیش کر سکے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب اودھ پنچ کا دورِ جدید بھی دم توڑ رہا تھا۔ اس لئے کہ اس نے حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اشاعت ہوتی تھی مگر گنڈے دار اور یہی سب سے بڑا سبب ہوتا ہے کسی اخبار کے بند ہو جانے کا۔ اودھ پنچ کی جگہ کوئی اور پنچ نکالا اس وقت موقع کی بات تھی۔ جو میرے کاروباری دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے کہ انکشاف کے ظرائف نمبر کی مقبولیت سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اگر کوئی اخبار یا رسالہ شوکت صاحب کی ادارت میں شائع کیا جائے تو یقیناً بہت مقبول ہوگا مجھے اس وقت تین سال تک انکشاف اور ۹ ماہ تک حریم نکالنے کا تجربہ تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر شوکت صاحب راضی ہو جائیں تو ایک مزاحیہ اخبار نکالا جائے۔ امین سلونوی صاحب اس میدان کے مجھ سے بھی پرانے کھلاڑی تھے۔ اس لئے میں نے ان سے بھی رائے لی۔ اور انہوں نے نہ صرف اس خیال کو پسند کیا۔ بلکہ تعاون کا بھی وعدہ کیا۔ اس کے بعد ہم نے اسکیم شوکت صاحب کے سامنے پیش کی تھی۔

شوکت صاحب ادارت کے لئے راضی ہو گئے اور نام تجویز کرنے لگے پنچ کا لفظ ضروری تھا۔ اس میں شوکت صاحب کی تجویز پر سر لگا کر سرپنچ کر دیا گیا اور ڈھولکی پر پھاگ کھیلتے ہوئے میں نے ایک مکان بھی موجودہ دفتر کے قریب ہی کرائے پر لے لیا تاکہ اس میں دفتر قائم کیا جائے ـــــ ابھی تک حریم کا دفتر نیاز صاحب کے دفتر نگار ہی کے ایک گوشے میں قائم تھا۔ ستمبر ۳۱ء میں سرپنچ کا دفتر کھلا۔ ایک میز اور چند پرانی کرسیاں خریدی گئیں۔ پہلا پرچہ ۲۰ × ۳۰ سائز کے ۱۶ صفحات پر شائع کرنے کے انتظامات کئے گئے۔ اس

[illegible] سے دوسرے مضمون نگاروں کا شمار بھی ممکن نہیں ہو سکتا تھا [illegible] سے مل ہو گئیں۔ تحریک سے متعلق اشتہارات تک [illegible] بھی شوکت صاحب نے لکھے۔ لکھنؤ کے طلبہ، پنڈت [illegible] صاحب نے ملاقات کی۔ اور [illegible] کی تصاویر بھی چھپ کر پمفلٹوں کی شکل میں دی گئیں۔ اور جب یہ پمفلٹ [illegible] سے زیادہ کر گئی۔ شوکت صاحب [illegible] تحریر نے [illegible] دی تھیں [illegible] قیمت [illegible] برسوں میں نہیں ہوتی۔

اسی زمانہ میں شوکت صاحب اخبار ہمدم میں کام کرتے تھے کہ جب [illegible] شوکت صاحب نے [illegible] نکالا [illegible] سب سے پہلے اپنے مضمون [illegible] تھا۔

> "اس زمانہ میں ہمدم ایک عجیب بحران میں مبتلا ہو گیا تھا۔ [illegible] خاں صاحب [illegible] نے ہمدم سے [illegible] خان بہادر محمد حسین صاحب نے [illegible] حیثیت سے استعفیٰ دے دیا۔ چودھری خلیق الزماں صاحب نگران مقرر ہوئے۔ مگر وہ بھی زیادہ وقت نہ دے سکے [illegible] منتقل ہو گئے [illegible] چودھری رحیم الزماں نے ادارت سنبھالی۔ اس [illegible] میں میرے لئے [illegible] پیچھے سے [illegible] جاؤں۔ نسیم انہونوی اور [illegible] خوش تھے کہ اب [illegible] وقت سرپنچ کو دے سکوں گا۔ مگر میں نے اپنا [illegible] صاحب نے [illegible] منشی نول کشور کے اودھ اخبار کی ادارت سنبھال لی۔ سرپنچ کا کام بدستور جاری رہا اور اب سرپنچ نے اپنے لئے [illegible] حلقہ حاصل کر لیا تھا کہ [illegible] تو ان ہی کے بے لوث اور [illegible] تعاون سے سرپنچ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ امین صاحب خالص کاروباری قسم کے آدمی تھے ان کے حسن انتظام نے سرپنچ کی بنیادیں نہایت مستحکم کر دیں ۔۔۔۔"

اس تحریر کی تفصیل یہ ہے کہ سرپنچ اس وقت [illegible] کی تعداد میں چھپنے کے باوجود اس قابل نہ تھا کہ شوکت صاحب کو اتنی تنخواہ دے سکتا جس سے ان کی گزر بسر بافراغت ہو سکتی۔ اس لئے ہمدم کے بعد وہ اودھ اخبار میں چلے گئے۔ سرپنچ کو ان کے پورے وقت کی ضرورت بھی نہ تھی۔ حاضر دماغ ہونے کے ساتھ ہی شوکت صاحب زود نویس بھی تھے اور بسیار نویس بھی۔ آپ یقین فرمائیں کہ جس روز سرپنچ نکلنا ہوتا اس سے ایک روز پہلے وہ قلم و کاغذ لے کر بیٹھتے اور کاتب کو بٹھا لیتے اور صرف چند ہی گھنٹوں میں اداریہ سے لے کر اشتہارات تک سب لکھ دیتے اور اخبار مکمل ہو جاتا۔

سرپنچ کا دفتر قائم ہوتے ہی وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ اسی عمارت میں آ گئے تھے۔ عقبی حصہ اور صحن شوکت دلہن کے تصرف میں تھا۔ اور باہر کے دو کمرے دفتر کے لئے وقف تھے۔ اور جب رات میں دفتر بند ہو جاتا تو یہ کمرے بھی شوکت صاحب ہی کے اختیار میں رہتے۔ شوکت دلہن اس وقت پردہ کرتی تھیں۔ مگر مجھ سے ان کے تعلقات کچھ ایسے موڑ پر پہنچ گئے تھے کہ وہ میرے سامنے آنے لگی تھیں اور میں ان کی نظروں میں ان کے سگے دیور سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

اودھ کا ایک ہفتہ وار اخبار جو بلا کسی معتد بہ سرمایہ کے نکالا گیا ہو کبھی اس قابل نہیں ہو سکتا کہ تین خوش پوش گھرانوں کی کفالت کر سکے۔ اس لئے امین صاحب اور شوکت صاحب دونوں ہی اودھ اخبار سے متعلق رہے۔ کچھ ہی دنوں بعد امین صاحب کی دلچسپیاں کم ہو گئیں اس لئے کہ انہوں نے انڈی پنڈنٹ نیوز سروس قائم کر کے اردو اخبار کو لوکل خبریں فراہم کرنا شروع کر دی تھیں۔

ر اس کے لئے انہیں ملازمت سے بچا ہوا تمام وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ ان کا نام معاون اڈیٹر کی حیثیت سے صفحے ہی میں نکلتا رہا۔ مگر کام ادارت کا تمام تر شوکت صاحب ہی کرتے تھے۔ انہیں اس سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ اپنا ہی بچہ سمجھتے رہے۔ اور میں بھی پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے شوکت صاحب سے جو عقیدت، محبت اور خلوص تھا اسے نہ صرف شوکت ہی جانتے تھے۔ بلکہ ہر وہ شخص ان حالات سے واقف تھا۔ جو ہمارے قریب تھا۔

شوکت صاحب کی قابلیت اور ذہانت سے کسی کو قطعی انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود ان کی شہرت میں میرا بہت ہاتھ تھا۔ میں نے انہیں مشہور کرنے کے لئے معلوم نہیں کیا کیا کیا تھا۔ سرپنچ کی ادارت نے جہاں سرپنچ کو شہرت بخشی وہاں خود انہیں بھی اس سے سارا ہندوستان جان گیا۔ اور ان کے جوہر اجاگر ہونے لگے۔ اس لئے کہ اس وقت بھی شوکت صاحب کے قلم میں اتنا زور تھا۔ جو پختہ کاروں کی تحریروں میں بھی کم ہی ہوتا ہے۔

ایک ہی سال بعد سرپنچ کا دفتر بدلنا پڑا۔ اب ہم اس عمارت میں آ گئے تھے، جہاں آج کل نسیم بک ڈپو کا دفتر قائم ہے۔ اس کے تین حصے تھے۔ دو میں دفتر تھا اور ایک حصہ شوکت صاحب کی رہائش کے لئے وقف تھا۔ اس میں کئی سال تک شوکت صاحب رہے۔ اس کے بعد انہوں نے خود اپنا اخبار طوفان نکالنے کا منصوبہ بنایا اور سامنے کی ایک کشادہ عمارت کرایہ پر لے کر اس میں چلے گئے تھے اس اخبار کے لئے انہیں قادیانی مشن سے ایک معقول رقم مل گئی تھی۔ لیکن افسوس کہ وہ اخبار اپنے زورِ قلم کے باوجود نہ چلا سکے۔ اخبار کے لئے ایک بہترین منتظم ایڈیٹر سے زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں شوکت صاحب بالکل کورے تھے۔ کورے ہی نہ تھے بلکہ اپنی تلخ مزاجی اور زود رنجی کے باعث اشاعت کا تعاون بھی حاصل نہ کر پائے۔ اور انتظامی خرابیوں کے باعث طوفان کا زور بہت جلد کم ہو کر ختم ہو گیا۔

شوکت صاحب کی مزاجی کیفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے دفتر میں ایک بہت بڑے افسر کی حیثیت سے بیٹھتے تھے۔ نوکروں کو ہر طرح کے ضابطہ اور قانون کا پابند رکھنا چاہتے تھے۔ نوکر کی معمولی سی بات بھی انہیں اس درجہ مشتعل کر دیتی تھی کہ وہ اسے فوراً برخواست کر دیتے تھے۔ خواہ وہ کتنی ہی عمدہ کام کرنے والا کیوں نہ ہو۔ ان کا یہ طرزِ عمل ایک ایسے چھوٹے ادارے کے لئے کبھی مفید نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے سرپنچ کا دفتر قائم کیا تو حال یہ تھا۔ کہ میں چپراسی، کلرک، اور منیجر سب ہی کی عزت کرتا تھا۔ کبھی ان کے پاس جاتا اور وہ احتراماً کھڑے ہونا چاہتے تو میں انہیں ایسا نہ کرنے دیتا۔ ان سے میری ایسی بے تکلفی تھی کہ کوئی نیا شخص دفتر آتا تو مالک و نوکر میں تمیز نہ کر پاتا۔ وہ میرا کھانا میں دفتر ہی میں کھاتا تھا۔ اور یہ کھانا اتنا آتا تھا کہ میرا اسٹاف بھی میرے ہی ساتھ کھاتا تھا۔ میرے اس برتاؤ کا یہ اثر ہوا کہ میرے معاون مددگار یا میرے دست و بازو میرے ملازم ہر حالت میں میرا ساتھ دیتے تھے۔ اس وقت سخت مالی مشکلات تھیں۔ صرف بارہ روپیہ سے میں نے اپنا کام شروع کیا تھا اور جیسا کہ شوکت صاحب نے میرے متعلق مضمون لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ میں لنگوٹی میں پھاگ کھیلتا تھا واقعی سچ ہے۔ میری جیب میں دس روپیہ ہوتے اور کام ہزار کا کرنے لگتا۔ لیکن یہ سب کچھ میری نرم مزاجی، ضبط و صبر اور مساوات کا طفیل تھا کہ گاڑی چلتی رہی۔ میں کبھی کبھی نوکروں کی ایسی باتیں بھی مطلق برداشت کر لیتا تھا جیسی کوئی دوسرا برداشت نہیں کر سکتا لیکن شوکت صاحب نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا۔ وہ بلا سوچے سمجھے ہر کام کرتے اور نتیجہ خراب ہی نکلتا۔ وجہ ان کی فطرت تھی۔ جو سنا ہے بدلی نہیں جا سکتی۔ وہ برابر والے کی بھی کوئی بات برداشت نہ کر سکتے تھے۔ چہ جائیکہ نوکر۔ شوکت صاحب سے میں نے اتنی مدت تک کس طرح نباہ کیا۔ لکھوں تو ایک طویل مضمون اسی بحث پر ہو جائے گا۔ بس مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ میں جتنا شوکت صاحب

کے زمانے تک دنیا میں کسی سے نہیں ڈرا۔ حتیٰ کہ لفافے سے بھی نہیں۔ اگر یہی تو پاس و لحاظ کے، تکلفات کا ان کو معلوم نہ ہو۔ شاید تعلق بھی کسی وجہ پر پہنچا دیتا۔ وقت پر گوارا ہی شوکت صاحب کا اولیہ ہے یہ بھی بڑا مزیدار تھا۔ اور یہ رات کو بھی پہچانتا تھا، چاہتا تھا شوکت صاحب کو یاد رکھتے ہیں۔ یہ خشیت اس کا [illegible] کے خلاف تھی بات تھی۔ خواہ میرا لکھنا کا سنتے وقت یاد نہ رہا ہے۔

شوکت صاحب شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، افسانہ نگار بھی تھے اور صحافی بھی۔ جس تیزی کے ساتھ وہ مسلسل لکھتے تھے اتنی ہی تیزی سے توجہ بھی کر سکتے تھے۔ لیکن وہ [illegible] بہت زبردست ہوا ہے۔ جو کچھ بھی لکھتے، سب سے پہلے سنانے کو بے چین رہتے اور یہ بوجھ سب سے زیادہ مجھ ہی پر پڑتا تھا۔ اس لئے اس وقت مجھ سے زیادہ قربت کسی کو حاصل نہ تھی۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی لکھنے بیٹھ جاتے تھے اس لئے صبح جب میں دفتر آتا تب سب سے پہلا کام یہ ہوتا کہ شوکت صاحب کا لکھا ہوا مضمون سنوں۔ اس کے لئے میرا ہمہ تن گوش ہونا ضروری ہوتا۔ مجال نہ تھی کہ اس دوران میری حسوں کی توجہ بھی کسی اور طرف ہو سکتی۔ میں اس طرح اپنا منہ ان کی طرف کر کے بیٹھ جایا کرتا اور کسی کی مجال نہ ہوتی۔ اس وقت دفتر میں کوئی آ جائے بیرا کسی سے مخاطب ہوتا تو شوکت صاحب کی نظروں میں ایک جرم ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ دفتر آتے ہی کام شروع ہو جاتا کوئی بات پوچھنے کاتب یا فرزی [illegible] میرے پاس آ جاتا۔ لیکن میں ذرا بھی مخاطب نہ ہوتا۔ گویا اسے دیکھا ہی نہیں۔ صرف اس لئے کہ شوکت چاہتے تھے کہ ان کا مضمون سنتے وقت میں اور کسی بھی بات کو اپنے ذہن، تصور میں نہ آنے دوں۔ حالانکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں بظاہر ہمہ تن گوش بنا ہوتا۔ مگر میرا دماغ کسی اور الجھن میں ہوتا۔ اور زبردستی مجھے شوکت کا مضمون سننا پڑتا۔ خصوصیت کے ساتھ اس وقت میں بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ جب ایسے موقعوں پر کوئی معزز شخص باہر سے آ جاتا۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار جبکہ شوکت صاحب تازہ پرچہ کا مسودہ مجھے سنا رہے تھے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب آ نکلے۔ یہ سرپنچ [illegible] تھے۔ اور ان کی عدالت میں میری جائیداد کا ایک مقدمہ بھی اسی زمانہ میں چل رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کی آمد پر بھی میں شوکت صاحب ہی کی طرف متوجہ نہیں رہ سکتا تھا۔ میری توجہ ڈپٹی صاحب کی طرف ہو گئی۔ کھڑے ہو کر میں نے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں عزت کے ساتھ بٹھایا۔ مگر خوف و دہشت سے میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ میں نے شوکت صاحب کی طرف دیکھا جو اب مسودہ میز پر رکھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ ڈپٹی صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔ مگر شوکت صاحب نے پھیکی مسکراہٹ سے ہاتھ ملایا اور اٹھ کر اپنے پرائیویٹ [illegible] میں چلے گئے۔ میں ڈپٹی صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ اور اس سے پہلے کہ ڈپٹی صاحب رخصت ہوں۔ شوکت صاحب کا نوکر ایک پرچہ لئے ہوئے آیا۔ پرچہ میں وہی لکھا تھا جس کی مجھے امید تھی یعنی استعفا۔ لیکن ان کے استعفے سے میں زیادہ گھبراتا نہ تھا۔ وہ جہاں انتہا درجہ کے تنک مزاج اور زود رنج تھے وہاں دل کے اتنے صاف تھے کہ بڑے سے بڑے واقعہ کو بھی چند گھنٹوں یا دنوں میں اس طرح فراموش کر دیتے تھے۔ جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

سورج کی اشاعت کے بعد ہی میں نے شوکت صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے مضامین کو کتابی شکل میں مرتب کریں۔ اور نسیم بک ڈپو سے اس کی اشاعت کی جائے۔ شوکت صاحب نے میری اس رائے سے اتفاق کیا اور موج تبسم کے نام سے اپنے ابتدائی منتخب مضامین کو مرتب کر کے دیئے۔ اس کی اشاعت ۲۶×۲۰/۱۶ سائز پر ہوئی۔ پورے کپڑے کی جلدیں اور سنہرے الفاظ میں کتاب کا نام چھاپا گیا۔ جس طرح شوکت تھانوی کا نام میرے تعاون سے پہلی بار کسی اخبار پر اڈیٹر کی حیثیت سے لکھا گیا۔ اسی طرح یہ فخر بھی مجھی

لاہور میں ان کی پہلی کتاب کا پبلشر بنا اور اس کے بعد میں نے شوکت صاحب کی دیگر کتابیں دنیائے تبسم، بڑ جس، مصنفاتی، [illegible] کھٹ، سوتیا چاہ، خانم جان، دولہا [illegible] اور شیطان کی ڈائری، بیرہ وغیرہ بھی شائع کیں۔

اوائل عمری میں مجھے شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انکشاف کی اڈیٹری کے زمانہ میں شوکت صاحب سے جب میرے تعلقات بڑھے تو میں ان کے ساتھ ہی مشاعروں میں جایا کرتا تھا۔ وہ بحیثیت شاعر نہ صرف یہ کہ بڑے تھے۔ بلکہ ذہانت و ذکاوت میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ان کا کلام اس وقت بھی معیاری ہوا کرتا تھا۔ وہ لکھنؤ کے مشہور شاعر جناب آسی کے شاگرد تھے۔ میں بھی آسی صاحب کی خدمت میں جایا کرتا تھا مگر کبھی ان سے اصلاح نہیں لی۔ ہاں شوکت صاحب نے اکثر میرے اشعار پر اصلاح کی اور کبھی کبھی جب وقت کی کمی یا اور کسی دشواری کے باعث میری غزل مکمل نہ ہو پاتی تو شوکت صاحب اپنی غزل کے چند اشعار مجھے دے دیتے۔ یہی نہیں۔ اکثر مشاعروں میں میری غزل پڑھتے بھی شوکت صاحب ہی تھے اس لئے کہ وہ ذہن و دماغ کے ساتھ ہی آواز بھی مترنم رکھتے تھے۔ اور ان کے پڑھنے کا طرز اتنا دلکش ہوتا تھا کہ وہ مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔

موج تبسم کی اشاعت کے بعد میں نے اور شوکت صاحب نے ایک ٹور کیا جس میں کانپور، دہلی، شاہجہان پور وغیرہ کا دورہ کرتے ہوئے ہم دونوں بھوالی پہنچے۔ اس زمانہ میں بھوالی سینیٹوریم میں ڈاکٹر زبیر صاحب انچارج تھے۔ یہ شوکت صاحب کے چچیا خسر تھے۔ انہیں کے ساتھ ہم دونوں نینی تال پیدل آئے تھے۔ اس سے پہلے ہم نے نینی تال نہ دیکھا تھا۔ تمام دن وہاں کی سیر کرکے ہم پھر بھوالی واپس آگئے۔

اس سنہ میں موج تبسم کی صدہا جلدیں فروخت ہوگئیں۔ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت پسند کی گئی۔ اس وقت صرف مرزا عظیم بیگ چغتائی کی چند کتابیں شائع ہوئی تھیں مزاح پر۔ لیکن ان کا رنگ شوکت صاحب کے رنگ سے بالکل مختلف تھا اور ہر نئی چیز ویسے بھی زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ موج تبسم کی کامیابی کے بعد بحر تبسم چھپی اور وہ بھی پسند کی گئی۔

شوکت صاحب کو فلش کھیلنے کا بہت شوق تھا اور یہ ناممکن تھا کہ شوکت صاحب جو بات پسند کرتے ہوں میں اس سے انہیں روک لوں یا خود اس سے پرہیز کروں۔ تفریح کی باتیں تو خیر کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اور اس عمر میں کون ہے جو کسی نہ کسی کھیل سے دلچسپی نہ رکھتا ہو اس لئے اگر میں شوکت صاحب کی خاطر ان باتوں میں حصہ لیا کرتا تھا جو انہیں پسند تھے تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ حیرت تو مجھے یہ ہے کہ شوکت صاحب نے مجھے بے نمازی تک بنا دیا تھا۔ خدا مغفرت کرے اور مجھے بھی معاف کر دے۔ اب سوچتا ہوں تو سخت ندامت ہوتی ہے۔ ایک انسان کی خاطر مجھے معبود حقیقی کی ناراضگی کا بھی خیال نہ ہو سکا۔ بات یہ تھی کہ میں جو [illegible] ہوں۔ ایک بہت ہی متقی اور پرہیزگار باپ کا بیٹا ہوں۔ والد مرحوم کی نماز کبھی قضا نہ ہوئی تھی۔ مجھ پر بھی اتنا اثر اس زمانہ میں ہو گیا تھا۔ جب میں ہر دم و ہر آن خیال رکھتا تھا کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھوں۔ لیکن شوکت صاحب اس وقت نماز پڑھتے ہی نہ تھے۔ اس لئے وہ مجھے بھی طرح طرح سے روکتے تھے۔ مثلاً میں مصلے پر ہوں اور قبل اس کے کہ میں سجدے میں جاؤں۔ شوکت صاحب لوٹا لاکر سجدے کی جگہ رکھ دیتے۔ کبھی کرسی اٹھا کر جانماز پر لے آتے۔ کبھی جانماز ہی الٹ دیتے۔ غرض ان کی ان حرکتوں سے عاجز آکر توبہ توبہ، خوفِ خدا نہ محسوس کرتے ہوئے ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں ہی چھوڑ دیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کہہ یہ رہا تھا کہ شوکت صاحب کو فلش کھیلنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس سے میں نے ان کے اس

شوق رکھا کرتے تھے۔ ایسا منظم [illegible] شوکت صاحب مرحوم [illegible] صاحب مرحوم [illegible] سے ملنے والے جانی مرحوم اور [illegible] کے ساتھ [illegible] ہوتا۔ [illegible] ہم بیٹھے [illegible] دوستی [illegible] مکمل [illegible] صحبت [illegible] کی مرت [illegible] گئی تھی۔ شوکت صاحب [illegible] نہیں [illegible] اسپورٹ سے کھیل جیتے اور [illegible] کہ تو دوسرے بھی چال چلنے پر مجبور ہو جاتے [illegible] تھی۔ جب [illegible] سے شوکت صاحب کی [illegible] ہوا نہیں۔ لیکن وہ اس صحبت کو چھوڑ کر [illegible] نہ رہ سکتے تھے۔ جب [illegible] ریڈیو اسٹیشن پہنچے تو زمانہ صحبت بھی قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ اور ملاقات بس کبھی کبھی ہو پاتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب [illegible] گھر سے آنا جانا [illegible] تو وہ [illegible] سے دور ہم پہنچ گئے۔ اور تعلق [illegible] شوکت [illegible] سب کچھ [illegible] صاحب مرحوم [illegible] میں نے کبھی ان کی تنقید کو مناسب نہ سمجھا۔

شوکت صاحب میں میرے خیال سے جو سب سے بڑی کمزوری تھی وہ یہ تھی کہ اپنی کسی کمزوری پر تنقید برداشت نہ کر سکتے۔ اگر کبھی ایسا ہو جاتا تو شوکت صاحب اس بات پر برہم ہو جاتے [illegible] اس [illegible] مناسب نہیں [illegible] مجھے [illegible] شوکت صاحب کی کمزوریوں پر کبھی تنقید نہ کرتا [illegible] زیادہ [illegible] سے کوئی بھی واقف نہ تھا [illegible] حق بات کہتے بھی نہ ڈرا۔ حد یہ ہے کہ وہ ایک بار اپنے والد [illegible] سے بھی حق کے لئے زبان لڑا بیٹھا تھا جس کا آج تک افسوس ہے۔ لیکن شوکت صاحب میں [illegible] تھا کہ میری حق گوئی ان کے مقابل ہمیشہ شکست کھاتی رہی۔

ریڈیو کی سروس کے دوران شوکت صاحب سے میری ملاقات کبھی کبھی ہوتی تھی۔ حالانکہ میرے آفس کے سامنے ہی رہتے تھے۔ جن لوگوں نے شوکت صاحب کو قریب سے دیکھا ہے۔ یا وہ لوگ جو ان کے قریب رہ کر ان سے دور ہو گئے ہیں۔ یقیناً اس بات سے واقف ہوں گے کہ شوکت صاحب پاس ہوتے تو بہترین دوست ہوتے اور دور ہوتے تو اس طرح بھول جاتے جیسے کبھی ساتھ ہی نہ رہا ہو۔ اور جب کبھی وہ دور رہ کر خط لکھتے تو پھر اس انداز میں کہ پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا جیسے کہ شوکت صاحب آج بھی اس سے اتنے ہی قریب ہوں جیسے پہلے تھے۔

لاہور جانے اور پاکستان بن جانے کے بعد شوکت صاحب کئی بار لکھنؤ آئے لیکن ان کا قیام نہ تو میرے یہاں رہا نہ [illegible] صاحب کے یہاں۔ نہ ہی وہ کسی عزیز کے یہاں ٹھہرے۔ حالانکہ ان کے چچا سسر ظہور صاحب بھی یہیں رہتے ہیں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ہمارے یہاں قیام کے بعد رمی کھیلنے کا انہیں موقع نہ ملتا۔ جب کہ ان کا تقریباً تمام وقت اسی شغل میں ان احباب کے ساتھ صرف ہوتا جو ریڈیو اسٹیشن کی سروس کے زمانہ میں ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ ایک بار جب شوکت صاحب کو میں نے اس سلسلہ میں احتجاجی خط لکھا تو انہوں نے اپنے خط مورخہ ۴ / ۱۰ اپریل میں مجھے لکھا تھا۔

ـــــ میں تم سے دور ہو چکا ہوں۔ ـــــ اتنی دور سے یہ دل آزاری کرتے شرم نہیں آتی — میری بے وفائی کا شکوہ کرنے والوں میں تم بھی ہو لہذا سنو۔

لاہور سے تین مرتبہ ایک نہ ایک کام سے وہاں گیا۔ اور تینوں مرتبہ اس حالت میں کہ بھارت جا کر پاکستان والے ایک

ایک پیسہ دانت سے پکڑ کر مروت کرتے ہیں۔ میں نے مدیری کی پرواہ نہ کی، اور لکھنؤ میں گیا۔ ایک مرتبہ تمہارا مسعود [illegible] کاپیوں کے کیس صاحب کیا کام تھا کہ کر دیا؟ کسی تجارتی شغل ہو گیا تھا یا کوئی جاننے والا موجود تھا؟ مروت مدستوں کرو دیکھے اور ان سے ملنے۔ آخری مرتبہ تم خود موجود۔۔ تھے نیز تال گئے تھے۔ بہرحال اس میں میرا قصور نہیں۔ بہرحال میں بے مروت ہی طوطا چشم ہی محبت فراموش تھا مرتبہ ان حضرات سے ملنے گیا ہے۔ مگر اس دعوی قحط اور مروت کے قصیدے کے بعد سجادہ نشین بنے بیٹھے ہیں۔ اب ذرا اپنے گریبان میں تم بھی منہ ڈال کر دیکھو، مسالہ خود جو تم اپنی لکھنؤ کو اب لاہور سا بنا رہے ہو۔ غزالہ اور ممو میاں اور بھابی اور ننھی بچی کے۔

۱۰۰ پشت پرانے جو میری بے مروتی کے شاکی ہیں ان کی سلامتی کے لئے میں دعا کرتا ہوں کہ جب میں مرد ہوں تمام کو میری مروت اور وفا بھی یاد آ کر پھر تو سزا دے

طرزی صاحب کو تسلیم۔ ممو میاں کو پیار۔ اور بچی کو بہت بہت پیار۔

جاؤ ہم اپنا نام نہیں لکھتے۔

میں نے اس خط کا جواب دیا اور یہ بتلا کر یہ لکھ دیا کہ لکھنؤ آپ آئے رتی لکھیں ہی سب سے اہم مسئلہ ہے آپ کی زندگی کا۔ وغیرہ وغیرہ اور اس کا جواب شوکت صاحب نے ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء کو ریڈیو پاکستان سے لکھا جو حسب ذیل تھا۔

برادرم نسیم صاحب آپ کا خط ملا۔

لکھا تھا کہ حسد محبت کو جلا دیتا ہے اور بدگمانیوں کو ختم کر دیتا ہے مگر معلوم ہوا کہ بدگمانیاں جدائی اور بعد کی فضاؤں میں بھی پروان چڑھتی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تم میرے خلوص کے کبھی قائل نہ ہے۔ اور ہمیشہ پرورش کے طور پر مجھ سے خلوص برتتے رہے ہو۔ بہرحال تم اپنی خو نہ چھوڑو ہم اپنی وضع نہ چھوڑیں۔ اور یہ تعلقات یوں ہی چلتے رہیں۔

یار ایک بات بتاؤں۔ مجھ ایسے لعنت زدہ ہستی کو بھول جاؤ یہ سمجھ کر کہ مر گیا۔ وہ بدنام کنندۂ وفا اور صبر کرو۔ تمہارا اور تمہاری خوشی کا خط پڑھنے کے بعد میں اپنی نظروں میں جس حد تک گرا ہوں اس گہرے غار سے شاید تم خود بھی کو نکال سکو گے یہ معاوضہ ہے میرے ان جذبات کا جو تمہارے لئے دل میں تھے۔ ہیں اور باوجود اس قدر افزائی کے ہمیشہ رہیں گے۔

تمہارا بے وفا
شوکت

میں نے اس کا جواب بھی لکھا اس لئے کہ اب شوکت صاحب سے میرا خوف دور ہو چکا تھا اس لئے کہ نہ سوچنے کے اقرار تھے نہ یہ اپنا کوئی ناول مجھے اشاعت کے لئے دیتے تھے۔ لکھنؤ آتے تو ان لوگوں کے یہاں قیام کرتے جو صرف ریل کے ناتے ان کے دوست تھے۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ اب بھی میں حق بات کہتے ڈرتا۔ میرا خط پا کر شوکت صاحب نے پھر مجھے ریڈیو پاکستان سے ۲۴ مئی ۱۹۵۶ء کو جو خط لکھا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

میرے نسیم! اپنی بیوی کو سلام [illegible] یہ خط [illegible] لکھ رہا ہوں کہ میں نے تم دونوں کے [illegible] سینہ چاک کر کے رکھ دیا ہے اب اپنے متعلق جو کچھ [illegible] ہے [illegible] معلوم ہو گیا۔ میں تم سے کیا کہوں تمہاری یاد [illegible] وقت ہے [illegible] ان حالات کے ساتھ [illegible] سب کچھ کہتے ہیں۔ [illegible] آنے کے بعد [illegible] اور [illegible] اپنے [illegible] پر [illegible] جو کچھ ہو رہا تھا۔ [illegible] بہرحال تم [illegible] خط [illegible] خوبصورت [illegible] حقیقت حال پر [illegible] کی قیمت رکھ کے [illegible] تمہارے خط [illegible] سب کچھ [illegible] ہے۔ [illegible] تمہارے شوکت میں اب بھی [illegible] ہے [illegible] سب کچھ [illegible] دنیا سے [illegible] ہو جاؤ [illegible] تمہیں [illegible] کے اس [illegible] ہے۔

بہرحال تم مجھ سے بدظنی [illegible] تمہارا [illegible] جہاں نہیں [illegible] سب کچھ [illegible] دور رہ کر چلا ہوں اور [illegible] تم [illegible] نہ لکھ سکا۔ [illegible] مجھ کو معاف کر دو۔ [illegible] خدا تم کو [illegible] ہی پاس۔

بھابی کی خدمت میں آداب۔ ثمر میاں کو دعائیں۔ چندہ [illegible] ——— [illegible] صاحب اگر قریب ہوں تو ذرا انگشت [illegible] ....

تمہارا شوکت

اور اس کے بعد جب تک شوکت صاحب [illegible] رہے۔ افسوس کہ حالات سازگار نہ ہو سکے۔ اور پھر ان کا لندن جانا [illegible] کہ میں بھی کبھی خط لکھتا رہا۔ اور کبھی کبھی شوکت کے خطوط بھی آتے رہے۔

دفتر جنگ راولپنڈی سے ۲۸ جولائی ۶۲ء کو انہوں نے مجھے یہ خط لکھا تھا

نسیم پیارے۔ میری عمر بھی تم کو لگے۔

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ اور میں عالم تصور میں اس کو سرونج کے دفتر میں بیٹھ کر پڑھ رہا تھا خدا تم کو خوش رکھے کہ تم دونوں نے ویسے بھی تم نے مجھ کو وہیں پہنچا دیا جہاں کی سہانی یادیں اب صرف تڑپا ہی جاتی ہیں۔

تمہاری عزیزہ اور میری بیگم [illegible] مجھ سے واقعی روحانی طور پر بہت قریب ہے۔ میں نے ایک دن اس کو ایسی جگہ پا لیا کہ جہاں انسان خود اپنے کو بھول جاتا ہے۔ پیرس نادر دیکھنے گیا تھا وہاں ایک مغربی خاتون کو دیکھا جو اس طرح ہنس رہی تھیں کہ دل میں خیال آیا کہ یہ ہنسی گوش آشنا ہے۔ اپنے حافظہ کو کریدا اور فوراً ہنستی ہوئی عزیزہ سامنے آگئیں کہ آپ مجھ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ پھر لندن واپس آکر میں نے غالباً عزیزہ کو خط بھی لکھا تھا۔ میں نے اس لئے لکھا کہ وہ

---

[1] یہ خط حریم لکھنؤ بابت جون میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] میری بیوی کی عرفیت۔

عزیز مجبوراً دماغ میں سمائے رہتے ہیں۔ اسی طرح اچانک یاد آجایا کرتے ہیں۔ بیگم جان ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ اسی طرح میرے تصور میں ابھر چکی ہیں۔ اور یہ ایک روحانیت کا مسئلہ ہے کہ جن افراد سے روحانی تعلق ہوتا ہے۔ وہ اسی قسم کا سلسلہ وار وارد ہوتا ہے۔ بیگم جانی کو مجھ سے جو عقیدت ہے۔ وہ اسی قلبی اور روحی تعلق کا نتیجہ ہے۔ خدا اس کو تمہارا خوش نصیب سہاگن رکھے۔ اور تم اس کے لئے سلامت رہو۔ غالباً اب میری اس دعا کا مفہوم واضح ہو گیا ہو گا کہ میری عمر بھی تم کو لگے۔

نسیم تم نے جس جد و جہد سے حالات کے ساتھ کشتی لڑی ہے اس سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ اور تم کو فولادی عزم کا انسان سمجھتا ہوں۔ یہ وقار قائم رکھنے کے لئے بے کسی کے سخت وقت سہے۔ واقعی تم نے اپنے ادارے کو زندہ رکھ کر معجزہ کیا ہے۔ مگر تمہارے اس انہماک اور اس محنت سے میں ڈر رہا ہوں کہ صحت کی ذمہ داری سے غفلت نہ برتنا شروع کر دو۔ بات یہ ہے کہ یہ تو آدمی میرا ایسا بے حیا ہو کر

غم ہائے روزگار کو آسان بنا دیا
جو غم ملا اسی کو ہنسی میں اڑا دیا

مگر تم میں یہ بات نہیں ہے۔ تم آدمی ہو حساس بھی اور فطرتاً غم پرست بھی۔ لہٰذا تم بہت نازک آبگینہ کی حیثیت رکھتے ہو۔ مناسب یہی ہے کہ اب اپنی حفاظت خود کرو۔ فہمی میاں اب بالغ ہو چکا ہے۔ عاقل تو پہلے ہی سے ہے اس سے تھوڑی ذمہ داریاں سنبھالو۔ یہ کچھ دیکھ لیں اور خود ذرا آرام بھی کیا کرو۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ تم تندرست اور زندہ رہو۔ خواہ وصل جگر ہی کے شوق میں مبتلا ہو کر ہی کیوں نہ زندہ رہو۔

اپنی عزیزہ کو اماں جان کی دعائیں پہنچا دو۔ نجم السحر اور منے کو پیار، شمو میاں کو دعا اور پیار، دونوں بھاوج کو آداب۔

میرے یہاں بھی سب اسی قسم کی باتیں کہہ رہے ہیں۔ طرزی نمبر بھیجنا ضرور۔

تمہارا شوکت

اس خط سے پہلے ہی طرزی صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر شوکت صاحب نے دفتر جنگ راولپنڈی سے، ہاجرہ کو لکھا تھا۔

پیارے نسیم
خدا تم کو سلامت رکھے۔

آج صبح ناشتہ کرنے بیٹھا اور چائے کے پہلے ہی گھونٹ کے ساتھ نظر پڑی۔ اخبار میں اس نحس خبر پر جس نے چائے کی اس گھونٹ کو بھی حلق میں پھنسا دیا۔

محبوب طرزی ہمارا ایک خلوت و جلوت کا ساتھی اس طرح ہم سے بچھڑ گیا۔ کاش تم یقین کر سکو کہ آج دن بھر میں عالم تصور میں لکھنؤ ہی میں رہا ہوں۔ ہر اس محفل میں جہاں طرزی کا تصور لے گیا۔ اللہ جانے تم آج کل لکھنؤ میں ہو یا نینی تال میں بہرصورت کسی طرح میری تعزیت اس کے پس ماندگان تک پہنچا دو۔ مجھے اس کا پتہ معلوم نہیں۔ مگر یہ آج

یہ ان قصبہ [illegible] ہے [illegible] صاحب [illegible] اب بہت [illegible] ہو گئے ہے [illegible] ایک مرتبہ [illegible]
[illegible] گلستہ بہار [illegible] ۔۔ [illegible] ایک مرتبہ [illegible] چونکہ [illegible]
[illegible]۔

ب۔ ثبوت

[illegible] صحت [illegible]
[illegible] اپنے خیال [illegible] خیال [illegible]
[illegible] ثبوت [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]۔

شوکت تھانوی سودیشی ریل کے بعد

حکیم یوسف حسن

۱۹۲۶ء کا زمانہ تھا۔ متحدہ ہندوستان پر ہر جگہ برطانوی پرچم لہرا رہے تھے۔ بھارت میں سودیشی تحریک زوروں پر تھی۔ پلیٹ فارم اور اخبارات کے صفحات پر حکومت پر شدید نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ ہندوستانی رائے عامہ کو بیدار کر کے سوراج حاصل کرنے کے لیے اُسے تیار و متحرک کیا جا رہا تھا۔

ہندوستان کی ادبی فضا پر "نیرنگ خیال" ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوا تھا۔ اس کے صفحات پر بنگال، بہار، یو۔ پی، حیدرآباد، بمبئی اور پنجاب کے چوٹی کے ادبا اپنے رشحاتِ قلم پیش کرتے تھے۔ اس کی کامیابی اور مقبولیت غیر متوقع تھی۔ ہم نت نئی باتیں سوچا کرتے تھے۔ پرچہ کو آگے بڑھانے اور یادگار نمبر نکالنے کی دھن ذہن پر سوار رہتی تھی۔

ذہن نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا۔ یہ مختصر سا لفظ تھا "سالنامہ"۔ ہم نے گویا انگریزی لفظ ANNUAL کا صحیح ترجمہ کیا تھا۔ "تذکرہ" کے وزن پر سالنامہ گویا سال بھر کا یا سال بعد کا نمبر ہونا چاہیئے۔ نیرنگ خیال نے سب سے پہلے سالنامہ ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔

یہ خیال ۱۹۲۷ء کے آخر میں سوجھا۔ ذہن رسا اس کے لیے قسم قسم کی جدتیں سوچنے لگا۔ مثلاً

اس کا سائز عام رسائل سے بڑا ہونا چاہیئے۔

اس کا ٹائیٹل نئے انداز پر خاص قسم کے کاغذ پر رنگین چھاپا جائے۔

مشہور مصور عبدالرحمان چغتائی اس کے لیے ڈیزائن عطا کریں۔

کتابت اور طباعت بڑی دلکش اور دیدہ زیب ہو۔

چھ، سات ٹرائی کلر (رنگین) آرٹ کی تصاویر سے اسے مرصع کیا جائے۔

متعدد ہاف ٹون بلاک چھاپے جائیں۔

اس کا اشتہار خاص انداز سے جاری کیا جائے۔ اور سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ زمیندار سے معاملات کر لیے جائیں۔

ایک کالم مخصوص ہو۔ اس پر عنوان ہو۔

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۲۸ء ۔۔ اور پھر اس کے نیچے ان تمام اہلِ قلم کے نام دیئے جائیں جو اس میں مضامین لکھ رہے ہیں۔

ترتیب دے لی گئی جو دو حصوں پر مشتمل ایک اہم رسالہ ہے اور دوسرے دو اہم ہوں۔ اور تیسرے حصے میں تین نام ہوں یہ بعد ایک اہم اضافہ ہے جسے بعد میں ایک [illegible] ان نام ہیں اور [illegible] یہ پاس ان نام ہیں۔ اور [illegible] جلد باشعبہ ایک کر ایک نام [illegible] میں۔ و [illegible] اشتہار شائع کر دیا۔

اب نیرنگِ خیال کے اشتہار کی کامیابی کا عام تجربہ ہی کیجئے کہ [illegible] رسالہ شائع ہوا نیرنگ خیال کے دفتر کے سامنے چھوٹے ملازموں کی قطار لگ گئی۔ اور لوگ [illegible] روپیہ اپنا [illegible] نیرنگ خیال کو دے دے کر جا چکے تھے۔

اُس وقت سستا زمانہ تھا۔ ہم نے [illegible] دو روپے میں [illegible] دو روپے بھی [illegible] مشکل ہے۔ [illegible] دو روپے [illegible] اور آج وہ ۲۲ روپے [illegible] ہے۔ [illegible]

اور رسالہ سے مضامین۔ نیرنگ خیال کی ترقی کے لئے اس کو نئے ڈھانچے کے لئے ہم دن رات ایک کیا کرتے تھے۔

نیرنگ خیال!!!

خود ہی جوڑ توڑ کیجئے [illegible] ہمارے احباب پر نیرنگ خیال بڑی طرح سوار تھا۔ ہر ماہ اس کے مضامین کیجئے [illegible] اس کے لئے ہندوستان کا سفر کرنے کی تیاری ہم نے کی [illegible] خاص خاص اہل قلم سے [illegible] گئے۔ [illegible] ہم [illegible] سہارنپور، میرٹھ، دہلی، کانپور اور سہارنپور [illegible] ایک ہی چکر میں چلے گئے۔ [illegible] نیرنگ خیال کی داستان نہیں لکھنی ہے چند جملے تمہید [illegible] لکھ دی ہیں۔

ان ملاقات تھی۔ حضرت شوکت تھانوی کی!

اُن دنوں شوکت ایک نوخیز نوجوان تھے۔ کچھ تھوڑا بہت لکھ لیتے تھے۔ کبھی شعر و شاعری سے شوق فرماتے۔ کبھی افسانوں میں دلچسپی لیتے کبھی کسی اخبار میں کچھ کام کر لیتے کبھی کسی کی کتاب مرتب کر دی۔ دو چار ایسے مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے تھے جن میں مزاح کی چاشنی اسی طرح تھی جس طرح ان کے منہ سے وہ پھولوں کی صورت جھڑتی رہتی تھی۔ ابھی ادب میں ان کی صحیح حیثیت یا مقام کا تعین نہ ہوا تھا۔

لکھنؤ میں نیرنگ خیال کے محسن اوّل ہمارے دوست حامد اللہ افسر مقیم تھے۔ آپ تھے تو میرٹھ کے لیکن لکھنؤ میں ان کا قیام اتنا طویل ہو گیا تھا کہ انہیں اب لوگ لکھنوی ہی سمجھتے ہیں۔ وہیں ہماری پہلی ملاقات شوکت صاحب سے ہوئی۔ اور متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور لکھنؤ کی سیر انہوں ہی میں ہوتی۔ وہ بطور رہنما کے لکھنؤ میں ہمارے ساتھ رہے۔ اور ان کے امداد و تعاون سے ہمیں اپنے مقاصد میں بڑی کامیابی ہوئی۔ ہم نے باتوں باتوں میں شوکت کے ذہن پر نیرنگ خیال کے آنے والے سالنامے کا ایسا خاکہ ابھارا کہ یہ نوجوان ادیب ٹھٹھک کے رہ گیا وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگتا اور سمجھتا کہ کسی علاؤالدین چراغ کے ذریعہ دنیائے ادب کے سامنے ایک ایسا طلائی اور نقرئی محل پیش کرنے والا ہوں جس میں سینکڑوں کھڑکیاں ہوں گی۔ اور ہر ایک کھڑکی میں ایک نامور ادیب جلوہ افروز ہو گا۔ اور پھر کیا اس میں شوکت تھانوی بھی ہو سکتا ہے؟ یہ سوال تھا جو اس نوجوان ادیب کے ذہن پر بار بار ابھر رہا تھا کیوں نہیں! اس میں شوکت تھانوی بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ذرا محنت کر کے ایک ایسا شاہکار مضمون لکھو کہ لوگ محو حیرت رہ جائیں!

ہماری عادت تھی کہ ہم نوجوان اور نوخیز ادیبوں کو مختلف ڈھنگوں سے لکھنے اور اچھا لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

اور بعض ابجق سے اصلاح لے لینے پر بھی مجبور کر دیتے تھے۔ نامور اور استاد قسم کے اہل قلم سے جا یا عطر نظم دوسری نوعیت کا ہوتا تھا۔ الغرض یہ تماشا ہمارا وہ اڈیٹری کے تھیلے میں محفوظ رہتے تھے۔ اور ہم وقت وقت پر ان سے کام لیا کرتے اور اعلام فلاں کرتے تھے

شوکت صاحب نے کہا افسانہ لکھوں :

میں نے کہا افسانہ! افسانے تو بہت آجاتے ہیں۔ اور نظموں کے لیے توجہ نہیں لگتی۔ نثری علمی مضامین کم تھے ہیں۔ اگر آپ مزاحیہ یعنی مزاحیہ افسانہ لکھیں تو بات دلچسپ رہے گی۔ اس انداز میں لکھنے والے بہت کم ہیں۔ اور آپ میں اس کی صلاحیت ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک مزاحیہ افسانہ جب پوری کوشش سے لکھا جائے تو وہ کامیاب نہ ہو۔ ذرا ذہن پر زور دے کر کوئی پلاٹ سوچیے۔ اور مزاح کا رنگ بھرتے جائیے۔ اور پھر دیکھیے کہ شوکت کے نام کا ڈنکا بجتا ہے یا نہیں۔

ہم نوجوان تو اکساتے رہے۔ شوکت نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری اور کہا میں کوشش کروں گا۔ اس وقت میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میں سودیشی ریل کے مصنف سے بات چیت کر رہا ہوں۔ یا میری اس تحریک کے نتیجہ میں ایک شاہکار مضمون کی تخلیق ہونے والی تھی۔

نیرنگ خیال کے اس سالنامہ میں بڑے پایہ کے مضامین تھے۔ مگر جو چرچا سودیشی ریل کا ہوا وہ کسی دوسرے مضمون کو نصیب نہ ہوا۔

۱۹۲۸ء میں انگریزی حکومت ہندوستان پر اپنا تسلط مضبوط کرنے کی فکر میں تھی۔ اور ساتھ ساتھ وہ ان تمام تدابیر اور ذرائع کو ملیا میٹ کرنا چاہتی تھی جو سوراج حاصل کرنے کیلئے اختیار کئے جا رہے تھے۔ سودیشی ریل جس کا اردو ادب میں مزاحیہ رنگ میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ وہ دشمنان آزادی، ہندوستانیوں کے سوراج حاصل کرنے پر اس ملک کی جو گت بنے گی اس کے نقوش دکھانے کے لئے بطور دلیل کے پیش کر رہے تھے۔

سودیشی ریل کا بے ساختہ پن۔ ہندوستانیوں کی تحریک سودیشی کا اپمان کرنے والا ثابت ہوا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا ریلوے ممبر اس مضمون سے بہت متاثر ہوا۔ اور محکمہ اطلاعات حکومت ہند نے اس مضمون کے انگریزی تراجم مختلف ذمہ دار افسروں گورنروں اور وائسرائے کو بھجوائے کیونکہ اس میں سودیشی تحریک کا مضحکہ جس انداز میں اڑایا گیا تھا وہ حکومت کے اقتدار مضبوط کرتا تھا اور انہیں سودیشی ریل جیسے متعدد مضامین کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

ہمیں سو فیصدی یقین ہے کہ شوکت تھانوی کا ذہن اور دامن اس قسم کی آلائشوں سے پاک تھا۔ اور انہوں نے سودیشی ریل خالص مزاحیہ انداز اور مزاحیہ بنیادوں پر استوار کی تھی۔ اسے سیاسیات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ لیکن انگریزی حکومت کے ارباب حل و عقد نے اس سے جو تاثر لیا اور اس سے اپنے مقاصد میں جو امداد حاصل کی اس سے اس کا مصنف ناواقف تھا۔

حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات کے سربراہ ان دنوں علامہ جعفری تھے۔ جو بڑے مدبر اور مشہور اہل قلم تھے۔ اس مضمون کی وجہ سے شوکت تھانوی کا تعارف جعفری صاحب سے ہوا۔ اور بعد میں یہ تعارف شوکت صاحب کے سونگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں منسلک ہو جانے کا باعث بنا۔ جعفری صاحب نیرنگ خیال کے نہ صرف مداح تھے۔ بلکہ سرپرست بھی تھے۔ اور خود بھی نیرنگ خیال میں وقتاً فوقتاً لکھتے تھے۔

سودیشی ریل کے علاوہ ان کی [illegible] مضامین میں [illegible] اور طوالت کی [illegible] سے کچھ مختلف [illegible] مضمون کے [illegible] ہوتے تھے۔ [illegible] مضامین میں [illegible] مزاح [illegible] ہے۔ [illegible] معلوم ہوتی ہے۔ [illegible] ضرورت کے [illegible] ایک [illegible] نہیں کیا۔ ان مضامین میں [illegible] بہت بات کامیاب [illegible] کے لئے مسرت کا [illegible] ادب نے ایک [illegible] ہو رہا۔

اس زمانہ میں چودھری [illegible] رشید احمد صدیقی کے مضامین مزاح نگاروں میں سرفہرست تھے۔ [illegible] تخلیقات میں [illegible] نمایاں تھا۔ [illegible] کا ہر [illegible] دوسرا [illegible] طنز نگاری کا [illegible] چودھری کسی مضمون کے لئے [illegible] مضمون رسالے کے صفحات پر نظر آتا [illegible] رشید احمد صدیقی کی تھی۔ [illegible] سیاسی [illegible] مزاحیہ مضامین سب سے زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس سلسلہ میں چند [illegible] مزاح لکھنے کا ذوق رکھتے تھے۔ شوکت [illegible] کامیابی سے بہت متاثر ہوئے [illegible] دیکھا کہ ایک کوشش [illegible] مضمون شوکت تھانوی ادب [illegible] میں طے کر گئے ہیں۔ [illegible] انہوں نے [illegible] مقام حاصل کر لیا جو ایک ادیب برسوں کی مسلسل کاوش کے بعد حاصل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ [illegible] عظیم بیگ چغتائی اور [illegible] سے دیگر اہل قلم نے زیادہ توجہ [illegible] شروع کیا اور رسالوں کا ہر [illegible] مزاحیہ مضامین سے مزین ہونے لگا۔ مشہور رسالوں کے علاوہ قریباً [illegible] دوسرے ادیبوں نے بھی اس سلسلہ میں خامہ فرسائی کی۔ مثلاً ابو ظاہر، سید ضمیر غلام سرور، ساغر، میر ولی اللہ ایبٹ آبادی، سید ضمیر حسن جعفری وغیرہ وغیرہ۔ ان کے مضامین بھی مزاحیہ ادب میں کچھ نہ کچھ مقام رکھتے ہیں۔ گویا ادب کے اس نوع پر بھی خاص توجہ دی جانے لگی۔ بلکہ مزاح کی مقبولیت اخبارات تک بھی جا پہنچی اور اکثر روزناموں نے مزاحیہ کالم اپنے لئے لازمی قرار دے دیئے۔ روزنامہ انقلاب کی مقبولیت کا باعث، فیصلا جناب سالک مرحوم کے لکھے ہوئے افکار و حوادث تھے۔ افکار و حوادث، علم و ادب، مزاح اور طنز کے شہ پارے ہوتے تھے۔ اگر ان کا انتخاب شائع کیا جائے تو ہمارے خیال میں وہ مجموعہ تمام مزاحیہ کتابوں سے گراں بار اور گراں بہا ثابت ہو گا۔ ہندوستان کے اخبارات میں ملا رموزی کی گلابی اردو اور زمیندار اخبار میں حاجی لق لق کے مزاحیہ کالم گو علمی ادبی رنگ سے محروم تھے لیکن کچھ نہ کچھ مزاح کا رنگ ضرور رکھتے تھے۔ یہ رسم یہاں تک بڑھی کہ آج بھی روزنامہ جنگ میں ابراہیم جلیس کا [illegible] وغیرہ وغیرہ [illegible] شوکت تھانوی کا [illegible]۔ روزنامہ نوائے وقت کا سرمایہ ہے جو خاصے مقبول ہیں۔ شوکت تھانوی کی سودیشی ریل نے مزاحیہ ادب کی کامیابی کے راستے استوار کر دیئے۔ اس کامیابی کا ایک بین ثبوت شوکت تھانوی کی درجنوں مزاحیہ تخلیقات ہیں۔ جن کی مقبولیت اس بات کی شاہد ہے کہ ہر پڑھا لکھا اپنے دماغی سکون کے لئے تفریح و تنفس کے لئے اور غم و افکار کے ازالہ کے لئے جب کچھ پڑھنا چاہتا ہے تو اس قسم کے لٹریچر کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ افسانہ اور ناول ٹریجڈی سے بھرپور ہوتے تھے۔ اور خوش انجام ناول بھی جب تک ہیرو ہیروئن کو پوری طرح رنگ نہ جمائیں، مسرت کی گھڑیوں کے قریب نہیں پہنچتے۔ اس لئے دو گھڑی ہنس بول لینے کے لئے اور تفکرات دنیا سے آزاد رہنے کے لئے مزاحیہ کتابوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے

شوکت تھانوی نے جو کچھ دیا ہے بہت کم ملا ہے۔ ان کا زیادہ وقت ریڈیو کی نذر ہو گیا، یا روزنامہ میں کھو گیا۔ ریڈیو کی صورت

سب سے حالت ظاہر ہوتی ہے۔ وقت بے وقت، بلا ضرورت، جبراً بھی لکھنا پڑتا ہے۔ یہ آمد نہیں آورد ہوتی ہے۔ آمد کا درجہ ہمیشہ مقدم ہوتا ہے۔ جبر روزی کے لیے جو ادب تخلیق کیا جائے گا وہ یقیناً پست ہوگا۔ وقتی طور چند منٹ ہنسانے اور گدگدانے کا تو آجاتا ہے۔ مگر اسے کوئی مستقل شکل نہیں دی جا سکتی۔ روزی کی شدید مصروفیت نے شوکت تھانوی کی اڑان کے پر کتر ڈالے تھے اور وہ وہ مقام حاصل نہ کر سکا جو وہ اطمینان اور سکون سے لکھی ہوئی تحریروں سے حاصل کر سکتا تھا۔

شوکت تھانوی ابتدا میں سب سے اوّل شاعر تھے۔ اس کے بعد افسانہ نگار بنے اور آخر میں مزاح نگار ہو گئے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہو گا کہ شوکت تھانوی اچھے شعر کہتے تھے۔ اب بھی جب کسی مشاعرہ میں مدعو ہوتے تو اپنا کلام سناتے تھے جو پسند کیا جاتا تھا۔ اگر آپ مزاح نگار نہ ہوتے تو یقیناً ایک نامور شاعر ہوتے۔

سنہ ۱۹۳۳ء کا سالنامہ نیرنگ خیال میرے سامنے ہے۔ اس میں جن شعراء کا کلام درج ہے ان کے نام ملاحظہ ہوں۔ کیفی چڑیا کوٹی، ساغر نظامی، جگر مراد آبادی، آرزو لکھنوی، اصغر گونڈوی، جمیل قدوائی، تپش لاہوری، حسن مارہروی، آزاد انصاری، عزیز لکھنوی، ہادی حسن، مرزا یاس، شوکت تھانوی، سید عابد علی، اختر شیرانی، حضرت سیماب، آغا حشر، رگھوپتی سہائے فراق، سید الف شاہ بیکش، ضیا فتح آبادی، احسان بن دانش، اکبر حیدری، محمود اسرائیلی۔ ان سب کے دوش بدوش شوکت تھانوی موجود ہیں۔ حضرت شوکت تھانوی کی غزل ملاحظہ ہو۔

نوائے شوکت

فریبِ ذوق کو ہر رنگ میں عیاں دیکھا
جہاں جہاں تجھے ڈھونڈھا وہاں وہاں دیکھا
جب اپنے آپ کو آمادۂ فغاں دیکھا
تو دردِ عشق نے لرزہ میں آسماں دیکھا
وہی ہے وحشتِ جنوں اور وہی ہے تنہائی
ترے فریب کو اے گردِ کارواں دیکھا
عجب یہ دل ہے جسے باوجودِ تنہائی
گھرا ہوا ترے جلووں کے درمیاں دیکھا
جنوں نے ذوقِ محبت مٹا دیا دل سے
پھر اب تو یاد نہیں ہے کہ کیسے کہاں دیکھا
ہے برق کو بھی کوئی لاگ نامرادی سے
گری تڑپ کے جہاں اس نے آشیاں دیکھا

کبھی ذرا بھی کمی لطف میں نہیں آئی
اجل کو درد و وفا کا مزاج داں دیکھا
وہیں وہیں ترے جلووں نے آگ بھڑکائی
جہاں جہاں کوئی بے نام و بے نشاں دیکھا
لگا دی جان کی بازی ستم محبت نے
جب اُن کے حسن کا سودا بہت گراں دیکھا

۱۹۳۳ء سالنامہ نیرنگ خیال، صفحہ ۴۰۔

یہ شوکت تھانوی کا ۱۹۳۳ء کا کلام ہے۔ آج سے ۴۰ سال قبل کا۔ اگر مزاح کا رنگ اُن کے سب پر نہ چھا جاتا تو یقیناً وہ ایک بڑے شاعر بھی ہوتے۔

حضرت شوکت تھانوی کی ایک خصوصیت جو اکثر عوام و خواص سے پوشیدہ رہی ہے۔ یہ تھی کہ آپ شعراء کے طرز بیان کی ہوبہو نقل اتارتے تھے۔ اکثر تنہائی میں یہ مشغلہ بڑا دلچسپ اور پُرلطف رہتا تھا۔ کبھی آپ جگر کے انداز میں، کبھی حسرت کے، کبھی ساغر نظامی کے انداز میں، کبھی حضرت حفیظ جالندھری کے انداز میں یہ نقل اتارتے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کمرے میں بیٹھا ہو تو اُن سے غزل سن کر وہ یقیناً یہی کہتا کہ جناب جگر یا ساغر یا حفیظ صاحب پڑھ رہے ہیں۔ حضرت شوکت تھانوی خود تو ہمیشہ تحت اللفظ پڑھتے تھے مگر شعراء کی پوری اور ہوبہو نقل ترنم سے اتارتے تھے۔ اگر کارکنانِ ریڈیو کو حضرت شوکت تھانوی کی اس خصوصیت کا علم ہو جاتا تو وہ اُن سے بڑا معقول کام لے سکتے تھے۔ یا کم از کم اگر اُن کا ایک ایسا ریکارڈ ہی تیار کر لیا جاتا جس میں ہندوستان کے ایک ایک اہم شاعر کی ہوبہو نقل اتاری ہو تو یہ ریکارڈ یقیناً محفوظ رکھا جاتا۔ جب کبھی ہم تنہائی میں شوکت سے ملتے تو اکثر ہماری فرمائش یہی ہوتی تھی۔ شوکت صاحب کچھ برہم ہو جاتے۔ اور کہتے سنا دیجئے۔ ذرا ساغر صاحب کی نقل اتار دیجئے۔ شوکت صاحب زیرِ لب مسکراتے اور پھر پوری طرح شروع ہو جاتے۔ اور دو چار شعر ادا کرتے ہوئے ہنس جاتے۔ اس وقت ہم اُن کی مزاحیہ خصوصیات کو بھول جاتے تھے۔ اور ہمیں اُن کی ان نقالیوں میں اتنا لطف آتا کہ دوسری ملاقات تک قلب و روح پر حاوی و طاری رہتا تھا۔

غرض شوکت تھانوی ہرفن مولا تھے۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے کر لیتے تھے۔ جو کچھ چاہتے تھے کہہ لیتے تھے۔ یہ خوبی آج اردو کے کتنے ادیبوں میں ہو گی؟ —— جو جانِ محفل بھی ہو۔ اور جانِ ادب بھی!

شوکت میرا دوست"

سید عطا حسین کلیم

سودیشی ریل کے مصنف سے ملاقات کی تمنا کس کو نہ ہوگی۔ میں بھی شوکت تھانوی کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سودیشی ریل لکھ کر شوکت تھانوی نے ہندو سامراج پر بہت گہری چوٹ کی تھی۔ اُن کی اس تحریک کے بعد عوام کی نظروں میں ہندو کانگرس کے سودیشی راج کی کوئی وقعت باقی نہ رہی تھی۔ اس سے برصغیر میں برہمن راج کے منصوبے خواب پریشان ہوکر رہ گئے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شوکت تھانوی کی سودیشی ریل نے پورے ملک میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور وہ لوگ بھی جن پر اس میں طنز کیا گیا اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

شوکت تھانوی سے ملاقات کی تمنا مجھے محض اس لیے تھی کہ میں اس شخص کو دیکھوں جس نے اپنی صرف ایک تحریر سے شہرت و ناموری کے تمام مراحل اس قدر جلد طے کرلیے تھے لیکن جب میں اُن سے ملا تو سودیشی ریل ہمارے درمیان موجود نہیں تھی۔ وہ ایک سنجیدہ، ذہین، ہمدرد اور غمگسار دوست کی طرح ملے اور پھر ہم اُس وقت تک ملتے رہے جب تک موت نے ہمارے درمیان ایک نہ گرنے والی دیوار حائل نہ کردی۔ یوں تو شوکت تھانوی سے میری یاد اللہ بہت مدت سے تھی لیکن جب وہ راولپنڈی میں "جنگ" اخبار کے مدیر ہوکر آئے تو ہمارے تعلقات اور بھی استوار ہوگئے دن ہو یا رات روزانہ ملاقاتیں رہتیں۔ کبھی بالمشافہ اور کبھی ٹیلیفون پر۔ وہ ایک سچے دوست کی طرح میری زندگی میں داخل ہوئے اور مرتے دم تک میری ہر مشکل کو اپنی مشکل اور میری ہر تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے رہے۔ پچھلے سال جب میں بیمار ہوا اور مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا تو اس کے باوجود کہ وہ خود پاؤں کے درد میں مبتلا تھے ہر شام اپنی بیگم کے ہمراہ عیادت کے لیے ہسپتال آتے رہے۔ اُن کے اور میرے تعلقات اب ہمارے گھروں تک پھیل گئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے دکھوں سے واقف ہوچکے تھے لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شوکت نے اپنے سینے کے اندر اس نامراد بیماری کا جو دکھ پال رکھا تھا اُسے اُس نے کبھی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ شوکت تھانوی بہت کم آمیز انسان تھے لیکن شہرت اور ان کے قدردانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا وہ جس سے ایک بار بھی ملتے وہ انھیں عمر بھر اپنا خیال کرتا۔ شوکت زندگی کے ہر معاملے میں نفاست اور ایک خاص قسم کے رکھ رکھاؤ کے پابند تھے اُن کی شاہی وضع داری اور کم آمیزی زبان زدِ عام تھی لیکن اس کے باوجود کوئی بھی انھیں غرور اور پندار کا طعنہ نہ

ے سکتا تھا۔

شوکت تھانوی ایک بزم آرا انسان تھے یا یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے جس میں ہمہ وقت زندگی چہک اٹھتی۔ بات کرتے ہوئے ان کا چہرہ ہمیشہ پرسکون اور سنجیدہ رہتا، ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ کھیلتی نظر آتی اور گہرے رنگ کی عینک کے پیچھے ان کی آنکھوں میں ایک نہ بجھنے والی چمک دیکھنے والوں کو نظر آتی اور جب وہ کسی بات کا تجزیہ کرتے اور اسے دلکش پیرایہ میں بیان کرنا ان پر ختم تھا وہ جب ایک نکتے سے چٹکلا کر داستان بنا لیتے تھے ان کی باتوں سے لوگوں کے دلوں میں گدگدی ہونے لگتی محفل کشت زعفران بن جاتی لیکن وہ خود بہت پرسکون اور سنجیدہ بیٹھے رہتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

مجھے شوکت تھانوی کی رفاقت میں متعدد مشاعروں میں شرکت کا موقع بھی ملا، یوں تو ہر جگہ ان کی صحبت کی شگفتگی اور حاضر جوابی نے سفر کی کوفت کو آرام اور سکون سے بدل دیا۔ مگر مظفرآباد وغیرہ کے مشاعرے تو عمر بھر یاد رہیں گے۔ مولانا ماہر القادری اور صابر دہلوی مرحوم سے ان کے دیرینہ مراسم تھے مولانا سے ان کی محبت اور بے تکلفی تو بعض اوقات گستاخی کی حدود کو چھو لیتی تھی مگر چونکہ دونوں جانب یکساں خلوص اور محبت کار فرما تھے اس لیے کبھی بدمزگی کی نوبت نہیں آئی۔ مظفرآباد کے مشاعرہ میں مولانا ماہر القادری کو رات بھر جگائے رکھنا ان سے پرانے وعدہ کا کلام مجبور کر کے سننا پھر ان کی سادہ لوحی کو کسی فرضی محبوبہ اور شاعرہ کا جھانسہ دے کر صبح تک عشقیہ اشعار سنتے رہنا یہ سب شوکت کی زندہ دلی کے مظاہرے تھے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ شوکت مولانا کی عزت نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی تاویل یوں کی جا سکتی ہے کہ شوکت کی سدا بہار طبیعت انھیں چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی اور ان کی حاضر دماغی سنجیدہ سے سنجیدہ گفتگو میں بھی مزاح کے نکات ڈھونڈ لیتی تھی۔ مری میں گزشتہ سال جشن مری کے سلسلہ کا سالانہ مشاعرہ تھا دیگر شعرا کے ساتھ شوکت، سید محمد جعفری اور میں بھی مدعو تھے منتظمین سے طے یہ پایا تھا کہ ہم تینوں برائٹ لینڈ ہوٹل میں اکٹھے ٹھہریں گے شوکت نے پہلے تو یہ شرارت کی کہ شام کے وقت جب ہم مال روڈ پر گھوم رہے تھے ایک بہت طویل القامت انسان کو عجب ڈرامائی انداز میں پکڑ کر لے آئے اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے پھر عرض کی "بندہ پرور ہماری زندگی وبال ہو گئی ہے کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں آپ کا کرم ہو تو ہم اس مصیبت سے نجات پا سکتے ہیں۔"

وہ شریف آدمی حیران ہوا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے شوکت تھانوی جیسا مشہور ادیب اور گفتگو کا یہ انداز! خدا جانے انھیں کیا مشکل درپیش ہے اس دوران سید محمد جعفری ملتجی نظروں سے اسے دیکھتے رہے جیسے کہہ رہے ہوں بھائی خدا کے لیے ہماری مدد کرو ہم مظلوم ہیں بہرحال وہ صاحب قدرے پریشان ہو کر گویا ہوئے "فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" "بس آپ تھوڑی دیر کے لیے ہمارے ساتھ تشریف لے چلیے وہیں معاملہ طے ہوگا۔ شوکت نے کہا۔" میں ڈاکخانے کے سامنے حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ خدا جانے ان دونوں پر کیا افتاد پڑی ہے جو اس طرح ایک اجنبی کی خواہ مخواہ منت سماجت کر رہے ہیں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو شوکت

اور جعفری اُن صاحب کو ساتھ لیے میری سمت چلے آ رہے ہیں۔ قریب پہنچ کر شوکت نے للکار کر کہا صاحب کیا بڑا بے ادب بات کہ زندگی اجیرن کر رکھی ہے چھ فٹ تین انچ قد کیا ہُوا ہمارے لیے مصیبت بن گیا جناب ہمارے سامنے تیری کیا حقیقت ہے اور ان تعارف کے بجے یہ بھی سن لے کہ یہ عروہ بن عشق کی اولاد میں سے ہیں" میرا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا اور وہ صاحب ہنسنے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی نظر آ رہے تھے وہ تو کہیے خیر گزری اور مشاعرہ میں جو شعرا کی ایک ٹولی ادھر آ نکلی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

لاہور کے ایک مشاعرہ میں ایک وہابی قسم کے باریش بزرگ سید محمد جعفری کو ہر مصرع پر بیٹھ بیٹھ کر داد دے رہے تھے کہ شوکت کو جو شرارت سوجھی تو اپنی جگہ سے اُٹھ ایک لمبا چکر کاٹ کر مولانا کے پاس جا پہنچے مولانا نظم سننے اور داد دینے میں محو تھے کہ شوکت اُن کے قریب منہ لے جا کر بولے —— "شرم تو نہیں آتی آپ کو انھیں داد دیتے ہوئے" وہ بزرگ بہت جز بز ہوئے اور غصے میں کہنے لگے "یہ کیا بدتہذیبی ہے منہ سنبھال کر بات کرو سُنی ہم نہیں تو مشاعرہ میں کیوں آئے ہو" اب شوکت نے دوسرا وار کیا۔ "حضرت یہ شیعہ ہے" اب کیا تھا مولانا ایسے چپ ہوئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو اور مشاعرہ کے اختتام تک پھر کسی نے اُن کی آواز نہ سنی —— شوکت تھانوی ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ شیعہ، سُنی، وہابی کے امتیازات سے بالاتر۔ اُن کے بہترین دوست سید محمد جعفری اور ظریف جبلپوری کی عمر بھر کی رفاقت اس امر کی شاہد ہے کہ کسی فرقہ کی دل آزاری اُن کے نزدیک گناہِ عظیم تھی اس کا مظاہرہ انھوں نے ایک مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے بھی کیا تھا شوکت زود رنج بھی تھے اور جلد ہی من بھی جاتے تھے میں نے انھیں دوستوں کے لیے کڑھتے دیکھا ہے۔ میرے علم میں ایسی کئی مثالیں ہیں جب انھوں نے اپنے آرام اور فائدہ پر دوستوں کے فائدہ کو ترجیح دی وہ مشاعروں میں شرکت کے تمنائی نہیں تھے لیکن جب کسی مشاعرہ میں بلائے جاتے تو اپنی طرف سے تمام شرائط اور معاملات پہلے سے تصفیہ کر لیتے اور پھر منتظمین کی طرف سے اس معاملے میں ذرا سی کوتاہی بھی گوارا نہ کرتے۔ عام طور پر وہ مشاعروں میں تنہا جایا کرتے لیکن اگر کبھی دوسرے دوستوں کو اُن کی رفاقت میسر آ گئی تو نہ صرف یہ کہ سفر بہت مزے کے ساتھ کٹتا بلکہ اُن کے رفیقوں کو ہر قسم کا آرام بھی ملتا اور شوکت خود تکلیف اُٹھا کر بھی اُن کی آسائش کا خیال رکھتے۔

شوکت تھانوی کو قدرت نے ایک سدا بہار ذہن عطا کیا تھا۔ وہ ایک ہی بات کو سو طرح بیان کرنے پر قدرت رکھتے تھے، ان کی نظم میں بے ساختہ پن ہوتا تھا اور ان کی نثر بے خوفی اور بے باکی کی مظہر تھی۔ طنز و مزاح پیدا کرنے کے لیے انھیں کسی تکلف یا بناوٹ کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ وہ مزاح میں طنز کے ساتھ ساتھ اصلاح کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے۔

ان کا کردار "قاضی جی" ریڈیو پاکستان کے جس اسٹیشن سے بھی وابستہ رہا قومی اور ملی مسائل کو سلجھانے میں بے حد مددگار ثابت ہوا۔

قاضی جی گو ایک مزاحیہ فیچر تھا لیکن اس میں شوکت تھانوی کا دل پوری شدت سے دھڑکتا تھا۔ وہ قوم اور وطن کی اصلاح و تعمیر کے لیے اس کردار کے روپ میں کچھ اس طرح نمایاں ہوئے کہ عوام اور خواص یکساں اُن کی شخصیت سے مانوس و متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

۲۳ مارچ سے پہلے وہ قدرے صحت یاب ہو گئے۔ وہ اس طرح اکثر بیمار ہو جایا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی انہیں اس درجہ پریشان نہیں دیکھا تھا۔ مگر کوئی اُن کی حالت پر ان کے سامنے پریشانی کا اظہار کرتا تو وہ اُسے گوارا نہ کرتے۔ جیسے کہ بہت پہلے ان کا اعتقاد ڈگمگا گیا ہو۔ لیکن ان کی تکلیف بھی ایسی نہ تھی کہ اس پر فکر مندی کا اظہار کیا جاتا۔ ۲۳ مارچ کو گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں حکومت کی طرف سے تمغۂ امتیاز ملنے والا تھا —— وہ لاہور گئے۔ تقریب میں شریک ہو کر ایوارڈ حاصل کیا لیکن پھر واپس نہ آ سکے۔ آنے کے بجائے جب یہاں اس اعزاز پر انہیں استقبالیہ دینے کی سوچ رہے تھے خبر ملی، شوکت تھانوی میو ہسپتال میں داخل ہو گئے ہیں —— پھر خبر آئی ان کی حالت تشویشناک ہے۔ پھر ڈاکٹروں کی مایوسانہ رپورٹ کا پتہ چلا۔ میں، محترم دوست سید محمد جعفری اور ظریف جبلپوری کے ہمراہ جو لاہور گیا، ہسپتال میں شوکت سے ملا۔ مگر شوکت مل نہ سکے۔ وہ تو شوکت تھانوی کا بے روح جسد تھا۔ وہ جس تکلیف کے ساتھ سانس لیتے تھے اس سے خود مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

میں تین چار روز وہاں رہا مگر مجھے شوکت تھانوی ایک دن بھی یوں نہ مل سکے جیسے وہ کبھی ملا کرتے تھے۔ ان سے جو باتیں ہوئیں وہ بجائے خود اس درد کی ٹیسیں تھیں جسے شوکت تھانوی نہ جانے کب سے اپنے سینے میں چھپائے بیٹھے تھے۔ اور جو آج ایک مہلک اور آخری روگ بن کر ظاہر ہو گیا تھا۔

اپریل کے آخری ہفتے میں مجھے اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں مشرقی پاکستان جانا پڑا۔ اور پھر وہیں مجھے یہ خبر ملی کہ شوکت تھانوی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ۴ مئی ۱۹۶۳ء کو میں چاٹگام میں تھا۔ دل صبح سے اُداس تھا۔ عالمِ غربت میں یوں بھی دوستوں اور عزیزوں کی یاد ستاتی ہے —— اور میں تو اپنے جان سے پیارے دوست شوکت کو نزع کی حالت میں چھوڑ کر آیا تھا۔ مجھے بے حد پریشانی تھی۔ پونے نو بجے (مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق) ریڈیو پر خبریں سنیں۔ شوکت کی موت کی خبر نے میرے حواس کھو دیئے۔ میں رات بھر سو نہ سکا۔ اُف! کس قدر بھیانک تھا یہ خیال کہ میں اب قیامت تک اپنے عزیز دوست کو دیکھ نہ سکوں گا۔

میں لاہور سے ڈھاکہ آتے ہوئے شوکت سے ملا تھا۔ اور شوکت کا یہ فقرہ کہ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ مجھے کفن میں لپیٹے دفنانے جا رہے ہیں" میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ شوکت جسے میں نے اپنا عزیز ترین دوست جانا اور مانا اور جس نے مجھ سے اپنی زندگی کا کوئی راز نہ چھپایا، ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میری بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ میں جو اُس کے ہر اچھے بُرے میں شریک تھا اُسے سفرِ آخرت میں کندھا بھی نہ دے سکا۔

زندگی کی مجبوریاں

بے شک میں نے انھیں شدید بیماری کی حالت میں بھی دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ شخص جسے زندگی سے والہانہ عشق تھا، جو دوسروں کو بھی زندگی کرنے کے گر سکھاتا تھا یوں اچانک موت سے ہمکنار ہو سکتا ہے —— لیکن یہ ہمارے وہم و یقین پر منحصر نہیں، موت کا ایک وقت معین ہے جب وہ وقت آ جائے تو زندگی آپ ہی آپ موت کی تاریک وادیوں میں چپ چاپ اُتر جاتی ہے۔

شوکت تھانوی مر گئے یا نہیں —— لیکن یہ ایک اذیت ناک حقیقت ہے کہ اب وہ ہم میں موجود نہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے رائٹرز گلڈ کے جلسے آپ کے بغیر سونے پڑے ہیں ہمارے مشاعرے بے کیف ہیں ہمارے ریڈیو کے "قاضی جی" کہیں نظر نہیں آتے اور جنگ اخبار کا کالم "پہاڑ تلے" اپنے قارئین کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گیا ہے۔

دنیائے ادب کی طرف سے شوکت صاحب کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں مجھے کیا کہنا چاہیئے میں کیا کہہ سکتا ہوں اور پھر میرے سامنے ایک بھیانک خلا پھیل جاتا ہے میں سوچتا ہوں یہ خلا جسے شوکت کی موت نے پیدا کیا ہے کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ ہم اس بہت ہی پیارے دوست کو اب کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی بے اختیار میرا دل ڈوب جاتا ہے میری پلکیں بھیگ جاتی ہیں۔ ڈھاکہ سے واپسی پر میں لاہور ٹھہرا تھا۔ اپنی بدنصیب بھاوج زہرا شوکت سے ملنے گیا ہم دونوں مرحوم کو یاد کر کے آنسو بہاتے رہے پھر میں میانی کے قبرستان میں گیا جہاں دنیائے ادب کا یہ درخشندہ ستارہ دھندلکوں میں کھو گیا ہے۔

ایک کچی قبر دنیا اور دنیا والوں کے عہدِ محبت کی ناآستواری پہ نوحہ کناں ہے اور صبح و شام کی اداسیاں شوکت کے طنز و مزاح کی جاوداں شگفتگی پر خندہ زن نظر آتی ہیں۔

بیگمات نے کہا

محمد طفیل

خلق اللہ کا فور کی ہے دنیا میں۔ اگر کسی کو ثبات حاصل ہے تو وہ اہل قلم ہی ہیں۔ جو اپنے فن کے بل بوتے پر صدیوں زندہ رہتے ہیں اور رہے ہیں۔

شوکت تھانوی جسم کے اعتبار سے اس دنیا میں موجود نہیں۔ مگر وہ کسی رنگ میں موجود تو ہیں۔ ورنہ کیوں دلوں کی ویرانیاں قہقہے بیدل کی بنتیں ؟

ان دنوں میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار کاغذ اور قلم کی مدد سے آپ پر واضح نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسی "مرحوم مگر زندہ شخصیت" پر لکھنے کے لیے جس دل گردے کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے میسر ہی نہیں۔ میں تو یادوں کے ہجوم میں خود ہی گم ہوا جا رہا ہوں۔

میں جس حال میں بھی رہا۔ انھوں نے میرا ساتھ دیا۔ وہ مجھے چھوٹا بھائی کہتے تھے۔ میں انھیں بڑا بھائی سمجھتا تھا مگر انھوں نے میرے ساتھ تعلقات کو کچھ ایسے نبھایا کہ جیسے وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے اور میں انھیں بڑا بھائی کہتا تھا۔

ادیب کی حیثیت سے میرا سب سے پہلا واسطہ شوکت صاحب ہی سے پڑا۔ اُس دن سے کر مرنے کی گھڑی تک اس واسطے کو نبھانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس عرصے میں ہم متعدد بار روٹھے، متعدد بار "خوخیلنے" مگر آفرین ہے شوکت صاحب پر کہ وہ ابھی روٹھتے تھے اور ابھی مان جاتے تھے۔ اگر یہ خوبی اُن میں نہ ہوتی تو ہم دو برس بھی ایک ساتھ نہ چل سکتے۔

شوکت تھانوی کون تھے۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ میں بھی جانتا ہوں۔ مگر کیا تھے ؟ یہ سب نہیں جانتے اور یہی بتانا ہے بھی مشکل، اس مشکل کو حل کرنے کے لیے، میں نے مرحوم کی بیگمات سے مضمون لکھوانے کی کوشش کی۔ مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اگر میں مرحوم کے بارے میں باتیں بھی کرتا تھا تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

باتوں باتوں میں، مختلف اوقات میں، میرے تجسس نے ان کے آنسوؤں کے درمیان جو کچھ دیکھا اور سنا وہ آپ کو بھی دکھائے اور سنائے دیتا ہوں:—

(اس وقت میرے سامنے شوکت صاحب کی بڑی بیگم سعیدہ خاتون بیٹھی ہیں۔ میں ان سے ۱۹۴۴ء سے واقف ہوں اُس وقت سے لے کر آج تک میں نے انھیں حد درجہ سنجیدہ، رکھ رکھاؤ والی اور مصلے تسبیح والی خاتون پایا)

بھابی! — یہ تو بتائیں آپ کی شادی کس سن میں ہوئی تھی اور اس وقت آپ دونوں کی عمر کیا تھی؟

طفیل بھائی! میرا نکاح ۱۹۲۵ء میں ہوا، تاریخ اور مہینہ ٹھیک سے یاد نہیں اور رخصتی دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ رخصتی کے وقت میری عمر بہت کم تھی۔ شوکت صاحب تقریباً بائیس سال کے تھے اور میری عمر تقریباً سولہ سال ہوگی۔"

چھ سال کا فرق تھا **طفیل** : — کیا شوکت صاحب آپ کے رشتہ دار بھی تھے؟ یا یہ بندھن ایسے ہی انسانی برادری والا قصہ تھا۔

جی ہاں: شوکت صاحب میرے رشتے کے چچا ہوتے تھے۔ میرے والد حکیم مولوی سجاد حسین صاحب شوکت صاحب سے قریبی رشتے کے خالہ زاد بھائی تھے"

بھابی گستاخی معاف! یہ تو بتائیں آپ کی شادی میں کچھ ہاتھ شوکت صاحب کا بھی تھا یا یہ شادی بھی قرنہ خاں کے قاعدے کے مطابق ہوئی تھی؟

طفیل بھائی! شوکت صاحب قرنہ خاں کے قائل نہیں تھے اور یہ شادی سولہ آنے ان کی اپنی پسند سے ہوئی تھی جس کا ذکر انھوں نے خود اپنی کتاب "مابدولت" میں کیا ہے۔ کہ وہ کس طرح میری پھوپی میرے گھر آتے، مجھ کو دیکھ پسند کیا اور اپنے ماں باپ سے کہہ کر شادی کا پیغام بھجوایا۔ حالانکہ اس وقت تک میری بڑی بہن کی شادی نہیں ہوئی تھی اور میرے والد صاحب کی خواہش تھی کہ پہلے بڑی لڑکی کا عقد ہو جائے اس کے بعد مجھ کی نسبت پر غور کیا جائے۔ لیکن شوکت صاحب کی ضد کی وجہ سے والد صاحب کو پہلے میری ہی شادی کرنا پڑی۔ لیکن ابھی صرف نکاح کی رسم ادا ہوئی تھی، والد صاحب قبلہ کی خواہش یہ تھی کہ شوکت صاحب جب انٹرنس پاس کر لیں گے تو اس وقت رخصتی کی رسم ادا کی جائے گی۔ شوکت صاحب کو یہ شرط منظور تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد شوکت صاحب کی بے قرار طبیعت نے ایک بار پھر والد صاحب کو مجبور کر دیا کہ وہ شوکت صاحب کے انٹرنس پاس کرنے کا انتظار نہ کریں اور میری رخصتی کر دی جائے۔

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ شوکت صاحب کو جس بات کی دُھن سوار ہوتی تھی اُس سلسلے میں جلدی کے قائل تھے۔ پھر یہ معاملہ تو شادی کا تھا (جب میں نے یہ فقرہ کہا تو مجھے بڑی شرم آئی مگر میں آنکھیں نیچی کر کے کہہ ہی گیا) اچھا یہ تو بتائیے اس وقت شوکت صاحب کیا تھے؟ اور آپ کی ان کے بارے میں کیا رائے تھی؟

اس وقت وہ صرف محمد عمر تھے شوکت تھانوی انھوں نے بننا شروع کیا تھا۔ شاعری اور مضمون نگاری کی طرف ان کا رجحان ہو چکا تھا۔ نکاح کے بعد رخصتی سے پہلے ان کا پہلا مزاحیہ مضمون جس کا عنوان "میٹھے چاول" تھا۔ ایم سلونی صاحب کے رسالے "ترچھی نظر" میں شائع ہوا اور کافی مقبول عام ہوا، مجھے بھی بہت پسند آیا۔ میری اس وقت عمر ہی کیا تھی جو میری رائے کی کوئی اہمیت ہوتی مگر جب میں نے ان کا یہ مضمون پڑھا تو نہ معلوم میرے دماغ میں یہ کیوں بیٹھ گیا کہ شوکت صاحب ایک بڑے ادیب ہیں اور میں اپنے آپ ہی ان سے بے انتہا متاثر ہو چکی تھی۔

یہ بتائیں کیا شوکت صاحب آپ سے ڈرتے تھے؟ مابدولت میں بھی اس امر کا سراغ ملتا ہے اور ان کے دوسرے مضامین بھی اسی امر کی چغلی کھاتے ہیں؟

طفیل بھائی! میرے خیال میں مابدولت میں کسی جگہ بھی یہ تاثر پیدا نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے ڈرتے تھے۔ آپ پھر اسے غور سے

بھی تو آپ کا اندازہ ہوگا کہ ان واقعات میں اور مضحکہ آرائی شامل نہیں تھی بلکہ محض ایک جھلک تھی مقصد یہ بھی اس لیے کہ وہ کسی قیمت پر میری دل آزاری نہیں چاہتے تھے اس لیے اگر وہ باتیں جو ان کے خیال میں میری دل آزاری کا سبب بن سکتی تھیں وہ سب چھپائے جاتے تھے۔ وہ جو آپ نے ان کے بعض مضامین کی طرف اشارہ کیا ہے تو وہ تو بھی صرف مضمون نویسی ہی کے لیے، جبکہ زندگی میں ان واقعات کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف ہنسانا تھا۔ کبھی مجھے چھیڑ دیا کبھی آپ کو گدگدا دیا اور کبھی خود سامنے بیٹھے اور لوگ ہنس پڑے —

ان کا ہنسنا ہنسانا تو ان کی زندگی کا معمول ہی تھا۔ مگر میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ شوکت صاحب آپ سے ڈرتے نہ تھے بہرصورت میں صاف لفظوں میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس کرۂ ارض میں ننانوے فیصد شوہر ایسے ہی تو ہیں جو اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ اس قصے کو چھوڑیے کہ وہ آپ سے ڈرتے تھے یا نہیں۔ یہ فرمائیے کہ آپ کی ازدواجی زندگی کیسی گزری؟ کیا تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے یا نبھائے چلے جانے کا سا انداز تھا؟

ہماری ازدواجی زندگی بڑی پرسکون تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تحاشہ محبت کرتے تھے اور کسی قیمت پر بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ دونوں میں سے کسی کے بھی جذبات مجروح ہوں اور جہاں یہ جذبہ ہو وہاں ناخوشگواری کا سوال ہی کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر میں یہ کہوں کہ ہماری زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی تو یہ بھی مبالغہ آرائی ہوگی۔ برتن پاس ہوتے ہیں تو کھڑک ہی جاتے ہیں بس احتیاط یہ ہے کہ ٹوٹیں نہیں۔

ہاں صاحب برتن ضرور کھڑکتے ہیں۔ ویسے بھی زندگی میں لطف پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کبھی کبھی برتنوں کو کھڑکا ہی دیا جائے۔ یکسانیت ہی یکسانیت سے، خواہ وہ خلوص اور پیار ہی پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس سے آدمی بور ہو جاتا ہے۔ میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں کہ صرف پیار ہی پیار، وہ بھی ایک لمبے عرصے کے لیے، کیا بدمذاقی ہے — ویسے میں نے یہ تو محسوس کیا اور دیکھا کہ شوکت صاحب کو اپنے بچوں اور رشتہ داروں سے بڑی محبت تھی۔

شوکت صاحب کو اپنے تینوں لڑکوں سے بے انتہا پیار تھا اور ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بچوں کی ہر خواہش کو پورا کریں اور اسی بات پر میری ان سے جھڑپ بھی ہو جاتی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس طرح بچوں کی ہر ضد پوری کرنے سے بچے خراب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں شوکت صاحب میری ایک نہ سنتے اور بچوں کی ہر جائز و ناجائز ضد کو پورا کرتے رہتے۔ خود ان کے ساتھ بچہ بن کر کھیلتے مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے اپنے تینوں لڑکوں میں سے کسی کو مارا بھی ہو۔ اگر کبھی کسی بات پر ڈانٹ بھی دیا تو خود ہی تھوڑی دیر میں گلے لگا کر چمکار بھی لیا۔ رات کو جب تک کوئی بچہ ان کی بغل میں نہ لیٹے ان کو نیند نہیں آتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ بچے بھی مجھ سے زیادہ ان سے مانوس تھے۔ شوکت صاحب کا اپنے رشتہ داروں سے سلوک بہت مشفقانہ تھا اور وہ اسی وجہ سے تمام رشتہ داروں میں ہردلعزیز تھے۔

ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے کہ شوکت صاحب ہردلعزیز رہے۔ دوست احباب کے دلوں میں بھی ان کے لیے ہمیشہ ہی جگہ رہی۔ مگر شوکت صاحب اپنے دوستوں سے ایسے ایسے بھی مذاق کر لیا کرتے تھے جو حد درجہ خطرناک ہوا کرتے۔ گھر میں ان کا کیا عالم تھا؟

جی ہاں! جب ان کا مذاق کا موڈ ہوتا تھا تو وہ گھر میں بھی کسی کو نہیں چھوڑتے تھے چاہے والدہ ہوں چاہے بہن ہو، مجھ سے،

بچوں سے اور حد یہ کہ نوکر چاکر سے بھی مذاق کرنے سے نہیں چوکتے تھے اور وہ اس وقت ایک شریر لڑکے کی طرح ہر ایک کو چھیڑتے پھرتے تھے —— میں نماز پڑھ رہی ہوں تو میرے گلے میں ہینڈ بیگ لٹکا دیا۔ اب نہ میں رکوع میں جا سکتی ہوں نہ سجدے میں۔ ایک عجیب مخمصہ میں جان ہے اور وہ ہیں کہ لطف لے رہے ہیں اور ایک ایک کو بلا کر تماشہ دکھا رہے ہیں —— یا کبھی نماز پڑھتے ہوئے مجھے چوکی سے اٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا، کبھی میں سجدے میں ہوئی تو کسی بچے کو میری پیٹھ پر سوار کر دیا اور میں سجدے ہی میں رہ گئی —— اپنی ماں کے کان میں نہ معلوم کیا بات کہہ دی کہ وہ ان کے پیچھے "خبیث، کمبخت" کہہ کر دوڑیں —— اسی طرح ایک دفعہ پڑوس میں ایک دھوبی کے گھر کوئی تقریب تھی۔ شوکت صاحب کی بڑی بہن نے ان سے کہا کہ "دھوبی کے گھر کے ماش اور چاول کھانے کو جی چاہ رہا ہے" یہ سننا تھا کہ شوکت صاحب چپکے سے اُٹھے اور دھوبی کے گھر جا کر کہہ دیا کہ "ہماری بہن صاحبہ ماش اور چاول مانگ رہی ہیں" اور یہ کہہ کر غائب ہو گئے —— تھوڑی دیر بعد دھوبی ماش اور چاول کا تھال لیے دروازے پر تھا۔ اس تحفہ پر ان کی بہن صاحبہ حیران ہوئیں، تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ یہ سب شرارت شوکت صاحب کی ہے۔ اور وہ گھر سے غائب ہیں۔ کبھی نوکر کو بلایا کہ لاؤ تمہارا شیو بنا دوں اور اس کی مونچھیں، بھویں اور پلکیں تک مونڈھ کر رکھ دیں اور وہ بیچارہ سب سے منہ چھپائے پھر رہا ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ کوئی بڑی خطرناک شرارت بھی کر جاتے کہ جس سے سارا گھر پریشان ہو جاتا تھا۔ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے کہ ایک دن پتہ نہیں کیا سوجھی کہ ایک دم اپنے ہاتھ پیر ٹھنڈے کر کے بیٹھ گئے۔ آنکھیں اوپر کو چڑھا لیں دانت بھینچ لیے، پکارو تو بولتے نہیں ہلاؤ تو جنبش نہیں، پانی کے چھینٹے دیے تو بھی کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ سارا گھر پریشان ہو گیا کہ یا اللہ یہ ایک دم سے کیا ہو گیا۔ لڑکے تینوں چھوٹے تھے، وہ حیران و پریشان، گھبرائے ہوئے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے، میں گھر میں بالکل تنہا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بے حد پریشان ہو کر بڑے لڑکے سعید سے کہا کہ "میاں جاؤ جلدی دوڑو سامنے کی کوٹھی میں اطلاع کرو کہ تمہارے ابا کی طبیعت بے حد خراب ہے فوراً کسی ڈاکٹر کو فون کر کے بلا دیں۔" ابھی سعید جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک زوردار قہقہہ لگا کر اُٹھ بیٹھے۔ اب ہم لوگ ہیں کہ ان کا منہ تک رہے ہیں اور وہ ہیں کہ ہنسے جا رہے ہیں، یہ ان کی اتنی خطرناک شرارت تھی کہ اگر ذرا دیر اور قائم رہتی تو میں اپنے حواس کھو بیٹھتی۔

جی ہاں، خود تفریح کا موڈ ہوتا تو دوسروں کی پریشانیوں کا مطلق خیال نہیں رکھتے تھے۔ میرے سامنے بھی ایسے بہت سے واقعات ہیں مگر میں آپ سے وہ کیا کہوں۔ جبکہ آپ کی معلومات مجھ سے کچھ زیادہ ہی ہوں گی۔ یہ تو خیر شوکت صاحب کا سلوک اپنے دوستوں اور اپنے ملنے والوں کے ساتھ تھا۔ خود آپ کی شوکت صاحب کے دوستوں کے بارے میں کیا رائے تھی۔ یہ میں نے اس لیے پوچھا ہے کہ بعض تو اُن میں سے ایسے تھے جو ہر وقت کے "ساتھی" (رمی کھیلنے والے) تھے۔ بعض ایسے تھے کہ صرف ہا ہا ہُو ہُو اور سبحان اللہ، جزاک اللہ کرنے والے تھے۔

طفیل بھائی! شوکت صاحب کے دوستوں کی فہرست بہت لمبی چوڑی ہے اور میں ان ہی لوگوں کو جانتی ہوں جن کا کہ میرے گھر آنا جانا تھا لیکن سچ پوچھئے اور کسی کو بُرا نہ لگے تو ان دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آیا جو کہ دوستی کے معیار پر پورا اُترے وہ سب شوکت صاحب کی تفریحات کے ساتھی تھے جیسا کہ ابھی آپ نے کہا کہ بعض تو ان میں سے ایسے تھے

جو بیوی کے "میرے" نہ تھے۔ بعض صرف شاعر کے ساتھی تھے اور بعض محض یونہی خوش گپیوں کے لیے مل بیٹھتے تھے پھر بھلا بیوی بیوی کے متعلق کیا رائے ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی چند ایک ہستیاں ایسی ضرور ہیں کہ جن کو شوکت صاحب کا پُر خلوص دوست کہا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے تو ایسا ہی سمجھتی ہوں اب پتہ نہیں شوکت صاحب کی خود کیا رائے تھی۔

ٹھیک ہے بھابی، ہر قوم کے اچھے بُرے کئی قسم کے دوست ہوتے ہیں جیسی ہیں "دوستی" کی اور بھانت بھانت کے ہوتے ہیں، یہ سمجھو شوکت صاحب کے ساتھ بھی نہ تھی۔ ساری دنیا کو اسی ماحول میں اپنی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ یہاں ایک سوال ابھر آیا سوال ذہن میں آیا ہے۔ اگر آپ اس پر روشنی ڈال سکیں تو بڑا اچھا ہو۔ وہ سوال یہ ہے کہ مرحوم کو جھوٹ لکھنے کا بڑا ہوکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ غلط سلط بھری ہی سہی باتیں لکھ کے بھی اپنی فوقیت اپنے ہم چشموں پر جتاتے رہیں۔

عقیل بھائی! آپ مجھ سے یہ سوال نہ پوچھیں تو بہتر ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے جواب سے آپ کو مطمئن نہ کر سکوں بات یہ ہے کہ مجھے تو آپ کے اس سوال کی بنیاد ہی پر اعتراض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شوکت صاحب کو ہر لحاظ سے اس قدر نوازا تھا کہ اب انھیں جھوٹ لکھانے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ بہرحال پھر بھی ہو سکتا ہے انھوں نے اپنی بابری کے مضمون میں تفریحاً کچھ ایسی باتیں لکھ دی ہوں کہ جن سے آپ نے یہ اندازہ لگایا۔ لیکن میں ان باتوں سے بالکل اجنبی ہوں۔

ان صاحب! بیویوں کے اتنے حوصلے کہاں کہ وہ کسی سے اپنے شوہر کی برائی سن سکیں۔ ویسے چاہے خود ہزار برائیاں نکالتی رہیں مگر وہ کسی دوسرے کی بات نہیں سن سکتیں۔ آپ شوکت صاحب کی اتنی تعریفیں کر رہی ہیں۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ مگر خود شوکت صاحب کا ایک خط ایسا چھپا ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ میرا ایک عورت سے غیر شرعی تعلق بھی رہا ہے۔ آخر وہ عورت کون تھی!

جی ہاں! وہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ایک ڈرامہ آرٹسٹ تھی وہیں شوکت صاحب کی اس سے ملاقات ہوئی اور مراسم پیدا ہو گئے مجھے جس وقت اطلاع ہوئی تو شوکت صاحب اپنی اس لغزش پر بے حد پشیمان تھے اور اس سے بے تعلقی کا عہد کر چکے تھے۔ میرے خیال میں اس بات کو یہیں پر ختم کر دیجئے گندی باتوں کو کریدنے میں کچھ مزا نہیں آتا۔

واقعی بُری باتوں کو کریدنا ہے تو بُرا، مگر بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر اُن پر سرے سے غور ہی نہ کیا جائے تو اس کے نتائج چپ رہنے سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ مجھے اس نمبر کی ترتیب کے سلسلے میں یہ دقت پیش آئی ہے کہ بیشتر مضمون نگاروں نے اس بات کا ذکر کیا چونکہ ذکر مناسب الفاظ میں نہ تھا۔ اس لیے میں نے ان باتوں کو حذف کر دیا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ اس بات کا کچھ تو سراغ ملے۔ اچھا بھابی یہ ذکر چونکہ تکلیف دہ ہے اس لیے ہم کیوں نہ مرحوم کی خوبیوں کا ذکر جی بھر کے کریں۔

آپ نے ایک مختصر سا سوال کیا لیکن میرے جواب کے لیے ایک مضمون پیدا کر دیا ہے۔ شوہر جیسا کچھ بھی ہو لیکن ہر بیوی کو اپنا شوہر خوبیوں کا ایک مجسمہ ہی نظر آتا ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے کس کس پہلو کی خوبیاں اجاگر کروں کچھ خوبیاں تو ان کی ایسی ہیں کہ جن پر آپ بھی اتفاق کریں گے مثلاً ان کی نفاست پسندی ہر پہلو میں نمایاں تھی، لباس بھی نفاست سے پہنتے اور اس پر بلا کے جامہ زیب تھے کیا مجال جو کسی کپڑے پر کوئی داغ، دھبہ یا شکن پڑ جائے۔ کھانے کے سلسلے میں یہی حال تھا، اچھا کھانے کے شوقین تھے اور اس سے بڑھ کر کھانے کا سلیقہ تھا اسی طرح ان کی تحریر میں بھی آپ یہی دیکھیں گے۔ الفاظ کے مناسب چناؤ کے ساتھ ساتھ خط نہایت نفیس تھا اور ان کی تحریر میں آپ کہیں کاٹ چھانٹ نہیں دیکھیں گے۔

خود اعتمادی کا یہ حال تھا کہ ایک بار لکھ کر اپنی تحریر کو کبھی دوبارہ نہیں پڑھا جیسے کہ ان کو یقین ہوتا تھا کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ وہ دھن کے پکے تھے اور یہ ان کی مستقل مزاجی ہی تھی جس کی بدولت وہ اتنے مشہور شاعر بنے "ما بدولت" میں ایک جگہ انھوں نے خود ذکر کیا ہے کہ میں نے جو پہلی غزل اپنے نام سے سب کو سنائی وہ چرائی تھی۔ جب اس بات کا بھانڈا پھوٹا تو اس خفت کو مٹانے کی خاطر خود کچھ کہنے کی کوشش کی، کئی بار ناکامی ہوئی لیکن بہت جلد شاعری اور ادب میں ان کا شمار چوٹی کے شاعروں میں ہونے لگا، پھر جب مزاح نگاری کی طرف رخ کیا تو بڑے بڑے مزاح نگار ان کا لوہا مان گئے ریڈیو میں ملازم ہوئے تو "قاضی جی" جیسا ایک زندہ و جاوید کردار ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے، جب صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو ایک نیا رنگ پیدا کیا ـــــ خودداری کا یہ عالم تھا کہ اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے نہ چوکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۲ء میں جب شوکت صاحب پنچولی آرٹ پکچرس میں ملازم تھے تو ایک زیر تکمیل فلم کی کہانی میں پنچولی آرٹ کے جنرل منیجر دیوان سرداری لال نے شوکت صاحب کی غیر موجودگی میں ان کی لکھی ہوئی کہانی میں کچھ رد و بدل کر دیا۔ کسی کے مشورے پر اپنے قلم سے تو وہ رد و بدل کر سکتے تھے لیکن بھلا یہ کیونکر برداشت کرتے کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی اور ان کی تحریر میں رد و بدل کر دے۔ نتیجہ یہ کہ فوراً استعفیٰ دے دیا اور کہانی ساتھ لے کر گھر پہنچ گئے۔ اس وقت مالی طور سے حالات بہتر نہیں تھے لیکن وہ اپنی خودداری کو کسی قیمت پر بھی بیچ نہیں سکتے تھے ـــــ آخر کار دیوان سرداری لال نے ان سے معافی مانگی تب کہیں جا کر انھوں نے اپنا استعفیٰ واپس لیا۔ مہمان نوازی کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی دشمن بھی کبھی مہمان بن کر آ جائے تو وہ اس کے آگے بچھے جاتے، اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے یہ تو دشمن کے ساتھ سلوک تھا اور اگر کبھی خوبیٔ قسمت سے کوئی دوست مہمان بن کر آ جائے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں کوئی خزانہ مل گیا ہو، مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے۔ مالی حالت جیسی بھی ہو لیکن خاطر مدارت میں کمی نہ ہونے پاتی چاہے اس کی خاطر جو کچھ بھی کرنا پڑے۔ مجھے یاد ہے جب شوکت صاحب لکھنؤ میں محکمہ پبلسٹی آرگنائزر کی حیثیت سے تعینات تھے تو ان کے ایک دوست کا آل انڈیا ریڈیو دہلی سے لکھنؤ تبادلہ ہو گیا۔ شوکت صاحب تو اس تلاش ہی میں رہتے تھے کہ کوئی دوست آئے اور وہ اس کی مہمان نوازی کریں بس اب کیا تھا ان کو بلا کر اپنی حسرتیں پوری کرنا شروع کر دیں۔ خیال یہ تھا کہ جب تک انھیں کوئی مکان نہیں ملتا وہ ہمارے ہی گھر رہیں گے۔ لیکن شوکت صاحب کی پُرخلوص شخصیت نے ان کو اپنے جال میں ایسا جکڑا کہ پھر وہ اپنے لیے مکان نہ ڈھونڈ سکے اور جب تک وہ محکمہ قائم رہا اور ہم لوگ اس سرکاری کوٹھی میں رہے وہ ہمارے ہی ساتھ رہے اور اس طرح جیسے کہ وہ مہمان نہ ہوں بلکہ ہم لوگ ان کے مہمان ہوں اور مزے کی بات یہ کہ جب وہ محکمہ ٹوٹا اور وہ سرکاری کوٹھی خالی کرنا پڑی تو شوکت صاحب کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ ہم لوگوں کے لیے دوسرے مکان کا کیا بندوبست ہوگا فکر تھی تو یہ کہ ان کے ان دوست کے رہنے کا اب کہاں انتظام ہوگا۔ حاضر جوابی کا یہ حال تھا کہ جس محفل میں پہنچ گئے سب کو لاجواب کر دیا۔ ایک دفعہ میرے چھوٹے لڑکے رشید کے حلق میں کچھ تکلیف تھی ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ غدود بڑھ گئے ہیں اس لیے آپریشن کرا دینا چاہیے۔ شوکت صاحب آپریشن سے بہت گھبراتے تھے سوچا کہ لاؤ یونانی علاج کرا کے دیکھیں لہٰذا رشید کو لے کر حکیم نیر واسطی صاحب کے پاس مشورہ کرنے کے لیے گئے۔ حکیم صاحب نے بہت ہی توجہ سے رشید کو دیکھا اور ایک ایلوپیتھک نسخہ تجویز کر دیا جس میں آپریشن کا ہونا

وہ دن تھا حکیم صاحب بھی ایک مدت یہاں رہے وہ دن یاد تھیں۔ شوکت صاحب کو غالباً اس وقت اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ نسخہ کیا گیا بہت حیران ہوئے۔ حکیم صاحب نے مسکرا کر کہا "شوکت صاحب آپ حیران نہ ہوں یہ نسخہ میں نے بہت سوچ کر تجویز کیا ہے۔ شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ میں آدھا تیتر آدھا بٹیر ہوں" شوکت صاحب نے بڑی فصاحت سے جو جواب دیا تو قہر ہو گیا جیسے بم پھٹ گیا ہو: یہ سننا تھا کہ حکیم صاحب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے اور اسی وقت نسخہ پھاڑ کے نالی میں پھینک دیا۔ شوکت صاحب سو خوبیوں کی ایک خوبی ان کی یہ عادت ہے اپنی خامیوں کا اس بھولپن سے ذکر کرتے چلے گئے ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اپنی غلطیوں کا اس طرح اعتراف کر لینا کردار کی بہت بڑی خوبی ہے۔

جانی مزا آ گیا! آپ نے اس ضمن میں بڑی تفصیل سے باتیں کیں۔ کیا آپ مرحوم کے ساتھ ان کی کوتاہیوں کے بارے میں بھی کچھ بتائیں گی یا صرف ان کی تعریف ہی کرتی چلی جائیں گی!

جی ہاں! ہر انسان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں اور بھلا کون سا انسان ایسا ہے جو برائیوں سے پاک ہوتا ہو۔ قدرت کا کچھ اصول ہی ایسا ہے کہ ہر بڑے سے بڑے انسان میں کوئی نہ کوئی خرابی ہوتی ہے اور ہر نیک سے نیک انسان میں کوئی نہ کوئی برائی ضرور پائی جاتی ہے اور جب کہ شوکت صاحب اپنی برائیاں خود اپنے قلم سے "مابدولت" میں بیان کرنے سے نہیں چوکے تو مجھے کیا تکلف ہو سکتا ہے۔ شوکت صاحب کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ جہاں وہ ہر ایک سے ہر طرح کا مذاق کر لیتے تھے وہاں وہ اپنے سے کسی اور کا مذاق برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ شوکت صاحب اس قدر حساس واقع ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی جنونی کیفیت بھی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، ذرا سی بات ناگوار گزری اور تمام گھر کو سر پر اٹھا لیا اور اس غصہ میں وہ اکثر اپنا بڑے سے بڑا نقصان بھی کر لیا کرتے تھے۔ ماں باپ کے بہت لاڈلے تھے اور بڑے ناز و نعم سے پرورش پائی تھی اور چونکہ وہ بچپن میں اکثر بیمار رہتے تھے اس لیے ان کی ہر جائز و ناجائز ضد پوری کی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ہر ضد منوانا ان کی عادت بن گئی اور بچپن کی خوشامد پسندی کے جیسے کہ وہ عادی سے ہو کر رہ گئے تھے اور بوڑھے ہو کر بھی ان کی طبیعت میں شامل رہی اور جہاں ان کو یہ چیز نہیں ملتی تھی تو یہ ان کی طبیعت پر ناگوار گزرتا تھا۔ ان کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ جو کام بھی وہ کریں اس کو سب سراہیں اور کسی قسم کا اعتراض نہ کریں۔ اسی طرح ایک دفعہ وہ ایک بہت ہی خوبصورت چائے کا سٹ خرید کر لائے جو مجھے اور میری مرحومہ بہن رابعہ کو بہت پسند آیا۔ ہم دونوں کی تعریف سے بہت خوش ہوئے لیکن جب انھوں نے اس کی قیمت بتائی تو میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ "جتنا اچھا سیٹ ہے اتنی اچھی قیمت بھی تو ہے"! یہ سننا تھا کہ ہنستا ہوا چہرہ ایک دم سے آگ برسانے لگا اور اس سیٹ کو فٹ بال کی طرح اچھال دیا اور وہ چکنا چور ہو گیا۔ اس حسین سیٹ کے ٹوٹنے کا مجھے اب بھی افسوس ہے۔

ہاں صاحب! ان کے غصے سے تو مجھے بھی ڈر لگتا تھا۔ مگر میں نے اس کا ایک علاج ڈھونڈ رکھا تھا کہ جب مرحوم غصے میں ہوتے تھے تو میں ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خود ہی شور و غل مچا کے چپ ہو جایا کرتے تھے۔ دوبارہ ملتے تھے تو پچھلی رنجش کا ذکر تک نہ کرتے تھے۔ انہی باتوں سے تو میرا خیال بھی ہے کہ مرحوم بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کا ان کا بڑا لمبا ساتھ رہا۔ آپ دو چار باتیں اس نوع کی بھی سنا دیں۔

ضمیر بھائی! شوکت صاحب کی تمام زندگی دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے اس سے پہلے بھی میں نے جو باتیں بیان کیں۔ ان میں بھی بعض شوکت صاحب کے دلچسپ واقعات ہیں بہرحال پھر بھی اس سوال کے ضمن میں ایک واقعہ اور سن لیجئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب شوکت صاحب آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ملازم ہوئے تھے ہم لوگوں کا گھر سرفراز اخبار کے دفتر کے بالکل سامنے تھا۔ وہیں سرفراز اخبار کے دفتر میں ایک ہندو رہتا تھا، نام ٹھیک سے مجھے یاد نہیں۔ پتہ نہیں انھیں کیا سوجھی کہ اس بیچارے کو پہلے تو اس خوش فہمی میں مبتلا کیا کہ تم بہت خوبصورت ہو، بہت حسین ہو، لڑکیاں تم پر جان دیتی ہیں اور پھر اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ میرے گھر پر ایک شمیم نامی لڑکی ہے جو میری بیوی کی سہیلی ہے اور تمھاری ایک جھلک دیکھ کر تم پر سو جان سے فدا ہو چکی ہے اور یہاں سے اب شوکت صاحب کا ڈرامہ شروع ہوا کبھی فرضی لڑکی کے نام سے پرچے لکھے جا رہے ہیں، کبھی اندھیرے میں برآمدے میں پڑی ہوئی چق کے نیچے سے دوپٹہ نکال کر باہر لٹکایا جا رہا ہے جب اس بیچارے کو اچھی طرح مجنوں بنا لیا تو یہ بھانڈا پھوٹا کہ یہ فرضی لڑکی شمیم اور یہ اس کے خطوط یہ سب شوکت صاحب ہی کی کارستانی ہے۔ اس واقعہ سے وہ بیچارا اس قدر شرمندہ ہوا کہ منہ چھپا کر ایسا بھاگا کہ پھر نظر نہیں آیا اور یہی واقعہ پھر شوکت صاحب کی کتاب "خانم خاں" کا پلاٹ بن گیا۔

اچھی بھلی باتیں ہو رہی تھیں کہ بھابی اپنے خیالوں میں دُور نکل گئیں۔ اس کے بعد میں نے بڑی کوشش کی کہ یہ مجھ سے کچھ باتیں اور کریں مگر میں اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوا۔ ایک چُپ سی لگ گئی۔

"بھابی! ـــ میں آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"میں اس وقت آپ کی کسی بات کا جواب نہ دے سکوں گی۔"

بھابی سعیدہ بھی میرے سامنے ایسے ہی خاموش ہو گئیں، جیسے شوکت تھانوی، بس فرق اتنا تھا کہ ایک میرے سامنے بیٹھی تھیں اور وہ دوسرے کو اپنے کندھوں پہ اٹھا کر دفن کر آیا تھا۔

(۲)

ابھی بھابی زہرا کی شادی نہیں ہوئی کہ دو خواتین ہمارے دفتر تشریف لائیں اور انھوں نے شوکت تھانوی کی خود نوشت سوانح "ما بدولت" طلب کی۔

اتفاق کی بات کہ اُس وقت شوکت صاحب کے منجھلے صاحبزادے خورشید عمر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا "ما بدولت پڑھ کر کیا کیجئے گا؟"

یہ چٹکلے سب پہلے ہوتے ہیں!

بے شک صاحب ہر لطیفہ نہیں ہوتا۔ کچھ تو دن رات ہوتے ہیں:

بالکل ٹھیک ہے۔ صاحب شوخیاں ہی باتیں کرتی ہیں:

یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی خوش مزاجی میں ایک راز تھا۔ جو [illegible] شوکت ہیں۔ میں نے ان کی تصویر دیکھی ہے ان کی صورت کیا تھی؟ [illegible] کوئی [illegible] شوکت صاحب نے بہت پوچھا تھا۔ آپ نے ان [illegible] کی کیا کیا باتیں ہوئی تھیں؟

شوکت صاحب مجھ سے ہنستے تھے۔ میں نے بات ہنسی مذاق میں ٹال دی۔

جب پہلی بار میری زہرا شوکت سے ملاقات ہوئی تو یہ بڑی پیاری تھیں۔ خوبصورت سی، سفید رنگت، بھرا بھرا چہرہ، بڑا سا جسم ۔۔۔ مگر اب بھابی ویسی نہیں رہیں۔ شوکت صاحب کی زندگی میں بھی ویسی نہ رہیں۔ پہلے "پنجاب دی کڑی" لگتی تھیں۔ اب یو۔پی کے کسی گھرانے کی خاتون لگتی ہیں۔ دبلی پتلی، بلا سا تو رنگ، پان سے دانت ۔۔۔ شوہر نے بھی پہلے آپ کو خوب ڈھالا۔ شوکت کی جانی نہ بیٹھ کر یہ لکھنوی بن گئیں۔

شوکت صاحب کے انتقال نے انہیں بجھا دیا ہے۔ وہ ویران ہیں۔ اب مستقبل کے اندھیروں میں اکیلی ہیں۔ تین معصوم بچیوں کا ساتھ بھی ہے۔

زندگی کی ایسی اندھیری رات میں جب کہ بظاہر، زندگی کا آدھا سفر بھی طے ہو چکا ہو۔ کیا کیا نہ وسوسے ان کو گھیرتے ہوں گے۔ مگر ان کی زندگی کا سہارا یہی بچیاں تو ہیں۔ جو اڑتی پھرتی، دل کی تسکین کا بہانہ ہیں۔ دل کی جراحتوں کا مداوا ہیں۔ بچوں کی یتیمی کا احساس انہیں خون کے آنسو رلاتا ہو گا۔ مگر بچیوں کے خوشگوار مستقبل کے خواب میں جگنو کی روشنی ہی ڈھارس بندھاتی ہو گی۔

شوہر کے بعد بیوی کی زندگی امید و بیم کے جن وسوسوں سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی تفسیر زہرا شوکت ہیں۔ حال تکلیف دہ، مستقبل مشکوک!

جس نے زندگی بھر ہنسایا ہو، اس کا تذکرہ منہ بسور کے کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ مگر کیا کریں۔ کس طرح ہنس کے دکھڑے کو ٹال دیں؟

کوشش کرتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے، ذہن کو جھٹک کر زہرا شوکت سے باتیں کروں۔ بے شک آپ بھی سن لیں پڑھ لیجیے۔

بھابی! شوکت صاحب بڑے کٹر قسم کے یو۔پی والے تھے۔ پھر انہوں نے آپ سے شادی کیوں کی، جبکہ آپ کا تعلق ایک پنجابی گھرانے سے ہے؟

عقیل صاحب! میں نے شادی کے بعد شوکت صاحب کو کٹر قسم کا یو۔پی والا نہیں پایا۔ دوسرے آج کل تو ایسی بہت سی شادیاں ہو رہی ہیں۔ پنجابی گھرانوں میں یو۔پی کی بہو بیٹیاں آ رہی ہیں اور پنجاب کی بہو بیٹیاں یو۔پی والوں کے ہاں بیاہی جا رہی ہیں۔ چلیے میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ ساتھ ہی اب ہمیں علاقائی بنیادوں پر سوچنا نہیں چاہیے۔ اب ہم سب پاکستانی ہیں۔ سب ایک ہیں ۔۔۔ شادی کے وقت آپ کی اور شوکت صاحب کی عمر کیا تھی؟

جو صرف شریف گھرانوں کی میاں اور بیویوں کی ہوا کرتی ہیں۔"

بھابی! آپ نے تو بڑے خوبصورت انداز میں ٹال دیا۔ مگر بتا دینے میں حرج تو کچھ نہ تھا۔ آپ بے شک اپنی عمر وہ چار سال کم بتا دیں مگر کچھ بتائیں تو!

"میں اُن عورتوں میں نہیں ہوں، جو اپنے آپ کو لڑکپن کے فریب میں مبتلا رکھنے کے خواب دیکھتی ہوں۔"

چلیے آپ ہی کی منطق کی روشنی میں عمر والی بات گول ہوئی۔ میں خود ہی اندازہ کروں گا کہ شادی کے وقت آپ کی عمر اکیس بائیس سال ہوگی اور شوکت صاحب کی عمر اتالیس یا چالیس سال ہوگی (حالانکہ حساب کے مطابق اس وقت شوکت صاحب کی عمر ۴۴ سال تھی) — اگر عمر کی طرح یہ معاملہ بھی راز کا نہ ہو تو اتنا ہی بتا دیجئے کہ شادی کے وقت، جو شرائط طے ہوئی تھیں۔ وہ کیا تھیں!

"عقیل صاحب معلوم ہوتا ہے نہ آج جو آپ کھُرچ کھُرچ کے مجھ سے باتیں پوچھ رہے ہیں تو وہ ضرور چھاپنے کے لیے پوچھ رہے ہیں۔"

بھابی! ویسے تو میں یہ باتیں اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ اگر چھپ جائیں تو حرج بھی کیا ہے۔ پھر یہ کہ شوکت صاحب کے بارے میں جتنا کچھ آپ جانتی ہیں اتنا ہر ایک تو نہیں جانتا۔ لہٰذا جو میں پوچھوں، وہ بتاتی چلی جائیں۔ اس لیے کہ ادیب قوم کی امانت ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں قوم کی امانت ہوتی ہیں۔ انھیں عام لوگوں کی طرح خاندان کی ملکیت نہیں سمجھنا چاہیے۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔ اسی خیال سے اپنی ذاتی مگر راز میں رکھنے والی بات بتلائے دیتی ہوں۔ شادی کے وقت شوکت صاحب نے بطور شرائط ہمیں جو کچھ لکھ کے دیا تھا۔ وہ یہ ہے:-

(۱) میرا نام محمد عمر ہے۔ لوگ مجھے شوکت تھانوی کے نام سے جانتے ہیں۔

(۲) میرے والد مرحوم کا نام صدیق احمد صاحب تھا۔ جو یو۔ پی پولیس میں انسپکٹر اور بھوپال میں انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔

(۳) میں شیخ فاروقی ہوں۔ حنفی ہوں۔ میری عمر ۴۵ سال ہے۔

(۴) تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کا رہنے والا ہوں۔

(۵) میری تعلیم انٹرمیڈیٹ تک ہوئی اور بعد میں انٹرمیڈیٹ کا ممتحن بھی رہ چکا ہوں۔

(۶) میری تنخواہ اس وقت ساڑھے چار سو روپے ماہوار ہے۔

(۷) میرا خاص مشغلہ کتابوں کی تصنیف ہے۔ جس سے اوسطاً دو سو روپے ماہوار آمدنی ہے۔ اس وقت تک پینتالیس کتابوں کا مصنف ہو چکا ہوں۔

(۸) میں اب تک چھ روزنامہ اخباروں کا اور چار ماہنامہ کا ایڈیٹر رہ چکا ہوں۔

(۹) . . . .

(۱۰) مجھے اس عقد کے سلسلے میں تمام شرائط منظور ہوں گی اور میں مہر وغیرہ کے لیے ہر قسم کی لکھا پڑھی کیلئے تیار ہوں۔

(۱۱) رہائش کا انتظام الگ کروں گا۔ میری زوجہ ثانیہ کو پہلی بیوی سے کوئی تعلق کسی قسم کا نہ ہوگا۔

"سوال: ان باتوں سے بہت سی نئی باتوں کا علم ہوا [illegible] خود کس طرح [illegible] سب نہیں لکھا۔ اس لیے [illegible] احتمال ہے [illegible] کی غمازی ہے [illegible] ضرور نہیں؟"

جب شوکت صاحب [illegible] ایک بہت ہی [illegible] ذکر [illegible] جن باتوں کے [illegible] کا [illegible] آپ [illegible] نہیں گے؟"

"سوال: [illegible] شوکت صاحب کی [illegible] باتیں [illegible]

بڑی احتیاط [illegible] ہیں [illegible] آپ کا انجام [illegible]؟"

"جواب: انجام بخیری ہو گا انشاءاللہ! [illegible] اس وقت [illegible] نہیں کرنا چاہئے۔ [illegible] تو آپ یہ بتائیں کہ آپ کیسے میں شوکت صاحب کی [illegible] کرتی تھیں، اور [illegible] وقت کس قسم کا ماحول چاہتے تھے؟"

"شوکت صاحب [illegible] پُرسکون اور [illegible] ماحول چاہتے تھے۔ بڑے خوبصورت [illegible] بہترین [illegible] کرتے تھے۔ اگر کوئی ان کی تحریر دیکھے تو وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ پوری دلچسپی اور اطمینان کے ساتھ لکھا کرتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ گھر کے شور شرابے میں اور وہ لکھ رہے ہیں [illegible] وہ ہر قسم کے حالات میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے لکھنے پر قادر رہتے۔"

شوکت صاحب آپ کو ہر محفل میں لے جاتے تھے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ آپ کا اصرار ہوتا تھا، یا اُن کی خواہش ہوتی تھی؟"

"شوکت صاحب مجھے ہر محفل میں نہیں لے جاتے تھے۔ صرف وہیں لے جاتے تھے جہاں میرا جانا مناسب ہوتا تھا۔ ایک بار ایک کاک ٹیل پارٹی میں غلطی سے چلی گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر میری طبیعت خراب ہو گئی۔ اس کے بعد سے ایسی مخلوط دعوتوں میں کبھی شریک نہیں ہوئی۔ چونکہ شوکت صاحب کو بھی شراب سے نفرت تھی۔ اس لیے وہ بھی ایسی دعوتوں سے بچا کرتے تھے۔ بہرحال میرا دعوتوں میں شریک ہونا نہ میرے اصرار پر منحصر تھا نہ شوکت صاحب کی خواہش پر بلکہ یہ منحصر تھا دعوت کی نوعیت پر یا صاحبِ خانہ سے مراسم پر۔"

"شوکت صاحب کے مذہبی خیالات کیا تھے۔ میرا خیال ہے، انھوں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ نہ روزے رکھے۔ مگر اب شوکت صاحب کے دوست کہہ رہے ہیں کہ وہ بڑے مذہبی آدمی تھے؟"

"شوکت صاحب نے نمازیں بھی پڑھیں۔ روزے بھی رکھے۔ وہ واقعی ذہناً مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ گو روزے نماز کے معاملے میں پابندی تو نہ کرتے تھے مگر اللہ اور رسول کا نام لیتے ہوئے آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے ۔۔۔ بقول سید محمد جعفری کے ۔۔۔ "شوکت صاحب کہا کرتے تھے کہ جب میں اپنے خالق کے حضور میں نماز کے بعد دعا مانگتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حرمِ کعبہ میں کھڑا ہوں۔ کعبہ کا پردہ اٹھا ہے اور اس نے میرے سر پہ سایہ کیا ہے اور اس سے مجھے سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے" ۔۔۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ اور بھی ہے کہ جب راولپنڈی میں غلافِ کعبہ کی زیارت کرائی گئی تو اُن دنوں شوکت صاحب بڑے بیمار تھے۔ اور وہ اپنی بیماری کی وجہ سے خود سے جا کر غلافِ کعبہ کی زیارت نہیں کر سکتے تھے

اس پہ مشتاق رہتے تھے۔ میر خلیل الرحمٰن صاحب کو جب شوکت صاحب کی اس آرزو کا علم ہوا تو انھوں نے شوکت صاحب سے کہا۔
جب غلافِ کعبہ کی زیارت ہو چکے گی تو میں رات کو جا کر غلافِ کعبہ یہاں لے آؤں گا! — جب یوں ہوا اور میر صاحب غلافِ کعبہ
گھر پہ لے آئے تو اُسے متعدد بار آنکھوں سے لگایا اور چوما اور اس کا اظہار کیا کہ میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔"

"بھابی مجھے یہ باتیں سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ مگر میرا خیال ایسا نہ تھا اور یہ تغیر بھی ان کی آخری عمر میں آیا۔ اس لیے کہ انھوں نے جب تک جوانی کی حدود کو بڑھاپے کی حدود سے جدا نہ لیا۔ انھوں نے اپنی شوخیوں کو خیر باد نہ کہا۔ شوخیاں مذہب کے معاملے میں بھی روا رکھتے تھے اور زندگی کے باقی معاملات میں بھی' میری اس بات کی تائید شوکت صاحب کی پہلی بیگم کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ نماز پڑھا کرتی تھیں تو کبھی شوکت صاحب ان کے گلے میں ہینڈ بیگ لٹکا دیا کرتے تھے اور کبھی انھیں چوکی پر سے اٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا کرتے تھے۔ بہرحال مجھے ان کے موجودہ خیالات سے بےحد خوشی ہوئی۔ جس کا علم مجھے اس سے پہلے نہ تھا۔ چلئے یہ تو بات ہو گئی ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں' اس اچھی بات کے ساتھ' ان کی طبیعت میں بے حد غصہ بھی تھا۔ آپ کے خیال میں کیا وہ بلا وجہ غصے ہو جایا کرتے تھے یا باوجہ غصے ہوتے تھے؟"

"یہ وقتی جوش اور عارضی جذبہ ہوا کرتا تھا۔ وہ ایکدم بھڑک کر ایکدم نرم ہو جایا کرتے تھے اور یہ سب کچھ دنیاوی تفکرات اور دنیاوی الجھنوں کی بنا پر ہوا کرتا تھا۔ انسان آخر انسان ہے۔ وہ اچھی باتوں سے خوش ہوتا اور بُری باتوں سے کبیدہ خاطر رہتا ہے وہ بھی اس سے متاثر تھے۔ چونکہ بے حد حساس تھے۔ اس لیے برہم بھی ہو جایا کرتے تھے اور جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو جایا کرتا تھا تو بےحد نادم ہوا کرتے تھے۔ پھر وہ بلا تفریقِ مرتبہ اور عمر کے معافی بھی مانگ لیا کرتے تھے۔"

"شوکت صاحب بے جا جھوٹ بولا کرتے تھے۔ ایسا وہ کیوں کرتے تھے؟"

"آپ کا یہ سوال بڑا چھوٹا سا ہے۔ مگر اس کے جواب کے لیے مجھے سوچنا پڑ گیا ہے۔ اگر آپ کی مراد دروغ مصلحت آمیز سے ہے تو اس کی مرتکب ساری دنیا ہے۔ آپ بھی ہوں گے۔ اس میں اکیلے شوکت صاحب کا کیا قصور ہوا۔ وہ یقیناً ایسی باتوں کے سلسلے میں جھوٹ بولتے تھے۔ جن باتوں کے سچ کہنے سے کسی کی دلآزاری ہوتی ہو۔ وہ کسی کے خوف یا اپنے لالچ کے لیے جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے۔ بعض اوقات محض تفریحاً بھی جھوٹ بول دیا کرتے تھے۔ تاکہ ذرا لطف رہے — ایک واقعہ بتاتی ہوں — رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ ایک دفعہ شدید زلزلہ آیا تھا۔ حد درجہ گھڑگھڑاہٹ کی وجہ سے بڑا بھیانک سماں تھا۔ شوکت صاحب ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے مجھے گھبرائے ہوئے انداز میں آواز دی اور پوچھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا زلزلہ ہے۔ کہنے لگے تو پھر اچھا لا الٰہ الا اللہ — زلزلہ آیا تھا۔ چلا گیا۔ مگر شوکت صاحب کی گھنٹوں سانس پھولی رہی۔ حد درجہ پریشان رہے۔ ممکن ہے یہ سوچتے ہوں کہ پھر زلزلہ نہ آجائے — اتفاق کی بات کہ اُن دنوں میرے دانت میں تکلیف تھی۔ دوسرے دن میں شوکت صاحب کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں گئی۔ وہاں زلزلے والی بوکھلاہٹ کا قصہ میرے نام سے منسوب کر کے ڈاکٹر صاحب کو سنا دیا۔ میں دانت کے درد کی وجہ سے منہ دبائے بیٹھی تھی۔ بولنے سے مجبور تھی۔ مگر وہ جھوٹ بول کر بھی لطف لے رہے تھے۔"

"شوکت صاحب میں ایسی کیا انسانی بڑائیاں تھیں۔ جن کی بنا پر وہ اتنے ہر دلعزیز تھے؟"

"اس کا جواب خود آپ کے پاس بھی ہے۔ مگر آپ ہر بات کا جواب مجھ سے چاہتے ہیں۔ یہ اچھی زبردستی ہے۔ شوکت صاحب کی

بلکہ شخصیت بیویوں کی بد صورتی کا باعث تھی۔ انھیں مردوں میں بٹھا دیتے تو وہ انھیں جتا کے نہ تھکتے تھے۔ لوگوں سے بیویوں کے اوپر اٹھانے کا جذبہ رکھتی تھی۔ اس ضمن میں اگر ان کا حزن و تعزیت دیکھا جائے تو شوکت صاحب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ وہ کس طرح تعزیت لیتے تھے کہ سانحے میں بھی دل کی استقامت کے بجائے بیٹھے تھے ہمراہ کے ساتھ کی ایک بھی بیماری کا گریہ جاری تھی — وہ پچھلی ہی بات ہے۔ سید محمد جعفری اور ہم اکٹھے ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ وہ چھاؤں مانی سڑک کے کنارے تھا۔ گرمیوں کی ایک رات کو کوئی بارہ ایک بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی تو دیکھا کیا ہوں ہوا پانی ٹھنڈا ہے۔ میں گھبرا کر اٹھی۔ مکان چھان مارا، شوکت صاحب نہ ملے۔ دروازہ کھول کے دیکھا تو شوکت صاحب اور جعفری صاحب سڑک کے کنارے زمین پر بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؛ شوکت صاحب نے جواب دیا گھر میں گھٹن لگ رہی ہے۔ سڑک پر اس لیے آ کے بیٹھ گئے ہیں کہ آتے جاتے لوگوں کی وجہ سے ہوا لگتی ہے۔

ایک اور بات یاد آئی — یہ جو میں نے آپ کو تصویر دکھائی تھی۔ جس میں شوکت صاحب صدر سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ اس کا بھی ایک لطیفہ ہوا تھا۔ صدر نے ازرہِ پیار کہا — "شوکت تو بھی اپنے سفید بالوں سے ڈرا رہا ہے؟" تو شوکت صاحب نے برجستہ کہا تھا — "جی نہیں، آپ زیادہ ڈرا رہے ہیں —" اس پر صدر بھی ہنس دیئے تھے اور باقی سامعین بھی۔ یہ تھیں وہ ساری باتیں جن کی وجہ سے وہ [illegible] مسرور رہتے تھے۔"

"بھابی! ساری بیویاں اپنے شوہروں کی تعریفیں ہی کرتی ہیں۔ مگر ہر شوہر میں کچھ نہ کچھ ایسی بھی باتیں ہوتی ہیں۔ اگر آپ تھوڑی سی ہمارا اور تھوڑی سی عام عورتوں سے اونچی ہو کر اس ضمن میں بھی روشنی ڈالیں تو اچھا ہو۔"

"طفیل صاحب! کمزوریاں ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ مگر شوکت صاحب کی خوبیاں ان کی کمزوریوں پر غالب تھیں۔"

"بھابی! آپ نے یہ جواب دے کر میرے ہی سوال کو تقویت پہنچا دی۔ جب شوکت صاحب کی خوبیوں کی بات چلی تو آپ نے فوراً چند ایک بڑی اچھی باتیں بتائیں۔ جب کمزوریوں پر کچھ کہنے کے لیے کہا تو یہ کہہ کر گزرنا چاہ رہی ہیں کہ کمزوریوں پر خوبیاں غالب تھیں۔ تو وہ کمزوریاں کیا تھیں جن پر خوبیاں غالب تھیں؟"

"طفیل صاحب میرا یہ خیال نہ تھا کہ آپ بھی شوکت صاحب کے دشمنوں میں سے نکلیں گے۔ ایسی کرید کرید کے برائیاں تو دشمن ہی نکالا کرتے ہیں۔ میں کوئی ان کی دشمن تھوڑی ہوں کہ ان کے کیڑے ڈالنے بیٹھ جاؤں۔ وہ اچھے تھے۔ ہر طرح اچھے تھے۔"

"میں کہتا ہوں۔ وہ برے تھے۔ ہر طرح برے تھے۔ پھر؟"

"توبہ ہے صاحب! لیجئے ان کی برائیاں بھی سن کے خوش ہو جائیے۔ ابھی جو میں نے کہا تھا کہ ان کی برائیوں پر خوبیاں غالب تھیں تو وہ بات غلط نہ تھی — شوکت صاحب کو اپنی برتری جتانے میں خاص لطف ملتا تھا۔ ایک بار ہم کسی کے ہاں دعوت پر گئے۔ بیٹھے بیٹھے کسی نے وقت پوچھا۔ کسی نے کہا نو بجے ہیں۔ شوکت صاحب نے کہا نو بج کے دس منٹ ہوئے ہیں۔ وہ صاحب کہیں میری گھڑی ٹھیک ہے۔ یہ کہیں میری گھڑی ٹھیک ہے۔ یہ تکرار کہ میری گھڑی ٹھیک ہے۔ میری گھڑی ٹھیک ہے [illegible] جاری رہی۔ بالآخر شوکت صاحب نے غصے میں آکر کہا اگر میری گھڑی غلط ہوئی تو اسی وقت توڑ دوں گا اور یہ کہتے ہی گھڑی کلائی سے اتار لی۔ ٹیلیفون کر کے وقت پوچھا گیا تو شوکت صاحب کا ٹائم ٹھیک تھا۔ اگر شوکت صاحب کی گھڑی کا وقت غلط

تھا تو جس وقت سلطانہ سوئی گھڑی توڑ دیتے۔ کسی زمانے میں شوکت صاحب رات بہت گئے تک لکھتے تھے اس وجہ سے صبح دیر تک رہتا تھا مگر یہ شوق بھی وہ دوستوں کی خوشنودی کے لیے ہی پورا کیا کرتے تھے۔ کیونکہ صاحب تو یہ ہے۔ رات کیا ہوتی تھی ایک میلہ لگتا تھا۔ وہ دو دن بیٹھتے۔ تین تین دن بیٹھے ہیں۔ زیادہ تر یہ ان دنوں ہوتا تھا جب جگر صاحب آتے تھے ورنہ کیا تھے۔ یوں دنیا کو بھول کر نہ کھیلتے تھے۔ بعد میں میں نے طریقوں طریقوں سے یہ عادت بھی چھڑا دی تھی۔ اس کے بعد وہ میرے شکر گزار بھی رہے ——— عقیل صاحب! شوکت صاحب اپنی زندگی کے آخری پانچ برسوں میں اتنے بدل گئے تھے کہ میں پہلے جب وہ بیمار سے اچھے ہو گئے تو پھر ان کی برائیوں کا ذکر بھی بیجا معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے ان میں ایسی خرابیاں بھی نہ تھیں جو بہ طور خاص زور دیا جائے ——— اچھا تو بھابی اب یہ بتائیں کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ شوکت صاحب کے تعلقات بڑے لوگوں سے زیادہ تھے اور چھوٹے درجے کے لوگوں سے نہ تھے یا کم تھے۔"

"عقیل صاحب آپ پھر پھر کے باتیں تو وہی کرتے ہیں۔ مگر آپ نے اپنے خیال کے مطابق تجزیہ کو بدل دیا ہے۔ جیسے کہ تو یہ معلوم ہے کہ وہ گھر کے ملازم اور دفتر کے چپراسی کو بھی اتنا ہی عزیز رکھتے تھے۔ جتنا کہ کسی اور کو۔ بات یہ ہے کہ وہ چھوٹے لوگوں سے ملتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ شرارتیں کرتے تھے تو لوگ کہتے تھے۔ تختۂ مشق بناتے ہیں۔ بڑے لوگوں سے ملتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ شرارتیں کرتے تھے تو لوگ کہتے تھے۔ خوشامد کرتے تھے۔ یہ دنیا عجیب و غریب ہے۔ کیا کیا جائے۔"

"بھابی اس دنیا کے عجیب و غریب ہونے میں تو کوئی شک نہیں۔ اس معاملے میں آپ کا تجزیہ بالکل صحیح ہے۔ دنیا مطمئن کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی ——— آپ سوچ رہی ہوں گی کہ میں الٹے سیدھے ہی سوال کرتا چلا جا رہا ہوں۔ مگر میں کیا کروں۔ بعض باتیں میرے ذہن میں صاف نہیں ہیں۔ اوروں کے ذہن میں بھی صاف نہیں ہیں۔ اس لیے پوچھنی پڑ رہی ہیں۔ مگر آپ یہ سوچ رہی ہیں کہ آپ کو صرف شوکت صاحب کی مدافعت ہی میں کچھ کہنا چاہیے۔ یہ جذبہ غلط ہے۔"

"جی ہاں آپ کا یہ جذبہ بڑا صحیح ہے کہ شوکت صاحب کے بارے میں آپ نے کوئی ایسا سوال نہیں پوچھا جس سے میری بھی خوشی وابستہ ہو۔" "عقیل صاحب! حد ہو گئی۔ گویا میں شوکت صاحب کا دشمن ٹھہرا۔ آپ کا یہ خیال ٹھیک ہوگا مگر میں اس کے بارے میں خود سے کیا کہوں۔ بہرحال آپ مجھے شوکت صاحب کا دشمن ٹھہرائیں، لڑیں یا ناخوش ہوں۔ مگر میں چند ایک باتیں ضرور پوچھوں گا۔"

"پوچھیے۔ پوچھیے۔"

"یہ بتائیں کہ شوکت صاحب اپنے سے بہتر لکھنے والا کسی کو نہ سمجھتے تھے۔ جبکہ ان سے بھی بڑے لکھنے والے موجود تھے اور ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"شوکت صاحب نے اس قسم کی کوئی بات میرے سامنے کبھی نہیں کی۔ اس لیے اس کے بارے میں میں کیا بتا سکتی ہوں مجھے۔ وہ صدر درجہ مقبول مصنف تھے۔ ان کی کتابیں خوب بکتی تھیں۔ اس لیے اگر انھوں نے ایسا سوچا ہو تو غلط بھی نہ سوچا ہوگا۔ بہرحال انھوں نے میرے سامنے کبھی نہیں کہا کہ میں سب سے بڑا لکھنے والا ہوں۔"

"جس وقت آپ کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت آپ کی صحت بڑی اچھی تھی۔ بعد میں خراب ہوئی۔ اس کی وجہ کوئی گھریلو پریشانی تھی؟"

"اوّل تو یہ سوال شوکت صاحب کے بارے میں نہیں ہے۔ اگر اسے کسی بھی طریقے سے شوکت صاحب ہی سے متعلق سمجھ لیا جائے تو میں

ورنہ میں [illegible] صحت کا [illegible] کوئی تعلق شعر و [illegible] پتا نہیں ہے [illegible] بچوں کی پیدائش، گھر چلانا، شاعروں اور ادیبوں کی عادات [illegible] ان کی عادات و معمولات کے بارے میں [illegible] کمزوریاں، ان سب باتوں سے غافل کہ میری صحت کا اس پر [illegible] ہے۔ پھر بھی [illegible] مجھے [illegible] کبھی خیال تھا کہ [illegible] اور میری [illegible] سمجھ [illegible] ہے مگر شوکت صاحب [illegible] رہے [illegible] جب شوکت [illegible] تو [illegible] خوب [illegible] کے ساتھ [illegible] طرح [illegible] ورنہ [illegible]

— آپ کو [illegible] ہوں گی [illegible] بڑی [illegible] ہے — ہاں تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ حکومت نے آپ کی کس حد تک مدد کی ہے۔ کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

— بیگم صاحبہ: بات یہ ہے کہ [illegible] ہے۔ جب [illegible] نے ہم سے شوکت صاحب کو چھین لیا تو ہماری اس سے بڑھ کر اور کیا بدنصیبی ہو گی۔ [illegible] کرتے ہیں۔ مجھے جس طرح بھی جینا ہے جی لوں گی۔ اس لیے کہ اکیلی میری جان کا سوال نہیں ہے۔ تین معصوم بچیوں کا ساتھ ہے۔ ان کے مستقبل کا سوال ہے۔ شوکت صاحب تو انھیں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ میں ان کے [illegible] کی خوشیوں کو پورا کیسے کر سکوں گی۔۔۔ حکومت نے [illegible] وجہ سے [illegible] ہو گئے۔۔۔ مگر [illegible] بچیوں کی تعلیم [illegible] کا [illegible] ہو گیا ہے۔۔۔ یہ سوال میرے علاوہ [illegible] صاحب [illegible] سوچنے کا ہے۔

میں شوکت صاحب کی بیگمات کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے دکھوں اور رنج بھری یادوں کے باوجود میری باتیں سنیں اور ان کے جوابات عنایت فرمائے۔ الفاظ کی حد تک یہ سلسلہ [illegible]۔ مفہوم کی حد تک، میں نے مرحوم کی بیگمات کا ساتھ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اتنی اہم معلومات کو بھی معتبر نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ یہ ممکن ہے کہ کہیں کہیں میں نے مفہوم کے اخذ کے سلسلے میں کوتاہی کا ثبوت دیا ہو۔ اس لیے اس گفتگو کے سلسلے میں اتنی بھی عجیب سی باتیں آپ کے ذہن میں ابھریں، انھیں بے تکلف میرے کھاتے میں ڈال دیجئے گا۔

اس گفتگو کے سلسلے میں میرے لیے بڑی مشکلیں تھیں۔ بہت سی باتوں کو جانتے بوجھتے ہوئے میں نے پوچھا تاکہ میرے ذہن میں وہ باتیں زیادہ صاف ہو جائیں اور آپ کے لیے "انکشاف" کا درجہ رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں کئی مواقع ایسے آئے کہ بیگمات میرے سوالوں کو سن کر سٹپٹا گئیں، اور میرے خلوص پر بھی شبہ ہوا مگر میں سر نیہوڑائے وہ ساری باتیں کر گزرا، جو میں کرنی چاہتا تھا تاکہ مرحوم کی شخصیت کے وہ پہلو سب کے سامنے آ جائیں جو ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ازبس ضروری تھے۔

میں نے اُن باتوں کی بھی وضاحت چاہی۔ جو شوکت صاحب کے کمزور پہلو تھے۔ ہم دور کے تماشائی، جو کسی شخصیت کو پوری طرح نہ جانتے ہوئے، اعتراضات کر بیٹھتے ہیں ـــــ اُن کی صراحت بھی تو مطلوب تھی ـــــ اور اس کے ساتھ ساتھ، میرا مدعا یہ بھی تھا کہ معلوم کروں کہ بیویاں اپنے شوہر کے بارے میں کس حد تک حسن ظن رکھتی ہیں۔ سو الحمد للہ شوکت صاحب کی بیویاں

سو آپ نے پوری باتیں ـــ جذبے میں، معلومات میں! ـــ مگر بتا دیں، دیکھئے، میں نے آپ کی خاطر کتنا طویل لکھ دیا۔

سبھی یہ کہہ رہے ہیں کہ شوکت تھانوی مر گئے۔ ایسے ہی ہوگا، مگر میں تو یہ سن رہا ہوں کہ آج کے دانشور اس امر کی بھی کوشش کر رہے ہیں کہ ہزاروں برس پہلے کی آوازوں کو بھی سنوا دیا جائے۔ جب انسان کسی نہ کسی روپ میں باقی ہے تو پھر اُسے مردہ کیوں کہیں!

میں انسان کی عظمت اور اس کی صلاحیتوں پر یقین رکھتا ہوں۔ اس کے باوجود یہ کہنے کی جسارت کروں گا ـــ آدمیوں کے اس بھرے جنگل میں شوکت صاحب ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوں گے۔

میرا بھیا

خاتون ارشد

میرا بیرن بچپن ہی سے ذہین تھا۔ عجیب عجیب حرکتیں سوجھتیں وہ بھی ایسی جن سے دوسرے لوگ جلتے خفا ہوتے ہنسنا شروع کر دیتے۔ ہم جتنا اُسے چڑاتے وہ اتنا ہی ہمیں ستاتا۔ تنگ کرتا۔ جب بھی اس کی شرارتوں پر ڈانٹ پڑتی رہتی۔ ہماری ایک تائی اماں تھیں۔ بیچاری کانوں سے بہری اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے کچھ کچھ سنکی ہو گئی تھیں سیدھی سادی تو وہ شروع ہی سے تھیں ہمارے تایا جو ہمارے ابا سے بڑے تھے مدت ہوئی ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے اور ۲۵-۳۰ برس سے لندن میں مقیم تھے۔ اس واقعے نے تائی اماں کی دماغی حالت خراب کر دی۔ پھر بھی وہ ان کی واپسی کی لو لگائے بیٹھی تھیں۔ محمد عمر یعنی شوکت کی عمر کوئی ۱۱ سال کی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ماموں زاد چھوٹے بھائیوں کو سکھا پڑھا کر تیار کر کے بابا آ گئے۔ اور خود سوٹ پہن کر ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ مغرب کا وقت تھا کچھ اندھیرا ہو چلا تھا تائی اماں بیچاری کو یقین آ گیا کہ سچ مچ ان کے میاں آ گئے۔ اور خوش خوش بیٹھ گئیں اور سر پر سے دوپٹہ ماتھے پر کھسکا کر گھونگھٹ کی طرح کر لیا۔ کچھ منٹ انتظار کرنے کے بعد گردن موڑ کر کن انکھیوں سے دیکھا۔ تو بھتیجے کو دیکھ کر پیٹھ پر دوہتڑ مار کر کہا مجھ کو بنانے چلا ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک کاغذ پر کچھ خانے بنائے اور اس میں کچھ ہندسے لکھے اور تعویذ کی طرح موڑ کر ان کے تکیہ میں رکھ دیئے۔ جب دوسرے دن دھوبی کو کپڑے دیئے جانے لگے اور تکیہ کا غلاف اتارا گیا تو وہ تعویذ نکلا۔ تائی اماں بیچاری پرانے زمانے کی عورت تھیں تعویذ گنڈوں اور جادو ٹونے کی بہت معتقد تھیں۔ بدحواس ہو کر رونے لگیں۔ کہ کسی نے میرے اوپر سفلی عمل کیا ہے۔ اب مجھ پر کچھ ہو جائے گی۔ میری اماں انکی دیورانی تھیں اور ان کی پوزیشن بہت نازک تھی۔ اس لیے کہ وہی ان کو ساتھ رکھے تھیں۔ اور کفالت کرتی تھیں وہ پریشان ہو گئیں کہ کہیں ان کو یہ بدگمانی نہ ہو جائے کہ میرا بوجھ ٹالنے کے لیے دیورانی نے تعویذ گنڈے کئے ہیں۔ ان کو پریشان دیکھ کر میں نے کہا ہو نہ ہو یہ حرکت محمد عمر کی ہے۔ ماموں زاد بھائی جو ان کے شریک تھے وہ کیوں بتلاتے۔ تائی اماں کو میں نے سمجھایا مگر ان کے پاس تو یہ تعویذ دستاویزی ثبوت موجود تھا۔ میں نے اُسے لے کر دیکھا اور فوراً کہا اسے یہ تعویذ تو سلمان الارشد کے لیے ماموں نے دیئے تھے (سلمان الارشد میرا بڑا لڑکا اس وقت شیر خوار تھا) یہ میں کہیں رکھ کر بھول گئی تھی پھر انہیں کے سامنے کپڑے میں باندھ کر

سلطان کے گلے میں ڈال دیا۔ تب جاکر نانی اماں کو سکون ہوا۔ اب بھیا کی گوشمالی بھی کرنا تھی۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔ میں جتنا چاہتی تھی اتنا ہی ڈانٹتی بھی رہتی تھی۔ بیلنے سے جاکر خوب پیٹا تھا۔ اور کہا کہ اگر ابا کو خبر ہو گئی تو خوب پٹائی ہو گی۔ ان حضرت کو چھٹپن ہی سے صاحب بہادر بننے کا بہت شوق تھا اماں ابا سے اور خوب ضد پوری کرا لیتا تھا مگر والد صاحب (منشی صدیق احمد) اس شوق پر کہتے تھے کہ جب تک تم میٹرک نہیں کرو گے سوٹ نہیں پہن سکتے۔ ۱۵ سال کی عمر تھی یہ میرے پاس اچھاور آئے۔ یہ ریاست بھوپال کا ایک بڑا تھانہ ہے۔ اور میرے شوہر راشد تھانوی جو شوکت کے چچا زاد بڑے بھائی ہیں وہاں سب انسپکٹر تھے۔ شوکت نے ان سے کہا کہ بھائی جان مجھے بھی ایک سوٹ سلوا دیجیے۔ راشد صاحب خود ابا سے ڈرتے تھے۔ کہنے لگے چچا جان خفا ہوں گے کہتے تھے شوق قبل از وقت پیدا کرتے ہو۔ لیکن میری سفارش پر انھوں نے سوٹ بھی تیار کرا دیا اور میرے کہنے پر ہیٹ بھی منگا دی۔ بھیا بہت خوش ہوئے ان کے بھائی جان (راشد تھانوی) ان کو گھوڑے کی سواری بھی سکھایا کرتے تھے۔ آدمی لگام پکڑے ساتھ رہتا تھا۔ پھر بھی شوکت اس سے کتراتے تھے۔ مگر سوٹ پہن کر ہیٹ لگانے کے بعد خود ہی سائیس سے جاکر گھوڑا تیار کرایا۔ اور سوار ہو کر قصبہ میں گھومے۔ واپس آئے تو مجھ سے کہا کہ باجی دیہاتی عورتیں مجھے گھوڑے پر آتے دیکھ کر گھبرا گئیں اور ایک دوسرے سے کہنے لگیں ہٹو ہٹو صاحبوا آرہا ہے۔ میں جانتی تھی۔ یہ بات غلط ہے۔ ذرا بھوپال میں صاحبوا کوئی نہیں کہتا یہ پوربی بولی ہے۔ مگر اپنے بھیا کا دل رکھنے کو میں نے کہا۔ تم مجھے بھی تو صاحبوا معلوم ہوتے ہو۔

ایک روز ان کے بھائی جان نے کہا کہ صاحب اگر شیر کا شکار بھی کرتے ہیں تم صاحب تو ہو گئے ہو مگر بہادر نہیں بنے آؤ تمھیں بندوق چلانا سکھائیں پھر تم صاحب بہادر بن جاؤ گے۔ تھانہ کے پیچھے ایک میدان تھا وہاں لے جاکر اپنے آگے بٹھایا اور بندوق ہاتھ میں لے کر شوکت سے چلوا دی۔ اس کا ایک ہلکا سا جھٹکا کندھے کے قریب چھاتی پر لگا بندوق پھینک کر دوڑ کر گھر میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بھائی جان سے کہہ دیجیے کہ میں صرف صاحب بننا چاہتا ہوں صاحب بہادر بننا نہیں چاہتا۔ پھر کبھی بندوق کی مشق نہیں کی اور گھوڑے پر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔

۱۹۲۶ء کا ذکر ہے۔ شوکت میرے پاس سیکلون آئے۔ یہ ریاست بھوپال کی ایک دور افتادہ تحصیل ہے۔ راشد صاحب وہاں تحصیلدار بھی تھے اور مجسٹریٹ پرگنہ بھی۔ اتفاق سے تحصیل کی عمارت کی مرمت ہو رہی تھی۔ اور راشد صاحب سکونتی مکان کے بیرونی حصے میں اجلاس کیا کرتے تھے شوکت وہاں جاکر بیٹھ جاتے تھے اور مقدمات کی کارروائی دیکھتے۔ ایک دن ایک ہندو عورت کا بیان لیا گیا اس کو سن کر عورت نے ہندی میں تیزی سے دستخط کر دیئے۔ شوکت یہ دیکھ کر تیزی سے اندر آئے اور مجھ سے کہنے لگے باجی کمال ہے۔ یہاں کے دیہات کی عورتیں بھی انگریزی جانتی ہیں شوکت نے دور سے یہ دیکھا تھا کہ عورت نے بائیں سے دائیں کو قلم چلایا۔ انگریزی اور ہندی کی تحریر بھی اسی رخ سے ہوتی ہے وہ اس کو انگریزی سمجھا جب رات کو کھانے پر راشد صاحب سے اس کا ذکر ہوا تو انھوں نے اس غلط فہمی کو باقی رکھا۔ اور شوکت کو جو اسکول میں زیر تعلیم تھے کہا جب تم روانی سے انگریزی لکھنے لگو گے اور فر فر انگریزی بولنے لگو گے تو سیکلون

بس اگر نہ مانے ان لڑکی سے تمھاری شادی کر دیں گے۔ اس وقت تو شوکت کچھ سوچ کر چپ ہو رہے اور بعد میں ہم ان کو چڑاتے رہے۔

لکھنؤ میں جب یہ خبر پہنچی تو گھر والوں نے ان کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ذرا ذرا سی بات پر چڑنے لگے۔ برداشت نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو ان کے لڑکپن کی باتیں ہیں۔ جوانی میں بھی ان کی شرارتیں پوری دلچسپی کے ساتھ جاری رہیں۔ بھوپال کے سلیمان حلوائی کا قلاقند ان کو بہت پسند تھا۔ جب وہ بھوپال سے سالگرہ جشن کے بعد گئے۔ جب لکھنؤ گئے تو ان کے لیے بھوپال کا قلاقند بھی لیتے گئے۔ میرے خالہ زاد بھائی مولوی محمد عثمان صاحب، ارشد صاحب کی بہت دوستی تھی یہاں ان کے لیے بھی قلاقند بھیجا تھا۔ جب لکھنؤ میں قلاقند گھر میں آیا تو بھائی عثمان کا حصّہ الگ کر کے باقی ختم کر دیا۔ ارشد صاحب نے شوکت سے کہا کہ دیکھو تم بھائی عثمان کے حصّہ میں سے نہ چرانا۔ اس پر شوکت نے کہا آپ کو جو یقین نہیں تو بھائی عثمان کے حصّے کے ٹکڑے گن گن کر رکھ دیجئے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب دوسرے روز رات کو کھانا کھانے بیٹھے تو شوکت نے کہا کہ دسترخوان پر کچھ میٹھی چیز بھی تو ہونا چاہیے۔ پھر خود ہی بھائی عثمان کے حصّہ میں سے قلاقند لا کر رکھ دیا۔ ارشد صاحب نے دیکھ کر کہا کہ گھر کا قلاقند تو ختم ہو چکا تھا تم نے ضرور بھائی عثمان والا قلاقند چرایا ہے۔ شوکت نے جواب دیا کہ آپ اپنے قلاقند کے ٹکڑے دیکھ کر گن لیجئے۔ الماری کھولی گئی تو ٹکڑے تعداد میں پورے تھے۔ مگر جب کچھ شک ہوا اور ان کو اٹھا کر دیکھا تو اس کی موٹائی کم تھی۔ جناب سالگرہ جشن آفیسر صاحب نے رات کو کسی وقت اٹھ کر نیچے سے آدھے آدھے ٹکڑے چاقو سے تراش لیے تھے۔ راز فاش ہونے پر شوکت بولے یہ آج کل کی بہنیں ہیں کہ بھائی کی پردہ پوشی کرنے کے بجائے اس کو مجرم بناتی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ مزیدار بات یہ ہے کہ ارشد صاحب لکھنؤ سے بھوپال سندیلے کے لڈو لے کر آئے۔ یہ لڈو بطور تحفے کے دور دور کے شہروں تک جاتے ہیں اور کوری ہانڈیوں میں رکھ کر فروخت کیے جاتے ہیں۔ ہانڈیوں کے منہ پر لال کپڑا رکھ کر ڈوری سے باندھ کر گرہ پر لاکھ کی مہر لگا دی جاتی ہے۔ بھوپال آکر دو چار روز ہوئے تھے کہ ۳۔۴ دن بعد نواب صاحب کی جشن سالگرہ میں شرکت کی غرض سے شوکت بھی آ گئے۔ گھر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ ارشد صاحب نے کہا کہ تیسری ہانڈی بھی کھولو۔ شوکت جلدی سے بولے میں اس میں سے لڈو کھا چکا ہوں۔ میں نے حیران ہو کر کہا کہ یہ تو سربمہر ہے۔ اور لکھنؤ سے جیسی لائی ہوں ویسی ہی رکھی ہے کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ شوکت نے کہا اچھا آپ کو یقین نہیں آتا تو کھول کر گن کر دیکھ لیجئے کہ ان کی تعداد پوری ہے یا کم ہے۔ میں نے مہر دیکھی لگی ہوئی تھی ہانڈی کھولی گئی اور گننے لگے تو مقررہ تعداد سے واقعی دو کم نکلے۔ اب سب کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیا جادو کیا ہے۔ آخر ان ہی جادوگر صاحب نے بتایا کہ لکھنؤ میں جب یہ ہانڈیاں خریدی گئی تھیں اور روانگی سے ایک دن پہلے گھر میں رکھ دی تھیں۔ تو میں نے آدھی رات کو اٹھ کر ہر ہانڈی میں سے دو دو لڈو نکالے۔ اور پھر دفتر میں پیچھے سے اپنی مہر لاکھ لا کر لگا دی۔ اب آپ کو تو سربمہر ملیں کیسے شبہ ہوتا۔ اس پر ہم لوگ ہنسنے لگے کہ ماشاء اللہ بھیا کو چوری کا سلیقہ خوب آگیا ہے۔ حالانکہ مقصد قلاقند یا لڈو کھانا نہیں ہوتا تھا بلکہ سب کو حیرت میں ڈالنے کے لیے اس قسم کی حرکتیں ہوتی تھیں۔

بعض دفعہ مجھ کو بھی جوابی حرکتیں کرنا پڑتی تھیں۔ جیسا کہ ایک دفعہ ہوا۔

جب وہ لاہور پنچولی آرٹ پکچرز میں ڈرامہ نویس ہو کر آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی تبادلہ کیا گیا۔ یہ واقعہ غالباً سنہ ۴۹ء کا ہے۔ میں کسی ضرورت سے لکھنؤ گئی وہاں میرا لڑکا عمران الارشد پڑھتا تھا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ شوکت دلہن میری بھاوج بھی اپنی بیمار بہن کو دیکھنے آئی ہوئی ہیں۔ اور شوکت کی بھیجی ہیں جلد لاہور واپس جا رہی ہیں۔ میں اس اتفاقیہ ملاقات پر خوش بھی ہوئی اور جب سنا کہ دوسرے دن لاہور جا رہی ہیں تو گھبرائی بھی کہ میں آئی اور تم جا رہی ہو؟ انھوں نے کہا آپ بھی لاہور چلئے بھائی سے مل کر چلی جائیے گا۔ میں نے کہا صرف ایک ہفتے کے لیے آئی ہوں چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر زیادہ دن کیسے لگا دوں لاہور جاؤں گی تو شوکت جلدی سے واپس نہیں آنے دیں گے۔ ان کا اصرار بڑھا دل میرا بھی بھائی کو دیکھنے کو تڑپ رہا تھا۔ عمران الارشد (میرا لڑکا) نے کہا جائیے میں بھوپال جا کر کہے دیتا ہوں کہ ماموں جان کو دیکھنے لاہور چلی گئیں۔ میں تیار ہو گئی اور سعیدہ شوکت دلہن اور بابا میاں رشید عمر کے ہمراہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔ ریل میں ہم نند بھاوج نے ایک پروگرام بنایا اور بابا کو بھی جو چھوٹا تھا پیار محبت سے سمجھایا کہ ابا کو نہ بتانا کہ پھوپھی اماں آئی ہیں۔ میں نے کہا شوکت بہت تنگ کرتا ہے اب کی اس کو بھی ستانا ہے۔ جب لاہور اسٹیشن قریب آیا تو برقع کی نقاب اچھی طرح ڈالی۔ جب لاہور کا اسٹیشن آ گیا تو شوکت اور منجھلا لڑکا خورشید اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ ڈبے میں سے متعدد خواتین اتریں، ان کے ساتھ میں بھی اتر گئی۔ اور چند قدم فاصلے سے دوسری عورتوں کے ساتھ گیٹ تک آئی بس ایک غلطی ہوئی کہ میرا ٹکٹ بھی سعیدہ شوکت دلہن کے ہاتھ میں تھا۔ جب وہ ٹکٹ دے کر گیٹ سے نکلنے لگیں تو شوکت نے کہا یہ دو ٹکٹ کیسے؟ گھبرا تو گئیں کہ راز نہ کھل جائے مگر سنبھل کر کہا ایک بیوی میرے ساتھ آئی ہیں ان کے ساتھ کوئی نہیں ہے یہ ان کا ٹکٹ ہے۔ میں نے جب یہ سن لیا تو پھر ساتھ ساتھ چلنے لگی جب تانگہ کرنے جانے لگا تو بھاوج نے کہا تین کر لو ان کا سامان بھی ہے۔ اور جب سب بیٹھنے لگے تو میں جھٹ سے بھاوج کے برابر بیٹھ گئی وہاں شوکت خود بیٹھنا چاہتے تھے۔ برا لگا مگر دوسرے تانگہ میں بیٹھ گئے بابا کو بلا کر بٹھانا چاہا تو ہم نے اس ڈر سے کہ یہ ناٹک جو ہو رہا ہے بچہ گڑبڑ نہ کر دے اپنے پاس ہی بیٹھا رہنے دیا شوکت چیں بہ جبیں ہو رہے تھے کہ بیوی نے ایک غیر عورت کو اپنے پاس بٹھایا، بچہ کو بھی نہ آنے دیا۔ اور میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ بہت دوسروں کو بیوقوف بنا کر خوش ہوتا ہے آج میں بھی خوب تنگ کروں گی حضرت کے تیور بدلے ہوئے تھے اور ہم دونوں کو ہنسی آ رہی تھی۔

شوکت دوسرے تانگہ میں پنچولی کی طرف چل دیئے اور ہم لوگ سیدھے گھر پہنچ گئے اور خورشید نے تانگے سے اترتے ہی کہا۔ امی جان ایک تانگہ واپس نہ کروں میری طرف اشارہ کر کے کہا، آپ کو ماڈل ٹاؤن بھی پہنچانا ہے (سعیدہ نے رستے میں کہا تھا یہ ماڈل ٹاؤن جائیں گی) شوکت دلہن بولیں نہیں بھائی اشارہ سے کہا چائے وغیرہ سے فارغ کر کے پھر لے کر جانا۔ خورشید کو بہت ناگوار گزر رہا تھا کہ ماں کو تو دیکھو کیا ہو گیا ہے۔ خورشید نے گھر میں جب سب آ کے سامان اتروا لیا تو اکیلے میں ماں سے کہا آپ کو معلوم ہے ابا ناخوش ہو رہے ہیں اسی لیے سیدھے گھر نہیں آئے

یہ ہے تمھاری بہنوں کا خواب ساتھ لگا لیے ہیں۔ پھر اس عورت کے چلے گئے تب میں جاتا ہوں جب یہ
تو ہم [illegible] شوکت دیکھنے کی بڑی بیتاب تھی۔ اس بیچاری کے ساتھ کوئی نہیں آیا تو اسٹیشن
پر مجھ کو جانا پڑا [illegible] سے پہنچا آتا۔ میں اس وقت بیٹھ رہو میں چلی گئی تھی۔ اور شوکت کی آمد کی انتظار
نے کیا۔ آپ [illegible] کی دیکھ لے اور جانا تو پھوٹ جائے۔ خوب خدا نے کہا ارے بھائی جان آپ نے غضب کیا
میں [illegible] کپڑے تبدیل کر لیے وہاں کہیں بٹھا دیا سب کمرے میں بیٹھ جائے۔ بیمار شدہ سے
اگر وہاں جائیں گے
شوکت کی آمد کا انتظار تھا جب آدمی جانے لگا تو کہا وہ بلا گئی یا ابھی ہے خیر گھر آئے تو بیوی نے کہا آپ رستہ میں
سے تھے۔ اشارہ سے بیوی سے پوچھا وہ گئی۔

میں نے سوچا کہ کہیں پھر نہ حضرت چل دیں اب کھیل ختم کرنا چاہتے ہیں نے پیچھے سے اگر دونوں آنکھوں
پر ہاتھ رکھ دیئے کہ [illegible] آنکھیں بند کر کے پلٹ کر مجھ کو دیکھا تو دیوانہ وار ہنس دیا
میری باجی تم کہاں سے آ گئیں مجھ کو اتنا پریشان کر [illegible] کیا۔ بیوی سے کہا اتنی کوفت دی ہے
دل چاہتا تھا اس عورت کا [illegible] اور نکال دوں۔ ہم دونوں نے کہا اگر ایسا تو پھر تم کامیاب ہوتے
ہماری اسکیم فیل ہو جاتی۔ بہت میاں سب کو ستاتے ہیں آج پتہ چلا دوسروں کو کتنی کوفت ہوتی ہے تم کو مزہ
آتا ہے۔

بیوی سے کہا اتنی کوفت تم نے دی انھوں نے کہا ایک تو آپ کی بہن کو لے آئے اور آپ کو غصہ آ رہا تھا
کہنے لگے پتہ بھی ہو کہ میری باجی آ گئی بلکہ میرا تو غصے کے مارے برا حال تھا اچھا ہوا ورنہ اب اور تم لوگ تنگ کرتے
تو بغیر کھانا کھائے چلا جاتا کہ اب اس بلا کو گھر میں رکھو جب چلی جائے گی تب آؤں گا۔ اس پر میں نے کہا آج
ہی جاتی ہوں مجھ کو سوار کرا دو کہنے لگے جی ہاں جتنا مجھ کو تنگ کیا اتنا ہی تنگ کر کے جانے دونگا۔ میں نے کہا اچھا
اب سنو کہ راستہ میں یہ سب پروگرام بنایا ورنہ مجھ سے کہاں ضبط ہو رہا تھا۔ کہنے لگے جی ہاں جیسے تو تنگ کیا ہے۔
ورنہ ہمیشہ رو کر لپٹ جاتی تھیں۔ اب آسانی سے تھوڑی جانے دونگا نہ بدلہ لیا ہو تو شوکت نام نہیں اب ایک سال
رہنا پڑے گا۔ میں نے کہا نہ بھیا چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر آئی ہوں کہنے لگے آج ہی بھائی جان کو لکھتا ہوں کہ
ہمارے یہاں جب تک وہ لوگ لینے نہ آئے لڑکی بھیجی نہیں جاتی یہ کہتا ہوں جب تک لینے نہ آئیں گے نہیں بھیجوں گا۔
اور یہی کیا کہا رشید صاحب کا جب بلانے کا خط آتا کہ لڑکیاں گھبرا رہی ہیں یہاں سے خط جاتا خود آ کے لے جائیے،
ورنہ نہیں بھیج سکتے۔ ہماری لڑکی کو تکلیف ہے ہم نے میکہ میں بٹھا لیا ہے۔

غرض ارشد صاحب کو آنا پڑا بجائے ایک دن کے ۲۵ روز روکے رکھا، روز بستر بچھتا، نہار ناشتہ تیار
ہوتا تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں ناشتہ سب کو کھلایا جا رہا ہے بستر کھولا جا رہا ہے۔ صبح کو جاگنے سے پہلے
ایک صاحب جو لکھنؤ کے تھے اور پنچولی میں ستار بجایا کرتے تھے اور داڑھی رکھنے کی وجہ سے شوکت ان کو مولانا
کہتے تھے ان کو پابند کیا تھا کہ روزانہ ستار لاؤ اور بھائی جان کے سرہانے کھڑے ہو کر بجاؤ۔ پہلے دن انھوں نے

پکھانا شروع کیا تو شوکت نے کہا کہ جاگیے حضور چائے میز پہ آگئی ہے اور پھر جگانے کا یہی طریقہ ہے ورنہ بھائی جان نہیں جاگیں گے۔ ان بیچارے نے ہلانا شروع کیا ارشد صاحب آواز سن کر جاگ گئے اور کہا شوکت یہ کیا بدمعاشی ہے شوکت بولے ہمارے یہاں تہذیباً پکارا نہیں جاتا۔ ایسے ہی جگایا جاتا ہے۔ غرض دن رات یوں ہنستے گزرتے تھے۔ وہ دن یاد آتے ہیں۔ اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میرا بھائی اب بھی زندہ ہے۔ اپنے سے اس کو جیسے کوسوں بچپن سے لے کر اب تک اس کی زندگی میری نظروں کے سامنے پھر رہی ہے۔ شوکت کیا مجھے چاہتا تھا اور اس کی ہر چیز ہر بات سے میں کیسا کیسا خوش ہوتی تھی۔

لڑکپن میں سب سے پہلے جب سائیکل چلانا سیکھی تھی تب مجھے پکارا تھا کہ باجی۔ باجی جلدی آئیے دیکھیے مجھ کو سائیکل چلانا آگئی اور باجی اپنے بھیا کی ہر بات سے مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی۔ دنیا کی کوئی ایسی بات نہ تھی جس میں باجی سے مشورہ نہ کیا جاتا ہو۔ باجی اور بھائی جان اس کی چیزوں سے جتنا خوش ہوتے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا جتنی داد ہر نئی ذہانت کی اس کو میں اور ارشد صاحب دیتے اور کوئی نہ دے سکتا۔ بڑے ہونے پر بھی وہ ہمارے ساتھ بچہ بن جاتا اور ارشد صاحب بھی اس کے ہم جولی بن جایا کرتے تھے حالانکہ وہ اس سے ۱۸ سال بڑے تھے۔

ایک بار ۲۶؁ میں جب لکھنؤ سے میرے پاس آیا تو ہم لوگ ریاست بھوپال کی ایک دور افتادہ تحصیل میں تھے اسی لیے اماں نے لیچیاں اور بہت سے پھل بھیجے تھے اور شوکت اپنے دونوں بھانجوں سلمان اور سلطان کے لیے گیند اور دو بیٹ اور ننھے عمران کے لیے ننھا بڑا سا کھلونا لائے۔ بڑی بھڑیں جن کو تتیا بھی کہتے ہیں۔ پھلوں کے ٹوکرے پر آ جا رہی تھیں ایک بھڑ ادھر آئی جہاں ہم سب بیٹھے تھے۔ ارشد صاحب بیٹ لے کر کھڑے ہو گئے بھڑ کو مارا وہ نیچے گری اور پاؤں بڑھا کر جوتے سے کچل دیا۔ اب بھلا شوکت سے کہاں صبر ہوتا دوسرا بیٹ لے کر وہ بھی کھڑے ہو گئے اور جس طرف بھڑیں آ جا رہی تھیں اس طرف جا کر کہنے لگے آئیے بھائی جان مقابلہ ہو جائے دیکھیں کون زیادہ بھڑوں کو مارتا ہے پھر کیا تھا دونوں بھائی جٹ گئے کچھ نہیں کچھ نہیں تو سو سوا سو بھڑیں مار ڈالیں اگر چائے نہ لگا دی جاتی تو معلوم نہیں کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ لیکن نتیجہ کسی کے حق میں نہ نکلا بغیر ہار جیت کے یہ بازی ختم ہو گئی۔

ایک روز بستی میں گھومنے گئے وہاں کچھ ہندوؤں کو چوسر کھیلتے ہوئے دیکھا گھبرا کر بولے ہم بھی چوسر کھیلیں گے چوسر منگوائی گئی اور کھیلنے والے کو بلا کر اس کے قاعدے سیکھے اور کئی روز تک یہی مشغلہ رہا۔ لکھنؤ جاتے وقت مجھ سے اس کی بساط سلوائی اور کہا کہ کوڑیاں اور گوٹیں لکھنؤ میں خرید لوں گا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کا خط آیا کہ پچیسی کے علاوہ میں نے شطرنج کی بھی مشق کر لی ہے اب کے آپ لکھنؤ آئیں گے تو اس پر بھی میری ذہانت کا اندازہ کیجیے گا۔ اور جب کچھ عرصے کے بعد ہم لوگ لکھنؤ گئے تو شوکت اپنے بھائی جان کے ساتھ پچیسی بھی کھیلتے رہے اور شطرنج بھی پھر جلدی اکتا گئے ادبی ذوق کی تکمیل کا وقت ضائع ہوتا تھا شوکت اور میں مزے مزے کی باتیں کرتے اور پھر وہ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور مضمون لکھتا ہم دونوں میں جو باتیں ہوتیں اسی پر مضمون تیار ہو جاتا۔ میں بھوپال میں چلی آتی تھی اور جب وہ مضمون چھپ کر آتا تو خاص طور سے مجھ کو بھیجتا۔

اپنے بھائی جان کے اتنے عاشق زار تھے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ لکھنؤ جانا جب میرا پہلا لڑکا، سلمان ارشد پیدا ہوا میں لکھنؤ میں تھی۔ اماں نے کہا اپنے بھائی جان کو اطلاع کا تار دے دو۔ لکھو نوزائیدہ بچہ خیریت سے ہیں۔ آپ کو ارشد صاحب کو بھیجنے کا موقع ملا تو آگیا اور تار میں اپنی طرف سے ترمیم کر دی کہ زچہ سخت بیمار ہیں فوراً آئیے ارشد صاحب نے گھبرا کر اسپیشل بھیجی اور لکھنؤ پہنچے معلوم ہوا سب خیریت ہے۔ جب پوچھا کہ ایسا تار کیوں دیا تو شوکت نے کہا آپ کو بلانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس سے ان کی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ تینوں لڑکوں میں ان کی خصوصیات الگ موجود ہیں۔ بڑا لڑکا سلمان ماموں کی طرح قد آور ہے دوسرا سعدان خوش گفتار ہے۔ چند گنی خوش لب سی ہیں بالکل ماموں کی طرح ہے تیسرا عمران اس میں ماموں کی وہ سنجیدگی ہے جو چھٹی بیٹھنے کے بعد وہ اختیار کر لیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے شوکت کو بھی ۳ بیٹے دیے ہیں ان کے نام ہیں اور ارشد صاحب کے بھتیجے ہیں لیکن شوکت کو لڑکی کی تمنا بہت تھی۔ ایک دفعہ لکھنؤ سے خط میں لکھا لڑکی پیدا ہوئی ہے زچہ بچی بخیریت ہیں مگر گزر رہی ہے۔ شوکت کو معلوم تھا کہ جب تک سعید عمر نہیں ہوا تھا تو بھائی کی اور دوسری بہن کو کتنی تمنا تھی اور ان کے ہونے کے بعد باجی زچہ ہوئیں مگر کہ بھتیجی بھی ہو اسی لیے یہ لکھا تھا کہ میں خوش ہو جاؤں گی۔ سب کو لکھا جب لکھنؤ آئیں گی تو کہاں سے لڑکی دکھاؤ گے کہنے لگے دو تین روز میں لکھ دوں گا کہ ختم ہو گئی تو عادت کے تحت سے نکلا خدا نہ کرے کہنے لگے اچھا ہو گی ہی نہیں اور کیا مانتی ہو۔

خدا نے اس کی یہ تمنا بعد کو پوری کر دی لاہور میں جب [illegible] خاتون سے شادی ہوئی تو سب سے پہلے بچی ہوئی جس کا نام برسوں پہلے سے ہی شوکیہ رکھ رکھا تھا۔ اس کے بعد دوسری بچی فوزیہ پیدا ہوئی پھر تیسری شاہدہ۔ اس طرح انسانیت کا حساب برابر رہا یعنی پہلی بیوی کے ۳ لڑکے سعید عمر۔ خورشید عمر۔ رشید عمر۔ دوسری بیوی کے ۳ لڑکیاں شوکیہ، فوزیہ شاہدہ۔ بچیاں بڑی پیاری معصوم ہیں مگر ان پر سے اللہ میاں نے باپ کا سایہ جلد اٹھا لیا۔ ان بچے بچیوں سے اس لیے بھی محبت ہے کہ ان میں بہت چیزیں شوکت کی ہیں۔ اور خود اپنے بچوں میں جب یہ خصوصیات دیکھتی ہوں تو ان کو بھی اس لیے چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کی یہ چیزیں ان میں موجود ہیں۔ شوکت کو اس لیے چاہتی تھی کہ اس میں بہت سی چیزیں ابا کی تھیں ابا جب یاد آتے تھے تو بھائی کو دیکھ کر دل کو تسلی دیتی تھی کہ باپ نہ سہی بھائی تو موجود ہے۔ اب میں کیا کروں کیسے یقین کروں میرا بھیا ہمیشہ کے لیے مجھ سے روٹھ گیا۔ میں بدنصیب اپنی شدید علالت کی وجہ سے دیکھ بھی تو نہ سکی کیسے دل کو سمجھاؤں دل یقین نہیں کرتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا میرے باپ کے گھر کا چراغ گل ہو گیا۔ میرے دل پر قیامت گزر رہی ہے مگر پھر سوچتی ہوں نہیں اس کے لڑکے اس کی لڑکیاں سب اسی چراغ سے چراغ روشن ہوتے ہیں ان کو کلیجے سے لگاؤں دل کو سمجھاؤں ہائے میرے بھیا تو کہاں ہے تیری ماں جائی تڑپتی ہے تو صرف تنہا بھائی تھا بتا کیا کروں تجھ کو کس طرح بھلاؤں ہائے میرا بھائی کہاں چلا گیا۔ رات رات بھر آنکھوں میں کاٹتی ہوں۔ تجھ کو کسی نے یہ تک نہ بتایا کہ ماں جائی سخت بیمار ہے۔ ہائے سوچا ہو گا کیسی بہن ہے جو نہیں آئی۔ معلوم نہیں کیا کیا سوچتی ہوں روتی ہوں کیا کروں، اللہ تو بتا کیا کروں۔ سعید، خورشید، رشید۔ شوکیہ، فوزیہ، شاہدہ تم نہ روؤ مجھ کو رونے دو اپنی پھوپھی کو دھاڑیں مار مار کے رو تڑپنے دو۔ میرا تو صرف ایک بھائی تھا اب کچھ نہیں۔ تم بچے ہو تم چھ بھائی بہن ہو اپنی اماں کو تسلیاں دو ان کے کلیجے

سے لگ جاؤ ہوش سنبھلنے کی کوشش کرو۔ میرا دل تڑپ رہا ہے اب لکھا نہیں جاتا کیسے یقین کروں کس طرح دل کو سمجھاؤں۔ دل چاہتا ہے آنکھ کھل جائے اور یہ سب خواب ہو میرا بھائی زندہ ہو کاش ایسا ہو سکتا۔ کراچی سے جانے کے بعد میں نے دیکھا ہی نہیں بہت دل کو سمجھاتی ہوں کہ وہ تو پنڈی ہی میں ہے نہ یقین کروں ہائے میرے قلم سے آج تک لفظ مرحوم نہیں نکلا کیسے لکھوں۔ میں نے تو یہ پروگرام بنایا تھا کہ لڑکیوں کی چھٹیوں میں پنڈی جاؤں گی اب کس کے پاس جاؤں پیارا بھائی اب کبھی دیکھنے کو نہیں مل سکتا۔ کبھی نہیں مل سکتا۔

ہائے شوکت تو کہاں چلا گیا!

شوکت سلمہٗ

(جواب مرحوم مغفور ہو گیا)

ارشد تھانوی

طفیل صاحب! شوکت نمبر کے لیے جو کچھ لکھا، یہاں ہے۔ بعض حصے سابقہ مضمون سے ماخوذ ہیں۔ مگر بیشتر حقائق پہلی بار زیرِ قلم آئے ہیں۔
ارشد

لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں، اور بُرے بھی۔ بُروں میں بھی کچھ اچھائیاں ہوتی ہیں اور اچھوں میں بھی کچھ برائیاں۔ شوکت میں خوبیاں بہت زیادہ تھیں اور ناخوبی بہت کم۔ اگرچہ یہ سالہا سال کے استعمال سے بہت عامیانہ ہو گیا ہے مگر شوکت پہ زبان سے نکل ہی جاتا ہے کہ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

وہ ناظم بھی تھا، ناثر بھی۔ شعر بھی کہتا تھا، مضامین بھی لکھتا تھا۔ ریڈیو کی نشریات میں بھی بالالتزام حصہ لیتا تھا۔ فیچر اس نے لکھے، ڈرامے اس نے لکھے، مختصر افسانے اس نے لکھے، ناول اس نے لکھے، متعدد روزناموں کی ادارت اس نے کی اور طنز و مزاح کا ایسا اسلوب اس نے پیدا کیا جس نے ہندوستان و پاکستان کے ہر صاحبِ قلم کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ خواص تو خواص عوام بلکہ معمولی پڑھنے لکھنے والوں کا دل بھی اس نے موہ لیا تھا۔ اس پر خامہ فرسائی کرنا میرے لیے مناسب نہیں ہے۔ یہ دوسرے اہلِ قلم کا موضوع ہے۔ وہ میرا جان سے زیادہ عزیز چھوٹا بھائی تھا لیکن حقیقی نہیں بلکہ عم زاد۔ اگرچہ عام طور پر اس کو میرا حقیقی بھائی سمجھا جاتا ہے اور اس کی ننھی عمر کے دیکھنے والے بعض حضرات اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ میرا بیٹا تھا۔ ساغر نظامی نے اپنے مجموعہ مکتوبات میں اسے میرا سوتیلا بھائی لکھ دیا۔ اس غلط فہمی کے اسباب کی بنیاد ہمارے خاندانی روابط اور معاشرتی ہم آہنگی ہے۔ شوکت بچپن ہی سے میری گود میں کھیلا۔ طفولیت میں میرا ہمراز رہا، جو شعور کو پہنچ کر اپنے آپ کو "تھانوی" لکھنے لگا حالانکہ وہ تھانہ بھون میں کبھی نہیں رہا۔ کم سنی میں ایک بار صرف ایک دن کے لیے تھانہ بھون گیا، پھر جوانی میں اپنی رفیقۂ حیات سعیدہ خاتون کو وہاں اعزہ سے روشناس کرانے کے لیے صرف دو دن اپنے آبائی وطن میں رہا۔ واقعہ کے طور پر وہ تھانوی نہیں لکھنوی تھا۔ چچا جان منشی صدیق احمد صاحب (شوکت تھانوی کے والد) ایک رومانی ناکامی کی وجہ سے نوعمری ہی میں تھانہ بھون سے چلے آئے تھے

عرصہ دراز تک محکمہ پولیس میں ملازمت کرکے لکھنؤ ہی میں رہے اور لکھنؤ ہی کے ایک ممتاز صدیقی خاندان میں شادی کی جن کا سلسلہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی تک پہنچتا ہے۔ ان کی بیگم ہماری چچی جو کہ بڑے سرمایہ [illegible] کی تھیں اودھ کے زمانہ شاہی کے وزیر اعظم کی پوتی تھیں۔ یوں تو چچا جان یو پی کے مختلف اضلاع میں بسلسلہ تبادلات مقیم رہے لیکن مستقل سکونت لکھنؤ ہی میں اختیار کرلی۔ وہیں ذاتی مکان بنایا جو زرد کوٹھی کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ زرد کوٹھی محلہ آغا باقر میں چھوٹی شہزادی کی حویلی کے سامنے وکٹوریہ سٹریٹ پر تھی جو اب تقسیم ملک کے بعد سے شرنارتھی کے قبضہ میں ہے۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا کہا ہے۔

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت
رفت منزل بدیگرے پرداخت

۱۹۲۷ء میں میری شادی شوکت کی بڑی بہن ظہور فاطمہ بیگم صاحبہ سے اسی زرد کوٹھی میں ہوئی اور مدتوں اسی کے بالائی حصہ میں میرا قیام رہا۔ میرے والد شیخ سلطان احمد بھوپال اسٹیٹ کے مشہور وکیل فوجداری تھے۔ ماہ فروری ۱۹۰۵ء میں ان کو اپنے چھوٹے بھائی صدیق احمد کا تار ملا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ ان دنوں چچا جان بندرابن ضلع متھرا میں کوتوال تھے۔ میرے والد نے اس بچے کا نام "تنویر احمد" از روئے اعداد ابجد نکالا جس سے ۱۳۲۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ چچا جان، ان کی بیگم اور دوسرے افراد خاندان ایک تارک الدنیا بزرگ کے جو بڑے مولانا صاحب کہلاتے تھے، بہت معتقد تھے۔ ان ہی مقدس انسان کے صاحبزادے حضرت مولانا عین القضاۃ بانی مدرسہ قرآن تھے جہاں سے حفاظ و قرآن کی دیندار جماعتیں اب بھی نکلتی رہتی ہیں۔ چچا جان کے یہاں شادی کے بعد عرصہ دراز تک اولاد نہ ہوئی، بڑے مولانا صاحب سے دعا کرائی گئی اور ۱۹۰۱ء میں چچا جان کے یہاں [illegible] ضلع [illegible] میں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ چونکہ یقین یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اولاد بڑے مولانا صاحب کی دعا قبول فرما کر دی ہے، انہی سے نام رکھنے کی استدعا کی گئی، انہوں نے "ظہوراً" نام تجویز کیا۔ میرے والد نے بھتیجی کے نام کو سلیقے کا تاریخی حیثیت دے دی اور ظہوراً کو ظہور فاطمہ بیگم بنا دیا جس سے سنہ پیدائش (۱۳۱۸ھ) برآمد ہوتا ہے۔ اس بچے کا نام بھی بڑے مولانا صاحب کے ارشاد کے مطابق محمد عمر رکھا گیا۔ اس محمد عمر یا تنویر احمد کی پیدائش کے چند ہی روز بعد چچا جان ریاست بھوپال آ کر پہلے میونسپل بورڈ کے سرکاری چیئرمین ہو گئے، پھر منتظم پولیس کے عہدہ پر تقرر ہو گیا۔ یہ عہدہ سپرنٹنڈنٹ ضلع اور انسپکٹر جنرل کے درمیان ریاست کی زیر نگرانی ہوتا تھا۔ شیر خوار محمد عمر بھی اپنے والدین کے ساتھ وہاں پہنچا۔ میرے والد چار بھائی تھے، سوائے میرے اور کوئی لڑکا ان بھائیوں کے یہاں نہ تھا۔ مجھے یہ دودھ پیتا منا بھیا بہت ہی اچھا لگا۔ میں خود بھی تو عمر یہی ۱۸، ۱۹ سال کا تھا اور ریاست کے قوانین رٹ رٹ کر امتحان وکالت کی تیاری کر رہا تھا۔ اس مصروفیت سے جتنا وقت ملتا مدرسے یہی محمد عمر کی ناز برداری میں گزرتا۔ اسے گھٹنوں پر بٹھا کر جھو جھو کرتا، کندھے پر بٹھا کر صحن میں ٹہلتا، دونوں ہاتھوں میں لے کر اچھالتا۔ جب وہ کھلکھلا کر ہنستا تو میں بھی باغ باغ ہو جاتا۔ کمرہ میں ایک منقش چھت گیری لگی ہوئی تھی، ایک طرف کا بند کھل گیا اور کپڑا نیچے جھک آیا۔ میں نے حسب معمول منے بھیا کو نچاتے، کداتے اوپر اٹھا کر چھت گیری سے لگاتے ہوئے کہا، "تجھے آسمان پر پہنچا دوں"۔ چچی جان جو رسمی توہمات سے بالاتر نہ تھیں، گھبرا کر بولیں "ایسی بُری فال زبان سے نہ نکالو"۔ میں نے جواب دیا کہ "یہ بُری نہیں بلکہ فرخندہ فال ہے، شہرت و عزت کی فال! آپ اسے بُری فال کیوں کہتی ہیں۔" کاش چچی جان عمر طبعی کی انتہائی حد تک زندہ رہتیں

[illegible] چند چاند کو مرہم سمجھتا تھا [illegible] قسمت پر [illegible] رخشندہ جبیں [illegible] ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہوئے اس کے آثار نمایاں تھے۔ وہ [illegible] بہت سے [illegible] نظر آتے ہیں۔ محمد عمر [illegible] آتا ہے۔ دو سال پہلے [illegible] گورنمنٹ نے چچا جان کو ریاست سے [illegible] صاحب کر دیا۔ چونکہ بھوپال میں ان کو ایک وسیع حلقۂ احباب مل گیا تھا اس لیے واپس آکر انگریزی کی نوکری میں ان کا دل نہ لگا اور [illegible] بھوپال آ گئے۔ [illegible] نواب [illegible] نے ایک اہم خدمت پر مامور کیا۔ [illegible] وہ زمانہ [illegible] پولیس [illegible] سی۔ آئی۔ پولیس کے ایک ریٹائرڈ [illegible] خان بہادر شیخ محمد سرور [illegible] انسپکٹر جنرل مقرر ہو کر ریاست میں آ گئے [illegible] نظام پولیس [illegible] سے متعلق [illegible] ان کے نائب [illegible] ڈپٹی انسپکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ [illegible] دونوں [illegible] الگ الگ تھے [illegible] دونوں میں چشمک ہو جاتی تھی [illegible] بعض [illegible] باتوں پر [illegible] افسر اعلیٰ [illegible] مونچھوں پر خضاب لگاتے اور سر کے بال [illegible] مشین [illegible] سے کترے [illegible] کہ سفیدی زیادہ نمایاں [illegible] پہنے [illegible] بیٹھتے تھے [illegible] افسر اعلیٰ صاحب [illegible] اطلاع [illegible] طرح [illegible] چچا جان نے دیکھتے [illegible] آپ نے [illegible] سامنے سے آنے [illegible] افسر [illegible] نہیں [illegible] چچا جان [illegible] سر [illegible] ہے اس سے میں نے کہا۔ افسر اعلیٰ صاحب نے [illegible] سر پر [illegible] معاف کیجئے [illegible] سفید [illegible] سیاہی کے [illegible] کا شبہ ہوا۔ افسر اعلیٰ اس پھبتی کو [illegible] جواب [illegible] آپ کی نظر زیادہ کمزور ہو گئی ہے [illegible] تو غضب ہی کر دیا۔ [illegible] ہوا یہ کہ اپنے آقا سے [illegible] کے ساتھ بازار گئے۔ واپسی پر چچا جان نے [illegible] جواب دیا۔ جی ہاں [illegible] ایک جگہ آپ کے افسر اعلیٰ [illegible] پر [illegible] باندھے کھڑے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک گھڑی والے کی دوکان پر ایک [illegible] کا مجسمہ [illegible] جو کوٹ پتلون پہنے [illegible] لگائے کھڑا تھا، اس پر گھڑی کا [illegible] بنا تھا۔ یہ پھبتی خان بہادر محمد سرور پر اس قدر چسپاں ہوئی کہ

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

چچا جان اور [illegible] نے جو اتفاق سے وہاں بیٹھے تھے، اس [illegible] کو [illegible] اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ریاستوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہوتی جو "یا شراب خوردہ [illegible] نہ کردہ" پر عمل کرتے ہیں۔ چچا جان کے حاشیہ نشینوں نے جو افسر اعلیٰ کے التفات کے [illegible] رہتے تھے، موصوف کو بھی یہ خبر مزید حاشیہ آرائی کے ساتھ پہنچا دی۔ انہوں نے بہت برا مانا اور دلی کبیدگی اس قدر بڑھی اور باہمی تلخی نے اس قدر شدت اختیار کی کہ چچا جان کو مستعفی ہو کر لکھنؤ چلا آنا پڑا۔ حکیم [illegible] اللہ خاں نے فرمانروایان اودھ کے دعویٰ نجابت پر [illegible] کہ اپنے حق میں جو کانٹے بوئے تھے ان صاحبزادے نے اپنے والد کے حق میں [illegible] لیکن اسی ذہانت اور تیزی طبع سے اپنی زندگی میں خوب پھلے پھولے اور ادب اردو میں وہ شاہکار پیش کئے جو اپنی جگہ اختراع [illegible] کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر اس کچی عمر میں محمد عمر [illegible] لکھنؤ آکر نشوونما نہ پاتے تو وہ بھوپال میں رہ کر [illegible] نہ بنتے [illegible] اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے بن کر رہے۔ لکھنؤ کی شہری فضا اور شہری ماحول نے ان کی ذہنی قوتوں کو ابھارنا شروع کر دیا۔ مادری زبان تو لکھنؤ کی یگانگی زبان کے آغوش میں پروان چڑھ رہی تھی، لکھنؤ کی معاشرت بھی پورے طور پر اثر انداز ہونے لگی۔

جس محلے میں گھر تھا وہاں زیادہ تر امامیہ عقیدے کے اصحاب رہتے تھے اور ہم سب کے تعلقات عزیزوں جیسے تھے اور مجالس میں شوکت کو بھی اپنی والدہ کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ کسی مجلس میں ایک ذاکرہ نے مرثیے یا سلام بصورت مستزاد پڑھا۔ اس پر غور کرتا ہوا گھر آیا۔ ان کے ابا اس وقت کسی کا ذکر کر رہے تھے کہ "وہ جھٹ گھٹی پہ گر گئے پھرتے ہی لشتہ سے" شوکت نے اسے مستزاد جیسا مصرعہ قرار دے کر فوراً اگلا ٹکڑا چسپاں کر دیا "عباس کے آگے" جو بالکل فٹ بیٹھ گیا ؎

وہ جھٹ گھٹی پہ گر گئے پھرتے ہی لشتہ سے
عباس کے آگے

میں نے اس سے پہلے بھی اس کا ایک غیر ارادی شعر فی البدیہہ سن کر کہا تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ضرور شاعر ہوگا اور وقت آنے پر یہ ہونہار بروا شاعر ہی نہیں انشا پرداز بھی ہو گیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ میں نے ننھی عمر سے لڑکے کے نام اخبار پھول جاری کرا دیا تھا۔ پڑھنے کی چاٹ پڑی ہوئی تھی۔ جب چھوٹے بھائی نے اردو پڑھنے لکھنے کی تھوڑی سی استعداد پیدا کر لی تو مجھ سے فرمائش کی کہ جس طرح باجی کا نام چھپا ہوا آتا ہے میرا نام بھی اخبار میں چھپوا دیجئے۔ میری ایک مختلف البطن بہن جو شوکت سے ۶ ماہ بڑی تھی دونوں بھائی بہن آپس میں بہت مانوس تھے، اس نے بھی بڑی لگن سے یہی بات کہی۔ یہ اس وقت کا قصہ ہے جب ہم بھوپال ہی میں تھے۔ میں نے دو کہانیاں دونوں کے نام سے لکھ کر بھیج دیں۔ عنوان تھا "بڑھیا کا لڑکا" یہ ننھے میاں کی طرف سے اور دوسری کہانی "سفید بلی" افسر بیگم کی طرف سے۔ جب وہ چھپ کر آئیں تو میاں محمد عمر جو اس وقت شوکت کا پیار کا نام تھا، دوڑتے ہوئے اپنی ماں کے پاس گئے اور کہا: "دیکھئے اماں! بھائی جان آپ کو بڑھیا سمجھتے ہیں اور پھول کے شروع صفحوں کی فہرست مضامین دکھا کر بولے۔ یہ دیکھئے لکھا ہے "بڑھیا کا لڑکا محمد عمر" اور "سفید بلی افسر بیگم" جب میں باہر سے آیا تو یہی بات مجھ سے کہی کہ ہماری امی زیادہ عمر کی تو نہیں جو آپ نے مجھے "بڑھیا کا لڑکا" لکھ کر چھپوا دیا۔ میں نے کہا۔ تم بڑے شریر ہو اپنی ذہانت سے الفاظ کا مطلب بدل دیتے ہو۔ تم خوب سمجھتے ہو کہ کہانی کا نام "بڑھیا کا لڑکا" ہے اور لکھنے والے کا نام "محمد عمر"! چچی جان یہ سن کر ہنس پڑیں۔ اس دن سے حضرت نے افسر بہن کو "سفید بلی" کہنا شروع کر دیا۔ بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال نے شاہی خاندان اور معزز عہدہ داروں کے لئے ایک ابتدائی درس گاہ "نزول الکمل" کے نام سے قائم کی تھی۔ محمد عمر بھی اس میں داخل تھے۔ دوپہر کا کھانا گھر سے ایک اردلی لے کر جایا کرتا تھا۔ محمد عمر اپنا مزے دار کھانا اپنے ہم جماعت دوستوں کو کھلاتے اور چھٹی ہونے پر بڑے ابا کے یہاں یعنی ہمارے گھر بھوک سے بلبلاتے ہوئے آتے اور آتے ہی کہتے "سفید بلی! لہسن کی چٹنی پیسو!" میری دو حقیقی بہنیں جو دونوں سے بہت بڑی تھیں کہتیں "سالن سے کیوں نہیں کھاتے۔ انڈا تلوا لو، کباب منگوا دیں" معلوم نہیں سفید بلی اور بڑھیا کے لڑکے کو کیا دھن تھی کہ لہسن کی چٹنی مزے لے لے کر کھایا کرتے۔ یہ روز کی بات تو نہیں تھی ہفتہ میں دو ایک بار ایسا ضرور ہوتا۔ ان کی امی کو خبر ہوئی، انہوں نے بھی سمجھایا کہ اول تو ہمارا بھیجا ہوا کھانا دوسروں کو نہ کھلایا کرو اور اگر کبھی کھلا بھی دو تو گھر آ کر یا بڑے ابا کے گھر جا کر دال سالن سے روٹی کھایا کرو لیکن لہسن کی چٹنی کے چٹخارے سے وہ باز نہ آئے۔ میں لہسن کی بو سے بہت چڑتا ہوں۔ میں نے کہا سفید بلی ہو سو ہو تم لہسن کھا کر میرے پاس نہ آیا کرو، تم باتیں کرتے ہو تو مجھے لہسن کی بدبو آتی ہے۔ ایک روز آپ کو مجھ سے کچھ کہنا تھا۔ چٹنی روٹی کھا کر بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر جلدی سے کلی کی اور چچی اماں سے

پر الجھن الجھی، اتنے میں چچا [illegible] آئے تھے اور مجھ سے بولے کہ آج میں نے تم سے [illegible] کی بات کہی تھی [illegible] سے اس کا نتیجہ آپ ہی ہے۔ یہ پہلی بات ہے [illegible] تو وہ بہت غلیظ سا لگتا تھا۔ [illegible] اور سب کے سب [illegible] سے مجھ پر اترتے تھے۔ یہاں مجھے ان کے [illegible] شباب کی ایک بات یاد آئی۔ [illegible] شوکت اپنے مجھ سے آپ کے یہاں [illegible] آئے۔ خیال کیا اب [illegible] ہو چکی تھی۔ آپ [illegible] محنت سے [illegible] کر آیا ہیں اس زمانے میں ایک [illegible] میں [illegible] میاں [illegible] جواب [illegible] اور [illegible] مجھ کی [illegible] ملنے گئے۔ [illegible] کا [illegible] سے [illegible] کے لیے ہے کہ سکے آپ ہوں۔ [illegible] کہا تو کہا کہ [illegible] ایک ہو گئی ہے [illegible] جذبہ محبت [illegible] اشارہ ہو گا بہت متاثر ہو کر شفقت بھری دعائیں دیں۔ [illegible] اسی طرح باتیں [illegible] کر کے [illegible] مطلب [illegible] ہو سکے اور بڑی [illegible] بعد فرمانے لگے۔ میری شادی [illegible] ابھی نہیں [illegible] وہ [illegible] ہو کر [illegible] کی صورت دیکھی تھی۔ پھر بولیں۔ وہ تم سے چھوٹی نہیں بلکہ [illegible] زیادہ ہے۔ شادی [illegible] کرنی چاہیے۔ آپ نے جواب دیا [illegible] بہت دن [illegible] عشق [illegible] اور کسی کتاب میں پڑھ رکھا ہے [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی حضرت خدیجہ رسول پاک سے ۱۲، ۱۵ سال عمر میں بڑی تھیں۔ [illegible] صاحب [illegible] بات ماننے کو [illegible] آپ [illegible] منظور کریں گے۔ [illegible] بھائی جان [illegible] بہت [illegible] ہیں۔ [illegible] منظور [illegible] اور [illegible] اپنے [illegible] نہیں [illegible] گے۔ [illegible] جان [illegible] تو وہ [illegible] ہو جائیں گے یہ بات [illegible] بعض خاندانی [illegible] کی وجہ سے اس تجویز سے متفق نہ ہو سکا [illegible] شوکت [illegible] اور بہن کے جذبات سے اس خطرناک اپیل پر اتر آئے کہ [illegible] ریل کی پٹری پر لیٹ کر ٹرین سے کٹ جاؤں گا۔ میری بیوی کہا [illegible] انھوں نے دو چار روز پہلے ایسے ہی معاملہ پر کسی نوجوان کی خودکشی کی خبر پڑھی تھی۔ انھوں نے بدحواس ہو کر مجھے خبر کی۔ میں نے ایک خط اپنے والد کو لکھا اور دوسرا چچا جان کو، اس میں اپنا [illegible] شوکت کی خودکشی کی دھمکی تفصیل سے لکھ دی۔ [illegible] سے والد صاحب نے تو یہ اطلاع دی کہ [illegible] کے بیٹے سے نسبت طے ہو چکی ہے اور [illegible] عنقریب [illegible] ہے۔ اب اس بات پر توجہ نہیں کی جا سکتی۔ چچا جان کا لکھنؤ سے خط آیا کہ محمد عمر کو فوراً واپس لکھنؤ [illegible] کی والدہ سخت علیل ہیں۔ شوکت لکھنؤ چلے گئے۔ تفصیلات تو معلوم نہیں۔ شاید وہاں بھی خودکشی پر آمادگی ظاہر کی اور جب یہ [illegible] پولیس افسر باپ کے سامنے پیش ہو کر بھی اپنی ضد پر اڑے رہے تو انھوں نے اپنا بھرا ہوا ریوالور نکال کر سامنے رکھ دیا کہ بیٹے اپنے کو گولی مار لو، پھر ریوالور کی نالی ان کی کنپٹی پر چھوا کر کہا۔ اس جگہ گولی لگتے ہی بھیجا پاش پاش ہو جائے گا۔ بہادر بیٹے کا [illegible] کمرا ہو گیا اور جسم تھر تھرانے لگا۔ چچا جان یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے ۔

ایں نہ عشق است ایں کہ در مردم بود
ایں فساد از خوردن گندم بود!

بعد میں اس [illegible] نے از راہ مصلحت اندیشی مجھے اور اپنی بہن کو اس تجویز کا بانی قرار دیا کہ انھوں نے مجھے اس پر

تیار کیا تھا اور اس مصروفیت سے باور کرایا کہ سب نے یقین کر لیا اور مدت تک یہ غلط فہمی باقی رہی۔ اسی کے ساتھ یہ مشکل پیدا ہوئی کہ ماں کو یہ خیال ہوا کہ بیٹا جوان ہو گیا ہے اور خیالات ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں جلدی سے شادی کر دینا چاہئے اور کچھ عرصہ بعد وہ بھی جلد ہو گیا اور خاندان ہی میں ایک مناسب عزیزہ سے شادی کر دی گئی اور عزیزم شوکت کچھ دنوں تک اس اہتمام کے پابند رہ کر پھر سے بھائی جان کے پیارے بیٹے بن گئے۔ یہ قصہ تو بہت بعد کا ہے ذکر تو اس وقت کا ہے جب پہلے پہل انہوں نے اخبار "پھول" میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھا اور خود سے مزید فرمائشیں کیں۔ علاوہ "پھول" اخبار کے بچوں کے ایک ماہنامہ "[illegible]" میں ان کی طرف سے ہلکی پھلکی نظمیں چھپوائیں۔ رفتہ رفتہ ان کی تسکین ہوتی رہی اور اس قدر ہوا اور جذبۂ شہرت پسندی اندر ہی اندر پاتا اور اخبار کے ساتھ مختلف ماہناموں سے ان کا تعلق رہتا رہا جیسا اپنی لکھی ہوئی "کچھ یادوں کچھ باتوں" میں انہوں نے ذکر کیا۔ وہ میری غزلیں یا تخلص بدل کر مشاعروں میں پڑھتے رہے۔ میں نے جب پہلے پہل ان کا تخلص شوکت سنا تو کہا کہ تم نے اپنی خالہ کا نام کیوں چرایا؟ ان کی حقیقی خالہ جو ساتھ ہی رہتی تھیں ان کا نام شوکت جہاں ہے۔ تو بس محمد عمر المتخلص بہ شوکت نے بتایا کہ ایک تو اس ردیف کے وزن پر ہے آسانی آپ کا متروک شوکت کا منتقل ہو جانے سے دوسری بات یہ ہے کہ علی برادران کی اصل شخصیتوں سے نسبت دینا چاہا تھا۔ مولانا محمد علی کے نام سے تو تخلص بنایا نہیں جا سکتا مولانا شوکت علی کے نام سے مدد لی ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ کافی عرصے کے بعد میری اور اپنی تصویر ایک ساتھ سے رسالہ میں ساتھ ساتھ اس نے چھپوائی کہ اس کے نیچے علی برادران کے بجائے "تھانوی برادران" لکھ دیا، اور پھر لکھنؤ کے ایک حلقہ احباب میں ہم تھانوی برادران ہی کہا جانے لگا۔ میری شادی ان کی بڑی بہن سے ۱۹۱۷ء میں ہوئی جب یہ ۱۲ برس کے تھے۔ اس جدید رشتے سے برادر عزیز نے فائدہ اٹھا کر اپنی معمولی شوخی و شرارت کا استعمال مجھ پر بھی شروع کر دیا اور وہ کل کہتے کہ مجھے کتنا پٹوایا۔ اسے روشنی طبع تو بہر حال بلاشبہ میں ہی نہیں گھر کا کوئی فرد ماں، باپ، بہن، بھائی خاندان کے ذہین و لبیب افراد اس کی دلچسپ اور برمحل فقرہ بازی سے محظوظ ہوتے مگر محفوظ ہوتے تھے۔ ۱۹۰۸ء کا ذکر ہے لکھنؤ میں ایک سکھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سردار [illegible] سنگھ کوتوال ٹھہرتے تھے۔ ننھے شوکت اپنے ابا کے ساتھ کبھی کبھی ان کے یہاں جاتے اور رنگین طبع بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ میں بھی لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ عزیز گرامی مجھے دیکھتے ہی باغ و بہار ہو گئے کیونکہ ان کی ذہانتوں کی داد گھر بھر میں میں ہی دیا کرتا تھا۔ سب یہی سمجھتے کہ موقع ملے تو کوئی کارنامہ دکھا کر داد لیں کیونکہ یہ داد بیشتر مشغلوں کے ساتھ مادی صورتوں میں بھی ہوتی تھی۔ اتفاق سے میری بیوی بالاخانے پر جا کر نہانے لگیں، جب نہا چکیں تو کسی ضرورت سے گلشن خادمہ کو پکارا، جس کی آواز سن کر بطور سعادت مندی آپ اوپر پہنچ گئے اور وہاں جاتے ہی چیخ چیخ کر مجھے پکارنے لگے۔ بھائی جان! بھائی جان! جلدی آیئے۔ میں گھبرا کر زینہ پر چڑھا کہ نہ معلوم کیا غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا۔ دیکھا تو ان کی باجی نے سر کے بالوں کو نچوڑ کر ماتھے کے اوپر جوڑا سا باندھ لیا ہے۔ چادر اوڑھے چوکی پر بیٹھی تنگ مہری والا سوتی شرعی گھٹنا دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر پہن رہی تھیں۔ شوکت بولے "دیکھئے بھائی جان! سردار [illegible] سنگھ بن رہی ہیں۔" ان کی باجی ہنس کر سوئر، پاجی، بدمعاش بنانے لگیں اور حضرت ہنستے ہوئے بھاگ گئے۔ ان ہی دنوں کا ذکر ہے، میرے ایک دوست ابوتراب المتخلص بہ طرب مجھے ملنے آئے۔ کہنے لگے آپ نے بہت دنوں میں لکھنؤ کی طرف توجہ کی کوئی تازہ غزل سنائیے۔ میں نے بیاض اٹھا کر ایک مطلع پڑھا، وہ کچھ چونک سے پڑے مگر کہا کچھ نہیں۔ میں نے بعد کا شعر پڑھا۔ بولے، ذرا ٹھہریئے یہ غزل آپ نے کب کہی ہے

[illegible] شوکت نے [illegible] رشید صدیقی نے [illegible] بھیجے۔ [illegible] ہم سب نے بہت مارا [illegible] غزل ہوئی [illegible] یہ بات پھیل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہم نے شوکت [illegible] غزل [illegible] کوشش کی [illegible] غزل [illegible] اپنی [illegible] کا ثبوت [illegible] ایک [illegible] مصرع [illegible] ایک [illegible] غزل [illegible] صاحب [illegible] آپ بھی [illegible] شوکت [illegible] اس تقریبی غزل کا ذکر آیا۔ [illegible] مجھے نہیں ملی۔ بہت تلاش کی [illegible] شوکت [illegible] اس غزل کا پہلا شعر [illegible] مطلع تھا ؎

ہم ذوقِ نظر یوں ہی تائید نہیں کرتے
اس درجہ بھی کورانہ تقلید نہیں کرتے

اب وہ اس طرح ہو گیا تھا ؎

ہم روزے تو رکھتے ہیں پر عید نہیں کرتے
اس درجہ بھی کورانہ تقلید نہیں کرتے

دوسرا شعر تھا ؎

ہم اہلِ وفا کو تم الزام دیے جاؤ
ہے پاسِ ادب مانع تردید نہیں کرتے

شوکت نے بہت ہی واہیات مگر دلچسپ مصرع لگایا ؎

ہم گھاس تو کھاتے ہیں پر عید نہیں کرتے
ہے پاسِ ادب مانع تردید نہیں کرتے

اس کے بعد شوکت برائے تخلص نہیں بلکہ سچ مچ کے ہو گئے اور مشاعروں میں دھڑلے سے جانے لگے۔ پھر بھی کبھی مجھ سے رجوع کرتے رہتے۔ ایک بار جبکہ میں ریاست جے پور کے ایک بعید علاقہ میں تحصیلدار تھا، لکھنؤ سے آئے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے فیض آباد کے مشاعرہ میں جا رہا ہوں۔ پیشانی دیکھتا ہوں، لگا ہی دیکھتا ہوں، ردیف و قافیہ ہے مگر عنوان دیکھتا ہوں نہیں بندھتا میں نے ذرا تامل کے بعد کہا، یہ شعر کیسا رہے گا —

پڑھا ہے میں نے ہر افسانۂ عشق
تمھی کو زیب عنواں دیکھتا ہوں

پسند کرکے اپنی بیاض میں ٹانک لیا پھر کہا میری ایک اور غزل ہے:۔

حجاب حسن کی توہین ہے حجاب نہ کر

"اس میں "خواب نہ کر" بھی ہونا چاہئے"۔ میں نے کہا "تمہارے رنگ سے ملتا ہوا نہیں ہے، چاہو تو لکھ لو —

مجھے اذیت بیداری دوام نہ دے
دکھا دکھا کے مجھے اہتمام خواب نہ کر"

کہنے لگے "بہرصورت قافیہ تو آگیا"۔ یہ تو شوکت کی ابتدائی مشق کی باتیں ہیں، پھر تو اس نے اتنی غزلیں کہیں کہ چند سال بعد ہی دیوان مکمل کر لیا جو بعد میں "گہرستان" کے نام سے چھپ کر شائع بھی ہو گیا۔ اگرچہ شاعری میں اسے کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں ہے، پھر بھی ایک خاص انداز اس کا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی۔ نواب چھتاری کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ خان بہادر معین الدین کلکٹر یا ڈپٹی کلکٹر اس کے باضابطہ سیکرٹری تھے مگر اس کے تمام فرائض شوکت انجام دے رہے تھے۔ میں بھی مشاعرہ میں بلایا گیا تھا۔ شوکت کی دن رات کی مصروفیت دیکھ کر میں بھی اکتانے لگا۔ شوکت نے مجھ سے کہا "غالب کا مصرع دیا ہے کہ "ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں"۔ مجھے فرصت نہیں مل رہی ہے جو سکون سے بیٹھ کر غزل کہوں آپ ہی میرے لیے غزل کہہ دیجئے"۔ میں نے کہا "میری کہی ہوئی غزل کسی طرح نہیں ہو سکتی"۔ شوکت نے کچھ سوچا، پھر کہا "اچھا "طور" کا قافیہ تو موزوں کیجئے"۔ میں نے کچھ سوچا پھر کہا، سنو —

جلوہ یوں عام ہو تیرا مجھے منظور نہیں
میری دنیا میں کہیں برق نہیں طور نہیں

شوکت نے اتنی دیر میں خود بھی مطلع کر لیا تھا۔ کہنے لگا میں نے اس طرح سوچا ہے —

بے حجابی ہی تری بزم کا دستور نہیں
ورنہ وہ کونسا ذرہ ہے جو خود طور نہیں

میں نے ہنس کر کہا جس طرح مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب! اسی طرح تھانہ بھون، تھانہ بھون ہے اور لکھنؤ لکھنؤ! تم اپنی غزل خود کہو اور میں اپنی غزل آپ۔ شوکت نے کہا، ٹھیک ہے! اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ! حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو موزوں طبع تو سمجھتا ہوں مگر شاعر نہیں، یہی رائے میری شوکت کے متعلق بھی ہے۔ آخر میں شوکت بھی اسی نتیجہ پر پہنچ گیا تھا اور سنجیدہ بیانی

پہلا دور میں شروع ہو رہی [illegible] ۔ [illegible] ہے ۔ پہلے ہم لوگ [illegible] نے مجھے چند سال پہلے دکھایا تھا جس میں [illegible] سے اشعار کی بہت سی [illegible] صاحب [illegible] کی گئی تھی ۔ وہ درحقیقت صاحب [illegible] اور اتنا چھوٹے لگتے تھے کہ [illegible] پڑھا جاتا تھا ۔ لکھنؤ کے جن مشاعروں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے ساتھ ہی ان دنوں کے وقت سے الہ آباد اکیڈمی کے اجلاس بھی منعقد ہوتے ۔ شوکت کہاں ہیں ۔ لکھنؤ میں ایک مقررہ تاریخ کو [illegible] باہر سے آنے والے شعرا کی تعداد کافی تھی وہ شوکت کے وقت ہی گھر سے نکلتے تھے ۔ وہ مقررہ پر جلسہ کا آغاز ہونے والا تھا میں سوچ رہی تھی [illegible] ضرورت سے فارغ ہو کر نے ہمیشہ شرکت کر آیا کریں ۔ شوکت کی وسیع نے [illegible] باتوں کے ہو گئے ہوتے تھے [illegible] میں جا کر پھر زیادہ مقالہ پڑھنا ہے ۔ اکیڈمی کا جلسہ شروع ہونے والا ہے جلدی سے اٹھو ۔ وہ اشاروں سے گھر پر ساتھ چلنے کو تیار نہ ہوئے کہا آپ ناشتہ کر کے جائیے مجھے ابھی شیو کرنا ہے اور مقالہ لکھنا ہے ۔ میں نے بڑی حیرانی سے کہا مقالہ اب تیار کریں گے ۔ وہ بھی دوسری ضروریات کی تکمیل کے بعد ۔ بڑی بے پروائی سے شوکت نے جواب دیا ۔ آپ بے فکر رہیے [illegible] تیار [illegible] جاتے ہیں ۔ اتنی فرصت مجھے کہاں ہے اور [illegible] ہو گیا ۔ میں [illegible] سے فارغ ہو کر [illegible] ہوا [illegible] اکیڈمی کا جلسہ وقت مقررہ پر شروع ہو گیا ۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ گزرا ہوگا ، دوسرے مقرر مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی [illegible] شروع ہو چکی [illegible] پیچھے نظریں دوڑاتا تھا کہ شوکت آئے یا نہیں ۔ دل میں مایوس تھا کہ اپنی باری پر [illegible] سکیں گے جب [illegible] وقت [illegible] مولانا عبدالماجد جیسے ہی ڈائس سے اترے اور شوکت بڑے اطمینان سے آتے ہوئے دکھائی دیے ۔ نام پکارا گیا اور شوکت نے [illegible] پر لطف تقریر پڑھنا شروع کی جس میں بیرونی حضرات کے ان تصورات کو طرز مزاح کا رنگ دے کر پیش کیا گیا جو قدیم لکھنؤ کی بعض [illegible] روایات پر مبنی تھے ۔ شوکت کو بہت ہی پسند کیا گیا اور کئی روز تک تعریف ہوتی رہی ۔ اگر میں کہتا کہ اس مقالہ کی جو فقط ایک بھی ہے اور یہی بھی ایسی رواروی اور کم وقت میں تکمیل کی گئی ہے تو کوئی یقین نہ کرتا ۔ میں نے واپس گھر جا کر اس کی مزید تصدیق بلکہ تحقیق کی کہ پہلے کوئی یادداشت یا ابتدائی حصہ اس کا لکھا ہوا رکھا تھا تو معلوم ہوا مطلق نہیں ۔ انشاء اللہ خاں کے قول کو شکوہ تھا جس کو انہوں نے ذہنی کانوں سے سن کر کہا ۔

کہتا ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

مگر شوکت کا قلم پوری تیزی کے ساتھ اس کے خیالات کا ساتھ دیتا تھا ۔ عام لوگوں کی زبان قلم کچھ اور ہوتی ہے اور زبان ذہن کچھ اور مگر شوکت کی دونوں زبانیں ایک تھیں ۔ اس کے قلبی و ذہنی احساسات کی ترجمانی پوری بے ساختگی کے ساتھ اس کی زبان کرتی ۔ اسے اپنی نسبت اہل زبان ہونے کا بھی یقین تھا گو وہ اس کا اظہار کبھی صراحتاً نہیں کرتا تھا اور روزمرہ ہی سے اس پر اپنی باجی سے [illegible] پر بحث کرتا رہتا تھا ۔ ایک دفعہ ایک نئے رنگ کی شیروانی بنوائی ۔ خوش پوشی کا ذوق ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہا اور ساتھ شوقِ نمائش بھی مگر [illegible] انداز میں نہیں ۔ نئی شیروانی پہن کر اپنی چھب دکھانے بڑی بہن کے پاس آئے اور کہا ' باجی دیکھو دھانی شیروانی ! باجی نے گرفت کی ' دھانی چوڑیاں سب کہتے ہیں ، دھانی شیروانی تم سے ہی سنا ہے ۔ شوکت نے کہا ' باجی ! آپ اب زیادہ تر بھوپال میں رہتی ہیں ۔ لکھنؤ میں مستقل رہنے والوں کی زبان پر آپ اعتراض نہیں کر سکتیں ۔ بھائی جان اہل زبان تو نہیں مگر زبان داں ضرور ہیں ان سے پوچھ لیجیے میں نے دھانی کا صحیح استعمال

کیا سمجھا؟ غلط فہمی تھی۔ ہو چکی تھیں وہ میری اہمیت اپنے مقابلے میں کیسے مان لیتیں۔ کہنے لگیں تمہارے بھائی صاحب کی یہ نہ ہی کر دیتے ہیں، میرا پیچھا شہر میرٹھ، آس پاس کے قصبات، مظفر نگر، تھانہ بھون، پھپھول اور [illegible] لکھا ہے، کئی بیٹھے کرشن درست کر لیا ہے۔ تمہارے شعر و عروض درست کرتے رہے ہیں، تم بھی ان کی دھاک مانو۔ میں اور بیٹا بھی بھائی کی باتیں سن رہے تھے تو پھر کہہ دینے لگے فوراً بڑھ کر اور شوکت سے کہا، ملبوسات کو بھی ان کے رنگ کی مناسبت سے دھانی کہا جاتا ہے۔ میری بھولی بیگم پنجاب میں! کیا پیارا نام لگتی ہے۔ میں نے کہا، نہیں جناب لکھنؤ اور اس کے شہر جو خالص شاہی لکھنؤ تھا اور امانت نے اندر سبھا میں بھی سبز پری کہی ہے ؎

مشہور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں

شوکت نے یہ شعر سن کر اصل بات کا رخ تفریح کی طرف پھیر دیا اور سینہ پر ہاتھ پھیر پھیر کر گانا شروع کر دیا ؎

مشہور ہوں شوخی سے شرارت سے بھرا ہوں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پرا ہوں!

پہلے سے پرا تو شوکت نے نوعمری میں بنایا تھا، ایسی تانیث سے تذکیر کا قیاس فقط ساٹھ برس کی عمر میں بنایا۔ عمر میں بھی شوکت کے نخرے کم نہیں ہوئے۔ بیٹھے ہوئے میں نے نوکر لڑکے کو آواز دی "گنڈے لڑکے!" زہرہ بیگم شوکت کی پنجابی دلہن نے کمرہ سے نکل کر پوچھا "بھلا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!" "لڑکے سے چائے بانٹ کو کہا تھا" شوکت سمجھ گئے کہ میری مراد کیا تھی، ہنس کر کہنے لگے 'گنڈی' پنجابی میں خرگی کو نہ ورکتے ہیں مگر لڑکے کو گونڈا نہیں 'منڈا' کہتے ہیں۔ شوکت کی ادبی دیانت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ میری نوشتہ کتابوں، غزلوں وغیرہ کے اپنے نام سے شائع ہونے کا اظہار اپنی کتابوں اور مضمونوں میں بارہا کیا ہے۔ اگر وہ اس جرأتِ اخلاق سے کام نہ لیتا تو میں بھی اس مضمون میں ان کو حذف کر دیتا۔ جب اس کی صلاحیت پورے طور پر ابھر آئی تو بڑے بڑے ادبی لطیفے نظم اور نثر دونوں میں اس سے سرزد ہوئے۔ ایک بار خواجہ عزیز الحسن جو برہنہ نیک نفسی ڈپٹی کلکٹری کرتے کرتے کوشش کر کے انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ پر منتقل ہوئے اور خان بہادر ہونے پر کبھی اس خطاب کا استعمال اپنے نام کے ساتھ جائز نہ رکھا، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ مشاعرہ میں غزل پڑھنے بیٹھے، مجذوب تخلص کرتے تھے اور بڑی وارفتگی کے عالم میں غزل پڑھتے تھے۔ اہل محفل ہمہ تن گوش تھے۔ مجذوب صاحب نے مطلع پڑھا ؎

کیا سے کیا تو نے یہ اے شوقِ فراواں کر دیا
پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کر دیا

یہ سن کر شوکت سے ضبط نہ ہو سکا۔ خواجہ صاحب کو روک کر کہنے لگے پہلے میرا مطلع سن لیجئے۔ حاضرینِ مجلس نے بہت کچھ کہا کہ غزل پوری کر لینے دیجئے پھر آپ ارشاد فرمائیے مگر شوکت کہاں ماننے والے تھے، آخر اجازت مل گئی تو پہلے آپ نے خواجہ صاحب کا مطلع دہرایا اور مصرعہ ثانی پر زور دیا کہ پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں کر دیا اور کہا میں عرض کرتا ہوں ؎

کیا سے کیا بیرم کو اکبر تو نے ہاں ہاں کر دیا   پہلے خاں پھر خانِ خاں، پھر خانِ خاناں کر دیا

[illegible] جناب [illegible] صاحب [illegible] ہو رہے ہیں۔ شوکت بھائی کے جاننے والے [illegible]
بات کہنے کی جرأت کرتے [illegible] جب ان کے سامنے تو وہ [illegible] جواب دینے سے گریز کرتا [illegible]
جواب [illegible] قریشی

جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا تو شوکت کو بھائی جان [illegible] بڑے [illegible] کر دیتا۔ [illegible] رسول شمسی کی [illegible] حال ہو چکا تھا۔ وہ طالب علمی [illegible] سے اوپر ہونے کے بعد [illegible] گئے۔ [illegible] دوں کا اعتماد کر سکتے۔ وہ ایک [illegible] حیثیت [illegible] وقت [illegible] مسکراتے [illegible] صاحب [illegible] آپ کی [illegible] شوکت [illegible] آپ [illegible] تعجب ہو [illegible] یہ لوگ اپنی بیٹیوں اور بچیوں کی شادی ہی کیا کرتے ہیں۔ چٹھیاں [illegible] حضرت [illegible] ہے۔ ایک صاحب جو باتیں [illegible] شوکت [illegible] اور [illegible] چلے [illegible] شوکت [illegible] جب وہ [illegible] بیٹھے تو شوکت بڑے [illegible] ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور [illegible] کہا۔ میری بہت ہی بڑی [illegible] درخواست ہے۔ وہ اور بعض دوسرے احباب [illegible] اپنے [illegible] صاحب نے اپنے آپ کو [illegible] بڑی خندہ پیشانی سے [illegible] شوکت نے [illegible] عاجزانہ انداز بیان کرنا: جب آپ وفات پانے لگیں تو مجھے اطلاع دے دیجئے گا۔ میں آپ کی کھال کا سوٹ کیس بنواؤں گا۔ یہ سنتے ہی قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہر شخص ان کی طرف دیکھتا اور ہنستا تھا۔ ان حضرت پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شوکت کے والد اور والدہ اپنے عقیدہ کی سے تحت عورتوں کے پردے کے شدید پابند تھے، ایسے کہ جب میں خلافِ ارشاد ان کی صاحبزادی [illegible] لکھنؤ سے [illegible] جاتا [illegible] میں گاڑی تبدیل ہوتی تو چچا جان ریلوے اسٹیشن کے سب انسپکٹر کو تار دے کر پلیٹ فارم کے ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لیے ڈولی کا انتظام کرا دیتے۔ میں نے پھر بھی حضرت گنج لکھنؤ کی انگریزی دکان میں جا کر اپنا [illegible] کا شوکت کو [illegible] اس کی چھوٹی بہن کا یکجائی فوٹو گروپ تیار کرایا۔ شوکت تو گھریلو معاملات میں میرے قدم بقدم چلا کرتے تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو انہوں نے بھی یہی جرأت ظاہر کی۔ میرا واقعہ تو کھل چکا تھا مگر انہوں نے فوٹو احتیاط سے رکھے۔ میں لکھنؤ گیا تو مجھے خوش ہو کر دکھائے۔ میں نے ایک فوٹو لے کر اپنے بکس میں رکھ لیا۔ اس زمانہ میں شوکت میرے ایک دوست کے خلاف مقامی رسائل اور اخبارات میں مضامین لکھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے شکایت کی۔ میں نے تنہائی میں شوکت کو سمجھایا اور باز رکھنے کی کوشش کی۔ جواب ملا کہ بھائی جان آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر مگر میری شخصی ذمہ داریاں بھی کچھ ہیں، یہ فرض تو بہر صورت مجھے انجام دینا ہی پڑے گا۔ مجھے بھی ایک ترکیب سوجھی۔ میرے چچا جان ان دنوں بھوپال گئے ہوئے تھے اور لیاقت علی کے یہاں مقیم تھے۔ میں نے شوکت سے پوچھا، چوک کے ڈاکخانہ میں کتنے بجے تک رجسٹری مل جاتی ہے۔ کہنے لگے وقت ختم ہو گیا، کیا آپ کو کوئی رجسٹری کرنا ہے۔ میں نے کہا ہاں! —— لیاقت علی کو تمہارا اور شوکت دلہن کا فوٹو بھیجنا ہے کہ مبارک ہو۔ آپ کے آزاد خیال بھتیجے نے اپنی دلہن کے ساتھ فوٹو کھنچوایا ہے۔ یہ سنتے ہی شوکت گھبرا گیا۔ وہ جب سے خود کشی کی دھمکی کے نتیجہ میں بھرے بھرے [illegible] کمپنی سے مس کرا چکے تھے، باوجود تنہائی

شفقتوں کے سایے آبا سے بہت ڈرنے لگے تھے۔ پہلے تو مذاق سمجھے، جب میں نے سنجیدگی برتی تو کہنے لگے۔ بات کی طرح یہ کہ سخت حامی ہیں۔ پھر تو وہ عاق کر دیں گے اور ناخوش ہو کر یہاں آتے ہی مجھے گولی مار دیں گے۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا چچا جان کے احساساتِ خاندانی اور عقائدِ دینی کی حفاظت کرنا میری بھی شخصی ذمہ داری ہے۔ یہ فرض تو بہرحال ادا کرنا ہی ہے۔ الغرض کہہ گئے میری نافرمانی کا علاج ہے۔ کچھ اور ہنستے ہوئے بولے، "میں آپ کے دوست کی مخالفت میں کچھ نہ کہوں گا۔ قسم کھاتا ہوں۔ پھر تو آپ سر لیاقت علی کو رجسٹری نہ کریں گے۔" چنانچہ معاملہ طے ہو گیا لیکن شوکت نے میری نیازی کا انتقام کئی برس بعد اس طرح لیا کہ ایک بار میں بیوی بچوں کو لکھنؤ پہنچا کر بھوپال واپس آ رہا تھا۔ شوکت اور ان کے ماموں زاد بھائی محمد ہاشم، محمد اکرم اور میرے بعض احباب مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے۔ قلی نے سامان گاڑی میں رکھا۔ میں پلیٹ فارم پر ان لوگوں سے باتوں میں مشغول تھا، شوکت ڈبے میں میرا سامان رکھوا رہے تھے۔ وہاں ایک مردِ معقول اور بیٹھے تھے۔ شوکت نے ان سے کچھ کھسر پھسر کی اور جب میں گاڑی میں سوار ہوا تو بستر کھول کر بچھایا کیونکہ رات کے ۱۰ بجے تھے۔ پھر یہ کہہ کر میرے جوتے کے تسمے کھولنے لگے کہ آرام سے لیٹ کر سو جائیے۔ میں نے کہا بھی کہ یہ سعادت مندی کیوں فرمائی جا رہی ہے۔ بڑی معصومیت سے باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ جب ٹرین چلی اور میں نے پان کھانے کو ڈبہ کھولا تو ایک گلوری ان ہم سفر کرم فرما کو بھی پیش کی۔ انھوں نے سر کو پیچھے ہٹاتے ہوئے بصد شکریہ نہیں نہیں میں پان نہیں کھاتا! حالانکہ ان کے سرخ ہونٹ ان کے پان خور ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ میں اس زمانہ میں سگریٹ بھی پیتا تھا تھوڑی دیر بعد میں نے سگریٹ کیس ان کی طرف بڑھایا، کچھ بوکھلاتے ہوئے لہجہ میں اس سے بھی انکار کیا۔ وہ اک باتیں کہیں تو کچھ عمل سے جواب دے کر اور سرک کر بیٹھ گئے۔ میں یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ وہمی سے آدمی ہیں۔ جب گاڑی کانپور کے قریب گنگا کے پل پر پہنچی تو میں یہ دیکھنے کو اٹھا کہ چاندنی میں سطحِ آب پر کیا دلچسپ منظر ہے، تو وہ صاحب کھڑکی کے آگے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔ آرام سے لیٹے رہیے، جھانکیے نہیں۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ صاحب ضرور کھسکے ہوتے ہیں۔ میں نے ڈانٹ کر کہا بھی کہ آپ کوئی خدائی فوجدار ہیں؟ مگر وہ مزاحمت بنے رہے اور عاجزانہ درخواست کرتے رہے کہ کھڑکی سے سر نہ نکالیے۔ میں یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ دماغ ذرا مختل معلوم ہوتا ہے، کہیں الجھنا نہ پڑے۔ اور گاڑی کانپور اسٹیشن پر رک کر آگے روانہ ہو گئی۔ میں سو گیا۔ ٹرین لیٹ ہو گئی تھی، جھانسی پہنچنے سے پہلے ہی دن نکل آیا۔ ایک صاحب کسی درمیانی اسٹیشن سے سوار ہوئے اور اگلی سیٹ پر دراز ہو گئے تھے، صبح ہوتے ہی وہ اٹھے، میں بھی بیدار ہو گیا تھا۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ صاحب بڑے تپاک سے بڑھے اور السلام علیکم کہہ کر بولے، "تحصیلدار صاحب آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" یہ صاحب سید افضل [illegible] اکسائز انسپکٹر اور میرے ملاقاتی تھے۔ میں نے بتایا کہ بیوی بچوں کو پہنچانے ایک ہفتہ کی رخصت پر لکھنؤ گیا تھا۔ وہ مردِ معقول جن کا رویہ مجھ سے بہت نامعقول تھا، حیران ہو کر ہماری باتیں سنتے گئے، پھر معذرت آمیز لہجے میں کہنے لگے، "صاحب معلوم ہوتا ہے مجھے بیوقوف بنایا گیا تھا۔ یہ صاحب جو لکھنؤ اسٹیشن پر بہت ہی ادب و احترام سے پیش آ رہے تھے وہ کون تھے؟" میں نے کہا "شوکت تھانوی!" وہ بے ساختہ کہہ اٹھے "ارے! کیوں؟ یہ جو شوکت تھانوی، شوکت تھانوی جو مشہور ہے۔ جناب کا اسم گرامی؟" میں نے کہا، "ارشد تھانوی!" کہنے لگے "وہ تو آپ کے چھوٹے بھائی ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں! ہم زاد!" مزید ہنسے اور ہنس کر ہنستے اور بتایا کہ آپ کے سوار ہونے سے پہلے انھوں نے مجھ سے بڑے نیاز مندانہ لہجہ میں کہا تھا کہ آپ آگرہ تک جا رہے ہوں تو ان کا خیال رکھیے گا۔ یہ میرے سب سے بڑے بھائی ہیں

[illegible] ادبی و شعری ذوق کے مالک [illegible] ہے [illegible] منصفانہ [illegible] ہے [illegible] بات [illegible] کے [illegible] تقاضے کے اس [illegible] سے جانا [illegible] کہ وہ [illegible] جاتا ہے۔ [illegible] آپ کی مخالفت اور تواضع سے [illegible] تھا۔ [illegible] حضرت نے [illegible] کہ [illegible] پر جانکے [illegible] دیا۔ سبب ہے کہ [illegible] کرو نہ چاہیں۔ اگر آپ نے [illegible] تھا [illegible] کا [illegible] آپ [illegible] میں نے [illegible] شوکت سے [illegible] کہے۔ آپ کی [illegible] مجھے [illegible] آپ کو پاگل بنا [illegible] سے یہ قصہ [illegible] کہ [illegible] بہت [illegible] ہے [illegible] نے تھے ہندوستان سے لے کر پاکستان تک اپنے [illegible] احباب میں ایک دلچسپ داستان [illegible] رہتے ہیں [illegible] جانتے ہوں، جانی پہچانے والی [illegible] کی ان کی زبانی [illegible] سے [illegible] تھی۔ شوکت [illegible] تھا [illegible] وہ ایک مستقل [illegible] میں [illegible] سب [illegible] خاص طور [illegible] سے [illegible] کر [illegible]۔ چچا جان کی وفات کے کچھ [illegible] جان [illegible] ہے کہ شوکت [illegible] بھائی سے بہت [illegible] اس کو [illegible]۔ میں نے کہا آپ کس وقت میری موجودگی میں اس کو [illegible] سمجھئے [illegible] کی طرح سمجھا دوں گا۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور کمرہ میں بیٹھ کر [illegible] سے کہا۔ [illegible] شوکت سے [illegible] بیٹا یہ تو تمہارا بھائی نہیں بیٹا ہے۔ [illegible] آئے دیکھ کر شوکت نے [illegible] جان سے کہا [illegible] آپ [illegible] آپ کا [illegible] رشتہ مناسب نہیں۔ [illegible] بیچاری اس کا مفہوم نہیں سمجھیں۔ میں نے کہا یہ مذاق تھا۔ [illegible] مذاق سے باز نہیں آتا۔ جواب میں ایک پیاری سی مسکراہٹ تھی۔ ایک بار [illegible] کے انسٹیٹیوٹ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ بھوپال سے میں اور [illegible] بھی مدعو تھے۔ [illegible] ایک [illegible]۔ [illegible] نے صدر [illegible] شوکت تو عموماً مشاعروں کے [illegible] طور پر [illegible] کرتے ہیں وہ سیکرٹری شپ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اگلے صوفوں پر خواتین کی نشست تھی۔ ان میں شوکت کی دلہن بھی تھیں [illegible] اور شوکت کے ساتھ آئی تھیں۔ کافی وقت گزرنے پر ایک ایک دو دو کر کے سب بیگمات چلی گئیں۔ شوکت کی دلہن اس [illegible] بیٹھی ہیں کہ ہمارے ساتھ گھر آئیں۔ صدر مشاعرہ نے شوکت سے کہا، یہ ایک بیچاری بہت دیر سے اکیلی بیٹھی ہیں۔ شوکت نے کہا، کہئے تو آپ کے پاس لاکر بٹھا دوں۔ صدر صاحب نے پوچھا یہ ہیں کون؟ شوکت نے بڑی سادگی سے جواب دیا، میری بیوی ہیں۔ جناب صدر کچھ جھینپ کر رہ گئے۔ ان کا نام یاد نہیں، شاید حلیم تھا یا صدیقی، شوکت کی یہ بیوی ایک محترم عزیز عالم باگل کی بیٹی ہیں۔ بعض رکاوٹوں کی وجہ سے میں ان کی شادی کی تقریب میں شریک نہ ہوا تھا، بعد میں لکھنؤ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر شوکت تھانوی مولوی محمد عمر بنے ہوئے ہیں اور پانچوں وقت کی نماز پوری پابندی سے پڑھتے ہیں۔ سعیدہ خاتون فرائض مذہبی کی پوری پابندی کرتی ہیں۔ سسرال میں آتے ہی اپنے شوہر کو بھی پکا نمازی بنا لیا۔ میں نے شوکت سے کہا، تم نے بڑا غضب کیا کہ حضرت عمر فاروق کی آنکھیں حضرت صدیق اکبر کے سامنے نیچی کر دیں۔ حضرت ابوبکر نے عالم ارواح میں حضرت عمر سے کہا کہ تمہارے ہم نام پوتے عمر بن صدیق نے خدا کے حکم سے نماز نہ پڑھی، رسول کریم کے ارشاد کی تعمیل میں نماز کی پابندی نہ کی۔ والدین، بزرگوں، استادوں کی ترغیب پا دا سے نماز پر آمادہ

نہ ہوا! ایسے سخت تارک الصلوٰۃ کو میری پہلی بیوی مرحومہ نے نمازی بنا دیا۔ تذکرہ چاہیے تھا کہ بیوی کے دباؤ میں آکر خود تو کیا نمازی بنتے خود بیوی کو بھی تارک الصلوٰۃ بنا دیتے۔ جب جی چاہے توبہ استغفار کر کے دل کا حال ہی جانتے۔ اس وقت تو یہ بات آئی گئی ہوگئی مگر ۳۱، ۳۲ برس بعد شوکت نے بہت ہی پُرلطف طریقہ پر اس کا اعادہ مسٹر معین الدین کی کوٹھی پر کراچی میں کیا۔ چائے نوشی اور مشاعرے کے جب سب ہی مراحل طے ہوگئے تو شوکت نے لکھنؤ کی روضہ والی عورتوں کی نقل بیبیوں کے مجمع میں کی جو گلی تصویروں کی کتاب کے ورق الٹتی ہوئی کہتی جاتی تھیں: "یہ بی بی فاطمہ کا لوٹا ہے جس سے وہ وضو کیا کرتی تھیں، یہ اس عورت کی تصویر ہے جس نے اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر غیر کو دودھ پلایا۔ اب دو سانپ اس کا دودھ پی رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔" شوکت نے یہ سب دہراتے ہوئے کہا: "اور یہ سید محمد جعفری کی تصویر ہے جس نے خدا کے حکم سے نماز پڑھی نہ رسولؐ کے حکم سے، نہ ماں باپ کے حکم سے مگر بیوی کے حکم سے بلا چون و چرا نماز پڑھنے لگے۔ قیامت کے روز ایک قوام کے ملتے پر بھڑوں سے پڑا ہوا آگے چلے گا، دوسرے جگنو کی دم۔" اس آخری فقرہ پر ساری محفل کشتِ زعفران ہوگئی۔ مدتوں پہلے کی وہ باتیں جو میں بطور مزاح کہتا تھا شوکت اپنے لطیف اضافوں سے کہیں کا کہیں پہنچا دیتا۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ ریاست بھوپال کے ایک دور افتادہ سب ڈویژن میں بحیثیت تحصیلدار، منصف و مجسٹریٹ پرگنہ میں تعینات تھا۔ تو شوکت وہاں گئے۔ میرا مستقر "سہیلون" نام کی بستی میں تھا۔ وہاں سے ریلوے اسٹیشن "باموره" کا فاصلہ دس بارہ میل تھا۔ سڑک خام، بیل گاڑیوں میں آتے جاتے تھے۔ شوکت نے واپسی کا قصد کیا اور کہا لکھنؤ جانے والی ٹرین شام کو چار بجے جاتی ہے۔ میں ابھی سے باموره چلا جاؤں۔ ان کی باجی نے کہا دوپہر ہو چلا ہے، دھوپ کی تیزی میں نہ جاؤ۔ میں نے کہا شام کو جانا۔ اسٹیشن ماسٹر میرے ملاقاتی ہیں وہ پلیٹ فارم پر ہی تمہارے پلنگ بچھوا دیں گے۔ رات کو آرام سے سونا۔ سویرے تمہاری گاڑی ملے گی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر چلے جانا ناشتہ کے ساتھ تازہ چائے بھی وہی پلا دیں گے۔ چھوٹا اسٹیشن ہے وہاں چائے وغیرہ نہیں ملتی۔ شوکت بولے ثریا جی بھی ساتھ چلیں۔ اگر اسٹیشن پر مجھے نیند نہ آئی تو وہ کہانیاں سنا کر مجھے سلا دیں گی۔ بیوی نے کہا، کاش بوا جعفری خانم باموره کی اسٹیشن ماسٹر ہوتیں تو ہمارے بھیا کو بہت آرام ملتا۔ اٹھتے بیٹھتے بھیا کو دیر ہوتی تو اپنے ممدوح (محمد عمر) کے لیے وہ آئی ہوئی ٹرین کو بہت دیر روکے رکھتیں۔ اس پر سب جعفری خانم کی اسٹیشن ماسٹری، ان کے انتظامات پر بہت مضحکہ خیز گفتگو کر کے ہنستے رہے۔ یہ باتیں شوکت کے حافظہ میں مدت تک محفوظ رہیں اور ایک وقت ایسا آیا، لاہور کے ایک رسالہ میں "سودیشی ریل" کے عنوان سے ایک بہت ہی پھڑکتا ہوا مضمون شائع ہوا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ مولوی محمد عثمان صاحب نے جو شوکت کے قریبی رشتہ سے خالہ زاد بھائی اور شوکت دلہن کے چچا تھے، چودھری سر ظفر اللہ سے ملایا۔ چودھری صاحب ان دنوں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے۔ انہوں نے شوکت کے اس مضمون کو سرکاری حلقے میں موضوعِ سخن بنایا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اس وقت کی غیر ملکی حکومت کے لیے یہ مضمون بہت کارآمد تھا۔ شوکت کو ایک معقول معاوضہ دیا گیا۔ نظرثانی اور کچھ اضافے کے بعد کتابی صورت میں اس کی اشاعت ہوئی، انگریزی میں ترجمہ ہو کر لندن میں شائع ہوا۔ یہاں ایک اور لطیفہ یاد آگیا۔ جعفری خانم ہماری بیگم کی مزاج داں اور مزاج شناس، اتالیق اور بتدریج ان کی مشیرِ خاص کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ یہاں تک کہ خانگی معاملات میں بھی اس کی رائے کو بہت دخل تھا۔ میں اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا اور شوکت میرے قدم بقدم چلنے کی وجہ سے اس کے کھٹکتا تھا

سمجھ رہے تھے [illegible] گئی تھی۔
رستے میں جہاں ان کی خالہ [illegible]
[illegible] کتاب وغیرہ [illegible] جانی تھی
[illegible] بھیج دیا۔ ایسے پُر تکلف کھانے سے [illegible] لکھنؤ میں [illegible]
[illegible] جعفری [illegible]
[illegible] آپ [illegible]
زندگی میں کر دیتے [illegible] ایسی بڑی بات [illegible] آپ [illegible]
[illegible] جعفری خاندان کے تورے کا [illegible] نواب [illegible]
اور ایک [illegible] بیان [illegible] میں نے شوکت سے کہا۔ آج بڑے شان کی چیزیں [illegible]
[illegible]
میرے بھتیجے بھی میرا [illegible] کر دیتے [illegible] کھائیں گے۔ [illegible]
کا خوان گھر کی [illegible] شوکت بھی [illegible]

یتیم بچے مسجد میں بیٹھے ہیں۔ لاؤ میں ان کو یہ تورہ کھلا دوں۔ تم یہ خوان مجھے مت دو اور گھر جاؤ۔ اس سے دو خوان [illegible] لے کر کچھ دیر ہم دونوں رکے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلے اور باہر کے کمرہ میں بیٹھ کر [illegible] رہے۔ جو کچھ بچا ایک فقیر کو دے دیا۔ سامنے ہی سکرو کی دھوبن رہتی تھی۔ وہ یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس وقت تو چپ رہی، اگلے دن چچی جان سے آکر کہہ دیا کہ دولہا میاں (یعنی میں) اور میرے بھتیجے نے تورے کا کھانا باہر بیٹھ کر کھایا تھا۔ ہم نے خالی برتن یہ کہہ کر واپس کیے تھے کہ یتیموں کو کھلا آئے ہیں۔ چچی جان دھوبن کی رپورٹ سن کر بہت بگڑیں کہ اللہ کے فضل سے جوان ہو، بیوی بچوں والے ہو، نوکر چاکر ہو، خود بھی بدنیتی کرتے ہو اور چھوٹے بھائی کو بھی بدنیت بناتے ہو، شرم نہیں آتی۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے میاں تحصیلدار ہیں اور نیت کے ایسے خوار ہیں کہ فقیروں کے حصہ کا کھانا چوری سے کھا گئے۔ میں نے کہا چھوٹے بڑے ہو کر بھی بزرگوں کے سامنے بچے ہی ہوتے ہیں اور طفلانہ شرارتیں ان میں عود کر آتی ہیں۔ شوکت تو آخر عمر تک خاندان کے بزرگوں سے ہونہال بچہ بنا رہا۔ چچا جان کی وفات کے بعد وہ میرے پاس بھوپال آیا۔ میں ان دنوں ایک تحصیل کا انچارج تھا اور نواب صاحب کے وزیر خصوصی بسلسلہ دورہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے شوکت کی ملازمت کے لیے عرض کیا اور وہ تحصیلدار مقرر کرنے پر آمادہ ہو گئے، شوکت گھر میں باجی کے پاس جا کر رونے لگے کہ بھائی جان مجھے لکھنؤ چھڑا کر دیہاتی ماحول میں قید کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے خبر ہوئی تو سمجھایا کہ بیٹا، تمہاری بیوی ہے، کچھ دنوں میں بچے ہو جائیں گے۔ انگریزی حکومت میں ملازمت کے لیے تمہارے پاس تعلیمی سرٹیفکیٹ نہیں۔ تمہارے ابا کی دیرینہ خدمات اور باقیماندہ رسوخ کی وجہ سے تمہیں یہ سنہری موقع مل رہا ہے، کیوں کفرانِ نعمت کرتے ہو۔ آگے چل کر ترقی پاؤ گے۔ نائب ناظم (ڈپٹی کلکٹر) ہو سکتے ہو، اور قسمت نے یاوری کی تو ناظم ضلع یعنی کلکٹر بھی بن سکتے ہو۔ شوکت بظاہر رضامند ہو گئے اور بڑے ابا یعنی میرے والد سے مشورہ کا بہانہ کر کے بھوپال آئے اور وہاں سے لکھنؤ پہنچ گئے۔ بعد

بنا مصلحت آمیز خط کے ذریعے مجھے اطلاع دی کہ میں نے روزنامہ ہمدم کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں ملازمت کر لی ہے۔ میں بھی علمی اور صحافتی کام کر رہا تھا۔ دونوں کا مستقبل اس وقت کی ملکی فضا کے اعتبار سے کچھ امید افزا نہ تھا۔ افسوس کر کے رہ گیا۔ اس کی تعلیم حمیدیہ ہائی اسکول کے آٹھویں درجے تک تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو دماغی و ذہنی صلاحیتیں اس قدر ارزانی فرمائی تھیں کہ آخر میں اس نے روز افزوں ترقی کی اور میں ہر اعتبار سے اس سے پیچھے رہ گیا۔ جب اخباری لائن سے نکل کر ریڈیو سے وابستہ ہوا اور بھوپال کے شاہی مشاہرہ میں آیا تو سر سلام الدین وزیر قانون و انصاف کے نیم سرکاری اخبار "ندیم" کی ادارت بیک معقول مشاہرہ کی پیش کی۔ شوکت نے لسان الحال ریڈیو جو ماہانہ رقم مجھے مل رہی ہے۔ آپ اس سے دگنی قیمت پر مجھے لینا چاہتے ہیں، اس کا بہت بہت شکریہ مگر ریاستی فضا میں صلاحیتوں کا جو خون ہوتا ہے، اس کی مثال میرے سامنے بھائی جان (ارشد تھانوی) موجود ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ تحصیلدار ہو جاتا اور آگے ترقی بھی کرتا۔ تو یہ شہرت یہ ہر دلعزیزی اور یہ وقار۔ جو اسے اپنی خوشگوار ذہنی زندگی میں حاصل ہوا اس کا عشر عشیر بھی میسر نہ آتا۔ اس کی تمام ذہنی امنگیں اور سے فرائض اور ملازمانہ قیود بند میں گھٹ گھٹ کر ختم ہو جاتیں۔ یا وہ بغاوت یا مستعفی ہونے پر مجبور ہوتا۔ اس کی زبان جب گھر کے بزرگوں اور خاندان کے چھوٹے بڑوں کو نہ بخشتی تھی، تو ریاستی غلامانہ ذہنیت رکھنے والے اصحاب کیا رکب اس سے بچ سکتے تھے۔ نتیجہ خطرناک ہوتا۔ اگرچہ اس کا مذاق اور طنز و مزاح بہت لطیف، بالواقع اور شائستہ ہوتا تھا کہ موضوع شخصیت بھی داد دیے بغیر نہ رہتی تھی، اس کے ساتھ حفظِ مراتب کا بھی پورا لحاظ رکھتا تھا۔ مجھ سے انتہائی بے تکلف اور ہمذوق ہونے کے باوجود ادب و احترام کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کے ماشاءاللہ تین ہونہار اور سعادتمند بیٹے ہیں۔ پہلے کا نام سعید عمر ہے، جو ماں اور باپ دونوں کے ناموں کا مرکب ہے۔ دوسرے کا نام خورشید عمر، بلحاظ قافیہ ان کی پھوپھی (خاتون ارشد) نے رکھا۔ جب تیسرا بیٹا ہوا اور شوکت نے مجھے تار پر اطلاع دے کر نام رکھنے کی استدعا کی تو میں نے اپنے نام پر اس کا نام رشید عمر تجویز کیا چونکہ میرا نام رشید احمد ہے اور بچی چچا سب مجھے رشید کہتے تھے، اس لیے شوکت اور اس کی بیگم نے اپنے بچے کو رشید کہہ کر پکارنا میری بے ادبی سمجھا اور اسے بابا کہنے لگے، اب وہ خدا کے فضل سے جوان ہو گیا ہے۔ مگر سب اسے بابا ہی کہتے ہیں۔ کیسی رنجدہ بات ہے کہ ان خصوصیات کے باوجود ۱۹۵۲ء میں وہ اپنی بہن یعنی میری بیوی اور اسی کے ساتھ مجھ سے سخت کبیدہ ہو گیا، اور مرتے دم تک یہ آزردگی رہی۔ حالانکہ اسی کی اصرار آمیز طلبی پر میں اپنے ارادے سے کچھ پہلے ہی پاکستان آیا تھا۔ اور ہم لوگوں کے یہاں پہنچنے پر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شوکت ان دنوں لاہور میں تھے اور ریڈیو اسٹیشن سے متعلق۔ میرے لیے انھوں نے ایک ادبی و علمی کاروبار اعلیٰ پیمانہ پر چلانے کی تجویز سوچ رکھی تھی۔ مگر بعض خانگی مصلحتوں کی بنا پر شوکت کی مرضی کے خلاف میں کراچی چلا آیا اور ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہو گیا۔ مگر شوکت کی آزردگی کا سبب یہ نہ تھا۔ حقیقت کچھ اور ہے۔ بیگم ایک سلیقہ مند کفایت شعار اور معاشرتی ربط و ضبط سے محتاط رہنے والی خاتون ہیں، شوکت حد درجہ فیاض، احباب نواز، عزیزوں رشتہ داروں کی دل کھول کر مدارات کرنے والا سیر چشم بلند نظر انسان تھا۔ اس لیے میاں بیوی کی افتادہ طبیعت میں ذرا بھی ہم آہنگی نہ تھی، شوکت جو ابتدا سے شعر "با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا" پر عامل تھا۔ اپنی شریک زندگی کی خاطر شکنی کیسے گوارا کرتا۔ اس نے اپنے احباب کی پذیرائی کا جداگانہ انتظام کر لیا۔ اس کی سن گن پر ناگواریاں پیدا ہوئیں۔ دو ایک بار میں نے ان ناگواریوں کو خوشگواریوں میں تبدیل بھی کر دیا۔ لاہور آنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں آخر شوکت نے لاہور کی ایک لکھی پڑھی خاتون سے عقد کر لیا۔ اس سلسلہ میں سعیدہ خاتون سے تلخی پیدا ہوئی اور اس قدر

مگر شوکت اپنی کمال چابکدستی اور شائستگی کی بنا پر کبھی [illegible] نہ ہونے دیتے۔ [illegible] نکاح میں تین بیویاں [illegible] بیگم کے ساتھ رہے۔ ان کی وفات سے اب تک کہ پندرہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان میاں بیوی نے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھی۔ یہاں تک کہ جب شوکت مرض علالت میں مبتلا ہو کے سیو اسپتال میں داخل ہو رہے تھے، (غالباً ڈاکٹروں کے مشورہ پر) سعیدہ خاتون ان کو لینے نہیں گئیں۔ مگر یہ بیٹی کسی خوف کے احساس سے [illegible] علیحدہ ہو کر دعائیں مانگتی رہیں۔ پھر وفات ہو جانے پر بھی حسب بیان آخری دیدار بھی نہ کیا۔ زہرہ بیگم دن رات بیچاری شوہر کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں اور اسپتال سے انہی کے گھر پر جانے کے دو تین روز بعد شوکت نے جان شیریں جان آفریں کے سپرد کی۔ اس پندرہ سالہ علیحدگی کے دوران میں میاں بیوی کے درمیان مراسلت بھی بند ہی رہی۔ اور شوکت ایک رقم اپنی بڑی بیوی کو پوری پابندی سے ماہ بماہ بھیجتے رہے۔ شوکت کی بیوی سے کھٹ پٹ رہی۔ ان کا اصرار تھا کہ اس بے تعلقی کو ختم کر دو، دونوں کے ساتھ رہتے رہو۔ انصاف کرو، میں بھی اسی بات پر زور دیتا تھا کہ بیٹے بھی زہرہ بیگم والے گھر پر نہ جا سکتے تھے، ریڈیو اسٹیشن پر ضرورتاً مل لیتے تھے۔ پھر جب وہ روزنامہ جنگ کے ادارہ میں کراچی آکر شامل ہوئے تب بھی ان کے بیٹے ان کے گھر نہ جا پاتے تھے۔ چچی یا خالہ کے یہاں رہتے اور دفتر روزنامہ جنگ میں جا کر ملتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شوکت کو اپنے بیٹوں سے محبت نہ تھی۔ وہ رنج تو کرتے [illegible] ایسا کرتے تھے اور بچوں کی بہبود کا پوری شدت سے خیال رکھتے تھے۔ ایک موقع پر تار دے کر سعید عمر کو لاہور سے بلایا۔ اپنے تعلقات سے کام لے کر پی آئی اے کے شعبہ انجینئرنگ میں بھرتی کرایا۔ جہاں اب وہ آٹھ سو روپیہ ماہوار پاتے ہیں۔ دوسرے بیٹے کو واپڈا میں ایک معقول جگہ دلوائی۔ دونوں کی شادیوں میں شریک تو نہیں ہوئے۔ مگر مصارف کے لیے بڑی بڑی رقوم بھیجیں۔ ایک سہرے کا شعر ہے

سیہ وزند کا ہے نہ ہے دل و جگر کا سہرا
ہے سعیدہ کی دعاؤں کے اثر کا سہرا

زہرہ بیگم بقول شوکت "اچھی عورت ہے" اس کا ثبوت یہ ہے کہ شوکت کے جس لڑکے نے ایک بار اپنی سوتیلی ماں کی سخت توہین و تذلیل کی تھی، جب وہ اپنی بیوی کو لے کر شوکت کے دوران علالت میں سوا اسپتال گیا۔ تو اس کی دلہن کو زہرہ بیگم نے چھاتی سے لگا کر پیار کیا، مٹھائی منگا کر ساتھ کی۔ اور کہا دلہن تم ایسی جگہ ہی ہو کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے متعلق اگرچہ یہ حقیقت نہ تھی۔ شوکت میرے متعلق یہ یقین رکھتے تھے کہ سعیدہ کی طرفداری میں، میں زہرہ بیگم کا سخت مخالف ہوں، اسی لیے جب ان کے بیٹے کبھی عدم شفقت کی شکایت دفتر جنگ میں جا کر کرتے تو ان کو یہ بدگمانی ہوتی کہ میں نے ان کو بھڑکایا ہے۔ اور وہ میری شکایات [illegible] میرے پاس نہ ٹھہرنے کی ہدایت کرتے باایں ہمہ میرے احترام و محبت میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔ [illegible] میں کراچی میں سخت علیل ہوا اور مایوسی آمیز خط لکھا، یہ چند سال پہلے کی بات ہے شوکت نے جواب میں مجھے لکھا کہ پچیس تیس سال پہلے علی برادران کی تصویریں اخباروں میں چھپا کرتی تھیں، تو میری اور آپ کی تصویریں بھی "تھانوی برادران" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ آپ اطمینان رکھئے کہ موت کے سلسلہ میں بھی ہم تھانوی برادران، علی برادران ثابت ہوں گے۔ یعنی چھوٹے بھائی مولانا محمد علی کی وفات پہلے ہوئی اور شوکت علی بعد میں فوت ہوئے۔ اسی طرح پہلے میں مروں گا اور بعد میں آپ کا نمبر آئے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ آپ نہیں مر سکتے۔ شوکت کے شفیق ترین محسن، دوست جناب احمد سلمان صاحب کو یہ خط دکھایا تو وہ بولے بڑی سعادت مندی کی

بلکہ شاید اُس نے یہ پیشین گوئی کسی غیبی احساس سے کی تھی جو ۴ مئی ۱۹۶۳ء کو سچی ثابت ہوئی۔ جب ۶۰ برس کا بڈھا زندہ ہوں۔ وہ ۵۹ برس کچھ ماہ کی عمر میں داغِ مفارقت دے گیا۔ بعض اخبارات و رسائل میں اس کی عمر ۵۵ - ۶۵ سال بھی شائع ہوئی ہے۔ دوسرا عقد کرنے کے بعد اُس نے قرار دے لی تھی اور ۱۹۰۴ء کے بجائے ۱۹۱۰ء کے ۱۰ فروری کو اپنا ماہ پیدائش بنا لیا تھا۔ پہلے اپنی کتاب "مابدولت" وغیرہ میں خود اپنا تاریخی نام تسخیر احمد اور ۱۳۲۲ھ سنہ ولادت لکھ چکا تھا۔ فرہنگِ عامرہ میں جو شعرائے قدیم و جدید کی فہرست شامل ہے، اُس میں شوکت کا سنہ پیدائش صحیح لکھا ہے۔ اسی طرح لکھنؤ اور علیگڑھ میں اس کے زیرِ تعلیم رہنے کی بھی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں تقریر کی حصہ لینے کے لیے ضرورتاً بعد میں اضافہ کر لیا تھا۔ اس کی موت پر عمر کی ۴-۵ سال کی کمی بھی زیب دیتی تھی اور اس کی زبان و قلم سے اولڈ بوائے ہونے کی تائید بھی ہوتی تھی۔ جن لوگوں نے اس کو ریڈیو پر سنا ہے کیا وہ کہہ سکتے تھے۔ کہ یہ آواز محمد عمر کی تھی اور اصلی قاضی کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ لکھنؤ میں تو وہ خاص لکھنوی تھا ہی، بھوپال میں جہاں اکثر الفاظ کے زبر کو زیر کر دیا جاتا ہے۔ بالکل بھوپالی لہجہ میں بولتا تھا اور تھانہ بھون کے کوئی بزرگ ملتے تو اُسے نصف صدی پہلے کی ٹھیٹھ زبان استعمال کرتا تھا اور کسی کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ بقول حافظ؎

معشوق ما بشیوۂ ہر کس برابر است
با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

مرحوم نے خواہ اپنی عمر کسی وجہ سے کم کی ہو، اگر زیادہ بھی ہوتی تو بھی کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ آخر وقت تک جوان تھا۔ اُس کا دل جوان تھا۔ اُس کا دماغ جوان تھا۔ اُس کی زبان جوان تھی، اس کا قلم جوان تھا اور مجھے تو وہ ہمیشہ ایک چلبلا لڑکا ہی نظر آیا۔ اکثر اس سے باتیں کرتے ہوئے میں اپنی طفولیت کا کوئی واقعہ بیان کرتا تو کہا کرتا تھا۔ شوکت جب میں تمہاری برابر تھا تو وہ ہنس کر کہتا۔ بھائی جان اب بھی لڑکا نہیں رہا اب میں تو لڑکوں کا باپ ہوں۔ چھوٹی بیوی زہرہ بیگم کے بطن سے اس کی تین لڑکیاں ہیں۔ بڑی بچی کا نام شوکیہ ہے، منجھلی کا فوزیہ اور چھوٹی کا نفیسہ۔ شوکیہ ترکی لفظ ہے، جس کے معنی تابانی اور درخشندگی کے ہیں، اس نام کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ بھوپال سے کسی زمانہ میں ایک نسوانی رسالہ "الحجاب" کے نام سے نکلتا تھا۔ اس میں ایک ترکی افسانہ کا ترجمہ شائع ہوا۔ شوکیہ اس کا عنوان تھا۔ شوکت کی باجی کو یہ نام بہت پسند آیا۔ کہا کرتی تھیں کاش یہ نام میرا ہوتا۔ جب اُن کے بھتیجے نے اپنا تخلص شوکت رکھا تو انھوں نے کہا، میں اس کی بچی کا نام شوکیہ رکھوں گی۔ شوکت بھی باجی کے اس خیال میں شریک ہو گئے، مگر ان کے متواتر لڑکے ہوتے رہے، لڑکی کوئی نہ ہوئی اور ولادت کا یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ شوکت اور ان کی باجی کی یہ خواہش دل کی دل ہی میں رہی، یہ نام اگر پیشِ نظر نہ بھی ہوتا تو بھی شوکت کو مُنّی بٹیا کو کھلانے کا بہت شوق تھا۔ میری لڑکی شہربانو بہت ہی چھوٹی سی تھی، شوکت جشنِ سالگرہ کے مشاعرے میں بھوپال آئے، جب تک گھر میں رہتے، ننھی بھانجی کو گود میں لیے رہتے۔ ایک روز قاضی محمد مکرم تحصیلدار کے یہاں مخصوص مشاعرہ تھا۔ شوکت شہربانو کو بھی لیے ہوئے چلے گئے اور مشاعرے میں پہنچ کر اپنے گھٹنوں پر شہربانو کو لٹا لیا۔ جگر صاحب برابر بیٹھے تھے۔ جب جگر صاحب غزل پڑھ چکے تو شوکت نے شہربانو سے کہا۔ بیٹی تم بھی شعر کہا کرو۔ ننھی بانو نے فوراً پوچھا کیسے؟ شوکت کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ بچی شعر کو شیر سمجھے، ہنس کر جگر صاحب کی طرف اشارہ کر دیا۔ اب شہربانو ماشاءاللہ بڑی ہو گئی۔ ایم۔ اے ہے بی۔ ایڈ ہے۔ مگر شوکت اس کو ابھی تک شیر والی بانو کہتے رہے۔ مگر اللہ نے ان کی یہ آرزو پوری کر دی۔ جب انھوں نے دوسرا عقد کیا اور بچی پیدا ہوئی تو بہن کو خط لکھا۔ اللہ کا شکر ہے

ـــے خانہ کے سب کتنی طرح آتی سب سے خوبصورت لگتا ہے کہ جس کا چاہنے والا اب بھی کسی نہ کسی [illegible] بڑی نیند سو رہا ہے۔ شوکت نے
ہنسانے والوں [illegible] (خاتونِ مشرق) کو لکھا ہے۔

"ہم کبھی کبھی ابا کو یاد کر کے روتی ہیں وہ ہر وقت ابا کی محبت کی باتیں یاد آتی ہیں۔ کئی بار ابا کی قبر پر گئی تھیں
وہاں کے سناٹے میں [illegible] جانے کو جی چاہتا ہے کہ کسی طرح سے ابا کو دیکھیں لیکن کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ روتی رہتی ہیں ابا کی
پھر وہ اپنے آپ ہی سامنے آ جاتے ہیں۔ ہمارے سب کچھ وہ ہی تھے۔"

جب بھی جانے والے کے سب سے صاحبزادی [illegible] کا اور میرا دل ان معصوم بچیوں کی تڑپ پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ان معصوم پھولوں جیسی بچوں کی ماں پر کیا گزر رہی ہو گی جس کا آدمی جیتے جی پہلے ساتھ چھوڑ گیا۔ اس بچی کی ان ننھی کلیوں کی نگہداشت اور پرورش کا بوجھ اس پر آ پڑا۔ [illegible] ہر وقت [illegible] اس وقت [illegible] مقدم کرتی تھی جب [illegible] سے [illegible] تو اس بار کے [illegible] اس گھر میں گنجائش نہ تھی [illegible] وہ میرے ساتھ تھا [illegible] کھانے کے لیے شوکت و زہرہ نے بڑی ضد سے [illegible] آ کر کھانے کا پابند کر رکھا تھا خاص طور سے پُر تکلف کھانے بڑے اہتمام سے تیار کرتی، ہر ایک [illegible] اور دسترخوان پر [illegible] میری عادت ہمیشہ سے چاول میں قورمہ ڈال کر کھانے کی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب میں اس کو گنوار پن سمجھا جاتا ہے۔ پہلے دن جو میں کھانے بیٹھا، [illegible] سے پلیٹ میں چاول نکالے۔ زہرہ بیگم نے چمچہ بھر کر قورمہ اس میں انڈیل دیا۔ اس نے تو اپنی تہذیب کے مطابق مجھے زحمت سے بچایا تھا۔ میں سمجھا شوکت نے میری عادت سے واقف کر دیا ہو گا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ شوکت کی پلیٹ میں بھی زہرہ نے قورمہ ڈال دیا تو کہا، جناب شوکت صاحب سبحان اللہ تعالیٰ، کیا آپ بھی میری طرح گنوار پن اختیار فرمانا پسند کرتے ہیں۔ زہرہ نے حیرانی سے پوچھا، کیا بات ہوئی، میں نے کوئی بدتمیزی کی؟ میں نے کہا، تمہارے لکھنوی الاصل تھانوی شوہر صاحب ہمیشہ قورمے سے سالن کھانے کو [illegible] سمجھا کرتے ہیں۔ زہرہ بولی، [illegible] تو جوڑ ہے۔ میں نے شوکت سے کہا، سنو وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ شوکت نے [illegible] تو کیا کسی فارسی شعر کا [illegible]

حکم زہرہ بیگم از حکم خدا است اینکہ این زہرہ بفرماید بجا است

افسوس کہ بعض غلط فہمیوں نے یہ فضا ہی بدل دی۔ آخری مرتبہ جب شوکت راولپنڈی سے کراچی آئے اور یونیورسٹی کے کسی مشاعرہ میں میری لڑکیاں ملیں تو دونوں کو چھاتی سے لگا لیا اور بہت دیر دونوں بچیوں کو ساتھ لئے ہوئے اپنی کار تک آئے اور اقبال صاحب صفی پوری سے جن کے ہاں ٹھہرے تھے آ کر کہا مجھے شہربانو، مہربانو ملیں تھیں، مگر باجی اور بھائی جان نے مجھے چھوڑ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس کی زندگی کے تیسرے دور نے اس کی باغ و بہار زندگی کو اندرونی طور پر خزاں آلودہ بنا دیا تھا۔ وہ آخری دورِ حیات میں شدید دماغی کشمکش اور ذہنی اذیت کا شکار رہا۔ جن شخصیتوں سے اس کے دل کی گہرائیوں میں بہت ہی محبت تھی، زبانی ان سے نفرت کا اظہار کرتی تھی؛ جن اعزہ کی طرف جذبات کھنچتے تھے، تصورات ان سے روگردانی کرتے تھے، اس کے اندرونی تقاضے کچھ اور تھے اور بیرونی اصرارات کچھ اور۔ اس میں انا بالکل نہیں تھی لیکن اپنی شخصیت کے وقار کا حد درجہ لحاظ اور پاس اس درجہ کہ اس کے لیے جیتے جی قربانی دے دی۔ اسے جگر کے سرطان کا مرض ہو گیا تھا، اگر نہ ہوتا تو اس کے دل کے ناسور اسے زیادہ زندہ نہ رہنے دیتے۔ میرے سامنے تو اس کی گھریلو اور نجی زندگی ابتدا سے رہی، اس لیے سب کچھ جانتا، سب کچھ سمجھتا ہوں لیکن اس کی اندرونی الم پذیری کو اس کے بالغ نظر احباب بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری نے اپنی تعزیتی ریڈیائی تقریر میں اس کے متعلق دو شعر ایسے بھی پڑھے جن میں اس کی

بھی ادیبوں کی طرف اشارے تھے اور جناب قدرت اللہ شہاب نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ "شوکت تھانوی سے بے شمار لوگوں کو حسد [illegible] لیکن اس کے اپنے دکھ اندر ہی اندر ناسور بنتے گئے۔ یہاں تک کہ اس ناسور نے چپکے چپکے گھن کی طرح اس کی زندگی کو کھا [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ شوکت کو اپنی موت کے دن کا ادراک ہو گیا تھا۔ ان کا بڑا بیٹا سعید عمر باپ کی علالت کی خبر [illegible] سے لاہور گیا۔ باپ کی حالت دیکھ کر رخصت [illegible] بڑھائی۔ جب وہ بھی ختم ہو گئی اور بظاہر شوکت کی حالت سنبھلی ہوئی معلوم ہوئی [illegible] گیا اور باپ سے روانگی کی اجازت چاہی تو شوکت نے کہا، بس بیٹے ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ سعید نے [illegible] ان کا سفر ملتوی کر دیا۔ [illegible] تک باپ کے قریب بیٹھا۔ شوکت نے کہا جاؤ میاں اب سو رہو۔ شب بخیر۔ خدا حافظ۔ سعید گومتی شاہ [illegible] اپنی والدہ کے گھر پہنچا۔ [illegible] دن سویرے جب زہرہ کے مکان پر آیا۔ اس کے پہنچنے کے چند منٹ بعد اس کو خدا حافظ کہنے والے باپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی [illegible] کو جنازہ اٹھا اور میانی صاحب کے قبرستان میں بیٹے نے باپ کے جسد بے روح کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا، شاید اسی آخری خدمت [illegible] شفیق باپ نے بیٹے کو روک لیا تھا۔ پھر [illegible] محلے کے حکیم سعید صاحب دہلوی نے جو کراچی سے عیادت کے لیے لاہور گئے تھے اور شوکت [illegible] سے اس وقت اپنے سسرالی گھر میں آ بیٹھے تھے۔ ان کے کمرۂ قیام کی حدت محسوس کر کے کہا تھا کہ میں کل اس کو ایئر کنڈیشنڈ کرنے کا انتظام [illegible] لیکن اگلے دن اس کی ضرورت باقی نہ رہی، اور اسی شام کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ مجھلے بیٹے نے [illegible] وقت کہا، ابا آپ کی اس آرام گاہ کو ایئر کنڈیشنڈ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بالآخر

ہوئے دوست رخصت ہوئی قبر بند
کھلا اب کہ کوئی کسی کا نہیں

مگر شوکت کے لیے یہ کہنا غلط ہے، اس کے سب کوئی ہیں۔ اس کی ماں جائی، اپنے بیرن کی تشویشناک بیماری کی خبر پاتے ہی صاحب فراش ہو گئی اور بیس دن گزر جانے پر بھی ہنوز مریض ہے، اس کی بڑی بیگم پیکرِ غم ہے، چھوٹی بیگم کی حالت تو ناقابل بیان ہے۔ بیٹے، بیٹیاں، بھتیجے بھانجیاں، سب ہی تو اُسے اپنائے ہوئے ہیں جتنا زندگی میں بھی نہ اپنایا تھا۔ میں انھیں سمجھانے میں لگا رہتا ہوں کہ ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

ہندوستان اور پاکستان میں اس کے دوست، اس کے قدر شناس جن میں عوام و خواص، اعلیٰ و ادنیٰ سب ہی شامل ہیں حد شمار سے باہر ہیں، سب ہی تو ماتم گسار ہیں اور دعائے مغفرت میں مصروف، کثیر التعداد، دلوں سے نکلی ہوئی یہ دعائیں اللہ تبارک تعالیٰ نے منظور کی ہوں گی، کیونکہ مرنے والے نے مخلوق خدا کے دلوں کو مسرت و راحت پہنچا کر حاصل کی ہیں، اور اللہ تعالیٰ جو بڑا رحیم و کریم ہے اُسے ابدی مسرت و شادمانی عطا فرمائے گا۔

ابا

رشید عمر تھانوی

اپنے والد کی طرح وہ بھی پیارے [illegible] وہ بہت [illegible] سے وہ [illegible] علاوہ [illegible] وہ عمر [illegible] نفس کا یہ عالم رہا ہرگز کسی شخص [illegible] تک [illegible] شاید [illegible] بھی اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔

زندگی بھر جس کے [illegible] وہ [illegible] بہت خوش [illegible] بہت سے چھوٹے بڑے شہروں سے [illegible] ہوئے پھرتے تھک گئے۔ اب وہی شکووں کا [illegible] اپنے رنگ سے اپنے دُکھ درد [illegible] انھیں [illegible] ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ خود اپنے ہی دکھوں کے بوجھ تلے دب گئے۔ اور ان حالات میں بھی انہوں نے اپنی کوئی جھلک [illegible] دوسروں کے [illegible] نہ بنایا۔

سب سے شوکت تھانوی چھن گیا مجھ سے میرا باپ — سب [illegible] مجھے [illegible] شفقت شوکت تھانوی اب بھی زندہ ہے۔ اور [illegible] اپنی تصانیف [illegible] ہمیشہ زندہ رہے گا [illegible] میرا باپ [illegible] ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔ سکھ کی نیند، چین کی نیند، جس میں نہ تو سے تنفس کی تکلیف ہے کہ [illegible] سانس [illegible] مستقل [illegible] نہ وہ [illegible] زندگی کی تلخیاں جو آخر کار [illegible] اب میں کس سے کہوں [illegible] اور میرا بچپن یاد آتے اس موڑ پر ——— جب میں اپنے پنگوڑے پر لیٹا چسنی یا ہاتھ کا انگوٹھا چوستا [illegible] گر جاتا تو ابا آتے اور دور ہی سے "با با" کہہ کر پکارتے، میں اپنی تمام مصروفیت چھوڑ کر اس مانوس آواز کی طرف دھیان دیتا۔ ابا میرے سینے پر جھک کر اپنی انگلی میرے ہونٹوں پر رکھ کر کہتے: "میرا بابا ہے [illegible]" ان کو اپنے پر جھکا دیکھ کر میری چھوٹی سی [illegible] ڈھلک جاتی میں کھلکھلا پڑتا۔ اور اپنے ہاتھ پیر چلانے لگتا وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر [illegible] کہہ کر [illegible] ورنہ معلوم کیا کیا کہتے پھر مجھے پالنے پر لٹا دیتے اور میں انہیں غوں غاں کرکے تکا کرتا اور سوچتا کہ یہ کون حضرت ہیں؟ کہاں سے آ گئے ہیں؟ ایک عجیب بھولے بھالے آدمی! مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ کبھی تو اس طرح منہ بنا بنا کر چٹکی بجا بجا کر "با، بابا" کہہ کر پکارتے ہیں۔ جب وہ مجھے پنگوڑے پر تنہا چھوڑ کر چلے جاتے تو مجھے دکھ ہوتا اور میں اس کا اظہار اپنے منہ کا پورا دہانہ کھول کر مختلف سُروں سے کرتا، کبھی کبھی میرے آنسو امڈ آتے اور کبھی ان آنسوؤں سے پہلے ہی ابا پلٹ آتے۔

امی جان نے اب اپنے طوطے کو رٹانا شروع کر دیا۔ اور اپنی گود میں مجھے بٹھا کر ابا کی طرف اشارہ کرکے کہتیں "ابا"

کہ "بابا" ابا میرے ہیں تمہارے "ابا"۔ امی جان کی محنت اور اپنی کوششوں سے کچھ ہی دن میں [illegible] سے اپنی ملاقات [illegible] کران کا نام آتا ہے۔ اور اب جب مجھے ان کی دور سے آواز آتی "بابا" ترس آتا۔ لیکن کہاں تم پہچانتے تھی اور اپنے ہاتھ سے معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ تو وہ بھی میرے قریب آئیں، مجھے "بچہ" کہتیں۔ اب کیا ہوا ہے اور پیار بھی کر دیتیں۔ مجھے خوب اچھا لگتا۔ میں کھلکھلا پڑتا۔ اور جب وہ مجھے گود نہ لیتیں تو پھر میں اپنا ریاض شروع کر دوں اور میری آواز سے وہ خوب بولتا تاکہ جو کرتا بات چیت ہوتی۔

پھر کچھ عرصہ امی کی گود میں رہ کر مجھے معلوم ہوا وہ اصل ان کا نام "بابا" نہیں بلکہ "ابا" میرے ہیں ان کا نام [illegible] ہے۔ اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا نام [illegible] بابا نہیں بلکہ اب جو کوئی میرا نام پوچھتا تو بس اتنا وہ سکھایا جاتا "میرا نام [illegible] بابا تھانوی تھا"۔

ابا لکھنؤ میں [illegible] آرگنائزیشن کے افسر بنے مقرر ہوئے۔ بالائی منزل پر ہم لوگوں کی رہائش تھی اور نیچے دفتر [illegible] انفارمیشن [illegible] دفتر کی ٹھاٹ باٹ دیکھ کر مجھے بھی افسری کا شوق چرایا اور اپنی مستقل ضد پر ابا کے ماتحت کے ساتھ والا کمرہ مجھے بھی افسری کے لئے مل گیا۔ جس میں میز سے لے کر گھنٹی، رنگین پنسلیں اور کرسی سے لے کر پانی کی صراحی غرضیکہ سب کچھ موجود تھا۔ اور میں میز کرسی لے کر بیٹھا رہتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ افسر ہو اور پھر بھی کچھ نہ کھینچا کرتا۔ اور پانچ منٹ بعد پھر اس کو چلا کر کاغذ اور اٹھے سیدھے حکم دیا کرتا۔ اتنا تو معلوم ہی تھا جو دفتر میں کام کرتا ہے اسے تنخواہ بھی ملتی ہے۔ لہذا پہلی تاریخ پر ابا کے کلرک کے پاس موجود ایک پرچی ملتی جس میں دو روپیوں کے ادھنے ہوتے۔ اس پرچی کو لے کر فوراً گھر جاتا اور ابا کی نقل کرتے ہوئے صدا ہی سے امی جان کو پکارتا "بھئی جلدی تنخواہ لے لیجیے مجھے ابھی دفتر کا بہت کام کرنا ہے"۔ امی جان اپنے [illegible] سے تنخواہ لے لیتیں اور ہم پھر اپنے کمرے میں آ کر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے میں مصروف ہو جاتے۔

دفتر کے نیچے لان میں ابا اپنی زیر نگرانی مشاعرہ کراتے۔ ذہنی مشاعرہ ہوتا۔ تمام بڑے بڑے شعراء آتے، رات بھر محفل بھی رہتی اور شیر چائے کے دور چلتے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تمام شعراء اپنا کلام سنائیں اور میں چپ رہوں۔ جوں ہی مشاعرہ شروع ہوتا ہم ابا کی گود میں مچلتے "ابا ہم بھی غزل پڑھیں گے"۔ آخر کار میری ضد ابا پوری کرتے اور میں مائیکروفون پر اپنا کلام سناتا۔

ملا چل رہا ہے اور صاحب جا رہے ہیں۔

جب یہ ملازمت ختم ہوئی۔ تو ابا لاہور آ گئے اور یہاں پنچولی آرٹ پکچرس میں ملازم ہو گئے۔ ہم سب کو لاہور آنا پڑا۔ ابا کو یقیناً لکھنؤ چھوٹنے کا غم تھا۔ لیکن فکر معاش پر مجبور تھے اور مجھے جو غم تھا وہ اپنی افسری چھننے کا۔

اب میں کافی قابل ہو چکا تھا۔ اور ابا کی سکھائی سیکڑوں کہانیاں از بر تھیں۔ بڑے بھائی سید عمر تھانوی اور منجھلے بھائی خورشید شوکت کو اکثر بیشتر ابا کا سکھایا سبق سنانا پڑتا۔ بھائی جان کے ہاتھ میں گیند دیکھی اور فوراً کہا "بھائی مجھے گیند دو" ان کے انکار پہ پہلے تو اپنے سبق سے نوازتا اور پھر خود ہی روتا ہوا، منہ بسورتا ہوا ابا کے پاس پہنچ جاتا اور فی البدیہہ کہانی گھڑ دیتا "بھائی مجھے گیند نہیں دیتے اور بہت مارا ہے۔" پھر فوراً مجھے گیند مل جاتی۔ میری التجا پر نہیں بلکہ دھونس سے۔ گھر کے تمام افراد کے علاوہ ابا کے

[illegible] بھی میری اس قابلیت سے تحفظ شدہ ہے [illegible] سے چلا گیا [illegible] مجھے یاد ہے جب پہلی دفعہ آپ کے [illegible] گھر کو [illegible] بیگم صاحبہ [illegible] نہیں۔ مجھے دیکھتے ہی [illegible] اور پھر جلد [illegible] کہا۔ [illegible] بیٹھے [illegible] لگے لیکن ایک شرط ہے [illegible] ڈرائنگ روم میں تو [illegible] آیا [illegible] بیٹھے ہیں [illegible] پاس جاؤ [illegible] کر آؤ۔ معلوم [illegible] فوراً سینہ تان کر چل دیا۔ [illegible] ڈرائنگ روم [illegible] صاحب، آپ [illegible] میں [illegible] بھی نہ [illegible] شعر [illegible] بولی [illegible] اور مجھے گود میں اٹھا لیا [illegible] مجھے اب بھی [illegible] یاد ہے — آج بھی [illegible] ماں جان کی طرف اشارہ کر کے پوچھتے [illegible] پہلے [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] بیٹھ جاتا۔ اور [illegible] گالیاں دے [illegible] خبیث [illegible] مجھے [illegible] پر [illegible] قہقہے [illegible]۔

امی جان کو عطر جمع کرنے کا شوق تھا اور مجھے اس کو تباہ کرنے کی عادت۔ [illegible] امی جان کو [illegible] میں مصروف پاتا چپکے سے [illegible] اور [illegible] سے عطر دان نکالتا [illegible] کی خالی بوتلوں میں [illegible] امی جان نے [illegible] عطر کو تیل کی بوتلوں میں منتقل کر کے پانی بھر دیا۔ پھر [illegible] سے تیار کردہ اس غلاف کو اپنے بدن پر بھی چپڑ [illegible] کو بھی بسا دیا [illegible] راستے کو معطر کرنے کا کام خوب چل گیا [illegible] جونہی عطر کی خوشبو [illegible] امی جان کی ناک تک پہنچتی وہ مجھ پر لعنت ملامت کرتیں [illegible] میری اس حرکت پر [illegible] اور پُرخطر حالات میں پناہ بھی انہی کی گود میں ملتی۔ [illegible] امی جان سے میری بہت بنتی تھی۔ وہ میری حمایت کرنے سے باز آتی ہی نہیں تھیں۔ بلکہ اکثر مجھے "خبیث" کہہ کر مارنے دوڑتیں اور منہ میں [illegible] مجھے کی جھلک [illegible]۔ اس کے برخلاف، آپا میری ہر حرکت پر خنداں ہوتے۔ میری کسی شرارت پر دھول دھپا کرنے کی بجائے اپنے سینے سے لگا لیتے۔ اسی لئے آپا سے خوب دوستی تھی۔ اٹھنا، بیٹھنا، سونا سب کچھ ان ہی کے ساتھ ہوتا۔ حالانکہ اکثر رات کو [illegible] بھی لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ سلاتے۔ اور میں بھی جب تک ان سے چمٹ کر نہ لیٹوں نیند نہیں آتی تھی۔ آپا بھی میرے بغیر نہیں سو سکتے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اب آپا کے اس خط سے ہوا جو کہ انہوں نے امی جان کو ۱؍ جون ۱۹۲۴ء کو لکھا تھا۔ جب کہ وہ تنہا لکھنؤ تھے۔ اور ہم تینوں بھائی اور امی جان بھوالی (نینی تال) آئے ہوئے تھے۔

"بابا مجھے اس قدر یاد آتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ اب تک یہ حال ہے کہ رات کو آنکھ کھل جاتی ہے کہ بابا کو پیشاب کرا لوں۔ اور مجبوراً خود ہی پیشاب کر کے سو رہتا ہوں۔"

جب تک آپا گھر میں رہتے میں شیر تھا جو دل چاہا وہ کیا۔ لیکن جونہی وہ دفتر روانہ ہوئے۔ مجھے بھیگی بلی بننا پڑتا۔ اور امی جان نے [illegible] ہاتھوں، میری لاکھوں دھمکیوں کے باوجود کہ "شام کو آپا سے شکایت کروں گا کہ آپ نماز پڑھ کر ہاتھ اٹھا کر آپا کو دیر تک گالیاں دیتی رہتی ہیں" پھر بھی مجھے پڑھنا ہی پڑتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس قابل ہو گیا۔ کہ بڑی بڑی گالیاں بکنے کے علاوہ چھوٹی

میں کہانیاں بھی پڑھ لیا کروں۔ پھر کیا تھا جب آبا دفتر جاتے تو مجھ سے کتابوں کی فرمائش کرتے۔ بعد میں کہانی کی کتابوں کی۔ وہ ہمیشہ اردو کی پہلی کتاب سبق پڑھ، اور امی جان ان کے بارے میں لکھا جا چکا ہے گرمی ہو یا سردی، پنکھا ہاتھ میں رکھنا ضروری ہوتا مجھے بھی اس کی ڈنڈی سے مار ملتیں اور جب دل چاہے اسے جھل بھی لیتیں۔ امی جان کی، کھانے کے بعد تھوڑے سے پان کے تھوڑا بہت۔ وہ دو گھڑی پڑھنے کے بعد آبا کے انتظار کی گھڑیاں شروع ہو جاتیں۔ پھر آبا آتے اور میری امید سے زیادہ بہت ساری خوبصورت سرورق والی کہانی کی کتابیں ہوتے۔ میں آبا سے مارے خوشی کے لپٹ جاتا۔ آبا خوب پیار کرتے چومتے ان کی میں جھک ہو جاتا اور سوچتا کتنے اچھے ہیں ہمارے آبا۔

محمد عقیل صاحب (مالک ادارہ فروغ اردو) اکثر آبا کے پاس آتے تھے۔ جب ان کو آبا کے مسودات لے جاتے دیکھا تو ایک بار پوچھا کہ آبا یہ آپ کے لکھے ہوئے کاغذ کیوں لے جاتے ہیں۔" آبا سے معلوم ہوا کہ ان کاغذات سے آبا کا ناول چھپ کر آئے گا تو بے حد حیرت ہوئی اور میری سمجھ میں نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اب میں ہر وقت عقیل صاحب کا انتظار کرتا کہ وہ آئیں اور میں ان کو لپکنے کے لئے دوڑوں کسی دن عقیل صاحب آتے تو کاغذ کے چند پلندے عقیل صاحب کے حوالے کر دیتا۔ اب چھپی ہوئی کتاب کا انتظار شروع ہو جاتا۔ آبا سے برابر اپنی کتاب کی بابت پوچھتا اور آبا پیار سے کہتے "بس جلدی چھپ کر آ جائے گی۔"

جب میری کوئی شرارت، شرارت کے دائرے سے بڑھ کر بدتمیزی بن جاتی تو آبا مجھ سے خفا ہو جاتے لیکن مجھ پر زندگی بھر غصے میں بھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ میرا بستر گول کیا، ہتھیلی میں اٹھنی رکھی اور کہا "چلیے گھر سے نکل جائیے۔" پہلے آبا کی طرف رونی صورت بنا کر دیکھتا لیکن ان کے دوبارہ کہنے پر چل دیتا۔ کہاں باہر نکل کر گھر کا ایک چکر کاٹتا پھر کسی چور دروازے سے اندر آ جاتا اور کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد آبا کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان سے معافی مانگ لیتا۔ آبا مجھے نہ صرف معاف کر دیتے، چمٹا لیتے بلکہ اپنی جیب سے کچھ پیسے نکال کر بھی دیتے اور گھر سے نکالتے وقت کی اٹھنی اس کے علاوہ ہوتی۔ ایک دفعہ جانے کیا بڑی بدتمیزی مجھ سے سرزد ہوئی اور آبا نے ایک اٹھنی میری ہتھیلی پر رکھی اور گھر سے نکل جانے کو کہا۔ مجھ کو مجبوراً نکلنا پڑا۔ کوٹھی کا چکر کاٹا اور کوٹھی کے پیچھے نوکروں کے پاخانے میں چھپ گیا۔ کافی دیر جب کھڑے رہ کر بیٹھا بیٹھا تھک گیا تو سوچا کہ چپکے سے دروازے سے اندر جھانکیں اور دیکھیں کہ آبا دفتر چلے گئے یا نہیں۔ اب جو اندر جھانکا تو کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہاں سے ہٹ کر گیراج کے پیچھے کوٹھی کے آگے دیکھا تو آبا کوٹھی سے باہر نالے کے پل پر کھڑے تھے۔ اور امی جان ان کے ساتھ تھیں۔ اتنے میں سعید بھائی، خورشید بھائی اور اقبال ماموں (اقبال صفی پوری) اپنی اپنی سائیکلیں لے کر آئے اور آبا نے ان سب کو مختلف سمتوں پر روانہ کر دیا۔ آبا کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ میں بے خیالی میں اب جھانکنے کی بجائے ان دونوں کے بالکل سامنے تھا کہ اتنے میں امی جان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں پھر چھپ گیا۔ لیکن دوسرے لمحے امی جان مجھ تک پہنچ گئیں اور مجھے گھر لے گئیں، جونہی آبا کو دیکھا میں نے رونا شروع کر دیا اور انہوں نے مجھے گود میں اٹھا لیا میری ہچکیاں رک گئیں۔ اور میں پہلے کی طرح شاداب ہو گیا۔

جب میرا بچپن اور جوانی آپس میں گلے مل رہے تھے، میری مسیں بھیگ رہی تھیں تو آبا کی فکر معاش انہیں کراچی لے گئی۔ اور وہ روزنامہ جنگ کراچی کے مدیر ہو گئے۔ میری تعلیم نے مجھے لاہور ہی میں رکھا۔ اکثر آبا کی یاد اس شدت سے ستاتی کہ دل چاہتا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر اپنے پیارے آبا تک پہنچ جاؤں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو ہم سب کراچی چلے جاتے۔ میں گھنٹوں آبا

[illegible] میں بیٹھی رہتی۔ وہ میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے۔ اور جب وہ لکھنے میں مصروف ہوتے تو میں پیار بھری نظروں سے ان کو مکمل انہماک کے عالم مصروف دیکھتی اور [illegible] رہتی۔

پھر جب روزنامہ تعمیر کا ماہانہ [illegible] بھی نکلنے لگا تو ابا جو پنڈی ہی کے [illegible] اب [illegible] کی چھٹیوں [illegible] ہونے کی وہ کشش ختم ہو جاتی تھی لیکن سیماب [illegible] بھی موجود ہیں۔ ان سے [illegible] کے ساتھ [illegible] ہو [illegible] پنڈی جانے سے پہلے ہی کم از کم ایک ہفتہ کے لئے [illegible] ہی رہا [illegible] حقیقت [illegible] ابا [illegible] تعلق [illegible] جانے سے پہلے [illegible] ایک [illegible] صحبت میں [illegible] وہ کسی [illegible] تھے۔ [illegible] ہنستے اور کبھی صرف خاموش ہو کر مجھے [illegible] آنکھوں سے دیکھتے [illegible] محبت، پیار و شفقت کی جھلک ہوتی [illegible] ایسی پرچھائیں [illegible] ایسا ہی گزرتا [illegible] آتے [illegible] سے [illegible] جب بھی انہیں بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے [illegible] پنڈی سے پہلے [illegible] تو [illegible] بہت [illegible] وقت [illegible] سے بھرپور خط بھیجتا۔ [illegible] شدہ سال مجھے [illegible] عید [illegible] خط کے موقع پہ [illegible] تھے۔ [illegible] سے ملے نہیں۔ تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ اور میں نے فوراً ان کو شکایت آمیز خط لکھا۔ جس کے جواب میں [illegible] کے علاوہ مجھے [illegible] لکھا:

> میں عید منانے [illegible] جیسی بدنصیب [illegible] پر [illegible] تھے۔ [illegible]
> رات کے [illegible] بجے خیریت سے روانہ ہو کر [illegible] صبح [illegible] لاہور پہنچا۔ اسی شام کراچی [illegible] جانے [illegible] سے
> پنڈی واپس آیا۔ [illegible] ملنے کا وقت تھا [illegible] ہفتے کی چھٹی
> لے کر [illegible] اور [illegible] دیکھنے [illegible] خوشی [illegible] بہت [illegible] کس قدر
> پوری نہ ہو سکے گی کہ انتخابات سر پر ہیں۔ [illegible] ابھی [illegible] چھٹی سے [illegible] ہوں۔

اور پھر ایک سال کی مدت کے بعد ابا واقعی لاہور آ گئے۔ ہم کو پنڈی سے لاہور لانے کے لئے نہیں بلکہ موت سے گلے ملنے کے لئے ——— اپنے وعدے پورا کرنے کی بجائے وہ خود ہم سے روٹھ گئے۔

۱۸ مئی کو سورج طلوع ہوا اور اپنی کرنوں میں رات کی سیاہی کے ساتھ ساتھ میری ماں کا سہاگ بھی سمیٹ لے گیا۔ ایک جھٹکے سے امی جان کی چوڑیاں ٹوٹیں اور [illegible] ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی رہیں ——— اور پھر کلمۂ شہادت فضا میں گونجا اور ابا کی بارات خدا کے گھر چل دی۔ وہ بارات جس میں خوشی کے شادیانے نہ تھے بلکہ ہم سب کے بہتے آنسو، جلتی ہچکیاں ———

آج ہر کوئی اپنی زبان سے کہتا پھر رہا ہے: "کتنے اچھے تھے ہمارے ابا، کتنے پیارے تھے ہمارے ابا" ——— اتنے پیارے کہ خدا کو پیارے ہو گئے ——— اپنے کہنے پر یقین نہیں آتا۔ اس وقت بھی کہاں یقین تھا۔ جب اپنی آنکھوں سے ان کے بے جان چہرے کو دیکھا۔ اپنے کاندھے پر سہارا دے کر ان کو ان کی آخری آرام گاہ تک لے گئے؛ اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی ——— جب سب کہتے ہیں تمہارا باپ مر گیا، تم یتیم ہو گئے تو بہتے آنسو ان کی اس بات کی صداقت تسلیم کر لیتے ہیں۔

پیارے ابا شوکت تھانوی

شوکیہ تھانوی

میرے ابا کو بچے سے لے کر بڑے تک کون نہیں جانتا ہوگا۔ جو لوگ شوکت تھانوی کو نہیں جانتے وہ قاضی جی کو ضرور جانتے ہوں گے اُن کے جنگ اخبار کے کالم پڑھنے والے (کچھ یادیں کچھ باتیں) ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام "قاضی جی" کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ میں اپنے ابا کے گھر سنہ ۱۹۵۱ میں پیدا ہوئی۔ یوں ان کی زندگی کی تمنا پوری ہوئی۔ جن کے لئے انہوں نے بہت سی منتیں مانی ہوئی تھیں۔ شاید کوئی لڑکے کے ہونے پر بھی اتنی خوشی نہ مناتے۔ جتنی کہ میرے پیدا ہونے پر منائی گئی تھی۔ ۴۰ دن کے بعد مجھے داتا صاحب کی حاضری کے لئے لے جایا گیا۔ امی اور ابا بہت ساری ریزگاری بھی فقیروں میں تقسیم کرنے کے لئے لے گئے تھے۔ دعا مانگنے کے بعد ابا نے ریزگاری بانٹنی شروع کر دی۔ لیکن اُس زمانے میں سنا ہے کہ فقیر اتنے تھے کہ خدا کی پناہ۔ کسی نے ابا کا کوٹ پکڑا کسی نے ہاتھ پکڑا مجھے دو مجھے دو کی لوٹ مار شروع کر دی۔ ابا تنگ آ گئے اور شرارت جو سوجھی تو ساری کی ساری ریزگاری ایک طرف زمین پر پھینک کر کہنے لگے کہ جاؤ بھائی آپس میں لڑو مجھ سے کیوں لڑتے ہو۔ اور خود ایک طرف کھڑے ہو کر اُن کا تماشہ دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اور کہنے لگے (امی کو زہرہ کہہ کے بلاتے تھے) کتنی اچھی کشتیاں تھیں۔

میری عمر اس وقت بارہ سال ہے۔ آج سے آٹھ سال پہلے کی کچھ باتیں تحریر کرتی ہوں۔ جب میں پانچ برس کی تھی تو مجھے کونونٹ سکول میں داخل کرایا گیا۔ ابا ریڈیو اسٹیشن پر تھے ہی۔ اسکول ابا کے راستے میں پڑتا تھا۔ اس لئے اُن کے ساتھ آنے جانے میں بہت خوشی محسوس کرتی۔ شام کے وقت فرش پر گھوڑا بننا ہم کو اپنی پیٹھ پر سوار کرنا ابا کا خاص مشغلہ تھا۔ جب پیٹھ پر بٹھا کر اِدھر اُدھر ہوتے تو امی کو ہمارے گرنے کی بہت فکر ہوتی۔ لیکن ابا ہنستے ہوئے کہتے کہ میں اس نسل کا گھوڑا ہوں جو کہ مالک کے گرنے پر بسم اللہ پڑھتا ہے اور چوٹ نہیں لگتی۔ تین سال کی عمر میں ہم نے گھر میں ایک کتا پال رکھا تھا۔ جس کا نام جیکی تھا۔ ایک دن میں نے ابا کی ڈبیا جس میں پان کتھا اور چونا تھا ابا سے چوری اٹھا کر جیکی کے پاس لے گئی اور جا کر کہا جیکی تو پان کھائے گی۔ ابا نے مجھے دیکھ لیا اور گود میں اٹھا کر کہنے لگے میری بیٹی بہت مہمان نواز بنے گی ایک مرتبہ جگر صاحب مرحوم ہمارے گھر آئے۔ مجھے بلایا گیا۔ میں جگر صاحب کو دیکھ کر سہم گئی۔ اور ان کی گود میں جانے سے انکار کر دیا۔ ابا کہنے لگے یہ تمہارے بڑے ابا ہیں۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ یہ دنیا کے ابا ہیں۔ دنیا اُن دنوں بڑے لمبے بالوں والی ایک گڑیا ہمارے گھر میں تھی۔ ابا اس مشابہت سے سخت شرمائے۔ لیکن جگر صاحب بھانپ گئے اور کہنے لگے شوکت یہ لڑکی بڑی ذہین نکلے گی۔ اور وہ

وزٹ نکال کر دیا۔

۱۹۵۹ء میں ابا ولایت چلے گئے اور واپس آکر جنگ میں ملازمت کی اور وہ پہلی بار کراچی چلے گئے۔

کراچی میں ہمیں چچا کے گھر میں رہنا پڑا۔ اُن کی اوپر کی منزل میں ہم سب لوگ رہتے تھے چونکہ اُن کے اور ہمارے گھر کے معاملات میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تھا۔ اس لئے وقت بہت اچھی طرح گزر رہا تھا۔ لیکن کراچی کی آب و ہوا نے ابا اور امی دونوں کی صحت پر بڑا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد چچا جعفری کی تبدیلی راولپنڈی ہو گئی۔ تب ابا کے دل پر بہت فرق پڑا۔ اپنے دل سے دعا کی یا اللہ مجھے بھی میرے بھائی کے پاس بھیج دو۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اپنا کام کر جائے۔ روزنامہ جنگ بھی راولپنڈی سے نکلنا شروع ہو گیا۔ پھر ابا بھی کراچی سے راولپنڈی آ گئے۔

راولپنڈی میں جو ہمیں گھر ملا وہ بہت چھوٹا تھا لیکن پھر بھی ابا بہت خوش تھے اور کہتے تھے مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے۔

ڈھائی سال کی کوشش کے بعد ہمیں ایک بہت اچھا مکان ملا جو کہ دیکھنے میں بہت خوبصورت تھا لیکن ہمارے لئے بہت منحوس ثابت ہوا۔ اور اس میں بدقسمتی سے چار مہینے ہی رہے۔

پہلے مہینے میں اس مکان میں یہ بدشگونی ہوئی کہ میرے ساتھ سخت حادثہ پیش آیا۔ میں نہانے کے لئے غسل خانے میں گئی کہ گیس نے اپنا اثر کیا کہ میں بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اس حادثہ کا ابا پر بہت اثر ہوا اور رات کو مجھے اٹھ اٹھ کر دیکھتے رہتے تھے۔ مارچ میں ابا کو بخار اور کھانسی نے آگھیرا۔ اگرچہ علاج کرانے سے بخار اور کھانسی کو آرام تو آگیا۔ لیکن باوجود اس کے ابا بڑے سنجیدہ رہنے لگے تھے۔ پھر چند دن بعد ہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کھانسی بخار ہو جاتا اور کبھی آرام آجاتا۔ کمزوری دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ ان ہی دنوں غلافِ کعبہ کی زیارت پنڈی میں ہو رہی تھی۔ لیکن ابا اپنی کمزوری اور لوگوں کی بے پناہ بھیڑ کی وجہ سے مجبور ہو گئے۔ اور امی سے کہنے لگے میری قسمت میں زیارت نہیں ہے۔ خلیل صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ شوکت فکر مت کرو۔ میں جلوس کے ختم ہونے پر غلاف آپ کے گھر لا کر آپ کی خواہش پوری کر دوں گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ابا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور سب کمروں میں لے جایا گیا۔ کہنے لگے میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میں نے گھر پر ہی زیارت کر لی اور کہنے لگے شوکیہ دعا کرو میں اور تمہاری امی وہاں جا کر حج کے موقعہ پر بھی زیارت کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔

۲۳ مارچ کو ابا اپنا تمغۂ امتیاز حاصل کرنے کے لئے لاہور تشریف لائے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ میں اپنا مکمل علاج لاہور جا کر ہی کراؤں گا۔ ۲۲ مارچ کو جب ابا لاہور ریلوے اسٹیشن پر اترے تو اسی وقت اُن کو ۱۰۱ بخار تھا۔ اور میرے بھائی ہمیں لینے کے لئے آئے تھے۔ دوسرے دن ابا کو ۱۰۱ بخار تھا اور گورنمنٹ ہاؤس جانا تھا۔ اسی حالت میں آپ وہاں گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات نیاز صاحب سے ہوئی۔ جو کہ ابا کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ نیاز صاحب اُن کی حالت دیکھ کر سخت حیران ہوئے اور کہنے لگے۔ کل میں آپ کو اپنے ہاں بلاؤں گا۔ میرے ہاں ڈاکٹر صالح میمن جو کہ پاکستان کے چند ڈاکٹروں میں سے ہیں۔ دکھایا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب معائنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ جگر میں پھوڑا ہے۔ ہسپتال داخل ہو جانا چاہیئے۔ لیکن ابا کا اصرار تھا کہ نیاز صاحب میں ہسپتال میں داخل نہیں ہوں گا۔ البتہ گھر پر ہی علاج کراؤں گا۔ کیونکہ ابا انجکشنوں اور دواؤں سے سخت گھبرائے ہوئے تھے۔

مگر یہیں کرنل یوسف کا علاج شروع ہو گیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے نے بذاتِ خود میو ہسپتال کے انچارج بھی ہیں معائنہ کیا اور کہا آپ فوراً ہسپتال میں داخل ہو جائیں لیکن ابا اب تک اس بات پر بضد تھے کہ میں کسی قیمت پر ہسپتال نہیں جاؤں گا۔ آخر جب گھر پر کسی قسم کا افاقہ نہ ہوا۔ تو ابا کے چند مخلص دوستوں نے اصرار کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر امی نے کہا کہ شوکت صاحب اگر آپ اپنے لئے نہیں تو کم از کم ان بچیوں کے لئے ہی ہسپتال چلے جائیے۔ رضامند ہو گئے۔ لیکن اس شرط پر کہ میرا اپریشن نہ ہو۔ ۹ اپریل کو ابا البرٹ وکٹر کمرہ نمبر ۵ میں بستر علالت پر لیٹ گئے۔ اور علاج شروع ہو گیا۔ امی نے بہت محنت کی رات دن تیمارداری کے لئے حاضر رہتی تھیں اور دعا کرتی رہتی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہسپتال میں ابا کو دیکھنے کے لئے ابا کے دوستوں اور عزیزوں کا ہر وقت جمگھٹا رہتا تھا جس سے نرسیں بہت گھبراتی تھیں۔

۱۹ اپریل کو ڈاکٹروں کا ایک بورڈ بیٹھا۔ ڈاکٹروں نے کینسر ہونے کا اعلان کیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس بیماری کا مکمل علاج تو ہمارے پاس ہے نہیں۔ البتہ جو انجکشن ہم لگا رہے ہیں۔ اُن سے شوکت صاحب کچھ عرصہ کے لئے اور زندہ رہ سکیں گے۔ جس سے ہم سب مایوس ہو گئے۔ ابا کی زبردست خواہش کے مطابق ۲۵ اپریل کو گھر لایا گیا۔ گھر آ کر ابا بہت خوش ہوئے اور ہومیو پیتھک کا علاج شروع کر دیا۔ تقریباً پانچ دن یہ علاج ہوا لیکن طبیعت دن بدن گرتی ہی گئی۔ ۳۰ اپریل کی شام کو حالت بہت نازک ہو گئی۔ ۱۵ منٹ تک بیہوشی کے عالم میں پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو امی نے پوچھا کہ آپ کو کیا ہوا تھا۔ تو کہنے لگے شوکیہ میرے سامنے آ کر بیٹھی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دل پر انگارے ہیں۔ اس لئے میں بے بس ہو گیا۔ اور بعد میں مجھے ہوش نہیں تھا کہ کیا ہوا۔

۴ مئی کو صبح ۵ بجے امی کو ابا نے آواز دی۔ اس وقت امی مسلسل جاگنے کی وجہ سے سو رہی تھیں۔ میں جاگی ہوئی تھی اندر ابا کے کمرے میں گئی۔ ابا کہنے لگے آؤ میری بچی میرے پاس بیٹھو۔ اور بتاؤ کہ اس مرتبہ عید کا کیا پروگرام ہے۔ میں نے کہا کہ اس مرتبہ تو امی نے ہمارے کپڑے نہیں بنائے اور یہ خواہش ہے کہ آپ کے ٹھیک و تندرست ہونے پر راولپنڈی جائیں گے اور وہیں جا کر میلاد شریف کرائیں گے اور نئے کپڑے پہنیں گے۔ اسی دوران امی بھی جاگ گئیں اور ابا کہنے لگے ہاں بیٹی صرف ایک گھنٹے کا پروگرام ہو گا۔ اس کے بعد امی نے تھرما میٹر لگایا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کو حالت بتانا تھا۔ امی نے ناشتہ دینا شروع کیا کہ چچا جعفری کے لڑکے علی جعفری تشریف لے آئے اور کہنے لگے۔ مجھے مکمل حالت بتائی جائے تاکہ میں ابا کو جا کر بیان کر سکوں۔ خالو نے کہا آپ اندر جا کر خود ہی دیکھ لیں۔ کیونکہ ابا اُس وقت بالکل خاموش تھے۔ اور کچھ کانپ رہے تھے۔ خالو نے امی سے کہا کہ باجی دیکھیں یہ کانپ کیوں رہے ہیں۔ اس عرصہ میں گھر کے سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اور امی سے نحیف آواز میں دو مرتبہ کچھ کہا جو سمجھ میں نہ آیا۔ اور لمبی سانسیں لینا شروع کر دیں۔ اسی وقت آبِ زمزم ان کے منہ میں ڈالا اور چھوٹے ماموں ڈاکٹر کی طرف بھاگے۔ لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ابا ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔

پیارے ابّا

خورشید شوکت

جولائی ۱۹۶۵ء کا غالباً آخری ہفتہ ہوگا۔ تاریخ ٹھیک سے مجھے یاد نہیں۔ بہرحال اُنہی دنوں میں ایک روز میں دفتر سے جلد فرصت پاکر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ کسی نے دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ میں نے بڑی بیزاری کے ساتھ بہت ہی افسرانہ انداز میں کہا "YES COME IN"

دروازہ آہستہ سے کھلا اور دیکھا کہ ابا مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ابا کی اس غیر متوقع آمد نے مجھے کچھ بوکھلا ... اور میری پیچھے جھکی ہوئی کرسی گرتے گرتے بچی۔ ابا کے ساتھ اُن کے لاڈلے نسیم ممتاز سید بھی تھے جن کو ابا بڑے پیار سے کرنل کہا کرتے تھے۔ حالانکہ اُن بیچارے کا بندوق کی گولی سے کہیں دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ میری اور ابا کی آخری ملاقات ہے تو میں کیوں اُن کو اتنی جلدی جانے دیتا۔ میں اُن کو لے کر کہیں ... تنہائی میں چلا جاتا جہاں میرا بچپن پھر لوٹ آتا، میں اُن کی گود میں سر رکھتا، اُن کے بالوں سے کھیلتا، اُن کی گردن میں باہیں ڈال کر جھولا جھولتا اُن سے اتنی بہت ساری باتیں کرتا، اتنی بہت ساری باتیں کہ جو کبھی ختم نہ ہوتیں۔ لیکن افسوس کہ میں کوئی خاص بات نہ کر سکا۔

میرے ساتھی ابا سے مل کے بے حد متاثر تھے اور اس وقت کی غیر متوقع ملاقات سے بہت خوش تھے۔ دراصل اُن کی خواہش تھی کہ اس تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں کرلیں اور میں خاموش بیٹھا ہوا بڑی فراخدلی کے ساتھ اُن کو یہ موقع فراہم کر رہا تھا۔ کاش میں جان سکتا کہ یہ لمحے میرے لیے کس قدر قیمتی ہیں۔

میں خاموش تھا لیکن میری آنکھیں ابا پر تھیں اور دماغ زندگی میں پہلی مرتبہ ابا کے جسمانی تغیر پر حیران تھا کہ ایک دم سے کیا ہوگیا — بال سفید۔ آنکھوں میں چمک کی بجائے ایک مستقل سوچ۔ چہرے پر جھریوں کے آثار۔ جھکے ہوئے شانے۔ ایکدم سے اتنی ضعیفی پتہ نہیں کیسے اُن پر ٹپک پڑی تھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پوچھ ہی لیا۔

"ابا آپ کو یہ ایک دم سے کیا ہوگیا ہے۔ آپ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے شاید؟"

ابا نے میرا مطلب سمجھ لیا اور مسکراتے ہوئے بولے "بیٹا صحت کا خیال تو رکھتا ہوں لیکن عمر کی رفتار کیسے روک سکتا ہوں اس کے بھی تو کچھ تقاضے ہیں جو پورے ہو رہے ہیں اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔"

بہرکیف اس جواب سے بھی مطمئن نہ ہوا لیکن اس موضوع پر زیادہ بحث کر کے میں ابا کو کسی ذہنی انتشار میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے بات یہیں پر ختم ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد جانے کے لیے اٹھے تو میرے گال پر بڑے پیار سے ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولے: "سعید بابا اب چند دنوں میں دولہا بن جائے گا۔ تم کب دلہن لا رہے ہو؟"

میں نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

ابا نے میجر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "دیکھئے جناب! انھوں نے تو ابھی سے شرمانا شروع کر دیا۔"

ابا واپس گئے تو کچھ دنوں کے بعد ابا کے خط آنا یک لخت بند ہو گئے۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ اکثر ایسا ہوا تھا کہ کافی دنوں کے بعد ابا خود لکھا کرتے تھے اور پھر پتہ چلتا تھا کہ کہیں باہر مشاعرے وغیرہ میں گئے ہوئے تھے یا اسی طرح کی کوئی خاص مصروفیات تھیں کہ جو اتنے عرصے خط نہ لکھ سکے۔ لہٰذا میں بھی خاموشی کے ساتھ ان کے خط کا انتظار کرتا رہا۔ اسی دوران اتفاقاً میری حمید بٹ صاحب سے ملاقات ہوئی جو ایک دن پہلے پنڈی سے لاہور تشریف لائے تھے۔ حمید بٹ صاحب کی زبانی مجھے اس بات کی اطلاع ملی کہ پچھلے دنوں ابا کی طبیعت کافی خراب رہی ہے۔ ان کے پیر کے انگوٹھے میں گاؤٹ ہو گیا ہے۔

خلافِ توقع ابا کا خط ملا جو انھوں نے ۲۳؍اکتوبر ۱۹۶۲ء کو لکھا تھا۔

پیارے خورشید جیتے رہو

میاں مجھ کو گاؤٹ ہو گیا ہے۔ پیر کے دونوں انگوٹھوں نے مجھ کو "گاؤدی بدھو" بنا کر رکھ دیا۔ مرض خطرناک ضرور ہے مگر تم مطمئن رہو کہ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ چمڑے کا جوتا تو ابھی نہیں پہن سکتا۔ مگر ربڑ کے جوتے پہن کر رینگ لیتا ہوں۔ پرہیز نہایت شدید ہو رہا ہے صرف ابلی ہوئی ترکاریاں کھاتا ہوں۔ کوشش یہی ہے کہ یہ مرض دل تک نہ آ سکے اور میں اسے پیر ہی سے ٹھکرا دوں اور پیر کے ٹھینگے ہی پر مار دوں۔ تم نہ خود گھبراؤ نہ کسی کو گھبرانے دو۔

دلہن کو میری بے پناہ دعائیں پہنچا دو۔ بابا کو بھی دعائیں اور اپنی امی کو نہایت ادب سے آداب۔

خط مختصر اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اس بیماری نے ذرا کام چور بنا دیا ہے۔ بہرحال تم کو میری خیریت کی ضرورت ہے وہ تم کو مل گئی۔ یہ عذرِ لنگ نہیں ہے بلکہ عذرِ لنگ ہی دراصل میرا مرض ہے۔

تمہارا شوکت

امی جان کو جب سے ابا کی اس بیماری کی اطلاع ملی تھی وہ بے حد پریشان تھیں اور ہر وقت ابا کی صحت و تندرستی کی دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ ابا کے اس خط نے بھی امی جان کو مطمئن نہ کیا اور انھوں نے پھر ابا کو خط لکھا کہ اپنی اس بیماری کی پوری تفصیلات لکھیے۔ ابا نے امی جان کو جواب میں ایک مفصل خط بھیجا جو ۲؍نومبر ۱۹۶۲ء کو لکھا گیا تھا۔

بیگم صاحبہ!

آداب۔ آپ کا خط موصول ہوا۔ آپ میری بیماری کی تفصیلات پوچھنا چاہتی ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ

پر تعجب نہ کیجیے اس لیے کہ میری بیماری خطرناک بھی ہوتی ہے، بار خدا پر بھروسہ رکھا ہے تو کوئی بات بھی نہیں۔ بہرصورت جس طرح بھی اپنی طرف سے [illegible] ہوں کہ آپ بھی [illegible] رہیے۔ [illegible] مرض کا مقابلہ تھا۔ لیکن یہ سوچنے کی کوشش کیجیے کہ اگر یہ بیماری نہ ہوتی تو ہم دونوں [illegible]

دراصل چاولوں سے جسم میں [illegible] ہوتی ہے وہ [illegible] ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو جسم کے کسی خاص حصے میں جمع ہو جاتی ہے اور ہڈیوں کے [illegible] پیدا کر دیتی ہے اور [illegible] کے ذرات خون میں شامل ہو کر [illegible] کے ساتھ دل تک بھی پہنچ سکتے ہیں لہٰذا اگر اس کا کوئی ذرہ دل سے نہ گزر سکے [illegible] ہو سکتا ہے۔

مگر مجھے شبہ ہے کہ یہ [illegible] سے مجھے تکلیف بہت زیادہ ہے۔ پہلے دن تو یہ حال تھا کہ چت پڑا [illegible] کمرے کے پاس سے بھی کوئی گزر جاتا تھا تو اس کے پیر کی دھمک سے میری جان پر بن جاتی تھی پھر میں بمشکل تمام غسل خانہ تک جانے لگا اور رفتہ رفتہ اس قابل ہو گیا کہ ربڑ کا جوتا پہن کر تھوڑا بہت چل پھر سکوں۔ اب میں چل پھر سکتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے دفتر بھی آ جاتا ہوں، دل بہلنے کے لیے ایک آدھ پارٹی میں بھی شرکت کر لیتا ہوں مگر اب تک اس قابل نہیں ہوا ہوں کہ چمڑے کا جوتا پہن سکوں۔ پیر کے دونوں انگوٹھوں میں ابھی درد موجود ہے۔ گائے کا گوشت۔ ماش کی دال۔ گوبھی۔ آلو۔ اروی۔ گرم مسالا اور اسی قسم کی دوسری چیزیں مع چاول کے زندگی بھر کے لیے حرام کر دی گئی ہیں اور آج کل تو پرہیز اتنا سخت ہے کہ ڈیڑھ مہینے سے صرف اُبلی ہوئی بے مسالہ چیزیں کھا رہا ہوں۔ حد یہ ہے کہ پالک کے ساگ کا بدمزہ شوربہ تک پینا پڑتا ہے جب تک یہ درد موجود ہے یہی کرنا پڑے گا اور اس درد کے جانے کے بعد بھی شدید احتیاطیں کرنا پڑیں گی اس لیے کہ یہ گٹھیا تو اب لگ ہی چکا ہے۔

دفتر والوں نے فی الحال یہ اجازت دے رکھی ہے کہ میں کم سے کم کام کروں اور جتنا کام چاہوں گھر پر کروں اور جتنا چاہے دفتر میں کروں بہرصورت اُمید ہے کہ اپنی احتیاطوں کے سہارے چلتا رہوں گا۔

یہ میری بہو[1] کے مبارک قدم ہیں کہ میں اس سخت حملے سے بچ گیا اور خورشید اس سخت حادثے[2] کے باوجود محفوظ رہا۔ خدا کرے خورشید اب بخیریت ہو میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

بچوں کو میری طرف سے متفکر نہ ہونے دیجیے گا اور یہ واقعہ بھی ہے کہ خطرہ بڑی حد تک ٹل چکا ہے بس اب دعا کیجیے کہ دوسرا حملہ نہ ہو۔

معلوم نہیں دلہن لاہور میں ہیں یا کراچی روانہ ہو گئیں۔ سعید کو چاہیے کہ جب تک کوئی معقول طور

---

[1] سعید بھائی جان کی بیوی

[2] اُسی دوران میرا اسکوٹر ACCIDENT ہوا تھا۔

مستقل انتظام نہ کریں دلہن کو نہ بلائیں بہرحال وہ خود سمجھداری سے کام لیں گے۔
دلہن۔ خورشید اور بابا کو بہت بہت دعائیں۔

خیر اندیش شوکت

اچانک میری شادی کا پروگرام بنا۔ ابا کو تار کے ذریعے مطلع کیا گیا۔ گھر میں شادی کی چہل پہل تھی اور ہر شخص بڑی بے چینی سے ابا کا منتظر کہ شام کی ڈاک سے ایک خط ابا کا بھائی جان کے نام پہنچا اور گھر کی ساری چہل پہل جیسے سو گئی۔ خط کا مضمون تو مجھے یاد نہیں کیونکہ وہ خط بھائی جان کے نام تھا اور انہی کے پاس محفوظ ہے البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ شادی کے دوسرے روز ولیمہ میں ضرور شریک ہوں گے اور میرے سہرے کے کچھ شعر لکھ کر بھیجے تھے جو میری زندگی کا ایک عظیم سرمایہ ہیں۔

نوشہ نوشاد میرے تارِ نظر کا سہرا — میرے بیٹے میرے خورشید قمر کا سہرا
نہ ہی زر کا ہے نہ ہے لعل و گہر کا سہرا — ہے سعیدہ[1] کی دعاؤں کے اثر کا سہرا
گوندھتے دل بھی مرا سہرے کی لڑیوں میں گیا — کیوں نہ ہو یہ ہے میرے لختِ جگر کا سہرا
ہنسے دیتے ہیں سعیدؔ اور کھلے جاتے ہیں سعیدؔ — دیکھ کر بھائی کے سر پر گلِ تر کا سہرا
چاندنی ایک دلہن اور ہے دولہا خورشید — کیوں نہ پھر اس کو کہیں شمس و قمر کا سہرا
ہو کے دختر کے فرائض سے سبکدوش رشیدؔ — شاد ہیں دیکھ کے اب بیٹی کے سر کا سہرا

حاصلِ زیست ہے یہ دن کہ ہے دیکھا شوکت
شبِ امید کی تابندہ سحر کا سہرا

شادی کے روز یہ سہرا میرے چھوٹے بھائی بابا نے پڑھا اور جس نے بھی سنا اسے اس قدر پسند آیا کہ اس نے بار بار پڑھنے کی فرمائش کی۔ میرے خسر جناب ایم۔ اے رشید صاحب[4] نے سہرے کو سن کر بے ساختہ کہا "یہ سہرا کوئی بڑے سے بڑا شاعر نہیں کہہ سکتا صرف باپ ہی کہہ سکتا ہے۔" پتہ نہیں اس سہرے میں کیا بات تھی — شاید جذبات کی اس قدر فراوانی تھی کہ جس نے بھی سنا آنکھ میں آنسو بھر لایا۔

میں بھی دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کہ ابا کیوں نہیں آئے کہ دوسرے روز ابا کا ایک مختصر سا خط پہنچا کہ "بیٹا! میرے نہ آسکنے پر اپنا دل میلا نہ کرنا۔ بخدا میں آنے کے لیے بالکل تیار تھا کہ ایکدم بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا کہ ڈاکٹروں نے سفر کی قطعی ممانعت کر دی اور میں آنے سے مجبور ہو گیا۔ بہرصورت میں اپنی بہو کا خیر مقدم انشاء اللہ جلد ہی کسی اور موقع پر کروں گا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیروں گا۔ فی الحال تم مجھ کو روحانی طور پر وہاں موجود سمجھو۔"

۲۷ر جنوری ۱۹۶۳ء کو مجھے خوب تیز بخار چڑھا اور میں پسلیوں میں شدید درد لے کر بستر پر لیٹ گیا۔ پہلے تو ڈاکٹر نے نمونیہ تشخیص کیا لیکن جب مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی تو ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنی رائے بدلی۔ خون ٹسٹ ہوا، ایکسرے کرایا گیا اور آخر مجھے شدید قسم

---

[1] میری والدہ محترمہ [2] میرے بڑے بھائی جان [3] میرا چھوٹا بھائی (بابا) [4] میرے خسر کا نام

میری بیماری بگڑ گئی۔ ایک بار پھیپھڑا پانی میں منجمد ہوا تھا۔ سارا گھر پریشان تھا۔ ڈاکٹروں نے پورے تین ماہ کے لیے مجھے بستر پر لٹا دیا تھا۔ میں ملازمت کی طرف سے بے حد فکر مند تھا اور رو رو کر اپنی جان ہلکان کیے جا رہا تھا کہ "ابا یاد آ رہے ہیں" امی جان نے میری یہ تمام حالت ابا کو لکھ کر بھیج دی تھی جس کے جواب میں ابا نے ۲۴ جنوری ۱۹۶۳ء کو راولپنڈی سے مجھے یہ خط لکھا۔

پیارے بیٹے خورشید۔ جیتے رہو

تم نہایت بے وقوف آدمی ہو کہ بیماری اور بیماری کے سلسلے میں ملازمت سے پریشان ہو گئے ہو۔ تم اطمینان رکھو کہ تمہارا باپ تم سے دور سہی مگر تم سب اس کی دعاؤں سے بہت قریب ہو۔ میں اللہ تعالیٰ سے تم سب کی صحت اور زندگی کی بھیک مانگتا رہتا ہوں اور مجھے پورا اعتقاد ہے کہ میری یہ دعائیں وہ بے نیاز قبول بھی کرتا ہے۔

میں نے ابھی حکیم نیر واسطی کو خط لکھ دیا ہے وہ ضرور تم کو آ کر دیکھیں گے۔ میں نے صفدر میر صاحب کو بھی خط لکھ دیا ہے وہ بھی تمہاری رخصتوں میں تم کو نقصان نہ پہنچنے دیں گے۔ اور ہر اعتبار سے اللہ کا فضل رہے گا۔ تم ہرگز نہ گھبراؤ اور پوری طرح اطمینان رکھو کہ تم کو انشاء اللہ میری زندگی میں کوئی نقصان نہ پہنچ سکے گا۔

میں نے سنا ہے کہ تم روتے رہتے ہو۔ نہایت احمق ہو۔ تمہاری دلہن بھی کیا کہتی ہو گی کہ کیسا رونا میاں ملا ہے۔ اپنے دل کو مضبوط کرو۔ علاج اور پرہیز کا خیال رکھو۔ ملازمت کی فکر نہ کرو۔ اللہ مالک ہے۔ یہ فکر تمہاری نہیں میری ہے۔ اچھا بس آج سے تم یہ یقین کرو کہ تم اچھے ہو رہے ہو اور انشاء اللہ بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔

میں عنقریب لاہور آ کر اپنے بیٹے سے ضرور ملوں گا اور تندرست بیٹے سے ملوں گا۔ بابا کو حکیم صاحب کے پاس بھیجدو، وہ ان کو لے آئے اور ٹیلیفون پر ان سے وقت مقرر کرے۔ اپنی امی کو تسلی دو۔ خود بھی اطمینان رکھو اور اپنی دلہن سے نخرے بھی نہ کرو۔ اس کے آنسو پونچھو۔ دلار کرو اس کا اور ٹھیک ہو جاؤ۔

سعید دلہن کو اور خورشید دلہن کو دعائیں کہو۔ بابا کو پیار کرو۔ اپنی امی کو آداب کہو۔

تمہارا دعا گو ابا

شوکت

ابا کے اس خط نے مجھے بہت بڑا سہارا دیا اور میں نے جلدی جلدی سنبھلنا شروع کر دیا۔ حکیم نیر واسطی صاحب مجھے آ کر دیکھ گئے تھے اور بھائی جان بھی میری بیماری کی اطلاع پا کر کراچی سے چھٹی لے کر لاہور آ گئے تھے۔ علاج پورے زور شور کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز میری خیریت معلوم کرنے کے لیے ابا کا خط امی جان کے پاس آ جاتا تھا۔

۸ فروری ۱۹۶۳ء کو ابا کا ایک اور خط میرے نام پہنچا۔

میری جان۔ میری عمر تجھے لگے۔

خورشید خدا کے لیے یقین کر لو کہ میں راولپنڈی میں ہوں مگر میری روح تمہارے پاس ہے کہ تم جلد میرے لیے تندرست ہو جاؤ گے۔ دیکھو میں تم کو بتا دوں۔ تم کو یاد ہو گا لکھنؤ میں میرے ایک دوست تھے بر [illegible]

ماں کو شدید پلوریسی تھی خدا کے فضل سے اب تک ڈنڈے بجاتے پھرتے ہیں۔ نفادی جان سے صفدر باقر صاحب کو شدید پلوریسی تھی مگر انتقال تپ کی وجہ سے ہوا اور نہ جانے پلوریسی کے کتنے مریض بعض کیس کہ تندرست ہو چکے ہیں۔ میرا چاند بھی اسی طرح ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ۔ حکیم نیر واسطی صاحب کا اطمینان بخش خط مجھ کو مل چکا ہے۔ سعید کا خط بھی مل گیا ہے مگر میں جس قدر بھی جلد ہو سکا اپنے بیٹے کی دیدہ جوئی کے لیے آؤں گا۔ فی الحال صرف یہ ہے کہ تم جلد سے تندرست ہو۔

اچھا اب ایک کام فوراً کرو کہ بابا کو بلا کر کہہ دو کہ وہ میری کتابوں اور تصویروں وغیرہ میں ڈھونڈھ کر خواہ گروپ میں ہوں یا علیحدہ علیحدہ مندرجہ ذیل لوگوں کی جتنی تصویریں بھی مل سکیں فوراً رجسٹری کے ذریعہ مجھے بھیج دے ایک کتاب کے لیے شدید ضرورت ہے۔ بیٹے! یہ کام میں تم سے لیتا مگر تم بیمار ہو تو اپنی نگرانی میں بابا سے یہ کام کرا دو۔ جن لوگوں کی تصویریں درکار ہیں، وہ یہ ہیں: (۱) مولانا آسی (۲) سید جالب دہلوی (۳) [illegible] (۴) ابن سوزی (۵) نسیم انہونوی (۶) سراج (۷) قدیر (۸) رفیع احمد خان (۹) ظریف لکھنوی

ان میں سے سب نہ سہی جن جن کی تصویریں ملیں اور میری اگر پرانی تصویریں ہوں تو بھیج دو۔ مثلاً داڑھی والی تصویر بہت ضروری ہے۔ میں یہ سب تصویریں بلاک یا فلم بنوا کر واپس کر دوں گا۔ میری کچھ دن پہلے کی تصویریں بہت ضروری ہیں۔

اچھا اب تم تندرست ہو جاؤ اور میری بقیہ عمر کا تحفہ قبول کرو۔ اپنی امی کو تسلیم کہو سالوں کو دعا بابا کو پیار

تمہارا ابا شوکت

میری طبیعت بہتر ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود ابا کی غیر موجودگی کی وجہ سے میں نے آزاد ہو کر میں نے خط لکھا جس کا جواب انہوں نے ۱۶ ۱۹۶۳ء کو مجھے دیا۔ جو کہ میرے نام ابا کی زندگی کا آخری خط ہے۔ بلکہ میرے نام کیا غالباً اس خط کے بعد انہوں نے کسی کو خط نہیں لکھا اور یہ ان کے خطوط کی آخری تحریر ہے اگر پھر اس کے بعد کسی اور کو خط لکھا ہو تو میرے علم میں نہیں ہے۔

۱۸ مارچ ۱۹۶۳ء

پیارے خورشید سلامت رہو!

تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا خط میرے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ تم کو صحت عطا فرمائے۔

میں نے بھی حامد جلال صاحب کو خط لکھ دیا ہے۔ تم کوئی فکر ملازمت وغیرہ کی نہ پالو جان ہے تو جہان ہے۔

میاں کاش میں تم کو لکھ سکتا کہ میں صحت کے سلسلہ میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ صحت بگڑتے بگڑتے اس حالت پر آ پہنچی ہے کہ اب پندرہ دن سے بالکل صاحب فراش ہوں۔ بخار تو نہ جانے کب سے شام کو ہو جایا کرتا تھا اور اندر ہی اندر مجھ کو کھلا رہا تھا مگر میں نے اس کی پروا نہ کی۔ لاہور کے مشاعرے میں گیا تو بابا اور رشید کو خود دکھا دیا تھا کہ لو دیکھ لو بخار اس وقت بھی ہے۔ بہرحال اس بخار کے بعد کھانسی اور کھانسی کے بعد بلغم کے معائنے اور نہ جانے کیا کیا شروع ہوا اور مجھ کو بالکل لٹا دیا گیا۔ مجھ سے اب تک کہا تو یہی جا رہا ہے کہ کوئی

تم یہ بات بھی کوئی خطرناک بات نہیں مگر بہت سی باتیں شاید اپنے عزیزوں اور بچوں سے چھپا رہا ہوں کہ سب کو خواہ مخواہ پریشان کیوں کروں۔

میں شفا خانہ سے یوں گا صرف اس سلسلہ کو خوش رکھنے کا، ورنہ تو ہرگز منظور نہ ہوتا۔ ۲۲ تاریخ کو تمغہ امتیاز گورنر صاحب عطا کریں گے لہٰذا میں ۲۲ تاریخ کو کسی نہ کسی طرح وہاں جا رہا ہوں گا۔ پھر واپس آ کے ڈاکٹروں سے اپنا معائنہ بھی کرا لوں گا۔ اسی دوران تم سے بھی انشاءاللہ ضرور ملوں گا۔ سب کو سلام دعا کہہ دو۔ بابا کو پیار۔ اپنی دلہن کو بہت بہت دعائیں ہو

تمہارا ـــ شوکت

آپ کے اس خط نے سارے گھر کو بدحواس کر دیا۔ امی جان نے خیریت معلوم کرنے کے لیے فوراً ایک خط راولپنڈی روانہ کیا جس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ دو یا تین دن بعد ۲۲ مارچ بھی آ گئی کہ جب ابا کو لاہور آنا تھا۔ ہمیں ۲۳ مارچ کی صبح اخبار سے یہ اطلاع ملی کہ کل ابا نے گورنر ہاؤس میں گورنر صاحب سے تمغہ امتیاز لیا ہے۔ اس خبر سے قدرے اطمینان ہوا اب ہم کو ابا کا انتظار تھا۔ جب تین چار دن گزر گئے تو ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ ابا واپس پنڈی چلے گئے کیونکہ اتنے دن پنڈی سے غیر حاضر رہنا ابا کے لیے مشکل تھا۔ میں اس خیال سے کہ ابا پھر ہم لوگوں سے ملے بغیر واپس چلے گئے بہت غمگین تھا۔ اس دوران میں نے ایک خط ابا کو لکھنا شروع کیا لیکن پتہ نہیں کیوں وہ نامکمل رہ گیا اور آخر وہ منحوس گھڑی بھی آ گئی جب مجھے ابا کی تشویشناک حالت کی اطلاع ملی۔

یہ یکم اپریل ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ میرا چھوٹا بھائی بابا اپنی بھابی فریدہ کے ساتھ مل کر اپنے دوستوں کو فرسٹ اپریل فول بنا رہا تھا۔ کسی کو نمکین کھیر کھلائی جاتی اور کسی کو پان میں پسی ہوئی سرخ مرچ ڈال کر کھلائی جاتی اور کھانے والا "ھو ھو" کرکے جاتا۔ رات کے ۹ بجے ہوں گے کہ مجھے اطلاع ملی کہ ابوالحسن نغمی صاحب تشریف لائے ہیں۔ نغمی صاحب میرے پاس کمرے میں آ گئے اور بابا، فریدہ نے جلدی جلدی نمکین کھیر تیار کی لیکن اس سے پہلے کہ نغمی صاحب وہ نمکین کھیر کھاتے انھوں نے یہ کہہ کر ہم دونوں کے حق میں تیزاب انڈیل دیا کہ "شوکت صاحب کی حالت بہت تشویشناک ہے۔ ان کے جگر پر کینسر ہو گیا ہے اور وہ اس وقت گڑھی شاہو اپنی چھوٹی بیگم کے گھر پر زیر علاج ہیں" مجھے نہیں یاد کہ پھر اس کے بعد میں نے نغمی صاحب سے کیا باتیں کیں یا انھوں نے کیا کچھ کہا۔ جب میرے ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو نغمی صاحب جا چکے تھے اور بابا بیٹھا ہوا مجھ کو سمجھا رہا تھا۔ "بھائی جان اپنے آپ کو سنبھالیے، دیکھیے آپ کی طبیعت خود ٹھیک نہیں ہے اگر آپ نے اتنا اثر لیا اور خدانخواستہ آپ کی طبیعت پھر گڑبڑ ہو گئی تو کیا ہوگا۔ اللہ پر بھروسہ رکھیے انشاءاللہ یہ خبر غلط ہو گی۔"

امی جان کو جب ابا کی بیماری کی خبر ہوئی تو وہ یکدم سے اپنے حواس کھو بیٹھیں اور ہر وقت جھولی پھیلائے اللہ کے آگے گڑگڑاتی رہتیں۔ ان کی حالت بھی نہیں دیکھی جاتی تھی۔ رات دن جائے نماز بچھائے بیٹھی رو رہی ہیں اور ابا کی صحت و تندرستی کی دعا مانگ رہی ہیں۔

بھائی جان کو بھی بابا نے اطلاع دے دی تھی اور وہ لاہور آنے کے لیے چھٹی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ابھی تک مجھ کو چلنے پھرنے کی اجازت بالکل نہیں دی تھی اور میں ابا کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

۵ اپریل ۱۹۶۲ء کو ابا میو ہسپتال لاہور کے وارڈ میں داخل ہو گئے۔ میں ابا کی بیماری اور امی جان کی بدحواسی سے بہت گھبرایا۔ [illegible] تاریخ کو بھائی جان بھی لاہور پہنچ گئے اور آتے ہی ابا کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ بھائی جان صبح ہسپتال جاتے اور رات گئے گھر واپس آتے۔ ابا اور رشید چچا کا بھی زیادہ وقت ہسپتال ہی میں گزرتا یہاں گھر پر امی جان، فریدہ اور چھوٹے بہن بھائی گڑگڑاتے رہتے۔ میری زبان پر تو جیسے یہ کلمہ ورد ہو گیا تھا کہ "خدا میرے ابا کو اچھا کر دے۔ خدا میرے ابا کو اچھا کر دے" سوتے جاگتے ہر وقت یہی کلمہ زبان پر ہوتا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور ایک روز میں ڈاکٹروں سے زبردستی اجازت لے کر بھائی جان کے ساتھ ابا کو دیکھنے ہسپتال پہنچ گیا۔ اب میں کیا بتاؤں وہاں جا کر میں نے کیا دیکھا۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ اگر بھائی جان میرے ساتھ نہ ہوتے اور مجھے نہ بتاتے تو میں ابا کے پاس سے گزر جاتا اور انھیں نہ پہچان سکتا۔ ابا کو اس حال میں دیکھنے کے لیے میں تیار نہ تھا اور مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

ابا نے مجھ کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے "بیٹا تم کیوں آئے؟"

بھائی جان نے جلدی سے آگے بڑھ کر ابا کو تسلی دی کہ میں ڈاکٹر کی اجازت لے کر ہسپتال آیا ہوں اور اب مجھے ڈاکٹر نے تو اجازت دے دی ہے کہ میں تھوڑا بہت چل سکتا ہوں۔

ابا نے آنکھ کے اشارے سے مجھے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا اور پھر ان پر غشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے آنکھ کے اشارے سے بھائی جان کو بلایا اور بہت ہی آہستہ بولے "بیٹا تمھاری دلہن کراچی میں ہے خورشید کی دلہن کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔"

بھائی جان نے ابا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا "خورشید تو آج ہی فریدہ کو ساتھ لا رہے تھے لیکن میں نے روک دیا کیونکہ ہسپتال ڈاکٹر زیادہ آنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں بہرحال کل فریدہ بھی آ جائیں گی۔"

میری تینوں بہنیں شوکیہ، فوزیہ اور نفیسہ بھی اپنی بھابی سے ملنے کے لیے بے تاب تھیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور فریدہ کو لے کر آؤں گا۔ اتنے میں میجر صاحب (نسیم ممتاز سید) بھی آ گئے۔ ان بیچارے نے تو ابا کی محبت میں اپنے کو بالکل وقف کر لیا تھا۔ ابا نے میجر صاحب کو دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بڑی محبت سے بولے "سید اپنے ہاتھ سے ایک پان تو کھلا دو شاید سید کے ہاتھ کا پان کھا کر شفا ہو جائے۔"

ادھر امی جان کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی کسی بات کا ان کو ہوش نہیں تھا نہ کھانے پینے کا اور نہ کپڑوں کا۔ دن میں دو تین بار اختلاجی دورہ پڑتا تھا اور بلڈ پریشر ایکدم خطرے کی حدوں میں پہنچ گیا تھا اور وہ مچل رہی تھیں کہ کسی طرح مجھ کو اپنے ابا کے پاس ہسپتال پہنچا دو جبکہ ڈاکٹر اور ابا کے دوستوں کی قطعی رائے نہیں تھی کہ اس عالم میں امی جان ہسپتال آئیں قطعی ممکن تھا کہ اس حال میں ابا کو دیکھ کر وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال پائیں اور پھر اس کا اثر مریض پر کتنا خراب پڑے گا۔ اس لیے ہم لوگ ہر طرح سے امی جان کو ٹال رہے تھے کہ ابھی ابا سے ملنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ ہم لوگ بھی باہر ہی باہر سے خیریت معلوم کر کے آ جاتے ہیں۔ ذرا ان کی طبیعت سنبھل جائے پھر جا کر دیکھ لیجئے گا۔

دوسرے دن جب میں ہسپتال گیا تو فریدہ بھی میرے ساتھ تھی۔ شوکیہ، فوزیہ اور نفیسہ بڑی دیر سے ہسپتال میں اپنی بھابی کی منتظر تھیں جیسے ہی ہم دونوں کو آتا دیکھا تینوں دوڑ کر اپنی بھابی سے لپٹ گئیں۔ ابا نے فریدہ کو دیکھا تو مارے محبت کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے

[illegible] اور پھر سعد کی بابت پوچھا، سلام کیا تو [illegible] بھائی جان کو مخاطب کر کے بولے: "دیکھو [illegible]" [illegible] رشید [illegible] [illegible] پھر بولے: [illegible]

[illegible] تمھاری [illegible]

[illegible] بھائی جان کی [illegible]

سعد کہاں جا رہا ہے [illegible] میں نے [illegible] چلے گئے اور پہلے [illegible] کی کوشش [illegible]

گھبرانے کی کیا بات ہے؟

بہت ہی نقاہت سے بولے: "گھبراتا نہیں [illegible] سعید کل اور رک جاتا!"

میں نے پوچھا: "کل کیا کوئی خاص [illegible] ہے؟"

کہنے لگے: "[illegible] دیکھنا میرا کمرہ ایرکنڈیشنڈ [illegible] جائے گا اور میری مسہری بدل دی جائے گی۔"

اس بات کا مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس دن صبح [illegible] کمرے کے [illegible] آئے تھے اور انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ یہ کمرہ بہت چھوٹا اور [illegible] ہو جانا چاہیے۔ [illegible] تو انھوں نے حکم صادر کر دیا تھا کہ کل شوکت صاحب کا کمرہ ایرکنڈیشنڈ کر دیا جائے اور ان کی یہ مسہری بدل دی جائے۔

اب سوچتا ہوں کہ ابا کا یہ کہنا کہ کل میرا کمرہ ایرکنڈیشنڈ کر دیا جائے گا اور میری مسہری بدل دی جائے گی۔ ایک طنز نگار کی ایک آخری طنز تھی۔ ان لوگوں پر جو کل کا پروگرام بنا رہے تھے [illegible] نہ جانتے تھے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ تب ہی تو وہ کہتے تھے کہ "کاش سعید کل اور رک جاتا!"

ابا کی طبیعت اب کافی سنبھل گئی تھی اور بڑے مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ رات کے گیارہ بجے خود ہی بولے: "بیٹا اب تم لوگ جاؤ، میرا سونے کا پروگرام ہے۔"

ہم لوگ رخصت ہونے لگے تو بابا نے کہا: "ابا وعلیکم السلام۔"

مسکرا کر بولے: "دیکھو کتنا شریر ہو گیا ہے۔"

میں بابا کو لے کر گھر واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بھائی جان بھی آ گئے اور اپنی صبح کی روانگی کی تیاری کرنے لگے۔

صبح ناشتہ سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے: "رات ابا سے کہہ تو آیا ہوں لیکن پھر سوچتا ہوں جا کر سلام کر لوں اور دیکھ آؤں۔"

امی جان نے کہا: "ہاں ہو آؤ لیکن جلدی واپس آ جانا۔"

اور واقعی بھائی جان بہت جلدی یتیم ہو کر گھر واپس آ گئے۔ ہم لوگ لٹ گئے، ہمارا گھر تباہ ہو گیا۔ امی جان پچھاڑیں کھا رہی

تھیں۔ سینہ کوٹ رہی تھیں۔ بال نوچ رہی تھیں اور پھر ایک سے لپٹ لپٹ کر پوچھ رہی تھیں۔ بتاؤ یہ کیا ہوا۔ کہہ دو کہ بجو شوکت جو بھی ان کی یہ حالت دیکھتا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ رشید بھیا۔ فریدہ اور فریدہ کی والدہ رو بھی رہی تھیں اور امی جان کو بھی سنبھال رہی تھیں۔ ابا بیچارہ ایک طرف چپ۔ یغما۔ بھائی جان مجھے سینے سے لگائے کھڑے خود رو رہے تھے اور میرے آنسو پونچھ رہے تھے جب میں زیادہ نڈھال ہونے لگا تو بھائی جان مجھے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لا کر بہلانے لگے ۔ "خورشید ہم لوگ تو خوش قسمت ہیں ایسے شخص کے بیٹے ہیں کہ جس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور جب تک شوکت تھانوی کا نام زندہ ہے ہمارا باپ زندہ ہے۔ اور پھر تم اس طرح روؤ گے تو ابا کی روح کو کس قدر تکلیف ہوگی۔ تمہیں یاد ہے ایک خط میں انہوں نے تم کو لکھا تھا کہ میری بقیہ عمر کا [illegible] کرو گے۔ انہوں نے اپنا تحفہ دے دیا۔ انشاء اللہ تم بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرو۔"

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اوپر اٹھایا اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا "خدا میرے ابا کو [illegible] کرے"

•

جو نہ مرتا کوئی دن اور ـــــ

عادل رشید

شوکت تھانوی۔ بی اے، بی ٹی ۔۔۔ ہے جو کبھی [illegible] نے [illegible] سب سے پہلے جانا تھا ۱۹۲۶ء میں شوکت صاحب محض شوکت تھے، وہ ابھی شوکت تھانوی نہیں بنے تھے۔ اس وقت وہ [illegible] میں [illegible] سے غائب ہو گئے تھے۔ [illegible] وقت اپنی ماں کی گود میں بیٹھ کر [illegible] رہا تھا۔ [illegible] وقت میں [illegible] دس برس کی تھی۔

۱۹۲۶ء میں محمد عمر صاحب لکھنؤ سے ہمدم اخبار میں جیسے مرزا جاب [illegible] صاحب [illegible] رہتے تھے، [illegible] ہو گئے وہ جانب دہلوی صاحب سے اپنے مضامین پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ وہ [illegible] جانب دہلوی صاحب سے اصلاح لیتے تھے میں اپنے گاؤں رشید گنج میں [illegible] کے ساتھ [illegible] کھیتوں اور باغوں میں کھیل رہا تھا۔ اور جب یہ محمد عمر صاحب روزنامہ ہمدم میں مزاحیہ کالم [illegible] "شوکت تھانوی" کے نام سے باقاعدہ لکھ کر مشہور ہونے لگے۔ تو میں اپنی حویلی کے باہر مردانے میں مولوی صاحب کے پاس بسم اللہ شروع کرنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ میری بسم اللہ جتنی دھوم دھام سے ہوئی تھی شوکت تھانوی صاحب کا مزاحیہ کالم اس سے کہیں زیادہ دھوم دھام سے پڑھا جانے لگا۔ ان کے مزاحیہ فقرے ادبی حلقوں میں زبانوں کو مزا دینے لگے۔

میں اپنے مولوی صاحب سے جب الف دو زبر آن اور بے دو زبر بن پڑھ رہا تھا اس وقت شوکت تھانوی صاحب کی شہرت دن دونی رات چوگنی کے حساب سے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب میں پرنس ماڈل اسکول، نخاس گنج الہ آباد میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا تو شوکت تھانوی صاحب "سرپنچ" لکھنؤ کے مدیر محترم ہو کر اپنے مزاح سے لڑکوں کو پاگل اور دیوانہ بنا رہے تھے۔ ہر ہفتہ "سرپنچ" لکھنؤ کی آمد کا انتہائی بے صبری کے ساتھ انتظار کیا جاتا۔ اور جب نئے ہفتہ کا "سرپنچ" آ جاتا تو لڑکے ہنس ہنس کر اور قہقہہ لگا لگا کر پاگل ہو جاتے۔

ایک دفعہ تو شوکت صاحب کی اس مزاح نگاری نے ہم سب پر بڑا احسان کیا۔ ہمارے حساب اور اردو کے ماسٹر صاحب انتہائی بدمزاج، روکھے، پھیکے اور [illegible] ٹائپ کے انسان تھے۔ وہ کلاس میں آتے تو ہم سب کا ڈر کے مارے خون خشک ہو جاتا۔ وہ کسی نہ کسی بات پر ہم لڑکوں کو گدھے کی طرح پیٹنے لگتے تھے۔ حساب کا گھنٹہ آیا اور وہ چنگیز خاں بن کر اور نادر شاہ کی شکل میں ہماری کلاس پر حملہ آور ہوئے

ہم سب اپنے اپنے چہروں پر ہوائیاں لئے اور دلوں ہی دلوں میں جل تو جلال تو کا وظیفہ پڑھتے ہوئے اللہ اللہ کر رہے تھے کہ ہم سب سوچ رہے تھے دیکھیں آج سب سے پہلے کس کمبخت کی "موت" آتی ہے۔ اور وہ پیریڈ کی کلاس میں آتے ہی اپنی کرسی کے پاس کھڑے، مسکراتے ہوئے پوچھنے لگے۔ اُن کے ہاتھ میں کوئی اخبار تھا۔ وہ اُسے ہم سب کو دکھا کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"جانتے ہو یہ کیا ہے—؟"

پھر خود ہی فرمانے لگے

"یہ سرورق ہے، لکھنؤ کا ہفت روزہ مزاحیہ اخبار"

ہم سب وہاں موجود لڑکے تھے، حیرت اور تعجب سے سر جوڑے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اس میں آخر وہ کون سی دلچسپ بات چھپی ہوئی ہے جسے دیکھ دیکھ کر ماسٹر صاحب اپنی سدا کی خونخوار اور قہری صورت پر مسکراہٹیں بکھیرے کھڑے ہیں۔ کہ وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر ہم سب سے بڑی شفقت کے ساتھ بولے۔

"بیٹھ جاؤ—"

ہم سب بیٹھ گئے۔ حیرت و تعجب میں غرق رہے۔

"شوکت کا نام سنا ہے کبھی—؟"

"جی ہاں—" میں اپنے ڈرے اور سہمے ہوئے انداز میں مری مری آواز سے بولا "شوکت آج اسکول نہیں آیا۔ ماسٹر صاحب اس کی درخواست آئی ہے۔ وہ بیمار ہے۔"

"ابے چُپ—" وہ مسکراتے ہوئے بولے "میں اُس گدھے شوکت کی بات نہیں کر رہا۔ میں ہندوستان کے مزاح نگار شوکت تھانوی کی بات کر رہا ہوں۔"

میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جانتے ہو تم شوکت تھانوی کو—؟"

"جی نہیں—" میں ڈرتے ڈرتے ادب سے بولا۔

"گدھے ہو—" انہوں نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا "سنو تم لوگ، میں شوکت تھانوی صاحب کا ایک مضمون تم لوگوں کو سناتا ہوں" مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس وقت یہ یاد نہیں آ رہا کہ وہ شوکت تھانوی صاحب کا کونسا مضمون تھا۔ لیکن اتنا یاد ہے مجھے کہ وہ مضمون اتنا دلچسپ تھا کہ ہم لوگ جو کہ ان ماسٹر صاحب کو شیر ببر اور بھیڑیا سمجھتے ہوئے ہمیشہ اُن کے سامنے چہروں پر ہوائیاں لئے ڈرے ڈرے رہتے تھے۔ یکدم سے مسکرانے لگے۔ اور پھر ہم سب ان شیر ببر اور بھیڑیئے صاحب کے سامنے اُن کی موجودگی میں شوکت تھانوی صاحب کی مزاح نگاری کے جادو سے مسحور ہو کر زور زور سے ہنسنے اور قہقہے لگانے لگے اور یہ گھنٹہ، یہ پیریڈ یونہی ہنستے ہنستے ختم ہو گیا۔

جب چپراسی نے برآمدے کے اس لٹکے ہوئے گول گھنٹے پر ایک زور کی ضرب لگائی اور گھنٹے کے ختم ہونے کا اعلان کیا تو ماسٹر صاحب جو کہ خود ہنستے ہنستے پاگل ہو گئے تھے۔ جن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اپنے رومال سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے بولے۔

"تم ایسا پہلی بار شوکت تھانوی صاحب سے [illegible] ۔ یہ [illegible] کی ہے"
وہ اتنا کہہ کر چلے گئے۔ اور ہم سب نے شوکت تھانوی کی [illegible] باقی [illegible] اطمینان [illegible] دیکھ کے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا

"شوکت تھانوی صاحب زندہ ہیں [illegible] آپ نے ان کو زندہ کر دیا [illegible] شوکت تھانوی نے اپنے [illegible] کی [illegible] ہو گئی۔"

شوکت تھانوی صاحب کا نام اور [illegible] جب میں اسلامیہ ہائی اسکول [illegible] میں پڑھتا تھا۔ [illegible] صولت پبلک لائبریری میں جاتا تھا۔ اس وقت شوکت تھانوی کی [illegible] شخصیت [illegible] ہندوستان کا مقبول ترین مزاحیہ اخبار تھا اور شوکت تھانوی صاحب کے مضامین کے [illegible] نام سے شائع ہو چکے تھے۔ میں [illegible] لائبریرین صاحب سے شوکت تھانوی صاحب کے [illegible] اپنے نام لکھوا کر لے لیتا اور وہیں بیٹھ کر پڑھنے لگتا۔ پڑھتے پڑھتے بے اختیار [illegible] ہنسی [illegible] قہقہہ نکل جاتا۔ مگر لائبریری کا خیال [illegible] شکل سے [illegible] اپنے ان قہقہوں کو ضبط کرتا۔ میرے دوست سید [illegible] صاحب [illegible] بھی شوکت تھانوی کے دیوانے [illegible] ساتھ ساتھ لائبریری جانے لگے۔ ہم دونوں شوکت کے دیوانے [illegible] قہقہوں [illegible] ایک دوسرے کو ایک ایک فقرہ [illegible] دکھاتے جاتے۔ اور [illegible] کھی کھی ہنستے رہتے۔ [illegible] لائبریری [illegible] دوسرے [illegible] نے والے ہم دونوں کو [illegible] سے چڑ گئے۔ اور ہمیں لائبریری میں [illegible] نظروں سے دیکھا جانے لگا۔

ایک دن لائبریرین صاحب کی طرف سے حکم ملا۔ "تم شرافت سے کتابیں پڑھو [illegible] ورنہ تم لوگوں کا داخلہ لائبریری میں بند کر دیا جائے گا۔"

پھر ایک دن وہ آیا کہ ہمیں شوکت تھانوی کی مزاح نگاری پر کھی کھی کھی کرنے کے جرم میں لائبریری سے بے عزت کر کے نکال دیا گیا۔

ہمارے اپنے محلہ میں [illegible] میں ہمارے عزیزوں کا پورا ایک محلہ دائرہ شاہ رفیع الزماں کے نام سے آباد ہے۔ [illegible] رفیع الزماں کے نام سے ہی ایک لائبریری تھی۔ میرے وقت کا زیادہ حصہ اسی لائبریری میں گزرتا تھا۔ شوکت تھانوی صاحب کا سرپنچ بھی آیا کرتا تھا۔ اسی کی ورق گردانی کیا کرتا۔ پڑھتا تھا تو شوکت تھانوی کو۔ باتیں کرتا تو شوکت تھانوی کی۔ اور اگر کسی ادیب کا احترام کرتا تھا تو شوکت تھانوی کا۔ پھر "سرپنچ" ہی کے ادارہ سے شوکت تھانوی صاحب کا ایک ادبی رسالہ "شباب" آنے لگا۔ شوکت تھانوی، نسیم انہونوی، ابن سلونوی، اویس احمد ادیب۔ ایم۔ اے (بی۔ اے۔ آنرز) اور خان محبوب طرزی (مرحوم) کے نام بار بار نظروں کے سامنے آنے لگے۔ اور میں ان ناموں ہی کو پہچاننے لگا۔ لیکن ان سب ناموں میں شوکت تھانوی کا نام ایسا تھا جو دل و دماغ پر کبھی نہ مٹنے والا نقش بن کر رہ گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے ایک کہانی لکھ کر اس زمانہ میں شوکت تھانوی کے پاس اصلاح کے لئے بھیجی۔ خط میں لکھا تھا کہ آپ اس کہانی پر اصلاح فرما دیں گے تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ اور اگر آپ اسے اپنے "سرپنچ" میں شائع فرما دیں گے تو دوہرا احسان مند ہوں گا۔ خط میں کہانی رجسٹرڈ واپسی کے لئے میں نے ٹکٹ بھی رکھے تھے۔ یہ کہانی رجسٹری سے پوسٹ کرنے کے بعد میں ہر روز شوکت تھانوی صاحب کے جواب اور کہانی کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن وہ اصلاح ہو کر آتی اور نہ اس کا کوئی خط ہی آیا۔ کوئی دو ہفتہ کے بعد سرپنچ میں ایک خط پڑھا جس میں کسی نے شوکت صاحب سے کہانی پر اس کی فرمائش کی تھی۔ جواب تھا۔ "ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہم اصلاح کرتے پھریں وغیرہ وغیرہ۔" ظاہر ہے کہ یہ میرے ہی خط اور میری ہی حماقت کا جواب تھا۔ یہ بات اور ہے کہ وہ خط کسی اور کے نام سے چھپا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ اور پھر نہ شوکت صاحب کی طرف سے کوئی خط آیا نہ کہانی ہی واپس ملی۔ ظاہر ہے کہ وہ ٹکٹ ضبط ہو گئے اور کہانی ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ سے شوکت صاحب کی وقعت اور ان کی اہمیت میرے دل سے کم نہیں ہوئی۔

۱۹۳۶ء میں "شاہد" ماہنامہ بریلی کا ایڈیٹر ہو کر جب میں بریلی پہنچا تو جاتے ہی میں نے دس یا پندرہ روپیہ معاوضہ دے کر "شاہد" کے لئے شوکت صاحب سے ایک کہانی منگوائی۔ کہانی کا عنوان تھا "مینار بن گنبد"۔ یہ کہانی کوئی اچھی تو نہیں تھی۔ لیکن چونکہ میرے محبوب ادیب کی کہانی تھی۔ لہذا "شاہد" میں بصد شوق اسے شائع کر دیا۔

اس کے بعد کسی کام سے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ تو اب مجھے یاد نہیں رہا کہ کہاں اور کس دفتر میں شوکت صاحب سے ملاقات ہوئی لیکن میں اپنے پسندیدہ ادیب سے ملا۔ شوکت تھانوی میرے سامنے موجود تھے۔ لیکن بات چیت نہ ہونے کے برابر اس لئے ہوئی کہ وہ ملک کے مانے ہوئے مزاح نگار تھے۔ اور میں بزعم خود "شاہد" ماہنامہ کا ایڈیٹر تھا۔ دونوں ہی کچھ کھنچے کھنچے سے رہے۔ وہ اپنی جگہ شاید درست اور میں اپنی جگہ پر خود غلط۔

شوکت صاحب کے کسی دوست کی طرف سے انہیں کے ایما پر دبے چھپے انداز میں اس بات کی بھی خواہش ظاہر کی گئی کہ میں اپنے رسالہ "شاہد" کے لئے ان سے مضمون مانگ لوں۔ لیکن میں نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ شاید اس لئے کہ شوکت تھانوی صاحب کا "مینار بن گنبد" مجھے دل سے پسند نہ آیا تھا۔ یا شاید اس لئے کہ انہوں نے مجھے کوئی خاص لفٹ نہیں دی تھی۔ البتہ شوکت صاحب کی حالت سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ ہندوستان کا یہ عظیم مزاح نگار مالی اعتبار سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہے۔

پھر اس کے بعد کوئی ملاقات برسوں نہ ہو سکی۔ ان کے مضامین البتہ میں پڑھتا رہا۔ ان کے وہ مضامین جو اچھے بھی تھے اور بہت اچھے بھی اور برے بھی تھے۔

۱۹۴۰ء میں شوکت تھانوی صاحب کی چچا زاد بہن کی بیٹی عذرا سے میرے رشتہ کی بات چیت اتفاقیہ طور پر شروع ہوئی۔ شوکت تھانوی صاحب کے بھانجے سلطان الارشد صاحب میرے دوست تھے۔ عذرا ان کی سگی پھوپھی زاد بہن تھی۔ عذرا کے ماں باپ کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ اس کی پرورش اس کے ماموں ارشد تھانوی صاحب نے اپنی سگی اولاد ہی کی طرح کی تھی۔ جب یہ بات چیت شروع ہوئی تو میں شادی کے حق میں دل سے نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا چارم ضرور تھا کہ عذرا شوکت تھانوی کی بھانجی ہے۔

بہرحال میری شادی ۱۹۴۲ء میں عذرا کے ساتھ ہو گئی۔ ارشد تھانوی صاحب بھوپال میں رہا کرتے تھے۔ وہ وہاں کے مشہور وکیل تھے۔ عذرا کی شادی پر نہ جانے کس وجہ سے شوکت تھانوی صاحب شریک نہ ہو سکے۔ وہ اپنی بھانجی کی شادی پر لکھنؤ سے بھوپال نہیں آئے

لے۔ میاں بیوی کے جھگڑوں کا ایک مضمون ضرور بھیجئے۔ شاد نے بغرض اشاعت مجھے واپس [illegible] تو میں ایک خط میں ان سے نام خاص میں [illegible] ضرور کر دیں [illegible] لیکن بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے نہ دیکھ سکا [illegible] کے وہ [illegible] نہیں میں نے سمجھا کہ [illegible] ایک مضمون ضرور بھیج رہا ہوں۔ مگر شاد نے شادی نمبر میں اسے شامل کر دیا۔ یہ [illegible] ضرور بھیجئے کے لئے یہ آخری بھیج رہا ہے۔"

یہ مضمون اتنا پرکشش اتنا دلچسپ اور قیمتی تھا کہ شاد نے نہیں چھاپنے کے بعد [illegible] محمد طفیل صاحب نے اپنے یہ انتخاب میں شوکت تھانوی کے بہترین [illegible] حیثیت سے شامل کیا۔

اس کے بعد کبھی شوکت تھانوی صاحب کا [illegible] ہو گیا تھا لہٰذا ان سے خود کبھی [illegible] میرے پاس [illegible] رہتے تھے [illegible] ہیں اس سے آگے نہ وہ بڑھے اور نہ میں بڑھا۔

۱۹۴۲ء میں "میر صاحب" میری ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ یہ میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ تھا۔ میری خواہش تھی کہ اس پہلی کتاب پر میں شوکت تھانوی صاحب سے دیباچہ لکھوا لوں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے میں نے شوکت تھانوی صاحب کو لکھا اور جواب آیا کہ میں کتاب کا مسودہ انہیں بھیج دوں۔ وہ اس پر بڑی خوشی کے ساتھ دیباچہ لکھ دیں گے۔

میں نے وہ مسودہ شوکت صاحب کو لکھنؤ بھجوا دیا۔ مسودہ کی رسید تو آگئی۔ لیکن دیباچہ [illegible] دن گزر جانے کے بعد بھی جب نہ آیا تو میں نے انہیں اصرار کے ساتھ یہ لکھا کہ وہ مجھے بغیر دیباچے کے مسودہ واپس کر دیں۔ بڑی [illegible] کے بعد مسودہ مجھے لکھنؤ سے بھیج دیا گیا۔ ساتھ میں شوکت صاحب کا یہ خط بھی تھا کہ وہ اس پر دیباچہ لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن [illegible] کے بعد مسودہ بغیر دیباچے کے بھجوا دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے مسودہ بھجوا دیا ہے۔ خط میں انہوں نے تاخیر کی معذرت اس بنا پر کی تھی کہ وہ [illegible] کی تقریبوں کے سلسلے میں بہت مصروف رہے۔ اور اس تمام عرصہ میں وہ لکھنؤ سے تقریباً باہر رہے ہیں۔ لہٰذا تاخیر ہوئی ——

میں نے اُن کے اس خط کا انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ یہ کتاب "میر صاحب" بمبئی سے مکتبہ [illegible] کی طرف سے [illegible] کے دیباچے کے ساتھ چھپ گئی —— قصہ ختم ہو گیا

"میر صاحب" چھپنے کے کچھ دن بعد جب میں بھوپال گیا تو مجھے کسی کی زبانی معلوم ہوا کہ شوکت صاحب نے اس کتاب پر دیباچہ اس لئے نہیں لکھا کہ وہ ایک کمزور کتاب تھی۔ کہنے والے نے کہا کہ یہ خود شوکت صاحب نے اس سے کہا تھا۔

مجھے یہ سن کر ملال ہوا۔ غصہ آیا۔ اس لئے نہیں کہ شوکت صاحب نے میری اس کمزور کتاب پر دیباچہ کیوں نہیں لکھا یا یہ کہ انہوں نے میری اس کتاب کو کمزور کیوں بتایا۔ بلکہ اس لئے کہ اگر واقعی "میر صاحب" کے مضامین میں کمی تھی یا کمزوری تھی تو انہوں نے مجھے اپنا سمجھتے ہوئے اس طرف میری توجہ مبذول کیوں نہ کرائی۔ غیروں کی طرح وہ گول کیوں ہو گئے۔

کہنے والے نے یہ بات کہہ تو دی لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پایا کہ اس کی اس بات سے کتنی بڑی بات پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے شوکت صاحب کی اس بات پر غصہ آ رہا تھا۔ جب میں بمبئی واپس آیا تو میں نے اُن کے ناول [illegible] پر تند و تیز اور ایک انتہائی سخت قسم کی تنقید لکھی۔ تنقید بہت کڑوی تھی۔ بے حد ترش۔ لیکن میں شوکت صاحب کو آئینہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ خود کیا ہیں۔ لہٰذا یہ تنقید چھپ گئی لیکن چونکہ میں اپنا نام لکھ کر شوکت صاحب کو بہت زیادہ افسردہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا یہ تنقید عادل رشید کے نام سے نہیں بلکہ اے آر [illegible]

کے بعد سے یہی ہفتہ وار اخبار "نظام" میں شائع ہوتی۔ "نظام" کے ایڈیٹر فردوس جمال صاحب تھے۔ جو جمال پاشا کے بھتیجے تھے۔ اور ہم سب کے جاننے والوں میں سے تھے۔ میں نے ان سے اس راز کی رازداری کا وعدہ لے کر یہ قسطیں "نظام" میں چھپنے کے لئے دی تھیں۔ لیکن انہوں نے غضب یہ کیا۔ انہوں نے شوکت صاحب کو بھجوا یا اور ساتھ میں ایک خط بھی لکھ دیا کہ آپ کے داماد صاحب ہی نے یہ تنقید آپ پر کی ہے۔

ظاہر ہے کہ شوکت صاحب کو اس سے ملال ہوا اور انہیں بے حد صدمہ پہنچا۔ اس بات سے کہ میں نے ان کی کتاب پر اس قدر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن انہوں نے مجھ سے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا اور میں ان تمام باتوں کی طرف سے انجان ہی رہا۔

۱۹۶۲ء میں میں دہلی میں تھا۔ شوکت صاحب بھی اسی سال جشن کے سلسلہ میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ اور حفیظ جالندھری صاحب کے پاس ٹھہرے تھے۔ انہیں اپنے بھانجے عمران اللہ رشد سے معلوم ہوا کہ میں دہلی میں ہوں۔ انہوں نے عمران سے کہا کہ وہ مجھے یہاں ان کی موجودگی کی اطلاع دیں اور مجھے اپنے ساتھ لے آئیں۔

لہٰذا جب عمران نے مجھے بتایا کہ ماموں جان دہلی میں ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو عمران کے ساتھ میں ان سے ملنے کے لئے شام کے وقت حفیظ صاحب کے بنگلے پر پہنچا۔ میری اور شوکت صاحب کی بات چیت فون پر ہو چکی تھی۔ اور وہ میرے منتظر تھے۔

شوکت صاحب نے مجھے گلے لگایا اور میں نے انتہائی سعادت مندی کے ساتھ انہیں اپنا بڑا سمجھ کر ان سے گفتگو کی۔ ہم سب یعنی میں، عمران، حفیظ جالندھری صاحب اور شوکت صاحب بنگلہ کے لان پر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

شوکت صاحب مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ اور بار بار میرے لباس کو اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے کہ وہ میرے لباس سے مجھے پرکھنا چاہتے تھے۔ اور لکھنؤ کی پہلی ملاقات کے بعد یہ میری ان کی دوسری ملاقات تھی۔ میں اس وقت انتہائی شاندار اور قیمتی گرم سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

مجھے شوکت صاحب کی یہ پرکھ کچھ اچھی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن میں خاموش رہا۔ اور اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ البتہ میں نے دل ہی دل میں یہ ضرور سوچا کہ وہ آج اپنی بھانجی کی شادی کے پورے ساڑھے چار سال بعد اپنے داماد کی مالی حیثیت کا اندازہ اس کے لباس سے لگا رہے ہیں۔ اب جبکہ بقول شخصے۔

اب پچھتائے کا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

باتوں کے درمیان شوکت صاحب نے مجھ سے کہا۔

"میاں! کتنے سال ہو چکے کہ تم ہمارے داماد بنے ہو اور اب تک تمہاری سسرال والوں نے تمہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ لکھنؤ میں بھی تمہاری بہت بڑی سسرال ہے۔ میرے ساتھ لکھنؤ چلو۔"

پھر مسکرا کر بولے۔

"وہاں تمہاری حسین حسین سالیاں بھی تمہیں ملیں گی۔ سالیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا اور ان کے ماں باپ سے سلامی وصول کرنا اب کہو جی ——!" میں نے ان کی اس بزلہ سنجی پر دل ہی دل میں ان کی شگفتہ مزاجی کا اعتراف کرتے ہوئے سعادت مندی سے

[illegible] لکھنا چاہتا ہے۔ یکم جب شوکت صاحب لکھنؤ [illegible]

" تو آپ بہت [illegible] مسلمانوں [illegible] [illegible]

اور ابھی وہ بھی لکھنؤ اپنے ساتھ چند [illegible] تھے۔ [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] شوکت [illegible] لکھنؤ [illegible]

[illegible] شوکت صاحب نے [illegible]

" تم اور ابھی [illegible] لکھنؤ چلو [illegible]"

اور جو اسی وقت [illegible]

" [illegible] تم ابھی [illegible] لکھنؤ [illegible]

دوسرے [illegible] شوکت صاحب [illegible] [illegible] شوکت صاحب [illegible] تھے۔ [illegible] ارشد صاحب [illegible] محسوس [illegible] کر رہے تھے۔ شوکت صاحب نے شاہد کا ذکر [illegible] [illegible] آپ کا مداح ہوں۔

لکھنؤ جب ہم پہنچے تو وہاں [illegible] ارشد صاحب [illegible] لکھنؤ سے ہوئے تھے۔ اور یہ بات شوکت صاحب نے مجھے دہلی میں نہیں بتائی تھی۔ [illegible] دونوں کو [illegible] بہت خوش ہوا۔ [illegible] ارشد صاحب [illegible] شوکت صاحب کی اس بات پر خوش [illegible] شوکت صاحب دلی سے اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے۔

شوکت صاحب اُن دنوں بڑی خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ اور بات کہ وہ [illegible] اور اس حد تک بے نیاز تھے کہ اخبارات و رسائل نیز، مکتبہ یا پبلشر کے لیے [illegible]۔ وہ ایک شاندار کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ نوکر چاکر تھے اور ہر طرح کا ذہنی سکون انہیں میسر تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ کوٹھی کے نچلے حصّہ میں اپنے خاص الخاص شاندار ڈرائنگ روم میں شوکت صاحب بیٹھے تھے۔ میں بھی بیٹھا تھا۔ میرے خسر صاحب یعنی ارشد صاحب اور میرا ایک دوست بھی بیٹھا تھا جو کہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میرے رشتے کے ایک بھائی بھی تھے جو لکھنؤ ہی میں پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب اور بھی بیٹھے تھے۔ شوکت صاحب کے دوست تھے۔ اس ڈرائنگ روم میں سید اور رشید (شوکت صاحب کے بیٹے) بھی کھیل رہے تھے۔ یہ دونوں ابھی چھوٹے تھے۔ یکایک شوکت صاحب نے اپنے بیٹوں سے کہا "بیٹو! تم لوگ اوپر جاؤ۔ یہاں نہ آنا تم لوگ۔ ہم اس وقت ذرا شعر و شاعری کے موڈ میں ہیں۔" میں سوچنے لگا کہ آخر یہ کس قسم کا شعر و شاعری کا موڈ ہے

کہ سعید اور خورشید کہاں جا رہے ہیں

سعید اور خورشید کو اٹھا کر وہ ظریف سے مخاطب ہوئے۔

"شعر سنو گے عارف میاں۔"

"جی۔ ضرور جی۔ چاہیں کریں سب سے بہتر۔" جی ہاں۔"

پہلے پہر وہاں بیٹھا رہا۔ بات یہ تھی کہ شوکت صاحب رفیع احمد خاں مرحوم کے مزید اشعار سنانے شروع کر دیں گے۔ انہوں نے پہلا شعر سنایا۔ پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ اب میں ہوں اور سب سے نظریں چرا رہا ہوں۔ پھر سے پرچھائیاں اتر رہی ہیں کہ وہ میری طرف غور سے دیکھ کر بولے۔

"ارے میاں یہ بدمذاقی ——— خدارا داد تو دو۔ تم تو چوتھی کی دلہن کی طرح گھٹنوں میں سر دیے رہے ہو"

اور میری حالت اس لئے اور بھی زیادہ خراب ہو رہی تھی کہ ارشد تھانوی صاحب پہلے سے برابر میں بیٹھے تھے۔ ان کے بڑے رفعت کے بھائی بھی تھے اور دوست بھی۔ میری پریشانی اور اور ہو رہی تھی کہ انہوں نے رفیع احمد خاں کا مشہور شعر قدم قدم پہ عجب ہے کہ پاسبانی کی ——— سنا دیا اور بولے۔

"یہ شعر یقیناً تمہیں پسند آیا ہوگا۔ کیوں ہے نا قابل داد شعر۔"

"جی ہاں۔" مجبوراً مجھے بھی زبان کھولنا پڑا۔ وہ بے ساختہ بولے۔ "دراصل میں تمہارے جمالیاتی ذوق کو پرکھنا چاہتا ہوں۔"

پھر فوراً ہی وہ ارشد صاحب کی طرف مخاطب ہوئے۔

"ٹھیک ہے نا بھائی جان ——— ؟"

"بیشک صاحب —" ارشد صاحب پان چباتے ہوئے بولے۔ "اس رنگ میں رفیع احمد خاں کا جواب نہیں تھا۔" انہوں نے گویا کہ تشریح کی۔

"صاحب! بہت بڑی قیمتی چیز، بہت بڑی بات غالب نے کہی ہے۔ حقیقت ہے —"

اور پھر نتیجہ یہ کہ شرم اور لحاظ کو کسی حد تک بالائے طاق رکھ کر مجھے بھی اس شعر و شاعری میں دلچسپی لینی پڑی۔ شوکت صاحب نے میری اس قدر بے تکلفی کو غنیمت جانا۔ بیحد خوش ہوئے اور پھر بہت سے شعر بھی سنا ڈالے۔ اپنے بھی شعر سنائے اور رفیع احمد خاں کے بھی۔ پھر مجھ سے فرمائش ہوئی۔

"تم بھی تو اس رنگ میں شعر کہتے ہو گے۔ سنا دو میاں اپنے بھی شعر سنا دو۔ جہالت کی باتیں چھوڑو۔ ہم سب آپس میں دوست ہیں" وہ کہتے رہے اور میں معذرت کرتا رہا۔ لاکھ بے تکلف بننے کی کوشش پر بھی میں ارشد صاحب کی موجودگی میں جاہل کا جاہل ہی رہا۔ میری جہالت رہ گئی۔

ایک دن دسترخوان پر انہوں نے اسی قسم کا ایک لطیفہ اور سنا ڈالا۔ دسترخوان لگ چکا تھا۔ پلیٹیں لگ رہی تھیں اور کھانا آنا تھا کہ انہوں نے ان نواب صاحب کا ایک لطیفہ سنا ڈالا جو دسترخوان پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ اور جن کی پیاس کھل گئی تھی۔ اپنی بیگم کے بھوں بھوں کے اشارے پر انہوں نے گردن جھکا کر نیچے دیکھا۔ بڑی ادا کے ساتھ بولے۔ "کام چور زنانہ حاضر ہے"

[illegible] شوکت صاحب [illegible] تھے۔ اور دسترخوان پر سب بیٹھے تھے۔ میں، بڑے صاحب، میری خوش دامن صاحبہ [illegible] خورشید [illegible] اور بائیں طرف شوکت صاحب کا سب سے [illegible] اور سب سے چھوٹا بیٹا بھی بیٹھا تھا۔

خالہ جان (مسز شوکت) نے شوکت صاحب کو گھور کر [illegible] دیکھ رہے ہیں۔ کبھی تو شرم کیجیے۔ داماد کا ہی خیال کر لیجیے۔"

خالہ جان کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے [illegible] بڑی حسرت سے [illegible] رہے تھے۔

[illegible] ہماری شادی کی بات سن کر [illegible] خالہ جان [illegible] اور شوکت صاحب جی ہی جانتی ہیں [illegible] دوست [illegible]"

[illegible] شوکت صاحب [illegible] رہے تھے۔ اور میں شوکت صاحب کی [illegible] دل ہی دل میں [illegible] خالہ جان [illegible]

"[illegible]"

"یہ بات آپ [illegible] ۔۔۔"

"[illegible]"

"[illegible] آپ [illegible] دن میں [illegible] کہا ہے [illegible] پر عاشق ہو گئی ہیں۔ [illegible] انہوں نے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] تمہاری انگلی پکڑ کر [illegible] چلی جا رہی تھیں۔"

انہوں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"جانتے ہو۔ میرے دل پر کتنا زور دار گھونسہ پڑا تھا۔"

میری جان میں جان [illegible] اور اب میں مسکرا رہا تھا۔ [illegible] کر لیے۔

"ارے میاں مسکراؤ۔ خوب ہنسو۔ اپنی فتح اور دوسروں کی شکست پر لوگ اسی طرح مسکراتے ہیں۔"

وہ خالہ میرے لکھنؤ کے دن اور میری لکھنؤ کی راتیں شوکت صاحب کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی سے باغ و بہار بنی ہوئی تھیں۔ مجھے یہاں آتے ہوئے آٹھ دن ہو چکے تھے۔ [illegible] ایک دن بڑا ناخوشگوار [illegible] صبح کا وقت تھا۔ میں میز کے سامنے بیٹھا [illegible] رہا تھا شوکت صاحب اسی کمرے میں تھے۔ اور تخت پر بیٹھے اپنی کتابوں پر [illegible] سے آٹوگراف کر رہے تھے۔ کہ میں نے خورشید سے کہا۔

"خورشید میاں لا نا تو کتابیں۔ دیکھیں ہمارے ماموں جان نے ہمارے لئے کیا لکھا ہے۔"

خورشید نے ایک کتاب لا کر مجھے دی۔ یہ شوکت صاحب کی [illegible] تھی۔ لکھا تھا: "اس جرم میں کہ عادل بھانجے کے شوہر ہیں۔"

کتاب کے پہلے صفحہ پر [illegible] کے نیچے انہوں نے یہ فقرہ لکھا تھا۔ میں مسکرانے لگا۔ دوسری کتاب [illegible] تھی۔ لکھا تھا۔ عزیزی عادل رشید کے لئے تاکہ وہ بھی اس کی قسم کا ایک تبصرہ اس پر بھی کریں۔

اس کے بعد سے شوکت صاحب کی میری ملاقات برسوں تک نہیں ہوئی۔ خط و کتابت بھی نہیں ہوئی۔ ان کو جب میں دہلی واپس جا رہا تھا تو وہ مجھے سی۔ آف کرنے کے لئے اسٹیشن آئے تھے۔ اور بہت سے میرے مداح اور دوست تھے جو مجھے الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ارشد صاحب (راقم) بھی تھے اور سعید احمد خورشید بھی تھے۔

میں بہت پریشان اور گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ میری برتھ ریزرو نہیں تھی۔ صرف سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ میرے پاس تھا اور مجھے یہ فکر دامن گیر ہو رہی تھی کہ اگر کوئی برتھ خالی نہ ملی تو رات میں کس طرح گزاروں گا۔ میں نے کل سفری سامان سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا تھا اور میں اس کمپارٹمنٹ کے سامنے ان سب کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور الجھ رہا تھا کہ شوکت صاحب میری الجھن اور ذہنی کوفت کا اندازہ لگاتے ہوئے لپک کر بولے۔

"اماں تم عجیب ہو عادل میاں۔ اگر مجھے کوئی کہے تو میں سر کے بل کھڑا رہ کر پوری طرح اس ٹرین میں سفر کر لوں۔ مجھے تو تمہاری خوش قسمتی پر رشک آ رہا ہے اور تم ہو کہ منہ بنا رہے ہو۔"

بات دراصل یہ تھی کہ سیکنڈ کلاس کے اس ڈبے میں انتہائی حسین و حسین قسم کی کئی عورتیں بیٹھی تھیں۔ بے حد خوبصورت، دلکش، دل نشین اور بڑے گھر کی تندرست عورتیں۔ وہ پھر فرمانے لگے۔

"یہ تم نے یوں سمجھ کر دہلی کا نہیں بلکہ جنت کا ٹکٹ لے رکھا ہے۔ اور حوریں تمہاری منتظر ہیں۔"

پھر وہ ارشد صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیوں بھائی جان! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔۔۔؟"

"ہاں صاحب۔۔!" ارشد تھانوی صاحب مسکرائے: "ایک سے ایک مہ لقا ہیں یہ۔ خود میری رال اس عمر میں ٹپک پڑ رہی ہے۔ دیکھو نا ایک سے ایک پٹاخہ موجود ہے۔"

"اور یہ حضرت ہیں کہ کفرانِ نعمت فرما رہے ہیں۔" شوکت صاحب خورشید کی طرف مخاطب ہوئے: "میاں تم اپنی امی جان سے جا کر کہہ دینا کہ آبا دہلی چلے گئے۔ میں تو دہلی جا رہا ہوں۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ شوکت صاحب بولے۔

"میاں دہلی پہنچ کر اپنی خیریت کا خط ہم لوگوں کو ضرور لکھ دینا۔ ورنہ دھڑکا ہی لگا رہے گا۔ کیا پتہ کوئی حسینہ تمہیں اپنے حسن کے جادو سے مینڈھا بنا کر اپنے پیچھے پیچھے بھاگنے پر مجبور کر دے۔ آخر ہمیں اپنی عذرا کی بھی تو فکر ہے۔"

پھر گاڑی چھوٹ گئی اور میں اپنے ماموں جان شوکت تھانوی سے جدا ہو گیا تھا۔ راستہ بھر اُن کی باتیں مجھے یاد آتی رہیں اور میں اُس بکواس والے ناخوشگوار حادثہ پر افسوس کرتا رہا۔ [illegible] اے۔ آر۔ راہ گیر پر مجھے غصہ آ رہا تھا جس نے اتنے پیارے پیارے انسان، ہنسا ہنسا کر لٹا دینے والے ادیب پر تنقید لکھی تھی۔ سخت قسم کی تنقید جس سے دوسروں کو ہنسانے والا خود کبیدہ خاطر اور غمگین ہو گیا تھا جیسے ایسا محسوس ہوا تھا۔ کہ اچانک اس کا ہاتھ کرنٹ پر پڑ گیا ہو۔

میں نے اس واقعہ کے بعد سے اے۔ آر۔ راہ گیر کے نام سے پھر کبھی کچھ نہیں لکھا۔ کوئی مضمون نہیں۔ کوئی تنقید نہیں۔ میں نے اس اے۔ آر۔ راہ گیر کو زندہ زمین میں دفن کر دیا ہے۔ جس نے ہنسا ہنسا کر لٹا دینے والے شوکت تھانوی کو افسردہ اور غمگین کیا تھا۔ جس نے

لکھنؤ کے قیام کے دوران میں مجھ سے ایک دن کہا تھا۔

”تمہیں اس بات کا افسوس ہو رہا ہوگا کہ میں نے شادی میں جلدی کی۔“

”وہ کیوں ماموں جان۔“ میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔ جواب دیا گیا۔

”اس لئے کہ تمہیں شاید یہ نہیں معلوم تھا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔“

”جی۔۔۔؟“

”ارے بھئی۔ تم اُس احاطے روز جاتے ہو نا۔ گھنٹوں وہاں بیٹھے رہتے ہو۔“

میں سمجھ گیا۔ ایک احاطے میں ماموں جان کے سسرال والے رہتے تھے۔ وہ سب کے سب اُن کے عزیز تھے۔ اور وہاں نہ صرف خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں۔ جوان اور حسین کنواری لڑکیاں۔

بات کچھ ایسی نہیں تھی۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ مجھ سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ جیسے بڑبڑائے۔ ”لیکن تمہاری ممانی بھی لاکھوں میں ایک ہے۔“

یہی کی بات پہلے ایک بات اور یاد آ گئی۔

ایک روز ہم لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ کھڑکی سے ایک مرغا تازہ باہر سے کود کر آیا۔ شوکت صاحب نے اُسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمارے گھر میں ایک مرغا اور ہے۔“

شوکت صاحب کے گھر میں ایک تبدیلی ہوئی تھی۔۔۔

بمبئی کے ایک گجراتی فلم پروڈیوسر دلسکھ ایم۔ پنچولی تقسیم ہند سے پہلے لاہور کے سرکردہ اور مانے ہوئے فلمساز تھے۔ پنچولی آرٹ پکچرز ان کا تھا۔ یہ لاہور کے بڑے اثر و رسوخ والے فلمساز تھے۔ ”خزانچی“ اور ”خاندان“ ان کی مقبول ترین اور بہت بڑا بزنس کرنے والی فلمیں تھیں۔ شوکت صاحب ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر اُن کے پاس اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ ”پونجی“ اور [illegible] وغیرہ ان کی لکھی ہوئی فلمیں تھیں۔ انہوں نے اُن کی کاسٹیوم پکچر ”شیریں فرہاد“ لکھی تھی۔ وہ یہ فلم بمبئی میں جب ریلیز ہونے لگی تو پنچولی صاحب خود بمبئی آئے۔ شوکت صاحب نے مجھے ایک خط لکھا کہ تم سیٹھ جی صاحب سے جا کر ملو۔ اور اُن سے کہو کہ لاہور سے ماموں جان کا خط آیا ہے۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ یہ اُن کا حکم ہے میرے لئے۔ اسی لفافے میں شوکت صاحب نے پنچولی صاحب کے نام بھی انگریزی میں ایک خط لکھ کر رکھ دیا تھا۔ کہ یہ خط میں انہیں پیش کر دوں۔ اُس میں بھی یہی لکھا تھا کہ یہ عادل رشید میرا داماد ہے۔ بمبئی میں اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ ایک ویکلی ”شاہد“ کا مالک ہے۔ پبلسٹی میں ماہر ہے۔ اس سے آپ جو کام چاہیں لیجئے۔ اِس خط میں شوکت صاحب نے پنچولی کو سیٹھ جی لکھا تھا۔

مجھے شوکت صاحب کی اس ذہنیت پر بڑا غصہ آیا۔۔۔ میں نے وہ دونوں خطوط پھاڑ ڈالے۔ شوکت صاحب کو یہ لکھا۔

ماموں جان! تسلیم

آپ کا خط مجھے مل گیا۔ میں غلامی، جی حضوری اور ”سیٹھ جی“ کی دنیا سے

بہت دور ہوں۔ جس دن یہ ذہنیت مجھ میں پیدا ہو گی میں اسی روز خودکشی کر لوں گا۔

میں بہرصورت ذاتی طبیعت سے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ انسان کو اگر روٹی نہ ملے تو وہ زہر کھا کر مر جائے۔ میں بچوں جیسے انسان کی چوری کو گالی سمجھتا ہوں۔

میں نے آج تک کسی کا حق نہیں مارا۔ حالانکہ بمبئی میں رہتا ہوں۔ جہاں کا کلچر ہی سیٹھ ہے۔ میں آپ کی ان خدمات سے معذور ہوں۔

اس خط کے بعد پھر شوکت صاحب کا کوئی خط مجھے کبھی نہیں ملا۔ اور ہمارے مراسم اندرونی طور پر کچھ خراب ہو گئے اور ہو سکتا ہے شوکت صاحب کو شاید میرے دعووں اور میرے نام سے بھی چڑ ہو گئی ہو گی۔

غالباً ۵۶ء میں دلی میں ایشین رائٹرز کانفرنس تھی۔ اور پھر اس کے بعد ہی ہند و پاک لیکھکوں کی کانفرنس بھی تھی۔ میں ان دونوں کانفرنسوں میں دعوت پر بمبئی سے دلی گیا تھا۔ ہند و پاک لیکھکوں کی کانفرنس کے سلسلے میں پاکستان سے شوکت صاحب بھی آئے تھے۔ ایک روز جہاں یہ کانفرنس ہو رہی تھی، ہماری ان کی ملاقات ہوئی۔ صرف علیک سلیک کی حد تک اور بس۔

کانفرنس کے خاتمے والے دن، شام کے پانچ بجے تقریباً ڈھائی تین سو ادیب کانسٹی ٹیوشن کلب میں مدعو تھے۔ میں بھی تھا۔ شوکت صاحب بھی تھے۔ اتفاقاً ہم دونوں باتھ روم سے نکلے۔ تب کہیں ہمارا آمنا سامنا ہو گیا۔

"مجھے تم سے ایک بڑی شکایت یہ ہے کہ تم سنہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آئے۔ تمہارا پورا خاندان تمہارے ساتھ تھا۔ حالانکہ تمہارے بچے تم لاہور دس دن رہے۔ لیکن تم مجھ سے ملنے کے لئے راولپنڈی نہیں آئے۔"

"میں بُری طرح سٹپٹا گیا" — میں نے کہا۔

"وہ بات دراصل یہ تھی بھائی جان کہ میری چھوٹی بچی شاہینہ سخت بیمار ہو گئی تھی۔ اور ———"

اُنہوں نے میری بات اُچک لی۔

"بیکار باتیں ہیں یہ — وہ بڑے ملال کے ساتھ بولے۔ تم اور وہ سالے بھی ہم لوگوں سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔"

اور یہ کہہ کر وہ باتھ روم سے باہر آ گئے۔ میں بھی آ گیا۔ اس کے بعد پھر ہماری کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ حالانکہ ہم لوگ وہاں اس کے بعد بھی کافی دیر تک رہے۔ اور یہی میری اور شوکت صاحب کی آخری ملاقات تھی۔

دوسرے دن یونس دہلوی مدیر "شمع" کی کوٹھی پر پاکستانی ادیبوں کا ایک ڈنر تھا۔ اور اس ڈنر میں ہندوستان کے اردو کے چیدہ ادیب بھی مدعو تھے۔ میں بھی مدعو تھا۔ یونس نے مجھ سے کہا تھا کہ "اگر تم نہ آئے تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" الیاس نے زور دیتے ہوئے کہا: "عادل جانی، دیکھئے آئیے گا ضرور۔ ورنہ ہماری آپ کی کُٹّی۔"

لیکن اس ڈنر پر میں جان بوجھ کر اس لئے نہیں گیا کہ میں اُسی رات ایک دوسری جگہ پر مدعو تھا۔ اور یہ ڈنر بطور خاص میرے لئے ارینج کیا گیا تھا۔ اور ڈنر دینے والا مالکانِ "شمع" کی طرح بڑا آدمی نہیں تھا۔

تبسم صاحب قدس اللہ سرہ نے لکھا تھا کہ آپ نہیں آئے اور شوکت نے آپ [illegible] [illegible] [illegible] جیسے [illegible] [illegible] آپ کی کمی کو دو دن محسوس کرتے رہے تھے۔

اور یہ احساس مجھے اسی طرح ہوا ہے کہ شوکت صاحب کی موت پر ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے [illegible] تھے شاید [illegible] [illegible] ہم ایک ساتھ بیٹھے۔ اس کے بعد بھی کبھی [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible] تھا۔

شوکت تھانوی صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ [illegible] زندگی کا [illegible] [illegible] [illegible] نکلا ہے۔

شوکت تھانوی صاحب بہت سی خوبیوں کے آدمی تھے سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ وہ ہر جگہ [illegible] [illegible] جو آپ کو اپنی صحبت کا گرویدہ کر لیا کرتے تھے۔ [illegible] [illegible] میں پہنچ جاتا تھا وہ محفل پر چھا جاتے [illegible] بڑے بڑے پڑھے لکھے اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] معلوم ہوتے تھے۔

اپنے سے چھوٹوں کی صحبت میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے ملتے تھے۔ اور ان کا احترام کرتے تھے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔

بڑے سے بڑے چلتے باز اور حاضر جواب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] رہ جاتے تھے۔ ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک محفل میں ایک صاحب جو اپنے آپ کو بہت بڑا ادیب اور شاعر سمجھتے تھے۔ شوکت صاحب سے [illegible] [illegible] فرمانے لگے۔ "صاحب آپ کا خاندان کہاں ہے جہاں آپ بیٹھتے ہیں۔" انہوں نے تھانوی کی رعایت سے یہ [illegible] [illegible] تھا [illegible] نصیحت تو اُن کی اس بات میں کوئی [illegible] ان سنی کر دینے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے پھر یہی بات اسی انداز میں دہرائی جیسے کہ انہوں نے شوکت صاحب کو لاجواب کر دیا ہو تو شوکت صاحب نے کمال سنجیدگی سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"جب میں آپ کی ہمشیرہ محترمہ کو آپ کی دعوت پر لے کر آپ کے ہاں پہنچوں گا تو اس وقت اپنا خاندان اپنی حیثیت اور اپنا آبائی پتہ سب آپ کو بتا دوں گا۔"

اس پر ایک پرزور قسم کا فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور وہ بس۔ خان صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ میرے محترم ارشد تھانوی صاحب کے ساتھ بھی پیش آ چکا تھا۔ انہوں نے بھی ایک محفل میں ایک صاحب کو اسی قسم کا جواب دیا تھا۔ اور وہ صاحب بھی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تھے۔

شوکت تھانوی صاحب کی ایک عزیزہ کی شادی تھی۔ ایک صاحب نے شوکت صاحب سے لڑکی والے ہونے کی حیثیت سے اس ڈھنگ سے مذاق فرمایا جیسے کہ ان کی کوئی [illegible] ہو۔ شوکت صاحب نے اُن کے اس بیہودہ مذاق پر فرمایا۔

"جناب ہمارے یہاں کا اور ہر شریف آدمی کے یہاں کا یہی دستور ہوتا ہے کہ جب لڑکیاں شادی کے قابل ہو جاتی ہیں تو اُن کی ہم لوگ شادی کر دیا کرتے ہیں۔ شاید آپ کے یہاں ایسا نہ ہوتا ہو گا۔ آپ لوگ لڑکیوں کی شادی کے بجائے انہیں کوٹھوں پر بٹھا دیا کرتے ہوں گے۔" وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

شوکت صاحب ایک صاحب طرز ادیب ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک مانے ہوئے صحافی بھی تھے۔ "سرپنچ" ہفت روزہ "شباب" ماہنامہ، روزنامہ جنگ، مارواڑی ہندی اُن کے بحیثیت ایڈیٹر اور صحافی ہونے کی روشن مثالیں ہیں۔

شوکت صاحب نے بہت لکھا ہے۔ ایک پورا دفتر کا دفتر لکھ ڈالا ہے۔ انہوں نے اچھا بھی لکھا ہے۔ اور بہت اچھا بھی۔ بہت بُرا بھی لکھا ہے انہوں نے۔ لیکن دُنیا کا کون ایسا ادیب یا شاعر ہے جو ہر چیز اچھی ہی لکھے۔ ہر دُنیا کے بڑے سے بڑے ادیب کو اس کسوٹی پر پرکھئے۔ آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ شوکت صاحب نے جتنا کچھ لکھا ہے اگر ہم اس میں سے اُن کی شاہکار چیزیں چھانٹ شروع کردیں تو وہ بھی اتنی ہوں گی کہ اُس سے بیک وقت کئی مجموعے بڑی آسانی کے ساتھ ترتیب دئے جا سکیں۔ اُن کے یہ کئی حسین مجموعے ایسے ہوں گے۔ جن پر اُردو ادب کو بجا طور پر ناز ہوگا۔ جنہیں ہم بڑی آسانی کے ساتھ دُنیا کے بڑے سے بڑے ادب کے مقابلہ میں بطور نمونہ رکھ سکیں گے۔

ادیب کو مُنفرد اور صاحب طرز بنانے کے لئے تو ایک کتاب کافی ہوتی ہے۔ یوں تو شوکت تھانوی نے ایسی ایسی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو شاہکار کہلاتی ہیں۔

شوکت صاحب کا طرز نگارش اپنا تھا۔ اس پر کسی دوسرے ادیب کی چھاپ ہرگز نہیں تھی۔ شوکت صاحب کے ترشے ہوئے جملے، اُن کے مزاح کا بے ساختہ پن، ان کے جملوں کا لوچ، اُن کا نکھار، اُن کی ادائیں، ان کی بندشیں ایسی نہیں جن سے پڑھنے والا آسانی کے ساتھ گزر جائے۔

اُن کے فقرے ایسے ہوتے ہیں جو پڑھنے والے کو بے ساختگی کے ساتھ ہنسنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ اپنے مضمون "تعزیت" میں لکھتے ہیں۔

"مرحوم کو بیماری کیا تھی؟" انہوں نے پوچھا۔ جواب دیا گیا۔ "بڑھاپا خود ایک مستقل مرض تھا" فوراً بولے۔

"جی ہاں، جی ہاں۔ یہ مرض کمبخت اب عام ہوتا جارہا ہے۔ ابھی کل ہی میرے دوست کا تین سالہ بچہ اسی مرض کا شکار ہو کر مرا ہے۔"

"سودیشی ریل" میں لکھتے ہیں۔

"فائرمین سر پر کوئلے سے بھرا ہوا ٹوکرا لئے چلا آرہا تھا۔ آتے ہی ہانپتے ہوئے بولا۔ "یار" اس نے انجن ڈرائیور سے کہا "کوئلہ کا انتظام پہلے سے رکھا کرو۔ نخاس سے کوئلے کر آرہا ہوں۔ میرے گھٹنے بھی چھل گئے۔" یا ۔۔۔ ٹکٹ دینے والے بابو نے کہا۔

"اچھا لاؤ دو روپیہ چار آنے ہی نکالو۔ بوہنی کا وقت ہے۔"

جواب ہے اس بوہنی کے وقت کا۔ یا اس کا کہ انجن کے لئے ٹوکرا بھر کوئلہ نخاس کی ایک دوکان سے لایا گیا ہے لانے والے فائرمین کے گر پڑنے کی وجہ سے گھٹنے بھی چھل گئے ہیں۔ یا اس کا کہ میرے دوست کا تین سالہ بچہ اسی بڑھاپے کے مرض میں مبتلا ہو کر مرا ہے۔ یا اس بات کا کہ باپ کے مرنے کا پُرسہ جوان بیٹے کو اس طرح دیا جارہا ہے کہ "اللہ تمہیں اس کا نعم البدل جلد دے۔"

مجھے ٹھیک سے نہ تو یاد ہے اور نہ اس وقت یہ مضامین ہی میرے پاس کہ انہیں میں صحیح طور پر نقل کر سکوں۔ لیکن باتیں کچھ اسی قسم کی تھیں۔ کوزے میں دریا بند ہوتے تو سنا ہے۔ لیکن شوکت صاحب کے یہاں اُن کے ایک ایک فقرے میں کئی کئی سمندر بیک

وقت بھلے جیسے مزاح کے ایسے [illegible] جیسا کہ آگ بنا دیں۔ اسے پڑھنے والے اُن میں بہہ جاتے ہیں۔
شوکت صاحب کے جملوں میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ بناوٹ نہیں۔ سب سے بڑا فرق انہیں دوسرے مزاح نگاروں سے ممتاز بناتا تھا۔

آپ غضب کے شاعر بھی تھے۔ سنجیدہ شاعری کی بات نہیں، اس سے نہیں کہہ سکتا۔ ہاں وہ شاعری بڑی خوبیوں سے بہت [illegible] ہے۔ البتہ میں ان کی ایک نظم کراچی کی بس کا ذکر کیے بغیر [illegible]۔ بمبئی میں ایک مشاعرہ تھا آپ بھی پاکستان سے اس مشاعرے میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے۔ اس وقت مسٹر چوان جو مہاراشٹر گورنمنٹ کے چیف منسٹر تھے (آج کل یونین منسٹر ہیں) چوان صاحب بہت بہادر بھی دوسرے صوفے پر بیٹھے تھے۔ [illegible] ایک دلچسپ بات ہے۔ لیکن وہ بھی شوکت صاحب کے ایک شعر پر اتنا ہنسے کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اور آپ نے مقررہ وقت [illegible] ارشاد کا نعرہ بھی لگایا۔

شوکت صاحب نے اپنی نظم "کراچی کی بس" میں کراچی کی بسوں میں سب سے زیادہ [illegible] فرماتے ہیں۔
"اتنی بے دردی کے ساتھ ہمارے جسم میں بجلی ہوتی، اور ہم نے سمجھا تھا چاہا تو [illegible] ہمارا دوسرے لگا رہے ہیں۔"
اس مفہوم کا یہ شعر تقریباً ہزاروں سننے والے شوکت صاحب کے اس شعر پر دیوانے ہو گئے۔ چوان جیسے اُردو سے ناواقف شخصیت نے اس شعر کی اتنی داد دی کہ ہنستے ہنستے دیوانے ہو گئے۔

شوکت تھانوی کی موت یقینی طور پر اُردو ادب کے لیے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ یہ موت شوکت تھانوی کی اپنی ہی موت نہیں ہے۔ بلکہ یہ موت اُردو ادب کے اُن ہزاروں لاکھوں پڑھنے والوں کی مسرتوں، شادمانیوں اور قہقہوں کی موت بھی ہے۔ جو شوکت تھانوی کی گل افشانیوں سے جنم لیتے رہے تھے۔

وہ محفلیں اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سونی ہو گئیں جو شوکت تھانوی کی وجہ سے کشتِ زعفران بنی رہتی تھیں۔ جہاں وہ شمعِ محفل بنے ہوئے ہر خاص و عام کی توجہ کا مرکز بنے رہتے تھے۔ اُن کے قہقہوں سے دُنیا خالی ہو گئی۔ اور اُن کے اُٹھ جانے سے اب بہت دنوں تک ایسا محسوس ہوتا رہے گا۔ جیسے کہ ماحول، ہلاک سناٹوں اور ویرانیوں سے دوچار ہو گیا ہے۔ جیسے ——— "ایک ملکوتی مشعل گاڑی گذر جانے کے بعد۔"

میرا دل بار بار پوچھتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ میں شوکت صاحب سے کسی طرح بڑے پیار کے ساتھ پوچھوں۔

"کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور"

شوکت بھائی

اقبال سفی پوری

شوکت بھائی جنہیں "مرحوم" لکھتے ہوئے نہ صرف دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے بلکہ روحانی اذیت بھی محسوس ہوتی ہے مرحوم نثر نگاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے ان کی نثر نگاری کا صحیح اندازہ انہی حضرات کو ہو سکتا ہے جنہوں نے انہیں نثر لکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کا قلم صفحۂ قرطاس پر اس روانی سے چلتا تھا کہ دیکھنے والے محو حیرت ہو جاتے تھے۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے بلا تکلف صفحے کے صفحے لکھتے چلے جاتے تھے۔ ان کی مہارت اور قدرت کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی نشست میں بیس صفحات لکھنے کے بعد بھی کوئی لفظ نہ کاٹتے تھے نہ ہی کوئی فقرہ تبدیل کرتے تھے۔ انہیں اپنی صلاحیتوں پر کامل اعتماد تھا۔ اور جو موضوع ان کے سامنے آتا تھا وہ اپنی اعلیٰ ذہانتوں کے بل پر اسے تشنۂ تکمیل نہ چھوڑتے تھے لیکن جس چیز نے انہیں برصغیر ہند و پاک میں غیر معمولی شہرت و عظمت عطا کی وہ ان کا منفرد طرز نگارش اور مخصوص انداز طنز و مزاح تھا۔

شوکت تھانوی بسیار نویس تھے۔ یہ بات مشہور ہے کہ بسیار نویس اچھا ناثر اور بسیار گو اچھا شاعر نہیں ہوتا لیکن شوکت صاحب کی تصانیف۔ ادارئیے۔ ادبی مضامین۔ مقالے۔ خاکے۔ فکاہی کالم اور ریڈیائی فیچر غرضیکہ تمام نثری کائنات پر نظر ڈالنے کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انکی نثر میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ بلکہ ایک ایک لفظ اپنی جگہ نگینے کا کام دیتا ہے۔

شوکت بھائی ایک کامیاب اور صاحب طرز نثر نگار ہی نہیں تھے۔ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی غزلیات کا اولین مجموعہ "گہرستان" پڑھنے کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ذہن رسا اور قلب سلیم عطا کیا تھا ان کی غزلوں میں سوز و گداز۔ کیف و اثر۔ لطف زبان و بیان۔ مختصر یہ کہ وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو لازمۂ غزل ہیں بایں ہمہ یہ بات یقیناً باعث حیرت و استعجاب ہے کہ وہ ایک کامیاب مزاح نگار بھی تھے اور ایک سنجیدہ غزل گو بھی۔ چند سال سے انہوں نے اپنی سنجیدہ غزل گوئی کا رخ مزاحیہ شاعری کی طرف موڑ دیا تھا۔ اسکا سبب غالباً شوکت بھائی کے عزیز ترین دوست اور ملک کے مشہور اور مستند مزاح و طنز نگار شاعر سید محمد جعفری کی رفاقت اور دوستی تھی۔ لیکن اس میدان میں بھی انہوں نے اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا کر چھوڑا۔ پاکستان و ہندوستان میں ایک دو نہیں نہ جانے کتنے مشاعرے پڑھے اور عوام و خواص سے داد و تحسین حاصل کی ان کی ہمہ گیر طبیعت اور خوبیوں کا اندازہ صحیح طور پر انہیں کو ہو سکتا ہے جو ان کے بے تکلف رفیق خلوت رہے ہیں اور جنہوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے۔

آج سے تقریباً [illegible] سال پہلے غالباً [illegible] کی بات ہے جب پہلی بار شوکت صاحب سے تعارف [illegible] ملاقات ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ میں [illegible] اور اپنی [illegible] ۔ شوکت بھائی [illegible] مشہور [illegible] میں شہرت پا چکے تھے۔ میری شاعری [illegible] ۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے ترنم کی دولت سے بھی نوازا ہے۔ [illegible] کامیابی سے ہم کنار ہو [illegible] اور تمام بڑے بڑے مشاعرے [illegible] ۔ شوکت بھائی [illegible] تھے۔

[illegible] میں لکھنؤ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ [illegible] مشاعرے کے سیکرٹری جناب صبیح الدین صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ لکھنؤ تھے۔ شوکت بھائی [illegible] جیسے صاحب [illegible] شوکت [illegible] جگر [illegible] مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی [illegible] آسی [illegible] لکھنوی [illegible] ثاقب لکھنوی وغیرہ جیسی عظیم شخصیتیں موجود تھیں۔ [illegible] شوکت [illegible] شاعر [illegible] نشستوں پر [illegible] شوکت [illegible] مشاعروں [illegible] شوکت بھائی [illegible] مجھے اس وقت [illegible] بغیر [illegible] اور میرا نام [illegible] شعراء کی فہرست میں شامل کر لیا [illegible] مشاعرے میں شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ اور یہ میرا [illegible] ۔ اس مشاعرے کے صدر [illegible] صاحب بھٹناگر تھے۔ فہرست شعراء کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے تھی [illegible] ہونے کی حیثیت سے مجھ سے مشاعرے کی ابتدا ہوئی۔ شوکت بھائی میری کامیابی پر خوش [illegible] اپنے حسن انتخاب پر نازاں تھے یہ کامیابی میری ادبی زندگی کا پہلا موڑ تھا جس کے لئے شوکت بھائی کا رہین منت رہوں گا۔ اس لئے کہ میں نے اپنی [illegible] اور سن و سال کے اعتبار سے اس عظیم اور تاریخی مشاعرے میں شرکت کا اہل نہ تھا۔ اس مشاعرے میں کامیابی کے بعد میرے لئے مقامی و بیرونی مشاعروں میں شرکت کی راہیں [illegible] ہو گئیں۔ اس سے شوکت صاحب کی وسیع نظری اور عالی ظرفی [illegible] کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر شعراء اور ادبا میں حسد و رقابت کا جذبہ پایا جاتا ہے لیکن شوکت بھائی اس سطح سے بلند تھے۔ انہوں نے دوسروں کے کمال کا اعتراف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اور کامیاب نثر نگاروں [illegible] کی ہمت افزائی کی۔ برسبیل تذکرہ یہ لکھنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ شوکت صاحب نے ادبی دنیا میں جو منفرد مقام حاصل کیا اس کے اسباب و محرکات کیا تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے روزنامہ "جنگ" میں ان کے حالیہ کالم بعنوان "کچھ یادیں کچھ باتیں" (افسوس کہ جنہیں وہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے) پڑھے ہیں وہ بخوبی جان گئے ہیں کہ شوکت صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی میں تحصیل علم و فن کے لئے کس قدر

دماغ سوزی، عرق ریزی، اور شبانہ روز محنت کی ہے۔ اور یہ اسی کاوش اور پرخلوص مشق کا نتیجہ تھا کہ وہ طنز کے صاحب طرز اہلِ قلم تسلیم کئے گئے اور ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر جلوہ گر ہوا۔

شوکت بھائی رونقِ انجمن، حاضر جوابی اور طنز و مزاح کے رنگ میں ڈوبے ہوئے چست و برمحل جملوں سے تھوڑی دیر میں ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ وہ ہر شاعر کے انداز میں اس کی کامیاب نقل اتار سکتے تھے۔ آواز و لہجہ ہی نہیں بلکہ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے وہ محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے لیکن چند مخصوص احباب و اعزّہ کے علاوہ شاید ہی کسی کو اس کا علم ہو کہ وہ شخص جو دوسروں کو ہنسانے اور محفلوں کو زعفران زار بنانے کا ملکہ رکھتا تھا، وہ خود اندرونی طور پر کس قدر دکھی تھا۔ ان کی زندگی شدید الجھنوں اور آلام و مصائب کا مرقع تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوت برداشت مزید عطا فرمائی تھی وہ اپنی اندرونی کشمکش اور ذہنی الجھنوں کو چھپانے میں عزیزوں کی محفلوں میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ اسلئے بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں۔ چونکہ شوکت بھائی سے مجھے نسبت قرابت داری بھی ہے۔ وہ یوں کہ ان کی پہلی بیگم سعیدہ خاتون میری رشتہ کی بہن ہوتی ہیں اس بنا پر مجھے ان کی نجی زندگی کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا رہا۔

شوکت بھائی قیامِ پاکستان سے قبل ہی لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر لاہور آ چکے تھے اور پنچولی آرٹس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مجھے اس مفارقت کا بیحد قلق تھا۔ اسے اتفاق سے تعبیر کیجئے یا میری خوش قسمتی سے کہ جون ۱۹۴۸ء میں جناب ایس۔ ایم۔ توفیق صاحب مرحوم سابق چیف انجینئر کراچی میونسپل کارپوریشن کے برادرِ خورد مسٹر ایس۔ ایم۔ عتیق جو میرے عزیز دوست ہیں اور اپنے وطن کانپور میں مقیم ہیں۔ ان کی بارات میں مجھے لاہور آنا پڑا۔ باراتیوں میں مولانا حسرت موہانی صاحب مرحوم اور مولانا کرمی صاحب بھی شامل تھے۔ شوکت بھائی لاہور سے بارات میں شریک ہو گئے۔ مجھ سے ملکر بیحد خوش ہوئے اور کہنے لگے اب تمہیں بھی واپس نہیں جانے دیا جائے گا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اب عین نکاح کے وقت لڑکی والوں کی طرف سے شرکت کے لئے جناب سید سعید جعفری سی۔ ایس۔ پی جو اسوقت لاہور میں ڈائرکٹر فوڈ ڈیپارٹمنٹ کے عہدے پر فائز تھے تشریف لائے۔ جعفری صاحب نے بھی مجھ سے اصرار کیا کہ میں مستقلاً پاکستان آجاؤں۔ شوکت بھائی بولے انہیں واپس ہی کیوں جانے دیا جائے۔ جس سے موصوف نے اتفاق کیا چنانچہ دونوں حضرات کے اصرار پر مجھے یہ اعلان ہونا پڑا۔ بارات دوسرے روز واپس گئی اور میں شوکت بھائی کے مکان نمبر ۱ کینال پارک میں منتقل ہو گیا۔ میرے بارات کے ساتھ واپس نہ جانے کی وجہ سے عتیق صاحب کو ایک مدت تک شکایت رہی۔

جعفری صاحب نے چند ہی دنوں میں میرا تقرر فوڈ میں چیف انسپکٹر کی حیثیت سے کر دیا اور فرمایا کہ اب جا کر بیوی بچوں کو لے آؤ۔ چنانچہ میں ہندوستان گیا اور سب کو ہمراہ لے کر ۲ ہفتے میں لاہور واپس آ گیا۔ لاہور آنے کے بعد۔ میں، میری بیوی اور میرا ایک بیٹا شوکت بھائی کے اسوقت تک مہمان رہے جب تک کہ اسی کوٹھی کا نصف حصہ مجھے الاٹ نہیں ہو گیا۔ میرے اور میری شریک زندگی کے مسلسل اصرار کے باوجود شوکت بھائی اس بات پر رضامند نہ ہوئے کہ ہم لوگ اس مختصر مدت کے لئے اپنے خورد و نوش کا علیحدہ انتظام کر لیں۔ یہ ان کی محبت، خلوص اور فراخدلی کا ایک روشن ثبوت ہے چونکہ کوٹھی کا نصف حصہ مجھے الاٹ ہو گیا اس لئے ہم لوگ اکٹھے رہنے لگے اب وہ ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہو چکے تھے۔ ہم دونوں اپنی ملازمت کے فرائض انجام دینے کے بعد کس لطف سے وقت گزارتے تھے آج بھی اسے یاد کر کے دل بے چین ہو جاتا ہے۔ یوں تو ان کی زندگی کے نہ جانے کتنے دلچسپ واقعات ذہن میں محفوظ ہیں اور بھی

چاہتا ہے کہ انہیں یادگار کے طور پر ضبط تحریر کر دیا جائے کاش مجھے کبھی اتنی فرصت ہو سرگزشت لکھ سکوں یہ فرض [illegible] احسن طریقے سے ادا کر سکوں۔ ایک ایسا واقعہ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت دلچسپ بھی ہے۔ تو [illegible] کے لئے تحریر کرتا ہوں اس واقعہ کا مطلب یہی ہے کہ ایک دوست نے جنہیں جھوٹ بولنے کی شاید کوئی عادت تھی آغا شوکت بھائی سے پہلی ملاقات پر ایک بات ایسی بیان کی جس کا انہیں یقین آگیا لیکن جب انہیں اس بات کے جھوٹ ہونے کا علم ہوا تو نہ صرف انہیں ندامت ہوئی بلکہ افسوس بھی کہ ایک شخص نے ان جیسے ذہین انسان کو بیوقوف بنا دیا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا انتقام لیا وہ نہ صرف ان کی ذہانت، بلکہ ان کی روشن دماغی کا ثبوت ہے۔ بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ان صاحب نے غالباً زندگی بھر کیلئے جھوٹ نہ بولنے کا عہد کر لیا۔ جھوٹ ایک ایسی بری عادت ہے کہ [illegible] مستقلاً جھوٹ بولتا ہے تو [illegible] جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں ان کا یہ پہلو [illegible] کر دیں [illegible] بہت جلد [illegible] جھوٹ بولنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ عادی ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب سے متعلق یہ واقعہ ہے وہ جھوٹ کی اسی قسم میں آتے ہیں۔

واقعہ یوں ہے کہ ہمیں [illegible] یہاں بیٹھے ہوئے کچھ عرصہ ہی گزرا ہوگا کہ ایک روز مجھے ہندوستان کے ایک پرانے وقت کے ساتھی اور عزیز دوست کا کراچی سے تار ملا کہ وہ کل صبح [illegible] پہنچ رہے ہیں اس غیر متوقع آمد کے ملنے کی بڑی خوشی ہوئی اور میں نے شوکت بھائی سے اپنی مسرت کا اظہار کیا ساتھ ہی آنے والے دوست کا غائبانہ تعارف بھی کرا دیا۔ یہ ہندوستان کے ایک باعزت اور بلند خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بڑے بھائی صاحب ان دنوں قائداعظم مرحوم (جو اس وقت بسلسلہ علالت زیارت میں قیام پذیر تھے) کے خصوصی ذاتی اسٹاف میں کسی ذمہ دار عہدے پر فائز تھے۔ اس بات کا بھی تذکرہ میں نے شوکت بھائی سے کر دیا۔ ظاہر ہے شوکت بھائی نے آنے والے مہمان کے متعلق ایک اچھی رائے قائم کی ہوگی۔ وہ ان سے ملنے کے مشتاق ہو گئے۔ قائداعظم کی علالت کی وجہ سے ہم سب رنجیدہ تھے اور ہر ایک کو ان کی صحت اور حالات کی صحیح کیفیت معلوم کرنے کی فکر رہتی تھی اور ہر شخص ان کی صحت کیلئے دست بدعا تھا۔

میں اور شوکت بھائی اپنے دوست کو دوسرے روز اسٹیشن پر خوش آمدید کہنے گئے۔ ان سے تعارف کے بعد شوکت بھائی نے پہلا سوال یہ کیا "میاں قائداعظم کا صحیح حال کچھ معلوم ہے ان کا مزاج کیسا ہے؟" میرے دوست بلا تامل بولے "میں تو بھائی جان کے پاس ہی تھا۔ زیارت سے پرسوں کراچی پہنچا اور دوسرے روز یہاں کے لئے چل دیا۔ زیارت سے چلنے کے ایک روز قبل قائداعظم کی صحت کی خوشی میں بھائی جان نے انہیں ڈنر پہ مدعو کیا تھا جہاں میری ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ بحمداللہ وہ اب روبہ صحت ہیں۔ معمولی کمزوری رہ گئی ہے۔ وہ بھی رفتہ رفتہ جاتی رہے گی۔" یہ سن کر شوکت بھائی کو بیحد مسرت ہوئی اسلئے کہ اسوقت اخبارات میں قائداعظم سے متعلق واضح طور پر کوئی خبر نہ آتی تھی میں اس بیان کی صداقت سے کما حقہ واقف تھا لیکن میں نے شوکت بھائی سے فوری طور پر اُس دوست کی کمزوری کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا جس سے ابھی ابھی تعارف ہوا تھا۔ لیکن اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ یہ بات کہاں تک پہنچے گی تو اس کا فوری اظہار بھی نامناسب نہ ہوتا۔

ہم دونوں اپنے مکان پر آگئے اور شوکت بھائی ریڈیو اسٹیشن چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اس خوش خبری کو آنِ واحد میں پوری تفصیل کے ساتھ نشر کر دیا۔ لوگ مسرت سے ناچنے گانے لگے۔ مٹھائیاں تک تقسیم ہو گئیں۔ اپنے

محبوب قائد اعظم کی صحت کی خوشی کوئی معمولی خوشی تو نہ تھی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن شومئی قسمت تو دیکھئے کہ تھوڑے دنوں بعد قائد اعظم کے انتقال پُر ملال کی خبر آگئی اور ہر طرف ایک کہرام مچ گیا۔ ریڈیو اسٹیشن کو ہر اہم خبر کی اطلاع سب سے پہلے ہی ہو جایا کرتی ہے چنانچہ خبر آتے ہی ساتھی ریڈیو اسٹیشن لاہور کے چھوٹے بڑے افسران نے شوکت بھائی کے کمرے پر دھاوا بول دیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے بھائی یہ کس چیز خوشی کی خبر لائے تھے آپ؟ کوئی بولا "اگر مٹھائی ہی کھلانا مقصود تھی تو یوں ہی کھلائی جا سکتی تھی اتنی بڑی شخصیت کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت تھی" وغیرہ وغیرہ۔ شوکت بھائی اپنا سا منہ لئے دبکے بیٹھے بظاہر خفا اور شرمندہ تھے لیکن ہمارے دوست کے خلاف ان کا جذبۂ انتقام بھڑکتا چلا جا رہا تھا۔

میرے دوست کا تقرر حکومت پاکستان کے ایک محکمہ میں ہوا تھا اور وہ اس سلسلے میں لاہور آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے عہدے کا چارج ایک روز قبل لے چکے تھے۔ جب شوکت بھائی ریڈیو اسٹیشن سے گھر واپس آئے تو ان کا چہرہ ان کے جذبات و احساسات کی پوری ترجمانی کر رہا تھا۔ آتے ہی انہوں نے میرے دوست سے پوچھا کہ بھائی عجیب بات ہے ابھی چند روز قبل حضرت قائد اعظم ماشاء اللہ اتنے تندرست تھے کہ آپ کے بھائی صاحب کی طرف سے دی ہوئی دعوت میں شریک تھے اور آج اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ میرے دوست نے حاضر جوابی سے کام لیتے ہوئے کہا "شوکت بھائی زندگی اور موت کا کیا بھروسہ اچھا خاصا تندرست انسان چلتے چلتے ٹھوکر لگنے سے گر جاتا ہے اور وہیں دم توڑ دیتا ہے۔ قائد اعظم تو ضعیف اور کمزور ہو چکے تھے" "سچ کہتے ہو میاں" شوکت بھائی نے ان کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ مجھے علیحدہ لے جا کر شوکت بھائی رازدارانہ طور پر بولے "یہ حضرت پہنچے ہوئے درویش معلوم ہوتے ہیں۔ انکو بھی وہ مزہ چکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ اور آئندہ جھوٹ بولنے کی ہمت نہ کریں گے"۔ دوسرے روز شام کو میں اور میرے دوست مکان کے سامنے نہر کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے کہ ناگاہ شوکت بھائی ریڈیو اسٹیشن سے واپس آتے ہوئے دکھائی پڑے۔ ہم لوگ بھی ان کی طرف بڑھے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ قریب پہنچ کر انہوں نے مجھ سے کہا "اقبال میں نے تمہارے دوست کو آسمان پر پہنچا دیا ہے لیکن قبل اسکے کہ میں اس بات کو بتلاؤں انہیں مٹھائی کھلانے کا وعدہ کرنا ہوگا" میرے دوست نے کہا "شوکت بھائی آپ کیلئے مٹھائی ہر وقت حاضر ہے" "یوں نہیں صاحب پہلے مٹھائی کے لئے دس روپیہ کا نوٹ اقبال کے پاس رکھ دو تب بات بتاؤں گا اور شرط یہ ہے کہ اگر اس غیر متوقع اطلاع سے تم کو مسرت نہ ہو تو بیس روپے کی مٹھائی میرے ذمہ رہی" میرے دوست نے بالآخر دس روپے کا نوٹ اپنی جیب سے اور شوکت بھائی نے ایک لفافہ اپنے بیگ سے نکال کر بیک وقت میرے ہاتھ میں رکھے۔ لفافہ کھول کر میں نے ٹائپ شدہ خط نکالا اور پڑھ کر اس کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اور اپنے دوست کی جانب بظاہر رشک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے خط بڑھا دیا۔ شوکت بھائی بولے آج سے انکا شمار پاکستان کی چند مخصوص اور بلند ترین شخصیتوں میں ہو گیا ہے۔ جس کے لئے یہ تا عمر میرے شکر گزار رہیں گے۔

وہ خط ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹیشن ڈائرکٹر کی جانب سے ان کے چھپے ہوئے لیٹر پیڈ پر تھا اور اس میں تحریر تھا جناب والا ہمیں شوکت تھانوی صاحب کے ذریعہ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو حضرت قائد اعظم سے ان کی وفات سے چند روز پہلے اپنے بڑے بھائی کے یہاں دئے ہوئے عشائیہ پر شرف ملاقات کا حاصل ہوا۔ ہم ممنون ہوں گے اگر آپ فلاں فلاں تاریخ ۹ بجے شب ایک تقریر ہمارے ریڈیو اسٹیشن سے نشر فرمائیں۔ اور قائد اعظم سے آخری ملاقات

[illegible] تاثرات کا اظہار فرمائیں۔ آپ پاکستان کی ان چند خوش نصیب ہستیوں میں سے ہیں جنہیں مرحوم سے [illegible] زمانہ میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مرحوم [illegible] ہم نے کراچی ریڈیو اسٹیشن کو بھی مطلع کر دیا ہے۔ [illegible] مجھے بھائی صاحب کی خدمت میں اس [illegible] تقریر کے لیے [illegible] پیش کرنا ہے"

محمد کا پڑھنا تھا کہ مارے [illegible] ان کے [illegible] چہرہ فق ہوگیا [illegible] [illegible] ..... [illegible] جیسے گویا ہو لے شوکت بھائی .... جی [illegible] ہے کہ ...... یہ اچھا نہیں ہے —

اچھا کیوں نہیں ہوا۔ شوکت بھائی نے میاں مٹھائی [illegible] باتوں سے بیوقوف بنانے کی کوشش [illegible] مجھ سے [illegible] [illegible] میں نے اس [illegible] چھوڑ دیا [illegible] مشکوک [illegible] چل کر چائے بنواتا ہوں —

شوکت بھائی مٹھائی کی بات ہے آپ [illegible] تو بس [illegible] ایک نوٹ [illegible] لیکن [illegible] [illegible] ہی [illegible] دوست نے [illegible] اور بات کا رخ موڑتے ہوئے [illegible] سمجھ گیا [illegible] تم کیوں پریشان ہو [illegible] ساری [illegible] ذرا ایسی لکھوں گا کہ [illegible] تقریر [illegible] تمھاری [illegible] تم صرف اس دعوت کی [illegible] پرچے پر لکھ دو باقی میری ذمہ داری ہے۔ [illegible] جب [illegible] جائیے اور مٹھائی لے کر آئیے۔

چنانچہ میں چل دیا اور تقریباً ایک گھنٹے میں مٹھائی لے کر واپس آگیا۔ ہمارے اصرار کے باوجود وہ مٹھائی میں شریک نہیں ہوئے۔ اتنے میں میری بیگم جن کو اس ڈرامے کا علم ہو چکا تھا [illegible] اور [illegible] مجھ سے بولیں "آپ دونوں نے انہیں کس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا ہے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ایسے مذاق سے کیا فائدہ؟ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں"

میں نے کہا ابھی عجلت کیا ہے۔ ذرا صبر کرو اور تماشہ دیکھو۔ چائے کے بعد شوکت بھائی نے ہمارے دوست کی طرف کاغذ کا ایک شیٹ بڑھاتے ہوئے فرمایا "آپ اس پر اس دعوت کی نمایاں باتیں مثلاً قائد اعظم مرحوم کس لباس میں ملبوس تھے ان کے داہنے بائیں کون بیٹھا تھا۔ کھانے کے وقت کس قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ اس دعوت میں دیگر کون شخصیتیں موجود تھیں وغیرہ وغیرہ یادداشت کے طور پر نوٹ کر دیں تاکہ میں تقریر ابھی لکھ دوں اور آپ دو روز میں اسے کئی بار پڑھ کر رواں کر لیں"

ہمارے دوست نے وہ کاغذ تو لے لیا لیکن پھر شوکت بھائی کی منت و سماجت کرنے لگے "اگر آپ نے یہ پروگرام منسوخ نہ کرایا تو مصیبت آجائے گی۔ میرے اور بھائی جان کے تعلقات خراب ہو جائیں گے اس لئے کہ [illegible] اس دعوت کا کہیں تذکرہ نہ کرنا۔ میں نے آپ کو اپنا سمجھ کر بتلا دیا"

شوکت بھائی نے پوچھا کہ آخر اس کو صیغۂ راز میں رکھنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ؟!

ہمارے دوست برجستہ بولے اصل بات یہ ہے کہ آج کل بھائی جان کے تعلقات وزیر اعلیٰ سے کچھ بہتر نہیں ہیں اور موصوف کو اس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی اب اگر اس کا چرچا ہوتا ہے۔ اور ان کے علم میں یہ دعوت آجاتی ہے تو بھائی جان کی پوزیشن اور خراب ہو جائے گی "

"سبحان اللہ کیا استدلال ہے" ہاں یہ دعوت ہوئی بھی تھی کہ تم نے یوں ہی اڑا دیا" شوکت بھائی نے پوچھا۔

میرے شیر نے سینہ تان کر جواب دیا "نہیں صاحب دعوت تو ضرور ہوئی تھی۔ اور محترمہ فاطمہ جناح بھی شریک تھیں "

"تو پھر تقریر بھی منظور ہو گی" "میں مجبور ہوں اس لئے کہ ریڈیو کے پروگرام میں تنسیخ میرے بس کی بات نہیں" شوکت بھائی نے ذرا لہجہ بدل کر کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں دل کا دورہ پڑتے پڑتے رہ گیا۔ ان کی عدم موجودگی میں میری بیگم اور میں نے شوکت بھائی سے درخواست کی کہ اب اس کی خطا معاف کر دیجئے ورنہ صبح تک اس کا برا حال ہو جائے گا لیکن وہ ابھی کہاں معاف کرنے والے تھے۔ انہوں نے کہا کہ خاموشی سے تماشہ دیکھتے جاؤ۔ وہ واپس آئے تو شوکت بھائی نے سوالات کی بوچھار کر دی جو کچھ اس قسم کے تھے؛

"قائد اعظم کے داہنے۔ بائیں کون بیٹھا تھا؟"

"ان کے داہنی طرف محترمہ فاطمہ جناح تشریف فرما تھیں اور بائیں جانب بھائی جان"

"قائد اعظم کس لباس میں ملبوس تھے؟"

"ڈنر سوٹ پہنے ہوئے تھے"

"محترمہ فاطمہ جناح کون سا اور کس رنگ کا لباس زیب تن فرمائے تھیں؟"

"سیاہ رنگ کی ساڑھی پہنے تھیں "

"تو یوں کہئے کہ انہوں نے اپنے بھائی کے سوگ میں ۴-۶ یوم پہلے ہی سے ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ ورنہ یوں تو بالعموم وہ سفید لباس پسند فرماتی ہیں۔ اچھا میں اب سمجھ گیا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں مضمون لکھ لوں گا؟"

میرے دوست بولے "شوکت بھائی وقت گزرتا جا رہا ہے آپ خدا کے لئے کسی صورت سے کراچی ٹیلی فون کریں اور انہیں روکیں ورنہ اگر کہیں بھائی جان کے پاس اس تقریر کے لئے خط چلا گیا تو غضب ہو جائے گا اور میں کہیں کا نہ رہوں گا" اب کوئی نو بجے کا عمل ہوگا۔ میرے دوست کی حالت غیر تھی اور ہر لحظہ بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ بار بار پانی پیتے تھے پھر بھی ہونٹ اور زبان خشک نظر آ رہے تھے بالآخر میرے دوست مجھے علیحدہ لے گئے اور کہا کہ اگر بھائی جان کی تقریر کو ملتوی نہ کرایا گیا تو قیامت آ جائے گی۔ میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ ریڈیو پاکستان کا خط فرضی اور جعلی ہو شوکت بھائی نے مذاقاً ایسا کیا ہو تو فرمانے لگے "تم پاگل ہو گئے ہو، خط پر اسٹیشن ڈائرکٹر کے دستخط موجود ہیں۔ (جیسے وہ دستخط پہچانتے ہوں) بات یہ ہے کہ جب انسان بوکھلایا ہوا ہوتا ہے تو اس کی ساری دماغی صلاحیتیں جواب دے دیتی ہیں۔ اس وقت یہ اسی منزل میں تھے۔ میں نے پوچھا۔ اچھا مجھے تو صحیح بتاؤ ڈنر کی بات غلط ہے نا۔ اس ڈھٹائی سے بولے غلط کون کہتا ہے ڈنر ہوا اور میں بھی موجود تھا۔ تو پھر تقریر کرنے میں کیا قباحت ہے۔ جب کہ شوکت

معلوم ہو، یہ تقریر ملتوی کرا دی ہے! کہنے لگے بھائی تقریر سے زیادہ دوست یہ بات پریشان کئے ہوئے ہے۔ کہ بہت ممکن ہے بھائی جان کو اس موضوع پر تقریر کرنے کے لئے دعوت دی گئی ہو۔ میں مصلحتاً اپنا حوالہ مناسب نہیں سمجھتا ہوں اگر ریڈیو والے چاہیں تو دعوت دیں لیکن میرا نام کسی صورت سے درمیان میں نہ آنا چاہیے۔

میرے دوست کی حالت لمحہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ ہم سب نے ایک زبان ہو کر ان سے کہا کہ شوکت بھائی اس بات پر ہم لوگوں نے رضامند کر لیا ہے کہ وہ نہ صرف جی۔ پی۔ او۔ جا کر ٹرنک کال کریں گے اور بھائی جان کی تقریر منسوخ کرا دیں گے بلکہ تمہاری بھی تقریر منسوخ کرانے کی کوشش کریں گے لہٰذا تم اس بات کا اقرار کرو کہ تم جھوٹ بول رہے تھے ورنہ کیسے منہ بولے وکیل صاحب تو چلے گئے۔ وہ اس پیر کو یہاں تو نہیں بیٹھے تھے کسی طرح اگر کر چکے بات تو اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ میں بلا وجہ جھوٹ کیوں بولتا۔ اب اگر زبردستی آپ لوگ یہ کہلوانا چاہتے ہیں کہ دعوت نہیں ہوئی تو بات دیگر ہے۔

اب میں سمجھ چکا تھا کہ ان سے اقرار جرم کا موقع نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی مناسب نہ تھی کہ یہ بات اسی طرح ختم کر دی جاتی چنانچہ میں نے کوشش کر کے شوکت بھائی سے سب کی موجودگی میں کہا کہ صاحب یہ مذاق تھا جھوٹ یوں ہی بول رہے ہیں۔ نہ ماڈل ٹاؤن کی دعوت ہوئی اور نہ ہی یہ وہاں موجود تھے۔ چونکہ یہ کہہ چکے ہیں اس لئے یہی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے بھی ان کی تقریر کو منسوخ کرا دیا تو ان کے بھائی صاحب سے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ اور ان کی ملازمت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

یہ سن کر شوکت بھائی اقبال کی طرف مخاطب ہو کر بولے "کیوں بھائی اقبال جو کچھ کہہ رہے ہیں درست ہے؟" اس بار دل الجاجت سے انہوں نے جواب دیا "اب آپ جو کچھ سمجھیں ٹھیک ہے۔ لیکن خدا کے لئے اب مہلت کیجئے میں تانگہ لینے جاتا ہوں۔ دس بج چکے ہیں۔ جی۔ پی۔ او۔ چل کر ٹیلی فون کرنا ہے۔" اب شوکت بھائی کو بھی اس کے حال زار پر ترس آ گیا تھا اور وہ چلنے کیلئے تیار ہو گئے۔ تانگہ آ گیا ہم تینوں جب مکان سے نکلنے لگے تو شوکت صاحب کی بیگم صاحبہ نے کہا کہ "آپ ادھر جا رہے ہیں تو انارکلی سے موتی چور کے لڈو ضرور لیتے آیئے گا۔" شوکت صاحب نے ان سے پیسے مانگے تو میرے دوست نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا کہ پیسے میرے پاس ہیں آپ خدا کے لئے جلد چلیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب ہمارا تانگہ جی۔ پی۔ او کے قریب پہنچا تو وہ خود ہی بولے کہ شوکت بھائی یہ پندرہ روپے ٹرنک کال کے لئے آپ لیجئے۔ ارجنٹ بک کروایئے گا۔ میں اور اقبال اتنی دیر میں اسی تانگہ پر جا کر انارکلی سے لڈو لے کر آتے ہیں۔ دو سیر لڈو ہم خرید کر کوئی بیس منٹ میں واپس آئے تو شوکت بھائی جی۔ پی۔ او کے باہر دروازے پر کھڑے ہم دونوں کا انتظار کر رہے تھے فرمانے لگے کہ میں نے ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل سے گفتگو کر لی ہے۔ تار انہیں مل گیا تھا۔ کل صبح تمہارے بھائی جان کو خط لکھ دیا جاتا لیکن میں نے ان سے کہہ دیا کہ یہ تار کسی غلط اطلاع پر روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس پر کوئی کارروائی نہ کی جائے اور اسے کالعدم تصور کیا جائے وہ میری بات مان گئے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ میرا دوست خوشی سے اچھل پڑا چہرے پر رنگ آ گیا۔ شوکت بھائی نے کہا ٹیلی فون کرنے میں تین روپے دس آنے مزید خرچ ہوئے تھے جو میں نے دے دئے ہیں۔ یہ سنتے ہی انہوں نے پانچ روپے کا ایک نوٹ زبردستی شوکت بھائی جیب میں ڈال دیا۔ حالانکہ وہ کہتے نہیں نہیں .... اس کی کیا ضرورت ہے کہتے رہے۔

ہم لوگ ساڑھے گیارہ کے قریب مکان واپس پہنچے۔ اس وقت تھوڑی بہت مشغولیت کی گئی بقیہ صبح ناشتے کے لئے رکھ دی گئی۔ اب شوکت بھائی نے ہمارے دوست سے کہا کہ آپ کے بھائی صاحب کی تقریر کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کیلئے کیا صورت ہونی چاہئے۔ تھوڑے توقف کے بعد فرمایا کہ اپنے دفتر سے دو یوم کی رخصت لے لو۔ ریڈیو کے تمام پروگرام سنو۔ وقت کی پابندی کے ساتھ ہوتے ہیں تمہاری تقریر پرسوں شب میں ہونی ہے میں وہاں کہہ دوں گا کہ وہ اتفاقی طور پر سخت علیل ہو گئے ہیں اور تقریر کرنے کے قابل نہیں ہیں لیکن اس بات کا لحاظ رکھیں۔ ان دونوں دنوں میں آپ مکان کے باہر نہ نکلیں اور نہ ہی کوٹھی کے لان پر کھلی فضا میں بیٹھیں اس لئے کہ ریڈیو کے افسران کبھی کبھی میرے پاس آجاتے ہیں اگر کسی نے آپ کو دیکھ لیا تو میں جھوٹا پڑوں گا۔ باوجود کہ ان کی شکل سے سٹیشن کا کوئی فرد بھی آشنا نہ تھا لیکن بے سوچے سمجھے بغیر وہ غریب اس عارضی قید کے لئے بھی رضامند ہو گئے اور اس صورت سے ہمارے دوست دو روز مکمل قید میں رہے۔

تیسرے روز یعنی جس تاریخ کو تقریر ہونی تھی شوکت صاحب نے دفتر سے واپسی پر ہم سب کو اپنے ڈرائنگ روم میں جمع کیا جس میں میری بیگم، شوکت صاحب کی بیگم، ان کے بچے اور میرے دوست سب ہی موجود تھے۔ شوکت صاحب ہمارے دوست سے یوں مخاطب ہوئے "میاں اب تو ساری بات ختم ہو گئی"

اب اپنی زبان سے بھی کہہ دو کہ دعوت کی بات غلط تھی۔ ہمارے دوست نے شرم سے آنکھیں تو جھکا لیں لیکن زبان سے اقرار جرم نہ کیا۔ اس کے بعد شوکت صاحب نے فرمایا "جھوٹ بولنے کے لئے بھی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے وقوف جھوٹ بول کر طرح طرح کے عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے اور عقل مند جھوٹ بولتا ہے تو مٹھائی بھی کھاتا ہے اور لطف بھی لیتا ہے۔ تم جھوٹ بولے تو تمہارے کم و بیش پچاس روپے خرچ ہوئے دو روز قید محض میں رہے اور جو تمہارے دل و دماغ پر گزری تم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ اور میں نے جھوٹ بولا تو تم سے روپے بھی لئے اور مٹھائی بھی کھائی۔" اس کے بعد مبلغ اٹھارہ روپے (یعنی ٹیلی فون کا خرچ) ان کو واپس کئے اور ان سے آئندہ جھوٹ نہ بولنے کا عہد لے کر اس ڈرامے کو ختم کیا۔

اسی ضمن کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ قائد اعظم کی وفات کے ساتھ ہی بھارتی گورنمنٹ نے ریاست حیدر آباد دکن پر قبضہ کرنے کے لئے فوج کشی کر دی تھی۔ قاسم رضوی صاحب کی انجمن اتحاد المسلمین کے رضاکاروں نے دلیرانہ انداز میں ایک مسلح فوج کا کئی روز تک مقابلہ کیا اس کا علم کس کو نہیں۔ ہر پاکستانی اپنے محبوب رہنما کی بے وقت وفات سے یوں ہی کیا کم رنجیدہ تھا اس پر ستم بالائے ستم کہ اچانک حادثہ سے لوگوں پر جو قیامت گزری اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ گنتی کے نہتے جانباز ایک منظم فوج کا کب تک مقابلہ کرتے نتیجہ بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جس وقت سقوط حیدر آباد کی خبر نشر ہوئی میں اپنے دفتر ہی میں تھا اس خبر سے ہر کس و ناکس کو دلی صدمہ پہنچا اور سارے ملک میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ میں دفتر سے سیدھا ریڈیو اسٹیشن شوکت بھائی کے پاس پہنچا۔ وہ بھی بہت رنجیدہ تھے اور اپنے دلی صدمے کا کئی بار اظہار بھی کیا۔ بالآخر ہم دونوں گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ کوٹھی کے اندر ابھی داخل نہ ہونے پائے تھے کہ شوکت بھائی کو اس عالم میں بھی ایک مذاق سوجھا۔ مجھ سے کہنے لگے "دیکھو میں پاگل بنا جا

۔ لیکن قہقہوں کی گھن گرج [illegible] انہوں نے [illegible] مجھے [illegible] اپنے ہاتھوں سے میرے تمام بال پکڑ کر [illegible] بیگم [illegible] آنکھیں [illegible] مجھ سے [illegible] اندر سے چلے [illegible] چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ [illegible] آنکھیں [illegible] نہیں۔

مجھے تو آج تک ان کی وہ [illegible] کوئی شکل یاد ہے۔ [illegible] ان کے [illegible] شوکت بھائی کو اس عالم میں دیکھنے [illegible] حال پوچھتے۔ میں نے شوکت بھائی کو ہدایت کے مطابق انہیں بتایا کہ میں وقت سے [illegible] پاگلوں جیسا حال بنا رکھا ہے۔ [illegible] مجھے [illegible] نہیں اپنے ہمراہ لایا ہوں۔ شوکت صاحب کی بیگم صاحبہ [illegible] مجھے [illegible] نہیں سب سے پہلا حملہ انہوں نے اپنی بیگم پر [illegible] رنے لگے نہ صرف وہ بلکہ ہم سب چیخ [illegible] تھے [illegible] آخر [illegible] شوکت بھائی کی [illegible] سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ [illegible] مجھے [illegible] چیخ پکار سے خدا کے لئے [illegible] بچاؤ" اس وقت شوکت بھائی کے [illegible] مجھے [illegible] محبت کا اندازہ لگانے کا موقع ملا۔ [illegible] چیخ [illegible] حالانکہ شوکت بھائی [illegible] بہت [illegible] میری بیوی کی چیخ پکار کی وجہ سے سب کے سب شوکت بھائی پر جھپٹ [illegible] انہیں زبردستی علیحدہ [illegible] لیکن وہ غصے کے عالم میں یہی کہتے رہے۔

"کس نے میری بیوی کو مجھ سے چھین لیا۔ یہ کون ہوتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ [illegible] میں نے [illegible] غلطی [illegible] لیا اور ان سے معافی مانگی تب کہیں جا کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ ان کی [illegible] کہ حیدرآباد کی فتح یا شکست سے آپ کا کیا تعلق؟ آپ نے خواہ مخواہ اپنے دل پر اس بات کا اتنا اثر کیوں لیا؟ آپ اپنی جان کیوں ہلکان کر رہے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔" لیکن شوکت بھائی کا جواب بھی خوب تھا بولے "مجھ سے کوئی تعلق نہیں؟ ایک ادیب۔ ایک فن کار کا کس چیز سے تعلق نہیں ہوتا۔ قائد اعظم اگر موجود ہوتے تو کوئی فکر کی بات نہ تھی لیکن ان کی وفات کے بعد ہماری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ .... اگر ہندوستان نے پاکستان کو یوں ہی ہڑپ کر جانا چاہا تو بھی آپ یہی فرمائیں گی کہ تم سے کیا مطلب؟ ...... کیا خوب بات کہی آپ نے .... میں یہ سوچ سوچ کر اور پریشان ہو رہا ہوں کہ اللہ میاں کے ہاں جب قائد اعظم مجھ سے محاسبہ کریں گے [illegible] پوچھیں گے کہ دنیا سے میرے چلے آنے کے ایک ہفتہ بعد ہی ہندوستان نے حیدرآباد پر قبضہ کر لیا تو میں کیا جواب دوں گا" یہ کہہ کر رونے لگے۔ گھر کے ہر فرد کو اب ان کے مکمل پاگل ہونے کا یقین ہو چکا تھا۔ عرق بید مشک وغیرہ انہیں زبردستی پلایا گیا لیکن بے سود۔ ان کے بچے رو رہے تھے اور نہ صرف ان کی بیگم بلکہ میری بیوی بھی بدحواس تھیں۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا گرمیوں کا زمانہ تھا۔ صحن میں پلنگ پر بستر بچھا کر انہیں زبردستی لٹا دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ آپ باتیں نہ کریں۔ اس واہمہ کو دل سے نکالیں اور ذرا دیر آرام کریں اس وقت تک نہ جانے کتنے ایسے نازک مقامات آچکے

تھے جہاں مجھے اپنی زبان کو دانتوں سے کاٹ کر ہنسی کو برداشت کرنا پڑا لیکن آخر تابکے۔ شوکت بھائی پلنگ پر بیٹھے تھے۔ ہم سب ان کے ارد گرد جمع تھے کوئی پنکھا جھل رہا تھا تو کوئی انہیں تسلی دے رہا تھا لیکن وہ جس کی طرف نظر بھر کر دیکھ لیتے تھے وہ اپنی جگہ سہم کر رہ جاتا تھا۔ ہر شخص چوکنا تھا کہ نہ جانے ان کی توجہ کا مرکز کون بنے۔ اب چاند پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہو چکا تھا بھائی لیٹے لیٹے چاند کو کچھ دیر غور سے دیکھتے رہے۔ اچانک پلنگ پر ہی کھڑے ہو کر چاند سے پیار شعروں میں باتیں کیں۔ اس کے بعد اپنا ہاتھ کمر پر رکھ کر کسی مشہور فلمی گانے کا ٹکڑا جس میں چاند کا ذکر تھا ایسی دھن میں مٹک مٹک کر یوں گانے لگے کہ نہ صرف میں بلکہ ان کی بیوی اور بچے بھی ان کی اس حرکت پر اپنی بے تحاشہ ہنسی کو روک نہ سکے لیکن اس کے فوراً بعد ہی ان کی بیگم نے اپنے بڑے بیٹے سعید عمر سے کہا کہ کیا دیکھ رہے ہو فوراً جا کر ڈاکٹر کو بلا لاؤ دیکھتے ہو ان کا کیا حال ہو رہا ہے۔ سعید نے قریب کی کسی کوٹھی سے غالباً شوکت صاحب کے خاندانی معالج ڈاکٹر ممتاز حسین کو ٹیلی فون کیا اور وہ نصف گھنٹے کے اندر آ گئے۔ افسوس کہ وہ بیچارے بھی ان حضرت کو نہ پہچان سکے۔ انہیں بھی شوکت صاحب کو اس حالت میں دیکھ کر صدمہ پہنچا۔ وہ تادیر شوکت صاحب کو سمجھاتے بجھاتے رہے۔ تفصیل حال سننے اور پورے معائنے کے بعد نسخہ لکھ کر وہ انجکشن لگانے کی فکر اور کوشش میں تھے کہ شوکت بھائی نے انہیں ایسی بھرپور نظروں سے دیکھا کہ وہ بغیر انجکشن لگائے اور بغیر فیس لئے شوکت صاحب کو آرام کرنے کی تلقین فرماتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اب سعید عمر دوا لینے کے لئے جانے والے ہی تھے کہ شوکت بھائی نے دوسروں کی نظریں بچا کر مجھے اشارہ کیا کہ انہیں روکو۔ چنانچہ میں نے کہا کہ آپا نو بجنے والے ہیں۔ مال روڈ اور انارکلی کی دوکانیں بند ہو گئی ہوں گی اسوقت اس مقصد کے لئے سعید کو بھیجنا فضول ہے۔ رات گزرنے دیجئے اگر خدانخواستہ صبح تک ان کی حالت نہ سنبھلی تو دیکھا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کھانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن اس پریشانی کے عالم میں کوئی کھانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ میری بھی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا میں نے شوکت بھائی سے کہا کہ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ اب مجھ میں ضبط کا یارا نہیں رہا۔ خدا کے لئے یہ ڈھونگ ختم کیجئے دیکھئے تو سب کا کیا حال ہو رہا ہے۔”

میرا یہ کہنا تھا کہ سب سمجھ گئے کہ یہ حضرت بنے ہوئے ہیں۔”

“انکی بیگم بہت خفا ہوئیں کہ ایسا مذاق بھی کیا۔ اختلاج کے مارے میرا نہ جانے کیا حال ہو گیا ہے۔ بالآخر شوکت بھائی اپنی اصلی حالت اور قدرتی شکل میں واپس آ گئے اور سب سے اپنی مہارت کی داد چاہنے لگے۔ سب نے یک زبان ہو کر ان کی اہلیت کو تسلیم کر لیا اور ان کے فن کی داد دیتے ہوئے کہا کہ اصلی پاگل بھی آپ سے آ کر آداب پاگلی سیکھے۔ رات کے دس بجے جب یہ ڈرامہ ختم ہوا تو سب کو کھانا نصیب ہوا۔ اس مذاق سے یہ ضرور ہوا کہ حیدرآباد کی خبر سے دل جس قدر رنجیدہ تھے اس کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔”

شوکت بھائی کے ساتھ رہ کر مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ انکی نجی زندگی حرف بحرف اس شعر کے مصداق رہی ؎

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

ہیں جیسا کہ ان کی زندگی کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ تاہم یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جس شخص کی زندگی میں تلخیاں ہی تلخیاں ہوں اور قدم قدم پر ناخوشگواری کے کانٹے ہوں اس کے ہونٹوں پر محفل احباب میں تبسم کیوں کر رقصاں ہو سکتا ہے یہ ظرف اور بڑے حوصلہ کی بات ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں جو مصیبتوں، صعوبتوں، رنجشوں اور تلخیوں کا مقابلہ نہایت صبر و ضبط سے کرتے ہیں اور ان کی زبان پر حرف شکایت بھی نہیں آتا۔ شوکت بھائی جن کے متعلق میں اپنی صحیح معلومات کی بنا پر اگر یہ لکھوں کہ:

"دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ اپنے دل میں نہ جانے کتنے زخم چھپائے ہوئے تھے جن میں سے شاید کوئی زخم سرطان کی شکل میں ظاہر ہو کر ان کے معالجین کے علم میں آیا اور بالآخر ان کے حق میں ابدی سکون اور مداوائے کامل ثابت ہوا اور وہ اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے لیکن نہ جانے کتنے دوستوں، عزیزوں اور ساتھیوں کو سوگوار و دلشکستہ چھوڑ گئے۔ غالباً ان کی نجی زندگی کی یہ تلخیاں ہی تھیں جنہوں نے انہیں دوسری شادی پر مجبور کیا۔ لیکن ان کے دکھ کا یہ بھی مداوا نہ بن سکی اس لئے کہ اب انہیں ہر دو طرف کی ذمہ داریوں نے اپنی گرفت میں لے لیا اور یہ امر واقعہ ہے کہ دو شادیاں کرنے کے بعد امن و سکون کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی پہلی بیوی اور بچوں کی ذمہ داریوں سے بے خبر ہو جاتے تو شاید ان کے مصائب و افکار میں کچھ کمی ہو جاتی لیکن وہ فطرتاً ایک ذمہ دار شریف النفس انسان تھے اس لئے وہ دوسری شادی کے باوجود اپنی پہلی بیوی اور بچوں کی طرف سے غافل نہ رہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ان کی کفالت کے لئے جو معقول رقم مقرر کر دی تھی وہ دو لڑکوں کے برسرِ روزگار ہو جانے کے باوجود تا دمِ واپسیں باقاعدگی سے دیتے رہے۔ یہ بات بظاہر بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دو گھروں کے چلانے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور اپنے آرام و سکون کا لحاظ کئے بغیر شبانہ روز جس محنت و جانفشانی سے کام کرنا پڑا وہ ان کی صحت کے لئے کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ غالباً یہ اسی بے پناہ محنت اور دماغی کاوش کا نتیجہ تھا کہ وہ ایک وقت دو موذی امراض میں ایسے مبتلا ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے۔ شوکت صاحب کی پہلی بیگم کے بطن سے تین لڑکے ہیں۔ جن میں سے دو الحمدللہ برسرِ روزگار ہیں اور تیسرے نے اس سال ایف ایس سی کا امتحان دیا ہے۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ دوسری بیوی سے تین کم عمر بچیاں ہیں جو ابھی تعلیم کے ابتدائی مراحل میں ہیں۔

میں [illegible] میں کراچی آ گیا۔ مجھے شوکت بھائی کی جدائی کا ایک مرتبہ پھر غم برداشت کرنا پڑا لیکن میری خوش قسمتی کہ تھوڑے عرصے بعد وہ بھی ادارہ جنگ سے منسلک ہو کر کراچی آ گئے میری خواہش کے مطابق ناظم آباد میں میرے قریب ہی کرایہ پر مکان لے لیا۔ اس مکان کی بالائی منزل میں ان کے دوست جناب سید محمد جعفری اور نچلی منزل میں شوکت صاحب رہنے لگے۔ اب ہم لوگ ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے اور کافی وقت ساتھ گزرنے لگا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب دفتر جاتے ہوئے ان کو بھی ساتھ لے لیتا۔ انہیں جنگ کے دفتر پر چھوڑ کر میں اپنے دفتر چلا جاتا۔ ایک دن صبح میری آنکھوں نے جو واقعہ دیکھا اسے اگر کوئی دوسرا بیان کرتا تو شاید مجھے مشکل ہی سے یقین آتا۔

شوکت صاحب کا معمول تھا کہ صبح ضروریات سے فارغ ہو کر دفتر جانے کے لئے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ناشتے کی میز پر آ جاتے اور ناشتہ کرنے کے بعد اپنا ہینڈ بیگ (جس میں ضروری کاغذات کے علاوہ پان کی ڈبیہ مختلف اقسام کے

تمباکو اور قوام کا ہونا ضروری تھا) لے کر، دفتر روانہ ہو جاتے۔ ایک دن صبح میں اپنے گھر سے نکل کر ان کے پاس پہنچا تو وہ ناشتہ کرتے ہوئے پائے۔ ایک چائے کی پیالی زبردستی میری طرف بڑھا کر کہنے لگے کہ بس میں چل رہا ہوں یہ کہہ کر وہ اپنے بیڈ روم میں چلے گئے میں بھی چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے یوں ہی ان کے پیچھے چلا گیا۔ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی مسہری کے سرہانے پر آویزاں ایک طغرے کو عقیدت کے ساتھ زبان سے چوم رہے ہیں اور آنکھوں سے لگا رہے ہیں ان کا چشمہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ جوں ہی ان کو میری موجودگی کا علم ہوا وہ ٹھٹک گئے۔ میری حیرت و مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ طغرہ جس کو وہ والہانہ بوسہ دے رہے تھے اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی شبیہ مبارک تھی یہ وہ روضۂ اطہر ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

شوکت بھائی کی دنیوی زندگی سے کما حقہ واقف ہونے کے بعد یہ واقعہ اپنی نوعیت کا نہایت عجیب و غریب واقعہ تھا۔ مجھے اس کے بعد شوکت بھائی کے اس دل پر رشک آنے لگا جس میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح جلوہ افروز تھی جس کا اظہار بھی شاید ان کی نظروں میں ریاکاری کے مترادف تھا کون جانے کہ رسول عربی کی ذات گرامی سے والہانہ محبت اور عقیدت کا صلہ انہیں وہ ملے جس کا ملنا تمام عمر کی عبادت و ریاضت کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا تو کہنے لگے "تم کو حیرت کس بات پر ہے۔ میں گنہگار سہی لیکن ہوں تو انہیں کا نام لیوا" مجھے اس بات کو اپنے دل میں محفوظ رکھنے کے لئے تلقین کی اور کہا کہ ایک بات اور تم کو بتلاتا ہوں جو میرے معمول میں ہے اور تم بھی اسے اپنا معمول بنا لو۔ وہ یہ کہ صبح اٹھتے ہی اپنے داہنے ہاتھ کی چھنگلی کو یوں موڑو کہ ہائے ہوز نظر آئے اور باقی انگلیوں کو اس طرح کشادہ رکھو کہ "اللہ" بن جائے۔ مجھے وہ شکل بنا کر بھی دکھائی۔ بولے کہ اس ہاتھ کو صبح اٹھتے ہی چوم کر اپنے چہرے پر مل لیا کرو۔ اس عمل سے بہت برکت حاصل ہوگی اور تمام دن اللہ کا کرم شامل حال رہے گا۔ اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ مرحوم کو اللہ اور اس کے رسول سے کس درجہ گہرا تعلق تھا۔ خوش نصیب ہیں وہ جنہیں خدا اور اس کے رسول کی محبت کی دولت لازوال میسر ہے۔

ہم لوگ خوش خوش دن گزار رہے تھے کہ ایک روز شوکت بھائی نے میرے گھر آ کر اپنے راولپنڈی تبادلے کی خبر سنائی۔ میر خلیل الرحمن صاحب نے راولپنڈی سے "جنگ" کے اجرا پر موصوف کو ادارتی ذمہ داریاں سونپ کر وہاں بھیجنا طے کر لیا تھا۔ چنانچہ شوکت بھائی نے بادل ناخواستہ و با چشم نم خدا حافظ کہا لیکن کون جانتا تھا کہ یہ عارضی جدائی کچھ مدت کے بعد دائمی اور یقینی مفارقت میں بدل جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی دونوں کی پُرخلوص اور بے لوث محبت کا نتیجہ تھا کہ ان کی علالت کے دوران آخری بار ملنے کی صورت خود بخود نکل آئی۔ میں دہلی کے مشاعرے میں شریک ہونے کے بعد ۴ر اپریل ۱۹۶۳ء کو لاہور واپس آیا۔ دہلی کے مشاعرے میں وہ بھی مدعو تھے ان کا وہاں بے حد انتظار رہا لیکن شوکت تھانوی نہ پہنچے اور نہ ہی عدم شرکت کا کوئی سبب معلوم ہو سکا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ راولپنڈی میں ہوں گے۔ میرا پروگرام دوسرے روز اپنے بھائی کے پاس پشاور جانے کا تھا۔ میرے ساتھ میری اہلیہ بھی تھیں اور ہم دونوں

نے لکھا تھا کہ شوکت بھائی سے ملنے کے لئے مارچ کے آخری ہفتہ میں ضرور جائیں۔ پہلی اپریل کی شام کو ہم لوگ ریل سے پشاور روانہ ہوئے اور چار تاریخ کو صبح دس بجے لاہور پہنچے۔ گاڑی میں اتفاقاً فرحت بھائی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے علیک سلیک کے بعد سب سے پہلے شوکت بھائی کی تشویشناک حالت کا تذکرہ کیا جس انداز میں کیا اس سے میرا جی دھک سے رہ گیا۔ میں اسی وقت اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ان کی سسرال واقع گڑھی شاہو پہنچا جہاں وہ مقیم تھے۔ جوں ہی ہم لوگ ان کے کمرے میں داخل ہوئے اور ہماری نگاہیں ملیں آنکھوں میں آنسو آ گئے اور صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ عجیب عالم تھا۔ خود شوکت بھائی ان کی دوسری بیگم اور میری بیوی چاروں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اور دلوں کی عجب کیفیت تھی۔ شوکت بھائی کو پہلی بار اس عالم میں دیکھ کر دل پر جو گزری وہ ناقابل بیان ہے۔ ان کی بیگم ان کے ہاتھ اور منہ دھلا رہی تھیں۔ پاس لئے کرہ چار بجے شام شوکت بھائی کو میو ہسپتال لے جایا جا رہا تھا جس کے لئے معلوم ہوا کہ وہ بالکل رضامند ہو گئے تھے۔ مجھ سے بولے "اؤ بابا تم جانتے ہو۔" میں نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا۔ کہنے لگے "ان سے زندگی میں اس طرح کا کوئی کام نہیں لیا تھا۔

اب یہ بے چاری رات دن جس صورت سے میری تیمارداری اور خدمت کر رہی ہیں اس سے میرے دل کو بے حد تکلیف ہے۔ میں اس کا بدل ان کو اس سے زیادہ کیا دے سکتا ہوں کہ آخری دم تک ان کا ساتھ نبھانے کی کوشش کروں۔" لیکن بے تحاشہ رونے لگے اور ہم لوگ بھی پھوٹ پڑے۔ میں نے کہا کہ شوکت بھائی آپ پریشان نہ ہوں خدا نے چاہا تو آپ جلد ہی ہسپتال سے صحت یاب ہو کر گھر واپس آ جائیں گے اور ہم لوگ انشاء اللہ آپ کے غسل صحت کا شاندار جشن منائیں گے۔ اور اس کا وقت نہ آیا۔ اس کے بعد اپنی بیگم سے کہا کہ تم میری فکر چھوڑ دو۔ بلکہ تمہاری دلہن پہلی بار تمہارے یہاں آئی ہیں ان کی خاطر و مدارات کرو۔ ہم دونوں یک زبان ہو کر بولے کہ شوکت بھائی ہم تو آپ کی عیادت کے لئے آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ آپ کو شفائے کامل عطا فرمائے۔ اس وقت کسی قسم کی خاطر و مدارات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تاہم انہوں نے اپنی قسم دے کر مجھے اور میری بیوی کو کچھ پھل کھانے پر مجبور کر ہی دیا۔ میں نے پوچھا کہ ابھی ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء کو آپ سے لاہور کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی اس وقت تک آپ بالکل تندرست نظر آ رہے تھے۔ یہ ایک ماہ میں آپ کا کیا حال ہو گیا ہے۔ مسکراتے ہوئے بولے بھائی بحمد اللہ میں وسیع القلب ہو گیا ہوں لیکن ڈاکٹر اسے دل بڑھ جانے کی بیماری بتلاتے ہیں اگر وسیع القلبی بھی کوئی عارضہ ہے تو اس عارضہ کو میں بخوشی قبول کرتا ہوں۔ اب شوکت بھائی کو میو ہسپتال لے جانے کی تیاری ہونے لگی چنانچہ ہم دونوں بھی ان سے باچشم نم رخصت ہو کر شام کی ٹرین سے پشاور چلے گئے۔ یہ ہماری ان کی آخری اور بالکل آخری ملاقات تھی۔

شوکت بھائی کے قہقہے۔ چست و برمحل جملے اور بے مثل لطیفے آج بھی سرمایہ گوش و ناز ہیں۔ ان کی بے پایاں محبت۔ ان کا اخلاص۔ ان کی شرافت نفس۔ ان کی بے غرضی اور بے لوثی کس کس بات کا ذکر کیا جائے اور کس کس وصف کو قلم بند کیا جائے۔ شوکت بھائی ایک نہایت اچھے مخلص دوست۔ ایک صاحب الرائے شفیق اور ایک سچے محب وطن تھے جب تک اردو زبان زندہ ہے شوکت زندہ رہیں گے۔ اور جب تک ان کے احباب اور ان کے مداح باقی ہیں ان کا تذکرہ ہوتا رہے گا لیکن ہر محفل میں اور ہر بزم سخن میں ان کی کمی

محسوس کی جاتی رہے گی۔

یہ ایک ایسا خلا ہے جسے گردشِ ماہ و سال کبھی پُر نہ کر سکے گی۔ یہ ایک ایسی جدائی ہے جس کے بعد اس دنیا میں امکانِ وصل ہی نہیں رہتا۔ یہ ایک ایسی مفارقت ہے جس کے بعد تصورِ قرب ایک واہمہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود محبت کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہے جو جسم و روح کی قیود ٹوٹ جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ شوکت بھائی آج بھی مجھے چلتے پھرتے۔ ہنستے۔ بولتے۔ اور لکھتے پڑھتے نظر آتے ہیں اور میں اکثر اپنا یہ شعر گنگنانے لگتا ہوں ؎

اگرچہ تو درمیاں نہیں ہے مگر تری روشنی ہے اب بھی
ضیائیں پھیلی ہیں انجمن میں چراغ پردے میں جل رہا ہے

شوکت تھانوی

سید امتیاز علی تاج

۱۹۳۲ء میں جب شوکت تھانوی سے پہلی بار ملنے کا اتفاق ہوا تو مجھے گمان بھی نہ گزرا [illegible] حالانکہ میں جو اپنے دنوں میں اخبار چھپوں کے بیسیوں مضامین [illegible] تھانوی کی نظموں کے لفافے میں ڈال کر بھجوایا کرتے تھے ۔ مجھے جن کے مضامین کی ڈاک کھول کر پڑھنے کی اجازت تھی ۔ [illegible] ایک مضمون نکلا ۔ ان کے مضامین [illegible] سے غیر معمولی معلوم ہوتے ۔ مجھے یاد رہ جاتے ۔ مجھے چنانچہ شوکت صاحب اگر اپنی [illegible] کا مضمون [illegible] تذکرہ کرتے تو [illegible] جن کر خوشی ہوتی مگر تعلقات زیادہ بڑھ جانے کے بعد بھی وہ نہ بتا سکے کہ انھیں کیوں [illegible] ملاقات مجھ سے منافقت معلوم ہوا۔ اس ملاقات میں میرے متعلق وہ جو رائے قائم کر کے گئے [illegible] انھوں نے اپنی کتاب شیش محل میں [illegible] بعد میں ایک بار خود ہی مجھ سے کہا کہ اُن کی وہ رائے صحیح نہ تھی ۔

کئی سال بعد شوکت صاحب سے ایک دو ملاقاتیں اس وقت ہوئیں جب ۱۹۴۳ء میں وہ لاہور پنچولی آرٹ پکچرز میں بحیثیت مصنف کے آئے ۔ افسوس کہ ان کے آنے سے پیشتر میں پنچولی آرٹ پکچرز میں تین سکرین پلے لکھنے کا معاہدہ ختم کر چکا تھا اور پربھات فلم کمپنی کے لیے ایک فلمی کہانی لکھ کر ڈائرکٹ کرنے کی غرض سے پونا بلایا جا رہا تھا ۔ اس لیے اس موقع پر شوکت صاحب سے ایک دو سے زیادہ ملاقاتیں نہ ہو سکیں ۔ وہ بھی بہت مختصر اور رسمی قسم کی ۔ پھر جب بعض مجبوریاں پیش آ جانے سے میرا لاہور چھوڑنا ممکن نہ رہا اور پونا جانے کا خیال مجھے قطعی طور پر ترک کرنا پڑا تو اس وقت تک شوکت پنچولی آرٹ پکچرز کی ملازمت ترک کر کے سونگ پبلسٹی کا کام کرنے یو۔پی جا چکے تھے ۔

آخر ۱۹۴۶ء میں شوکت صاحب سے تعلقات زیادہ بڑھنے کی ایک صورت پیدا ہو گئی ۔ سونگ پبلسٹی کا کام چھوڑ کر وہ دوبارہ پنچولی آرٹ پکچرز میں آئے تو اس زمانے میں میں بھی اس کمپنی کے لیے کام کر رہا تھا ۔ کمپنی کے مالک نے مجھ سے ایک فلمی ڈرامہ لکھنے کی فرمائش کر رکھی تھی جسے میں کمپنی ہی کے دفتر میں اس خیال سے جا کر لکھا کرتا تھا کہ کوئی بات مالک کمپنی سے پوچھنے کی ہو تو وہیں کے وہیں تبادلہ خیال کر لوں ۔ وہاں میرے کمرے کے برابر کے کمرے میں شوکت بیٹھتے تھے ۔ وہ اپنے کام سے اکتاتے تو میرے کمرے میں آ جاتے ۔ کسی شگفتہ طبع ادیب سے گفتگو کر کے جس قسم کی فرحت ملتی ہے وہ تو ان ملاقاتوں سے ضرور حاصل ہوتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہم نہ ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہو سکے اور نہ اُن کے کمالات مجھ پر کھل

لیکے۔ میرے فلمی ڈرامے کے لیے گانے لکھنے کا سوال پیدا ہوا تو یہ کام شوکت صاحب کے سپرد کیا گیا۔ ہم دونوں [illegible] اور انداز کے متعلق مل کر غور کیا کرتے۔ دو ایک گانے شوکت صاحب نے لکھ کر مجھے دیئے بھی جو میرے پہلے کاغذوں میں کہیں نہ کہیں پڑے ہوں گے۔ اسی زمانے میں ملک کے سیاسی حالات نے یہ صورت اختیار کر لی کہ یہ فلم [illegible] [illegible] رکھا گیا۔ مگر تقسیم ملک کے بعد ہندوستانی آرٹ تجربہ کا کاروبار ختم ہو گیا اور اس فلم کے بننے کی نوبت نہ آئی۔ شوکت صاحب ملازمت سے فراغت پا کر ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ اتفاق کی بات کہ اس زمانے میں میرے لیے بھی ریڈیو پاکستان لاہور میں ایک ایسا کام نکل آیا جس کے لیے مجھے کئی مہینے روزانہ وہاں صبح سے آٹھ آٹھ گھنٹے صرف کرنا پڑا۔

ہوا یوں کہ تقسیم ملک سے تھوڑے ہی عرصے بعد ظفر الاحسن صاحب نے جو اس زمانے میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے ایک موقع پر مجھ سے کہا کہ مہاجر طرح طرح کی مصیبتیں سہہ کر کے بُرے حالوں پاکستان پہنچ رہے ہیں اور ان کا مستقبل مجھے کچھ اچھا نظر نہیں آتا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ روزانہ اخباروں کے پہلے صفحے پر کچھ جگہ اس غرض کے لیے مخصوص کرنے کی کوشش کروں کہ ان لوگوں کا حوصلہ [illegible] کرنے کے لیے آپ روزانہ مناسب مضامین لکھنے کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ میں نے اس تجویز پر چند روز غور کرنے کے بعد ان کی خدمت میں عرض کیا کہ کئی کئی اخباروں کے لیے یہ خدمت روزانہ سر انجام دینا نہ صرف بہت محنت طلب کام ہے بلکہ اس طرح بعض پیچیدگیاں پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لیے میری دانست میں مناسب یہ ہوگا کہ یہ خدمت ریڈیو پاکستان کے ذریعے سر انجام دینے کی کوشش کی جائے۔ احسن صاحب نے میری اس تجویز سے اتفاق فرمایا چنانچہ میں نے ریڈیو پاکستان لاہور سے روزانہ نشر کرنے کے لیے ایک مرکب پروگرام کا منصوبہ تیار کر لیا اور ریڈیو کے متعلقہ افسروں سے اس پر تفصیلی بحث کی۔ انھوں نے میری اس تجویز کو پسند کیا اور یہ کام میرے سپرد کر دیا۔ پروگرام کا نام "پاکستان ہمارا" تجویز ہوا۔ ریڈیو پاکستان نے اس کام میں میری امداد کے لیے شوکت تھانوی کو مقرر کیا۔ شوکت صاحب نے بعد میں مجھے بتایا کہ شروع شروع میں انھیں اندیشہ تھا کہ روزانہ اکٹھے کام کرنے میں اختلاف رائے سے کہیں بدمزگی نہ پیدا ہو جائے لیکن جب کام شروع ہوا تو ایسی خوش اسلوبی سے سرانجام پاتا رہا کہ ہر دن ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر کرتا گیا۔

ہم دونوں ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ کام کرنے کا طریق یہ تھا کہ صبح کو دفتر پہنچتے ہی طے کرتے کہ اس دن کے پروگرام کا موضوع کیا ہوگا۔ موضوع کے انتخاب میں اخباروں کی خبریں اور رپورٹروں کی رپورٹیں ہماری رہنمائی کرتیں۔ ان دونوں ذریعوں سے امداد نہ ملتی تو عام حالات کا خیال کر کے ایک دوسرے کے مشورے سے کوئی مناسب موضوع خود طے کر لیتے۔ جو موضوع بھی طے ہوتا اس پر کلام پاک، حدیث اور تاریخ میں سے ایسی چیزیں نکالتے جن سے اسلامی نقطۂ نظر واضح ہوتا۔ اس کے بعد ہنگامی حالات پر توجہ کی جاتی۔ کیمپوں کے واقعات پر مکالمے، اسکٹ، نظمیں وغیرہ لکھنا تجویز ہوتا۔ یوں بہت سی اہم اور مفید مطلب چیزوں کی ایک فہرست دوپہر سے پہلے تیار ہو جاتی۔ اس کے بعد ہم کام تقسیم کرتے کہ فہرست کی کون کون سی چیزیں شوکت لکھیں گے اور کون کون

رہیں۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ وہ اس طرح کہ پہلے اپنے حصے کی تحریریں تیار کر لیتے پھر ایک دوسرے کو سناتے۔ دونوں ایک دوسرے کی چیزوں میں بے تکلفی سے اصلاح کیا کرتے اور جو قائل ہو جاتا وہ اپنی چیز دوبارہ لکھتا یا اس میں مناسب ترمیم کر دیتا۔ غرض جب اسکرپٹ کے مسودے [illegible] باقاعدہ نقلیں تیار ہو کر آتیں تو جلدی جلدی ہم انھیں پڑھتے اور کتابت کی غلطیاں درست کرتے پھر مختلف حصے مختلف آوازوں کے سپرد کر کے ان کی ریہرسل کراتے۔ اتنے میں براڈکاسٹ کا وقت ہو جاتا۔ اس میں حسب ضرورت حصہ لیتے۔ [illegible] کے حصے میں پڑتا۔ شوکت عموماً کسی اسکٹ میں حصہ نہ لیتے۔

اسی زمانے میں میرے ساتھ [illegible] یہ ہوا کہ [illegible] شروع کر دیا۔ [illegible] ہمارے سامنے بیٹھ کر لکھتے تھے جب کبھی مجھے کسی واقعے یا محاورے کے متعلق کچھ شبہ ہوتا تو میں سر اٹھا کر شوکت سے استفسار کرتا۔ ان سے جو جواب ملتا کتاب اور لغت بھی [illegible] تصدیق کرتی۔ خاص موقع تو اب مجھے یاد نہیں رہا لیکن ان کی [illegible] کوئی اہم معلومات حاصل ہونے پر بے اختیار میرے منہ سے نکلا "یار آپ کو تو علامہ کا لقب ملنا چاہیئے" بولے "لقب [illegible] دونوں پر دلالت کرتا ہے اس لیے علامہ شوکت بے خصوصیت سے موزوں ہے" اس کے بعد میں نے انھیں علامہ کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ چند روز وہ اس لقب سے بے چین سے رہے۔ بعد میں اس کے عادی ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ شوکت میں [illegible] نہ تھا۔ پہلی ملاقات میں وہ کسی طرح "علامہ" آدمی معلوم نہ ہوتے تھے۔ لیکن اگر ان سے کچھ پوچھا جاتا تو پتہ چلتا کہ ان کی معلومات غیر معمولی ہیں۔

"پاکستان ہمارا" کے سلسلے میں شوکت کے قاضی جی کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہم اکثر سوچا کرتے تھے کہ اس میں ظرافت کی چاشنی پیدا کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔ سوچ سوچ کر شوکت نے آخر قاضی جی کا کردار تجویز کیا۔ ایک بزرگ جو پاکستان کے سلسلے میں ہر بات پر نامعقول قسم کی ایسی نکتہ چینی کیا کریں۔ جو ہر ایک کو مضحکہ خیز معلوم ہو۔ شوکت نے ان کا ایک اسکٹ لکھا اور قاضی جی کا بولنے کا انداز اس زمانے کی ایک مزاحیہ شخصیت سے لیا۔ یہ ایک حکیم صاحب تھے جن سے کئی سال پیشتر میری ملاقات آبو پہاڑ پر ہوئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ لاہور آئے تو حسن اتفاق سے مسلم ٹاؤن میں شوکت صاحب کے ہمسائے بنے۔ میں ان سے اپنی ملاقات اور آبو میں ان کا میزبان بننے کی داستان شوکت کو سنا چکا تھا۔ لاہور میں وارد ہونے کے بعد شوکت سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھیں بہت دلچسپ شخص معلوم ہوئے۔ فراغت کے وقت ان کے تازہ کارنامے مجھے سنانے بیٹھتے۔ کبھی ان کی گفتگو بیان کرتے تو بات کو زیادہ پرلطف بنانے کے لیے بڑے کمال سے ان کے بولنے کی نقل اتارتے۔ چنانچہ قاضی جی کا خیال آتے ہی شوکت نے فی الفور انھیں حکیم جی کے قالب میں ڈھال لیا۔ قاضی جی کا پروگرام ریڈیو پر بہت مقبول ہوا اور اس نے "پاکستان ہمارا" میں ظرافت کی مطلوبہ چاشنی پیدا کر دی۔

ہمارے یہ پروگرام حیرت انگیز حد تک پسند کیے گئے۔ ریڈیو اسٹیشن کے اندر باہر کے لوگ اکثر ہم سے کہتے کہ اس پروگرام کی ایسی غیر معمولی مقبولیت ریڈیو کی تاریخ کا ایک اہم اور بے مثال واقعہ قرار دی جا سکتی ہے۔ [illegible]

پروگراموں کو بعد میں پڑھا تو اُن میں بعض خامیاں نظر آئیں لیکن ہمارا خروش اور جوش شاید اُن کے ہر عیب کو ڈھانپ لیتا تھا۔ بہرحال حالت یہ تھی کہ اس پروگرام کو سننے کے شوق میں کئی لوگوں نے شام کے وقت سینما دیکھنا چھوڑ دیا۔ مہاتما گاندھی نے ایک منگل کی شام کی تقریر میں میرا اور شوکت کا نام لے کر اس پروگرام کو سراہا۔ اس کی تعریف میں جو خطوط اور دن بھر جو فون ریڈیو اسٹیشن کو موصول ہوتے تھے ان کا تو شمار ہی نہ تھا۔

مجھے یاد ہے ایک روز صبح صبح ہمیں اطلاع ملی کہ کئی مہاجر جو ٹھکانا میسر نہ آنے کے باعث کیمپ ریلوے روڈ کے قریب سردیوں کے آسمان تلے پڑے ہوئے تھے رات میں ٹھٹھر کر جاں بحق ہو گئے۔ یہ اطلاع پا کر ہم بے حد متاثر ہوئے چنانچہ اُس روز کا پروگرام ہم نے شدید احساسِ درد کے ساتھ لکھا۔ اس پروگرام کے لیے شوکت نے ایک نظم "بعد از وقت" کہی جس کا مضمون یہ تھا کہ کوئی سوشل ورکر کسی مہاجر عورت کی بچی کے لیے کمبل لے کر پہنچتا ہے تو بچی سردی سے ٹھٹھر کر ختم ہو چکی ہے۔ نظم مؤثر تھی اور بہت خوبی سے پڑھی گئی۔ سارا پروگرام ہی ایسا تھا کہ سننے والوں پر اس کا بے حد اثر ہوا چنانچہ اگلے روز بیت المال سے اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کے نام فون آیا۔ کہ پچھلی شام کا پروگرام سن کر لوگ گرم کپڑے اور لحاف اور توشکیں لے لے کر اتنی زیادہ تعداد میں بیت المال پہنچ رہے ہیں کہ اُن سب کی لائی ہوئی چیزوں کو سنبھالنا ہمارے سٹاف کے لیے ناممکن ہو رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل اس بات سے پیدا ہو رہی ہے کہ عورتیں اپنی طلائی چوڑیاں اور انگوٹھیاں اور بالیاں لے لے کر آ رہی ہیں۔ ان زیوروں کو وصول کرنے میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ زیوروں کو تولنے یا اُن کی صحیح قیمت جانچنے کا ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں اور اس کے بغیر انھیں وصول کر لیا جائے تو ممکن ہے کل کو کوئی شخص بددیانتی سے وزنی زیور لے کر اُن کی جگہ ہلکے زیور رکھ دے، اس لیے براہِ کرم ریڈیو کے ذریعے خواتین کو ہدایت دیجئے کہ وہ بیت المال کو اپنے زیور فی الحال نہ دیں۔

مہاتما گاندھی پر گولی چلی تو اُس روز ایک پورا پروگرام اُن پر کیا گیا۔ اس میں شوکت نے مہاتما گاندھی کی آواز کی نقل ایسی خوبی سے اُتاری کہ کئی سننے والوں کو شبہ ہوا۔ کہ ریڈیو اسٹیشن کے پاس مہاتما گاندھی کا کوئی ریکارڈ موجود ہے۔ یہ پروگرام برعظیم میں بے حد پسند کیا گیا۔ بعض ہندو خواتین نے پروگرام لکھنے والوں کے لیے چیک بھیجے جو شکریے کے ساتھ انھیں واپس کر دیئے گئے۔ راجہ غضنفر علی مرحوم اُس وقت مرکز کے وزیر بحالیات تھے۔ ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر مسٹر کے۔ ایل پنجابی خاص طور سے راجہ صاحب سے ملے اور کہا کہ میری طرف سے اس پروگرام کی داد لکھنے والوں کو پہنچا دیجئے۔ کئی روز بعد مسٹر پنجابی نے راجہ صاحب کی معرفت لنچ پر بھی مدعو کیا اور اُس موقع پر کہا۔ کہ آل انڈیا ریڈیو سے روزانہ مہاتما گاندھی پر پروگرام نشر کئے جا رہے ہیں لیکن اُن میں کے ایک پروگرام میں بھی وہ اثر و تاثیر نہیں جو "پاکستان ہمارا" کے پروگرام میں تھی۔ میں نے عرض کیا "اس کی وجہ تو عیاں ہے۔ آپ ریڈیو پر ایک ایسی مصنوعی زبان استعمال میں لاتے ہیں جو نہ دل سے اُٹھتی ہے اور نہ دل پر گرتی ہے۔ ایسی صورت میں اثر و تاثیر کہاں سے آئے؟"

کوئی ایک سو پروگرام لکھنے اور پیش کرنے کے بعد تھک کر میں نے تو ریڈیو پاکستان سے رخصت کی اجازت چاہی۔ شوکت کا تعلق چونکہ اس محکمے سے مستقل تھا، وہ اس کام میں برابر مصروف رہے۔

تین چار مہینے کی اِس یکجائی سے میرے اور شوکت کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ پاکستان ہمارا چھوڑنے کے بعد میں جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا، جب اخبار بھی چاہتا، خواہش اس میں شوکت بھی میرے شریک ہوتے۔ ایک بار کوشش کی کہ دونوں مل کر آدھے درجن اسکرپٹ کا سلسلہ کریں۔ شوکت کو اس پر آمادہ کر لیا۔ فرصت کی چند دوپہریں اُن نشستوں میں صرف بھی کیں لیکن کام چلا نہیں۔ آپ جانیے اردو کے زندہ ڈرامے بہت پیچیدے ہیں۔ اُن میں ایسی گرفت نہ تھی کہ ہمیں کام میں مصروف رکھ سکتی۔ شوکت کی باتوں میں لذت زیادہ تھی چنانچہ باتیں زیادہ ہوتیں اور کام کم۔ رفتہ رفتہ باتیں ہی باتیں ہونے لگیں۔ ڈرامے کا مسودہ کھٹائی تک بند ہوا۔ یہ صورت دیکھ کر میں نے یہ کام خود ہی لپیٹ دیا۔ گپ البتہ چلتی رہی۔ ریڈیو اسٹیشن سے میرا گھر قریب ہے۔ وہاں سے چھٹ کر شوکت اکثر میرے ہاں آجاتے۔ بعض اوقات میں خود انھیں بلوا لیتا۔ گھنٹوں گپ رہتی۔ شوکت سے محفل آرا جہاں موجود ہوں، ممکن نہ تھا کہ وہاں سے قہقہے نہ سنائی دیں۔ قہقہوں کی آواز سن کر کبھی آپا اور یاسمین بھی آجاتیں۔ شوکت فی الفور ایسی باتیں شروع کر دیتے جن سے وہ دونوں بھی محظوظ ہوتیں۔ اس طرح وہ ہمارے فیملی ممبر سے بن گئے بلکہ اس دوران یہ بھی دریافت ہوا کہ میرا اُن سے واقعی دور کا کچھ رشتہ بھی ہے۔ میرے سمدھی نواب زادہ عابد علی سید سجاد حسین مرحوم کی اہلیہ محترمہ خانہ بجوں کی اور شوکت کے عزیزوں میں سے تھیں۔

کچھ عرصہ بعد ایک فلم کمپنی نے مجھ سے اسکرین پلے لکھنے اور ڈائرکٹ کرنے کی فرمائش کی تو اُس کی مکالمہ نویسی میں نے شوکت کے سپرد کر دی۔ شوکت ریڈیو کے بہت مشّاق مکالمہ نویس تھے لیکن ریڈیو اور فلم کے مکالموں میں بہت فرق ہے۔ ریڈیو کے مکالموں میں ہر عمل کا اظہار لفظوں میں کیا جاتا ہے، فلم کے مکالموں میں کوشش کی جاتی ہے کہ الفاظ کی بجائے حتی الامکان عمل سے کام لیا جائے۔ دونوں مکالمے سوچنے کا طریق ہی مختلف ہے۔ اس سلسلے میں ہماری دلچسپ بحثیں ہوتیں۔ شوکت کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ کج بحثی کبھی نہ کرتے تھے۔ ذہن بے حد تیز تھا۔ بات سمجھ میں آگئی تو فوراً نئے اسلوب پر پڑ گئے اور کئی منظر کے مکالمے بہت لذیذ لکھ کر لے آئے۔ میں نے کسی جگہ تبدیلی کی فرمائش کی تو کبھی اُس سے برا نہ مانتے اور فی الفور میری مرضی کے مطابق مکالمے میں تبدیلی کر دی۔

یہ فلم بننا تو شروع ہوا مگر تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ایک اور فلم کمپنی نے میری ایک پرانی کہانی "گلنار" کو فلم بنانے کے لیے پسند کیا اور فرمائش کی کہ اس کہانی کو میں لکھنؤ کی معاشرت میں ڈھال دوں۔ اِس کام میں شوکت سے مجھے قابلِ قدر امداد ملی۔ "گلنار" میں انھوں نے نہ صرف مکالمے لکھے بلکہ میرے اصرار پر اس میں نواب دلشاد کا پارٹ کرنے پر بھی رضامند ہو گئے۔ شوکت اسکرین پر پہلی بار آ رہے تھے۔ بعض پرانے ایکٹر شوکت کو مروجہ روش سے ہٹ کر مکالمے بولتے سنتے تو لہجے کی تازگی اور اچھوتے پن پر جلتے اور انھیں ڈرانے کے لیے کہتے۔ کمرے میں بیٹھ کر مکالمے بول لینا کچھ مشکل نہیں۔ آزمائش کا مقام اسٹوڈیو کا فلور ہے۔ جب ایک طرف روشنیاں گھیر کر چکاچوند کا عالم پیدا کر دیں اور دوسری طرف کیمرہ گھرر گھرر کر کے چلنا شروع ہو جائے تو اُس وقت لہجے کی سب جدتیں اور نفاستیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ شوکت خاموشی اور بہت بے پروائی سے یہ باتیں سنتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود

مجھے بھی اندیشہ تھا کہ کیمرے کے سامنے شوکت کہیں جھینپ نہ جائیں۔

سیٹ پر شوکت کا پہلا شاٹ مجھے بخوبی یاد ہے۔ نہ جانے کہاں سے وہ کسی لکھنوی نواب کی تصویر ڈھونڈ لائے تھے دیکھ کر اپنا میک اپ اس کے مطابق کرایا، مناسب کپڑے کا انگرکھا اپنی نگرانی میں سلوایا، شاہی کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور وصلی کی جوتی پہن کر اور سر پر دوپلی ٹوپی رکھ کر سیٹ پر آئے تو حسن نے دیکھتے ہی کہا کہ عین لکھنؤ کے نواب معلوم ہوتے ہیں۔ سین یہ تھا کہ نواب دلشاد صولت کے ہاں سے معصوم حسن سمیت مشاعرے میں آتے ہیں۔ سیڑھیوں میں صولت ان کا استقبال کرتا ہے اور اپنے ساتھ دیوان خانے میں لے جاتا ہے جہاں محفل مشاعرہ کا اہتمام ہے۔ شوکت بڑے اعتماد سے سیٹ پر آگئے۔ روشنیاں ٹھیک کی جانے لگیں۔ ایک دو ریہرسلیں بھی خاطر خواہ ہو گئیں اور اس کے بعد ٹیک کا مرحلہ آیا۔ ریہرسل میں شوکت کی خود اعتمادی دیکھ کر ایک بڑے ایکٹر نے ان کا پہلا شاٹ خراب کرنے کے لیے ایک نامناسب حرکت کی۔ شاٹ لینے کے لیے جب میں بلند آواز سے "خاموش، ٹیک" کہہ چکا تھا اور شوکت شاٹ دینے کے لیے موڈ میں تیار کھڑے تھے تو وہ صاحب لپک کر ان کے قریب پہنچے اور ان کا دھیان ہٹانے کے لیے ان کے انگرکھے کا دامن ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگے "خوب کپڑا ہے۔ کے روپے گز کا ہے؟" لیکن ان حضرت کی اس کوشش کے باوجود شوکت نے اپنے پہلے شاٹ میں ایسی ساختہ بے ساختگی سے کام کیا اور تمام تفصیل کو ایسے مکمل طور پر صحیح ادا کیا کہ شاٹ ختم ہونے پر "کٹ" کی آواز کے ساتھ ہر طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے شوکت سے مصافحہ کیا۔ شوکت اپنی کامیابی سے بے حد خوش ہوئے۔ پھر تو انھوں نے ایسے بے دھڑک طریقے سے شاٹ دیئے گویا انھیں احساس ہی نہ تھا کہ سیٹ پر کیمرہ بھی کام کر رہا ہے۔ نواب دلشاد کا کردار انھوں نے ایسے کمال سے پیش کیا کہ لکھنوی نوابوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ چال ڈھال، نشست و برخاست، حرکات سکنات ہر اعتبار سے وہ لکھنوی نواب تھے۔ افسوس اس فلم کی ایڈیٹنگ میری مرضی کے مطابق نہ کی گئی۔ کئی اہم حصے بے دردی سے کاٹ دیئے گئے اور ایڈیٹ ہونے کے بعد فلم سنسر ہونے سے پہلے مجھے دیکھنے کا موقع بھی نہ دیا گیا۔ ورنہ اس کی صورت بہت مختلف ہوتی۔

گلنار کے شوٹنگ کے دوران میں شوکت کے ساتھ وقت بہت لطف میں گزرا۔ وہ سیٹ کے کسی کونے میں اپنے پسندیدہ آرٹسٹوں کے ساتھ بیٹھے گفتگو کی آتش بازی چھوڑتے رہتے۔ میں تھک ہار کر دم لینے کو ذرا سی دیر اس محفل میں شریک ہوتا تو شوکت ہنسا ہنسا کر تازہ دم کر دیتے تھے۔ اس زمانے کی ساری باتیں مجھے یاد نہیں۔ اس خیال سے حافظے پر زور دینے کو جی بھی نہیں چاہتا کہ پڑھنے والوں کو شاید ان سے دلچسپی نہ ہو۔

گلنار کے بعد کوئی کام مل کر کرنے کا موقع ہی نہ ملا لیکن تعلقات ہموار انداز میں برابر جاری رہے۔ یہاں تک کہ وہ ہور چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ خط میں ضرورت کے سوا لکھتا نہیں چنانچہ شوکت سے خط و کتابت نہ رہ سکی۔ البتہ ایک خط ھیں اسی مضمون کا لکھنا یاد ہے کہ میں مہدی حسن احسن کے ڈرامے ایڈٹ کر چکا ہوں۔ ان کے حالات زندگی کی تلاش ہے۔ ی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی۔ آپ احسن سے مل چکے ہیں ان کی ایک قلمی تصویر لکھ کر بھیج دیجیے جسے میں آپ ہی کے نام

سلیقے سے شامل کروں گا۔ مجھے یاد ہے اس روز میں خط کا جواب آیا جس میں آتش کی بھی تصویر تھی۔ یہ تصویر میرے پاس محفوظ ہے۔ ایک بار میں کراچی گیا تو وہاں قیام کا بندوبست شوکت کے ساتھ کر دیا گیا تھا اور جس دن سے جب کبھی وہ لاہور آئے تو انھوں نے مجھے کا وقت ضرور نکال لیا۔

شوکت کثیر الاحباب شخص تھے۔ مجھے یقین ہے اُن کے کئی دوستوں نے اُن کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہوگا۔ بعض چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں جو کہنے کو معمولی ہیں لیکن شاید دوسروں کی توجہ حاصل نہ کر سکی ہوں مختصراً میں لکھے دیتا ہوں۔

اپنے لباس میں شوکت خاص اہتمام سے کام لیتے تھے۔ شیروانی پہنتے یا سوٹ، کپڑے کے انتخاب اور ڈیزائن سے ہمیشہ اُن کی خوش مذاقی کا ثبوت ملتا۔ ٹائی باندھ لیتے تو اُس کی گرہ بنانے میں سلیقہ جھلکتا۔ گریبان کی آستینیں تنگ ہوتی تھیں۔ شیروانی کی ذرا سی شکن کو دیکھ کر کوفت ہوتی تھی۔ سوٹ پہنتے تو قمیص کا رنگ سوٹ پر اور ٹائی کا رنگ قمیص پر جچتا۔ ٹائی اور رومال اور موزے ہمیشہ بہت اعلیٰ استعمال کرتے۔ شوز ہمیشہ پالش سے چمکتے ہوتے۔

شوکت کھانا بڑی نفاست و شائستگی سے کھاتے تھے۔ چپاتی اور چاول دونوں کا نوالہ ایسی نفاست و خوبصورتی و احتیاط سے بناتے کہ نظر پڑتی تو اُن کی انگلیوں کے پوروں کی کارگزاری دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔

تقریر و تحریر میں شوکت کی ظرافت پر غالباً اُن کے کئی احباب اظہار خیال کریں گے لیکن یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ شوکت نے طبیعت کی شوخی ورثے میں پائی تھی۔ ایک بار اپنے والد ماجد محمد صدیق صاحب کی مزاحی طبع کے کئی واقعات انھوں نے مجھے سنائے۔ اُن میں کا ایک مجھے یاد ہے۔ اُن کے والد ایک زمانے میں جودھپور پولیس میں ملازم تھے۔ وہاں کے کسی رئیس کے ہاں سری پائے بہت اچھے پکتے تھے۔ صدیق صاحب نے ایک بار اُن سے سری پائے کھانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے کسی تعطیل کے روز دوپہر کے کھانے پر انھیں مدعو کر لیا۔ یہ کھانے کے وقت پہنچے تو اتفاق سے اُن رئیس کے ایک ہندو دوست نازل ہو گئے۔ ایسے جم کر بیٹھے کہ کھانے کا وقت آ کر گزر بھی گیا مگر انھوں نے سرکنے کا نام نہ لیا۔ رئیس ان ہندو دوست کو بوجوہ کھانے میں شریک نہ کرنا چاہتے تھے۔ مروت کے مارے یہ بھی مناسب نہ سمجھتے تھے کہ انھیں رخصت کرنے کی کوئی کوشش عمل میں لائیں۔ ادھر کھانے میں تاخیر ہونے کے سبب مہمان سے ندامت ہو رہی تھی۔ اور کچھ تو سوجھا نہیں کاغذ کے پرزے پر یہ فقرہ لکھا "کیا کروں یہ حضرت سریش کی طرح چپک گئے ہیں۔ اچھا چھوڑیں تو دسترخوان بچھواؤں۔" یہ رقعہ لکھ کر انھوں نے خاموشی سے صدیق صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ آپ نے رقعہ پڑھا تو مسکرا دیئے۔ پھر یہ رقعہ بڑے ادب سے اُن ہندو دوست کی خدمت میں پیش کر دیا۔ میزبان لاحول ولا قوۃ کہہ کر زنان خانے کی طرف بھاگے اور ہندو دوست ندامت سے پسینہ پسینہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

شوکت کی ایک بات مجھے اکثر حیران کرتی کہ بے تکلف احباب کی صحبت میں بھی اُن کا دماغ فراغت سے کبھی راحت اندوز نہ ہوتا تھا بلکہ ہر وقت اور ہر پل کسی نہ کسی بات کا ظریفانہ پہلو دیکھنے میں منہمک رہتا تھا۔ ناممکن تھا کہ موقع ملے اور شوکت ظرافت کی پھلجھڑی چھوڑنے سے چوک جاتے۔ جہاں موقع نہیں ہوتا تھا، وہاں بھی انھیں یکایک ہنسی کی

کوئی ایسی بات سوجھ جاتی تھی کہ بعض اوقات میں دیر تک اُن کے ذہنی عمل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ قائدِ اعظم کی رحلت کے بعد پاکستان کے نئے صدر کا اعلان ابھی نہ ہوا تھا۔ شوکت سمیت ہم کچھ لوگ ریڈیو پاکستان پر عزیز ملک [illegible] سوچ رہے تھے کہ پاکستان کا آئندہ صدر کون بنے گا۔ ایک صاحب بولے "سر آغا خان مناسب صدر ہوں گے۔ دلکش شخصیت رکھتے ہیں، مادی و روحانی اثر اور بین الاقوامی شہرت کے مالک بھی ہیں۔" شوکت فی الفور بولے "سب تو ٹھیک ہے لیکن سر آغا خان صدر بنے تو قائدِ ملت کو شاید وزیرِ اعظم نہ رہنے دیں۔" پوچھا گیا کہ "کیوں وہ کسے وزیرِ اعظم بنانا پسند کریں گے؟" شوکت بولے "بس کسی جوکی ڈوکی کو۔"

میں دیکھتا تھا کہ ظرافت کی کوئی بات کرنے سے پیشتر شوکت کی آنکھیں نیم وا ہو جاتیں اور اُن میں ایک عجیب سی چمک آجاتی تھی۔ اُن کی بات پر سب ہنستے تو وہ خود بھی ہنسی میں دل کھول کر شریک ہوتے البتہ اُن کی ہنسی بآواز کم ہوتی تھی۔

شوکت کی ظرافت پر نقاد حضرات مجھ سے بہتر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ محفل آرائی میں وہ اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اُن کی باتیں اُن کی تحریروں سے زیادہ دلچسپ اور ظریفانہ ہوتی تھیں مگر اُن کی تحریروں کے متعلق یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ کاروباری مصنف تھے اور اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے انھیں چار و ناچار تصنیف کا کام کرنا پڑتا تھا۔ لکھتے قلم برداشتہ تھے اور ایک ہی نشست میں فل سکیپ سائز کے ایسے کئی کئی صفحے خوشخط لکھ جاتے جن میں ایک سطر بلکہ ایک لفظ بھی کٹا ہوا نہ ہوتا تھا۔

شوکت بہت باکمال نقال بھی تھے۔ کسی سے پہلی بار ملتے تو باتیں کم کرتے تمام وقت اُس شخص کی ایک ایک حرکت اور لہجے کی ایک ایک خصوصیت کا مطالعہ بہت غور سے کرتے رہتے۔ بے تکلف احباب کے ساتھ تنہائی کا موقع ملتا تو پورے اعتماد سے اُس کی ایسی مکمل نقل اُتارتے یا اس خوبی سے اُس کی پیروڈی کرتے کہ اُن کی قوتِ مشاہدہ کا قائل ہونا پڑتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بڑے کمال کی بات اُن میں یہ تھی کہ جب کبھی اُن سے درخواست کی جاتی کہ فلاں واقعے یا فلاں صاحب کی نقل سنا دیجیے تو انکار کبھی نہ کرتے۔ انھیں یہ خیال بھی نہ آتا کہ جس شخص کی [illegible] کے لیے ان سے یہ فرمائش جا رہی ہے، وہ اس قابل ہے بھی کہ اُس کی خاطر یہ زحمت برداشت کی جائے۔ وہ صرف فرمائش کرنے والے سے اپنے تعلقات کا خیال کرتے اور بلا تامل اُس کی فرمائش پوری کر دیتے تھے۔

گمان تک نہ گزرا تھا کہ اس ہنسنے اور ہنسانے والے شوکت کا چہرہ ایک روز کفن میں لپٹا ہوا دیکھنا پڑے گا۔ دل ندھوں کی ناتوانی پر کُڑھے گا کہ اپنے عزیز دوست کو اُس کی آخری منزل تک پہنچانے سے معذور ہے۔ آنکھیں اُسے مٹی میں لتا ہوا دیکھیں گی اور بے بسی کے آنسو بہاتی رہ جائیں گی۔

شوکت تھانوی کے آخری ایام

فضل احمد کریم فضلی ۔

میں ڈھاکہ میں تھا کہ خبر ملی کہ شوکت تھانوی بہت سخت بیمار ہیں۔ ویسے تو ان کی بیماری نئی نہیں پرانی تھی۔ شوکت کی شخصیت اتنی دلچسپ اور تصویر کی سی بشاشت بخش تھی کہ اس شخصیت سے کوئی بیماری منسوب کرنا عجیب سا لگتا تھا۔ دوسرے ہی دن میں ڈھاکہ سے سیدھا لاہور گیا۔ وہاں نیاز احمد صاحب سے ملا۔ [illegible] نے بتایا کہ شوکت جب ۲۲۔۲۔۶۳ء کو [illegible] ملنے پہنچے تو انہیں بخار تھا۔ دوسرے دن ایک ادبی محفل میں بھی وہ بخار کی حالت میں شریک ہوئے تھے۔ اس سے بھی برا ہوا۔ نیاز صاحب نے انہیں ڈاکٹر عیسیٰ کو دکھایا جو اتفاق سے وہاں آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر عیسیٰ نے بتایا کہ ان کے جگر میں سرطان ہے یا پھوڑا۔ اور جگر اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کا دباؤ دل اور پھیپھڑوں پر پڑ رہا ہے۔ فوراً سرطان یا پھوڑے کی تشخیص ہونی چاہیئے۔ اور اس کے مطابق علاج۔ یہ ۲۵۔۲۔۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ مگر جن ڈاکٹروں کو بعد میں دکھایا گیا، انہوں نے ڈاکٹر عیسیٰ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ بلکہ دل کی شکایت تجویز کی جس کا علاج وہ کرتے رہے۔ اور شوکت صاحب کی حالت تیزی سے خراب ہوتی گئی۔ اور اب وہ نقل و حرکت بھی نہیں کر سکتے۔

میں ۱۱ اپریل کی صبح کو انہیں دیکھنے گیا۔ کمرہ میں دبے پاؤں داخل ہوا تو مجھے پلنگ پر ایک باغ و بہار آدمی کی جگہ ایک باسی ہار پڑا ہوا نظر آیا۔ شوکت نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے مجھے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں کہ یہ شخص کہاں سے آ گیا۔ پھر انہوں نے بڑے پیار سے میرا نام لیا۔ اور بار بار ایسے انداز میں جیسے پوچھ رہے ہوں کہ آیا میں سچ مچ موجود ہوں یا وہ خواب دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں ہاں میں فضلی ہی ہوں۔ انہوں نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ دبایا، پھر کہنے لگے مجھے بات کرنا منع ہے۔ اور کہتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ شخص جو پھول برسایا کرتا تھا اب آنسو برسانے پر مجبور تھا۔ یہ منظر دیکھ کے دل ہل گیا۔ اور یہ حقیقت شوکت کے اشکبار چہرے کی صورت میں سامنے آ گئی کہ ہم کیا اور ہماری حقیقت کیا۔ تندرستی کی حالت میں ہم اپنے آپ کو جو چاہیں سمجھیں لیکن کوئی موذی مرض آ دبوچے تو پھر ہماری حیثیت اس کبوتر سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ جسے بلی نے اس طرح منہ میں بھر لیا ہو کہ پھڑک بھی نہ سکے۔
میں نے بھی کڑا کر کے کہا کہ "بھائی یہ شعر کہا تو اپنے لئے تھا۔ لیکن یہ صادق آپ کے حال پر زیادہ آ رہا ہے۔"

غمِ دوراں کے آگے سر جھکا دیں!
اب ایسے بھی گئے گذرے نہیں ہم

عمر پہنچتے ہنستے گزاری ہے۔ سبھی پہنچتے ہیں۔ اب اس موذی مرض کی بھی جنس جنس کے آزمائے۔ یہ مشورہ اور باتیں سن کر وہ خفیف مسکرائے "مجھے ایسا لگا جیسے یہ مسکراہٹ نہیں طنز ہے اور مجھ سے کہہ رہی ہو ساحل پر کھڑے ہونے والے منجدھار میں ڈوبنے والے کی حالت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ان کی بیوی نے مجھے پان دینا چاہا۔ میں نے کہا رہنے دیجئے۔ انہوں نے کہا کیوں۔ کیا پان کھانا چھوڑ دیا؟ میں نے کہا: "یہ تو صاحب بیماری کے زمانے میں نہیں چھوڑا تو اب کیا چھوڑوں گا؟ لیکن اس وقت اچھا نہیں لگتا۔" انہوں نے کہا کچھ نہیں کھاتے۔ شوکت صاحب کی نگاہیں بھی مجھ سے یہی کہنے لگیں۔ میں نے ایک آخری عذر جو حقیقت پر مبنی تھا اور پیش کیا "کہ قوام کی شیشی بھول گیا ہوں۔ وہ قوام یہاں ملتا نہیں۔ بغیر قوام کے پان کیا کھاؤں۔" سب چپ ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد شوکت صاحب نے اُن سے کہا میرا وہ بیگ دینا۔ انہوں نے پوچھا کون سا۔ شوکت صاحب نے جواب دیا دفتر والا۔ بیگم نے کہا اب دفتر والے بیگ کا کیا کیجئے گا۔ آپ کو کام کرنا منع ہے۔ شوکت صاحب نے قدرے زور دار آواز میں کہا دو۔ میں نے کہا۔ اس میں قوام ہے۔ وہ بیگ دیا گیا۔ کھولو۔ فلاں فلاں خانہ دیکھو۔ اس کی تہہ میں قوام کی شیشی رکھی تھی۔ بیگم نے کہا دیکھئے چھپا کے رکھتے تھے۔ اجازت ملتے ہی شوکت صاحب نے شیشی اپنے ہاتھ میں لے لی اور کچھ دیر انگلیوں میں گھماتے رہے۔ جیسے پس و پیش کر رہے ہوں۔ پھر میرے ہاتھوں میں دی اور دیتے ہی رو پڑے۔ اُن کی بیوی نے کہا "ارے رونا کاہے کا۔ انشاء اللہ اچھے ہو جاؤ تو خوب کھانا۔" میں نے کہا یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ انہیں یہ احساس ستا رہا ہے کہ ایسی حالت میں مجھے تحفہ بھی دے رہے ہیں تو کیا۔ پھر میں نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا "یار آپ نے بھی یہ تحفہ اس وقت میرے لئے بڑا بیش قیمت ہے۔" یہ سن کے اُن کے آنسو تھم گئے۔ اور خفیف مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر آ گئی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس حال میں بھی یہ تک یاد ہے کہ ایک قوام کی شیشی فلاں جگہ رکھی ہے۔ میں نے پھر ان سے کہا: "ایک دفعہ میں بھی اسی طرح اسپتال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ بات کرنا تو درکنار میں بیٹھے بیٹھے کوئی کتاب بھی نہ پڑھوں اور نہ پڑھوا کے سنوں۔ میں نے دل میں کہا خوب یہ سب نہ کروں تو کیا پڑے پڑے یہی سوچا کروں کہ اب ملک الموت صاحب تشریف لائے۔ اب انہوں نے گلا دبایا اب دم نکلا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اللہ نے مجھے شعر کہنے کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ میں کیوں نہ شعر کہوں۔ بڑے اطمینان سے شعر کہنے لگا اور یہ سارا وقت اچھی طرح گزرنے لگا۔ بلکہ جب کوئی اچھا شعر ہو جاتا تو روح میں بالیدگی و توانائی کا احساس بڑھ جاتا۔ یہ آزمودہ نسخہ آپ بھی آزما کے دیکھئے: یہ آزمودہ نسخہ آپ بھی آزما کے دیکھئے۔" شوکت صاحب نے اس طرح مسکرا کے سر ہلایا جیسے انہیں یہ تجویز پسند آئی ہو۔

بیگم نے بتایا کہ اور تو سب ٹھیک ہے مگر نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ اور روز بروز کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پانی بھی بمشکل پیتے ہیں ——— اسی وقت ڈاکٹر آ گئے۔ میں نے پوچھا "انار کا تازہ رس دینے میں کوئی حرج ہے؟" ڈاکٹر نے کہا اگر یہ پئیں تو بڑے شوق سے پلائیے۔ ہمیں تو فکر تو یہی ہے کہ انہوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ میرے پاس اعلیٰ قسم کا جواہر مہرہ تھا۔ میں نے سوچا اس سے بہتر اس کا استعمال کیا ہو سکتا ہے۔ کہ شوکت کے کام آئے۔

دوسرے دن میں جواہر مہرہ لے کے اسپتال گیا۔ وہ انار کا رس ایک گلاس میں آیا۔ ایک چمچے میں جواہر مہرہ اس میں گھسا گیا۔ سید امتیاز علی تاج صاحب کے بھتیجے نے گھسا۔ میں نے شوکت صاحب کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا یہ بہترین جواہر مہرہ ہے۔ اسے

پابند۔ انہوں نے [illegible] بیٹھے تھے [illegible] اور [illegible] ختم ہو گیا کہنے لگے
[illegible] مجھے ایک [illegible] شوکت صاحب کے [illegible] شوکت [illegible] ہے [illegible] انہوں نے اپنی
[illegible] پہنچا [illegible] میں نے پوچھا آپ نے [illegible] شوکت صاحب نے جواب دیا
[illegible] ہے [illegible] وقت [illegible] پر [illegible]
[illegible] میں نے یہ شعر کہا۔

میں تو بندہ ہوں یہی بندگی سے ہے پیار
تو خدا ہے اور خدا ہو کر بھی غافل نہیں

اس دن ڈاکٹر [illegible] بھی میرے سامنے تھے، تشخیص یہ [illegible] شوکت صاحب نے بڑی حسرت سے کہا: کبھی ہم بھی [illegible] اب کیا فرق پڑتا ہے، جب [illegible] ان کی موجودگی میں [illegible] کرانے کی غرض سے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پہلے [illegible] میں [illegible] شکل و صورت [illegible] دیکھ کے [illegible] میں نے [illegible] ہاتھ سے [illegible] بڑھ رہی [illegible] میں نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جیسے بھی تم [illegible] رکھو دل کی دھڑکن [illegible] اور اس نے ایک عجیب ستم ظریف [illegible] سامنے ہسپتال میں پیٹ [illegible] شوکت صاحب مسکرائے پھر بھی سنجیدگی سے [illegible] یہ بات [illegible] صاحب نے اس وقت کہی ہوگی۔ جب بیگم صاحبہ [illegible] اگر یہی بات [illegible] تو میری بیوی جوتی سے [illegible] ڈاکٹر میرا [illegible] بن جائے۔ سارا جسم پھیلا کر دے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اچھا ہے [illegible] ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب جب معائنہ کر چکے تو شوکت صاحب نے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: ڈاکٹر صاحب پھاڑیے گا تو نہیں؟ انہوں نے جواب دیا: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شوکت صاحب نے کہا دیکھیے ڈاکٹر صاحب، اگر آپ نے چیرا پھاڑا، اگر خدانخواستہ میں مر گیا تو میرے شیدا [illegible] اس شعر سے کسی نہ کسی طرح میرے مرنے کی تاریخ نکالیں گے۔

ہر عمر کا ایک ہی انجام ہے۔
پیٹ شوکت کا بھی پھاڑا ہی گیا۔

(اپنے نام [illegible] کی طرف اشارہ قابلِ داد ہے) ایسا لگتا تھا کہ یہ شعر انہوں نے یا تو اسی وقت یا اسی دن کہا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ اللہ نے اس شخص کو کیا دماغ دیا ہے موت کا خونی پنجہ اسے ہر طرف سے اپنی گرفت میں لے رہا ہے لیکن اس کی حاضر دماغی اور حس مزاح ختم نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب باہر نکلے تو انہوں نے بتایا کہ حالت بہت خطرناک ہے۔ انہیں جگر کا سرطان ہے اور بظاہر چند دن کے مہمان ہیں پوری تشخیص امروز فردا میں ہو جائے گی۔ جب میں کمرے میں واپس آیا تو شوکت صاحب نے مجھ سے پوچھا: ڈاکٹر نے کیا کہا؟ میں نے جواب دیا آپ کو کیا بتاؤں اور میرے اور آپ کے جگری دوست کا نام بیچ میں آتا ہے۔ مگر ساری خرابی انہی حضرت جگر کی ہے۔ اس پر وہ مسکرانے اور کہنے لگے۔ آپ نے کبھی سنا ہے کہ ڈاکٹروں کے پاس ——— جگر کا علاج ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے آپ مجھے یہاں سے نکال لے چلیے اور یونانی علاج کرائیے۔ میں نے پوچھا آپ کو اس علاج پر اعتقاد ہے؟ کہنے لگے۔ سو فیصدی۔

میں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایک نئی دوا آزمانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے اس سے افاقہ ہو۔ اور اگر

طاقت آجائے کہ انہیں بیرونی ممالک میں لے جا کر آپریشن کرایا جائے۔ اس کے بعد میں نے ان سے باتیں کیں اور پوچھا کہ یار ڈاکٹروں کو کیا جواب دینا چاہیے۔ اس کے بعد پھر معمول ہو گیا کہ میں روز جاتا اور انہیں انار کا رس مع جواہر مہرے کے پلاتا۔ اور وہ پورا پی لیتے۔ میری ایک روز طبیعت خراب تھی تو میں نے بیگم شوکت کو فون کیا کہ آج میں حسب معمول دن کو نہ آسکوں گا وہ رس کیوڑہ دیں شام کو اگر صحت نے اجازت دی تو حاضر ہوں گا۔ شام کو گیا تو معلوم ہوا کہ جب ان کی بیوی رس پلانے لگیں تو انہوں نے میرے بارے میں دریافت کیا۔ بتانے پر خاموش ہو گئے اور بمشکل دو چار گھونٹ پیئے۔

ایک دن میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ڈاکٹروں نے جانے کی اجازت دے دی ہے؟ بیگم شوکت اور لڑکوں نے کہا ڈاکٹروں نے تو اجازت نہیں دی لیکن یہ کسی طرح مانتے ہی نہیں۔ آپ کے کہنے پر شاید راضی ہو جائیں۔ حسن اتفاق سے اس دن میجر جمیل الرحمٰن صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کی یہ رائے ہوئی کہ کوئی دو دن آرام کا موقع دینا چاہیے۔ ورنہ اس طرح گھر سے جانا تو موت کو دعوت دینا ہے۔ چونکہ بہرصورت میں اور ہمارے محترم میجر ریاض صاحب نے انہیں بہت سمجھایا، بات کرنے سے معلوم ہوا کہ شوکت صاحب کو اندیشہ تھا کہ شاید ڈاکٹر ان کا آپریشن کر دیں گے۔ جب یہ اندیشہ دور کیا تو انہوں نے اپنے بڑے بیٹے میاں سعید کا سہارا لینا چاہا۔ انہوں نے بھی ہماری تائید کی تو کہنے لگے: اچھا لیکن اگر میرا آپریشن ہوا تو میرے بچوں کا خون آپ لوگوں کی گردن پر ہو گا۔ پھر کہنے لگے کہ بس اتنی طاقت آجائے کہ میں بیٹھنے لگوں پھر مرضی کر دیجئے گا۔ دوسرے دن انہیں خون دیا گیا۔ اور پھر نئی دوا کا استعمال شروع ہو گیا۔ بظاہر ان کی حالت بہتر معلوم ہوئی رات کو نیند بھی آنے لگی اور انہوں نے ناشتہ میں دلیہ بھی کھایا۔ اس سے کچھ اطمینان سا ہونے لگا۔ مجھے ۲۴ تاریخ کو کراچی واپس آنا تھا۔ اس دن جب ان سے ملنے گیا تو حسب معمول رس پلانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ وہ میرے بغیر اسے کوئی اہمیت دیتے ہوئے اپنے جانے کا ذکر کیا۔ انہوں نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ دبایا، اور میرے مصرعے ”فضلی، فضلی میرے فضلی میرے پیارے فضلی“ سے مجھے مخاطب کیا۔ یعنی ۲۴ تاریخ تک ان کا حافظہ اتنا اچھا اور ذہن اتنا صاف تھا کہ یہ مصرعہ بلا تکلف سنا سکے۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا تھا کہ اگر نئی دوا نے اثر کیا تو چند ہفتے شاید چل جائیں ورنہ چند دنوں کی بات ہے۔ اس لئے مجھے اندیشہ تھا کہ شاید میں ان کا آخری دیدار کر رہا ہوں۔ لیکن ان کے حافظے کی حالت دیکھتے ہوئے یہ امید بھی تھی کہ جب میں ۷ مئی کو لاہور واپس آؤں گا تو انہیں اس وقت بھی مرض اور موت سے نبرد آزما پاؤں گا۔ بیگم شوکت نے یہ بھی بتایا کہ میر خلیل الرحمٰن صاحب نے ٹیلیفون پر کہا ہے کہ وہ شوکت صاحب کو ولایت لے جا کر ان کے علاج کا پورا خرچ خوشی سے برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ اس خبر سے شوکت صاحب کے اعزا اور احباب میر صاحب کے بے حد ممنون ہوئے۔

کراچی واپس آنے پر برابر ایک سے شوکت صاحب کی خیریت دریافت کرتا رہا۔ جمعہ ۳ مئی کو معلوم ہوا کہ انہیں ہسپتال سے منتقل کیا جا چکا ہے۔ اس خبر سے بڑی تشویش پیدا ہوئی۔ کیونکہ اس کے یہ معنی تھے کہ نئی دوا ناکام رہی۔ اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔

جمعہ کی شام کو میرے ہاں جگر کی ماہانہ نشست تھی اس میں شوکت صاحب کی علالت کا ذکر رہا، حال میں نے حاضرین کو تفصیل سے بتایا اور دیر تک شوکت ہی کی گوناگوں صفات کا ذکر ہوتا رہا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس غیر معمولی انسان کو کتنی غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ اور آج یہ خبر پڑھ کر سنائی کہ یہ بلبل ہزار داستاں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس وقت صفی صاحب کا وہ شعر بے اختیار یاد آرہا ہے جو انہوں نے [illegible] ظریف لکھنوی کی موت پر کہا تھا۔“

جو اٹھ نہ سکتا تھا بے سہارے وہ شور محشر اٹھا کے اٹھا
ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رلا کے اٹھا“

۱۱ مئی ۱۹۶۳ء، جنگ کراچی

شوکت تھانوی

(چند یادیں)

عشرت رحمانی

"شاعر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے" اس مقولہ کا اطلاق صرف شاعری پر نہیں بلکہ ہر فنکار ادیب پر بھی ہوتا ہے۔ اور یہ مقولہ جس حد تک شوکت تھانوی پر صادق آتا ہے شاید اردو ادب میں گنتی کی ایسی ہستیاں ملیں گی۔ شوکت کا شعری و نثری ادب جس طرز و انداز کا بھی ہے سب کا سب تخلیقی ہے۔ اس کی زبان اور قلم میں ذرا بھی فرق نہیں۔ جس انداز میں باتیں کرتا تھا وہی پرواز قلم کا بھی تھا۔ بر موقع محل چسپ درن بات میں بات پیدا کرنا اور فقرے چست کرنا اس کی فطری خصوصیت تھی۔ وہی کیفیت تحریر میں بھی تھی جس روانی اور تسلسل سے گفتگو کرتا تھا اسی طرح بے تکلف مسلسل لکھتا چلا جاتا تھا حتیٰ کہ اس کا قلم اس کے تخیل کی روانی کا ساتھ نہ دے سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پیدائشی طور پر ایک صاحبِ طرز، حاضر جواب، حاضر دماغ ظریف، اور مزاح نویس شاعر و ادیب تھا۔ قدرت نے زبان و بیان کی جو قدرت عطا کی تھی، اس کا اندازہ شاید خود شوکت کو بھی نہ تھا۔ زبان کے معاملہ میں اس کا مکتب اس کی آغوش ہی تھا جہاں کمسنی ہی میں اس کی آنکھ کھلی اور شعور کے سن کو پہنچتے پہنچتے لکھنؤ دبستانِ شعر و ادب اس کا پہلا اور آخری دارالعلم تھا جس کے دامن نے اس کی زبان کو نکھار اور بیان کو رعنائی دی۔ اور یہی پہلی اور آخری سند تھی جس نے محمد عمر کو شوکت کی شان بخشی اور رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ لوگ عام طور پر اصل نام سے واقف ہی نہ رہے۔ اور یہی لکھنے لگے کہ ؎

نام کا نام ، تخلص کا تخلص شوکت ،

شوکت کے تخیل کی آمد اور سلاست روی ایک ایسی امتیازی خصوصیت تھی جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ کسی قدر مبالغہ کے ساتھ یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ شوکت کا تخیل اس تیزی اور روانی سے کام کرتا تھا کہ فقرے آگے آگے ہوتے اور وہ پیچھے پیچھے۔ یعنی ہر قسم کے حالات میں تحریر ہو یا تقریر چٹ پٹے اور برجستہ فقرے شوکت کی سوچ کی پیشوائی کرتے۔ جن حضرات نے تھوڑی دیر بھی اس سے گفتگو کی ہو یا لکھتے دیکھا ہو وہ اس حقیقت کی شہادت دے سکتے ہیں اور انہیں پورا پورا اندازہ ہوگا کہ شوکت کی قوتِ متخیلہ کتنی حساس اور زود رس تھی اور بیان کی صفائی اور صلاحیت کس درجہ رواں دواں ——— اس کے دل و دماغ میں بہت کم فرق تھا۔ اس حقیقت کا ثبوت شوکت کی ہر تحریر ہے۔ جس کی نسبت بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب وہ لکھنے بیٹھتا تو بس بے سوچے مسلسل بلا تکان لکھے جاتا۔ اور ہزاروں سطور لکھتے ہوئے ایک سطر

ے ، زیرِ طبع کتاب سے چند اوراق

میں ایک لفظ بھی کبھی کم و بیش نہ کرتا۔ یہ اس فنی مزاج انسان کی صاف گوئی اور صاف بیانی کی دلیل تھی۔ شوکت صاحب نے طویل داستانیں لکھیں، مختصر مضمون، افسانے یا ڈرامے لکھے لیکن کبھی ان میں سے کسی مسودے کی نظرِ ثانی نہیں کی۔ ۱۰۰ صفحے لکھے کہ دو حرف آخر، سب کچھ سوچ کر اپنے دماغ میں محفوظ کر لیتا ہوں۔ اور پھر اسے اٹھا کر کاغذ پر۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اشارہ۔ یا مضمون کا چارٹ یا طرح [illegible] دیکھ کر لکھنے کی فرمائش کی گئی اور لکھنا شروع جتنی دیر میں ایک مسودہ نقل کیا جاتا ہے اتنی ہی مدت میں لکھا۔ میرے مخصوص طرزِ بیان کی ۲ رسالے موجود ہیں۔ ہم عصر ادیبوں میں سے اب تک کسی صاحبِ طرز ادیب کے بارے میں ایسی مثال دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ البتہ مشہور مغربی مصنف ڈی ایچ لارنس نے خود اپنی نسبت یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ وہ مسلسل لکھے جاتا اور اپنی تحریر میں کتر بیونت یا کانٹ چھانٹ ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ اس کی پہلی تحریر ہی آخری مسودہ کی حیثیت رکھتی۔ اگر ان دونوں میں کوئی قدرِ مشترک نہیں لیکن سوچنے اور لکھنے کا انداز یکساں نظر آتا ہے۔

لکھنؤ، رنگ و بو کا شہر، شعر و ادب کا گہوارہ، آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن وہاں قائم ہوا۔ جناب [illegible] اس اسٹیشن کے کنٹرولر مقرر ہوئے۔ لکھنؤ ریڈیو اچھا خاصا اہلِ ادب کا مرکز بن گیا۔ ملک حسیب احمد پروگرام ڈائریکٹر تھے اور غلام قادر فرید، مسیح الحسن ناصری، میاں لطیف الرحمٰن، یزدانی نظامی، کرشن چندر اور یہ خاکسار پروگراموں کے مختلف شعبہ جات کے انچارج یعنی پروگرام اسسٹنٹ تھے۔ شوکت تھانوی مصنف اور صداکار مقرر ہوئے۔ ہمہ وقت عقل و فکر و فن آراستہ رہتی۔ نئی نئی تجویزیں، نئے پروگرام۔ رات دن سب کی فکر تھی تو یہ کہ کوئی ایسی جدت پیش کی جائے جو سامعین کو حیرت میں ڈال دے اور ان کی دلچسپیوں میں اضافہ ہو۔ سرکاری فرائض کی ادائیگی کا تو ہر ایک کو احساس تھا ہی لیکن اس سے زیادہ ہر ایک کو اپنے ذوق کے مطابق ایک ہی دھن تھی جس میں مگن نظر آتے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن کیا تھا ایک خاندان تھا اور یہ سب اراکین ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ چونکہ آپس میں سب ایک دوسرے سے پیشتر ہی سے بخوبی آشنا تھے اور ملک کے تمام نامور ادیبوں شاعروں سے مخلصانہ تعلقات بالخصوص ہموار تھے اور سب مل جل کر اسی تگ و دو میں رہتے کہ ان تعلقات سے جس جس طرح بن پڑے کام لیں اور پروگراموں میں نت نئے تجربے، دلچسپیاں اور مفید حرکتیں پیدا کر کے سامعین کو اپنی طرف مخاطب رکھیں۔ اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی اس کے شاہد برصغیر پاکستان و ہند کے وہ بے شمار باخبر سامعین ہیں جو لکھنؤ ریڈیو کی طرف ہمہ تن گوش رہتے۔ یہ مقبولیت نشری عملے کے لئے عذابِ جان بھی بن گئی تھی کیونکہ دوسرے اسٹیشنوں سے صحت مند مسابقانہ چشمک اور مقابلے شروع ہو گئے۔ چنانچہ لکھنؤ کے اراکین نے ہر ممکن سعی کی کہ اس کا ہر قدم جدت آمیز ترقی کے ساتھ آگے بڑھتا رہے۔ لکھنے والوں میں یوں تو سارے ملک کے مشاہیر (شاعروں اور ادیبوں) کا تعاون ہمیں حاصل تھا۔ اور ان کی اعانت ہی نے ہمارے اسٹیشن کو حسبِ استطاعت اقتدار بنایا ہوا تھا۔ لیکن بعض پروگراموں کی نوعیت کچھ ایسی تھی جو "خود ساختہ" کی مہر لگائے بغیر قابو میں آنے والے نہ تھے۔ اس سلسلے میں شوکت تھانوی کی فطری ذہانت اور زود نویسی ہر ہر قدم پر ہمارے آڑے آئی۔ نیز ان کی فنی صلاحیتیں ایک کامیاب صداکار کی حیثیت سے بھی غیر معمولی تھیں۔ بچوں کے پروگرام میں جو "ایک تھا راجہ" کے عنوان سے ہفتہ ہفتہ میں تین روز نشر کیا جاتا تھا۔ شوکت صاحب "چاچا" کا مخصوص کردار ادا کرتے تھے۔ وہی اس خاص پروگرام کے خالق تھے۔ خود ہی مسودہ لکھتے اور "چاچا" کا کردار ادا کرتے۔ بچوں کے پروگرام کی حیرت انگیز شہرت اور محبوبیت کے مالک بنے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ میں "چھوٹے چاچا" (چاچا کا بھائی) تھا اور غلام قادر فرید "ڈمو میاں" کا توتلا کردار ادا کرتے۔ اس کے علاوہ مختلف ڈراموں، فیچروں اور خاکوں کے لاجواب مسودات شوکت صاحب نے لکھے اور اپنی طبعی

سے اداریے سے لے کر ادبی محفلوں تک جس جلدی ہی ایک با قاعدہ "ہم شاعر" تشکیل "پیغامِ امن" [illegible] تھا جس پروگرام میں قیوم نظر، ن م راشد، پطرس کے علاوہ [illegible] صاحب کے معاصر شرکت کرتے۔ ہر ہفتہ ایک [illegible] نشست جس میں کچھ اس طرح سے اعلان ہوتا کہ

"منظوم تقریب : "ہم شاعر" کی پیغامِ امن [illegible] آج شب آپ کی خدمت میں اپنا مشہور و معروف کھیل
[illegible] مرقع پیش کر رہی ہے جس میں کھیل کے [illegible] غیر حسین [illegible]
میں آپ کے سامنے [illegible] اپنی حیرت انگیز اداکاری کے جوہر دکھائیں گی"

اور اس کے بعد قیوم نظر [illegible] کی تاثیر، بسنتیوں اور [illegible] کی گونج اور [illegible] کے بعد [illegible] کا [illegible] شروع ہوتا اور [illegible] قسم کے شعری چٹ پٹے [illegible] مشاعرے [illegible] نظموں کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ یہ پروگرام [illegible] کی خصوصیت خاص تھا اور [illegible] شہرت و مقبولیت حاصل [illegible] جو شوکت کی تخلیقی ظرافت اور ذہانت ادنیٰ نمونہ تھا۔ اس کے علاوہ ان کے ہفتہ وار خاکوں کا سلسلہ "منشی جی" تھا جو روز مرہ کی عام معاشرتی زندگی پر نہایت دلکش انداز میں لطیف طنز تھی۔ اس میں "منشی جی" کا کردار [illegible] کا ایک مزاحیہ اداکار رفیق [illegible] ادا کرتا اور [illegible] میاں کی بیوی کے روپ میں اپنی لاجواب فطری صداکاری کے جوہر دکھاتی۔ شوکت صاحب اس سلسلے کے مصنف بھی تھے اور ہدایت کار بھی۔ اس پروگرام کی کامیاب مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ رفیق [illegible] کو منشی جی کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ در اصل لاہور ریڈیو کا سلسلہ "قاضی جی" مرحوم "منشی جی" ہی کی پیداوار تھا جس نے شوکت صاحب کو پاکستان کی نشریاتی دنیا میں شہرتِ دوام بخشی اور جس کی بدولت انہوں نے اپنی اصلاحی ظرافت و طنز نگاری کا لوہا منوایا۔ غرضیکہ لکھنؤ اسٹیشن کی رونق زیادہ تر شوکت کے ہنگاموں پر موقوف تھی۔ گویا وہی ہمارے دستِ راست تھے اور وہی دستِ چپ۔ ہم تقاضے کرتے تھے کہ اور کوئی نئی حرکت ہو جائے۔ وہ کہتے تھے جو کچھ سب مل کر سوچیں۔ کبھی کوئی تجویز سوجھ جاتی تو فوراً اس پر بحث ہونے لگتی۔ بات سے بات نکلتی اور اچھا خاصا ایک دلچسپ سلسلہ نئے پروگرام کا شروع ہو جاتا۔ شوکت صاحب لکھتے۔ ہم میں سے کوئی اس کی ہدایت کاری اور پیش کش کا ذمہ لیتا یا وہ خود ہی پیشکار بھی بن جاتے اور اداکار بھی۔ عموماً ہم تین لکھنے والے، شوکت صاحب، سید انصار ناصری اور میں رات دن اس فکر میں رہتے کہ کوئی تازہ واردات، ہم تینوں نے مل کر ایک مرتبہ پروگرام بنایا کہ ایک پندرہ روزہ ڈراموں کا منایا جائے۔ بات یہیں تک نہ رہی بلکہ آگے بڑھ کر پورے مہینہ تک پہنچ گئی۔ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ملک حبیب احمد کا تو پہلے ہی یہ حال تھا کہ جب تک وہ خود یہ نہ سوچ لیں یا کسی سے نہ سن لیں کہ کل سے کوئی نیا پروگرام شروع ہو رہا ہے، کھانا ہضم نہ ہوتا اور نہ رات کو چین سے نیند آتی۔ جب انہیں یہ خبر ملی تو مارے خوشی کے ایک ایک

سے گلے ملنے لگے۔ گویا پیشگی مبارکباد شروع ہو گئی۔ مجلس مشاورت ہوئی۔ کئی گھنٹے بحث مباحثے میں گزرے۔ چائے کی متعدد کیتلیاں لنڈھائی گئیں۔ سیکڑوں سگرٹ پھونک ڈالے۔ ہنسی۔ قہقہے۔ گرما گرمی۔ شوکت کی فقرہ بازی۔ لطیفے اور دوسرے کا چست فقرہ سن کر [illegible] کا اظہار غرض ایک پُر لطف معرکہ گرم رہا۔ اور گرمیٔ محفل کا باعث محض شوکت کی ذات۔

تجویز ہوا کہ یہ پروگرام نشاط کا ہر اہل اور فنی رکن ایک ڈرامائی پروگرام ضرور لکھے۔ بحث کا سوال نہ تھا۔ طے پا گیا۔ جو لکھنے والے

نہ تھے وہ بھی خوشی سے آمادہ تھے کہ اس طرح

"ہنڈیا کے شبدوں میں نام کریں گے"

اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب پروگرام کی تنسیق ہو کر پڑھی گئی تو کل کا جوڑ چالیس تھا یعنی کہ باہر کے ۱۰ ہیروں سے جو لکھا جا سکتا تھا وہ صرف بیس کا پتہ چلا سوچا گیا کہ کیا جائے کسی کا یہ تو جی نہ چاہا کہ اس پروگرام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں اور پیچھے کی ٹیڈی سے صرف تیس رکھیں۔ شوکت صاحب نے کہا "ڈراموں کی اجارہ داری کے بعد چالیس ان کیوں نہ ہو؟" میں نے کہا "چالیسیوں کی نوبت کیوں آئی۔ بلکہ تعداد کی کمی زیادتی کی جائے کہ جینے یہ ہو جاتی۔ سب نے کہا وہ کیسے؟ میں نے کہا "چالیس پروگرام تک نوبت پہنچ ہی گئی ہے صرف بیس کی کمی ہے ساٹھ پیسہ کر کے۔ ایک دن میں دو ڈرامے یعنی صبح اور شام ایک ایک

میری بات نامکمل ہی تھی اور دوں تالیوں کی گونج شروع ہو گئی اور متفقہ طور پر ایک ہفتے میں ساٹھ ڈراماتی پروگرام نشر کیا جانا طے پایا۔ کیا بس کی فہرست مرتب ہو گئی۔ ان میں سے تمام مزاحیہ ڈرامے اور خاص شوکت صاحب کے ذمے تھے جب اس پروگرام کا آغاز ہوا تو عجیب طور پر ایک ہنگامہ تھا۔ عموماً ایک ریڈیو اسٹیشن سے ہفتے میں ایک دو ڈرامے یا فیچر پروگرام نشر ہوا کرتے ہیں۔ اور یہاں ایک دن میں دو کا اوسط تھی۔ ہدایت کار معتقف تھے۔ مگر صداکاروں کی تعداد محدود۔ نقل نویسوں کے ہاتھ اسکرپٹ اور مسودات کی نقلیں کرتے کرتے شل ہو گئے تھے۔ ہر ہدایت کار کوشش کرتی تو یہی کہ اسے بہتر صداکار ملیں۔ زیادہ سے زیادہ ریہرسل کا وقت ملے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ہر پروگرام کی ریہرسل کو بمشکل چند گھنٹے میسر آ سکتے تھے۔ شوکت صاحب کا ڈرامہ صبح نو بجے نشر ہونا ہے۔ گزشتہ شب ان کا ایک کیل نشر ہو چکا ہے اب وہ کچھ حصہ گھر سے لکھ لائے ہیں۔ سات بجے پہلی مجلس کے پروگرام حسب معمول نشر ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ ڈرامے کے صداکار۔ ہدایت کار متفکر کے ساتھ ادھر ادھر گھومتے پھر رہے ہیں اور شوکت صاحب کا انتظار ہے۔ سامنے سے شوکت کو دیکھتے ہیں ان کے گرد جمع ہو گئے کہ ڈرامے کا مسودہ دیکھئے تو جلدی سے پلٹ لیجے جا بجی نشر کا وقت آ رہا ہے۔ ہدایت کار سخت پریشان ہے۔ شوکت صاحب حسب معمول نہایت اطمینان سے تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں "بس ابھی دیتا ہوں۔" اور ڈیوٹی روم میں جا کر میز پر اپنا بیگ رکھ کر ڈبی سے چھالیہ کتھہ اور پان بڑا نکال کر چبانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہدایت کار پر بوکھلاہٹ طاری ہے۔ شوکت مسکراتے ہیں اور آرام سے بیگ میں سے چند کاغذات نکال کر انہیں الٹ پلٹ کے دیکھتے اور بلاتکلف لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہدایت کار اب یہ دیکھتا ہے کہ جو ڈرامہ نو بجے نشر ہونا ہے کہ اس کے مسودے کا چوتھا صفحہ اب شروع ہوا ہے۔ ڈرامے کی نشری مدت نصف گھنٹہ ہے۔ شوکت صاحب کی تحریر گنجان ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کو ابھی مسودہ مکمل کرنے کے لئے چھ سات صفحات اور لکھنے ہیں۔ آٹھ بجے کا عمل ہے۔ ہدایت کار اور صداکاروں پر جیسے غشی طاری ہونے لگتی ہے کہ اب ہوگا کیا۔ کب مسودہ ختم ہوگا، کب نقل ہوگا اور ریہرسل کس طرح ہوگی۔ اس ڈرامے میں کل چار کردار ہیں۔ ہدایت کار مسلسل شوکت سے اپنی پریشانی اور وقت کی تنگی کا اظہار کر رہا ہے۔ آخر وہ اس پر ترس کھا کر چار مکمل ورق اس کے ہاتھ میں دیتے ہیں مطمئن انداز میں کہتے ہیں "میری جان۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ لو۔ تم ریہرسل شروع کرو۔ اور میں ایک ایک ورق اس دوران میں تمہیں دیتا جاتا ہوں" اور پھر یہ دیکھ کر سب کی کچھ تسلی ہو جاتی ہے کہ ان چار ورقوں کی پانچ پانچ کاربن نقلیں کی ہوئی ہیں۔ جو شوکت نے اصل مسودہ لکھتے وقت کاربن کاغذ رکھ کر کر لی ہیں۔ سب خوشی خوشی جلدی سے اسٹوڈیو میں داخل ہو کر اپنے اپنے پارٹ پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

چار صفحے ختم ہوتے تک ایک ایک ورق اندر پہنچ رہا ہے۔ ڈرامہ آغاز ہونے سے پہلے کل مسودہ ہدایت کار اور صداکاروں کے پاس موجود ہو کچھ ضروری نہیں — وہ دن اور تھے ان میں یہ ہوتا ہے کہ ڈرامہ شروع ہو جاتا اور وقت ہی گزر جاتا — [illegible] خیر سے ہوا اور ڈراما ہو گیا۔

میں صداکار اس قسم کا ڈرامہ کیسے کرتے تھے کہ اس وقت ہی [illegible] چپ چاپ ورق ورق پڑھ کر ادا کر لیتے تھے کبھی کبھی ہدایت کار کسی لفظ کے تلفظ کی تصحیح کر دیتا یا کبھی کسی فقرے کی ادائیگی کا انداز بتا دیا اور وہ [illegible] کے ساتھ تبادلہ کا باعث ہوتے۔ حق تلفی ہو گی اگر مسودہ بھی کسی قسم کا ہو [illegible] یہ چیز نہیں جو شوکت صاحب سے مخصوص طور پر متعلق رہی ہو [illegible] کے عالم میں سے تقریباً اکثر لکھنے والوں کے مسودے اسی طرح مکمل ہوتے تھے [illegible] جب صاحب [illegible] نشر کے وقت سے کچھ دیر پہلے ہی مکمل لکھتے تھے کیونکہ دوسرے متعدد فرائض کی ادائیگی میں جو مصروفیت ہوتی تھی اس سے زیادہ وقت ملتی۔ میں اور شوکت صاحب کے ان ہنگامی نشری مسودات کی وجہ نشر کے [illegible] ایک عجیب شہرہ ہو گیا تھا جو کسی تعلق یا محض اتفاق سے حقیقت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ یعنی اگر شوکت صاحب کسی ڈرامے کا وقت ۴۵ منٹ نشر ہونے کے لئے مقرر ہے تو وہ [illegible] وقت صرف ۳۰ منٹ کا ہو گا اور [illegible] ۱۰ سے [illegible] ۴۵ منٹ یا ایک گھنٹہ کا ہوتا۔ یہ دونوں سب عجلت میں لکھے لکھے مسودہ مکمل کرتے تو وقت کا اندازہ لگائے بغیر کمی بیشی کا لحاظ نہ رکھتے

ڈراموں کے سلسلے میں کئی مواقع ایسے آتے کہ شوکت صاحب ولیجئے یا انصر صاحب کو کوئی ڈراما لکھنا ہے۔ میں وقت کم مسودہ نام ہے۔ صداکار چن لیے گئے۔ ابتدائی حصہ صداکاروں کے حوالے اور ہدایت کار نے وقت مقررہ پر ڈرامے کا آغاز کر دیا۔ مصنف اسٹوڈیو کے باہر ایک طرف گیلری میں بیٹھا بقیہ حصہ لکھ رہا ہے جس کے سامنے نقل نویس پارٹ نقل کر رہے ہیں۔ ایک چپراسی جلدی جلدی ورق ورق اسٹوڈیو کے اندر پہنچا رہا ہے۔ اور ڈراما مسلسل نشر ہو رہا ہے

دراصل اس میں صداکاروں کی چابکدستی اور حاضر دماغی کا بھی بڑا ہاتھ تھا جو اس عجلت کے دوران بیشتر مسودہ پڑھے بغیر اپنے اپنے پارٹ کس طرح ادا کرتے تھے کہ سامعین کو بھی اس حقیقت کا احساس نہ ہونے پاتا کیونکہ کسی سے کوئی غلطی یا سہو کا امکان ہی نہ تھا صداکاروں میں مقررہ اسٹاف آرٹسٹوں کے علاوہ زیادہ تر مستقل اسٹاف کے ارکین شوکت تھانوی۔ ملک حبیب [illegible] ناصری مرغلام فرید۔ یہ خاکسار شریک ہوتے۔ اور سب کو اپنے کام پر کامل عبور و اعتماد تھا

پھر اس نوع کے پروگراموں کی کثرت رہتی تھی کہ اس عجلت اور دوا روی کے بغیر چارہ کار ہی نہ تھا۔ ان میں دو ڈراموں کا پروگرام تو سال میں کئی بار ہونا معمول ہو گیا تھا اور پھر سب مسودات نئے ہوتے۔ لیکن اس کے علاوہ مختلف النوع پروگراموں کا تقرر و تسلسل جاری رہتا۔ اب ریڈیو پاکستان کے ڈرامائی پروگرام کی حالت زار دیکھ کر جب اس دور کا خیال کرتے ہیں تو شرم و ندامت سے سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ کیا ہائے ان خوابوں کی یہ تعبیر مقدر تھی!

اس وقت ہر ریڈیو اسٹیشن کی ایک خصوصیت خاصہ ہوتی تھی۔ مثلاً لاہور اسٹیشن خاص طور پر ڈراموں کے لئے مشہور تھا۔ یہاں لکھنے والے ہدایت کاروں اور صداکاروں میں تجربہ کار حضرات کی خاصی تعداد موجود تھی۔ سید امتیاز علی تاج۔ رفیع پیرزادہ۔ آغا بشیر احمد وغیرہ

اصحاب نئے نئے ڈرامے لکھنے اور پیش کرنے میں مصروف رہتے ۔ ان میں زیادہ تعداد تراجم کی تھی ۔ دہلی اسٹیشن تقسیم کے سبب مختصر سا تھا ۔ بمبئی میں کلاسیکی موسیقی کے اعلیٰ فنکار اور موسیقار مشاہیر جمع تھے اس لئے وہاں موسیقی کے پروگرام نمایاں حیثیت رکھتے تھے ۔ لکھنؤ اور اس کے قرب وجوار میں فنکاروں ، ادیبوں اور شاعروں کا مجمع تھا ، خاص لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر حسن اتفاق سے چند اہل ذوق آ موجود ہوتے تھے جن میں ہر جیسے قسم کے فنکار زیادہ تھے اور سب کے سب فن کے میدان میں مجاہدانہ زندگی گزار رہے تھے اس لئے یہاں یہ جدوجہد جاری تھی یعنی ہر پروگرام میں خاص جدت و خصوصیت شامل ہے لیکن دوسرے اسٹیشنوں کی طرح اس کی خصوصیت خاصہ غنائیہ نظم اور اوپیرا تھا ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نشری اوپیرا اس برصغیر میں سب سے پہلے لکھنؤ ریڈیو سے شروع کیا گیا کیونکہ سرزمین اودھ میں ماہر فن گلوکار موسیقار ۔ اور صداکار معقول تعداد میں پہلے ہی سے موجود تھے ۔ انہیں نشری ضروریات کے لئے آسانی سے تربیت دی جاسکتی تھی ۔

اس نوع کے پروگراموں کا آغاز ادبی منظوم ناٹک اندر سبھا سے کیا گیا اور اسی کے انداز میں مشہور اردو مثنویوں ’’بے نظیر بدر منیر‘‘ ’’زہر عشق‘‘ ’’گلزار نسیم‘‘ ’’ترانۂ شوق‘‘ وغیرہ کو نشری اوپیرا کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ۔ ان پروگراموں کی ترتیب کی ذمہ داری شوکت صاحب اور میں نے اپنے ذمے لے لی تھی ۔ اور سب مل جل کر پیش کرتے ۔ سلطان واجد علی شاہ کا منظوم ناٹک ’رہس‘ ’رادھا کنہیا‘ بھی اسی ذیل میں نشر کیا گیا جب تمام مشہور مثنویات تمام ہو چکیں تو سوچا گیا کہ اب کوئی نئی چیز ہونی چاہئے سلسلے طے پایا کہ ایک جدید مثنوی تصنیف کرائی جائے جس سے وہ پیرایہ تشکیل ہو سکے ۔

چنانچہ اس مقصد کے لئے کہانی کا خاکہ دے کر حضرت جگر مراد آبادی مرحوم کی خدمت میں عرضداشت پیش کی گئی اور اصرار و تقاضے کے بعد میں اور شوکت جگر صاحب سے مثنوی لکھوانے میں کامیاب ہو گئے ۔ لیکن جگر صاحب نے جو مثنوی لکھی وہ خالص طور پر پڑھ کر لطف اٹھانے کے قابل تو تھی جس کے شاعرانہ محاسن لاکلام لائق داد تھے ۔ سب سے بڑی خصوصیت اس کی یہ تھی کہ جگر صاحب نے مثنوی کے انداز میں اپنے مخصوص تغزل کی دلکش و رنگین کیفیت پیدا کی تھی ۔ لیکن اس کو نشری ڈراما بنانا ممکن نہ تھا کیونکہ اس میں ڈرامائی لازم عنصر یا عمل و حرکت سرے سے مفقود تھی ۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ شوکت صاحب اور میں اسی کہانی پر ایک مثنوی لکھیں اور جگر صاحب کے منتخب اشعار مناسب موقعوں پر شامل کریں جو ڈراما کی شکل میں ترتیب پا سکے ۔ سید انصار ناصری اس پروگرام کی پیشکش کے ذمہ دار تھے کیونکہ وہ ڈرامے کے انچارج تھے ۔ یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے ۔ اس وقت لکھنؤ کے اسٹیشن ڈائریکٹر مسٹر کندن سروپ ملک تھے جو کے ایس ملک کے نام سے مشہور تھے اور ایک باذوق فنکار ہونے کے ساتھ لکھنے کا شوق بھی رکھتے تھے ۔ اور ’پرویز‘ کے نام سے نشری ڈرامے اور خاکے لکھا کرتے تھے ۔ ملک صاحب ، انصار صاحب ، شوکت صاحب اور میں چاروں اصحاب ایک ساعت سعید میں ملک صاحب کے کمرے میں بیٹھ گئے اور یہ مثنوی (جس کا نام اسکی خاص کردار (ہیروئن) ’دردانہ‘ کے نام پر ’’دردانہ‘‘ رکھا گیا) کی مہورت کی گئی ۔ تین چار گھنٹے ہم سب سر جوڑ کر وہاں بیٹھے ۔ میں اور شوکت شعر پر شعر کہتے جاتے انصار ناصری لکھتے جاتے اور ملک صاحب اظہار رائے کرتے ۔ چائے کیک پیسٹری سگریٹ ۔ پان غرض شاندار تواضع جاری رہتی ۔ ملک صاحب کی حالت یہ تھی کہ جہاں کہیں انہیں کوئی مصرع یا شعر پسند نہ آتا صاف گوئی سے کام لینے کے بدلے صرف آہستہ سے اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ ’’اسے کسی اور طرح کہہ کر دیکھئے‘‘ یا شوکت کو یا مجھے مخاطب کر کے کہہ دیتے کہ

’’کیا خیال ہے آپ کا یہاں ٹھیک رہے گا ؟‘‘ کئی بار اس دوران میں شوکت کی تنک مزاجی ہنگامہ خیز ثابت ہونے لگتی ۔ کسی موقع پر ہم میں سے

سیریز میں سلسلہ وار [illegible] متعلق نشر کرتا [illegible] اقتباسات کی [illegible] کرتے جاتے۔ میرے اور شوکت کے درمیان جو [illegible] کا [illegible] ہر بار بھی شوکت میرے کسی شعر یا مصرعے پر اعتراض کر کے [illegible] لگتے۔ یا کبھی میں ان کے شعر یا [illegible] سے اختلاف کرتا، اس پر معرکہ ہوتا۔ آخر [illegible] صاحب کی [illegible] اور انصار صاحب کی [illegible] کرنے میں مدد ہوتی۔ یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ [illegible] کا نتیجہ یہ ہوا کہ [illegible] دفتری کاموں میں [illegible] بھی گھنٹوں [illegible] وہ شاعری میں [illegible] دفتری [illegible]۔ [illegible] کا [illegible] اوقات [illegible] سے ہو گئی۔ اُدھر شوکت صاحب کے ذمہ [illegible] تھے۔ [illegible] وقت [illegible] پیش کریں اور اس کام پر [illegible] کیا گیا کہ دو کی نشست [illegible] ہو۔ [illegible] دفتر کے اوقات کے بعد شام کو بیٹھنے کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اس مقصد کے لیے پہلے انصار صاحب کے مکان پر محفل آرائی ہوتی رہی۔ بعد میں میرے مکان پر۔ شوکت صاحب سہ پہر کے پروگراموں سے فارغ ہو کر رات کو آٹھ نو بجے آ جاتے اور ہم تینوں [illegible] شب تک اسی کام میں مصروف رہتے۔ کیا وقت تھا۔ موسم سرما کی خنک اور طویل راتیں۔ تین ہم خیال دیوانے مل بیٹھے۔ کھانا پینا ایک ساتھ۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ سگرٹ، حقے کے کش جاری ہیں۔ پانوں پر پان چبائے جا رہے ہیں۔ مصرعہ پر مصرعہ اور شعر پر شعر کہے جا رہے ہیں۔ انصار صاحب لکھ رہے ہیں۔ کبھی اپنے شعر پر تینوں خود ہی جھومنے لگے ہیں، گانے لگے۔ پھر اس خیال سے کہ گھر والوں کی نیند خراب نہ ہو جلدی سے آہستہ آہستہ گانے لگے۔ کڑی تنقید جاری ہے۔ نوک جھونک ہو رہی ہے۔ شوکت صاحب بگڑ گئے۔ روٹھ کر جا رہے ہیں کہ میرا شعر اچھا نہیں تو خود ہی سب کہہ ڈالو۔ میرے جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ انصار صاحب منا رہے ہیں۔ میں ہنس رہا ہوں۔ شوکت چڑھ کر پھر بیٹھ گئے۔ وہ ہی مسکرانے لگے اور بولے چلو آگے کہو۔ میں [illegible] پڑھنے کے لیے کہہ دیتا۔ اب میں نہیں کہتا تم ہی جھک مارو۔ شوکت نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال دیے۔

”میرا بھیا کہہ دے، کہہ دے۔ شاباش۔ چل یہ ہے مصرع۔ اس پر مصرع لگاؤ“ اور سلسلہ جاری ہو گیا۔ اس بگاڑ میں گرد کدورت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ مقصد سب کا ایک تھا۔ سادگی اور خلوص کی جھلک تھی لطف تھا۔ ایک خاص کیفیت تھی بیان میں آنے کے قابل نہیں۔ جوش و خروش کے عالم میں حقہ نوش پلٹ جاتا۔ اُگالدان قالین پر گل بوٹے بنا دیتا۔ بگڑنا، روٹھنا، اور منانا سب کچھ اخلاص و محبت اور سعادت کے لیے تھا۔ غرض ایک یہی تھی کہ پروگرام شاندار ہو۔ چنانچہ پندرہ بیس روز کی اس ہنگامہ آرائی اور بزم شعر گوئی کے نتیجہ میں ہم نے مل جل کر نہایت دلکش اور کامیاب مسودہ تیار کر لیا۔ جگر صاحب کے اشعار استعمال کرنے کی اجازت بھی ان سے حاصل ہو گئی۔ انصار صاحب کے ذمہ اس پروگرام کی ہدایت کاری تھی۔ فنکاروں میں کلکتہ سے ڈرامہ و تھیٹر کی مشہور و مقبول اداکارہ جہاں آرا کجن مرحومہ ہیروئین کے لیے بلائی گئیں اور لکھنؤ سے آجکل کے مقبول گلوکار طلعت محمود ہیرو کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ دوسرے صداکاروں میں مشتاق بائی مرحومہ (الہ آبادی)، اختری بائی فیض آبادی (جو اب اختر اشتیاق ہیں)، ستارہ بائی کانپوری اور دو درجن دوسرے اعلیٰ فنکار جمع کیے گئے۔ تقریباً دو ہفتے دن دن بھر ریہرسلیں ہوتی رہیں۔ اسٹیشن بھر کا عملہ تمام فنکار اور دیگر اہلکار افسران وغیرہ سب ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔

آخر یہ جدید انداز کا اوپیرا بڑی دھوم دھام سے مقررہ تاریخ کو نشر ہوا اور اپنی دلکشی و جاذبیت کے لحاظ سے سامعین

کے کانوں میں اس کی طرزیں گونجتی رہیں۔

غرض لکھنؤ ریڈیو کا وہ زمانہ اسی قسم کے ادبی فنی ہنگاموں میں گزرتا اور شوکت ہماری مجلس کے ایک نمایاں رکن رہے لیکن کچھ عرصہ بعد لاہور کی پنچولی آرٹ پکچرز نے شوکت کو فلم نگار کی حیثیت سے بلا لیا۔ اور وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ پھر جنگ شروع ہونے کے چند سال بعد سونگ پبلسٹی آرگنائزیشن کے نام سے حکومت نے ایک محکمہ قائم کیا جس کے سربراہ ملک حفیظ جالندھری (ابوالاثر) مقرر ہوئے۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں ادیب و شاعر احباب کو پبلسٹی آفیسر مقرر کیا۔ لکھنؤ میں شوکت تھانوی نے یہ منصب پایا۔ اور سونگ پبلسٹی کا دفتر امین آباد کے متصل ایک محل میں قائم ہو گیا۔ شوکت لاہور سے لکھنؤ آ گئے۔ اور جنگی ترانوں کے گیت لکھوانے اور ان کی طرزیں تیار کرانے میں مشغول ہو گئے۔ یہ کام بظاہر شوکت کے لئے نیا تھا لیکن انہوں نے اپنی فطری ذہانت اور طباعی سے تمام دشواریوں پر عبور حاصل کر لیا۔ اور اس خوبی و خوش اسلوبی سے ان ذمہ داریوں کو نبھایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مزاحیہ ادیب نہیں بلکہ بنیادی طور پر تبلیغی موسیقی کے ماہر تھے۔ شعبہ اور مرکز دونوں پر اپنی اہلیت کا سکہ جما دیا۔ نشریات کی جانب سے لکھنؤ میں رہنے کے باوجود ان کی دلچسپی کچھ کم ہی رہی۔ کیونکہ اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں ان کو گاؤں گاؤں منڈیوں منڈیوں گھومنا پھرنا پڑتا تھا۔ شوکت ہر رنگ اور ہر صورت میں ایک فطری فنکار تھے۔ اور انہیں اپنی فنی صلاحیتوں کو ہر جگہ نمایاں کرنے کا خاص ملکہ اور بہرحال وہ ایک ممتاز نشری شخصیت کے مالک بن چکے تھے۔ علاوہ ازیں لکھنؤ نشریات میں ان کے مخصوص احباب موجود تھے اس لئے وہ جہاں بھی رہے۔ ریڈیو سے الگ نہ ہو سکے۔

شوکت کی دوسری ادبی مصروفیات اس محکمہ میں رہ کر بھی کم نہ ہوئیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ایک مقبول ترین ناول "بیوی" اسی زمانہ میں لکھا جس کی تصنیفی مدت صرف ایک رات ہے۔ اس ناول کے ناشر برادرم محمد طفیل (مدیر نقوش و مالک ادارہ فروغ اردو لاہور) اس کے شاہد ہیں جنہیں رات بھر شوکت کے ساتھ بیٹھ کر یہ ناول لکھنا اور لکھانا پڑا۔ شوکت صاحب بے تکان واقعات بیان کرتے جاتے اور کہیں سے ربط و تسلسل میں فرق نہ آنے پایا۔ جب طفیل صاحب لکھتے لکھتے تھک جاتے تو سونگ پبلسٹی کے ایک منشی لکھنا شروع کرتے۔ لکھنے والے تھک گئے مگر شوکت کی روانی اور واقعات کے جوڑ توڑ میں کہیں تذبذب پیدا نہ ہونے پایا۔ سب کی حالت یہ تھی کہ

انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

رات کو نو بجے کھانے سے فراغت کر کے ناول شروع کیا گیا تھا اور صبح سات بجے ناشتے کے وقت مکمل ہو چکا تھا۔ قدیم شاہی عہد میں داستان سرائی کا یہی انداز ہوا کرتا تھا کہ بادشاہ سلامت رات بھر قصہ کہانی سنتے اور داستان گو ساری رات ایک طویل داستان فی البدیہہ تصنیف کر کے سناتے جاتے۔ شوکت صاحب کی ابتدائی تربیت بلکہ جوانی کا زمانہ بھی لکھنؤ کی الف لیلوی فضا میں بسر ہوا اور انہوں نے بھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز اسی انداز سے کیا۔ شوکت کی تصنیفی قوت واقعی حیرت انگیز اور تخلیقی مادہ بے پناہ تھا۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ صلاحیت خداداد اہلیت اور مطالعہ سے بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی۔ قدرت نے شوکت کو طنز و مزاح کا جو قدرتی ملکہ عطا کیا تھا خصوصاً طنز و مزاح کی جو دولت ان کے حصہ میں آئی اور جس فیاضی سے انہوں نے دونوں میں تحریری اور زبانی ہر طرح تقسیم کی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہو گی۔ شوکت کو مجسم ظرافت بلکہ متکلم ظرافت کہنا بجا تھا۔ اس کی بذلہ سنجی میں تکلف کو دخل نہ تھا۔ نہ بدیہہ گوئی میں تصنع کو ——— چونکہ لکھنؤ میں رہ کر سن شعور کو پہنچا۔ زبان کھولی تو کوثر کی دھلی ہوئی زبان بولنا شروع

وہ تحریر میں جیسے بے پناہ فصاحت و سلاست موجود تھی۔ وہ عام زندگی میں بھی نفاست پسند و نفیس طبع تھے۔ نشست و برخاست کے سلسلے میں ان کا انداز اچھوتا، نفاست و نزاکت کی خبر دیتا تھا۔ خوش وضع، خوش قطع، خوش خلق، خوش پوش و خوش مزاج انسان، ذرا سلیقے اور نفاست [illegible] بھی [illegible] تھا۔ اس کا تیور یہ تھا کہ دوسروں پر فقرے پہ فقرے کستا تھا، خوش طبعی پہ نازاں [illegible] جواب میں کسی [illegible] پھبتی سنتے [illegible] اٹھتا۔ [illegible] مگر یہ زندگی میں بھی بعض اوقات شوکت کی [illegible] جذباتی لمحوں میں اہل جہان نے صرف بیگم کے ساتھ ہی [illegible] تبدیل ہو کر [illegible] شوہر کی حیثیت اختیار کر لیتی۔ بیگم کا مرتبہ وہ دے [illegible] ایک شفیق باپ اور بیوی کے لئے پیار شوہر تھے۔ [illegible] شوکت نے ۱۹۲۹ء میں [illegible] شادی کی۔ پہلی بیگم [illegible] سعیدہ [illegible] تینوں لڑکوں کی [illegible] لڑکی کی شادی۔ [illegible] قسم کی شکایات رہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ شوکت نے ان سے نباہ کی روش اختیار کی جو ایک معقول شریف شوہر اور [illegible] بچوں کے ساتھ شفقت [illegible] کرنی چاہئے تھی۔ اولاد کی تعلیم و تربیت، شادی بیاہ [illegible] لڑکوں کی شادی ہو چکی ہے [illegible] کے سلسلہ میں پورا پورا حق ادا کیا۔ اس کے باوجود محروم قرار پاتے ہیں۔ دوسری بیگم زہرہ شوکت نے فطری جذبہ جو سلوک [illegible] تھا۔ آخری دم تک رہا۔ اور بیمار شوہر کی تیمارداری [illegible] خدمت گزاری و اطاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعض افراد و متعلقین نے اس سلسلہ میں عجیب و غریب انداز اختیار کیا اور مبالغہ آرائی کی حد تک شوکت کو معصوم بنانے کی سعی لاحاصل کی۔ اور افسوس یہ ہے کہ ان میں سے اکثر وہ احباب ہیں جن کے ساتھ شوکت نے اور بیگم زہرہ شوکت نے جو محبت کا سلوک روا رکھا، وہ ان احسانات کے عوض ان لوگوں نے شوکت کی وفات کے بعد اس کے حق میں تاسف تو درکنار [illegible] گوارا کیا۔ بہرحال یہ دنیا ہے۔

صد حیف کہ یہ بلبل ہزار داستان جس نے زندگی بھر چھوٹوں اور بڑوں بڑوں کو ہنسایا۔ جس بات کے چٹکلے نے انہیں بے بسی کے عالم میں ایسا رلایا کہ دوستوں کے دل شق ہو گئے تھے۔ چند نام نہاد اپنوں نے وفات کے بعد ہر ممکن طریقہ پر اس کے لئے جگ ہنسائی کے اسباب پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یقیناً انہیں اپنی موت یاد نہیں ع

ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

اور حقیقت تو یہ ہے کہ شوکت کی موت تو اس کی زندگی سے زیادہ شان و شوکت کا نمونہ ہو۔ کیونکہ ع

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

دراصل شوکت کی موت طب انگریزی پر ایک ایسا شدید طنز ہے کہ اس پہ جتنا ہنسا جائے کم ہے۔ کس قدر عبرتناک ہے یہ حالت کہ نامی گرامی حاذق ماہرین نے ایک عرصہ تک اس کے مرض کی تشخیص میں شک و شبہ کا اظہار کیا۔ اور حتمی طور پر اس وقت صحیح مرض کا اعلان کر سکے جب وہ داعی اجل کو لبیک کہنے کے لئے تیار آخری سانس لے رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ شوکت صاحب اپنی ہی خوش طبعی کا شکار ہوئے۔ وہ صاحب مزاح و ظرافت ہر بات میں لطیفہ پیدا کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ چند ماہ پیشتر جب وہ علیل ہوئے اور ڈاکٹروں نے انہیں احتیاط و علاج کی تاکید بھی کی تو انہوں نے دوا اور معالج سب کا مذاق اڑایا اور معالجہ کی مطلق پروا نہ کی۔ آخر مرض رفتہ رفتہ شدت کی صورت اختیار کرتا رہا۔ وہ بیگم سے بھی چھپاتے رہے لیکن تابکے۔ جب تکیہ سے سر لگایا تو اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

علالت کے دوران ہی میں شوکت صاحب لاہور آئے۔ اور ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء کو جشن اعزاز میں شریک ہو کر تمغۂ امتیاز حاصل کیا۔

۲۴ مارچ سے ان کی حالت بدتر ہونا شروع ہو گئی جب ڈاکٹر ویسٹ (ماہر امراض قلب) نے تجویز کیا کہ انھیں قلب کے بڑھ جانے کی بیماری ہے جس کا نتیجہ خراب ہے تو دوستوں کو اپنے مخصوص انداز میں خود کہہ کر یوں دل کی کمزوری ہے اور بلڈ پریشر [illegible] ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے طے کیا کہ میری بیماری میں تمام خرابی حضرت جگر مرادآبادی کی مے کشی کی ہے۔ حضرت [illegible] میں نہایت ضعیف القلب ہو گیا ہوں۔" حالانکہ ڈاکٹروں کی ابتدائی تشخیص سے انھیں اپنے بارے میں مایوسی ہو چکی تھی۔ اور عزیزوں، دوستوں اور بچوں کو گلے لگا کر بے اختیار روتے رہتے تھے لیکن حسبِ معمول بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا وہی عالم تھا۔ ملاقاتی سے بھی کوئی شگوفہ ایسا چھوڑ دیتے کہ ملاقاتی کو ہنسی آجاتی۔ اور اپنے رونے کو مذاق میں اڑا دیتے۔

شوکت جتنا زندہ دل واقع ہوئے تھے۔ سوئی کی صورت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کے سامنے شیر کھڑا ہے۔ کانپنے لگتے۔ [illegible] بیماری کے بہت کچے تھے۔ معمولی بخار آجاتا تو معلوم ہوتا کہ نہایت شدید بیمار ہیں۔ یہ سبب بھی ان کی علالت کو خطرناک حد تک پہنچانے کا باعث ہوا۔ کیونکہ ابتدا میں محض بیماری کے خوف سے علاج کی طرف توجہ نہ کی۔

لاہور میں قیام کے دوران میں جب ڈاکٹروں نے باقاعدہ تشخیص اور طبی معاینہ کی غرض سے ہسپتال میں داخل ہونے کی تجویز کی، تو انھوں نے بچوں کی طرح بسورنا اور رونا شروع کر دیا۔ مجھ سے گڑگڑا کر کہنے لگے۔ "بس مجھ پر ایک احسان یہ کرو کہ ہسپتال سے بچاؤ۔ میں ہسپتال میں جا کر مر جاؤں گا۔" میں نے تسلی دی اور منت سماجت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہسپتال میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہر قسم کی آسانی میسر آسکے گی وغیرہ وغیرہ۔ اس پر ایک روز کہنے لگے "دیکھو میں ایک راز کی بات بتاؤں، میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں ہسپتال داخل ہوں اور کفن میں لپٹا ہوا گھر لایا جا رہا ہوں۔ اس لیے مجھے اس عذاب سے بچانا ہے تو ہسپتال سے دور رکھو۔ میں یہاں یونانی علاج کراؤں گا۔ اور تندرست ہو جاؤں گا۔"

میں نے کہا "اس خواب کی مکمل تعبیر یہ ہے کہ ان شاء اللہ تم صحت مند ہو کر وہاں سے آؤ گے۔ کیونکہ ایک تو ہسپتال میں کوئی مر جائے تو وہاں سے کفن پہنا کر نہیں لایا جاتا، دوسرے کسی بیمار کا اپنے کو مردہ دیکھنا صحت اور زندگی کی علامت ہے" کہنے لگے "اچھا ایک دن ٹھہر جاؤ۔ ذرا طبیعت کو آمادہ کر لوں، پھر لے چلنا۔" اور ہم آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ خواب کی بات محض افسانہ طرازی ہے۔ جو ہسپتال سے بچنے کے لیے بنائی ہے۔ گمان بھی نہ تھا کہ شوکت کا افسانہ حقیقت بن جائے گا اور اس خواب کی تعبیر زندہ دلی کی موت ثابت ہو گی۔ بہرحال چند قریبی عزیزوں اور دوستوں کے اصرار و منت سے شوکت ہسپتال میں داخل ہونے کے لیے رضامند ہو گئے۔ جہاں ہم نے ان کے ساتھ ۲۔ اپریل سے ۲۶۔ اپریل کے دوران اس دنیا کی عبرت ناک سیر کی۔ حقیقت میں یہ ایک نیا اور عجیب جہان ہے جس کے حالات اپنی بے بسی کے آپ ہی شاہد ہیں۔

شوکت جس روز ہسپتال گئے تو خود بیٹھ اٹھ بلکہ تھوڑا چل پھر سکتے تھے لیکن اس کے بعد سے ان کی حالت روز بروز اور پھر لمحہ بلمحہ ابتر ہونے لگی۔ تیمار دار تو خیر بے بس ہی تھے۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ معالجین کے بس میں بھی کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اعلیٰ ماہرین دن رات کامل توجہ سے تشخیص و علاج میں مصروف تھے لیکن کسی کے کیے کچھ نہ بن رہا تھا۔ بالآخر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی !

بیگم زہرہ شوکت ہسپتال میں شوکت کے ساتھ تھیں، اور ان کی تیمارداری و خدمت گزاری میں شب و روز مصروف۔ رات دن

سے جو ہمیں گھنٹوں میں سے بجلی کی گھنٹی نہیں کا آواز کے بیٹھ آتے ہیں گے۔ مدد ہی ثابت۔ بیداری ہی ہوتے کی کلاں رہیں اور خداوند
سے کہ کس طرح سے علاج سے ایک ہم نیں تو شوکت کی طبیعت آوازیں اپنی بہلانی سنائی دیتی۔

چند ہی روز بعد شوکت نے گھر جانے کا اصرار شروع کیا۔ اصل کی ان کے ہسپتال میں بیٹھ کر کتابت کرتا۔ لب معتمد اس بات پر جھگڑا ہوتا، پھر خوش ہو کر کہتے کہ اب بھی گھر سے چلا اور جب میں مختار صاحب کی راستے میں رہ کے بتا رہا ہوں ان کی اجازت نہیں۔ انشاء اللہ چند دنوں میں صحت ہو جانے کی تو سے چلیں گے۔ تو بڑا لطف اور مگر کا اثر شروع ہو جاتا۔ عزیزوں اور دوستوں سے بیری کا عدم موجودگی میں شکایت کرتے کہ حضرت کو سمجھاؤ، ان کو رضامند کرو کہ مجھے یہاں سے لے چلیں۔

چونکہ ڈاکٹروں نے شوکت صاحب کے پاس لوگوں کو زیادہ آنے جانے سے منع کیا تھا اس لئے اخبارات میں ان کی ملاقات کے خوف کی خبر کے ساتھ یہ بھی پابندی عائد کی تھی۔ تاہم قریبی عزیزوں اور دوستوں کو ملنے کی اجازت تھی اور وہ آتے رہتے تھے۔ چنانچہ وفات سے باوجود صبح سے شام تک احباب کا ہجوم لگا رہتا۔ اکثر احباب کو کمرے کے باہر ہی بٹھا دیا جاتا اور چند مخصوص ہی ان کے پاس جاتے، جنہیں وہ دور سے پہچان کر مسکرا دیتے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی نگاہیں ہمیشہ خواب کی تعبیروں میں تیر رہی ہیں۔ لیکن دنیا امید پر قائم ہے۔ باوجودیکہ بیماری خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ حالت بد سے بدتر نظر آتی تھی۔ اور ڈاکٹروں کے بیان امید افزا معلوم نہ ہوتے تھے مگر یہ تو گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ شوکت کو موت آ سکتی ہے لیکن ع

موت سے کس کو رستگاری ہے

شوکت کی آئی کیسے ٹل سکتی تھی۔ اور ۴ مئی ۱۹۶۳ء کو وقت کی گھڑی آ پہنچی کہ شوکت نے خواب کی تعبیر پالی اور کرب اذیت کے عالم میں اس جہانِ ظرافت زندہ دل انسان نے صحیح معنوں میں یہ ثابت کر دیا کہ ع

مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

شوکت نے ہسپتال سے گھر آ کر دم لیا۔ اور چند روز بعد نہایت سکون و اطمینان کی حالت میں زہرہ اور بچوں سے باتیں کرتے ہوئے دم توڑ دیا۔ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی کی اذیتیں تمام ہوئیں۔ دل لگی ہی دل لگی میں زندگی کا کھیل ختم ہو گیا۔ شوکت کو ابدی سکون مل گیا۔ بیوی اور بچوں کو ناقابلِ تلافی صدمہ اور بے اندازہ غم، عزیزوں اور دوستوں کو جدائی کے رنج و الم۔ اور ستم ظریف احباب کو افسانہ طرازی کے مواقع نصیب ہوئے۔ شاید بعض احباب جو شوکت سے زندگی میں قربت کا دعویٰ رکھتے تھے وضعداری کو مبنی ایمان سمجھے ہوئے اس کے مرنے کے بعد بھی اس لئے ہنستے رہے کہ جس نے ہمیں زندگی بھر ہنسایا ہے اب رو کر اس کی روح کو صدمہ کیوں پہنچائیں اور اخلاص کیشیوں کا ثبوت اپنی مضمون نگاری کے انداز دکھا کر دیتے رہے۔ کسی نے اس کی نجی زندگی کے پہلو خود اور انوکھے انداز میں نمایاں کر کے اپنی خصوصیت جتائی۔ تو کسی نے چند ایسے خطوط جو شوکت نے بعینہٖ راز لکھے تھے شائع کر کے بد دیانتی کا اظہار کیا۔

شوکت کی علالت کے زمانہ کی کہانیاں تو اکثر حضرات نے عجیب عجیب طریقے سے بیان کیں۔ ایک صاحب نے جو شوکت کی بیماری کے زمانہ میں شاید ہی کبھی اس کے پاس آئے ہوں۔ ایک مضمون میں مضحکہ خیز واقعہ لکھ کر ضائع جانے کیا ثابت کرنا چاہا۔ فرماتے ہیں کہ ہسپتال میں جب شوکت صاحب گھر چلنے کے لئے ضد کر رہے تھے اس وقت ایک شیعہ دوست نے انہیں سمجھایا — اس پر شوکت صاحب نے برجستہ ایک شعر کہا جس کا مطلب تھا کہ تم چاہتے ہو میرے جگر میں خنجر پیوست ہو۔ میرا نام محمد عمر ہے اور اس طرح تمہارے تعصب

اور انتقام کی آگ بجھ گئی۔

اس کے علاوہ اور بہت سی لغو اور مہمل کہانیاں تراشی گئیں۔ یہ وہ حضرات تھے جو شوکت کے سامنے اس کی بذلہ سنجی کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ اور اس لئے خاموش ہو کر موقع کے منتظر تھے۔ حالانکہ شوکت نے ہر ایک سے انتقام لیا ہوگا۔ پھر انسان مجموعہ خطا کا ہے۔ شوکت کی ذات میں بھی یقیناً کچھ خامیاں اور کمزوریاں تھیں۔ سہواً یا عادتاً کبھی ہر قدم پر اس نے کسی سے زیادتی کی ہوگی۔ ایک سب سے بڑی کمزوری شوکت کی بدگمانی تھی۔ وہ بعض اوقات بے سبب محض شک و شبہ کی بنا پر کسی عزیز یا دوست سے خفا ہو جاتا اور اسی غصہ میں اس سے انتقام لینے کی بھی ٹھان لیتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس کی ذات میں انتقام لینے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ شوکت کی بہت سی کمزوریوں پر اس کے مزاح و ظرافت نے پردہ ڈال دیا تھا۔ اور اس کی شخصیت اس کی فطری لطافتوں میں اس قدر گم تھی کہ اس کی خامیاں بھی پیاری معلوم ہوتی تھیں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں!

○

مرحوم

نادم سیتاپوری

۴۔ مئی ۱۹۶۳ء کی سہ پہر کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر میں مولانا ضیاء الدین ہاشمی حیدرآبادی کا تعارف تھا۔ وہیں جناب شان الحق حقی نے شوکت کے انتقال کی خبر سنائی ——— حالات کئی دن سے تشویشناک تھے اور اخبارات برابر ان کی خبروں سے بھرے ہوا کرتے تھے ——— مگر جانے کیوں جی چاہتا تھا کہ شوکت ابھی نہ مرتے

کوئی سولہ سترہ سال سے شوکت کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید ایک بار وہ لکھنؤ آئے تھے لیکن میں لکھنؤ سے باہر تھا۔ بمبئی یا جبل پور گیا تھا ملاقات نہ ہو سکی ——— گذشتہ جنوری کے آخری ہفتے میں پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ لاہور پہنچا تو بیمار ہو گیا۔ سوچا بھی تھا کہ تقریباً حسب فرمائش۔ شوکت راولپنڈی میں تھے اور میرے پاس پنڈی کا ویزا نہیں تھا۔ میں نے شوکت کو لکھا کہ میں لاہور آگیا ہوں اگر تم ادھر آؤ تو مجھے اطلاع کر دینا۔ اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا ——— انہیں خط کا جواب دینا ہمیشہ نقصان کرتا تھا۔ اور غیر ضروری خط و کتابت سے وہ ہمیشہ دور ہی رہتے۔ بہتوں ہی کو گلہ رہا ہے کہ شوکت نے جواب شاید ہی کسی کو خود لکھا ہو۔ پھر مجھ جیسے انسان کی یہ توقع تو فضول ہی تھی جو ہمیشہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد برسوں کے لئے احباب سے جدا ہو جاتا ہے۔ لیکن شوکت کی اس بداخلاقی پر اب کی طے کر لیا تھا کہ ملاقات ہوتے ہی دو ٹوک فیصلہ ہو جائے گا۔ اور صاف کہہ دوں گا کہ میاں! ———

چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

مگر اس ملاقات کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ موت نے ہم دونوں کے درمیان ایک قطعی فیصلہ کر دیا۔ دو ٹوک فیصلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ———

شوکت تھانوی تو برائے نام ہی تھے، ان کا اصل وطن تو لکھنؤ ہی تھا جہاں انہوں نے شعور کی آنکھ کھولی تھی۔ چھوٹے چھوٹے نام تو دو تھے ——— ممتاز احمد ——— محمد عمر، لیکن مشہور ہوئے "شوکت تھانوی" کے نام سے۔ اور وہ بھی اس شان و شوکت سے کہ ان کی جیسی مقبولیت ان کے ساتھیوں میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ شوکت سے میرا پہلا تعارف کچھ عجیب و دلچسپ طریقہ پر ہوا،

کوئی تیس پینتیس سال ادھر کی بات ہے جب میں نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مضامین لکھنا شروع کئے تھے۔ کوئی معیاری رسالہ تو ان مضامین کو خاک چھاپتا۔ یہی سمجھ میں آیا کہ ہاتھ صاف کرنے کے لئے روزنامہ "ہمدم" ہی پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ شوکت اس زمانے میں "ہمدم"

کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہو چکے تھے اور "ہمدم" کا فکاہیہ کالم "دو دو باتیں" انہیں کے سپرد ہوتا تھا۔ یہی نہیں شوکت کے نثری مضامین، افسانے اور غزلیں وغیرہ بھی شائع ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ "دو دو باتیں" کے کالم میں تو شوکت کا نام ہی نہیں ہوتا تھا۔ مگر دوسرے صفحات میں اور افسانوں میں وہ باقاعدگی کے ساتھ "مولانا شوکت تھانوی" مشہور ہو چکے تھے۔

مولانا، مرشد، علامہ، ابو الفہم، ابو البشر، صاحبا! کیا کیا کچھ —— اس زمانے میں ہر ظریفانہ ادیب، شاعر و افسانہ نگار اپنے نام کے ساتھ ویسا ہی کچھ لکھا کرتا۔ مجھے اس قسم کی باتوں سے ہمیشہ الجھن سی ہوتی۔ اسی لئے جب شوکت نے میرے میگزین کے جلسے میں شکریے کے ضمن میں "جناب مولانا شوکت صاحب" دستیاب ہوں۔ مجھے تعجب سا ہوا۔ پھر تو حقیقتاً مجھے بے اختیار غصہ آیا۔ میں نے دعوت نامے کے ایک کونے پر لکھا کہ براہِ کرم آئندہ سے آپ مجھے "علامہ مولانا" ہرگز نہ لکھئے گا۔

اس وقت تک شوکت سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی اور میں "مولانا شوکت تھانوی" کو بہت ہی مرعوب کن شخصیت سمجھتا تھا۔

بڑی سی جسیم و ضخیم داڑھی ہوگی۔ ٹخنوں سے اونچا پائجامہ اور ترکی کا جوتا پہنتے ہوں گے۔ کُرتہ بھی مشہدی قسم کا ہوگا۔ بجائے اور —— اور جانے کیا کیا کچھ ——!

گو چند ہی دن بعد لکھنؤ میں جب ملاقات ہوئی تو ان میں "مولانائیت" کا نام و نشان تک نظر نہ آیا —— اور مولانا یا مرشد ہوتے بھی کیسے! ایک باوضع خوش رو نوجوان کے بارے میں یہ تصور ہی غلط تھا۔ دراصل پہلی ملاقات بہت ہی "اصحابِ باصفا" قسم کی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو سوا ادیب ظاہر کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس مدت کے ادبی ماحول پر سنجیدہ گفتگو رہی۔ مولانا حسرت موہانی کی پالیسی، کچھ سیاسی حالات پر نقد و تبصرہ غرضیکہ ایک گھنٹے کے اندر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کے لئے جلدی جلدی بہت سی باتیں کر ڈالیں۔ یہ سلسلہ اور بھی جاری رہا —— مگر جب شوکت کے پاس سے اٹھا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ شوکت پر ذرہ برابر میری کوئی ادبی دھونس نہیں جمی تھی۔ جس طرح میرا تیر خطا ہو چکا تھا اسی طرح شوکت کے ہاتھ بھی کچھ نہیں پڑا تھا۔ البتہ میں جب شوکت کے پاس سے اٹھا تو شوکت کی من موہنی شخصیت مجھ کو کافی متاثر کر چکی تھی۔

اس کے بعد شوکت سے مختصر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جب لکھنؤ جاتا شوکت سے ضرور ملتا۔ شوکت اس زمانے میں چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی کے قریب اپنے ذاتی مکان "نند کوٹھی" میں رہا کرتے تھے۔ آغا باقر کا امام باڑہ بھی نند کوٹھی کے پاس ہی تھا جس میں مرزا رفیع سودا کی قبر بتائی جاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب نخاس اور چوک کی رونق میں کمی ہو چلی تھی اور امین آباد کی چہل پہل دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ "پیام یار" والے منشی نثار حسین کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اب اس علاقے (چوک) میں صرف خواجہ عبدالرؤف عشرت ہی باقی رہ گئے تھے جن کی چھوٹی سی کتابوں کی دکان میں لکھنؤ ہی نہیں ہندوستان بھر کے ادیب اور شعرا کا جمگھٹا رہتا تھا۔ شبلی، سرشار، شرر، منشی سجاد حسین وغیرہ تو باقی نہیں رہے تھے البتہ عزیز، محشر، ریاض اور لکھنؤ کے بہت سے اربابِ کمال اب بھی کبھی نہ کبھی وقت یہاں ضرور پہنچتے تھے۔ امین آباد کی طرف نیاز فتح پوری کے آ جانے کے بعد ایک نیا ادبی مرکز نظیر آباد میں قائم ہو گیا تھا۔ مولوی صدیق احمد کے "صدیق بک ڈپو" نے جو اشاعتی پروگرام شروع کیا تھا اس نے لکھنؤ کی ادبی فضا میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اسی نظیر آباد میں ایک صاحب نے "شبلی بک ڈپو" بھی قائم کر دیا تھا۔ لیکن لکھنؤ کی اس نئی "ادبی پود" نے "امامی بسکٹ فیکٹری" کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔ بسکٹوں کی یہ چھوٹی سی دکان اس زمانے میں لکھنؤ کے فنِ بسکٹ سازی کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ لکھنؤ بھر کی ادبی سرگرمیاں

[illegible] کے بعد [illegible] چند کتب تھے [illegible] انتظار میں [illegible] تھیں [illegible] سید امام حسین [illegible] نسیم [illegible] چنانچہ [illegible] نسیم [illegible] ساتھ [illegible] امام [illegible] بلکہ [illegible]

نسیم [illegible] لیکن آپ [illegible] نسیم [illegible] ایک ایک [illegible] چند [illegible] تھے [illegible] انہوں نے [illegible] صاحب [illegible] نکات کی شکل میں سامنے آگیا [illegible] بالکل بے مقصد تھا۔ شوکت [illegible] نسیم کی [illegible] نصیب [illegible] ہر حیثیت سے [illegible] نشے پر [illegible] شوکت نسیم [illegible] ایک چھوٹی سی [illegible] پیش کرتا [illegible]

ماہنامہ [illegible] نسیم انہونوی کی [illegible] شوکت کی خداداد صلاحیتوں نے [illegible] میں [illegible] لکھنے والوں کا ایک اچھا خاصا حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ [illegible] عشرت [illegible] اور ظریف لکھنوی وغیرہ [illegible] ظرافت نگار اور طنز نگار کے [illegible] شوکت کی [illegible] اپنے استاد آسی [illegible] ۔۔۔۔۔۔ جن کا میدان طنز و مزاح یقیناً نہیں تھا چنانچہ [illegible] تنقید اور [illegible] مزاح نگار کی حیثیت سے [illegible] وہ کبھی سنجیدگی کے ساتھ سامنے [illegible] دنیا میں انہیں شہرت [illegible] حاصل ہوئی۔ یہی حال [illegible] کاظمی مرحوم کا تھا۔ [illegible] انہیں تحقیقی صلاحیتوں سے [illegible] کیا تھا [illegible] کا انجام بخیر ہوا ۔۔۔ [illegible] نے "دنیا میں جہنم" جیسی شاہکار تخلیق [illegible] ان کے حق میں یہی ہے کہ وہ ایک کامیاب صحافی کی حیثیت سے زندہ رہیں۔

"[illegible]" دراصل شوکت کی پہلی اڑان تھا۔ "ہمدم" کی [illegible] باتیں [illegible] کی صحافت میں ایک ایسی ہی [illegible] پیدا کر رہی تھیں جیسی [illegible] مولانا ظفر علی خاں نے پنجاب میں کر رکھا تھا۔ لیکن شوکت تنہا اپنی صلاحیتوں کے سہارے طنز و مزاح کی [illegible] اودھ پنچ" اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے دور سے بہت کچھ [illegible] تھیں۔ لکھنؤ [illegible] زیادہ [illegible] چکا تھا [illegible] کا مزاج بدل چکا تھا۔ نثر کے اسلوب بدل چکے تھے حتیٰ کہ [illegible] مرحوم [illegible] ترقی [illegible] تھا۔ پھر طنز و مزاح کی

تصویریں کیوں دیکھتیں ——— شوکت نے ہر سلسلے میں لکھنؤ کی روایتی زندہ دلی اور روایتی طنز نگاری کی تصویر [illegible] جنہیں منشی سجاد حسین اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے لکھنؤ [illegible] قرار دیا جا سکتا ہے۔

غالباً ۱۹۳۲ء کے اوائل میں "انکشاف" کا ظریف نمبر نکالا جو کئی اعتبار سے پہلا کامیاب خاص نمبر تھا۔ اس کی ظاہری [illegible] اور معنوی خوبیاں نسیم کی خوش سلیقگی اور نفاست کا زندہ ثبوت تھا اور ترتیب و تہذیب و سنوارنے کے لئے صرف شوکت کو داد دینا ہی کافی ہے۔ ادبی رسائل کے خاص نمبر نکالنے کا رواج عام نہ تھا ورنہ شاید اس اولیت کا سہرا حکیم یوسف حسن کے "نیرنگ خیال" اور "عالمگیر" سے زیادہ شاندار سالنامے اس زمانے میں [illegible] شائع نہیں کرتا ——— اور یوپی میں یہ اتفاق [illegible] ہوا کہ [illegible] شوکت و نسیم [illegible] عنایت کی [illegible] تھی۔ اس خاص نمبر کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ تھی کہ پہلی بار اس سالنامے میں شوکت نے یہ قرار کیا کہ [illegible] نسیم کی ادارتی [illegible] رکھنے کے لئے اس اشتہارات کا کچھ اس طرح ذکر تھا ——— "کس کی بری اور کون ڈالے گھاس"۔

یہ وہی دور تھا جب "سودیشی ریل" کی مقبولیت نے شوکت کی شہرت و ناموری کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اب ان پر اپنے کار منصبی کے علاوہ ادبی رسائل کے لئے مزاحیہ مضامین لکھنے کی ذمہ داریاں بھی آ پڑی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اب وہ "انکشاف" کو زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے چنانچہ سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی انکشاف بند ہو گیا۔

طنز و مزاح نسیم کے بس کی بات نہ تھی۔ اب ان کے سامنے یہی ایک صورت تھی کہ اپنی ادارتی پالیسی نبھانے کے لئے کوئی زنانہ ماہنامہ نکالیں چنانچہ "حریم" جاری ہو گیا اور جیسے تیسے نکلتا رہا۔

۱۹۳۱ء میں روزنامہ "ہمدم" کے بانی و سرپرست مہاراجہ محمد علی محمد خان (آف محمود آباد) کا انتقال ہوا اور "ہمدم" کی بنیاد ہلنے لگی۔ خان بہادر سید محمد حسن نے اپنے امکان بھر اسے زندہ رکھنے کی کوشش کی لیکن زیادہ دنوں تک ان کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں اور "ہمدم" نواب عبداللہ خان کی ملکیت میں چلا گیا۔ سید جالب دہلوی نے "ہمت" کے نام سے ایک دوسرا روزنامہ جاری کر دیا اور شوکت "اودھ اخبار" میں چلے گئے۔

یہ دور شوکت کی پریشانیوں کا دور تھا۔ نسیم اس نادر موقع کو بھلا ہاتھ سے کب جانے دیتے۔ "سرپنچ" کا اجرا ہوا اور شوکت باقاعدہ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ "سرپنچ پریس" نسیم کی ملکیت تھا جس کی طرف سے "سرپنچ" کے علاوہ "حریم" بھی نکلتا تھا۔

"سرپنچ" کا دور ادارت شوکت کی زندگی کا سب سے زیادہ المناک دور تھا۔ نسیم کا کاروباری برتاؤ اور شوکت کا عظیم پاس وضع! "سرپنچ" کے دفتر میں ایک چھوٹی سی میز پر گھنٹوں سر جھکائے وہ لکھا کرتے تھے جانے کیا کیا کچھ۔ "سرپنچ" اور "حریم" تو ان کے لئے زیادہ سے زیادہ دو تین دن کا کام تھا۔ لیکن نوکر جو تھے، خالی تو نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ دوسروں کے لئے ناول لکھ کر ڈیوٹی کے اوقات پورے کرتے رہتے۔

چاہے آپ اسے شوکت کی کمزوری کہئے چاہے حماقت ——— اس نے اپنے ہر چھوٹے بڑے دوست کو ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ نبھانے کی کوشش کی۔ یہ مروت اور وضعداری ایسی کہ اگر کوئی دوست "سرقہ بالجبر" کی واردات میں انہیں نامزد کر دیتا تو یہ نہایت ہی "سعادت مندی" کے ساتھ اقبال جرم کر لیتے ——— یہی وجہ تھی کہ ان کے کئی قریبی دوست ان کے ساتھ "بیرحمانہ" سلوک کرتے رہے۔ اور یہ نہایت ہی صبر و شکر کے ساتھ اسے برداشت کرتے رہے۔ برداشت ہی نہیں کیا بلکہ انہیں فراخ دلی کے ساتھ تمام عمر اس طرح نباہ دیا جیسے وہ اسی لئے پیدا کئے گئے تھے کہ دوستوں کا ظلم و ستم ہنس ہنس کر جھیلتے رہیں۔ "سرپنچ" کا دور ادارت المناک تو ضرور تھا لیکن شوکت نے جس

خود پیمانے کے ملتے رہتے تھے یا وہ بھی نہیں کا کام تھا ایسی [illegible] فضا میں جہاں [illegible] شوکت کا ظہور [illegible] نہایت مشکل شمع کیسے جلا رہا تھا ۔

"سرپنچ" سے شوکت کی علیحدگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شوکت پر جیسے گرانی رہی ہو ۔ — جب انہوں نے خود بھی سرگزشت ادبار نہیں کیا تو ان کا "ادارہ" [illegible] ہی [illegible] ہے کہ "سرپنچ" سے الگ ہو کر اپنی [illegible] زمانہ جانے تو ان کا مشغلہ بھی وہی رہا جو خان محبوب [illegible] کا تھا ۔

"بیمار زیست" شوکت کو وہ دن تھے جب میں بھی ان کے پاس کئی [illegible] زندگی [illegible] نہیں [illegible] زندہ رہنا تھا [illegible] ایک وقت [illegible] لکھنے میں مصروف تھے، میں چپکا [illegible] بیٹھ گیا — [illegible] انگلیوں کی گرفت میں [illegible] گیا تھا ۔

کب تک ارادہ ہے ؟

میں نے پوچھا ۔

کیا ارادہ — ؟

شوکت کا زود فہم دماغ کیا [illegible] گیا تھا جیسے — —

ارے بھئی — تمہاری "انتقال" [illegible] کا !

میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا ۔

فی الحال تو تم لوگوں کے مرنے کا انتظار کر رہا ہوں — مزاحیہ تعزیت نامے لکھنے کے لیے !

شوکت نے جواب دیا ۔

ماشاء اللہ — چشم بد دور !

میں نے ہنستے ہوئے کہا —

اور بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی — اپنی بے پناہ مصروفیت کا ذکر کرنے لگے اور بڑی دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے ۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے ۔ شوکت تھانوی ہونے کے باوجود لکھنؤ کی زندہ دلی اور طنز و مزاح کے احیاء کا ایک خاص پروگرام لے کر اٹھے تھے "اودھ پنچ" کے زمانے کا طنز و مزاح ان کے نزدیک صرف تاریخی اہمیت کا حامل رہ گیا تھا وہ چاہتے تھے کہ "سرپنچ" کے ذریعہ مزاح نگاروں کی ایک ایسی نسل پیدا ہو جائے جو مرحوم لکھنؤ کی روایات قدیمہ کو نئے اسلوب و انداز میں زندہ رکھ سکے لیکن شعر و ادب کی طرح "مزاح" بھی جبراً کسی پر طاری و مسلط نہیں کیا جا سکتا چنانچہ نتیجہ ظاہر "سرپنچ" کی فائلوں پر درجنوں نئے مزاح نگار ابھرے اور فطری صلاحیتوں کے فقدان نے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا ۔ دو ایک بیچارے یار لوگوں نے خود فہمی کر کے غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ "مزاح نگاری" میں میں ایک خاص مقام پیدا کرتا چلا جا رہا ہوں ۔

غالباً ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۲ء میں "سرپنچ" کے سالنامے کا اعلان ہوا ۔ شوکت بضد ہو گئے کہ تمہیں بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ہے ۔ چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے کردار "مرزا ظاہر دار بیگ" کو میں نے قالب میں [illegible] کا خاکہ بنایا اور اس پر ایک مضمون لکھ کر بھیج دیا ۔ اس مضمون کو طنز و مزاح

میں کون سا تمام حاصل ہوا؟ اس پر وہ راضی ہو ہی نہیں سکیں مضمون پڑھنے والے جیسے بھی ہوں، مجھے پہلی چیتی [illegible] نظریں میری اس بد مذاقی پر ہنسی آتی ہوگی کہ مجھے بھی مزاح نگاری کا خبط ہو گیا ہے۔ شوکت نے بڑا کرم کیا اس مضمون کی تعریف ہی نہیں کی بلکہ [illegible] میں چھپنے والوں کو جو صفحات دیتے ان میں میرے نام کے ساتھ۔ بحیثیت مدیر کام چھپوا بھی دیا۔

شوکت بہت ہی بڑا آدمی تھا ———

اتنا بڑا کہ زندگی بھر سنجیدگی کے ساتھ کبھی اپنے کام نہیں آیا۔ زندگی کا بیشتر حصہ 'یار باشی' اور دوست نوازی میں گزار دیا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان دوستوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ دوستوں کے کام آنا شوکت کا اخلاق و خمیر تھا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے موقعے تلاش کیا کرتے تھے کہ اپنے احباب کے کچھ کام آئیں۔

دوسری جنگ عظیم چھڑ چکی ہے اور شوکت یو پی کے 'سانگ پبلسٹی آفیسر' وغیرہ (Song Publicity Officer) مقرر ہو چکے ہیں۔ غالباً دو کمرے کی ایک کوٹھی تھی گونگے نواب کے باغ میں رہتے تھے۔ سانگ پبلسٹی آفس کے لئے ہی ایک بڑا سا ہال اور چند کمرے بھی الاٹ کرا لئے تھے —— ایک دن امین آباد میں مل گئے کئی مہینے کے بعد —— سلام علیک کے بعد کہنے لگے

اب اتنا بھی نادم نہ ہو —— لکھنؤ چپکے سے آتے ہو اور چپ چاپ کر نکل جاتے ہو —— ملتے جلتے بھی نہیں

معاف کیجئے گا —— میں نے جواب دیا "میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ بیکار ضائع کروں —— اگر تمہیں بڑی محبت ہے مجھ سے تو سیتاپور کیوں نہیں آتے۔

جی سبحان اللہ —— شوکت بولے "گویا میں تمہاری طرح بیکار ہوں —— خیر! چھوڑو آؤ میرے ساتھ!
زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے —— چائے منگوائی۔ کہنے لگے ———

اب تمہاری 'منڈلی' کا کیا حال ہے

'منڈلی' —— میں واقعی چکرا سا گیا مگر جلد ہی ان کی بات سمجھ میں آگئی —— جب تم نے سرکاری نوکری کر لی، مجبوراً منڈلی توڑ دینا پڑی —— اب اس کام کو طرزی کر رہا ہے۔

شوکت ہنسنے لگے۔ کچھ دیر تک خان محبوب خاں طرزی کی سانگ پارٹی کا ذکر ہوتا رہا۔ —— چائے اب ختم ہو چکی تھی کہنے لگے! ———

یہ کاغذ لو —— ذرا دو چار گیت لکھ ڈالو جلدی سے۔

گیت —— کیسے گیت؟

میں نے پوچھا ———

کہنے لگے ———

اماں ایسے ہی فضول سے "فوجی کم پڑن" کو سنانے والے، جنہیں سنکر وہ جھومنے لگیں۔

میں "فضول سے گیت" لکھنے لگا اور شوکت اپنے کام میں لگ گئے۔

کوئی بیس پچیس منٹ میں میں نے تین چار "فضول سے گیت" لکھ کر شوکت کی طرف بڑھا دیئے۔

شوکت نے غالباً دیکھ لیا اور سب کچھ بالائے طاق رکھ کر [illegible] پیچھے [illegible] رکھا۔

بس صاحب [illegible] [illegible] ہو گئے۔

[illegible] شوکت پھر باتیں کرنے لگے [illegible] نے [illegible] شوکت کی [illegible] کر دیا

شوکت نے [illegible] ہو کر جواب دیا۔

یہ چیک میرے نام تھا ——

میں نے کہا —— تو [illegible] ہو گیا —— معاف کیجئے گا [illegible] نہیں [illegible]

آپ [illegible] —— میں —— شوکت ہنستے ہنستے [illegible] ہو گئے

اس وقت تک میں نے [illegible] سے [illegible] کسی سے بھی [illegible] نہیں پایا تھا مجھے [illegible] شوکت نے [illegible]

[illegible] خیال میرے دل سے نکال دیا اور میں [illegible] ہو گیا۔

"وہی دہلوی" سے تو ہم ہی لوگ [illegible] [illegible] چھپا کرتی

[illegible] حکومت ہند و پاک نے ان سب کے اخلاق سوز لٹریچر کو ممنوع قرار دیا، اور اب سب [illegible] سے یہاں چھپے چھپے مقامات

چلے [illegible] مگر شاید اب تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ یہ "وہی دہلوی" ہیں کون صاحب؟ [illegible] یہ حقیقت بھی [illegible] کہ اس قسم کا لٹریچر [illegible]

کسی ایک ادارہ تک محدود نہیں ہے جس کا [illegible] "وہی دہلوی" بن گیا۔

لیکن شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ "وہی دہلوی" کا وجود دراصل شوکت کی ذہانت کا نتیجہ ہے [illegible] یہی نہیں بلکہ اسی سلسلے

میں شوکت نے [illegible] ایک شعر بھی کہا تھا۔

ہم آپ سے "وہی" ہیں ہمیں جان جائیے
پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے

ہوا یہ ۔۔۔۔۔!

نسیم انہونوی نے جب جنسیاتی افسانوں اور ناولوں کی اشاعت کا دھندہ شروع کیا تو نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے [illegible] "جھنکار" "[illegible]" قسم کی کئی کتابیں لکھوائیں جو جنسیاتی ہونے کے باوجود اتنی گندی، فحش اور خلاف [illegible] نہیں جیسی آج کل "وہی دہلوی" کے نام سے شائع کی جا رہی ہیں۔ پھر بھی ہندوستانی ماحول اور اردو زبان کے لیے یہ نیا تجربہ ضرور تھا۔ اسی لیے اس کے لکھنے والوں نے اپنا نام شائع کرنے کی اجازت نہیں دی چنانچہ یہ مسئلہ جب شوکت کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے ان فرضی مصنفین پر "وہی دہلوی" کا نقاب ڈال دینے کا مشورہ دیا اور یہ فرضی نام کچھ ایسا مقبول ہوا کہ درجنوں "وہی دہلوی" پیدا ہو گئے۔

شوکت محض مزاح نگار ہی نہیں تھے بلکہ قدرت نے ان میں ایک اچھے اداکار کی تمام صلاحیتیں بھی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھیں۔ ان کے دو تین معرکۃ الآرا مضامین میں "تعزیت" بھی ایک خاص مقام رکھتا ہے جو ان کی انتہائی سنجیدہ اداکاری کا آئینہ دار ہے۔ "مرقع" کے ایڈیٹر سید مقبول حسین وصل بلگرامی مرحوم بھی اسی قسم کی سنجیدہ ایکٹنگ کے ماہر سمجھے جاتے تھے لیکن انہوں نے اگر کسی سے مات کھائی تو وہ شوکت اور صرف شوکت تھے۔

وصل بلگرامی بڑے ہی بامذاق انسان تھے۔ ان کی بارعب گھنی داڑھی کے سبب ہمیشہ ایک خانقاہی جاہ و جلال موجود رہتا تھا اور مجلس میں سے کون باور کر سکتا تھا کہ یہ بزرگ صاحب کشف و کرامات نہیں ہیں۔

شوکت جن دنوں "زرد کوٹھی" میں رہا کرتے تھے انہیں آئے دن اللہ کے ایسے نیک بندوں سے سابقہ پڑا کرتا تھا جو خدا رسیدہ اور حق شناس اربابِ طریقت کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اسی قسم کے ایک صاحب اکثر شوکت کے پاس آیا کرتے تھے اور نہ جانے کیوں انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہی مردِ حق آگاہ انہیں منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

شوکت نے پیچھا چھڑانے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کی "طلبِ حق" نے ہمت نہ ہاری۔ شوکت ان سے عاجز ہی تھے، ایک چال سوجھی، ان سے کہا ——— دیکھئے صاحب، آپ کہئے تو چلتا ہوں ایک بزرگ کے پاس ——— لیکن اس کی ذمہ داری قطعاً نہیں لیتا کہ وہ آپ کو بیعت کی اجازت دیدیں، وہ بزرگ اس پایہ کے سالک ہیں کہ کسی قیمت پر کسی کا "پاس" نہیں کرتے۔ یہ بات آپ کو بتائے دیتا ہوں پھر نہ کہئے گا کہ مجھے دھوکا دیا ——— وہ آپ کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں، میں سمجھتا ہوں اس کا انحصار محض آپ کی طلبِ صادق پر ہے ——— اگر آپ میں سچی طلب ہو گی تو ان کے ٹھکرانے کے باوجود آپ کا سر ان کے قدموں پر پہنچ جائیگا۔

ان صاحب نے نہایت پُرجوش الفاظ میں اپنی طلبِ صادق کا یقین دلاتے ہوئے کہا ——— ——

شوکت صاحب ——— بس آپ تو ایک مرتبہ ان بزرگ سے ملوا دیجئے پھر میں خود نپٹ لوں گا۔

یہی تو سوچ رہا ہوں جناب، بعض وقت وہ اتنا جلال میں آجاتے ہیں کہ جو سامنے پڑ گیا اس کی مرمت کر دیتے ہیں۔ شوکت نے بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ انہیں سمجھایا ——— مگر انہوں نے ایک نہ سُنی اور شوکت نے اقرار کر لیا ———

آپ کو ان تک پہنچا دوں گا ——— آگے آپ خود جانیں۔

سمجھے ہوئے پلان کے مطابق دوسرے دن شوکت وصل کے یہاں پہنچے اور نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ منہ لٹکا کر ان صاحب کا تذکرہ کیا ——— ان سے کہا کہ ...... صاحب میرے پاس آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آپنے کسی بیوہ سے ان کا عقدِ ثانی کرا دینے کا وعدہ کیا تھا، وہ بیچارے بہت پریشان ہیں کہتے تھے کہ کئی مرتبہ وصل صاحب کے پاس گیا، مگر وہ برابر ٹال رہے ہیں۔ وصل نے جیسا کہنا چاہیے اس بات سے قطعاً انکار کیا ——— اور کہا کہ میں کسی ایسے آدمی سے واقف نہیں ہوں اور نہ میں نے کسی سے اس قسم کا وعدہ کیا ہے اور .... اور .... !

لیکن شوکت نے کچھ اس انداز میں وصل سے گفتگو کی کہ وہ برہم ہو گئے۔ شوکت چاہتے ہی یہی تھے بڑی متانت کے ساتھ یہ کہہ کر وصل کے یہاں سے چلے آئے۔

خیر ——— میں ان کا اور آپ کا سامنا کرا دوں گا، آپ جانیں اور وہ ——— !

اور یہی ہوا "ان حضرت" کو لے کر شوکت عین اس وقت "بھوڑ واڑہ ہاؤس" (قیصر باغ) پہنچے۔ جب وصل نماز پڑھ رہے تھے۔ شوکت نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ آپ کے بارے میں میں نے ان بزرگ سے کہہ تو دیا ہے مگر وہ "رجوع" ہوتے نظر نہیں آتے میں آپ کو وہاں پہنچا تو دوں گا مگر مجھے ایک بہت ضروری کام ہے اس لئے ٹھہر نہ سکوں گا۔ آپ ان سے صرف اتنا کہہ دیجئے گا کہ "شوکت تھانوی" نے بھیجا ہے ——— اور اگر وہ "رجوع" نہ ہوں تو آپ بلا تکلف ان کے قدموں پر سر رکھ دیجئے گا۔ اگر خدا کو منظور ہے تو انشاء اللہ

۲۱ [illegible]

شوکت [illegible]

[illegible]

شوکت تھانوی صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

شوکت کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] قریب نظر آتے ہے

[illegible]

[illegible]

مردِ خوش گفتار

نسیم ممتاز سید

چند شخصیتیں ہیں ۔ [illegible] لیے [illegible] عقیدت ہے ۔ [illegible] ہے ۔ مگر وہ [illegible] دستور بھی [illegible] کبھی [illegible] ہے ۔ [illegible] کبھی ہوتا [illegible] کئی شخصیتوں میں مرکز بن جاتی ہیں ۔ اور بہت سی شخصیتوں کو ہم ان کی زندگی میں پرکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی ۔ لیکن کسی کی زندگی ہی میں اسے سمجھ لیا اور اس میں ڈوب جانا در حقیقت اسی شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا موزوں ترین طریقہ ہے ۔ اور شوکت صاحب مرحوم کے ساتھ میرے تعلقات ایسے ہی [illegible] ہے ۔ وقت کے ساتھ ساتھ تعلقات کے یہ نقوش زیادہ گہرے ہوتے گئے اور آخر وہ مقام آ گیا جہاں دوئی مٹ جاتی ہے ۔ ان چھوٹی سی تحریری یادوں میں جہاں کہیں آپ مجھے پائیں گے ۔ تو اس میں میرا قصور نہیں ۔ بلکہ اس کی تمام تر ذمہ داری مرحوم پر آتی ہے ۔ جن کے خلوص اور جن کی شفقت نے بتدریج مجھے ان سے بہت قریب کر دیا تھا ۔

۲ مارچ کو [illegible] آنے والے ایک دوست نے پیغام دیا کہ شوکت صاحب شام کے جلسے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے لاہور پہنچ رہے ہیں ۔ چونکہ اگلی ہی صبح وہ واپس چلے جائیں گے ۔ اس لیے ان کی خواہش ہے ۔ کہ میں آ کر [illegible] سمجھتا ہوں ضرور ملوں [illegible] وہ مشاعرے میں جانے کا نہ تھا ۔ لیکن شوکت صاحب کا پیغام ملنے کے بعد شرکت ضروری معلوم ہوئی ۔ خصوصاً اس خیال سے کہ ان سے آخری ملاقات کوئی آٹھ مہینے پہلے ہوئی تھی ۔ اور ان کا لاہور آنا کچھ ایسا آسان بھی نہ تھا ۔

مشاعرے کا وقت غالباً شام کے سات بجے دیا گیا تھا ۔ میں کوئی آٹھ بجے پہنچا ۔ لیکن مشاعرے کی کارروائی نو بجے تک بھی شروع نہ ہوئی ۔ شعرا اسٹیج پر بیٹھے نظر آئے ۔ لیکن ان میں شوکت صاحب کہیں دکھائی نہ دیئے ۔ سو وقت گزارنے کے خیال سے میں چند احباب کے ساتھ ادھر ادھر ٹہلنے لگا ۔ نہ جانے شوکت صاحب کس وقت پہنچ گئے ۔ میں نے جب دیکھا تو بہ حیثیت صدرِ مشاعرہ محترم عبدالوحید خاں صاحب کے ساتھ بیٹھے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے ۔

مشاعرہ کوئی رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے ختم ہوا ۔ تو میں ان سے ملنے اسٹیج پر پہنچا ۔ ان سے جولائی سنہ ۶۲ء کے بعد ملاقات ہوئی تھی ۔ اس وقت کے شوکت تھانوی اور موجودہ شوکت تھانوی میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوا ۔ نحیف و نزار شدید کمزوری میں مبتلا اور بجھے بجھے ۔ یوں محسوس ہوا ۔ گویا یہ شوکت تھانوی نہیں ۔ بلکہ وہ پتلا ہیں جسے کسان کھیتوں میں

[illegible] کا اثر دیتے ہیں۔ کہ [illegible] قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ شوکت صاحب کا شمار گو موٹے تازے اور کسرتی جسم کے لوگوں میں کبھی نہ تھا۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کی صحت عام آدمیوں سے ہمیشہ بہتر ہی دیکھنے میں آتی تھی۔ جگر کی کمزوری تو [illegible] ہوگا کہ اپنی صحت اور اپنے جسم کے اعتبار سے وہ اپنی اصل عمر سے کم عمر ہی دکھائی دیتے۔ ان کی صحت کو اس درجہ انحطاط میں دیکھ کر دل کو دھچکا سا لگا [illegible] دکھ ہوا۔ شوکت صاحب بڑے دبنگ انسان تھے۔ [illegible] یاد کر رہے ہو [illegible] میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ لیکن پریشان [illegible] میں ابھی زندہ [illegible] کا سہرا [illegible] کے چند شعر لکھ بھی چکا ہوں۔"

[illegible] ختم کر دیں۔ شوکت صاحب نے میرے والد محترم اور بھائی جان کی خیریت پوچھی۔ میں نے کہا [illegible] دونوں تو خود مجھ سے اکثر آپ کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں کہ آپ کب واپس آ رہے ہیں۔ لہٰذا راولپنڈی جانے سے پہلے کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔ اس پر انھوں نے اپنی مجبوری بیان کی اور بتایا کہ اگلی ہی صبح واپسی کا ارادہ [illegible] لکھنے ہیں۔ [illegible] اس پر میں نے سمجھایا کہ صبح جا کر کیا کیجئے گا شام کے جہاز سے چلے جائیے گا۔ اتنی دیر میں محترم سید محمد جعفری صاحب بھی پہنچ گئے۔ بصد مشکل شوکت صاحب اس بات پر رضامند ہوئے کہ اگر جعفری صاحب [illegible] تو وہ دونوں ہمارے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا کر تین بجے روانہ ہو جائیں گے۔ رات کے ایک بجے کے قریب ہم تینوں [illegible] جعفر کی پہاڑی سے نیچے اترے۔ پلازا سینما کے چوک تک پیدل پہنچے ہوں گے کہ ایک موٹر رکشا مل گئی۔ میں نے ان دونوں کو اس میں روانہ کیا اور اگلی صبح دس بجے ان سے ملنے کا پروگرام بنایا۔

شوکت صاحب اور جعفری صاحب کو رخصت کر کے میں پیدل قدمی کرتا اپنے گھر روانہ ہوا۔ گھر پہنچنے تک میری آنکھوں کے سامنے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک کا وہ طویل عرصہ بجلی کی سی سرعت سے گھوم گیا۔ جب میرا بیشتر وقت شوکت صاحب کی پُرلطف صحبت میں گزرتا تھا۔ یاد نہیں آ رہا۔ ان سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ غالباً تقسیم ہند سے ذرا پہلے یہ پنچولی آرٹ پکچرز میں کچھ عرصہ ملازم رہے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ چند ہم جماعتوں نے فلم "شیریں فرہاد" کی شوٹنگ دیکھنے کی فرمائش کی۔ اور میں انھیں مسلم ٹاؤن والے اسٹوڈیو لے گیا۔ اتفاق سے اُسی دن سیٹ پر کمپنی کے مالک سیٹھ دل سکھ۔ ایم پنچولی (آنجہانی) بھی موجود تھے۔ انھوں نے میرا تعارف شوکت صاحب سے کرایا۔ جو اس فلم کے مکالمے اور گانے لکھ رہے تھے۔ بحیثیت مزاح نگار میں ان کا نام بچپن سے سنتا چلا آیا تھا۔ اور ان کا مداح تھا۔ لہٰذا ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تعارف ہو جانے کے بعد شوکت صاحب نے میرے متعلق فرمایا۔ کہ میری ان کی کچھ عزیزداری بھی ہوتی ہے اسی طرح چند اور مختصر ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔ جن کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔

۱۹۴۷ء کے نومبر میں جب ریڈیو پاکستان لاہور سے قومی تعمیر کا ایک پروگرام "پاکستان ہمارا ہے" نہایت پابندی اور باقاعدگی سے روزانہ نشر ہونا شروع ہوا۔ تو بحیثیت مصنف اور "ریڈیو وائس" مجھے ان پروگراموں میں اکثر

حفظِ مراتب کا فرق تھا۔ شوکت صاحب بھی اس پر دل سے قائل تھے۔ لہٰذا ہر دو سرپرستوں سے جب ملاقات ہوتی ہے ان ملاقاتوں میں بزرگی اور خوردی کی حدِ فاصل قائم رہی۔

شوکت صاحب نہایت جامہ زیب انسان تھے۔ عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کا خیال آتے ہی ذہن فوراً اس طرف جاتا ہے کسی ایسے شخص کی طرف جس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہو۔ شیو بنانا ہو۔ کپڑوں کی طرف سے انتہائی لاپروائی برتی جاتی ہو۔ مگر شوکت صاحب نہ صورت سے ادیب تھے نہ شاعر۔ کپڑے کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہن لی تو وہ ان پر سج گئی۔ سوٹ پہنا تو وہ ان پر کھل گیا۔ اپنے لباس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کا خیال رکھتے تھے۔ کسی محفل میں جانا ہو۔ تیز سے جلدی کر لیے۔ لیکن عین وقت پر خیال آیا کہ موزے یا ٹائی کا رنگ سوٹ کے لیے موزوں نہیں۔ کسی وقت جب کے جانے ہوں گے مال روڈ۔ کرسٹل بلڈنگ یا انار کلی پہنچے۔ اور جب تک موزوں ٹائی یا موزہ منتخب نہ کر لیا۔ کھانے پر نہ گئے۔

شوکت صاحب جس قدر محفل میں بہت خوش رہتے تھے۔ ان کی خواہش زیادہ رہتی تھی لیکن اور خود بہت کرے تک محدود ہوتی تھیں۔ "قاضی جی" کا پروگرام ریڈیو پر سنانا شروع ہوا تھا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سننے والے اسے غیر معمولی دلچسپی سے سنتے اور قاضی جی کا رول ادا کرنے والے شوکت تھانوی کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے خواہش مند رہتے۔ سردیوں کی ایک شام تھی۔ ہم لوگ ریہرسل سے فارغ ہو کر ایک نمبر اسٹوڈیو میں آ گئے۔ پروگرام شروع ہونے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے کہ شوکت صاحب کے ایک بہت قدیم اور عزیز دوست اسٹوڈیو میں تین خواتین کو لے کر آن پہنچے۔ فرمانے لگے: "بھئی شوکت! تم نے تو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ "قاضی جی" کا پروگرام کیا شروع کیا، ہم عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ جسے میرے تمہارے تعلقات کا علم ہے۔ وہ سب ہی فرمائش کرتا ہے کہ ہمیں "قاضی جی" سے ملوا دو۔" یہ کہہ کر پہلے تو انھوں نے شوکت صاحب کا تعارف ان خواتین سے کرایا۔ اس کے بعد فرداً فرداً ان خواتین کو ان سے متعارف کراتے ہوئے بولے "ان سے ملو۔ یہ ہیں ممتاز۔ اور یہ ہیں ان کی صاحبزادی امتیاز" ابھی تیسری خاتون کا نام نہ لینے پائے تھے کہ شوکت صاحب جھٹ بول اٹھے "ان کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ بس میں سمجھ گیا۔ ان کا نام ہو گا "دارالاشاعت"۔ (اشارہ میرے دادا جان مرحوم و مغفور شمس العلما مولانا سید ممتاز علی صاحب۔ ان کے صاحبزادے یعنی میرے چچا سید امتیاز علی صاحب تاج اور ہمارے ادارے "دارالاشاعت پنجاب" کی طرف تھا) وہ خواتین تو غالباً اس نکتے کو سمجھ نہ سکیں۔ لیکن جو صاحب تعارف کرانے آئے تھے۔ وہ چونکہ اس لطیفے کے پس منظر سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا بے انتہا محظوظ ہوئے۔

شوکت صاحب نے پھول کا سا دل پایا تھا۔ دوسروں کی تکلیف سے بہت متاثر ہو جاتے۔ سنہ ۵۸ء کی گرمیوں میں خدا بخشے میری والدہ ماجدہ مرضِ الموت میں گرفتار ہوئیں۔ اس تعلقِ خاطر کے پیشِ نظر جو شوکت صاحب کو ہمارے خاندان سے تھا۔ یہ اکثر ان کی مزاج پرسی کے لیے آتے۔ وہ کینسر کی مریضہ تھیں۔ ڈاکٹر، حکیم، ہومیوپیتھ جواب دے چکے تھے۔ لیکن شوکت صاحب آتے گھنٹوں بیٹھتے۔ لطیفے سناتے۔ باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے۔ نتیجہ یہ کہ چارہ گروں کی دوا میں

درپچھلے دنوں کی [illegible] جان [illegible] بہت ہو گئی۔ وہاں شوکت صاحب کی [illegible]
کے پاس [illegible] اپنی بیماری اور [illegible] ہو جاتی۔

[illegible] شوکت صاحب
کی [illegible] کا انتقال ہو [illegible] شوکت صاحب
پروگرام [illegible]
پروگرام نشر کر سکے۔

چند ہی دنوں بعد [illegible]
حیثیت [illegible] باقاعدہ [illegible]
[illegible] جانا معمول [illegible]
[illegible] رہیں۔

مجھے معلوم تھا [illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible]
میں ایک [illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible] دیکھا گیا۔ یوں کہ ابا جان [illegible] تشریف لائے ہیں۔ شوکت صاحب [illegible] بھائی جان [illegible]
انھیں جو آتے دیکھا۔ [illegible] بیگم کو [illegible] انھیں [illegible] بھائی جان تشریف
لائے ہیں۔ جلدی سے [illegible] بنا کر لاؤ۔ اور [illegible] بات [illegible] جان نے جو مجھے بیٹھے دیکھا۔ [illegible]
جناب بھی [illegible] ہوئے ہیں۔" ادھر شوکت صاحب [illegible] کہے جا رہے تھے۔ کہنے لگے: "بھائی جان۔ کچھ نہ پوچھیے آج آپ
کے آنے سے کس قدر خوشی ہوئی ہے۔" اس پر ابا جان بولے۔ "بھئی۔ میرے آنے سے تم کب خوش نہیں ہوئے۔ جو آج کی
خوشی کو کوئی خاص اہمیت دو۔" شوکت صاحب بولے گئے "اس میں تو کوئی شبہ نہیں بھائی جان۔ آپ کے تشریف
لانے سے ہمیشہ دلی خوشی ہوئی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ آج جو خاص خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی۔"
ابا جان نے اس "خاص خوشی" کی وجہ پوچھی۔ تو وہ بولے "یہ خوشی اس بات کی ہے بھائی جان کہ میں شوکت تھانوی ہوں۔
کوئی طوائف نہیں۔ ورنہ باپ بیٹے آج "ایک ہی کوٹھے" پر پکڑے جاتے۔ شوکت صاحب کا یہ کہنا تھا کہ محفل زعفران
زار بن گئی۔ جگر صاحب اور خود ابا جان نے انھیں بہت داد دی۔

شوکت صاحب کو جب کوئی بات سوجھتی۔ کوئی فقرہ چست کرنا چاہتے۔ کوئی پھبتی کسنا چاہتے۔ تو پھر چھوٹے

دوست کی مہربانی کرے۔ ان کی بات کرنے کا [illegible]۔ جو شخص ہمیشہ تفریحی ہوتا۔ قصہ مختصر کسی کی ملازمت ذرا نہ کرتے تھے۔ [illegible] پر کبھی ان کی فطرت داری کو افسوس نہ کرتے

شوکت صاحب بات بات پر [illegible] شوکت میں تو [illegible] صحبت بھی نباہ کر جاتے۔ شیخی [illegible] کا مذاق برداشت کر سکتے تھے۔ [illegible] کی شخصیت کا ایک سب سے بڑا پہلو یہ تھا۔ کہ خود [illegible] ہو گئے۔ [illegible] ہر بات کا [illegible] تھا جیسے بچے [illegible] شوکت صاحب [illegible] ہوتے ہیں۔ لیکن جب صحت خطرناک قسم کی بیماری کی جھلک شروع ہوئی۔ [illegible] گھبرائے۔ [illegible] مجھے بات فرمائی۔ کہ [illegible] لیکن یہ [illegible] بات [illegible]۔ بس مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے فکر [illegible] پوچھا: [illegible] کی صحت کا [illegible] لگے: "آپ بھی خوب ہیں [illegible] رنگ کی [illegible] دوسرا [illegible] نہ ہو۔

احمد سلمان صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان۔ [illegible] نے کراچی میں نئی کوٹھی [illegible] لی تھی۔ انھوں نے دو ایک بار فرمائش کی۔ کہ کسی اچھی سی نرسری سے گلاب کے پودے کراچی بھجوا دوں۔ میں اسی فکر میں تھی کہ کوئی جان پہچان والا کراچی جا رہا ہو۔ تو ان کے ہاتھ پودے روانہ کر دوں۔ کہ ایک دن [illegible] کی صاحبزادی اور میری عزیزہ بہن [illegible] کا خط پہنچا۔ [illegible] شوکت صاحب کو [illegible] گلاب کی جس قدر اچھی قسمیں مل سکیں۔ ان کے [illegible] ہم دونوں [illegible] خصوصاً کالے گلاب کے [illegible] واپس کراچی جاتے ہوئے [illegible] لاہور ٹھہریں گے۔ واپسی کی تاریخ اور ٹرین سے [illegible] مطلع کر دوں گی۔ پودے انھیں لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیئے جائیں۔ [illegible] خط [illegible] ہم دونوں کو [illegible] خط پہنچتے ہی شوکت صاحب کا فون آیا کہ میں ان سے فوراً ملوں۔ تاکہ لاہور کی تمام نرسریوں کو کھنگالا جائے۔ اور اچھے سے اچھے گلاب کے جو پودے دستیاب ہو سکیں۔ وہ فراہم کئے جائیں۔ سارا دن ہم دونوں تلاش میں مارے مارے پھرے۔ جس نرسری پر جا کر "کالے گلاب" کے پودے طلب کریں۔ نرسری والے ہمارا منہ دیکھیں۔ گویا ہم سے کوئی ایسی چیز طلب کی جا رہی ہے جس کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ کالے کے علاوہ باقی جس قدر قسمیں ممکن ہو سکتی تھیں ہم نے حاصل کر لیں۔

سلمان صاحب قبلہ تو میرے بے انتہا شفیق بزرگ تھے۔ انھیں سمجھایا جا سکتا تھا۔ لیکن زرینہ سے نمٹنا آسان نہ تھا۔ ایک طرف وہ میری عزیزہ بہن تھیں تو دوسری طرف شوکت صاحب کی لاڈلی بھتیجی۔ میں نے شوکت صاحب سے کہا۔ کہ "آپ کی اور میری دن بھر کی دوڑ دھوپ رائیگاں گئی۔ زرینہ بڑی نٹ کھٹ ہیں۔ اچھے سے اچھے جس قدر پودے

[illegible] سے حاصل کیا ہے [illegible] شوکت صاحب نے [illegible] تم [illegible] پوچھ [illegible]

کہا کر شوکت صاحب [illegible] وقت مقررہ پر ہم دونوں [illegible] پہنچ گئے [illegible] کا ذکر کیا [illegible] جواب دیا [illegible] شوکت صاحب [illegible] ہم آپ سے [illegible] جب شوکت صاحب [illegible] شوکت صاحب [illegible] کہاں [illegible] کی شکایت رفع ہو گئی۔

شوکت صاحب کی مزاجی خصوصیت کا ایک دوسرا پہلو یہ دیکھا۔ دوسروں کے کام آنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لوگوں کی سفارشیں کرتے رہتے ہیں۔ [illegible] ان کی ذات سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ بہت سے ضرورت مند انھیں جانتے تھے کسی دفتر میں چلے جاتے۔ [illegible] شوکت صاحب انھیں بھیج دیتے اور ان کا کام نکال لیتے۔ لیکن خود اپنی ذات کے لیے انھوں نے کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کیا۔ ریڈیو کی ملازمت چھوڑنے اور اخبار "جنگ" سے منسلک ہونے کے بعد لاہور میں ان کے لیے ایک بہت اچھی [illegible] سرکاری ملازمت حکومت کے پیش نظر تھی۔ [illegible] آنے کا [illegible]۔ انھوں نے فوراً شوکت صاحب کو بلایا [illegible] ملازمت کی پیش کش کی۔ ساتھ ہی مشورہ دیا۔ کہ وہ متعلقہ منسٹر اور حکام سے مل کر زبانی بات چیت کر لیں۔ شوکت صاحب ان سے یہ کہہ کر رخصت ہوئے۔ کہ وہ فوراً منسٹر صاحب سے ملتے ہیں۔ لیکن اس سے ملنے کے بجائے سیدھے [illegible] اسٹیشن پہنچے۔ اور کراچی کا رخ اختیار کیا۔

۵۴ء کی مارچ میں محمود نظامی صاحب مرحوم لاہور ریڈیو اسٹیشن کے ریجنل ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی طبیعت میں بھی بلا کی شوخی تھی۔ پھبتی کسنے اور فقرہ چست کرنے میں کسی سے کم نہ تھے۔ ہم دونوں کے حلقے میں نظامی صاحب بھی شامل ہو گئے۔ اور ہمارا یہ اتحاد ثلاثہ اگست ۵۶ء تک قائم رہا۔ شوکت صاحب اور نظامی صاحب کھانے کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ادھر شام ہوئی۔ اُدھر ہم تینوں اور اُن دونوں کی بیگمات [illegible] کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ کسی نے بتایا۔ کہ چونے منڈی کی کسی دکان پر کباب بہت اچھے بنتے ہیں۔ تو ہم سب بلا سوچے سمجھے اُدھر روانہ ہو گئے۔ دہلی دروازے کے اندر داخل ہو کر معلوم ہوا۔ کہ بازار میں کار نہیں جا سکتی۔ تو اسے کسی مناسب جگہ پارک کر کے ہم تینوں پیدل چل کھڑے ہوئے۔ دکان پر پہنچ کر گرم گرم کباب پلیٹوں میں رکھواتے اور کار کا رخ کرتے۔ کباب کی [illegible] رفع کرنے کو کسی مشہور حلوائی کی دکان کا سہارا لیتے۔

اسی زمانے میں رمضان بھری گرمیوں میں جون کے مہینے میں آیا۔ ہم تینوں نہایت پابندی سے روزہ رکھتے۔ دو چار دنوں کے بعد گرمی کی شدت حیرت [illegible] تھی۔ شکر ہم تینوں بڑی بڑی کوٹھیوں میں تھے۔ کمرہ [illegible] میں بارش کا پہلا قطرہ گرنے کی اور دیر تھی [illegible] کی شدت کریں مگر تینوں ہی ہٹ کے پکے تھے ثابت کہ روزہ رکھتے رہے اور رمضان شریف گزر رہا۔ گرمیوں کے روزوں میں صبح سے ایک بجے کا وقت تو جوں توں دفتری کام و فیات میں گزر جاتا۔ لیکن دو بجے سے افطار تک کا وقت سر ڈالنے کے مترادف ہوتا۔ جانے ہم میں سے کس نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ روزانہ سہ پہر کو میٹنی شو دیکھا جائے۔ تجویز کا پیش ہونا تھا۔ کہ وہ منظور ہو گئی۔ اور اگلے ہی دن سے نہایت پابندی اور باقاعدگی سے اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔ ادھر گھڑی نے تین بجائے ادھر ہم تینوں اور ان دونوں کی بیگمات نے سینما کا رخ کیا۔ مجھے اس سے غرض نہ تھی۔ مقصد صرف وقت گزارنا تھا۔ فلم اچھی ہو یا بری لطف اندوز ہو گئے۔ مزا آیا تو دیکھ کر۔ ورنہ سو کر وقت گزار دیا۔ گھر آتے آتے افطاری کا وقت ہو جاتا تھا۔

افطار کے بعد تھکن اور گھٹن کا احساس ہوتا۔ اسے رفع کرنے کو بھی ڈرائیو اور سیر و تفریح کا سہارا لیا۔ نظامی صاحب نے کولمبس بن کر۔ جانے کیسے ڈھونڈ نکالا کہ وہاں سنگھ کالج کے دروازے کے پاس [illegible] نکڑ پر ایک آئس کریم بیچنے والا اپنی دوکان ایک ریڑھی پر ہر شام سجاتا ہے۔ بقول نظامی صاحب کا یہ ہر لحاظ سے آئس کریم سب سے اچھی اور سب سے سستی تھی۔ یہ معلوم ہونے کی دیر تھی۔ کہ ہم پانچوں نے ہر شام وہاں دھاوا بولنا شروع کر دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ آئس کریم اچھی بھی تھی اور سستی بھی۔ لیکن نہ جانے وہ اس میں ہر روز ایک ہی ایسنس ڈال دیا کرتا تھا کہ مزا روزانہ یکساں ہوتا۔ شوکت صاحب کہتے تھے یہی بات مسلم گرلس یونیورسٹی کے ہوسٹل کے کھانے میں تھی۔ مرغی سے لیکر ہر موسمی سبزی تک گوشت میں پکتی تھی۔ لیکن کھانے میں مطلق فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔

جب روزانہ ایک ہی طرح کی آئس کریم کھا کھا کر تنگ آ گئے۔ تو ہم نے آئس کریم والے سے کہا۔ کہ "بھئی آم کی آئس کریم کیوں نہیں بناتے"۔ لیکن وہ ٹالتا رہا۔ غالباً اس لیے کہ آموں کا سیزن شروع نہ ہوا تھا۔ اور وہ خاصے مہنگے تھے۔ ایک دن جو ہم پہنچے۔ تو آئس کریم کھا کر واقعی بہت لطف آیا۔ اسے داد دی اور اس سے پوچھا: "اس میں خاص بات کیا ہے؟" وہ بولا: "صاحب آج میں نے اس میں بہت سے آم "گیرے" ہیں"۔ شوکت صاحب برجستہ بولے۔ "نظامی صاحب۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام کی مثل کا مفہوم دراصل آج سمجھ میں آیا"۔ شوکت صاحب کو اس کے "گیرے" کہنا بہت پسند آیا اور سچ پوچھیے تو آئس کریم سے زیادہ وہ اس اصطلاح سے لطف اندوز ہوئے۔ عرصے تک ہم [illegible] ملانے یا ڈالنے کے مفہوم کو "گیرے" ہی کہتے رہے۔

ہم تینوں کی دوستی اور قرب لوگوں کے لیے حیرت کا موجب تھی۔ خصوصاً ان دونوں سے میری قربت۔ کہ میں نہ ان کا ہم عمر۔ نہ ان دونوں کی طرح علم و ادب کی دنیا میں میرا نام۔ بہر حال دوستی تھی۔ اور دونوں کے آخری دم تک قائم رہی۔ اب آپ انہیں میرے بزرگ نما دوست یا دوست نما بزرگ، کچھ ہی سمجھ لیجئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں۔ ان کی بیگمات۔ ان کے بچے۔ ان کے بزرگ سب کے سب مجھے "بھائی" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میں جگت بھائی کیونکر بن گیا

[illegible] نہ ہو سکا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ شوکت صاحب [illegible] بہت [illegible] کی بات پر مجھے [illegible] انگریزی [illegible] شوقین [illegible] مجھے [illegible] جلد [illegible] مجھے [illegible] بہت اچھے [illegible] مگر [illegible] مجھے [illegible] شوکت صاحب [illegible] شوکت صاحب [illegible] مجھے [illegible]

شوکت صاحب کی [illegible] گئے تو [illegible] بہت [illegible] مجھے [illegible] جاتے اکثر [illegible] صاحب کی [illegible] [illegible] سیکرٹری [illegible] ان کی تصویر بنائے [illegible] میری تصویر [illegible] شوکت صاحب [illegible] تصویر [illegible] دوسرے جو لوگ صفائی کا خیال نہیں رکھتے انہیں [illegible] عبرت دلانا [illegible] ان کی [illegible] یہ بات بالکل درست تھی۔ لنڈن کی صورت میں بکھرے ہوئے بال۔ حلیہ [illegible] ترچھی ہوئی داڑھی۔ چہرہ اور بال گندے [illegible] ہوئے۔ نہایت لحیم شحیم۔ اس پر ایک نہایت موٹا کمبل اوڑھے بیٹھے۔ [illegible] کے بجائے وہ صاحب خود بھی بے اختیار ہنس پڑے۔ اور سامعین کی ہنسی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

شوکت صاحب نے ڈنر سوٹ بھی بنوا رکھا تھا۔ لیکن بیچاروں کو اس کے استعمال کا موقع بہت کم ملتا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ایسے پُرتکلف ڈنر بہت کم ہوتے۔ جہاں ڈنر جیکٹ کی پابندی ہوتی۔ لہذا شوکت صاحب اسے سال میں ایک مرتبہ پہننے کا موقع ضرور نکال لیتے۔ دو تین سال ہمارا یہ معمول رہا۔ کہ ۳۱ دسمبر کی رات کو شوکت صاحب ڈنر سوٹ زیب تن کرتے۔ اور ہم دونوں ریلوے کے برٹ انسٹی ٹیوٹ جاتے اور وہاں نئے سال کی آمد مناتے۔ ان کی تفریحات بہت معصوم قسم کی تھیں۔ دو تین گھنٹے کے لیے ڈنر سوٹ پہنتے۔ بو باندھتے۔ رات کے ساڑھے بارہ ایک بجے تک برٹ کے ہال میں دوسروں کو ناچتے۔ شراب پیتے۔ اودھم مچاتے اور گرتے پڑتے دیکھ کر خوش ہو جاتے۔

ماہِ گذشتہ میں ایک دن میں شوکت صاحب سے ملنے گیا کہ ان سے اپنے رسالے "پھول" کو چلانے کے سلسلے میں مفید مشورے لوں۔ شوکت صاحب نے نہ صرف بہت سے مفید مشورے دیے بلکہ اس کے ساتھ ہی ہر ماہ مضمون لکھنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ اس کی کتابت اور طباعت کا پروگرام پوچھا کہ کس دن تک مضمون مل جانے سے رسالہ بروقت چھپ سکتا ہے۔ [illegible] آخر میں آ وہ تھا۔ کہ ان میں سے جو قابلِ قبول ہو ایسے مضمون دوں گا میں لاؤں گا۔ لیکن تب [illegible] نے مضمون لکھنے کی پیشکش کی۔ وہ صاف بات ہے میں [illegible] ان کے متعلق دوسروں کا علم نہ رہے۔ [illegible] کے مصروف ہیں وہ "مشتاق" کا اداریہ اور جب [illegible] لیے اپنے عزیز تر دوستوں کے لیے بھی نہیں لکھتے۔ "پھول" بچوں کا رسالہ تھا۔ اس کے محدود وسائل میں مضمون کا معاوضہ چھپوا دینے کے بعد ان کے شایانِ شان معاوضہ دینا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اس سے پہلے کسی کو جا کر [illegible] کسی خاص نمبر کے لیے میں نے ان سے فرمائش کی تھی۔ تو انھوں نے [illegible] کرم [illegible] مضمون میرے حوالے کر دیا۔ اب جو انھوں نے باقاعدگی سے لکھنے کی حامی بھری تو مجھے [illegible] مناسب بھی معلوم ہوا۔ کہ انھیں یاد دہانی کراؤں۔ خود اس درجہ مصروف انسان ہیں۔ کہ خود ان کی طرف سے یاد رکھنے کی توقع نہیں ہو سکتی۔

میں نے مضمون کے لیے جو آخری دن انھیں بتایا تھا۔ اس دن دوپہر کو ریڈیو اسٹیشن سے ان کا فون آیا۔ کہاں غائب ہو۔ تمھاری امانت رکھی ہے۔ اگر میرے [illegible] مجھے [illegible] یاد [illegible]۔ کہ اس امانت سے ان کی مراد مضمون ہے۔ میں کچھ مصروف تھا۔ ان سے کہا۔ کل دوں گا۔ لیکن انھوں نے تاکید کی کہ شام کو ضرور گھر آؤ۔ شام کو ان کے گھر پہنچ گیا۔ جاتے ہی انھوں نے اپنے بیگ (جو ان کے [illegible] کی حیثیت رکھتا۔ اور ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا) میں سے "پھول" کے چند صفحوں کا مضمون نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے ان کا [illegible] سمجھ کر شکریہ ادا کیا۔

اگلے دن خوشنویس کو کتابت کے لیے دیتے وقت جو دیکھتا ہوں تو آخر میں "باقی پھر" لکھا ہے۔ اگلے ہفتے اس مخصوص دن پھر میں نے ان سے ملنا چاہا [illegible] لیکن ان کا فون آیا۔ اور انھوں نے پھر بلایا۔ اور مضمون کی دوسری قسط میرے حوالے کی۔ جب مسلسل تین چار قسطیں شائع ہو گئیں۔ تو ایک دن ہمت کر کے میں نے معاوضے کی بات چھیڑی۔ آپ کہنی تھی کہ وہ ایکدم برافروختہ ہو گئے کہ "اگر معاوضے کو مضمون لکھانا ہے۔ تو لاہور میں بے شمار لکھنے والے پڑے ہیں۔ ان سے لکھواؤ۔ صاحبزادے۔ کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے پیسے کی بات کی تو میں مضمون لکھنا بند کر دوں گا۔

اور گذشتہ اگست سے پہلے تک شوکت صاحب بہت پابندی اور باقاعدگی سے "پھول" کے لیے ہر ماہ مضمون لکھتے رہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مصروفیت کے سبب دن میں انھیں لکھنے کا موقع نہ ملا۔ اور آخری دن سر پر آ گیا۔ چونکہ تکلف تو درمیان سے اٹھ چکا تھا۔ لہٰذا میں انھیں مضمون لکھنا یاد دلاتا۔ ریڈیو اسٹیشن سے "قاضی جی" کا پروگرام ختم ہونے کے بعد مجھے شام کو اپنے ساتھ گھر لے جاتے۔ وہاں جا کر مجھے اپنی بیگم اور بچوں کے پاس بٹھا دیتے اور خود دوسرے کمرے میں چلے جاتے۔ میں سمجھتا ممکن ہے کپڑے تبدیل کرنے گئے ہوں۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر یہ تازہ تازہ

[illegible] بھی شامل تھے۔ ادارہ میں [illegible] میں مجھے [illegible] لکھ چکے تھے۔

یہ مضمون ایک ہی نشست میں [illegible] بزرگوں کا خاص [illegible] تاریخ سے ڈائری لکھنا شروع کر دی تھی [illegible] شوکت صاحب [illegible] کوئی ڈیڑھ سال تک [illegible] ریڈیو پاکستان [illegible]

اگر شوکت صاحب [illegible] متوقع طور پر انھیں [illegible] مضمون لکھنے نہ پاتے [illegible] چلول کی کوئی ساعت ان کے مضمون سے [illegible]

[illegible] سے قربت میں [illegible] جیسے [illegible] مضمون نویسی کی ابتدا کی [illegible] نظامی صاحب مرحوم کو ایک دن مجھے بیٹھے [illegible] فون کر کے فوراً دفتر پہنچنے کو کہا۔ اور میرے سامنے ایک اسکیم پیش کی۔ [illegible] ریڈیو [illegible] کی چیدہ چیدہ تقریروں اور [illegible] مضامین سے مرتب ایک رسالہ نکالا جائے۔ شوکت صاحب اس کے ایڈیٹر ہوں [illegible] اس کا ناشر ادارہ خود نظامی صاحب اس رسالے اور ریڈیو پاکستان کے درمیان رابطہ افسر ہوں۔ شوکت صاحب نے اسی وقت اس کا نام "جوہر" تجویز کر دیا۔ اسی دن محترم ذوالفقار بخاری صاحب کو تمام روداد لکھی گئی۔ چند دنوں بعد بخاری صاحب کا جواب آیا کہ "خیال اچھا ہے۔ عنقریب لاہور آ رہا ہوں۔ مزید مشورہ اس وقت ہوگا۔" لیکن بخاری صاحب لاہور جلد نہ پہنچ سکے اور اس طرح یہ اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔

راولپنڈی میں میرے اور شوکت صاحب کے ایک مشترکہ دوست عطاء اللہ سنگ ہیں۔ فوج میں تو ان کا عہدہ میجر کا ہے۔ لیکن علم و ادب کے میدان میں اگر فیلڈ مارشل نہیں تو کم از کم انھیں میجر جنرل ضرور کہا جا سکتا ہے۔ خود مضمون نہیں لکھتے بلکہ اچھے مضمون کی دل سے قدر کرتے اور داد دیتے ہیں۔ خود شعر نہیں کہتے لیکن اچھے شعر سن کر پھڑک اٹھتے ہیں۔ ۵۳ء سے ۵۸ء تک انھیں ہر سال دورہ پڑتا۔ اور یہ راولپنڈی میں مشاعرہ کرتے۔ مشاعرہ کیا اچھا خاصا میلہ برپا ہوتا تھا۔ کئی نشستوں پر مشتمل۔ ایک غزل کی محفل ہے۔ تو دوسری نشست نظم کی۔ پھر ایک محفل مزاحیہ شاعری کی۔ ایک نشست افسانے کی۔ اور آخر میں ایک تنقیدی محفل۔

فتان صاحب لاہور میں کے نمائندہ مقرر کر رکھا تھا۔ جب تاریخ قریب آئی۔ تو میں مجھے چند [illegible] اور میں ان کی طرف سے شعرا سے ربط قائم [illegible] ان سے [illegible] راولپنڈی سے جاتا۔ وہ میں ان خوب ہوا [illegible] گزرے [illegible] ہوں۔ کہ بات [illegible] سامنے۔ سو ناقم تھا۔ ساری بات [illegible] [illegible] جائل۔

۱۹۵۰ء میں [illegible] جگر صاحب مرحوم بھی لاہور آئے ہوئے تھے۔ فتان صاحب ان کو [illegible] اور ان کی محفل میں [illegible] کہ جگر صاحب، شوکت صاحب، ڈاکٹر عبادت [illegible] راولپنڈی [illegible] کی محفل سے فارغ ہو کر ہم سب [illegible] گزر [illegible] جیسے [illegible] ہی چل پڑے [illegible] فتان صاحب [illegible] کیا۔ بیگم شوکت بھی ساتھ تھیں۔ [illegible] جہلم [illegible] گھنٹوں کا فاصلہ کر [illegible] چار بجے [illegible] ہوا۔ [illegible] بہت [illegible] تھی۔ [illegible] خرابی پیدا [illegible] ہو گیا۔ [illegible] پیچھے [illegible] رات کے [illegible] گئے۔ ورکشاپ سب کی سب بند ہو چکی تھیں۔ ایک صاحب [illegible] گھر سے بلا کر کار درست کرائی۔ [illegible] آگے [illegible] ہو لیے۔ لیکن وہ درستی وقتی ثابت ہوئی۔ کھاریاں [illegible] میں پھر خرابی پیدا ہوئی۔ [illegible] جو جیپ [illegible] راستے آیا [illegible] رک پڑا [illegible] پانی [illegible] دیا۔ اور کار اس وقت تک [illegible] چل سکتی تھی جب تک [illegible] پانی ٹھنڈا [illegible] ہو جاتا۔ [illegible] ہمارے منتظر۔ اگر صرف میں اور عبادت صاحب ہوتے۔ تو [illegible] میں جتنے چاہتے گزارتے۔ لیکن [illegible] کے ساتھ جگر صاحب، شوکت صاحب۔ بیگم شوکت اور بچیوں کا خیال آتا۔ کہ بے چارے کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ میں اور عبادت صاحب جگر صاحب سے معذرت کرتے۔ تو جگر صاحب ہر دفعہ یہی کہتے۔ کہ اس منظر اور اس سفر سے وہ ہم دونوں سے بھی زیادہ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اتفاق کہ رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے پیچھے سے کسی کار کی روشنی دکھائی دی۔ ہم نے اسے ٹھہرایا۔ شکر ہے کار بالکل خالی تھی۔ ڈرائیور کی منت سماجت کی۔ کہ وہ جگر صاحب، شوکت صاحب اور بچیوں کو راولپنڈی تک ساتھ لے جائے۔ ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔ عبادت صاحب اور یہ جان۔ گھنٹے بھر بعد کار کا انجن ٹھنڈا ہوا۔ تو ہم نے پھر سفر شروع کیا۔

ادھر شوکت صاحب نے راولپنڈی پہنچ کر جو فتان صاحب کو بتایا۔ کہ ہم اس پریشانی میں گھرے راستے میں ہیں۔ تو وہ بیچارے رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے کسی دوست کی کار مانگ کر ہمیں لینے جہلم کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم گوجر خان سے ذرا آگے پہنچے ہوں گے کہ سامنے سے ایک کار آتی نظر آئی۔ کراس کرنے کے خیال سے جو دونوں کاریں آہستہ کی گئیں تو دیکھا فتان صاحب بیٹھے ہیں۔ گویا گھنٹے بھر میں ہم لوگ بخیریت راولپنڈی پہنچ گئے۔

اگلے روز دن میں محفل جمی۔ نہ جانے اس محفل میں کیا بات شوکت صاحب کو ناگوار گزری۔ کہ ایک دم ان کا موڈ بگڑ گیا۔ مغرب کے قریب ایک مخصوص نشست ہوئی۔ لیکن شوکت صاحب اس میں شریک نہ ہوئے۔ رات کو فتان صاحب نے

[illegible] میں ایک بہت شاندار [illegible] ہوئے۔ [illegible] صاحب کی کوٹھی [illegible] گئے۔ ممتاز صاحب کی کوٹھی [illegible] بیٹھے [illegible] صاحب [illegible] پہنچا ہوں۔ [illegible] ہیں۔ [illegible] دیکھا۔ [illegible] بیٹھی [illegible] قصد تھا [illegible] کہ کسی طرح [illegible] روانہ ہو گئے

لیکن شوکت صاحب [illegible] واپس ہو جاتے ہیں۔ [illegible] بعد ممتاز صاحب [illegible] شوکت صاحب کی [illegible] شوکت صاحب [illegible] ایک [illegible] ممتاز صاحب [illegible] گئے [illegible] ہے۔

مجھے چار دن بعد [illegible] سے واپس آیا۔ شوکت صاحب ملے [illegible] پوچھنے لگے کہ آپ نے [illegible] واپسی میں [illegible] بہت تنگ نہیں [illegible] جلسے [illegible] موڈ [illegible] نے پریشان کیا۔ واپسی پر آپ کا موڈ بگڑ گیا [illegible] بالکل ٹھیک [illegible] مجھے بہت خوشی ہوئی۔

مضمون یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شوکت صاحب کی [illegible] یاد آ گیا۔ غالباً [illegible] کی جنوری [illegible] مرحوم نے [illegible] ایک مسلسل ناول [illegible] سے نشر [illegible] پروگرام [illegible] جاری رہا۔ اور اس سلسلے کی کوئی چالیس قسطیں باقاعدگی سے ہر ہفتے نشر ہوئیں۔ شوکت صاحب نے اس کے مرکزی کردار کے لیے مجھے منتخب فرمایا۔ پروگرام کے وقت سے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہم ریہرسل کرنے جمع ہو جاتے تھے۔ ایک دن جو ہم پہنچے تو معلوم ہوا وہ ایک آرٹسٹ موجود نہیں۔ اگر کوئی آرٹسٹ وقت کی پابندی نہ کرتا تو شوکت صاحب جھنجھلا جاتے اور ان کا موڈ بگڑ جاتا۔ [illegible] ان کی اپنی اصلی حالت پر واپس لانے کو باقی آرٹسٹ باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ [illegible] کا دھیان ادھر سے ہٹ جائے۔ میری جو شامت آئی تو میں نے یوں ہی برسبیل تذکرہ ایک خاتون کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور بتایا کہ عجیب اتفاق ہے کہ مختلف اوقات میں ان کے جن مختلف اصحاب سے تعلقات رہے۔ وہ سب کے سب "حمید" نام کے تھے۔ میری اس "تحقیق" پر آرٹسٹ حیران سے ہوئے۔ کہ واقعی ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا خیال تک نہ آیا تھا۔ شوکت صاحب پروگرام کی طرف سے فکر مند تھے۔ آرٹسٹ پہنچے نہ تھے۔ لہذا انھوں نے میری بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ ایک ڈرامہ آرٹسٹ نے ان کی توجہ جو میرے اس "انکشاف" کی طرف دلائی۔ تو ان کا موڈ ایک دم درست ہو گیا۔ مجھے داد دی۔ اور باقی لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: "اس انکشاف کا حق انھیں نہیں۔ تو اور کسے پہنچتا۔ بات یہ ہے کہ بھائی جان یعنی ان کے والدِ محترم کا نام بھی تو حمید علی ہے۔ صاحبزادے کو فکر یہ لاحق ہوئی ہوگی کہ نگاہِ انتخاب کہیں ان

پہلے پڑھے شان دار کلمات کہہ کر مقتدیوں سے کہہ اٹھے ۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ شوکت صاحب زیادہ تر زبانی جمع خرچ نہ کرتے تھے بلکہ اس کے ساتھ ہی امداد بھی کر دیا۔ جو عرصہ گزر جاتا تو انھیں ایک عجیب سی بے چینی اور بے کلی محسوس ہوتی تھی۔ ایک دو سو صاحب کو عملی مدد کرنے کا موقع مل گیا۔ اور یہ موقع بہم پہنچایا ایک قاری صاحب نے۔ بدقسمتی سے ملازمت سے ان سے ملنے رحیم یار خان سے پہنچ گئے۔ شوکت صاحب انھیں مولانا کہہ کر لیتے تھے۔ حضرت آج کدھر سے آپ کا گزر۔ آپ ہی کو یاد کر رہا تھا۔ بلکہ سوچ رہا تھا کہ میرا بھی جی کرتا ہے کہ چلوں۔ مولانا چائے سے فارغ ہو کر اٹھے تو پوچھنے لگے "حضرت آج یہ شوکت صاحب ہی کیسے یاد آ گئے۔" شوکت صاحب بولے "ہوا یہ۔ رات ایک کھانے پر ریلوے کے جنرل مینجر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں کہا کہ صاحب پاکستان اسلامی ملک ہے۔ روزے کا انتخاب یہاں بھی نہ رکھا گیا۔ تو کہاں رکھا جائے گا۔" جنرل مینجر صاحب بڑے خوش ہوئے۔ کوئی عملی اسکیم آپ کے ذہن میں ہو تو بتائیے۔ میں نے اسی وقت جواب دیا کہ صاحب ملک بھر کے سٹیشنوں پر مساجد ہوں۔ ایک کمیٹی بنا دیجئے کم از کم ایک ہیڈ امام اور دس بارہ امام ہوں۔ بس اتنا ہی۔ جنرل مینجر صاحب کے دل کو یہ بات لگی۔ اور انھوں نے وعدہ کیا وہ بہت جلد یہ اسکیم تیار کر کے منظوری کے لیے مرکزی حکومت کو بھیج دیں گے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے میں ہیڈ امام اور نائب اماموں کے نام تجویز کر دوں۔ ظاہر ہے آپ جیسے عالم اور خوش الحان قاری کے ہوتے مجھے کسی اور کا نام کیسے تجویز کر سکتا تھا۔ مولانا اب یوں کیجئے کہ فوراً ریلوے کے ہیڈ کوارٹر آفس چلے جایئے اور جنرل مینجر صاحب سے مل لیجئے۔ بالکل تازہ معاملہ ہے۔ بڑے افسر ہیں۔ زیادہ عرصہ گزر گیا تو انھیں شاید یاد نہ رہے گا۔" مولانا بہت خوش ہوئے۔ فرمانے لگے "جنرل مینجر صاحب کو فون کر دیجئے۔ وہ اجازت دیں تو میں فوراً چلا جاتا ہوں۔" شوکت صاحب نے یوں ہی ٹیلیفون کا کوئی فرضی نمبر ملا دیا۔ دیر تک گھنٹی بجی۔ کسی نے فون کا رسیور نہ اٹھایا تو شوکت صاحب نے پرس میں سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا۔ اور کہنے لگے "مولانا۔ وقت بہت کم ہے۔ ذرا دیر میں دفتر بند ہو جائے گا یہ لیجئے کارڈ۔ اس پر لکھے دیتا ہوں کہ میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ بس تشریف لے جائیے۔ دیر نہ ہو جائے۔"

چلچلاتی دھوپ۔ شدید گرمی کا زمانہ۔ دوپہر کا بارہ ساڑھے بارہ کا عمل۔ قاری صاحب نے اپنی سائیکل اٹھائی اور سیدھے ریلوے ہیڈ کوارٹر آفس پہنچ گئے۔ جنرل مینجر صاحب کو کارڈ بھیجا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ شوکت صاحب کی طرف سے کوئی صاحب آئے ہیں۔ انھوں نے فوراً مولانا کو اندر بلا لیا۔ بہت تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ پوچھنے لگے "فرمائیے قاری صاحب۔ کیسے آنا ہوا۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" قاری صاحب نے چھوٹتے ہی ان جیسے دردمند اور فرض شناس افسر کی تعریف شروع کر دی۔ فرمانے لگے "صاحب۔ اب اسلام کہاں رہ گیا۔ آپ جیسے پرانی قدروں کو سمجھنے والے چند حضرات اس ملک میں ہیں۔ جن کے دم قدم سے اسلام باقی ہے۔ ورنہ یہاں تو بیشتر افسر وہ مسلمان ہیں جنھیں نہ نماز پڑھنی آئے نہ روزہ رکھیں۔" جنرل مینجر صاحب ذرا چکرائے۔ کہ ان سب باتوں کا محل کیا موقع۔ فرمانے لگے "مولانا دفتر بند ہونے کو ہے۔ ابھی مجھے چند ضروری فائلیں دیکھنی ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو

[illegible] آغا صاحب مرحوم [illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible] بہت اچھی ہوئی تھی [illegible] مرحوم [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] فرمائی [illegible] شوکت صاحب [illegible] صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible] صاحب [illegible]

مختار بیگم [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] سال [illegible] مجھے [illegible]
[illegible] کھانے کے بعد [illegible]
[illegible] مجھ سے فرمائش [illegible] مشہور [illegible]
شوکت صاحب مختار بیگم [illegible]
[illegible]
[illegible]
رضامند ہو گئیں۔ حکیم صاحب [illegible]
[illegible]

کھانے سے فارغ ہو [illegible]
ان کا گلا بھی اس قابل نہ تھا۔ تاہم بہت اصرار کے بعد آغا حشر مرحوم کی [illegible] رضامند ہو گئیں۔
حشر کا کلام۔ اس پر مختار بیگم [illegible] غزل [illegible] بند ہو گیا۔ آغا صاحب
کی غزل کا مطلع تھا ؂

میں بدگماں نہیں ہوں [illegible] قریب سے
[illegible] مجھ کو نہیں ہے [illegible] سے

جب یہ غزل ختم کر چکیں تو شوکت صاحب جو اُن کے بالکل قریب بیٹھے تھے بولے: "مختار بیگم۔ غزل کا ایک مصرع تو آپ بھول ہی گئیں"۔ وہ بہت حیران ہوئیں۔ اور پوچھنے لگیں: "کون سا مصرع؟" شوکت صاحب نے فی البدیہہ فرمایا ؂

"پہلے دوا گلے کی تو لے لو طبیب سے"

آغا صاحب کی غزل کی زمین میں یہ مصرع یوں محسوس ہوا۔ گویا انگشتری میں نگینہ۔ شوکت صاحب سے ذرا فاصلے پر میں بیٹھا تھا۔ میں نے عمر بھر کبھی شعر نہ کہا تھا۔ نہ جانے اُس وقت ایک مصرع کیسے سوجھ گیا۔ میں نے کہا: "شوکت صاحب یہ تو پورا شعر تھا۔ مصرع ثانی تو آپ نے یاد دلا دیا۔ مصرع اولیٰ غالباً آپ بھی بھول گئے"۔ شوکت صاحب حیرانی

سے پوچھا: "بھئی وہ کون سا مصرع ہے۔ [illegible]" میں نے فوراً عرض کیا کہ ؎

شوکت نے دی ہے مجھے دعوت

یہ سننا تھا۔ کہ شوکت صاحب ایک دم اچھل پڑے۔ بہت داد دی اور فرمانے لگے: "آپ کی یہ چہلیں تو گویا شعر بن گئے ہیں"۔ پھر اس شعر کو خود پڑھتے رہے ؎

شوکت نے دی ہے مجھے دعوت
پہلے دو [illegible] کی [illegible] طبیعت

محفل میں جو حضرات بیٹھے تھے۔ ان سب نے بھی دل کھول کر داد دی۔ شوکت صاحب داد دینے میں بخل سے کام نہ لیتے تھے۔ دوسرے شعراء سے کوئی اچھا جملہ مل جاتا۔ کوئی اچھا شعر سنتے۔ تو پھڑک اٹھتے۔ فرمانے لگے۔ "صاحب! آپ کی طبیعت شعر کہنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ شعر کہا کیجئے"۔ لیکن وہ دن اور آج کا دن۔ پھر شعر نہ کہا۔ ہاں اس سے دلچسپی ضرور ہے۔ برے بھلے شعر میں تمیز کر لیتا ہوں۔ وہی مضمون کہ ؎

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

غالباً یہ ان احباب کی صحبت کا فیض تھا۔ کہ میرا دماغ بھی شعر و شاعری کی طرف چل نکلا تھا۔

مشاعروں کا ایک خاص موسم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں لاہور، لائل پور، راولپنڈی اور ملتان میں مشاعرے وبائی صورت میں منعقد ہوتے۔ ہر جگہ سے شعراء ان میں حصہ لینے آتے۔ ایسے موقعوں پر شوکت صاحب کے یہاں جو محفلیں ہوتیں۔ جگر صاحب۔ سید محمد جعفری۔ ظریف جبلپوری۔ شاعر دہلوی۔ ادیب سہارنپوری۔ سحاب قزلباش۔ زہرہ نگاہ۔ [illegible] ہنکوی سب کے سب شوکت صاحب کے ہاں جمع ہوتے۔ ان میں سے بعض حضرات سے مجھے یوں تو نیاز حاصل تھا۔ لیکن قربت شوکت صاحب ہی کی وجہ سے ہوئی۔ شام کو ان کے یہاں چلا جاتا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے شام کے دھندلکے رات کی تاریکی میں ڈھل جاتے۔

مجھ سے زیادہ لوگوں کے لیے اور لوگوں سے زیادہ خود میرے لیے یہ بات حیرت کا موجب بنی رہی۔ کہ میری اور شوکت صاحب کی دوستی اور قربت میں کیا قدر مشترک ہے۔ دوسروں کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایک تو جب بھی میں ان سے ملا۔ میں نے حفظِ مراتب کا خیال رکھا۔ دوسری بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ انھیں مجھ سے کسی قسم کی "کینہ" یا رقابت" کا اندیشہ کبھی نہ ہوا۔ اپنے ہم عصر ادیب اور شاعر دوستوں سے وہ بظاہر ہنس بول کر ملتے۔ لیکن نفسیاتی طور پر ان کے تحت الشعور میں یہ بات ضرور رہتی۔ خدا نہ کرے اس سے میری مراد یہ نہیں۔ کہ وہ منافقانہ طور پر اپنے دوستوں سے ملتے تھے۔ میں نے انھیں اس عالم میں بھی دیکھا ہے۔ کہ اپنے ہم عصروں میں سے کسی بہت کم عمر شاعر نے کوئی اچھا شعر کہہ دیا تو دل بھر کے داد دی۔ بار بار وہ شعر سنا۔ اگر فی الواقعی کسی سے متاثر ہوئے تو خلوت و جلوت میں اور ان صاحب کی عدم موجودگی میں بھی ان کی ذہانت کو سراہا۔ ان کے شعروں کی تعریف کی۔ لیکن بعض ایسے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ جن سے ان کے مراسم تھے۔ بہت قربت بھی تھی۔ لیکن ان کی تحریروں سے

[illegible] بھی متاثر ہوئے

[illegible] میں شوکت صاحب [illegible] مستقل ہو گئے [illegible]

[illegible]

[illegible] ہو جائے گا کہ ظریفوں کا کوئی [illegible] گئے۔

[illegible]

[illegible] میں نے انھیں سلام تو کر دیا۔ لیکن کچھ [illegible] پٹ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولے۔ [illegible] میں نے نہایت صفائی سے جواب دیا: "جب دلوں میں [illegible] جاتے تھے۔ وہ سب غلط فہمیاں [illegible] بالکل صاف ہو گیا ہے۔ وقت اور واقعات نے بتادیا کہ وہ آگ کس کی لگائی ہوئی تھی۔"

اِدھر اُدھر کی متفرق باتیں کرنے کے بعد پوچھنے لگے: "اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے جواب دیا: "سہ پہر ہی ہندوستان کی روانگی ہے۔" انھوں نے دریافت کیا: "کیسے جا رہے ہو۔ یا اور بھی کوئی ساتھ جا رہا ہے؟" میں نے بتایا: کہ "ایک خیر سگالی وفد کے ساتھ جا رہا ہوں۔ چند شاعر حضرات بھی ہمراہ ہوں گے۔" انھوں نے شاعروں کے نام پوچھے۔ میں نے جب سید محمد جعفری صاحب کا نام لیا تو کہنے لگے: "خیر وہ تو آپ کے ساتھ نہیں جا رہے۔" اس پر میں نے عرض کیا: "پروگرام بن چکا ہے۔ وہ وعدہ کر چکے ہیں۔ کیسے نہیں جائیں گے؟" شوکت صاحب بولے: "وہ اور میں ہر جگہ اکٹھے جاتے ہیں۔

چونکہ آپ نے مجھے [illegible] نہیں کی۔ صرف اصل مدعا [illegible] ۔ لہٰذا میں [illegible] معلوم کیا۔ اگر [illegible] ۔ ورنہ انشاء اللہ آپ بھی تشریف لے چلیں۔ شوکت صاحب [illegible] کے علاوہ رہا چاہتے ہیں۔ آپ کے [illegible] میں کیسے چلا دوں۔

شوکت [illegible] نے [illegible] میں [illegible] میرے [illegible] دوست [illegible] سعید حسن نقوی صاحب [illegible] شوکت [illegible] سے متعارف [illegible] ہے کہ شوکت صاحب کی دلی خواہش [illegible] لاہور [illegible] گئے۔ لہٰذا میں [illegible] حاضر ہو گئے۔ نقوی صاحب [illegible] دعوت [illegible] شوکت صاحب [illegible] انسان مجھے نہ مانے کہنے لگے [illegible] بیں [illegible] معتقد [illegible] ہیں جب [illegible] نقوی صاحب اسی وقت [illegible] ٹرنک کال [illegible] خیریت [illegible] صاحب کو [illegible] لانے کا [illegible] ہے کہ شوکت صاحب [illegible] جب انھوں نے [illegible] صرف [illegible] سے [illegible] روانہ ہوں گے۔ ہم لوگ [illegible] کے عام [illegible] ملتوی کر دیں۔

[illegible] دونوں [illegible] اسٹیشن پر بیٹھے تھے۔ وہ پردے کی پابندی کی وجہ سے باہر نہ نکل سکے تھے۔ [illegible] شفائی صاحب کا [illegible] سے ہو۔ انھوں نے آگے [illegible] ان دونوں کو اپنے میزبان کی کار میں جا کر بٹھا آیا۔ [illegible] رات سے ایک دو بجے تک ساتھ رہا۔ [illegible] سے فارغ ہو کر [illegible] دوسرے دن [illegible] دہلی روانہ ہو گئے۔

[illegible] ملاقات [illegible] ہمارے چند گھنٹوں نے ہماری رنجشیں بھلا دیں۔ غبار محبت جیسا تھا۔ اور معلوم صاف ہو گیا تھا۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے سے پہلے سے بھی زیادہ قریب ہو گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا دو مریض کسی بیماری خصوصاً [illegible] سے صحت یاب ہونے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ صحت مند ہو گئے ہیں۔

مارچ [illegible] سے مارچ ۱۹۶۳ء تک شوکت صاحب راولپنڈی سے اگر ایک دن کو آئے تو اور اگر کئی دن کے لیے آئے تو۔ انھوں نے مجھے کبھی فراموش نہ کیا۔ اکثر آنے سے پہلے مارشے دیتے۔ خط لکھ دیتے۔ اور میں انھیں لینے ریلوے اسٹیشن جا پہنچتا۔ غالباً ۲۵ جولائی ۱۹۶۲ء کو شوکت صاحب کا تار ملا۔ کہ وہ ریل کار سے لاہور پہنچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے جو ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ تو انھوں نے وعدہ فرمایا تھا کہ آئندہ جب لاہور آئیں گے تو قیام میرے ساتھ کریں گے اس تار کے آنے کے بعد مجھے اس بات کا یقین ہو گیا۔ لہٰذا میں ان کے ٹھہرنے اور کھانے کا انتظام کر کے انھیں لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ٹرین آئی۔ تو نہ صرف یہ بلکہ ان کی بیگم صاحبہ اور بچیاں بھی ہمراہ تھیں۔ ظاہر ہے وہ لوگ ساتھ تھے تو ان کے اپنی سسرال کے علاوہ کہیں ٹھہرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ تاہم میں نے اصرار کیا۔ اور بتایا۔ کہ "میں تو کھانا بھی پکوا

[illegible] لیے [illegible] کا [illegible] [illegible] وہاں سب انتظار کرتے ہوں گے۔

شوکت صاحب [illegible] [illegible] تھا۔ ابتدائی [illegible] کچھ [illegible] [illegible] [illegible] جب تک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] صاحب [illegible] ہو گئے۔

[illegible] شوکت صاحب [illegible] [illegible] تھا۔ [illegible] [illegible] عزیزوں اور [illegible] [illegible] صاحب [illegible] [illegible] [illegible] شوکت صاحب [illegible] [illegible] وہ اپنی [illegible] شوکت صاحب اور [illegible] صاحب [illegible] [illegible] [illegible] چٹکلوں کا لطف بھی آتا۔

شوکت صاحب میں ایک [illegible] گرمی محفل [illegible] [illegible] ایک نظر میں جانچ لیتے کہ ان میں سے کون شخص۔ کون کون سا شخص [illegible] ذکر کر چکا ہوں کہ مرحوم جو [illegible] [illegible] [illegible] کے پندرہ بیس خواتین و حضرات پر نظر دوڑاتے [illegible] صاحب [illegible] کی طرف سے انھیں اندیشہ ہوا۔ کہ ان کا کلام سننے کے بعد کسی [illegible] [illegible] رہیں۔ یا وہ کوئی اوٹ پٹانگ حرکت نہ کر بیٹھیں۔ [illegible] شوکت صاحب [illegible] دو چار جملے ان پر کر دیئے۔ کچھ پھبتیاں کس دیں۔ وہ بیچارے کچھ ایسے بوکھلا جاتے۔ کہ پھر [illegible] کے منہ سے کوئی بات ہی نہ نکلتی۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ ان صاحب کی پتلون کے پائنچوں میں سے ان کے موزوں کی جھلک نظر آ گئی۔ اب اسے محض اتفاق کہیے یا ان صاحب کی شامتِ اعمال۔ کہ ان کے موزوں کا ڈیزائن اور رنگ بالکل اس قالین سے مشابہ تھا جو اس کمرے میں بچھا ہوا تھا۔ ممکن ہے اوروں نے بھی یہ محسوس کیا ہو۔ لیکن کسی نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی میں شوکت صاحب سے درخواست کر رہا تھا کہ پچھلی رات کے مشاعرے میں انھوں نے غالب کی "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے"

غزل کا جو ہندی [illegible] شناسا تھا۔ وہ شوکت میں [illegible] کی طرف کوئی توجہ [illegible] شگفتہ بازی [illegible] کے [illegible] دیکھ رہے تھے۔ [illegible] صاحب تشریف [illegible] صاحب [illegible] صاحب جیسے حضرت [illegible] آپ سے مزے میں رکھتے ہیں [illegible] مطلب تو وہ چونکہ یہ بات [illegible] ہوئے کچھ بیٹھے۔ میں اس بحث کو [illegible] جواب ہو [illegible] کہ شوکت صاحب بالکل بے ساختہ بے ساختگی سے [illegible] بولے "صاحب۔ [illegible] آپ کے [illegible] پڑھا ہوگا۔ ممکن ہے وہاں آپ نے [illegible] مزے سے [illegible] دیکھے ہوں [illegible] قصے ہی گزرے۔ لطف [illegible] ہے کہ [illegible] صاحب [illegible] لیکن [illegible] کے ساتھ ہی خفیف [illegible] کہ باقی [illegible] ان کی زبان کو جنبش تک نہ رہی۔

[illegible] ڈاکٹر [illegible] صاحب۔ شوکت صاحب [illegible] صاحب کو ٹرین پر سوار کرانے [illegible] اسٹیشن چلے گئے۔ گھر سے اسٹیشن تک میں نے شوکت صاحب [illegible] بالکل جھک [illegible] لاہور آ کر پہلے آپ کو میرے ہاں [illegible] ان کے مزاج کی طرف توجہ دوں۔ شوکت صاحب [illegible] کا عہد کرتے تھے۔ [illegible] پریشان ہوں [illegible] وعدہ کیا کہ جلدی جلدی لاہور آنے کی کوشش کروں گا۔ [illegible]

شوکت صاحب بات سے بات نکالتے [illegible] کرتے۔ [illegible] میں جواب [illegible] لکھتے۔ لاہور میں بہت دنوں [illegible] رہا ہے۔ [illegible] حکیم [illegible] محمد حسن [illegible] مولانا سالک۔ مولانا حسرت اور محمود نظامی جیسے حضرات [illegible] اس فن کے ماہر ہیں۔ ان لوگوں کے اٹھ جانے کے بعد محفلیں سونی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایک شوکت صاحب ہی تھے جو اس فن کے علمبردار بنے رہے۔ بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ ان سب حضرات [illegible] کا مقام [illegible] اس بے نظیر [illegible] وہ لوگ مسلسل لطیفوں تک چلے جاتے [illegible] کہتے تھے۔ ایک چٹکی کس دی۔ اور پھر دوسری [illegible] میں رہ گئے۔ کچھ دیر بعد موقع ملا تو چھوٹی سی تیز جملے کا نشتر لگا دیا۔ لیکن شوکت صاحب کے یہاں صورت ہی دوسری تھی۔ وہ مسلسل گھنٹوں [illegible] بے تکان جاری رکھتے تھے۔ دوسرا موقع [illegible] ان کے جملوں کی بھرمار اور چٹکیوں کے مسلسل اور متواتر جاری رہتے۔ عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ پڑھنے والا ان کے طلسم میں پھنس کے رہ جاتا ہے۔ اور ان سے ذاتی طور پر ملیے تو وہ طلسم ٹوٹ کے رہ جاتا ہے۔ لیکن شوکت صاحب کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ان کی مزاح نگاری سے کہیں زیادہ ان کی صحبت متاثر کرتی۔ جن لوگوں کو ان سے قرب حاصل رہا۔ ممکن ہے وہ میری اس رائے سے اتفاق کریں۔

شوکت صاحب اور ایک عام ادیب میں کیا فرق تھا۔ اس کی ایک مثال پیش کر دوں۔ پورے ایک مہینے بعد یعنی ۲ اپریل کو پھر میرے یہاں چند احباب کھانے پر جمع ہوئے۔ شامتِ اعمال وہ "مزے والے" صاحب بھی اتفاق سے لاہور میں موجود تھے۔ اور میرے یہاں تشریف رکھتے تھے۔ شوکت صاحب شدید طور پر علیل تھے وہ تو آ نہ سکتے تھے۔

[illegible]

[illegible] شوکت صاحب [illegible]

[illegible] داستان [illegible]

[illegible] کی کوشش کروں گا ۔

میرے تاثرات

ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری

خزاں کی تعطیلات گزارنے کے لیے میں گھر پہنچی تو گھر کے ریڈیو پاکستان سے آتے ہوئے ایک خبر سے مجھے اطلاع ملی کہ شوکت تھانوی بیمار ہیں اور ان کے احباب انہیں دیکھنے لاہور جا رہے ہیں۔ [illegible] یہ شوکت تھانوی مستقلاً سخت علیل ہو گئے ہیں۔ پنڈی چھوڑ کر لاہور جا چکے ہیں۔ لیکن وہ تو تقریباً تیار بیٹھے ہوئے تھے [illegible] نکلے ہوئے بچے ہیں۔ [illegible] حاصل کرنے کے بعد وہ واپس پنڈی نہ آ سکے۔ علالت نے ذرا شدت اختیار کی تو ڈاکٹروں نے [illegible] تجویز کیا ہے۔ [illegible] یہ ادیب اس علالت کا متحمل نہ ہو سکا۔ ایسا دھچکا لگا کہ [illegible] جو موت برسوں میں جا کر آتی وہ اس [illegible] سے دنوں میں ہو گئی۔ [illegible] ہم [illegible]۔

واپسی پر ان لوگوں نے بتایا کہ حالت گرتی جا رہی ہے لیکن اچھے معالجین پر امید ہیں۔ مجھے اطمینان [illegible] تھی۔ دل چاہتا تھا کہ عیادت کے لیے جاؤں۔ لیکن گوناگوں مصروفیات نے اس کا موقع نہ دیا۔ پھر یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ یہ سب کچھ اتنی جلد ہو جائے گا۔ [illegible] آنے والی ہے۔ صبح اپنے ساتھ اس ظریف کی موت کی خبر لے کر آئے گی۔ اف کس قدر بے کیف صبح تھی۔ [illegible] یہ انجمن برہم ہو گئی۔ یہ ادیب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ادیب و شاعر کی حیثیت سے شوکت تھانوی کی کیا فتوحات ہیں۔ میرا یہ موضوع نہیں۔ میں نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس ہیجانی دور میں، اس سراسیمگی و انتشار کے زمانے میں، انہوں نے اپنے انداز کو کس طرح نبھایا۔ ایک خاص زاویہ نظر سے کام لینا اور اس میں کمال حاصل کرنا کسی کسی کا کام ہوتا ہے۔ وہ پرانے ادیب تھے اور ہمیشہ کے زود نویس۔ تقسیم سے پہلے ہی کئی درجن کتابوں کے مصنف تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں بڑے پتے کی بات کہہ دینے کے عادی تھے۔ "سودیشی ریل" ان کے اس دور کا شاہکار ہے۔ وہ ان چند ادیبوں میں ہیں کہ اس زمانے میں ان پر جمود و سکوت طاری نہ ہوا بلکہ اس آشوب میں برپا ہونے والا ہر واقعہ ان کی سمند طبع پر تازیانہ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ تازیانے انہوں نے "قاضی جی" کی شکل میں مجتمع کر دیئے ہیں۔ اس دوران میں انہوں نے جو کتابیں لکھیں وہ ہمارے قومی کردار کی تشکیل پر تنقید ہی نہیں بلکہ تعمیر میں بڑی معاون ہیں۔ ان تصانیف میں ظرافت و مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے نشتر بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ان آئینوں میں ہم قہقہے لگاتے ہوئے اپنے خط و خال بھی دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن قہقہے کی ایک نئی لہر اس طرح آتی ہے کہ طبیعت کے تمام تکدر کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ یہی ان کا فن ہے اور یہی اسلوب۔

[illegible] شوکت تھانوی مرحوم کی [illegible] ایک بہت بلیغ [illegible]
[illegible] خود [illegible] بھی [illegible]
[illegible] شوکت تھانوی [illegible] حیثیت سے [illegible]
[illegible] کی [illegible] بہت [illegible]
[illegible] خوش [illegible] لکھتے تھے۔

[illegible] شوکت تھانوی [illegible] سید محمد جعفری [illegible]
[illegible] دونوں [illegible] شوکت تھانوی کا [illegible]
[illegible] مجلس [illegible]
[illegible] شوکت تھانوی [illegible] سید محمد جعفری [illegible]
[illegible] شوکت [illegible]
[illegible] آپ [illegible] کیجئے۔ [illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible] شعر پڑھنے [illegible]

شوکت تھانوی [illegible] سید محمد جعفری [illegible] چند شعر [illegible]
[illegible] ۲ مئی ۱۹۶۳ء [illegible] مشاعرہ راولپنڈی میں ایک تاریخی مشاعرہ ہے۔ [illegible] نشست [illegible]
انتظام و اہتمام [illegible] خوبصورت [illegible] نشست کا
جاتا ہے۔ [illegible] راولپنڈی میں [illegible] خوشگوار
ہوتی ہے۔ [illegible] شعر پڑھے تھے [illegible]
نے سیکرٹری اور اعلیٰ افسران کو بھی پہنچ [illegible] مہمانوں [illegible] شوکت تھانوی [illegible]
تھی۔ لیکن مجلس استقبالیہ کے ممبران نے مجھے بتایا کہ ابھی شوکت صاحب نہیں [illegible] اسی وقت مجھے شوکت صاحب اپنی بیگم صاحبہ
اور تینوں صاحبزادیوں کے کار سے اترتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ہمراہ سید محمد جعفری [illegible] میں نے
محسوس کیا کہ شوکت صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ ہمیشہ محفل میں تاخیر سے آتے اور مہمانوں کے جانے کے بعد [illegible] قیام کرتے۔

شوکت صاحب کے آتے ہی مشاعرہ شروع ہوا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے کی جو ان دنوں [illegible] گورنمنٹ کالج
[illegible] میں پرنسپل تھے۔ [illegible] کی تقریب میں شرکت کی غرض سے پنڈی آئے تھے۔ شوکت صاحب کی اطلاع کے بغیر ہم نے یہ فیصلہ کر لیا
[illegible] سیکرٹری کے فرائض شوکت صاحب انجام دیں گے۔ چنانچہ صدر کے تعارف کے بعد مرحوم سے درخواست کی کہ وہ مشاعرہ کی
کارروائی انجام دیں ان کے لئے یہ اعلان خلاف توقع تھا۔ لیکن بغیر کسی عذر معذرت کے انہوں نے درخواست قبول کی [illegible] مشاعرے
۱۹۶۳ء کی عید سے ایک دن قبل [illegible] شوکت صاحب کا انتقال ہوا۔

میں مقامی شعراء کے علاوہ دو شعراء نے بھی اپنا کلام پڑھا جو حسنِ اتفاق سے پنڈی میں موجود تھے اور کل ہند و پاک شہرت کے [illegible] مشاعرہ جتنا ستھرا تھا اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو ذوقِ سخن رکھتے ہیں۔ اس مشاعرے کی داد پانا بہت مشکل [illegible] شوکت تھانوی مرحوم کی نذر بھی کیے۔ [illegible] جنہوں نے [illegible] برجستہ و ظریفانہ انداز میں صدارت کر [illegible] گئی۔ اس وقت تو یہی کہہ کر مسرور ہوا [illegible] کی نشست [illegible] کھینچا [illegible] مرحوم مشاعرے [illegible] شاعر کے آنے سے قبل اور دیکھتے ہی [illegible] رخصت کے وقت [illegible] غزلوں کے جو اس کے بارے میں شوکت تھانوی مرحوم کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ گفتگو پر [illegible] صاحب تھے [illegible] مرحوم [illegible] ظرافت کے لیے [illegible] ہوں گی۔

شاعر [illegible] اکبر آبادی صاحب بھی تھے شوکت تھانوی نے اعلان کیا

اب میں غزل پڑھنے کے لیے نظم اکبر آبادی کو بلاؤں گا۔

شاعر [illegible] کلام [illegible] اعلان کیجئے۔

[illegible] سے درخواست ہے وہ اپنا کلام سنائیں۔

[illegible] آبادی [illegible] دوسری مرتبہ کلام کی درخواست کی گئی۔

جناب [illegible] آبادی کا طریقہ [illegible] جا رہا ہوں۔ [illegible] درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی [illegible] کے مطابق دوسری غزل بھی سنا دیں۔

[illegible] ریڈیو پاکستان [illegible] اہتمام کیا گیا تھا [illegible] کرسی پر بیٹھ کر [illegible] صاحب [illegible] بہت سے [illegible] بیٹھے ہی رہتے ہیں۔ ان کی تشریف آوری پر مرحوم نے اعلان کیا۔

مجھے مسرت [illegible] درخواست کرتا ہوں وہ تشریف لائیں۔

محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔ [illegible] صاحب کرسی پر [illegible] شوکت صاحب نے پھر [illegible] کی۔

آپ [illegible] ہوگی کہ سب سے [illegible] اور کلیم صاحب کو [illegible] کر دیا ہے۔ لیکن حضرات یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔

سید محمد جعفری نے اپنی نظم [illegible] سنائیں۔ [illegible] شوکت تھانوی سے اصرار کیا جا رہا تھا کہ [illegible] نظم سنائیں۔ شوکت صاحب نے سید محمد جعفری سے دوسری نظم سنانے کی درخواست کی اور کہا۔

خواتین و حضرات [illegible] یہ فرمائش [illegible] خواتین کی اور جعفری صاحب بہت بااخلاق آدمی ہیں۔ یہ خواتین کی فرمائش رد نہیں کرتے۔ . .

سامعین میں سے کچھ نے کہا آپ سے بھی خواتین کی فرمائش ہے۔

کہنے لگے اس میں بھی کافی بااخلاق ہوں، ان کی فرمائش رد نہیں کرتا۔

حضرت نیر اکبر آبادی سے جب دوسری مرتبہ پڑھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے کہا شوکت صاحب مجھے تو معاف کریں آپ

[illegible]

[illegible]

[illegible] شوکت صاحب [illegible]

[illegible] شوکت تھانوی کی تخلیق غالب [illegible] غالب

[illegible] پڑھتے وقت شوکت صاحب کا انداز بیان۔

سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا ہے۔ وہ مرحوم کی انکساری تھی۔ بزم میں کام کرنے کے دوران میں میں نے اکثر محسوس کیا۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ رفقائے بزم اور ان فن کاروں کے ساتھ کام کرکے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر خواتین اپنے [illegible] کی پابندی کے ساتھ کوئی سماجی کام کرنا چاہیں تو ہمارے مردوں میں آج بھی یہ صلاحیت ہے کہ ان سے قرار واقعی احترام ملنے کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ شوکت صاحب سے راولپنڈی میں اکثر و بیشتر ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہر موقع پر مجھے ان کی انسانیت، شرافت، ہمدردی، بذلہ سنجی اور حاضر دماغی کا معترف ہونا پڑا۔ جس محفل میں وہ ہوتے بوریت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک دفعہ سنسر بورڈ کی ایک نشست تھی [illegible] چراغ جلتا رہا [illegible] جا رہا تھا، سنسر بورڈ کے ممبران جن میں اعلیٰ افسران وغیرہ کے علاوہ وزارتوں کے چند سیکرٹری بھی تھے۔ فضل صاحب

ہوتی تھی۔ دفتر بھی چل گئی۔ شوکت صاحب اس ادارے کی حیثیت سے مجاز تھے۔ ظفر صاحب کا اضطراب دیکھنے [illegible] جب شوکت تھانوی اس مرقع کے لیے [illegible] جانے دیتے تھے بلکہ تقریباً آدھ گھنٹہ قبل [illegible] بھی ان [illegible] کو [illegible] سب لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔

آخری زمانہ میں انہوں نے مرثیہ گوئی کی صلاحیت کا جو اظہار کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ انہوں نے عمر بھر [illegible] ایک طویل مرثیہ لکھا جو پہلی دفعہ جو بڑا کامیاب ہوا تاریخ مرثیہ گوئی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ [illegible] ہے۔ احباب کی مجلسوں اور نشستوں کے علاوہ انہوں نے [illegible] دبستان [illegible] راولپنڈی کے بزم [illegible] میں بھی سنا [illegible] لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اس مرثیہ میں نہ صرف ان کا منفرد انداز بلکہ ان کی اہل بیت سے جو عقیدت تھی وہ بھی نمایاں ہے۔

شوکت تھانوی ڈراموں میں بڑے مشہور تھے۔ اس سلسلے میں ان کا [illegible] قاسم جان [illegible] ان کی زندگی میں [illegible] ہوتا ہے۔ ورنہ اردو کے ادیب اتنے خوش قسمت کہاں۔ ان کا پروگرام "قاضی جی" اردو ادب کی [illegible] ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس پروگرام سے جہاں ان کی طبیعت کی ہمہ گیری [illegible] ان کی فطری ظرافت پر روشنی پڑتی ہے [illegible] ان کی تحریری صلاحیتیں بھی اجاگر ہوتی ہیں۔ انہوں نے اس عنوان کے تحت ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ یہ پروگرام پانچ سال [illegible] جاری رہا اور کمال یہ ہے کہ سننے والوں کو [illegible] سال میں کبھی تکرار کی شکایت نہیں ہوئی۔ آخری دم تک یہ پروگرام ریڈیو سے نشر ہوتا رہا۔ اس دوران میں وہ اعتراضات کی منزلوں سے گزرے۔ لیکن قبول عام کا سیلاب ان [illegible] کی طرح بہا کر لے گیا۔ اور حقیقت [illegible] اپنی تصانیف سے زیادہ اس پروگرام کے ذریعہ لوگوں میں مقبول ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ شوکت تھانوی کی [illegible] ریڈیو پاکستان [illegible] آج [illegible] شوکت تھانوی کے [illegible] کی دلکشی میں فرق آ گیا ہے۔ [illegible] پروگراموں پر ایک بے کیفی طاری ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے۔ ع

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔

میں اور شوکت بھائی

بیگم خورشید حفیظ جالندھری

۱۹۴۷ء میں پارٹیشن کے بعد — آٹھ روز ریل میں سفر کر کے — بصد مشکل لاہور پہنچے تھے۔ اور جب لاہور ریلوے اسٹیشن پر اتری تو خوشی کے بجائے کچھ نظر نہیں آتا تھا — خون اور دہشت کے منظر ابھی تک آنکھوں کے سامنے تھے — زخمیوں کی چیخ و پکار، بچوں کے بلکنے عورتوں کے ریل میں سفر کے دوران ڈاکوؤں کے ہاتھوں کٹ کر مر گئے تھے اور جو کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ان کے عزیز دار جب ان کو اس بری حالت میں دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے — بہت سی عورتیں ریل سے آتے ہی جاں بحق ہو گئیں عام ہی سب تڑپ رہے تھے — کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا — کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی — چاروں طرف افراتفری مچی ہوئی تھی — ریلوے اسٹیشن پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گمشدہ ناموں کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی کہ فلاں نام کا مرد یا عورت موجود ہو تو وہ جلد سے جلد ویٹنگ روم میں آ جائے — اس کے رشتہ دار اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں — میں نے اپنے کانوں سے اپنے نام کی اناؤنسمنٹ ہوتے سنا مگر کانوں پر یقین نہیں کیا۔ جب کئی بار یہ آواز آئی کہ اگر خورشید بیگم ڈرامہ آرٹسٹ یہاں موجود ہوں تو وہ فوراً اپنی خیریت کی اطلاع ہمارے ریڈیو اسٹیشن پر ٹیلیفون کے ذریعے دیں۔ لاہور میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ بیچاری ریل کے سفر کے دوران قتل کر دیا گیا ہے — اس خبر سے میرے ساتھ کام کرنے والوں کو بہت دکھ ہوا — میرے ڈراما ڈائریکٹر سلیم شاہد نے دیگر ساتھیوں کے کہنے پر متواتر کئی روز تک میرے نام کی اناؤنسمنٹ کرائی — یہ آواز سننے کے بعد بھی میرے حواس مستقل طور پر درست نہیں ہوئے تھے — آٹھ روز کی بھوک پیاس اتنے دہشت ناک حادثے ان آنکھوں سے دیکھتی ہوئی ریل سے اتری تو یہاں بھی کہرام مچا ہوا دیکھا — ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے عزیزوں کا ماتم کرنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے — میں نے بمشکل اپنے حواس درست کیے اور ریلوے اسٹیشن سے ہی ریڈیو اسٹیشن ٹیلیفون کیا — ٹیلیفون پر شوکت صاحب بولے — میرا نام سن کر انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا — اور فرمایا اسٹاف کے سب فرد آپ کی خیریت چاہتے تھے — خدا کا شکر ہے آپ اور آپ کے سب احباب خیریت سے پہنچ گئے — میں آپ کی خیریت کا پیغام آپ کے سیکشن میں ابھی پہنچائے دیتا ہوں۔

دہلی میں شوکت صاحب اور امتیاز علی تاج صاحب کے بہت سے ڈراموں میں میں نے حصہ لیا ہے — شوکت صاحب کا ڈرامہ "میر صاحب کی بقرعید" اور ان کی کتاب "سودیشی ریل" یہ دونوں مجھے بہت پسند تھے — اکثر امتیاز صاحب اور شوکت صاحب سے ملنے کو دل چاہتا — مگر خدا نے کن ہنگاموں کے بعد ان دونوں ادیبوں کی شکلیں دکھائیں — دہلی سے لاہور تک آنے میں

جن حالات سے دوچار ہونا پڑا ۔۔۔ اُن کا دل پر کافی گہرا اثر پڑا ۔۔۔ میں اپنے گھر اور چند ملنے والوں کی محفلوں میں [illegible] بہت بددلی سی ہو گئی تھی ۔۔۔ نہ جانے کیوں ۔۔۔ مجھے بیٹھے بٹھائے یہ عقیدہ بندھ گیا تھا کہ [illegible] گھر سے لاہور آنے کے کوئی پندرہ دن بعد مجھے یہ پیغام ملا کہ بخاری صاحب سب آرٹسٹوں کو ملنا چاہتے ہیں [illegible] روز مجھے بھی جانا پڑا ۔۔۔ چنانچہ میں بخاری صاحب کا نام سُن کر اُن کی میٹنگ میں شامل ہو گئی ۔۔۔ بخاری صاحب نے سب آرٹسٹوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا ۔۔۔ بہت سی تسلی تشفی کے بعد یہ سب آرٹسٹوں کو دوبارہ ملازم رکھ لیا گیا۔ حکومت کی نظر میں بھی یہ سب آرٹسٹوں کی بڑی اہمیت تھی ۔۔۔ یوں بھی ہم کو انسپکٹ کیا گیا ۔۔۔ اس ملازمت کے [illegible] ایک چھوٹا سا لطیفہ یاد آ گیا ۔۔۔ جب مجھے لاہور ریڈیو پر دوبارہ رکھ لیا گیا تو بخاری صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ ہم سب [illegible] حفیظ ہوشیار پوری کے پاس ہیں۔ وہ اوپر کی منزل کے کمرے میں بیٹھتے ہیں ان سے جا کر دستخط کر دیجیے ۔۔۔ اُن دنوں [illegible] کا عالم بھی کچھ کم نہ تھا ۔۔۔ میں اوپر کی منزل میں گئی کمرے میں شوکت جانی اور حفیظ ہوشیار پوری دونوں آمنے سامنے [illegible] تھے ۔۔۔ میری اُن دونوں سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں جونہی کمرے میں داخل ہوئی اور حفیظ ہوشیار پوری سے مخاطب ہو [illegible] جی حفیظ ہوشیار پوری کون سے کمرے میں بیٹھتے ہیں مجھے کنٹریکٹ پر دستخط کرنے ہیں۔ حفیظ صاحب نے بہت خفگی [illegible] جائیے ۔۔۔ اُدھر شوکت جانی کی بے ساختہ ہنسی نکل پڑی ۔۔۔ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے ۔۔۔ کرسی پر بٹھایا اور حفیظ [illegible] سے فرمایا۔ آپ نے اپنی تعریف سُن لی اور مجھ سے کہا۔ تھے تو یہ ہوشیار پوری مگر اب سے شاہ پوری ہو گئے ہیں ۔۔۔ مجھے اپنی غلطی پر شرم آئی مگر شوکت جانی نے اُس شرم کو بھی اپنی چند اور باتوں سے مٹا دیا ۔۔۔ ملازمت کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ آج [illegible] ڈراموں کا دور خزاں ہے۔ ڈراموں کے بدلے ایک اور فیچر پروگرام روزانہ پیش ہو رہا ہے ۔۔۔ جس کا عنوان ہے "پاکستان ہمارا ہے" یہ پروگرام شوکت جانی، میاں لطیف الرحمن اور خود امتیاز علی تاج صاحب لکھتے اور پیش کرتے ۔۔۔ اُس پروگرام میں میں خود اور امتیاز [illegible] اور ان کے بیٹے نسیم تھا۔ اور کبھی کبھی موہنی داس بھی حصہ لیتی۔ یہ پروگرام رات آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک نشر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور پروگرام براڈ کاسٹ ہوتا ۔۔۔ لوگوں کے نام پیغام ریڈیو کے ذریعے دوسرے ملکوں میں ان کے عزیزوں کو پہنچانا۔ اُن کی خیریت کی اطلاع دینا اور یہ بتانا کون کہاں ہے ۔۔۔ مجھے اس پروگرام میں بھی حصہ لینا پڑتا تھا۔ آخر کار خدا خدا کر کے یہ مصیبت کے دن [illegible] گئے تو لاہور ریڈیو میں بھی روشنی کی کرن نظر آنے لگی ۔۔۔ وہ کرن تھے شوکت تھانوی ۔۔۔ شوکت جانی نے ایک فیچر پروگرام خود لکھ اور پیش کرنا شروع کیا ۔۔۔ جس کا عنوان تھا "قاضی جی" ۔۔۔ عوام نے شوکت جانی کے قاضی جی کو بہت ہی پسند کیا۔ گھر گھر قاضی جی کی شہرت کا چرچا تھا غرض قاضی جی بہت مقبول ہوا ۔۔۔ شوکت جانی قاضی جی کا رول خود کرتے تھے اور ان کی لاڈلی اکلوتی زہرہ [illegible] کردار میں ادا کرتی ۔۔۔ اُن کی بیوی موہنی داس بنتی ۔۔۔ اور بیوی کے بھائی کا پارٹ عتیق احمد ادا کرتے ۔۔۔ لاہور سے قاضی جی [illegible] سال تک ہر ہفتہ پیر کی شام سوا آٹھ سے ساڑھے آٹھ بجے رات تک نشر ہوتا رہا۔

اُن ہی دنوں شوکت جانی نے عورتوں کے پروگرام میں خالہ جان کے نام سے ایک فیچر پروگرام لکھنا اور پیش کرنا شروع کیا۔ جس میں قمر ایکٹریس بیگم خالہ جان بنتی تھیں اور میں ان کی بھانجی کا کردار ادا کرتی اور خود شوکت جانی ایک بیکار نااہل امیدوار لڑکے کا رول کرتے تھے جو خالہ جان کی چہیتی بھانجی سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا ۔۔۔ لڑکا جب بر دکھاوے کے لیے پیش کیا گیا تو اُس کی

[illegible] میاں [illegible] ہر شخص [illegible] ہوتا تھا۔ دور سے [illegible] تھا۔ [illegible] [illegible] بہت [illegible] ذرا اس کی [illegible] شادی [illegible] [illegible] بہت ہی دلچسپ تھا۔ [illegible] شوکت بھائی کی [illegible] [illegible] کام کرتی تھیں۔ وہ بھی شوکت بھائی سے [illegible] [illegible] بہت [illegible]

میری شادی کے بعد [illegible] پڑی۔ میری [illegible] شوکت بھائی اور ان کی [illegible] شوکت بھائی [illegible] دوسرے [illegible] میری [illegible] [illegible] پھر دن بعد شوکت بھائی اور [illegible] کراچی چلے گئے۔ کراچی سے ہی قاضی جی [illegible] تک [illegible] وہاں قاضی جی کی [illegible] تھی۔ کیونکہ شادی کے بعد ہی [illegible] گھر میں [illegible] ہو گئی تھی۔ [illegible] جس [illegible] وقت [illegible] تھی وہ سب خواب خیال ہو کر رہ گیا۔ [illegible] ہو جاتی تو میں [illegible] سے بات تک کرنے سے [illegible] — [illegible] یاد [illegible] پر [illegible] ان تو بات شوکت بھائی کی تھی [illegible] شوکت بھائی [illegible] اخبار [illegible] لگے اور پھر دن [illegible] ہو گئے [illegible] قاضی جی [illegible] — میری آنکھوں کے سامنے اس وقت بھی شوکت بھائی ہیں — وہ بہت ہی [illegible] کے مالک تھے۔ وہ اعلیٰ درجے کے ادیب، بلند پایہ شاعر، کمال [illegible] ان میں [illegible] تھے اور وہ حاضر جواب بھی تھے۔ غرض شوکت بھائی میں بہت سی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ ہر دل عزیز تھے۔ وہ ہنس مکھ سب سے بہت خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے شوکت بھائی اپنی خوبیوں کی وجہ سے زیادہ عزیز تھے۔ شوکت بھائی زیادہ [illegible] قائل نہیں تھے۔ صرف اتنا درست کرانے کے لیے ایک ریڈیو [illegible] کرتے۔ انہیں ہم سب پر [illegible] تھا، تو ہم سب کو ان پر ناز تھا۔ وہ پہلے کی طرح بعد میں بھی اگر کسی سے میرا تعارف کراتے تو [illegible] میری [illegible] بہن [illegible] اور میں بھی ان کے [illegible] لینے پر بڑا فخر محسوس کرتی — پیارے شوکت بھائی اپنی مسکراہٹیں بکھیرتے ہر کسی شام [illegible] میں داخل ہوتے۔ ہر وقت ان کی آنکھوں سے شرارت ٹپکتی تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں کسی نہ کسی کو اپنی شرارت کا نشانہ بناتے۔ ان کا مذاق بھی بہت پر لطف ہوتا تھا۔ [illegible] میں اپنے دماغ سے گھڑ کر ایسے لطیفے سناتے کہ ہنستے ہنستے ہم سب لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ شوکت بھائی لطیفوں کا تو [illegible] تھے۔ ان کے دماغ کی [illegible] سے انجان تو مجھ کو نہیں سکتا تھا کہ یہ سارے لطیفے خود ہی گھڑ کر سنا دیتے ہیں۔ [illegible] تو [illegible] کہاں سے کہاں بہہ جاتے۔ ان کے دماغ میں ذہانت کا کبھی نہ ختم ہونے والا سیلاب بھرا ہوا تھا۔ — شوکت بھائی نفاست پسند بہت تھے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے — کبھی ان کے کپڑوں پر میں نے شکن تک نہیں دیکھی۔ وہ جو بھی لباس پہنتے ان پر بھلا معلوم ہوتا — میری شادی کے بعد وہ مجھے کئی بار مختلف جگہوں پر ملے۔ پہلی مرتبہ وہ مجھے کراچی میں کسی کے گھر ملے۔ یہ ڈنر بھی اخبار والے کے گھر پر تھا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ اس میں شامل ہوئی تھی۔ شوکت بھائی سے شادی کے بعد میری یہ پہلی ملاقات

تھے وہ اسے سن کر بہت خوش ہوئے۔ خوشی سے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اسی دوران [illegible] پاس بلا لیا۔ شوکت بھائی نے چند باتیں اس سے کیں۔ تم نے یہ پوچھے کہ کون کون سی نظم [illegible] یاد ہو۔ [illegible] وقت بچی چار سال کی تھی اس کو بہت پیار کیا اور کہا یہ اپنے ابا کی ہو بہو ہم شکل ہے۔ سب بیٹھے [illegible] جس کے بعد وہ [illegible] دل [illegible] ہیں۔ حفیظ صاحب اگر کسی مشاعرے میں شامل ہوتے تو بچی [illegible] ہوتی ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ جا کر ان کی زبانی ان کا کلام سنوں ـــ وہ پھر کے مشاعرہ کا ایک بہت [illegible] یاد آگیا۔ جب میاں بیوی راولپنڈی ہو گئے تو بچی بھی میرے ساتھ تھی اس وقت اس کی عمر تقریباً تین سال کی تھی۔ اتنی سی بچی کا رات کے حصے میں جاگنا بھی مشکل تھا مگر بچی اپنے ابا جان کا کلام سننے کے شوق میں جاگتی رہی۔ شوکت بھائی مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے جب اُن کی باری آئی پڑھنے کی تو انھوں نے سب سے پہلے اپنی مشہور نظم "سے میرے بچے تو پیمانہ ہو" پڑھی۔ بچی یہ نظم سن کر بہت خوش ہوئی ـــ خیر رات تو بچی سو گئی۔ صبح ریحانہ کے ابا جان نے کہا کہ تم اور تمہاری امی یہاں آنے کی بہت ضد کر رہی تھیں۔ رات بھر تم جاگتی رہیں تمھیں تکلیف ہی ہوئی نا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ رات تم نے کیا سنا اور تمھیں کیا پسند آیا۔ بچی نے کہا ابا جان مجھے تو سب سے زیادہ وہ شاعر پسند آیا جو شاعرے میں بچہ پیدا کرتا تھا۔ بچی کی اس بات پر ہم سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اتفاق سے کچھ دیر بعد ہی ہمارے کمرے میں شوکت بھائی، ضمیر جعفری اور سید جعفری یہ تینوں حفیظ صاحب کے پاس آئے۔ حفیظ صاحب نے بچی کی پسند شوکت بھائی کو بتائی۔ اور کہا ہم تو تم کو پسند کرتے ہی ہیں۔ ہماری بچی کے تصورات آپ کے اس سے بھی زیادہ اچھے ہیں۔ شوکت بھائی بھی بچی کی بات سن کر بہت خوش ہوئے وہ زندہ دل اور شگفتہ طبیعت کے انسان تھے چند پرلطف مصرعے اور لطیفے اسی قسم کے اور سنائے اور بچی کو بہت پیار کیا۔ اُس کی ذہانت کی تعریف کی۔

جن دنوں شوکت بھائی کو حکومت سے پہلی بار اعزاز ملا۔ یہ خبر پڑھ کر مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔ حفیظ صاحب ان دنوں کراچی گئے ہوئے تھے اور میں لاہور میں ـــ کسی کام سے میں نے کراچی حفیظ صاحب کو ٹیلیفون کیا اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنادی کہ حکومت کی طرف سے شوکت بھائی کو بھی اعزاز ملا ہے۔ اس اعزاز کے ملنے کے کچھ دن بعد ہم پھر راولپنڈی مشاعرے میں گئے حفیظ صاحب نے شوکت بھائی کو یہ کہہ کر مبارکباد دی کہ یہ خبر مجھے سب سے پہلے میری بیوی نے سنائی تھی کہ شوکت بھائی کو بھی ادب کا اعزاز ملا ہے۔ شوکت بھائی یہ سن کر بے انتہا خوش ہوئے اور فرمایا بہن کا رشتہ بہت بلند ہے انھیں زیادہ خوشی ہونی ہی تھی۔ آپ بہنوئی ہیں آپ کو بھی اس رشتے کی وجہ سے خوش ہونا لازمی ہی تھا۔ یہ کہہ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھ شرارت سوجھی۔ حفیظ صاحب سے فرمانے لگے۔ آج بھی میں ہی صدارت کر رہا ہوں۔ میں آپ کے نام کے ساتھ اناؤنس کروں گا کہ اب میرے بہنوئی حفیظ جالندھری آپ کو اپنا کلام سنائیں گے۔ کیونکہ آپ اس رشتے سے کسی صورت بھی منکر نہیں ہو سکتے۔ حفیظ صاحب نے فوراً جواب دیا میں بھی کہوں گا یہ میرے سالے ہیں۔ اس بات پر ایک دم سب کے قہقہے بلند ہوئے۔ جتنی دیر شوکت بھائی ہمارے کمرے میں بیٹھے رہے کمرے کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ ہر ایک خوش۔ ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ روتوں کو ہنسانے والے شوکت بھائی۔ مردہ دلوں میں جان پیدا کرنے والے شوکت بھائی۔ آخری بار جب وہ لاہور کے مشاعرے میں شریک ہوئے تو ان کی آمد کی اطلاع مجھے اخبار کے ذریعے ملی تھی۔ میں نے سید محمد جعفری کے مکان پر شوکت بھائی کو فون کیا اور گھر آنے کی دعوت دی مگر شوکت بھائی نے اس وقت

[illegible] زیادہ وقت [illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible] گے۔ [illegible] ساتھ بیت کی [illegible]
دہ [illegible]

پھر [illegible] معلوم ہوا کہ شوکت صاحب بہت سخت بیمار ہیں۔ میں چونکہ [illegible]
خبر سن کر بہت پریشان ہوئی [illegible] شام کے وقت ہم ہسپتال [illegible] شوکت بھائی کو دیکھنے گئی [illegible]
صاحب [illegible] شوکت بھائی [illegible]
آہستہ سے شوکت بھائی کے پلنگ کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ [illegible] بڑی بڑی آنکھیں کھول کر میری طرف
دیکھنے لگے۔ جب [illegible] آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ شوکت بھائی بیماری کی وجہ سے [illegible]
[illegible] رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں [illegible]
[illegible] اس حالت میں بھی خوش دیکھ [illegible]
آہستہ سے کہا یہ بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اس کا علاج کرو۔ میں نے جواب میں [illegible] خراب ہو گیا ہے۔ میں
پھر وہاں بیٹھ کر [illegible] اور پریشان رہی [illegible] شوکت بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر دل پر غم کا بوجھ سا
محسوس ہونے لگا۔ کئی مرتبہ میں نے ڈاکٹروں اور [illegible] صاحب سے ٹیلیفون پر شوکت بھائی کا حال معلوم کیا۔ شوکت بھائی کو جلدی
سے دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ [illegible] خود دل کے عارضے میں کئی سال سے مبتلا ہوں۔ [illegible] بیماری کا
دل پر بُرا اثر پڑا۔ میں سولہ اپریل کو کسی ضروری کام سے اپنے شوہر کے پاس کراچی چلی گئی۔ مگر دل پر ہر وقت شوکت بھائی کی بیماری کا
کھٹکا لگا ہوا تھا۔ کراچی میں روز صبح [illegible] اور حنیف صاحب ہم دونوں اخبار پڑھتے ہوئے یہ دعا کرتے [illegible] خیر ہو
شوکت بھائی کی خیریت کی خبر ہو۔ مگر اخبار میں سوائے ان کی علالت کی خبر کے کوئی ایسی خبر نظر نہ آئی۔ [illegible] کی صبح میں [illegible]
ہی کا منہ دھلا رہی تھی کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور حنیف صاحب نے فون پر [illegible] آواز میں دہرایا [illegible] صبح [illegible] فوت ہو گئے
ہیں۔ یہ آواز سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے دل سے خود بخود نکلا۔ ہائے میرے اللہ کیا شوکت بھائی فوت ہو گئے اور میں [illegible]
حنیف صاحب کے پاس آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے پوچھا یہ کس کا فون تھا۔ کیا شوکت بھائی فوت ہو گئے؟
حنیف صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ یہ احمد سلمان کا فون تھا۔ ان کو اطلاع ملی ہے کہ شوکت ابھی صبح فوت ہو گئے ہیں۔ اس
دردناک خبر سے جو چوٹ دل پر لگی وہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ ہم دونوں میاں بیوی شوکت بھائی کی اس بے وقت کی اچانک
موت کے غم میں روتے اور آنسوؤں سے منہ دھوتے رہے۔ مگر قدرت کے سامنے صبر کرنے کے سوا کچھ نہ بنا۔ شوکت بھائی ہم سب کو روتا
اپنی یاد میں تڑپتا چھوڑ کر اس فانی دنیا سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شوکت تھانوی

جب قاضی جی ہوتے

(ریڈیو کی ایک شخصیت سے ملاقات)

اختر جہاں

جب میں کتابوں کی دنیا سے آشنا ہوئی شوکت تھانوی کا نام میرے شعور میں ایک سدا بہار پھول کی طرح لہلہاتا رہا۔ ان کی تصانیف کے کرداروں کے مادی پیکر میرے درمیان ایک خوش باش کنبے کی طرح بستے۔ ان کی کتابیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میری رگوں میں بجائے خون کے قہقہے دوڑ رہے ہیں ان کی تحریر کی شگفتگی ان کی شخصیت کی آئینہ دار تھی۔ وہ اپنی تحریروں میں مجھے اتنے قریب ہوتے تھے۔ کہ ان سے کبھی بالمشافہ ملنے کا شدت سے اشتیاق نہیں ہوا۔ لاہور، کراچی اور آخر میں راولپنڈی سے شوکت تھانوی کا نہایت مقبول پروگرام قاضی جی سنتی رہی پروگرام کے اختتام پر اناؤنسر کی یہ آواز سن کر "یہ فیچر شوکت تھانوی نے لکھا اور وہی پیش کر رہے تھے" مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہ ایک عظیم فن کار کی آواز ہمارے کانوں کو چھو کر گئی ہے۔ کبھی گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ کہ آخر میں بھی اس پروگرام میں حصہ لیا کروں گی۔ اوائل نومبر ۶۱ء میں ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے میرے نام بلاوا آیا: "قاضی جی" کے لیے نسوانی آواز کی ضرورت تھی میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ قدرت نے بالکل اتفاقیہ شوکت تھانوی سے بنفس نفیس ملنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا شوکت صاحب دوسرے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں دوسری خواتین کے ساتھ جو آواز کے AUDITION کے لیے آئی تھیں۔ میں بھی اسی کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی مجھے یاد ہے شوکت صاحب نے اشارے سے میرے سلام کا جواب دیا میں نے پہلی بار، سفید چوڑی دار پاجامہ اور سرمئی رنگ کی شیروانی میں دیکھا۔ اس وقت مجھے وہ بہت سنجیدہ باوقار اور ضرورت سے زیادہ بردبار نظر آ رہے تھے۔ مجھے تھوڑی مایوسی ہوئی کیونکہ میرے ذہن میں ان کی تصویر اس سے مختلف تھی۔ بہرحال دو چار روز بعد جب مجھے اس پروگرام کے لیے انتخاب کی خبر ملی۔ تو میں پھولی نہ سماتی تھی۔ شوکت تھانوی جیسے ادیب و شاعر اور فن کار کے ساتھ ہر ہفتے بولنا میرے لیے ایک مژدہ جانفزا تھا۔ پہلے پروگرام میں۔ میں گھبرا گئی مارے رعب کے زبان لڑکھڑا لے جاتی تھی دوسرے ہفتے مسودہ کی ریڈنگ کے بعد شوکت صاحب نے خود بھی کہا "پہلی مرتبہ آپ کی آواز میں تکلف تھا گھبراہٹ

اس میں اگر کوئی بھول چوک ہو جاتی تو جملہ دہرا دیا جاتا۔ پھر کہتے۔ شوکت صاحب کا یہ فقرہ مجھے اس وقت بھی یاد ہے۔ چٹکلوں سے ان کی آواز میں ہنسی ہوتی۔ وہ سر ہلا کر بیٹھے سے ہنستے۔ شوکت صاحب بات کا آغاز کیا کرتے [illegible] اور رفتہ رفتہ ہوتا گیا جب کبھی پروگرام کے دوران شوکت صاحب نے خود کو اس کا احساس [illegible] دیا تھا۔ یہ فقرہ ان کا ادب، مذاق ہے یہ احساس ہو [illegible]۔ بہر حال یہ روز کا معمول تھا شوکت صاحب کا [illegible] کمرا اور ان کے پلو کی [illegible] میرے خیال میں وہ جب وقت بیٹھے باتیں [illegible] باتوں میں گھلے رہتے ہوئے گھنٹوں بیت جاتے، ان کی حوصلہ افزائی [illegible]۔ پہلے غیر جذباتی سی محسوس ہوتی تھیں [illegible] سال مسلسل ہر جمعہ قاضی جی۔ ہر ہفتے [illegible] ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزرا [illegible] لے آتے ہیں۔ جیسے [illegible] صرف ایک قہقہہ لگا کر ہنسے۔ مجھے [illegible] سے کسی کی بات پر [illegible] ہنسے۔ اب [illegible] کے ہر شکایت سیدھا [illegible] منہ کرتا تھا۔ [illegible] بے ہی لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ جس وقت سے [illegible] شوکت صاحب کی [illegible] لہجہ اور آواز کو تسلیم نہیں [illegible] سب کچھ ان کے سامنے ہے۔ [illegible] میں بیٹھے کسی دن [illegible] ہوتا تھا۔ ڈیوٹی [illegible] سب کا سلام لیتے ہوئے میز پر بیگ رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے تھے اور لوگ آ جاتے تو اگر پروگرام کے پہلے کریکٹر موجود ہوتے تو بیٹھے ریڈنگ کر رہے ہوتے [illegible] ہوتے۔ میں علم ہے شوکت صاحب پہلے ہی ریڈیو سٹیشن پہنچ جاتے تھے۔ وقت کی پابندی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ذرا دیر ہو گئی یا شوکت صاحب کو ڈیوٹی روم میں بیٹھے دیکھ کر مجھے دیر کا احساس ہوا۔ بہر حال میں نے اندر داخل ہو کر جیسے ہی کہا "معاف کیجئے آج مجھے ذرا دیر ہو گئی" شوکت صاحب نے [illegible] برجستہ جواب دیا "صاحب مجھے معاف کیجئے میں آج جلد آ گیا تھا"۔ یہ فقرہ سیدھا سادہ ہے لیکن ان کے کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ سب بے ساختہ ہنس پڑے۔ اسی طرح ایک مرتبہ میرے سامنے ایک شخص نے اپنے مکان کی پریشانی بیان کی، جس طرح یاد نہیں [illegible] قصہ کیا تھا۔ شاید کسی نے اس کا مکان خالی کرنے کا نوٹس وغیرہ دیا تھا۔ شوکت صاحب نے اس سلسلے میں اس کی مدد کی [illegible] اس شخص کے جانے کے بعد آہستہ سے بولے "لوگ میرے قلم کے ساتھ [illegible] سمجھ بیٹھے تھا [illegible] نہیں سمجھتے"۔

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا پروگرام شروع ہونے میں دیر ہے۔ ریڈنگ سے فارغ ہو کر یونہی چھیڑ چھاڑ۔ سیاسیات۔ کتابیات۔ ادب و ذاتیات کی باتیں ہوتے ہوتے چھوٹے موٹے قصے اور چٹکلے شروع ہو گئے۔ شوکت صاحب کا طرز بیان طنز و مزاح اور بذلہ سنجی معمولی لطیفوں کا لطف دوبالا کر دیتی تھی۔ ان کی باتوں میں ہم لوگ ایسے کھو جاتے تھے کہ شام کا بھی خیال نہیں رہتا تھا۔ کئی بار عین پروگرام کے وقت ہم لوگ چونکے مجھے یاد ہے ایک مرتبہ عید کے موقع پر عید [illegible] ہو رہا تھا۔ اسی دوران اچانک اسٹوڈیو کا دروازہ زور سے کھلا شاید کوئی شخص غلطی سے ادھر آ گیا تھا۔ واہ رے حاضر دماغی! شوکت صاحب سامنے ہی کھڑے تھے فوراً قاضی جی کی آواز میں بولے "امجد میاں،

[illegible] بیٹھ گیا ہوگا۔ نکال باہر کرو۔ اس مسودہ کو بند کرو۔ ویسے بھی [illegible] ملاقاتیوں کو شبہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ کوئی انجانے پن میں بھی اس طرف چلا آیا تھا۔

ایک دن ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے ”میں اکثر آپ کا پریشان چہرہ دیکھ کر [illegible] اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو کیا تکلیف ہے۔ یہ حالت دو صورتوں میں ہوتی ہے یا تو [illegible] یا پھر کسی کا عارضہ لاحق ہو۔ اللہ جانے دونوں کیفیتوں میں سے آپ پر کونسی کیفیت گزر رہی ہے۔“ [illegible] بڑے شگفتہ لہجے میں کہہ کر فوراً طرز بدل کر بولے ”ارے میاں پریشانیاں کسے نہیں ہوتیں مگر ہر حالت میں [illegible] رہتے ہیں، میں بھی انسان ہوں۔ مجھے بھی پریشانیاں اور بیماریاں ہیں لیکن ہنسنے والے پریشان نہیں دیکھے جاتے۔“ چند دن [illegible] کا ذکر ہے شوکت صاحب کے پیر کے انگوٹھے میں سخت درد اٹھا تھا۔ زمین پر پیر رکھنا قیامت سے اور یہ قیامت وہ کس قدر خندہ پیشانی سے جھیل رہے تھے اتنی تکلیف میں بھی چھڑی کے سہارے بمشکل قدم اٹھاتے ہوئے کرسی تک پہنچتے مگر مجال ہے جو چہرے پر کرب کی ایک بھی شکن ہو۔ بات چیت میں وہی شگفتگی اور ہر کسی سے سب سے پہلا یہ سوال ہوتا تھا ”کہو کیسا ہے؟“ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک درد مند دل رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ شوکت صاحب کے ہمراہ ان کے چند بے تکلف دوست بھی تھے۔ چند خواتین بھی تھیں جو شوکت صاحب کی پُر مذاق باتوں پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ شوکت صاحب نے ان سے [illegible] جانے کو کہا ایک خاتون بولیں ”آج تو ہم یہیں کھڑے ہو کر سنیں گے۔“ شوکت صاحب جلدی سے بولے ”نہیں بھئی! آپ پروگرام کے دوران بھی ہنستی ہنستی رہیں تو سننے والے کہیں گے آج قاضی جی کا پیٹ خراب ہے۔“ ان صاحبہ پر ہنسی کا وہ زبردست دورہ پڑا کہ خدا کی پناہ۔

سوا سال میں تقریباً ساٹھ ہفتے ہوتے ہیں۔ ساٹھ ہفتوں کا یہ خیالی البم جس میں شوکت صاحب کی ہنستی چہکتی مسکراتی تصویریں ہیں۔ زندگی سے بھرپور، زندگی کی الجھنوں کا مضحکہ اڑاتی ہوئی۔ اس البم کی آخری تصویر [illegible] مارچ کی ہے۔ اس روز شوکت صاحب مضمحل اور خاموش سے تھے جب میں نے مزاج پرسی کی، بہت مختصر سا جواب دیا۔ میں ڈر گئی۔ کبھی کبھی شوکت صاحب کراہ کر پہلو بدلتے تھے اور بار بار کھانستے تھے۔ لیکن پیشانی پر کوئی ناگواری کے آثار نہیں تھے۔ پروگرام اکٹھے ریکارڈ کئے گئے۔ ۱۶ مارچ کو ریڈیو اسٹیشن سے شوکت صاحب کے آخری قدم گئے اس کے بعد میں شوکت صاحب کو نہ دیکھ سکی۔ گھریلو الجھنوں کی وجہ سے وہاں بھی نہ جا سکی۔ ”ساٹھ ہفتوں“ کا یہ البم شوکت کی جیتی جاگتی تصویروں کا ہے ——— میں نے انہیں بستر علالت پر نہیں دیکھا ——— میرے ذہن میں ان کی بیماری یا موت کا کوئی تصور نہیں۔

۴ مئی ہفتے کا دن تھا۔ یعنی قاضی جی کے پروگرام کا دن۔ میں ریڈیو اسٹیشن کے ڈرامہ سیکشن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک جعفری صاحب کمرے میں آئے میز پر مسودہ رکھا آہستہ سے بولے شوکت صاحب کا انتقال ہو گیا جیسے کسی نے بے خبری میں زناٹے کا طمانچہ کھینچ مارا۔ میرا سر چکرا گیا۔ شوکت صاحب چل بسے کسی اور کی بھی آواز

آؤ ۔ [illegible] شیروانی پہنے ۔ ہیٹ لگائے ۔ محفلوں میں [illegible] بچے جیسی نہیں آئی ۔ جس نے ان کو دو
تصویر میں [illegible] شوکت صاحب اپنے آخری سفر پر جانے کے لیے تیار ہیں ۔ میں نے ان کی تصویر کو ایک
بار غور سے [illegible] دیکھا کہ محبت سی ہوتی ۔ دل میں ایک ہوک سی [illegible] حقیقت کو تسلیم کرنے سے
انکار کر [illegible] معلوم ہوتا ہے ان کے بغیر [illegible] زندگی کی آخری [illegible] شوکت صاحب
[illegible] شوکت سے [illegible] ان کا تصور [illegible]
[illegible]
[illegible]

خطوط

بنام ــ بڑی بیگم

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ
۱۰ اگست [illegible]

ڈارلنگ ـــ تمہارا شکریہ تمہاری صحت اور زندگی کا حصہ سے جاری ہے۔ تمہارا خط ملا اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے روپیہ طلب کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جہاں تم ہو وہاں تمہارے پاس کافی روپیہ ہونا چاہیے مگر کیا کروں کہ میں کافی روپیہ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ بہرحال جو کچھ ہو سکتا ہے بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے پہنچ جائے اس طریقہ پر بھیجنا خطرناک ضرور ہے مگر اس کے علاوہ صورت ہی کیا ہے۔ منی آرڈر بھیجنا مناسب نہیں سمجھا اور نہ رجسٹری بھیجنا۔ بہرحال اللہ مالک ہے انشاء اللہ پہنچ جائے گا۔ تم نے کپڑا خریدا بہت اچھا کیا۔ تنخواہ ملنے پر کچھ اور بھیجوں گا تم خرچ کی فکر نہ کرنا البتہ اپنا دل کسی بات میں نہ مارنا۔ خداوند کریم میری بنّو کو ہنستا اور خوش نصیب کرے اور وہ بہت بڑی عمر ساتھ تندرستی کے پاکر خوب اوڑھے اور پہنے۔

میں بالکل اچھا ہوں اب کھانسی بالکل نہیں ہے اور نہ حرارت ہے مگر گولیاں جو ڈاکٹر نے دی ہیں وہ برابر استعمال کر رہا ہوں۔ میری طرف سے بالکل اطمینان رکھو۔ البتہ اپنا حال لکھو کہ اب کیا حال ہے ہاتھ کے زخم کیسے ہیں۔ یہ تم نے ٹھیک لکھا ہے آج کل ٹمپریچر کا کوئی اعتبار نہیں اس تکلیف کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ اس تکلیف کے ساتھ ہی ساتھ کم بھی ہو گا۔

اچھا جناب اب یہ فرمائیے کہ تشریف آوری کب ہو رہی ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں بلا رہا ہوں بلکہ اس خیال سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ جو کچھ کہیں اسی کے اعتبار سے پیارے لال کو گھبرا جائے وہ اپنی بیوی کو لینے شاید پہلی ہی تاریخ کو جانے والے تھے میں نے ان سے کہا ہے کہ میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں اس کا انتظار کریں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کو پہلے سے لکھ کر پوچھ لوں۔ اس لیے لکھ رہا ہوں۔

سعید اور خورشید دونوں خدا کے فضل و کرم سے اچھے ہیں اس وقت سو رہے ہیں۔ اگر جاگتے ہوتے تو آپ کو خط لکھتے مگر میں ان کو جگانا نہیں چاہتا بہرحال ان کی طرف سے اطمینان رکھئے۔ خورشید کے دانت پہلے سے کم ہیں۔

ایک ملازم مل تو گیا ہے اور کام بھی کر رہا ہے مگر مرضی کے مطابق نہیں اوّل تو بدصورت ہے۔ دوسرے کچھ سست معلوم ہوتا ہے۔ کھانا پکانا جانتا ہے۔ میں نے فی الحال اسے رکھ لیا ہے۔ اگر کوئی اور اچھا آدمی مل گیا تو اسے رکھ لوں گا۔

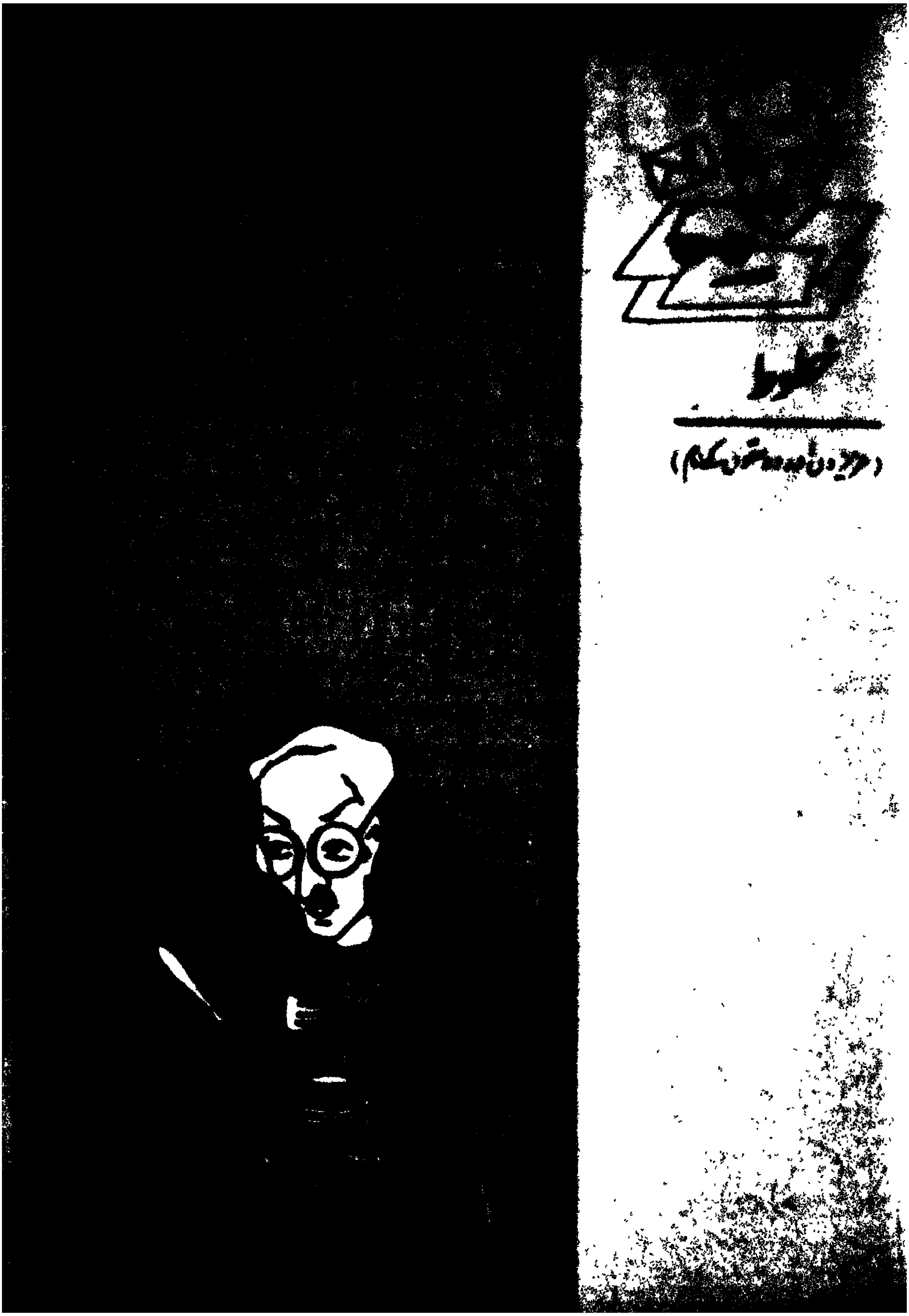

[illegible] ——— ۵۴۱ ——— [illegible]

[illegible] ان سے کہنا جواب لکھوں گا۔
اچھا اب رخصت چاہتا ہوں۔

تمہارا پرستار
شوکت

آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ
۵ر ستمبر ۴۸ء

سدو ڈارلنگ ——— کل تمہارا خط میرے پاس پہنچا اور تمہاری طبیعت سے انتہائی پریشانی کی حالت میں تھا ہمارے جو لطیفہ تم کو اب باقی ہو وہ بھی دور ہو جائے اور میرا یہ خط پہنچنے تک سب پریشانی میری جان سے دور ہو [illegible] میری بیوی بالکل تندرست ہو۔ آمین

تمہارے گھبرانے یا پریشان ہونے کی تو کوئی بات ہے۔ اس کو تو گھبرانا ہی نہ چاہیے جس کا کوئی چاہنے والا موجود ہو تم کو مگر شوکت تمہارا دیوانہ وار پرستار ہے۔ بالکل نہ گھبراؤ میں انشاء اللہ ۸ ستمبر کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر علی گڑھ سے چلا تو ۹ ستمبر کو تمہارے پاس موجود ہوں گا اور ۱۰ ستمبر کو وہاں سے ہم سب کی روانگی ہو گی میرا ارادہ تھا کہ ۷ ستمبر ہی کو روانہ ہو جاتا مگر یہاں سے [illegible] سے پہلے وہ ۷ ستمبر کو جا سکتے ہیں لہٰذا ۸ ہی کو روانگی ہو گی۔

آج حاتم کے والد کا خط مردان سے آیا تھا۔ حاتم غریب کی حالت اچھی نہیں ہے۔ انہوں نے ارادہ کر لیا ہے کہ حاتم کو جمعرات سینی ٹوریم میں داخل کر دیا جائے۔ بھائی زبیر کے نام بھی خط نکلا تھا میں نے خط بھیج دیا ہے۔ اگر حاتم جمعرات آ جائیں تو آپ [illegible] کہ اگر یہ نکلیں تو بھائی زبیر سے کہہ دینا کہ ان کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔

معلوم نہیں آپ کو روپیہ جو اس سے پہلے خط میں بھیجے ہیں ملے یا نہیں اس کا حال تو اب آپ کے کل والے خط میں معلوم ہوگا۔ ہمارے دو روپے بھیج گئے ہیں۔

تمہارے بچے بفضل تعالیٰ بالکل اچھے ہیں اور جدائی جانے کے لیے ایک ایک دن گن رہے ہیں۔

تم ہر طرح اطمینان رکھو کہ میں انشاء اللہ کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ ایک مسئلہ ہے نوکر کا [illegible] رکھ لیا ہے۔ اگر کوئی بہتر نوکر مل گیا تو اسے رکھ لوں گا بہر حال تم اطمینان رکھو۔

میرا یہ خط تم کو ۷ ستمبر کو ملے گا تم اب اس کا جواب کیا دو گی۔ میں خود ہی انشاء اللہ ۹ ستمبر کو پہنچ جاؤں گا۔

تمہارا ——— شوکت

پنجابی آرٹ پبلشرز، مسلم ٹاؤن، لاہور
۱۰ر مارچ [illegible]

ڈارلنگ سدو! خدا خدا کر کے آج ڈاک اور تار کھلے ہیں ورنہ ایک طرف تو [illegible] کے ہنگامے سے جیت

پریشانی ہوئی دوسرے آپ کا ارادہ معلوم نہ تھا۔ میں آپ کو [illegible] ملاقات سے [illegible] کی حفاظت کا [illegible] تھا کہ کہیں اخبار میں پڑھ کر آپ روانہ نہ ہو جائیں۔ سارے کیپٹن پر خدا جانے کب آپ کا خط ملا [illegible] ذکر ہے مگر فوراً ہی تار بھیجا اور تار وغیرہ یہاں پہلے سے بند کر دیے گئے۔ سب سے پہلے [illegible] کی اجازت مل [illegible] وہ تار سنسر میں رہ گیا۔ دوسرے دن دوبارہ تار بھیجا مگر تار نہ پہنچ پایا۔ وہ قیامت تھی کہ [illegible] کا حال یہ تھا کہ تیسری رات تک کوئی سو نہ سکا۔ تمام محلہ والے ہندوؤں اور پٹھانوں سے [illegible] شہر [illegible] بہت خراب ہو گئی تو جمیل صاحب اپنی بیوی اور بچی کو لے کر یہاں آ گئے اور بخاری صاحب [illegible] دوسرے دن حالات ذرا اطمینان بخش ہونے تو یہ لوگ واپس گئے۔ اب خدا کا فضل ہے کوئی خاص تشویش کی بات نہیں۔ آج [illegible] تار ملا اور ساتھ ہی ساتھ دو خط بھی جن میں سے ایک دوبارہ کا لکھا ہوا تھا اور دوسرا [illegible] معلوم نہیں [illegible] ہوں گے اور خدا جانے میرے خط کس طرح پہنچے ہوں گے اور نہ جانے پریشانی کی وجہ سے آپ کا کیا حال ہوا ہو گا بہرحال آج [illegible] کا تار بھی بھیج دیا ہے اور یہ خط بھی فوراً لکھ رہا ہوں کہ آپ کو اطمینان ہو جائے ہمارے یہاں سب خیریت ہے خدا کا فضل ہے

میری رائے یہ ہے کہ اب آپ تنہا نہ آئیں۔ جب آپ کا آنے کا ارادہ ہو مجھ کو لکھ دیجئے گا تاکہ مولانا کو بھیج دوں یا [illegible] اگر کوئی آ سکتا ہو تو ساتھ بھیج دیں۔ یوں تو اللہ مالک ہے وہی سب سے بڑا نگہبان ہے مگر انسان کو خود بھی احتیاط کرنا چاہیے۔

ذہبی کی حالت معلوم ہو کر تشویشوں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ خداوند کریم اس پر اپنا فضل کرے۔ ہم لوگوں کی پریشانیوں [illegible] اپنی اور بچوں کی خیریت سے جلد جلد اطلاع دیتی رہیے۔ آج کل دل بہت پریشان ہے۔ کل کا حادثہ سنئے کہ برکت [illegible] چل بسے۔ [illegible] وہی درد تھا جو مجھ کو ہوا کرتا تھا یعنی وہی آنت بڑھ جانے سے جو درد ہوتا ہے [illegible]۔ اچھا آدمی تھا غریب۔

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ بابا کو پیار۔ سعید کو بھی پیار۔ سعید کا مکمل انتظام کر دیجئے گا اور مکان کے متعلق خدا کے لیے کچھ لکھئے۔

آپ کا شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"
ایڈورڈز روڈ۔ راولپنڈی
۲۱ اگست ۱۹۶۱ء

بیگم صاحبہ۔ آداب ——— آپ کا خط ملا۔ میں نے اس پر غور کیا اور غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کو مبارکباد دوں۔

یہ خاندان ہر اعتبار سے اچھا ہے۔ میں اس کے اکثر حضرات سے واقف ہوں اور ان کی شرافت نسلی اور ذاتی شرافت کا قائل ہوں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سعید کی مرضی کو میں سب سے مقدم سمجھتا ہوں اور سعید اور عطیہ سلمہا کی راہ میں ناعاقبت اندیشی یا پہلی

رہ جاتی ہے [illegible] ہے مثلاً سپر غذی کے بعد سے [illegible] بھی [illegible] ہے [illegible] ہے [illegible] وقت [illegible] [illegible] ہے [illegible]

یہ احساس بہت [illegible] ہے تو شوق کے [illegible] ہوں۔ ڈاکٹر [illegible] ہے [illegible] ہوتی ہے لہذا میں [illegible] ہوں۔

احقر۔ شوکت

دفتر روزنامہ جنگ۔
راولپنڈی۔ ۱۹ مارچ [illegible]

سعید۔

تمغۂ امتیاز کے خطاب پر آپ کی خوشی فطری ہے۔ یہ اعزاز صرف میرا نہیں میرے تمام متعلقین کا ہے۔ خدا سب کو مبارک کرے۔

میں آپ کو تفصیلی خط فراغت سے لکھوں گا۔ اس وقت رسمی شکریہ ادا کر رہا ہوں۔

خورشید بہت خفا ہے اس کو پیار کرکے منا لیجئے۔ میں نے [illegible] اور [illegible] ذاتی [illegible] نہ ہوں یا کوئی دوسرا پرچہ دے دیجئے۔ اس کا خط آیا ہے، اس کا جواب ہے۔

آپ کا۔ شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"۔
راولپنڈی۔ ۱۰ اگست [illegible]

بیگم السلام۔

کمال کر دیا آپ سب نے کہ دیور دون کو بھابی جان مل گئیں اور ساس کو بہو مل گئی لہذا اب اس بڈھے کو گھاس ڈالنے کی کوئی ضرورت ہی نہ رہی۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں جب انعام الحق اور اقبال سلمہٗ کو خط لکھا تو معلوم ہوا کہ جناب مع دلہن بیٹی کے [illegible] پہنچ چکے ہیں۔

آج سڈنی سے سعید کا خط بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے ساتھ خیریت کے واپس لائے۔ اس بیچارے نے لکھا ہے کہ ابّا اپنے سوٹ کی پیمائش بھیج دیجئے میں آپ کے سوٹ لاؤں گا۔ میں نے اس کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ خبردار جو سوٹ لائے اس لیے کہ وہ جب تک سڈنی میں نوکری باندھ کر نہ پھرے، میرے لیے سوٹ لانے کی گنجائش نہیں نکال سکتا۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ جو کچھ لانا ہے وہ میری بیٹی یعنی اپنی دلہن کے لیے لانا ہے اس کی زیادہ خوشی ہوگی اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اپنی امی جان کے لیے

ایک نظارہ کا پہلا مسودہ۔

[illegible] کے بیچ اس حادثے میں ہر شعبہ اپنا کردار کسی اصول پر کھڑی ہو کر ادا [illegible] ایک [illegible] کہ دنیا یہ کہا کرے کہ میں نے حامد جلال صاحب کو ان کے متعلق جو خط لکھا ہے اس کا کیا نتیجہ ہوا۔ میں نے [illegible] صاحب کو [illegible] معاملہ میں لکھ دیا ہے کہ خورشید اور سعادت کے شعبہ میں سے ہیں۔ حامد جلال صاحب کا ابھی تک جواب نہیں آیا ہے لہٰذا تم [illegible] کو ذرا حامد جلال صاحب کو یاد دلانے کہ میرے خط کا جواب ان کے ذمہ ہے۔

بابا بیچارہ تو امتحان کی تیاریاں کر رہا ہوگا۔ لہٰذا اگر خط لکھ تو مختصر۔ [illegible] بھانجیوں [illegible] میرا بابا مجھے خط لکھا کرے گا۔

ان دونوں بدمعاشوں کو خیر دعا تو کہہ دیجئے مگر اس شفقت آمیز دعائیں صرف مُنی بی بی کو دی جائیں گی۔

مجھے پچھلے دنوں جو بخار آیا تھا وہ [illegible] تھا لہٰذا وہ اپنی کمزوری چھوڑ گیا ہے۔ ویسے بھی اب یہ کوئی سوال [illegible] کہ کمزوری میں اضافہ نہ ہو مگر میں پورا کھائے بغیر ہرگز مرنا نہیں چاہتا۔

آپکا ... شوکت

بھوپال

۱۴۔ فروری

میری اپنی سدّو — واقعی تم نے میرا خط پہنچنے سے پہلے ہی مجھ کو خط لکھ دیا۔ کیسا پیارا خط ہے۔ ایک ایک لفظ کا وہ لکھا ہوا اعتماد، وہ بھولی بھولی محبت وہ بچھڑی ہوئی خوبصورتی نمایاں، جس کے لیے تمہارا شوکت ترس رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ جیسے تم نے پیاسے کی پیاس بجھا دی۔ خدا میری چاہنے والی کو ہمیشہ میرے دل کی ملکہ بنائے رکھے۔ میری سدّو شاد و آباد رہے اور اس کا شوکت اس کا پروانہ بنا رہے۔ — آمین

تم ناحق گھبراتی ہو۔ میں دور سہی میرا تصور تو دور نہیں ہے۔ ہم دونوں پھر مل جائیں گے۔ سدّو تم بالکل نہ گھبرانا میری صحت بالکل اچھی ہے۔ درد میں کوئی زیادتی نہیں بلکہ مجھے اس دوا سے واقعی کچھ کچھ فائدہ محسوس ہو رہا ہے۔ اب ہر وقت کی کھٹک میں کمی ہے البتہ کھانے کے بعد کچھ تکلیف ہو جاتی ہے انشاء اللہ وہ بھی جاتی رہے گی۔ میرا پہلا خط جب تک تم کو نہ ملا ہوگا تم پریشان رہی ہوگی حالانکہ میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ تم کو خط لکھا۔

اچھا اب سنو یہاں سے کسی طرح ۱۹ فروری کی رات سے پہلے نجات نہیں مل سکتی۔ ۱۹ فروری کو ہز ہائنس کی طرف سے خاص تقریب ہے بغیر اس تقریب میں شرکت کے میں آزاد نہیں کیا جا سکتا لہٰذا میں ۲۰ فروری کی صبح ڈاک گاڑی سے چل کر رات کو لکھنؤ جاؤں گا۔ اسٹیشن سے ٹیلیفون کر کے وقت پوچھ لینا کہ جی۔ آئی۔ پی میل رات میں کس وقت پہنچتی ہے۔ غالباً اس کے پہنچنے کا وقت شام کو سات بجکر چھیالیس منٹ پر ہے۔ میں نے بے حد کوشش کی کہ مجھ کو نجات مل جائے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

کل رات کو مشاعرہ تو سنا ہوگا تم نے تو میری آواز سن لی ہوگی مگر میرے کان سدّو کی آواز کے لیے ترس رہے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

ہم تو کل سے بھی نہیں جانتی کیسے تھے یہ
[illegible]

آپ کا یہ شعر اس وقت یاد آ گیا ہے [illegible] کی طرح باتیں کرتی ہیں [illegible] آپ کا خط ابھی آیا [illegible] ہوتی ہیں [illegible] سے [illegible] کر [illegible] ہونے والا [illegible]

آپ میری صحت کی طرف سے بالکل مطمئن رہیے میں قطعاً اچھا ہوں اور آج [illegible] بہت بشاش ہوں۔ آپ کا بہت [illegible] سے پھر بھی ایک [illegible] ہونے والی کو [illegible] ہے۔ آمین۔

[illegible] آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ آج رات کو [illegible] کے یہاں آئیں گے۔ [illegible] باغ جانا چاہتی تھیں۔ میں نے ٹال دیا اس [illegible] کو آخر وہ دیکھ کر [illegible] پریشان ہونے کے بعد لیٹ رہی۔

سعدو باقر اس خط کا جواب مت دینا اس لیے کہ میں دفتر سے باہر ہوں گا۔ اب تم مجھے [illegible] خط لکھنا جو بہتر ہوگا۔ آپ بالکل تیار رہیے میرا خیال ہے کہ میں ۳۔۴ بجے آپ کو لینے آ سکوں گا مگر صرف ایک ساعت قیام کر سکوں گا اس سے زیادہ [illegible] کسی وقت پہنچوں گا اور دوسرے دن صبح آپ کے واپس ہو جاؤں گا۔

معلوم نہیں جگر بھوپال سے واپس آئے یا نہیں۔ بہرحال اب تو اس کا جواب بھی آپ دوسری تاریخ کو دیجئے گا۔ اب میں آپ کو خط لکھوں گا اگر موقع ملا تو کل ہی شاید خط لکھوں۔

آج کل میں اس خیال سے بہت خوش ہوں کہ میں آپ کی ایک خواہش کے پورا کرنے میں بفضل تعالیٰ کامیاب ہو گیا۔ یعنی آپ خدا کے فضل سے اپنی مرضی کے مطابق دو مہینے [illegible] میں گزار چکیں۔

سعدو اب ہم بھی کا بچہ نہ پائیں گے اب تو ہم سعدو کا بچہ پائیں گے جلدی سے ایک بچہ دو۔ شرماتی کیوں ہو بے۔ اچھا یہ خط شروع سے آخر تک تنا کو ضرور دکھا دینا۔

تمہارا اور صرف تمہارا
تمہارے علاوہ کسی کا نہیں
شوکت

معظمہ، مخدوم، مکرمہ
۱۰ اگست [illegible]

سلام و بندگی، اپنے غلام پرستار کی پرستش قبول کیجیے۔ کل صبح سے [illegible] اور یادداشتیں یہ کیفیت ابھی طاری ہے بہرحال میری تمام رعنائیاں، تمام شگفتگیاں، تمام [illegible] اور افسردگی کی کیفیت مجھ پر طاری ہے جو جدا اب تک نہیں ہوئی تھی ہے کہ شاید دل کی گہرائیوں [illegible] اشتعال اور ندامت نہ ہو لیکن فی الحال جو کیفیت مجھ پہ طاری ہے اس کو میں کیا جانتا ہوں میرے [illegible] والی میرے سخت سکون کی برداشت کرنے والی میری حسین مخدومہ! شاید آپ کو معاف کر [illegible] نہ رہے جو اب تک اپنے نادرو نظروں سے بنا ہوا تھا بلکہ شاید اب تو خود اپنے غلام [illegible] مجھ پر کل سے ایک سکوت کا عالم طاری ہے اور کسی سے بولنے کو دل نہیں چاہتا۔ رات بھر جو الجھن رہی۔ کاش کوئی دیکھتا اور دیکھا نہ جاتا۔

آج ایک رسالہ "ثریا" بیگم راحل ابلاغ نام ایک پرچہ ہے وہ بھی دیکھ لیجیے میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ "مخدوم" معذرت چاہتا ہوں۔ "مخدوم" میں آپ "دو دو باتیں" ضرور پڑھ لیجیے یہ میں لکھتا ہوں اور جب "دو دو باتیں" ختم ہو جائیں گی تو [illegible] ہے آج تک "مخدوم" میں جنس کے فلسفہ پر دو دو باتوں میں بحث کی ہے۔ تا کہ ہیں شائع کیجیے۔

سجاد حسین عطاری کی لڑکی زہرہ کل چھ بجے شام کو مر گئی۔

جو کو تنخواہ اس مہینہ میں ابھی تک نہیں ملی ہے ورنہ آپ کو ضرور اطلاع دیتا۔ پرسوں ترسوں ملے گی۔ ستمبر کی تنخواہ تو یکم کو میں خاص طور پر حاصل کروں گا اس لیے کہ کاپی ضرور جاتا ہے۔

اب کیا لکھوں مگر شاباش ہے آپ کو کہ آپ اس طرح ہر بات برداشت کر رہی ہیں۔ مجھ سے اپنی یہ بات خود ہی برداشت نہیں ہو رہی ہے مگر تم نے برداشت کر لی۔

شرمسار، گنہگار، سعیدہ کا غلام
شوکت

بنام ـــ چاوق بیگم

لندن ۱۷ جولائی

میری جو!

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔ میں نظامی صاحب کے ہمراہ آج دن کے ڈیڑھ بجے لندن پہنچ گیا۔ کل شام کے ۵ بجے کراچی سے چلا تھا۔ اب ارادہ ہے کہ ۲۴ کو یہاں سے چل کر ۲۵ کو کراچی اور ۲۶ کو لاہور پہنچوں۔ مگر آج معلوم ہوا ہے کہ جو جہاز یہاں سے جانے والا تھا وہ ۲۵ کو جائے گا۔ لہٰذا ۲۷ کو لاہور پہنچوں گا بہرحال کراچی پہنچ کر تار دوں گا۔

جو! تم اس ملازمت کے سلسلہ میں بالکل رنجیدہ نہ ہو جو تم چاہو گی وہی ہو گا۔ میری زندگی کا مقصد تمہاری خوشی ہے اگر تم ہی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شوکت

ROOM NO-759

۲۲ جولائی [illegible]

میری جان! [illegible] یہ تمہاری خط ہے۔ اس سے پہلے [illegible] خیریت [illegible] اپنی [illegible] بچوں [illegible] جو میں [illegible] بہت خوبصورت [illegible] کوشش کروں گا۔ بس اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے بمبئی پہنچ جاؤں۔ بہت دن ہو گئے اب [illegible] گھبرا رہی ہے۔ [illegible] خدا [illegible] خیریت معلوم ہو سکی۔ بہرحال تم سب کو خدا کے سپرد کیا ہے۔ [illegible] معلوم ہے کہ تم بہت اداس ہو گی۔ بہرحال اب یہ جدائی کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔ میری امی سے سلام کہنا۔ بھائی جان۔ بھابی۔ خالہ نانی جی کو آداب

شاہدہ۔ فوزیہ۔ [illegible] کو پیار

بڑے بھائی۔ چھوٹی بیا۔ نعیمہ کو پیار۔ مشتری۔ تابی۔ شریف اور زرینہ کو دعائیں

تمہارا اور [illegible]

شوکت

---

۱۰ فروری

یعنی فراق کا پہلا دن

میری جان!

ڈھاکہ پہنچتے ہی تم کو ارجنٹ تار دیا ہے اور تار دینے کے بعد ہی تم کو یہ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

یہ تمہاری دعائیں تھیں کہ زندہ سلامت ڈھاکہ پہنچ گیا ورنہ آج جو کیفیت گزری ہے وہ خدا کبھی نہ گزارے۔ جس وقت ہوائی جہاز

کے لئے ہم سب کو پریشانیاں پیدا ہو گئیں۔ ہوائی جہاز کے مسافروں میں پوری قسم کے لوگ ہی تھے۔ [illegible] دیں ہمارے [illegible] کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ خود ہوائی جہاز کے لئے [illegible] ہو گیا کہ شاید ہوائی جہاز کا راستہ بدلنا پڑا۔ بہرحال بالکل تباہ ہو گئے کے بعد یہ کیفیت ختم ہوئی اور جہاز [illegible] کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ اور میں نے بہت شکر ادا کیا۔ یہاں آکر یہ پروگرام معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ہم لوگ ایک بجے [illegible] جا رہے ہیں۔ کل صبح ڈھاکہ کے تاریخی مقامات دیکھیں گے۔ سہ پہر کو گورنر سے گورنمنٹ ہاؤس میں ملیں گے اور اس کے بعد [illegible] میں وزیر اعظم سے ملاقات ہو گی۔ سہ پہر کی چائے گورنر کے ساتھ ہے اور رات کو ہوٹل میں ڈنر کر کے اسی وقت [illegible] سے مشرقی روانہ ہو جائیں گے۔ جس ہوٹل میں اس وقت میں ہوں وہ ڈھاکہ کا بہترین ہوٹل ہے۔ بہرحال [illegible] زندہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ میں اپنی معصوم بچیوں کے لیے اور اپنی پیاری بیوی کے لیے زندہ ہوں۔

شوکیہ اور فوزیہ کے اسکول جانے اور آنے میں پوری احتیاط برتنا۔ شہد بابا کو بالکل [illegible] اماں کو تسلیم اور سب کو دعائیں۔

تمہارا
شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"
کراچی۔ ۱۱ اگست [illegible]

میری روح۔ میری جو!

تم سے رخصت ہو کر میں اس طرح کراچی پہنچا ہوں کہ جیسے روح لاہور میں چھوڑ گیا ہوں۔ یہاں اسٹیشن پر [illegible] پادری اور چنتا وغیرہ کے موجود تھے۔ ان کے ساتھ گھر آ گیا۔ [illegible] صاحب نے گھر بدل دیا ہے۔ یہ گھر [illegible] روڈ پر [illegible] میں ہے اور نہایت کشادہ ہے۔

مسز نظامی نے یہاں پہنچتے ہی [illegible] صاحب سے میری خیریت [illegible] میں سب کچھ کہہ دیا کہ میرے یہاں آنے میں کیا کیا رکاوٹیں تھیں اور آپ کی ساری پریشانی کا ذکر کیا۔ چنانچہ وہ مجھ کو میرے کمرے سے پکڑ کر لے گئے اور کہنے لگے کہ تم زہرہ کو فوراً بلا لو [illegible] کہ وہ رہنے کے خیال سے نہیں بلکہ عارضی طور پر آ جائے اور یہاں آکر خود اندازہ کرے کہ حالات کیا ہیں اور ہم لوگ اس کا ساتھ کس طرح دیتے ہیں۔ پادری جی نے کہا ہے کہ میں زہرہ کو اسی مکان میں فی الحال رکھوں گی اور اوپر کا کمرہ [illegible] وغیرہ کے ٹھیک کرائے دیتی ہوں تاکہ وہ یہاں رہ کر یہ فیصلہ کرے کہ اس کو لاہور میں رہنا ہے یا یہاں۔ یہ کتنا پیار ہے کہ طبیعت سخت [illegible] ہے۔ طبیعت اچاٹ ہے اور دل سخت گھبرا رہا ہے کہ نہ جانے لاہور میں کیا ہو رہا ہو گا۔ خدا کرے آپ سب اور میری بچیاں [illegible] ہوں — آمین

اماں کو تسلیم کہئے۔ بھائی جان۔ بھابی۔ خالہ وغیرہ کو آداب۔ شوکیہ۔ فوزیہ اور شہد بابا کو پیار۔ جمال۔ [illegible] وغیرہ کو دعائیں۔ نانی اور مشتری اور شریف کو دعائیں۔

خط ——— ۵۹۹ ——— [illegible]

[illegible]

آپ کا پردیسی میاں
شوکت

[illegible]
[illegible]
[illegible]

میری جان!

خط ملا۔ آپ بخیریت تمام وہاں پہنچ گئیں اور میری بچیاں بفضلہ تعالیٰ بخیریت تمام ہیں۔

اب جیسے بھی حالات ہیں۔ میرے لیے جس مکان کا ان لوگوں نے انتظام کیا تھا۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس میں رہا جا سکے۔ اس میں کل تین کمرے ہیں۔ سب سے بڑا کمرہ اتنا ہی ہے جتنا بڑا ہمارے گھر میں وہ کمرہ ہے جس میں جالی لگی ہے۔ [illegible] دوسرا کمرہ اس سے تھوڑا سا چھوٹا ہے۔ تیسرا بس اتنا ہی کمرہ جیسی آپ کی بڑی اماں کے گھر میں بیٹھک۔ ایک چھوٹا سا صحن ہے جس سے ملا ہوا باورچی خانہ ہے۔ ڈیوڑھی میں ایک غسل خانہ ہے۔ جس میں نل ہے اور اسی میں کچھ حصہ کر کے پاخانہ بن سکتا ہے [illegible] ہے۔ میرے اس مکان کی یہی تفصیل ہے۔ اگر سامان آ جاتے تو اسی میں رکھ دوں اور کسی دوسرے مکان کی تلاش میں ہوں۔ مکان مل گیا تو اچھا ہے ورنہ اسی گھر میں رہنا پڑے گا اور اسی کو درست کیا جائے گا۔ تین چار دنوں کے بعد سب [illegible] دفتر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ بس اتنا ہی کچھ غنیمت ہے [illegible] پر ہے جہاں کشمیر وغیرہ کے بھی بنگلے ہیں۔ علاقہ اچھا ہے اور مکان لب سڑک ہے۔ البتہ اگر اسی مکان میں رہنا پڑا تو بڑی محنت کر کے اس کی صفائی اور ٹھیک کرانا پڑیں گے اور بجلی کا سسٹم درست کرانا پڑے گا جو نہایت خستہ حالت میں ہے۔

اب آپ راستے دیکھئے کہ کیا کروں۔ اگر آپ کے ساتھ وہ چھوٹے کوئی ملازم آ جائے اور زہرہ کی ماں کچھ دن کے لیے آ جائے تو بہت اچھا ہے۔ راولپنڈی میں گرانی بہت ہے جس کا اندازہ اخبار سے آپ کو ہو جائے گا جو میں نے بھائی جان کے نام جاری کرا دیا ہے امید ہے کہ مل رہا ہو گا۔ میری عجیب حالت ہے۔ نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا۔ کسی وقت کھانا مل گیا تو کھا لیا ورنہ [illegible] کر تسکین کر لی۔ کبھی ایک [illegible] گوشت اور ایک [illegible] آج ہی [illegible] اور دو گوشت [illegible] رات بھر [illegible] کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔

اب آپ بہ تفصیل خط لکھئے۔ اور یہ بھی لکھئے کہ نزلہ وغیرہ کیسا ہے۔ خدا کرے کہ آپ بالکل ٹھیک ہوں۔ اور میری بچیاں بھی ٹھیک ہوں۔

کتنا اچھا ہو کہ اگر آپ کے ساتھ اماں بھی کچھ دن کے لیے آ جائیں اور آپ کا گھر ٹھیک کرا دیں۔ سامان کی بلٹی کہاں ہے؟ وہ سامان کب تک پہنچے گا؟ شریف سے پوچھ کر لکھئے۔

آپ کا پردیسی میاں
شوکت

شوکت تھانوی — ایک صحافی

احمد جمال پاشا

شوکت تھانوی پیدائشی صحافی تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کی عمر مشکل سے ۱۱، ۱۲ برس کی ہوگی۔ اپنے اسکول کے دوستوں کے لیے ایک قلمی رسالہ نکالتے تھے اس کے بارے میں مابدولت یوں لکھتے ہیں کہ :-

قلمی رسالہ

> "اس زمانے میں ہم نے اپنے اسکول دوستوں کے لیے ایک قلمی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ اس رسالے کو خود نہایت خوشخط لکھتے تھے۔ اس میں کارٹون بھی بنتے تھے، نقلیں ہوا کرتی تھیں اور احباب پر چوٹیں ہوتی تھیں۔ یہ قلمی رسالہ حلقۂ احباب میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ہر نمبر صرف ایک ہی ہوتا تھا۔ احباب کے یہاں ایک ایک دن مہمان رہتا تھا اور گشت ختم کر کے پھر ہمارے پاس آجاتا تھا۔ پندرہ دن بعد دوسرا نمبر نکلتا تھا۔ مگر اس کے غالباً چار ہی پانچ نمبر نکل سکے۔"

رسالہ حسن ادب لکھنؤ کی ادارت اس کے ۵ سال بعد سنہ ۱۹۲۵ء میں کی۔ یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ منشی واحد علی لطف لکھنوی اس رسالے کے چیف ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، منشی، مصحح سنگ اور خوشنویس، غرض سبھی کچھ تھے۔ پاٹے نالے لکھنؤ پر ان کا دستی پریس اور رسالے کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ منشی صاحب موجودہ ایڈیٹر سے مطمئن نہ تھے۔ شوکت تھانوی رسالے میں اشاعت کے لیے مضمون دینے گئے۔ انھوں نے مضمون اتنا پسند کیا کہ ان کو رسالے کا ایڈیٹر بنا دیا۔ شوکت تھانوی اس سے قبل کسی رسالے کے سرورق پر ایڈیٹر کے بجائے "رئیس التحریر" لکھا دیکھ چکے تھے لہذا رسالہ 'حسن ادب' کے تازہ شمارے کے سرورق پر ایڈیٹر کی جگہ 'ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی' لکھا گیا۔ چونکہ اس رسالے کا سر پیر نہ تھا اور منشی صاحب اس پر اس قدر حاوی تھے کہ جہاں سے چاہتے رسالہ شروع کر دیتے اور جہاں چاہتے ختم کر دیتے۔ پھر ان کے جیسے سیلانی آدمی کے لیے منشی صاحب کی ناز برداریاں ممکن نہ تھیں لہذا چار پانچ اشاعتوں کے بعد یہ رسالے سے علیحدہ ہو گئے اور رسالہ 'حسن ادب' بند ہو گیا۔

نقوش ـــــ ۱۸۵ ـــــ شوکت نمبر

[illegible] نے ۱۹۳۳ء میں لکھنؤ سے [illegible] ملازمت [illegible] ترنگ بطور [illegible] شرکت [illegible] ہو گئے تھے۔ [illegible] ہفت روزہ ترنگ اخبار [illegible] کالم [illegible] شوکت تھانوی [illegible] ہوتے تھے۔ [illegible] شوکت [illegible] شوکت تھانوی کا [illegible] پیش [illegible] جاتا ہے کہ

• [illegible] شوکت [illegible]

[illegible] کئی سال جاری رہا اور ہمدم میں آنے کے بعد ہی شوکت تھانوی [illegible] میں [illegible] تھے۔ سے شوکت تھانوی ۱۹۳۳ء میں [illegible] ہمدم کی ملازمت کے روزنامہ ہمدم لکھنؤ (پہلا دور) [illegible] لکھتے ہیں کہ :-

• والد کے انتقال کے بعد فکر معاش دامن گیر ہوئی۔ میرے ماموں مجھے ہمدم کے چیف ایڈیٹر خان بہادر سید محمد حسین رضوی کے پاس لے گئے جو ہمارے عزیز بھی تھے۔ اور سید صاحب نے اسی وقت پروانۂ تقرری دے دیا اور چالیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ (ما بدولت،

• استاذی میر بشارت علی جالب دہلوی روزنامہ ہمدم کے ایڈیٹر تھے۔ ہمدم کے ڈائریکٹر خان بہادر سید محمد حسین رضوی ایم اے نے مجھے ہمدم کے دفتر میں بلایا کہ میں مترجم کی حیثیت سے کام کروں۔ (شیش محل۔ جالب دہلوی ص۹)

• قاضی محمد حامد صاحب حسرت ہمدم کے نیوز ایڈیٹر تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی انھوں نے اپنے ہی کمرے میں ہمارے لیے ایک علیحدہ میز لگوا دی۔ اور سب سے پہلے ہم کو یہ کام بتایا کہ آپ ہمدم کے دو مہینے کے فائل لے کر تمام مقالات افتتاحیہ و شذرات پڑھ ڈالیے تاکہ آپ کو حالاتِ حاضرہ کے علاوہ ہمدم کی پالیسی کا اندازہ ہو جائے اس کے بعد آپ سے کوئی تحریری کام لیا جائے۔ ... ہم نے ۳ دن میں ۲ مہینے کے فائل پڑھ ڈالے اور مزہ یہ کہ - دو دو بار "بھی پڑھ ڈالیں۔ اب قاضی صاحب نے ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کیے، کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا، خبروں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات نہ تھی مگر شذرات بعد جالب صاحب کے پاس بھیج دیے جاتے تھے۔ (ما بدولت ص۹۶، ص۹۷)

ہمدم میں ملازمت اور کالم نگاری کے بارے میں شوکت تھانوی کے معاصر فرقت کاکوروی لکھتے ہیں کہ :-

• جب ۱۹۲۶ء میں میں دسویں جماعت میں تھا تو معلوم ہوا کہ وہ روزنامہ ہمدم

لکھنؤ میں، جو سید جالب دہلوی صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا اسسٹنٹ ہو گئے چونکہ وہ ایک فطری انشا پرداز اور مزاح نگار تھے اس لیے اسسٹنٹ کے فرائض کے ساتھ ساتھ مزاحیہ مضامین لکھ کر سید جالب کو دکھاتے تھے۔ شروع شروع میں سید صاحب اُن کی ساری عبارت کو سرخ روشنائی سے قلم زد کر کے ردّی میں پھینک جاتے۔ آپ اسسٹنٹ رہیے یہ کام آپ کے بس کا نہیں ہے۔ مگر شوکت صاحب نے اُن کی اس ڈانٹ ڈپٹ کی پروا نہ کی اور برابر جالب کی ڈانٹ ڈپٹ کھاتے رہے اور اُن سے اصلاح لیتے رہے۔" (شوکت تھانوی کے لطائف)

نسیم امروہوی مدیر سترنگ کے نام چودھری رحم علی الہاشمی سابق مدیر روزنامہ ہمدم لکھنؤ کا ایک حالیہ خط کا متن بھی اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

مکتوب بنام نسیم امروہوی

احاطہ کالے صاحب، قاسم جان اسٹریٹ، دلی ۶
۲۳ مئی ۶۳ء

مکرمی نسیم صاحب

سلام علیک، "حریم" میں آپ کے سفرِ دہلی کا حال پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آپ دلی تشریف لائے اور میرے پڑوس میں قیام فرمایا اور مجھے اطلاع تک نہ ہوئی۔ پھر شوکت مرحوم کی تعزیت جو آپ نے کی ہے اس میں تمام حالات واقف ہونے کے باوجود آپ نے وہ حصہ حذف کر دیا جس میں میرا کچھ ذکر آتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ جب جالب صاحب مرحوم کے بعد میں نے "ہمدم" کا چارج لیا ہے اس وقت شوکت صاحب شعبہ اشتہارات کے کلرک تھے میں نے سارے عملے سے مختلف کام لے کر شوکت صاحب کو صرف "دو دو باتیں" کا کام لکھنے پر مامور کیا۔ اور اسی میں سب سے پہلے "سودیشی ریل" چھپی جس پر میری اصلاحیں بھی تھیں بعد میں پھر اسے اور بڑھا کر شائع کیا گیا۔ اس قدر جلد آپ نے مجھے بالکل ہی اپنی یادداشت سے خارج کر دیا۔

باقی بہر حال اللہ کا شکر ہے۔

نیاز مند

رحم علی الہاشمی

ان متضاد بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۰ اپریل ۱۹۲۸ء (شوکت تھانوی کے والد کے انتقال کی تاریخ)

---

[1] سید جالب دہلوی افیون کھاتے تھے اس لیے ان کی ساری گفتگو نون غنّہ میں شرابور ہوتی تھی۔

یہ بات قدرتی تھی کہ [illegible] شعبہ [illegible] کی دیکھ [illegible] شوق [illegible] کام [illegible] [illegible] اصلاح [illegible] شروع کر دیے تھے۔

- پہلے [illegible] حروف کی صورت [illegible] لیکن [illegible] [illegible] میر صاحب کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] گئے۔ رفتہ رفتہ [illegible] حیثیت [illegible] مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ کوئی چیز بغیر اصلاح کے رہ گئی ہو۔ شذرہ ہو، مزاحیہ کالم ہو، ہر جگہ اصلاح موجود! اکثر تو اصلاح پر غصہ بھی آ جاتا تھا۔ تو [illegible] کر کے رہ جاتے۔ ہم نے لکھا تھا ایک جگہ "نقطۂ نگاہ" ـــ آپ نے اس کو کاٹ کر لکھ دیا "زاویۂ نگاہ"۔ جھلاتے ہوئے وہ اصلاح لے کر میر صاحب کے پاس پہنچے۔

"آپ نے "نقطۂ نگاہ" کاٹ کر "زاویۂ نگاہ" بنا دیا۔ اس میں کیا فرق پیدا ہو گیا۔؟"

سر جھکاتے ہوئے بولے ـــــ "بہت بڑا فرق ہے دونوں میں "نقطۂ نگاہ" تیقّن کے موقع پر استعمال ہوتا ہے گویا آپ کی نظر پورے وثوق کے ساتھ ایک خاص نقطہ پر ہے اور "زاویۂ نگاہ" میں شک کا احتمال باقی رہ جاتا ہے۔ گویا نگاہ نے نقطہ تک پہنچنے کا ایک زاویہ تو بنا لیا ہے مگر ابھی وہ نقطہ نہیں دریافت کیا ہے جس موقع پر آپ نے لکھا ہے وہاں "زاویۂ نگاہ" زیادہ بہتر ہے آپ نے لکھا ہے کہ "سائمن کمیشن" کے متعلق ہمارا "نقطۂ نگاہ" یہ ہے کہ حکومت نے اپنے تدبّر کے فقدان کا ایک اور ثبوت دیا ہے۔ اگر یہاں "زاویۂ نگاہ" لکھ دیجئے تو آپ پر نتیجے کی ذمہ داری نہیں رہتی اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ سائمن کمیشن کا مقصد نتیجے پر پہنچ کر عین تدبّر ثابت ہو۔ اس وقت اگر "زاویۂ نگاہ" غلط بھی ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں مگر "نقطۂ نگاہ" کا غلط ہونا ایک صحافی کی موت ہے" ـــــ اپنا سا منہ لے کر چلے آئے

مختصر یہ کہ اس قسم کی اصلاحوں کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔"

غرض "ہمدم" میں دفتری امور، ترجمہ اور شذرات کے ساتھ ساتھ اخبار کا "مزاحیہ کالم" "دو دو باتیں" بھی لکھنا شروع

کہ سید جالب نے ان کے کالم کو سراہا اور حوصلہ افزائی کی۔ رفتہ رفتہ یہ کالم مقبول ہونا شروع ہوا اور یہاں تک کہ اخلاص سے محبت سے "دو دو باتیں" لکھنے والے کو اپنے کالموں میں واقعہ یہ ہے کہ [illegible] کرنا شروع کیا۔ زمانے کے مزاحیہ کالموں میں شوکت تھانوی صرف مولانا عبدالمجید سالک کے "افکار و حوادث" کی مستقل خوبی سے متاثر ہوئے ہیں کہ انھوں نے جگہ جگہ اپنی تحریروں میں اعتراف بھی کیا ہے۔ "دو دو باتیں" کی مقبولیت یہاں تک ہوئی کہ دوسرے اخبار اس کالم کو نقل کرنے لگے اور اس کالم کے فقرے لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔ "دو دو باتیں" نمونہ دیکھئے :

دو دو باتیں (روزنامہ ہمدم لکھنؤ پہلا دور)

— قرطاس ابیض کے متعلق ہم سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ کوئی نہایت ہی مقدس صورت باشرع بزرگ ہوں گے۔ بڑی سی داڑھی ہوگی۔ لمبی سی تسبیح رکھتے ہوں گے۔ بڑا سا عمامہ باندھے عبا وغیرہ پہنے ہوئے بالکل رمضان شریف کی طرح۔ رتھ پر سوار تشریف لائیں گے اور خود اپنے "السلام علیکم" سے اپنی آمد کی اطلاع دیں گے لیکن جب ۱۸ مارچ کی صبح کو شور بلند ہوا کہ "قرطاس ابیض آ گیا۔ قرطاس ابیض آ گیا" تو خاکسار با [illegible] ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا مگر جناب مولانا قرطاس ابیض کا کہیں پتہ نہ چلا کہ وہ کس راستے سے تشریف لائے اور کہاں گئے، مجبوراً لوگوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ آپ اخبار پائنیر میں تشریف رکھتے ہیں۔ جب "پائنیر" دیکھا ہے تو معلوم ہوا کہ ع

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

بہرحال ہم نے شروع سے آخر تک اس قرطاس کو دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی، اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو ایک معمولی سی سمجھ کے انسان کے ذہن میں نہ آ جاتی ہو جا بجا ہم مختصر یہ کہ ہم نے اس کو ایک مرتبہ پڑھا اور دوسری دفعہ مع مضمون کے پڑھ کر بخوبی سمجھ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اب چپ رہو ذرا دیکھو تو دوسری بڑی بڑی کھوپڑیوں والے کیا فرماتے ہیں بلکہ اس مسئلہ کے اس کے بعد میاں بالفرض تم بھی اکثریت کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دینا ہی تمہاری رائے ہوگی اور دراصل یہی محفوظ ترین راستہ ہے بلکہ موجودہ زمانے کے تدبر کا راز اسی ایک نکتہ میں پنہاں ہے کہ انسان اقلیت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے بس چپکے سے اکثریت کے ساتھ ہو جائے ورنہ نتیجہ یہی ہوگا کہ تمام دنیا انگشت نمائی کرے گی اور اس انگشت نمائی کی تاب ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ لا سکتے ہیں جو بلا کے پڑھے لکھے ہوں اور بہرحال اپنے لیے امن اسی میں ہے کہ جو سب کی رائے وہی ہماری ورنہ اختلاف

[illegible] ـــ ۵۵ ـــ [illegible]

[illegible]

یہ جناب مدیر ہمدم [illegible] خاص طور سے ہندوستان کے شکریئے کے مستحق ہیں [illegible] [illegible] گئے۔ مگر اب یہ [illegible] [illegible] کی [illegible] تیار کی ہے [illegible] [illegible] گیا ہے کہ [illegible] نام [illegible] جلسے۔ چنانچہ [illegible] ثبوت [illegible] [illegible] نہیں بلکہ [illegible] ہے [illegible] [illegible] ہیں۔ اب [illegible] سکتا ہے۔

بہرحال ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ کوئی سروکار نہیں۔ ہم بہرحال سنجیدہ ہیں۔ ہماری رائے بہرحال سنجیدہ ہوگی اور وہ یہ ہے کہ یہ آئینی دستاویز کو کہ خود نویسوں کو گورنری یا گورنر جنرل کا مستحق نہیں بناتی۔ پھر بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ایک خامی کے ہر طرح مکمل ہمارے ہندوستان کی موسمی حالت کے عین مطابق ہے یعنی یہ مئی اور جون کی گرمی میں ناگوار ہوگی اور دسمبر جنوری کی سردی میں۔

اسی زمانے میں رسالہ "پیمانہ" میں "امرود" اور "پان" وغیرہ کے عنوان سے ساغر نظامی کی کچھ شوخ نظمیں شائع ہوئیں جن کی تیزی اور بے حجابی پر دوسرے بزرگوں کے علاوہ سید جالب نے بھی شدید اعتراض کیا۔ سید صاحب نے "ہمدم" میں "ادب کے نام پر فحاشی" کے عنوان سے ایک بہت سخت اداریہ لکھ دیا جس پر سید صاحب اور علامہ سیماب اکبرآبادی میں ان بن ہوگئی۔ اور وجہ یہ تھی کہ لکھنؤ میں سیماب اور ساغر کے پیچھے پیچھے مجاز کر پڑا ہوا تھا۔ اور دونوں کے کلام کی سخت پیروڈی کر رہا تھا۔ سید صاحب کا لکھنا تھا کہ علامہ سیماب ذاتیات پر اتر آئے اور اپنے پرچے "تاج" آگرہ میں ان کی افیون نوشی پر کھلا وار کہ "یہ افیونی اپنی پینک سے اس وقت چونکا ہے جب زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے اور اب یہ اعتبارات کی لکیر پیٹ رہا ہے" اس پر سید جالب نے برافروختہ ہو کر اس معرکہ کی کمان شوکت تھانوی کے سپرد کر دی اور "دو دو باتیں" کا کالم علامہ سیماب کے لیے وقف ہوگیا۔ جس کا تذکرہ "ہمدم" کے دوسرے دور کے ذیل میں آئے گا۔ اسی دوران منتظمین "ہمدم" اور سید جالب سے پالیسی کے سلسلہ میں ان بن ہوگئی۔ انھوں نے "ہمدم" سے

انتقال ہو گیا اور ہمدم کے بعد ہمت کر کے خود اپنا ذاتی اخبار "ہمت" نکالا۔ سید جالب نے "ہمدم" سے علیحدہ ہونے کے بعد [illegible] میں [illegible] کیا اور اس میں **روزنامہ ہمت لکھنؤ** کا مزاحیہ کالم شوکت تھانوی کے سپرد کیا۔ کچھ عرصہ بعد سید جالب کا انتقال ہو گیا۔ جس سے اخبار بند ہو گیا۔ "ہمت" میں شوکت تھانوی کی "دو دو باتیں" کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

دو دو باتیں (روزنامہ ہمت لکھنؤ)

یہ ٹھیک ہے کہ جس گھر میں بیٹی ہوتی ہے اس میں پیغام آتے ہی رہتے ہیں ایک ایک لڑکی کے لیے خدا جانے کتنے پیغامات آتے ہیں اور کس قدر امیدوار ہوا کرتے ہیں لیکن آخر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ صرف ایک ہی کامیاب ہوتا ہے باقی سب ناکام رہ جاتے ہیں۔ اس قسم کے اتفاقات بہت کم ہوتے ہیں کہ بیک وقت ایک سے زیادہ امیدوار کو اس قسم کے معاملات میں کامیابی حاصل ہو لیکن یہ تو دنیا ہے یہاں کم واقعات بھی بکثرت ہوتے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کے اتفاقات ہوتے ہی نہیں البتہ کم و بیش کا فرق ہے چنانچہ یہ جو قصہ ہم سنانے والے ہیں وہ اسی قسم کے واقعات میں سے ایک ایسا واقعہ ہے جو اگر اپنی نوعیت کا پہلا نہیں تو کم از کم عجیب و غریب ضرور ہے اور آپ یقیناً اس کو سن کر دنگ رہ جائیں گے۔

اسی مارچ کے مہینے کا واقعہ ہے کہ بجنور میں ایک دلہن کو بیاہنے کے لیے دو مختلف دولہا اپنی اپنی براتیں لے کر دلہن کے یہاں آ موجود ہوئے قصہ دراصل یہ تھا کہ ایک بیوہ پنڈتانی نے اپنی حسین و جمیل اکلوتی بیٹی کی شادی ایک جگہ طے کی اور یہ سودا سوا دو ہزار روپے پر طے ہوا لیکن اس اثنا میں ایک دیہاتی گاہک بھی پیدا ہو گیا اور اس نے اس جنس لطیف کو حاصل کرنے کے لیے چار ہزار روپیہ لگا دیا ٹھیک ہے کہ ع

مال اچھا ہے تو دنیا میں خریدار بہت

دلہن کی تجارتی دماغ رکھنے والی والدہ ماجدہ نے دونوں گاہکوں کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنی ایک عدد بیٹی کے لیے دو عدد براتیں ایک ہی وقت میں اپنے یہاں بلا کر کہہ دیا تاکہ دونوں امیدوار ایک دوسرے کے سامنے بولی بولیں اور جو زیادہ دام لگائے اسی کے نام نیلام ختم کر دیا جائے ممکن ہے کہ اس طرح قیمت چار ہزار سے بھی بڑھ جائے اور ایک دوسرے کی ضد پر دونوں خریدار قیمتوں میں اضافہ کر دیں۔

خیر صاحب دونوں براتیں بیک وقت دلہن کے گھر پہنچ گئیں اور ہر ایک امیدوار نے اپنے دوسرے رقیب کو روبرو دیکھ لیا۔ لیکن یہ قصہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا اب ذرا ٹیپ کا بند

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تو ایک [illegible] ہے کہ [illegible]

[illegible]

اس کے بعد دولہا نے پولیس میں رپورٹ کر دی۔ [illegible]
ہے چنانچہ دلہن کی والدہ [illegible]
دولہا کا پتہ نہیں ہے [illegible] دلہن جس کی
قسمت کی [illegible]
دولہا پر جو لعنت [illegible]
جس نے ایک لڑکی کے [illegible] دولہا تیار کئے [illegible]
دولہا کہنا چاہیے ۔

روزنامہ ہمدم لکھنؤ (دوسرا دور)

سید جالب کی "ہمدم" اخبار سے علیحدگی کے بعد اخبار کی ادارت ایک ہفتہ تک سابق مدیر "مدینہ" بجنور ملک نصر اللہ خاں عزیز نے کی اس کے بعد قاضی محمد حامد صاحب حسرت قائم مقامی کرتے رہے اور دو دن کے لیے شوکت تھانوی بھی ہمدم کے ایڈیٹر رہے پھر چودھری رحم علی الہاشمی نے باضابطہ ادارت سنبھال لی۔ ہاشمی صاحب آتے ہی "دو دو باتیں" کا مزاحیہ کالم شوکت تھانوی کے سپرد کر دیا۔ علامہ سیماب سے "دو دو باتیں" میں ہمدم کی معاصرانہ نوک جھونک جاری تھی اور اب اس ناخوشگوار بحث نے باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ علامہ نے اپنے اخبار کے علاوہ اپنے ایک شاگرد خواجہ ستار الحسن جمیل مدیر "فرشتہ" ہفت روزہ سے بھی ہمدم کے خلاف آتش فشانی شروع کروا دی۔ "فرشتہ" کی ایک تحریر کا جواب دیتے ہوئے ہاشمی نے لکھ دیا کہ "فرشتہ تو فرشتہ اس عالم الملکوت تک کے فرشتوں کو کیا اس کی خبر

ضمیمہ "ہمدم" روزانہ اخبار ہے اور یہ گزشتہ دور میں نکلنے والے ہفتہ وار اخبار ہی کی مثال [illegible] مزید بارہ [illegible] سکیں نہ ہی ہفتے کے بال بچے دو سالانے گزار کر پہلے ہی ساتھ لے "شکوہ" [illegible] جواب [illegible] کر سے

ادب باقی ہے اور نہ شعر اب باقی ہے
فقط طاقتوروں کی فکر بلند زاد باقی ہے
کوئی ہمدم کے بازاری ملک [illegible]
کہ شعار مر گیا اس کی گھر [illegible] باقی ہے

سنجیدہ قسم کے بزرگ اس ناخوشگوار بحث کو ختم کرانا چاہتے تھے چنانچہ چودھری رحم علی الہاشمی مدیر "ہمدم" نے اس جنگ کو ختم کرنے کے لیے شوکت تھانوی سے اصرار کیا۔ شوکت تھانوی نے رسالہ "پیام" میں سیماب کی تازہ غزل پر سخت تنقید کرتے ہوئے اور اپنے مضمون کو چٹکیوں میں اڑاتے ہوئے (علامہ سیماب کا مقطع یہ تھا۔ "سیماب حقیقت میں قدرت کا تمسخر ہے") لکھ دیا کہ "اب جبکہ مولانا نے خود اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اب ہم کو مولانا کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے اور آج سے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔"

رسالہ انکشاف "لکھنؤ ظریف نمبر" اسی دوران چودھری رحم علی الہاشمی نے ایک آنہ فنڈ لکھنؤ کا ماہنامہ "انکشاف" کے ایڈیٹر نسیم انہونوی کو شوکت تھانوی سے ملوایا۔ نسیم انہونوی "انکشاف" کے لیے مضمون لینے گئے تھے اس ملاقات کے بعد دونوں میں چٹکیاں بڑھنا شروع ہوئیں یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے ہمیشہ کے لیے جگری دوست ہو گئے۔ شوکت تھانوی کے مشورے پر نسیم انہونوی نے "انکشاف" کا سالنامہ "ظریف نمبر" کی صورت میں فروری سنہ ۳۳ء میں بڑے دھوم دھام سے نکالا۔ اس نمبر کو شوکت تھانوی نے مرتب کیا تھا اس نمبر میں ہندوستان کے تمام طنز و مزاح نگار شریک تھے۔ اس زعفران زار نمبر کا اداریہ شوکت تھانوی نے "بیگار" کے عنوان سے لکھا تھا جس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

> "کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس، یعنی رسالہ ایک آنہ فنڈ کا، ایڈیٹر اس کے میاں نسیم صاحب اور شذرات لکھیں مولانا شوکت تھانوی، گویا مولانا شوکت تھانوی نہ ہوئے کرایہ کے بلکہ بیگار کے ٹٹو ہو گئے۔ کہ چاہے [illegible] میں جوت دیا، چاہے تانگے میں لگا دیا، ہم کو تو کچھ چلنے سے کام، یہ رمضان شریف کا زمانہ دیکھئے، یہ عید کی آمد اور اس سلسلے میں ہندوستان کے رسائل کے عید نمبروں میں ہمارے مضامین کا شریک ہونا ملاحظہ فرمائیے اور پھر سب سے پہلے یہ شذرات لکھنا دیکھئے، شذرات کیا لکھ رہے ہیں حق دوستی بھگت رہے ہیں۔"

انکشاف کا ظریف نمبر بے حد مقبول ہوا مگر اس کے ساتھ پالیسی سے اختلاف کی بنا پر نسیم انہونوی "انکشاف" سے کنارہ کش ہو گئے اور اسی کے سال بھر بعد شوکت تھانوی کے مشورے سے "سرپنچ" ہفتہ وار نکالا اور اس کی

[illegible] شوکت تھانوی کے [illegible]۔
شوکت تھانوی [illegible]۔ [illegible] خان ۔ [illegible] شاعر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

دو دو باتیں (روزنامہ ہمدم لکھنؤ [illegible])

ہم تو اب تک صرف یہ سمجھتے تھے کہ بقول ڈارون یہ مسلّمہ ہو گیا ہے کہ ہم کے مورث اعلیٰ بندر تھے اور جنھوں نے اپنے مخصوص [illegible] کے اسلاف کو بندر کہہ کر [illegible] ہے لیکن دنیا کی ترقی کے ساتھ روز بروز حضرت انسان کی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور یہ راز افشا ہوا جاتا ہے کہ وہ انسان جو اشرف المخلوقات ہونے کے زعم میں مبتلا ہے دراصل کیا ہے اور کیا تھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض اوقات ان کی تحقیقاتوں کے نتائج معلوم کر کے اپنے انسان ہونے پر غصہ آتا ہے اور یہ غصہ حق بجانب ہے۔ آپ بلا [illegible] سمجھ کر وہ انسان جو بندر کی اولاد ہو، اگر انسان ہی ہے تو پھر کام کا۔ جس کے آباؤ اجداد تو وہ درختوں پر اوں اوں کرنے والے جانور تھے جن کو آج ہم اور آپ بجائے قبلہ و کعبہ کے [illegible] کہہ کر [illegible] ہیں اور جو درختوں پر ٹہنیوں ٹہنیوں چھلانگیں مارتے پھرتے تھے ہمارے اس بیان کی تصدیق اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ کسی بندر کو اپنا بزرگ سمجھ کر دیکھا جائے اور پیدا کر لیا جائے کہ ہم اس کی اولاد میں سے ہیں پھر دیکھیے کہ خود انسان اپنی نظروں میں کس قدر ذلیل ہو جاتا ہے اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا غرور کس بری طرح شکستہ ہوتا ہے۔

خیر یہ تو بندر ہی کو آباؤ اجداد بنانے کا قصہ تھا اب ملاحظہ فرمائیے کہ جزائر نکوبار کے باشندے اپنے کو کتے کی نسل سے کہتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں یعنی ڈارون صاحب نے تو انسان کو بندر کی اولاد کہا تھا لیکن نکوبار کے باشندے کتے کو اپنا جدِ اعلیٰ سمجھتے ہیں ان کا بیان ہے کہ سب سے پہلا انسان جو نکوبار میں آباد ہوا وہ مرد تھا اور اس کے ساتھ ایک کتیا تھی، اس اللہ کے بندے نے نکوبار میں سکونت اختیار کر کے اسی کتیا کو اپنی اہلیہ محترمہ بنا لیا اور اس کتیا سے تھوڑے دنوں کے بعد ایک صاحبزادے تولد ہوئے [illegible]

یہ حرکت کی کہ جب نام خدا جوان ہوئے تو اپنی والدہ ماجدہ کو کہیں [illegible] بزرگوار یعنی کتیا کے معزز شوہر کو مار ڈالا اور اپنی والدہ کے بلا شرکت [illegible] چنانچہ اب جتنے بھی ٹوبار کے اصل باشندے ہیں وہ اسی نسل سے ہیں [illegible] ابھی تک نہیں ہوئے ہیں اور کتوں، کتیوں کو نہایت عزت و احترام سے [illegible] کرتے ہیں اور وہی سلوک اس جانور کے ساتھ کرتے ہیں جو کوئی سعادت مند فرزند [illegible] کے ساتھ کر سکتا ہے اور یہاں کتے کو مارنا گناہ کبیرہ ہے اور واقعی گستاخی [illegible]۔

ملاحظہ فرمایئے کہ ابھی تک تو صرف ڈارون صاحب نے بندر کو باپ کہا تھا لیکن یہاں کتیا کو بھی ماں کہنے والے موجود ہیں لیکن باوجود اس کے افسوس ہے کہ ہمیں اشرف المخلوقات ہونے کے گھمنڈ میں اکڑا ہی جاتا ہے وہ تو کہیئے کہ ٹوبار کے باشندوں نے صرف اپنے کو کتیا کا جنا کہا ہے ڈارون کی طرح تمام دنیا کو بندر کی اولاد نہیں کہا ورنہ ہم ان کا بھی کیا بنا لیتے اگر وہ اپنے ساتھ ساتھ تمام دنیا والوں کو کتیا کے بطن سے پیدا ثابت کرتے اس لیے ہم نے تو ڈارون کی اس گالی کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ سنا جب اس نے ہم سب کو ایک سرے سے بندر کا بچہ کہہ دیا اور ہم اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکے نہ اس بکواس پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کیا اور نہ کوئی شرافت اور نجابت کا دعویٰ اس پر [illegible] کہ ڈارون کی اور اپنی جان ایک کرتے تو جناب ہماری شرافت سے یہ کب بعید تھا کہ ہم ٹوباری کتے کی نسل سے کہتے اور ہم خاموش ہو جاتے مگر یہ اہل ٹوبار کی شرافت تھی کہ انہوں نے اس شجرۂ نسب کو اپنے ہی تک محدود رکھا اور باقی تمام دنیا پر یہ عنایت فرمائی کہ کسی کا شجرہ کتوں اور کتیوں سے نہیں ملایا۔

انسان کے متعلق یہ دو روایتیں تو خیر ہو چکیں لیکن ہم کو اندیشہ ہے کہ ؎

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

اور ہر وقت ہم ڈرتے رہتے ہیں کہ خدا جانے یہ محققین ہم کو کیا ثابت کر دکھائیں اس سے آپ اطمینان رکھیئے کہ ان جہان بین کرنے والوں سے کوئی بات بعید نہیں ہے جب چاہیں گے انسان کو بندر کا بچہ ثابت کر دیں گے اور جب چاہیں گے یہ کہہ دیں گے کہ صرف ٹوبار ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسان کتیا کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں بس ہم کو تو یہ دعا کرنا چاہیے کہ خدا ان محققین سے ہم کو نجات دلائے اور عزت آبرو کے ساتھ جیسا انسان ابن انسان ابن انسان [illegible] ابن انسان پیدا کیا ہے اسی طرح انسان ابن انسان ابن انسان ابن انسان اس دنیا سے اٹھائے ورنہ خدا جانے انسان پیدا ہو کر کس جانور کی اولاد بن کر ہم کو دنیا سے اٹھنا پڑے۔

[illegible] شوکت تھانوی کی [illegible] میں [illegible] جب سرپنچ دوبارہ سرپنچ ہفت روزہ لکھنؤ سے [illegible] اخبار [illegible] کے [illegible] پیش [illegible] سرپنچ کی [illegible] [illegible] لکھنؤ [illegible] [illegible] اختیار کرنے لگے۔

سرپنچ اور اودھ پنچ کے اثرات

[illegible] لکھنؤ [illegible] سرپنچ کے [illegible] حقیقت ہے کہ سرپنچ نے اودھ پنچ سے بہت کچھ سیکھا اور پایا۔ سرپنچ کے [illegible] ترتیب [illegible] کالم [illegible] [illegible] زمین اور آسمان کا فرق ہے شوکت تھانوی [illegible] سجاد حسین [illegible] [illegible] صاحب کی طرح [illegible] وطن پرست ہیں۔ سرپنچ کے لکھنے والوں میں [illegible] احمد علی شوق [illegible] نہیں پہنچا اس وجہ سے سرپنچ کے لکھنے والوں کے طنز میں [illegible] کے بجائے [illegible] شگفتہ ہیں اور یہی اس کی [illegible] شگفتگی اور خوش مزاجی [illegible] کر دیتے ہیں اور خود ہنس کر دوسروں کو ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ [illegible] مسائل کی سوجھ بوجھ یا حالات و واقعات کا ادراک نہیں ہے مگر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ان کا رول محض ایک تماشائی کا سا ہے ان کی صحافت میں گرمی بھی ہے مگر یہ گرمی اودھ پنچ کے آتش فشاں کے پھٹنے کی صورت میں نہیں نکلتی بلکہ [illegible] بزم کے [illegible] سے نکلتی ہے۔ اس گرمی کا قوام تجسس، سنسنی خیزی اور دلچسپی سے [illegible] کرتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اودھ پنچ کے بعد اردو ادب میں طنز و ظرافت کا سب سے بڑا خزانہ ہمیں سرپنچ ہی کا ملتا ہے۔ سرپنچ، اودھ پنچ کی طرح محض اپنے لکھنے والوں ہی پر قناعت نہ کرتا تھا بلکہ [illegible] کا ایک وسیع حلقہ [illegible] دوسرے رسائل و اخبارات کی ظرافت کو بھی سرپنچ میں درآمد کر لیتا تھا۔

[illegible] سرپنچ کے [illegible] اس کے [illegible] اور برادری کی صحافت، ان کے [illegible] اداریے، باغ و بہار کالم، خاص نمبر [illegible] انتخابات، [illegible] تبصرے اور خطوط ایک انمول اور انمٹ خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اودھ پنچ کے بعد سرپنچ کا ہمارے مزاحیہ ادب میں سب سے اہم مقام ہے۔ سرپنچ نے مزاح نگاروں کی ایک پوری نسل کو جنم دیا، شائستہ ظرافت اور مزاح کے لیے فضا پیدا کی اور کاروانِ طنز و ظرافت کو ایک نئی منزل عطا کی، سرپنچ کے خس و خاشاک [illegible] آمیزش اور خوشبو ہے۔ غرض سرپنچ شوکت تھانوی کا ایک ایسا محترم کارنامہ ہے جو ہمیشہ ان کے نام کو زندہ اور

[illegible]

سرخی کی شہرت بہت جلد سرخی میں شوکت تھانوی کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ [illegible] پڑھنے کو معلوم نہیں کب کس کی خبر لے جائے۔ سرخی میں [illegible] شوکت تھانوی نے [illegible] مزاح کے ساتھ ساتھ سنسنی خیزی، گرمی اور تجسس کا عنصر بھی شامل کر دیا تھا۔ [illegible] تلخی، خون اور ہیجان کے ساتھ ساتھ معاصر پرچے مرکے اور نوک جھونک رہتی، [illegible] کے کالموں میں [illegible] کے ساتھ ایک بانکپن کی بھی شان تھی، [illegible] باتیں ہیں [illegible] ہو سکا مگر ایک تلخ سرا بھی ضرور نمایاں ہو گیا۔

سرخی پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دینے کے لیے کبھی یہ خبر چھپتی کہ ایڈیٹر سرخی کو ملک بھر سے دھمکی آمیز خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ کبھی ان فرضی خطوط کی نقلیں شائع کی جاتیں جن سے پڑھنے والوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ کبھی [illegible] کہ دھمکی دینے والے نے دفتر سرخی کی فائلوں میں آگ لگانے کی ناکام کوشش کی ؎

سرخی کو جلانے کی کوشش میں تھک نہ جاؤ
چنگاریوں سے اس کو جلایا نہ جائے گا

پھر ہزاروں روپے کی اور بندوقوں کے سائے میں دفتر کا دروازہ دھمکی دینے والے کو پکڑنے کے لیے کھولا جاتا تو اندر سے لرز کر کانپتا ہوا ایک خارش زدہ کتا برآمد ہوتا۔ اور کبھی ملاقاتی حامد ڈاکٹر کی جگہ حامد شاہ جہاں پوری نکلتا۔ کبھی منٹو پارک میں مرد ملنے جلسے کی خبر چھپتی، کبھی مس کجی دفتر سرخی میں رونق افروز ہوتیں شائقین اور طلبا ان سے ملنے کے لیے جا کر بٹھائے جاتے کہ ابھی جلوہ گر ہوں گی پھر خاصدان پیش کیا جاتا جس کے کھولے جانے پر پان کی جگہ اپریل فول کی بشارت ہوتی اور ملاقاتی کھسیا کر خاموشی کے ساتھ دوسرے دروازے سے نکل جاتا۔

وہمی وہاڑوی کا کردار اسی ہنسی، دل لگی بازی اور سنسنی خیزی کے بنیادی جذبہ نے سرخی کے صفحات پر وہمی وہاڑوی کے رسوائے زمانہ کردار کو جنم دیا۔ شروع میں شوکت تھانوی کے وہمی وہاڑوی غالب پر مصرعے لگاتے اور تک بندی کرتے تھے ؎

تقدیر کا لکھا وہمی کچھ بھی نہ پڑھ سکے
گویا کہ جو کچھ لکھا ہے بخط شکست ہے
محبت میں کیا جانے کیا کر رہے ہیں
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں
مے گلرنگ ابھی انگور کی دوشیزہ بیٹی ہے
آزمائے جو کوئی انگور کا داماد ہو جائے

اس کے بعد وہمی وہاڑوی کا چلن بگڑتا گیا۔ "ذم"، "بھنور" اور "نگاہ" کی "دلدل" میں ایسے پھنسے کہ دامن الجھنے،

[illegible] ——◆—— [illegible]

[illegible] سرپنچ [illegible]

[illegible]

[illegible] ہے۔

سرپنچ کے [illegible] شوکت تھانوی [illegible]

سرپنچ کے [illegible]

شوکت تھانوی [illegible] ہے۔ اس پرچہ میں [illegible] جلد سرپنچ [illegible] شوکت تھانوی [illegible] شائع [illegible] تحریر کرتے [illegible] اخبارات [illegible] وغیرہ [illegible] رہتے تھے۔

شوکت تھانوی کے اداریے بڑے ہنگامہ خیز ہوتے تھے۔ لکھنؤ میں حامد ذاکر [illegible] پولیس [illegible] کے سامنے [illegible] ایک مقدمہ میں حامد ذاکر کو پولیس نے گھیرا مگر حامد صاف نکل گیا۔ اس پر سرپنچ میں [illegible] اور مظلوم پولیس اور ظالم حامد ذاکر کے عنوان سے بہت سخت اداریہ لکھ دیا۔ جس پر یہ شعر بھی چسپاں کیا گیا تھا کہ

ناحق ہے ابھی وردی پولیس کی مشہور
چوڑیوں کا بھی اضافہ اس میں ہونا چاہیے

[illegible] پولیس کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے یہ شعر بھی چسپت کیا گیا تھا کہ

حامد کا ہر ایک جانب ہوا نظر آتا ہے
معصوم پولیس کو اب کیا کیا نظر آتا ہے

ں معرکہ کے اداریہ کی دھوم مچ گئی اور پرچہ کی اتنی زیادہ مانگ ہوئی کہ سرپنچ کے اسی شمارہ کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ پولیس نے سرپنچ پر مقدمہ چلانے کی بہت کوشش کی مگر اس میں اسے کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ پرچہ کی مقبولیت میں سرپنچ اور [illegible] کے قیامت خیز معرکہ نے بھی بہت اضافہ کیا تھا۔ چونکہ گجن بابو کا حمایتی تھی اور سرپنچ پیچھے جھاڑ کر گجن بابو کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ شوکت تھانوی کی ناول "بڑھبس" جب سرپنچ میں قسطوں میں شائع ہونا شروع ہوئی تھی تو اس کی قسطوں کا پڑھنے والوں کو بے قراری کے ساتھ انتظار رہتا تھا۔ اس میں ان کی قلمی تصویروں کا سلسلہ بھی بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دیوانِ غالب کی مزاحیہ شرح کی قسطیں، [illegible] کاٹے، سودیشی مضامین، [illegible]،

بے تبسم، سیلاب تبسم اور طوفانِ تبسم کے مضامین بھی پہلے سرپنچ ہی میں شائع ہو چکے تھے۔ مردہ کا چہرہ، تین کالم، چائے خور کتا، دو وحشت، سسرال، اگر میں تھانیدار ہوتا، بھکی، کچھ ان چھٹے ہیں، اگر میں بادشاہ ہوتا، خدا حافظ، شاعر، شامت، سودیشی مشاعرہ، عاشق ہونے کے لیے کسی مسئلہ کا... چوری اور سلیٹ کو آنکھ وغیرہ بے شمار مضامین، افسانے، ناول اور ان کی مزاحیہ شاعری کے نمونے اس میں چھپتے رہے۔

نسیم انہونوی سرپنچ کے پروپرائٹر ہونے کے علاوہ شوکت تھانوی کے جانے کے بعد اس کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہر حال میں سرپنچ کو ہمیشہ جاری رکھا اور شوکت تھانوی کے علاوہ ایکا لکھنوی، حسن صدیقی، جلال ملیح آبادی، جہاں بشری، رحمن محبوب حزنی کو بھی سرپنچ کا ممبر مقرر کیا۔

سرپنچ کے دورِ ترقی میں نسیم انہونوی کی ہمیشہ بڑی اہمیت رہے گی۔ سرپنچ میں ۱۹۳۲ء میں ان کا افسانہ "لیٰ" شائع ہوا تھا اسی کی بنا پر بعد میں شوکت تھانوی نے ۱۹۳۳ء میں "خدانخواستہ" کے عنوان سے پہلے مضمون لکھا اور بعد ازاں اسے بڑھا کر ناول بنا دیا۔ "آتش دنیا" سے متاثر ہو کر مرزا نے نظم "آنسو گنگا" لکھا۔ باقی۔ سرپنچ کے صفحات پر نسیم ہی کے بے شمار مضامین اور افسانے بکھرے ہوئے ہیں جن کی شیرازہ بندی کی ضرورت ہے۔ ان میں گھوڑوں کی کاشت، عدم عداوت، لاری کا سفر، حاصل، ہماخان، تانگہ خریدا، شلغم، بدمزگی، چھاچھکی نے کرشن پکارا، ڈیلیگیٹ شادی، ہیروں کا سینیچر، اور شریر بیوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے مضامین، افسانے، ناول کی قسطیں، شاعری کے نمونے اور "دم چھلے" کے مضامین برابر سرپنچ میں چھپتے رہتے تھے۔ "دم چھلے" سے مراد یہ ہے کہ جیسے مضمون شوکت تھانوی نے شروع کیا جہاں سے انھوں نے ختم کیا وہاں سے عظیم بیگ چغتائی نے لکھے۔ غرض اسی طرح سلسلہ جاری رہا۔

فرحت اللہ بیگ کی چٹخارے دار نثر اور گدگدے دار نظم سے سرپنچ کا رخ نکھرا نظر آتا ہے۔ ان کے بیشتر اہم مضامین اسی میں شائع ہوئے۔

ملّا رموزی کی گلابی اردو کے گل بوٹے اور ان کی مچلے دار نثر سرپنچ کے حسن میں اضافہ ہے۔ یہ اس کے انتہائی مستعد قلم کاروں میں سے ہیں۔

چودھری محمد علی ردولوی اودھ پنچ سے ہجرت کرنے کے بعد سب آگے آگے سرپنچ میں نظر آتے ہیں۔ ہجری دور میں اودھ پنچ برائے نام رہ گیا تھا اور کوئی دوسرا مزاحیہ پرچہ اس کی ٹکر کا نہ تھا۔ ان کے خاص کے مضامین اودھ پنچ کے بعد سرپنچ میں ملتے ہیں۔

ظریف لکھنوی اودھ پنچ کی طرح سرپنچ کے بھی سب سے خاص لکھنے والے تھے۔ سرپنچ میں ان کی شمولیت ایک بزرگ کی شرکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا بیشتر نمائندہ کلام سرپنچ کی جلدوں میں محفوظ ہے۔ شکوۂ سرپنچ کا ایک مشورہ "سنیئے" ـــ

[illegible]

[illegible]

[illegible] چھوڑ دی [illegible]

[illegible] شعراشتہار جدید پرداز [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] علامہ عبدالباری آسی [illegible]

[illegible]

اس کا ایک نمونہ دیکھئے۔

لُغَاتُ الظُرَفا

فیشن	بھیڑ چال
فادر	انگریزی داں کا باپ
ضدی	امیدوار ملازمت
مذہب	حیلۂ جنگ
مشاعرہ	دنگل
مروّت	دل کی کمزوری
مریضِ ہجر	شاعر
نجدی	دنیا سے باخبر اپنے سے بے خبر
دیوان	شاعر کا اعمالنامہ
[illegible]	قاضی الحاجات
شذرات	[illegible]

ابنِ سلوی رسالہ ترچھی نظر، نظر، اودھ اخبار، راز، بدذات، جوز سروس کے اڈیٹر، جھٹکے والے مرغا کے مدیر اور مبصر شعبہ اشتہارات بھی تھے۔ ان کی ذات کی اندری "شب نامہ" کے عنوان سے سہ ماہی بہت مقبول تھی اور بمبئی کے فلمی "فردوسِ اردو اور پروسنہ" دنیا میں جہنم "کے نام سے چھپا تھی۔ سرپنچ کے عنوان، سرپنچ میں ان کے بے شمار مزاحیہ مضامین بکھرے ہوئے ہیں۔

منور آغا مجنوں لکھنوی سرپنچ کے تقریباً ہر شمارے میں آتے آپ کی نظر آتی تھیں: "مہملات مجنوں" کے عنوان سے مستقل شائع ہوتے تھے۔ ہر لحاظ سے یہ ایک اہم شاعر ہیں اور سرپنچ کا ذکر بھی مرزا مجنوں کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔

احتشام ماہلی سرپنچ کے سلسلے میں یہ انکشاف بھی خاصا دلچسپ رہے گا کہ سید احتشام حسین افسانہ نگاری سے پہلے سرپنچ کے باقاعدہ مزاح نگار اور اس کے ممبروں میں سے تھے۔ اور مزاحیہ شاعری میں حیران تخلص کرتے تھے۔ ان کے رنگا رنگ مضامین مثلاً ہاسٹل کا شیطان، سیاہ بخت، مشاعرے، فاؤنٹین پین، ہنگامۂ والد گرامی، اڈیٹر، ہمدردی، وصال ہو گیا اور معشوقہ بیوی وغیرہ اب بھی سرپنچ کی جلدوں میں محفوظ ہیں۔

عبداللہ ناصر بھی اودھ پنچ ہی تھا، ہوتے اور سرپنچ میں پہلے پہلے یہ سرپنچ کے ہر ہنگامہ میں آگے آگے نظر آتے ہیں۔

سرپنچ برادری میں خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری، حکیم ممتاز حسین عثمانی، مولانا عبدالمجید سالک، بطرس، رشید احمد صدیقی، علامہ جمیل مظہری، سلطان حیدر جوش، ایم اسلم، دیوانہ گورکھپوری، فلک پیما، نازش بدایونی، سید بہادر رزم، ارشد تھانوی، آوارہ حیدرآبادی، حامد شاہجہانپوری، ماچس لکھنوی، علامہ مضحک دہلوی، فرقت کاکوروی، حافظ غازی پوری، باسط بسوانی، قمر نظامی، دیوانہ بریلوی، شبیر احمد علوی، خضر گرامی، رسوا سیوانی، درد کاکوروی، عنایت دہلوی، ملا حضوری، نظر بریلوی، بسم بیلوری، سلیم ندوی، خان محبوب طرزی، علامہ ہنٹر، محب دریابادی، بوم ہاپڑی، سحر عابدی، مظفر احسانی، شوخ لکھنوی، اشرف لکھنوی، ناکارہ حیدرآبادی اور غضنفر محمد خاں وغیرہ اس کی برادری یا "پنچایت" میں شامل تھے۔

سرپنچ کے اداریے بڑے نوکیلے تیز اور دھاردار ہوتے تھے۔ ان میں بلا کا طنز اور گرمی ہوتی تھی۔ کہیں کہیں مزاح کے چھینٹوں کی وجہ سے ان میں دھواں آتشا بھی نظر آتا ہے جس سے ایک خوشگواری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھئے شوکت تھانوی سرپنچ کے اداریہ میں "انگاشے" کے بارے میں کیا لکھتے ہیں:

انگاشے

- یہ انگاشے وہ نہیں ہیں جو انگ لگانے کے بعد . . . . کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں، بلکہ ہمارا مقصد "انگاشے" سے وہ کتاب ہے جو آجکل اخبارات کا دلچسپ ترین اور مسلم اخبارات

کا نام ترقی پسندی ہی ہو سکتا ہے ...... اس کتاب کا ذکر ہم نے کر دیا ایک سب سے صحیح ہوگا ... اور ہم مشکل میں ہیں کہ ہم نے کتاب کو دیکھے ہوئے بستر کیوں نہیں چھوڑا تھا — یہ کتاب دراصل دس ماہ کا اور ہے کہ افسانوں کا ایک ذخیرہ ہے جس کو سید سجاد ظہیر وغیرہ کی اجتماعی کوششوں سے مرتب کیا ہے ۔۔ پانچ افسانے سجاد ظہیر نے لکھے ہیں، دو افسانے احمد علی صاحب کی ادبی بدتمیزی کا ثمرہ ہیں، دو افسانے رشید جہاں صاحبہ کی انشاپردازانہ بیہودگی کا نمونہ ہیں اور ایک افسانہ محمود الظفر صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ان دسوں افسانوں کو پڑھ کر اگر [illegible] کوئی شخص اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے اور پڑھنے والے نے کیا پڑھا ہے تو دعوے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بریلی یا آگرے کے پاگل خانے کا ممبر بننے کا اہل ترین شخص ہوگا ...... اور اگر ان ہی افسانوں کو کوئی شخص بار بار پڑھے تو وہ بھی ہماری طرح صرف اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ کتاب صرف ایک مقصد کے تحت لکھی گئی ہے جس کو "صنعت بے معرف" کہہ سکتے ہیں۔ لکھنے والے نے صرف یہ کیا ہے کہ قلم اٹھا کر کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا اور بغیر یہ سوچے سمجھے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں لکھتے ہی چلے گئے ہیں، جو لکھ گئے تو لکھ گئے [illegible] سے نکل گئی تو نکل گئی۔ مختصر یہ کہ یاوہ گوئی کی طرح گویا ان حضرات نے "یاوہ نگاری" کے کمالات ان افسانوں میں دکھائے ہیں ...... ہم نے اس مجموعہ کو ادبی، اخلاقی، معاشرتی اور دیگر حیثیتوں سے بالکل مہمل پایا ہے اس میں جن شرفاء اور ایک شریف راوی نے جو جو حیا سوز مناظر پیش کئے ہیں ان کو دیکھ کر آبرو باختہ سے آبرو باختہ ہستی بھی انتہائی نفرت سے لاحول پڑھنے پر مجبور ہو جائے گی خداوند کریم اور رسول صلعم کی جو توہین ہوئی اس کا سوال تو اس وقت پیدا ہوگا جب ان مصنفین کی صحیح الدماغی تسلیم کر لی جائے گی لیکن ہمارے خیال میں تو یہ مجموعۂ خرافات سوائے اس کے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ واقعی ان انگاروں کو خاکستر کر دیا جائے۔"

(سرپنچ ۲۳ ؍ فروری ۱۹۳۳ء)

سرپنچ کے شذرات

لکھتے وقت شوکت تھانوی کھل کر اپنے اصلی رنگ میں آجاتے تھے۔ دیکھئے شذرات میں "انگارے پر پانی" کیسے پھیرتے ہیں اور بھی نمونے دیکھئے۔

انگارے پر پانی

جس اوٹ پٹانگ ...... تصنیف کے متعلق گزشتہ کسی پرچہ میں ہم تفصیل کے ساتھ عرض کر چکے ہیں اس کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب ایم ایل سی نے کونسل میں نہ صرف سوالات کئے بلکہ آنریبل ہوم ممبر صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اس کتاب کے پرنٹر پبلشر کو سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ

نے طلب بھی کیا تھا مگر ہم حضرات نے یہ شعر فسانی فرمائی ہے وہ تو آجکل قسمت میں ہی ہو جی بہرحال ۲ ارب روپے [illegible] ایک مصنف صاحب ہندوستان کے اندھی خیال کے تحت تو حکومت خود کچھ نہ کچھ کرے گی الفاظ ضرور پیدا ہو گئی ہے کہ ۱۰ سال کے پیسے کے بعد یہ انگلے رنجے سے زیادہ کچھ نہ رہ جائیں گے ۔

تلاش گمشدہ

عزیزہ مسلمہ جناب مسز افرام صاحبہ مسٹر کہاں تشریف لے گئی ہیں کہیں پتہ ہی نہیں چلتا نہ تو چین و جاپان کی معرکہ آرائی میں ان کا بیان شائع ہوا نہ یورپ کی ان جنگی تیاریوں میں سامنے آئیں اگر کسی اللہ کے بندے کو ان محترمہ کا معلوم ہو تو ہم کو مطلع فرمائیں تاکہ ان سے دریافت تو کیا جائے کہ آخر وہ ہیں کس مرض کی دوا؟

وائٹ پیپر واقعی سادہ کاغذ ہے

وائٹ پیپر کی مدتوں سے ہندوستان میں دھوم مچ رہی تھی۔ ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر "سائمن گو بیک" کے بعد اگر کوئی نیا لفظ چڑھا تھا تو وہ یہی "وائٹ پیپر" جس طرف دیکھئے اسی کا پرچا تھا اور جس کو دیکھئے اسی کا منتظر تھا۔ آخر وہ صبر آزما دستاویز سب کے سامنے آئی جس کے بے دن گنے جاتے تھے، لیکن اب حال یہ ہے کہ سب لوگ آنکھیں لال کرکے ٹکٹکی لگا کر بلکہ خوردبین کی مدد سے اس مسودہ کو دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ان کو کچھ نظر نہیں آتا اس کا نام وائٹ پیپر ضرور تھا مگر یہ تو واقعی سادہ کاغذ نکلا۔ ۱۰ اس آئینی دستاویز میں سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ گھما پھرا کر ہندوستان کو وہیں رکھا ہے جہاں وہ غریب اب تک بیٹھا ہوا منہ بسور رہا تھا۔ لیکن اس سیاسی چال کا جواب .. زبانی احتجاج نہیں بلکہ اس اینٹ کا جواب یقیناً پتھر سے دینا چاہیئے ۔۔۔"

ہندوستان میں بحر ہند کی آمد

ہندوستان کے گوشے گوشے سے آجکل سیلاب سیلاب کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں بعض مقامات پر تو طوفان نوح کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں اگر خدانخواستہ یہی حال کچھ روز اور رہ گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ ملک بحر ہند میں شامل ہو جائے گا اور کوہ ایورسٹ نام کا کوئی جزیرہ اس ملک کی یادگار کے طور پر باقی رہ جائے گا۔ اڑیسہ، آسام، بنگال اور پنجاب وغیرہ ہر طرف معلوم ہوتا ہے کہ بادلوں نے سمندر انڈیل دیا ہے۔ اڑیسہ کے تین کروڑ باشندے خانماں برباد ہو چکے ہیں اور یہی حال دیگر سیلاب زدہ مقامات کا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ آجکل ہندوستان میں بحر ہند مہمان آیا ہوا ہے حالانکہ مہمان کو کچھ نہ کہنا چاہیئے لیکن مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ

جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو

سرخی کے مزاحیہ کالم شوکت تھانوی کا سرخی (روزنامہ) کا پہلا مزاحیہ اخبار ہے جس میں سب سے زیادہ مزاحیہ کالم تھے۔ سرخی کے ان زعفران زار کالموں کی وجہ سے کالم نویسی کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رہے گی۔ سرخی کے خاص اور قابلِ ذکر کالم روزانہ باتیں، قلمزار، چٹکیاں، تیر بہدف، گلستانِ دیار، مجھ ہی کو کالم، عقلمندوں سے پوچھئے، گپ شپ، ٹیلی فون، بکٹ میں، ضربِ عشق، ادھم، بھتنستان، تذکرے، ادھر ادھر کی، ایڈیٹر کی ڈائری، اندھیر کی رام کہانی، پڑھنے کی شرط نہیں اور قوالی مولانا سرخی کے تھے۔

روزانہ باتیں کا نام شوکت تھانوی بھی "ہمت" اور دوسرے اخبار اور جرائد میں لکھتے تھے انھی میں سے یہ سرخی میں نقل ہوتا۔

قلمزار بھی معنوی طور پر سرخی کا مزاحیہ کالم تھا۔ اس کا ایک نمونہ دیکھئے۔

قلمزار

ہم اپنی گذشتہ اشاعت میں زبانِ اردو کی مختلف قسمیں بیان کرتے ہوئے سرکاری اردو کی نئی پیداوار کا ذکر جبری کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ہمیں اس "ادبِ لطیف" کے چند تھرڈ شاہکار دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے جن میں سب سے پہلے ہم ایک پیشکش ناظرین کرتے ہیں جس کا نام "رہبرِ حاجیانِ حجاز" ہی سے فصاحت و بلاغت ساون بھادوں کے مینہ کی طرح برس رہی ہے۔

پچھلے دنوں حکومتِ ہند کے شعبۂ تعلیم و صحتِ عامہ نے زائرینِ حرم کی سہولت کے لیے زبانِ انگریزی میں ایک مفید پمفلٹ شائع کیا تھا۔ "رہبرِ حاجیانِ حجاز" جیسے سرکاری اردو میں اس پمفلٹ کا ترجمہ ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اس عظیم الشان ادبی خزینہ کا کون سا جواہر ریزہ پبلک کے سامنے پیش کریں۔ کون سا پیش نہ کریں۔ کیونکہ جس طرح پنجاب میں چغتائی کا ہر "حسن" اقبال کا ہر شعر "شاہکار" ہے اسی طرح اس پمفلٹ کا ہر لفظ شاہکارِ ادب اور غالب و مومن کی روحوں کو تڑپا دینے والا نشتر ہے۔

ممکن ہے مصنفِ قلمزار بابت اعتراض جڑ دینے پہلے اوپر کتاب "رہبرِ حاجیانِ حجاز" کے اس لیے باز رہ سکتا ہے کہ سرکاری اردو میں قانونی پہلوؤں کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اور حکومت نے اس خیال سے کہ لوگوں کو کہیں یہ شبہ نہ ہو یا سرکاری اردو کے الفاظ میں "یہ شبہ نہ کیا جا سکتا ہو یا یہ شبہ آئندہ نہ کیا جائے گا" مسلمانوں کا فریضۂ حج سوائے سرزمینِ حجاز کسی اور مقام پر بھی ادا کیا جا سکتا ہے" اسی کتابچہ کے نام میں "حاجیان" کے ساتھ لفظ "حجاز" کا دُم چھلا لگانا ضروری سمجھا۔

سرورق اُلٹنے کے بعد ہمیں بابت والا پانے "کی ہم نفس" زبانوں میں ایک تمہید ملتی ہے جس میں سے زیادہ مضامین و ہمیں یہ قید ہے جس کو انگریزی سے ترجمہ کرتے وقت حکومت ہند کے فاضل مترجم نے اپنا طرز زیرِ دار ہوگا: "رسالہ مذکورہ کی نظر ثانی اس وقت تک ملتوی رہے گی جب تک کہ قانون جس کا انحصار کمیٹی کی سفارشات پر موقوف ہے پاس نہ ہو جائے۔"

سبحان اللہ کیا وردِ ایسے شعر کے پانی میں دھلی ہوئی زبان ہے۔ اکسیر خو ایک ساتھ قانون کے انحصار کو کمیٹی کی سفارشات پر موقوف کیا ہے۔ قابلِ ستائش ہے حکومت ہند کہ ایسے ایسے باکمال مترجموں کی قدر شناسی کر رہی ہے ورنہ یہ مترجم صاحب اگر کہیں چائے فروش ہوتے تو دو مہینے میں کان پکڑ کر موقوف کر دیے جاتے۔

ایک مقام پر حکومت ہند کا یہ فاضل مترجم سرکاری اردو کے جوہر دیدہ سے اس طرح بکھیرتا ہے۔

"ہر محلہ مومن مسلمانوں کی زیرِ نگرانی میں حاجیوں کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں۔"

"لال شاہی اردو" میں "لیلۃ القدر کی رات" اور "یوم قیامت کا دن" تو سنا ہی تھا لیکن اب سرکاری اردو کے تصدق میں ہمیں "زیرِ نگرانی میں" کی نئی ترکیب معلوم ہو گئی۔

اس سرکاری اردو پمفلٹ کے سرکاری مترجم پر خیر سے وہ مثل صادق آتی ہے کہ گہری پدی، مجھے کو کے منڈوری" آپ خدا کے فضل سے زبانِ عربی کے بھی نہ صرف زبردست ماہر بلکہ فنِ وضعِ اصطلاحات کے دستار بند۔ اسی تربیت پروردہ علم میں چنانچہ آپ نے انگریزی سے اردو ترجمہ کرتے وقت اپنی طبیعت و ہمہ دانی کے جوش میں "من" کو "مرنا" "عرفات" کو "عرات" "جدہ" کو "یدہ" "حلیم" کو "حلم" "نعمت" کو "نیامت" "جبیں" کو "جال" "ذہب" کو "زہاب" اور اسی کے وزن پر "وہاب" کو "وحب" بنا دیا۔

مترجم صاحب کو اپنے فضل و کمال کی نمائش اور زیادہ منظور ہوئی تو "رمضانی" کے اچھے خاصے مرد مسلمان سرکاری اردو کے جھگڑے سے شدھ کر کے "رام جانی" بنا ڈالا۔ خوب! "مطوفین" کعبہ کو ان کے زورِ قلم سے ڈر کر "مطر الفغان" بننا پڑا، خدا کا شکر ہے کہ "میم" کا پردہ مسلمانوں کے آڑے آیا ورنہ سرکاری مترجم نے تو حجاز کی مقدس سرزمین کو دہلی کا چاوڑی بازار، لکھنؤ کا چوک یا کانپور کا مول گنج بنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا تھا۔

قابلِ ستائش ہے وہ قدر شناس حکومت جس کو اپنی مطبوعات کے لیے ایسے ایسے قابل انشا پردازوں کی خدمات حاصل ہوں۔

چٹکیاں بعد میں یہ کالم "تیر بہدف" کے عنوان سے مقبول ہوا۔ اس میں خبروں کی سرخیوں پر حاشیہ آرائی کی جاتی تھی۔

پھلکیاں (ترجمہ)

ایک عورت ڈاکٹر سے ——— [illegible]

——— [illegible] قابل ہے۔

ایک شخص ڈاکٹر سے ——— [illegible]

——— [illegible]

ایک عورت ڈاکٹر سے ——— [illegible]

——— [illegible] ؟

انگلستان [illegible]

جاتا تھا۔

انگلستان (ہنسنے کی شرط نہیں دیوار قہقہہ)

ایک عورت نے جب [illegible] پوچھا: تم مجھے کس پر چھوڑے جاتے ہو؟

— [illegible]

اسکاٹ لینڈ کے باشندے اپنی کنجوسی کے لیے مشہور ہیں۔ ایک اخبار میں اسکاٹ لینڈ کے خلاف مضامین شائع ہو رہے تھے۔ ایک اسکاٹ باشندے نے اس اخبار کے ایڈیٹر کو لکھا کہ "اگر تم اپنے اخبار میں اسکاٹ لینڈ والوں کے خلاف مضامین لکھنا بند نہ کرو گے تو میں تمہارا اخبار مانگ کر پڑھنا بند کر دوں گا۔"

شوہر: میری ٹوپی کہاں ہے؟

بیوی: ٹوپی ہوتی کہاں؟ تمہارے سر پر ہے!

شوہر: اچھا ہوا تم نے بتا دیا، ورنہ میں ننگے سر دفتر چلا جاتا۔

بیوی: (پیانو بجاتے ہوئے) پیارے اب تم کیا چیز سننا چاہتے ہو؟

شوہر: (نیند اچاٹ ہونے اور بے تُکے نغموں سے بیزار ہو کر) پیانو کے بند ہونے کی لطیف آواز!

ایک رحمدل بڈھے نے ایک لڑکے سے پوچھا: تم مغموم کیوں بیٹھے ہو؟ لڑکے نے جواب دیا: میرے باپ نے ایک نیا صابن ایجاد کیا ہے جسے ہر گاہک کو دکھلانے کے لیے وہ ہر وقت مجھے دھوتا رہتا ہے۔

گرما گرم کے عنوان سے حالاتِ حاضرہ پر چٹ پٹا تبصرہ کیا جاتا تھا۔

گرما گرم

ریاست کشن گڑھ کے راجہ صاحب کی صاحبزادی کا عقد ہونے والا ہے اس کا خرچا کے لیے رعایا سے چندہ لیا جا رہا ہے ـــ راجہ صاحب کی صاحبزادی نہ ہوئیں جدید قسم کا ٹیکس ہو گئیں۔

لاہور میں ایک نوجوان نے اپنے پڑوسی کی چند چارپائیاں چرا لیں ـــ چارپائی کا صرفہ عبث ہے اس لیے کہ اب چند بڑے بڑے مقامات چوری ہوا کریں گے۔

اطلاع موصول ہوئی ہے کہ خدانخواستہ ملکِ معظم پر سردی کا خفیف سا حملہ ہو گیا ہے ـــ اس ضعیفی میں انگلستان جیسے ٹھنڈے ملک میں آخر کیوں رہتے ہیں؟

سنتے ہیں کہ چین اور جاپان میں کچھ ٹھن تو ہو گئی ہے ـــ بیشک اقوام کو پردے سے باہر آ جانا چاہیے۔

عقلمندیاں کے تحت اشتہارات، واقعات اور سرکاری اعلانات وغیرہ کے مضحک پہلوؤں پر چند جملے کسے جاتے

عقلمندیاں

ایک برقی کھمبے پر حسبِ ذیل اشتہار چسپاں کیا گیا ہے کہ ـــ خطرہ ـــ کھمبہ چھونے سے فوراً موت واقع ہو جاتی ہے خلاف ورزی کرنے والا گرفتار کیا جائے گا۔"

بے پر کی اور بعد میں گپ شپ کے عنوان سے ادبی ہوائیاں اڑائی جاتی تھیں۔

بے پر کی (گپ شپ)

ایک تازہ بے تار برقی پیغام مظہر ہے کہ حضرت خواجہ حسن نظامی اور آغا حشر صاحب کاشمیری میں کوئی ایسا معاہدہ ہو گیا ہے جس کے تحت آغا حشر صاحب اپنے تمام ڈراموں کا حقِ تصنیف خواجہ صاحب کو دے دیں گے اور خواجہ صاحب اپنے تمام مرید آغا صاحب کے سپرد کر دیں گے۔ واضح ہو کہ یہ ایک قسم کا معاصرانہ تبادلہ سمجھا جائے گا۔

معلوم ہوا ہے کہ جناب مشیر احمد علوی کے یکایک داڑھی نکلنا شروع ہو گئی ہے اس مرض کی وجہ خود ان کو بھی نہیں معلوم، ان کا بیان ہے کہ "میں کچھ عرصے سے امراضِ چشم میں مبتلا تھا لیکن داڑھی کی خود روئی پر خود مجھ کو بھی تعجب ہے۔"

ایک صاحب کا [illegible] ہے کہ حضرت اقبال اپنی [illegible] صاحب [illegible] کرنے کے لئے نادم ہو گئے ہیں [illegible] صاحب آئندہ حضرت اقبال کی [illegible] کیا جا چکا ہے۔

ایک خاص [illegible] ہے کہ [illegible] کی [illegible] امریکہ کے [illegible] چند [illegible] میں جن کا ذکر ہے کہ انسان [illegible] اور [illegible] کی [illegible] ہے:

ٹیلیفون کمپنی [illegible] سماعت پر اعتماد [illegible] ہو جائے گا۔

ٹیلیفون

ٹن —— ٹن —— ٹن۔ —— ہلو —— وائسریگل لاج [illegible] ہے —— ٹن ٹن —— ہلو —— پرائیویٹ سکریٹری —— آداب عرض —— میری بات سنئے —— جی ہاں میں ایڈیٹر سرپنچ ہوں میری عرض ہے ہز ایکسیلینسی سے [illegible] آپ [illegible] کر دیجئے کہ میں [illegible] ہوں اور اور ہز ایکسیلینسی کی خدمت [illegible] عرض کرنا چاہتا ہوں [illegible] ہز ایکسیلینسی نے مولانا شوکت علی کی [illegible] کے بعد بھی گاندھی جی کو [illegible] کر کے مولانا شوکت علی سے پبلک کی ہمدردیاں [illegible] وابستہ کر دی ہیں اگر ہز ایکسیلینسی گاندھی جی سے ملاقات کی صورت ہی بہم پہنچا دیجئے تو یہی ہمدردیاں اس وقت حکومت کے ساتھ ہو جائیں کاش کہ ہز ایکسیلینسی اس نکتہ پر اب بھی غور کر لیں باقی بحمد اللہ سب خیریت ہے۔ ٹن ٹن۔

ٹن —— ٹن —— ٹن —— ٹن —— نمبر دس ڈاؤننگ سٹریٹ لندن پلیز —— ٹن —— ٹن —— ہلو —— کون صاحب ہیں؟ —— ہاں ہاں آپ ذرا وزیر اعظم بہادر سے میرا سلام کہئے اور یہ کہئے کہ ہندوستان میں اس خبر نے آپ سے خاص عقیدت پیدا کر دی ہے کہ آپ گاندھی جی کی رہائی کے لئے کوشاں ہیں۔ خدا کرے یہ خبر سچ ہو لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آپ کوشش کریں اور وہ کوشش رائیگاں جائے۔ اگر ایسا ممکن ہے تو آپ کے وزیر اعظمی کے اختیارات سے دلی ہمدردی ہے۔ ٹن ٹن ٹن۔

ٹن —— ٹن —— ٹن —— صدر جمہوریہ امریکہ کے دولت خانہ میں پلیز —— ٹن۔ ٹن۔ ہلو —— کون —— مسٹر ہوور —— جی آداب عرض یعنی خود آپ ہی فون پر آ گئے ہیں۔ میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ کی زندگی پر جو قاتلانہ حملہ ٹرین کو تباہ کرنے کی صورت میں ناکام طور پر کیا گیا وہ ہماری نظروں میں حد درجہ کمینہ پن تھا۔ مگر آپ کا اس سے بچ جانا نہایت خوشی کا موجب ہے۔ واللہ آپ خوب بچے۔ جی ہاں زندگی تھی ورنہ ختم تو کر ہی دیا تھا ظالموں نے —— سچ کہا آپ نے کہ موت کا ایک دن معین ہے —— اچھا مبارک ہو —— آداب عرض —— ٹن ٹن۔

کٹ پیس کے عنوان سے دوسرے رسائل و اخبارات کی زبان و بیان کی اغلاط کا پوسٹ مارٹم ہوتا تھا۔

کٹ پیس

لکھنؤ کے ایک ہفتہ وار اخبار کے ایک مضمون کی سرخی ہے : بکار آمد غلطیاں ——

سبحان اللہ! غالباً بعض قابل اڈیٹر کے یہ جملے بھی پڑھ لیجئے جو عام طور پر مشہور ہیں۔

— لب دریا کے کنارے کی ٹھنڈی ہوا —— برگ شرینہ کی بو " ادبِ لطیف کے دست کا عجز و حیرت

معاصر پرتاپ کی ایک خبر کا عنوان ہے —— عید کے پٹاخوں نے جان لے لی ——— اسی پر کتاب کی کہو۔ کچھ معلوم وہ ہے —— یا تو شب برات کے پٹاخے ہوں گے ورنہ عید کی سیویاں۔

حضرتِ عشق کے عنوان کے تحت عشق کے مضحک پہلوؤں کو لطائف کی صورت میں اجاگر کیا جاتا تھا۔

حضرتِ عشق

پیٹر —— تمہارے محبوب کے عشق و محبت کا اب کیا حال ہے —— ؟

پال —— محبت کا معاملہ تو ختم ہو چکا۔ اب ہم دونوں کی شادی ہو گئی —— !

الم غلم کے عنوان کے تحت معاصرین سے مختلف مسائل پر چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی۔

الم غلم

— اُردو سے دھرم ویش رکھنے والوں کی سیوا میں پرارتھنا ہے کہ وہ مسٹر بروز امریکی پر مقدمہ چلائیں ان حضرت نے ایک دلچسپ افسانے میں بیان کیا ہے کہ ایک باشندۂ امریکہ جب مریخ میں پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہاں کے رہنے والے ہماری دنیا کے عالموں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوشیار ہیں، مریخ والوں نے طرح طرح کے عجیب و غریب آلات ایجاد کئے ہیں ان حالات کی مدد سے ان کو پتہ چل گیا ہے کہ باشندگانِ ارض جتنی زبانیں بولتے ہیں ان میں سب سے اہم صرف چار زبانیں ہیں اُردو، چینی، انگریزی اور روسی۔ جن مہاپرشوں اور مہاپتابیوں کی طرف ہمارا سنکیت ہے اُن کو چاہئے کہ مسٹر بروز کی خبر اچھے پرکار سے لیں تاکہ صاحب بہادر اپنے دونوں کان پکڑ کر پشچاتاپ کر لیں اور مانیں کہ کیول ہندی بھاشا کل بھارت نواسیوں کی ماتر بھاشا ہے اگر مقدمہ چلانے کی ہمت نہ ہو تو کم از کم ایک پتر لکھ کر ان کو قائل معقول کریں ہمارے متروں کو بھلی بھانت یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سمئے چپ بیٹھنے کا نہیں ہے اگر ہمارے متر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور یہ اوسر نکل گیا تو پھر امریکہ والوں کی طرح اور جاتیاں بھی اُردو کا پکش لینے لگیں گی آشنکا ہے کہ ہماری پرانشا پر کل مہاپرش ہو گیا

تو تو میں میں۔ بھی [illegible] کے ضمن کے تحت شوکت تھانوی [illegible] لکھتے تھے۔

تو تو میں میں (چٹکیاں)

[illegible] کہ آپ [illegible] صاحب [illegible]

شہر [illegible] کی [illegible] بالکل [illegible]

ادھر ادھر کی کے نام سے [illegible] ادھر ادھر کی [illegible] تھے۔

ادھر ادھر کی

وہی ہے جیسے تو گدھوں کے کان بجے

یہ تو خیر ایک [illegible] جب کسی [illegible] تو اب یہ [illegible] کہ تمام [illegible] لکھنؤ ـــ فیض آباد کے درمیان متعدد واقعات ہو چکے ہیں جس کا یہ نتیجہ ہو گیا ہے کہ [illegible] اوقات بھی حل پڑنے لگا ہے ہم پوچھتے ہیں کہ بھلا یہ کون سی بات ہے اور اس کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

ایڈیٹر کی ڈائری اس عنوان سے شوکت تھانوی ہر تاریخ ڈائری لکھتے تھے بعد میں اس کا عنوان بدل کر ایڈیٹر کی رام کہانی بھی ہو گیا تھا۔

ایڈیٹر کی ڈائری (ایڈیٹر کی رام کہانی)

۲۳ ستمبر۔ غیر دلچسپ واقعات لکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم بھی گویا اپنے وقت کے خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ بن جائیں۔ جبکہ دلچسپ واقعات ہر وقت اور ہر روز پیش نہیں آتے۔

۲۶ ستمبر۔ آج بحمد اللہ سب خیریت رہی لہذا کوئی خاص بات قابل تحریر پیش نہیں آئی۔

۲۹ ستمبر۔ غیر دلچسپ واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں مگر آج کوئی دلچسپ واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔

۹ ۔ اکتوبر ۔ اتوار کا دن ملاحظہ فرمایئے اور آج ہی بخار ہو گیا ۔ بخار کے بعد اور کیا دلچسپ بات آپ سننا چاہتے ہیں ۔

اقوال مولانا سرپنچ اس کالم کے تحت مولانا شوکت تھانوی اپنے تیار کرتے تھے ۔

اقوال مولانا سرپنچ

○ شادی کے بعد سسرال جم کے رہیے تاکہ کچھ عرصے بعد میکے کی قدر ہو سکے ۔
○ دوسروں کی بیویوں کو اپنی والدہ سمجھئے تاکہ آپ کی بیوی کو بھی لوگ والدہ سمجھیں ۔
○ پلاؤ زردہ سے کم پر شکر ادا نہ کیجئے ورنہ میزبان سمجھیں گے کہ یہ بندہ دال اور روٹی میں خوش ہے اس سے بہتر کھانے کیوں دیئے جائیں ۔
○ وقت کا پابند ہونا حبس دوام کی سزا بھگتنے کے برابر ہے ۔
○ کھانا خوب چبا کر نہ کھایئے ۔ اس سے دانت کمزور ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔
○ آج کا کام کل پر ٹالیئے اس لیے کہ ممکن ہے کل کا کام پرسوں پر ٹل جائے ۔

سرپنچ کے خاص نمبر ۔ سرپنچ اپنے خاص نمبر بڑی دھوم دھام سے نکالتا تھا ۔ سرپنچ کے عام ایڈیشن کے علاوہ اپریل فول نمبر ، سالِ نو نمبر (سرپنچ گزٹ) اور عید نمبر وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں : "سویاں مبارک" کے عنوان سے "عید نمبر" کا اداریہ لکھا جاتا اور اس پر یہ شعر اپنی بہار دکھاتا ؎

سرپنچ پڑھنے والوں کی ہر روز عید ہے
سرپنچ : عید ، اصل میں بس تیری دید ہے

سرپنچ گزٹ ۔ سالِ نو کے موقع پر مزاح نگاروں کو باقاعدہ خطابات تقسیم کرتا اور ان کے دلچسپ اعلان شائع کرتا ۔

سرپنچ گزٹ

(فہرست خطابات سالِ نو)
منجانب ادارہ سرپنچ

بتقریب سالگرہ اعلیٰ حضرت حضور پُر نور ہز ہائی نس عالی جناب سرپنچ بہادر دام اقبالہ وظرافتہ

تبسم نواز جنگ ۔ شوکت تھانوی
جہنم نواز جنگ ۔ امین سلونوی
ظرافت الملک ۔ فرحت اللہ بیگ
تمکنت جنگ ۔ تمکین کاظمی
جمیل القلم ۔ رشید احمد صدیقی
قلیل القلم ۔ پطرس بخاری
لیڈر القلم ۔ ملا رموزی

الادیب الدہر ، مرزا فرحت اللہ بیگ حیدرآباد ، مسٹر رشید احمد صدیقی علی گڑھ ، حکیم ممتاز حسین عثمانی لکھنؤ ،

مسٹر [illegible] جوش فتح گڈھ، مسٹر احمق پھپھوندوی پھپھوند۔

ن یار جنگ۔ مسٹر عشرت بخاری لاہور، ملا رموزی بھوپال، مسٹر عظیم بیگ چغتائی جودھپور، مسٹر [illegible]۔
مولانا عبدالمجید سالک لاہور، ڈاکٹر عبدالباری آسی لکھنؤ، مسٹر محمد فاروق دیوانہ گورکھپور، مولانا [illegible]
[illegible]، چودھری محمد علی ردولوی بارہ بنکی، مسٹر شہباز بلند پرواز حیدر آباد۔

ح الملک۔ مسٹر حامد شاہجہانپوری بمبئی، مسٹر [illegible]، مسٹر [illegible] حیدر آباد، ملا [illegible]
دہلی، مسٹر حافظ غازیپوری، مسٹر [illegible] نظامی۔

ح الدولہ۔ [illegible] قدرت، [illegible] کانپور، مسٹر [illegible] حیدر آبادی حیدر آباد، مسٹر [illegible]
[illegible] کانپور، مسٹر [illegible] کانپور، [illegible] کانپور

خان بہادر۔ مسٹر بشیر احمد علوی لکھنؤ، مولوی [illegible] کانپور، ملا [illegible] کانپور، ملا [illegible] کانپور
مسٹر [illegible] لکھنؤ، مسٹر [illegible] لکھنؤ، مسٹر [illegible]۔

ملک الشعراء۔ سید مقبول حسین ظریف لکھنوی، مسٹر [illegible] مجنون لکھنوی۔

امام الشعراء۔ مسٹر محب دریابادی، سید حسن جعفر شوخ لکھنوی، مسٹر [illegible] میرٹھ، سید [illegible] لکھنوی،
ڈاکٹر چودھری نذیر احمد [illegible] لکھنؤ۔

سرپنچ اپریل فول نمبر کی سرخیاں دیکھئے:-

سرپنچ اپریل فول نمبر

قطب مینار گر پڑا

دہلی میں قیامت خیز آندھی

[illegible]

تاج محل سیاہ ہو رہا ہے

سنگ مرمر نقلی ثابت ہوا

کوہ ہمالہ کی مہم

ہوائی جہاز سے کوہ ایورسٹ منہدم

مہاتما گاندھی کی شادی

ہری جنوں سے تعلقات بڑھانے کی ترکیب

اچھوت لڑکی سے نسبت ہو رہی ہے

[illegible]

زنانہ پارک میں جلسہ، مردوں کو دعوت عام

ہندوستان کا دار السلطنت بدل گیا

بجائے دہلی کے اناؤ

قرطاس ابیض آسٹریلیا کے متعلق ہے
ڈاک کی غلطی سے ہندوستان آگیا
ہندوستان کا قرطاس ابیض آسٹریلیا چلا گیا

مہاتما گاندھی کی تازہ غیر مطبوعہ غزل خاص بہر سرپنچ

اک ہاتھ میں پانی ہے اک ہاتھ میں چرخا ہے — پہلو مرا مٹکا ہے چرخا مری دنیا ہے
میں جیل کے اندر ہوں گھر گھر مرا چرچا ہے — جو نام ترا ہے اور جو سب ہے وہ اپنا ہے
ے جان کا چھوڑو تم سنڈے ہاتھ ہو — مندر کی حقیقت کیا دل اپنا شوالا ہے
پھر اتنے ہی پھیلاؤ، ہو جتنی بڑی چادر — گھر ہی، ہو جائی کھدر میں زمانہ ہے
میں جیل کے اندر ہوں اور جیل سے گتی ہے — میں ہوں مری کٹیا ہے اک آشرم کا پردہ ہے

گاندھی کو نہ چھیڑو اور گاندھی کو نہ چھیڑو تم
مرنے ہو تو مر جاؤ، وہ جینے سے لیتا ہے

سرپنچ کے انتخابات (پنچایت، "حلوائی کی دکان")

سرپنچ بھی دوسرے رسائل و اخبارات سے مزاحیہ ادب منتخب کرنے کے لیے ایک مستقل کالم "پنچایت" کے عنوان سے تھا جو بعد میں "حلوائی کی دکان" ہو گیا تھا۔ سید امتیاز علی تاج، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور مولانا عبدالمجید سالک وغیرہ کی تخلیقات خاص طور پر اس عنوان کے تحت منتخب کی جاتی تھی پطرس کے بہت کم تھے اور رشید احمد صدیقی، سید امتیاز علی تاج کے مضامین سرپنچ تک پہنچ نہیں پاتے تھے لیکن سرپنچ ان کے مضامین اس کالم کے تحت اپنے یہاں نقل کرنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ اس کالم کے اوپر جلی حروف میں لکھا رہتا تھا کہ "اس باب کے ماتحت تمام برادری سے بے تکلفی برتی جائے گی کہ جہاں سے جو چاہیں اپنی چیز سمجھ کر لے لیں۔"

سرپنچ کے کارٹون

اودھ پنچ کے بعد ہمیں کارٹونوں کا سب سے بڑا خزانہ شوکت تھانوی کے سرپنچ ہی میں ملتا ہے۔ سرپنچ کے کارٹون بہت نکیلے، تیکھے، جاندار، ہنستے ہوئے اور دلآویز ہوتے تھے۔ کامل لکھنوی اور امین فرنگی محلی اپنے فن میں یکتا تھے یہ سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی، مذہبی اور معاشرتی موضوعات کو ہدف بناتے تھے۔ خاص نمبروں میں مزاح نگاروں کے کارٹون بھی ہوتے تھے۔ "چوڑیاں پہنے ہوئے پولیس"، "حامد کا ہرّا"، مولانا شوکت علی، افقر موہانی، عنایت دہلوی، مدیر ریاست اور "بیگ اقوام" کے کارٹون اس میں بے حد مقبول ہوئے تھے۔ سرپنچ اکثر انگریزی رسائل و اخبارات کے کارٹون بھی نقل کرتا تھا۔

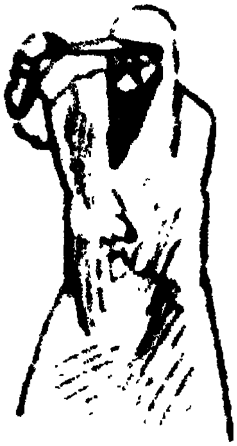

[illegible]

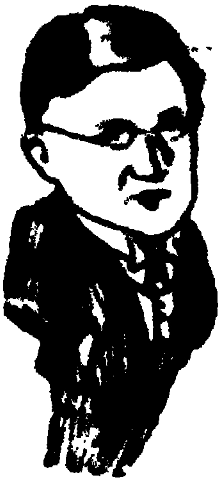

[illegible]

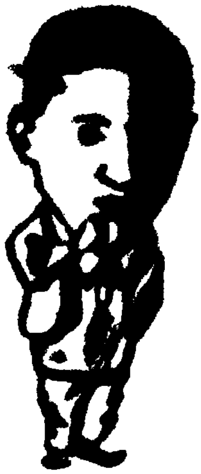

[illegible]

سرپنچ کے معرکے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پنچ کلکتہ سے [illegible] چونچ [illegible] انھوں نے نوابِ لکھنؤ کی غزل سرقہ کر لی جو شوکت تھانوی [illegible] سرپنچ نے کلکتہ کے نام [illegible] جو مسلسل اور متواتر [illegible] کی تھی اس کا [illegible] فائدہ اس قدر جلد اُسے [illegible] پہنچے گا [illegible] جب تک [illegible] کا خبط [illegible] قیامت بن کر ان حضرات پر ٹوٹتا رہا اس وقت تک تو آپ خدا جانے [illegible] کہاں پناہ لیتے تھے۔ ہم کو ہر طرف سے سمجھایا گیا اور ہر ایک نے ہم کو خاموش کرنے کی کوشش کی اور ہم نے اپنے کو [illegible] کہنا مناسب سمجھا اور ان ذات شریف نے ہر بات پر بلا ٹال دی۔ ابھی یہ قیامت خیز معرکہ جاری تھا کہ [illegible] حکیم محمد یوسف حسن نے کلکتہ جا کر چونچ والوں کو ٹھنڈا کیا اور لکھنؤ آ کر سرپنچ والوں کو مجبور کیا۔ غرض بیچ بچاؤ کر کے اس معرکہ کو فرو کیا۔

سرپنچ کے خطوط (ڈاک خانہ) کے عنوان سے سرپنچ کی خط و کتابت شائع کی جاتی تھی۔ یہ خط اصلی بھی ہوتے تھے اور فرضی بھی۔ ان خطوں میں اودھ پنچ کی جھلک ملتی ہے [illegible] والیانِ ریاست کو ریاستی معاملات سے [illegible] متوجہ کیا جاتا تھا جو فقرہ بازیاں [illegible] اور پیشین گوئیوں کے علاوہ [illegible] چھوڑی جاتی تھیں۔ ریاستی سربراہوں

اور قومی رہنماؤں پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ نواب رامپور کے نام ، اس کالم میں [illegible] کے عنوان سے بہت ہی دلچسپ خط شائع ہوا تھا۔ سرپنچ میں شائع ہونے والے خطوط کا ایک نمونہ دیکھئے۔

ڈاک خانہ (سرپنچ ڈاک)

مائی ڈیئر شوکت صاحب!

للہ آپ چوہے کی جان چھوڑ دو۔

نہیں چڑچڑا ہو جانے سے بے زبان جانور کو ستانا اچھا نہیں ہوتا۔

رفیع احمد نگینہ

رفیع احمد صاحب نگینہ تسلیم

"چوہے کو چھوڑ دوں، بہت اچھا مگر وہ تو بغیر پاسنگل کے دو روز سند فکر کے چھوڑا جا سکتا ہے۔ بہرحال آپ کے علاوہ دو سہ احباب کی بھی رائے ہے کہ سرپنچ کو چوہے کے سے چڑ مار نہ جانا چاہیئے ورنہ ہم خود بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ اب پنجرہ کی کھڑکی کھول دی جائے۔

سرپنچ

اودھ اخبار لکھنؤ سنہ ۳۳ء میں ہمدم اخبار بند ہونے کے بعد سرپنچ کے ساتھ ساتھ منشی نولکشور کے اودھ اخبار سے بھی وابستہ ہو گئے۔ اس میں بھی انھوں نے اپنے "دو دو باتیں" کے کالم کو جاری رکھا۔ اودھ اخبار مائل بہ زوال تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید نورالحسن کے جانے کے بعد شوکت تھانوی اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر کئے گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد اخبار سے علیحدہ ہو گئے۔ اور کچھ دن بعد اودھ اخبار کورٹ آف وارڈ کی تحویل میں چلا گیا۔ اودھ اخبار میں ان کی ظرافت کا نمونہ دیکھئے۔

دو دو باتیں (روزنامہ اودھ اخبار لکھنؤ)

"چائے پینے والی دنیا لپٹن کمپنی کے نام سے ناواقف نہ ہوگی۔ اس لیے اسی کمپنی کو چائے نوش دنیا کے پیر مغاں کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس کمپنی نے جو ادبی خدمات انجام دی ہیں اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے حالانکہ وہ خدمات پردۂ راز میں ہیں بلکہ یہ غیر فانی حیثیت سے علم و ادب کی دنیا میں جگمگا رہی ہیں۔ لپٹن کی چائے نے دوسری زبانوں کے لٹریچر پر جو احسانات کئے ہیں ان سے ہم کو کوئی سروکار نہیں البتہ اب اردو ادب میں اس ادب نواز کمپنی نے جو معتدبہ اضافے کئے ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا ہماری انتہائی بے ادبی ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ لپٹن کمپنی نے اردو کی وہ خدمات انجام دی ہیں کہ اردو زبان اور اردو زبان کو اپنی مادری زبان کہنے والا طبقہ اس کمپنی کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

لپٹن کمپنی کی [illegible] ادبی خدمات سے [illegible] آپ [illegible] واقف ہوں گے جو [illegible] چھپ [illegible] پیالیوں پر چھپے شعر [illegible] مشہور ہوں [illegible] استعمال [illegible] معروف [illegible] پہلے [illegible] پروپیگنڈا [illegible] مگر آج کل [illegible] شعر [illegible] ہو سکتا ہے [illegible] کی حقیقت [illegible] اور [illegible] کیا جاتا ہے۔ [illegible] لپٹن کمپنی [illegible] لپٹن کی چائے [illegible] پہنچتی ہے [illegible] نہیں [illegible] اس جگہ [illegible] کمپنی کی [illegible] شاعری [illegible] کی وجہ [illegible] ہوتی ہے۔

[illegible] لپٹن کمپنی کی [illegible] شاعری کا ایک نمونہ [illegible] نہیں [illegible] معلوم ہو کر حیرت اور حیرت کے ساتھ مسرت ہوگی کہ یہ کمپنی [illegible] شاعری سے بھی دلچسپی رکھتی ہے مگر [illegible] ہو کر رہ جائے [illegible] اور [illegible] کا [illegible] کہ [illegible] لپٹن کمپنی کا رنگ شاعری بہت کچھ دینا [illegible] ماحصل ہے۔

ہر سخن [illegible]

[illegible] کہ لپٹن کمپنی [illegible] زیادہ کامیاب ہے [illegible] اور [illegible] تو ڈال دیتا [illegible] کو بہت جلد لوگ فراموش کر دیں گے۔

حال ہی میں لپٹن چائے کا ایک اشتہار شائع ہوا ہے اس میں شعر کے جو نادر الوجود نمونے موجود ہیں ان کو فی الحال چھوڑیے لیکن لپٹن کمپنی کا [illegible] نتیجۂ فکر ملاحظہ فرمائیے کیا خوب فرمایا ہے ــــ

یہ شخص اور ان کے بھائی
پیتے ہیں لپٹن چائی

اس شعر کی معنوی خوبیوں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی بد مذاق "چائی" پر غور کرنے لگے تو اس کی [illegible] لپٹن کمپنی پر نہیں بلکہ خود اس شخص کی محدود استعداد پر ہے یہ ٹھیک ہے کہ صحیح لفظ "چائے" ہے لیکن اول تو جملہ کا قافیہ چائے نہیں بلکہ "چائی" ہے دوسرے اگر شاعر چائے کو ردیف رکھتا تو بالائی یا [illegible] وغیرہ [illegible] کا براہ راست چائے سے تعلق ہے نظم نہیں ہو سکتے تھے لہذا اس قدر دانش شاعر کمپنی نے [illegible] سے پہلے ایسی جنس لطیف کی بھی تانیث چائی کی صورت میں بنائی بہرحال [illegible] مسئلہ پر بحث نہ کیجیے بلکہ یہ دیکھیے کہ اس کمپنی نے کس قدر اچھوتے اور کیف آور خیال کو نظم کیا ہے مگر افسوس ہے کہ صرف یہی مطلع شائع ہوا ہے امید ہے کہ پوری غزل لپٹن کمپنی لمیٹڈ کی کلیات میں ملے گی اگر کسی صاحب

کریمی کمپنی کی کلیات کے ملنے کا پتہ [illegible] قیمت معلوم ہو تو برائے مہربانی مطلع فرمائیے۔

روزنامہ ہند لکھنؤ ۔ روزنامہ [illegible] دہلی کے [illegible] کہ لکھنؤ میں [illegible] کے تحت ہند کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا [illegible] اخبار [illegible] شوکت تھانوی کو اخبار کا نائب مدیر مقرر کیا گیا مگر [illegible] ماہ کے بعد [illegible] کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ہند اخبار میں بھی شوکت تھانوی نے دو دو باتیں کے مزاحیہ کالم کو جاری رکھا اس کا ایک نمونہ

دو دو باتیں (روزنامہ ہند لکھنؤ)

کلکتہ سے ایک ہفتہ وار چھوٹا اخبار "ہریتی" کے نام سے شائع ہوتا ہے اور خدا جانے کیوں جاری ہے معلوم نہیں وہ کون لوگ ہیں جو اس اخبار کے ظریف کہلانے کی ذلیل برداشت کرتے ہیں۔ واللہ یہی بہتر جانتا ہے لیکن ہم تو یہ کہیں گے کہ اس اخبار کا مذاق پسند ہے لئے کہ تو یہ ایک مزاحیہ اخبار ہے لیکن اس کا مزاح در اصل مزاح [illegible] سے بغض والوں والا گندہ مذاق اور منہ چڑانے والی ظرافت اس نام نہاد ظریف اخبار کی خصوصیات ہیں۔ وہ اخبار دنیا میں [illegible] درجہ حاصل ہے جو ہندوستان میں اچھوت قوم کو حاصل ہے حال ہی میں ہم نے [illegible] معاصر سرپنچ نے اس اخبار کا جو [illegible] چھوڑا ہے اور جس بری طرح اس کا [illegible] ہے وہ واقعی ایک عبرتناک سبق ہے۔

قصہ اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے مایہ ناز ظریف شاعر اور سرپنچ کے [illegible] سید [illegible] حسین صاحب ظریف لکھنوی نے ایک غزل [illegible] بہت پہلے کسی مشاعرے کے لیے [illegible] جس پڑھنے کے بعد لکھنؤ کے بچے بچے کی زبان پر آ گئی اور ہندوستان کے بیشتر اخبارات نے اس غزل کو نقل کیا۔ لیکن اب وہی غزل اخبار ہریتی میں مدیر ہریتی جناب عنایت دہلوی کے نام نامی اسم گرامی کے ساتھ چھپی نظر آ رہی ہے۔ اور بقول معاصر سرپنچ کے ہم خود حیران ہیں کہ اس غزل کے حقوق ملکیت کس طرح یکایک ظریف صاحب سے عنایت صاحب کی طرف منتقل ہو گئے۔ ہم نے نہ آج تک ایسا عظیم الشان توارد دیکھا ہے کہ پوری کی پوری غزل لڑ جائے نہ ہم نے ایسا بے تغیر سرقہ دیکھا ہے کہ کسی زندہ مشہور شاعر کا کلام چرا کر شائع کر دیا جائے اور نہ یہ دیدہ دلیری ہماری نظروں سے گزری ہے کہ چوری کی غزل جلی حروف کے ساتھ اپنے ہی اخبار کے سرورق پر اس طرح چھاپی جائے کہ گویا آپ ہی کی نوج ہے۔ ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ظریف صاحب کی مذکورہ بالا غزل کے کچھ شعر ہم کو بھی یاد ہیں جو حال ہی میں چوری کی گئی اور جس کا چور معاصر سرپنچ نے لکھنؤ بیٹھے بیٹھے ہی کلکتہ میں گرفتار کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے وہ اشعار ۔

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] گلستاں [illegible]

[illegible]

[illegible]

ماہنامہ شباب لکھنؤ ۔ [illegible] بند ہونے کے بعد شوکت تھانوی [illegible] [illegible] نے "شباب" کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ کا اجرا کیا اور اس کا ایڈیٹر شوکت تھانوی کو مقرر کیا۔ "شباب" میں اردو کے ممتاز لکھنے والوں کی نگارشات چھپیں بعض شوکت تھانوی نے [illegible] اور [illegible] مگر ایک سال چل کر یہ رسالہ بند ہو گیا۔

روزنامہ حق لکھنؤ جب ۱۹۳۵ء میں ہفتہ وار سے روزانہ اخبار ہوا تو شوکت تھانوی کو اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ دفتری امور، ترجمہ اور شذرات کے علاوہ حق و باطل کے عنوان سے حق کا مزاحیہ کالم اور شاعر حق کے نام سے روزانہ ایک مزاحیہ قطعہ یا رباعی بھی لکھتے تھے —— دونوں کے نمونے دیکھئے۔

رباعی —— شاعر حق

ہر راہ گزر پہ ہر قدم پر شاعر
آتا ہی نہیں [illegible] شاعر
اللہ رے شعر و شاعری کی بہتات
بیوی شاعر ہیں اور شوہر شاعر

حق و باطل (روزنامہ حق لکھنؤ)

"مجھے اور سنیئے کہ یورپ کے ایک ڈاکٹر صاحب نے یہ جدید تحقیقات فرمائی ہے کہ اکثر بیماریوں کا علاج گانے کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور بہت سے ایسے امراض ہیں جن میں بجائے دوا ہی استعمال کرنے کے یہ طریقہ بیحد مفید ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مستقبل قریب میں لوگ ادویہ کا استعمال بالکل ترک کر دیں گے اور موسیقی کے ذریعہ بیماریوں کا تدارک کریں گے اسی طریقہ کو تمام اطبا اختیار کریں گے۔ موسیقی سے نہ صرف ذہنی اور دماغی بلکہ جسمانی علاج بھی ہوگا۔

مگر ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق اگر صحیح ہے تو سب سے پہلے ان کو ہی اور اپنے ہم پیشہ اطبا کی خبر لینا چاہیے اور حصول معاش کا کوئی اور ذریعہ تلاش کر لینا چاہیئے۔ اس لیے کہ موسیقی سے بیماریوں کا علاج عام ہو جانے کے بعد یہ تمام دنیا کے ڈاکٹر، حکیم سب [illegible] رہ جائیں گے۔ البتہ ان کی جگہ پر مس زہرہ بائی، مس اللہ رکھی، مس جن جان، مس گلن جان، مس بے نظیر، مس گن بائی اور ماسٹر نثار وغیرہ کی پریکٹس خوب چلے گی اور ہر شہر کے چکلوں میں ہر کمرے پر مطب کھل جائیں گے۔ یہی کم ظرف بالا نشین گانے والیاں سول سرجن بھی ہوا کریں گی اور اسسٹنٹ سرجن بھی اور یہی تمام آلات موسیقی آلات طب کا کام دیں گے۔

جب یہ طریق کار بعد جاری ہو گا زمانہ یہ ہوا کرے گا کہ غریب آدمی بیمار ہو کر ڈولیوں میں، دو یا پیادہ گانے والوں اور گانے والیوں کے مکانات اور کوٹھوں پر جایا کریں گے اور وہ مریضوں کو دیکھ کر نسخہ تجویز کریں گی کہ اس کو ٹھمری سے فائدہ ہو سکتا ہے یا بھیرویں سے، غزل اس کے لیے مفید ہو گی یا دادرا، اور جیسی بھی مرض کی نوعیت ہوگی ویسا ہی علاج کر دیا جائے گا۔ اسی طرح امرا ان مغنی طبیبوں کو فیس دے کر اپنے گھر پر بلایا کریں گے اور وہ بجائے تھرمامیٹر اور دوسرے آلات کے طبلہ اور سارنگی وغیرہ لے کر موٹر پر نہایت ٹھاٹھ سے ان کے یہاں جایا کریں گے۔ ان کی نبض دیکھیں گے کہ کون سا راگ چھیڑیں۔ یہی ہے پھر اسی کے مطابق کوئی چیز ان کو سنا کر اپنی فیس لے لیں گے اور کسی دوسرے مریض کے یہاں چلے جائیں گے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جب یہ طریقہ علاج رائج ہو جائے گا تو لیڈی ڈاکٹروں کی کثرت ہو جائے گی اور مرد زیادہ تر لیڈی ڈاکٹروں ہی کا علاج کریں گے۔

اگر اس وقت جو نسخہ لکھنے کا طریقہ رائج رہا تو یہ ہوا کرے گا کہ ڈاکٹرنی صاحبہ مع اپنے سازندوں کے جو اس وقت کمپونڈر کہلائیں گے مریض کے یہاں جائیں گی اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد پہلے تو یہ طے کریں گی کہ کون سا مرض ہے یعنی دق ہے یا ہیضہ، اور اس کے بعد پھر اس طرح نسخہ لکھیں گی:

ہمدم

مدیر مسئول [illegible]

مدیر [illegible]

معاون [illegible]

[illegible] سے ہمدرد [illegible] ہوتے رہتے ہیں۔

اب [illegible] کا ورد کرتے ہیں۔

ماہنامہ کائنات لکھنؤ ۔۔ ماہنامہ [illegible] شوکت تھانوی [illegible] ۱۹۳۰ء [illegible] بعض نزاکتوں کے [illegible] ہوگئے [illegible] شوکت تھانوی [illegible] کائنات [illegible] کائنات میں شائع ہوتی تھی [illegible] کی طرح تھی۔

[illegible] اسی کی کائنات

روزنامہ طوفان لکھنؤ ۔۔ روزنامہ [illegible] میں شوکت تھانوی [illegible] ان کے سرپرستوں [illegible] دوسروں کے علاوہ [illegible] نواب [illegible] سر محمد مزمل اللہ خاں، خان بہادر سید [illegible] الدین، خان بہادر سید [illegible] حسین [illegible] شیخ احمد علی [illegible] وغیرہ کی مدد سے یکم جون ۱۹۳۶ء کو شوکت تھانوی نے ایک اخبار "طوفان" کے نام سے جاری کیا۔ "طوفان" کانگریس کے مقابلے میں "زمیندار کانفرنس" اور تعلقہ داروں کی نیشنل ایگریکلچرسٹ پارٹی کا ترجمان تھا شوکت تھانوی تحریر کے بادشاہ تھے مگر منتظم نہ تھے جب مولانا محمد علی جیسے عدیم المثال انسان کا اخبار محض تحریر کی خوبی سے نہ چل سکا تو بھلا طوفان کیا چلتا۔ آزادی جمہور کے چند جھونکے اس پارٹی اور راجہ صاحبوں کو اڑا لے گئے، اخبار ایک سال چل کر بند ہو گیا اور طوفان گزر گیا۔ طوفان کی پالیسی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی طوفانی ظرافت کا مختصر نمونہ دیکھئے:۔

روزنامہ طوفان کی ظرافت

"سنا ہے کہ کانگریس کا اجلاس منعقد کرنے کے لیے کئی صوبے [illegible] رہے ہیں۔ کیا کانگریس بھی بعید جات ہے؟"

"انڈیا ہاؤس کی نمائش میں شاہ ٹیپو سلطان کی پگڑی اور بیگم اودھ کا دوشالہ رکھا گیا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد گاندھی جی کی لنگوٹی بھی ان تاریخی چیزوں میں شامل ہو جائے گی بشرطیکہ مجنوں کے گریبان کی

مدیر [illegible] کراچی

روزنامہ جنگ کراچی ۔ شوکت صاحب [illegible] وفات سے پہلے [illegible] کراچی چلے گئے تھے [illegible] روزنامہ [illegible] اور مشرق میں [illegible] روزنامہ جنگ کراچی کے [illegible] کراچی چلے گئے جہاں انھوں نے "وغیرہ وغیرہ" کے عنوان سے اسی اخبار میں روزانہ "وغیرہ وغیرہ" لکھنا شروع کیا۔ [illegible] کرلی۔ ان کے اس صحافی مزاج کا ایک نمونہ دیکھیے۔

وغیرہ وغیرہ (روزنامہ جنگ کراچی)

آج میرے ایک مخلص دوست [illegible] سامان سے [illegible] اور [illegible] کوئی چیز نکالنے کے لیے بھی نہیں [illegible] سامان [illegible] سامان بھی ایسا کہ وہ چیزیں [illegible] وہ بھی [illegible] سمجھتے ہیں [illegible] کسی طرح [illegible] بیس برس پہلے ہجرت کی [illegible]۔

اس [illegible] یہ ہے کہ یا تو ہم خود رہیں یا سامان کو رکھیں [illegible] دونوں کے لیے [illegible] ایسے سامان میں [illegible] محسوس [illegible] اور اس حقیقت کو بھی [illegible] خالی [illegible] بیس برس کے سامان [illegible] کل کی [illegible] چنانچہ ہم نے [illegible] کہ خدا کے فضل سے اسباب [illegible] رکھتے ہوئے، اسباب جمع کرنے کی بھی کوشش نہیں کی اور اگر اسباب جمع بھی کرتے تو نتیجہ [illegible] یہ کہ یہی ہو سکتا تھا کہ یا تو اسباب باہر ہوتا اور ہم گھر میں یا سب گھر میں اور ہم باہر مگر ہم نے یہ صورت ہی پیدا نہ ہونے دی، اور ہم اور ہمارا اسباب نہایت [illegible] طریقہ پر اسی گھر میں مدت سے رہتے چلے آ رہے ہیں اور جو حضرات [illegible] کے بندے ہیں لہٰذا اس سے مکان کی شناخت بھی نہیں کر سکتے۔

صاحب ہمارے مکان میں دو قلمدان کی نسل کے کمرے ہیں۔ ایک کمرے میں ایک طرف باورچی خانہ ہے دوسری طرف ایندھن رکھنے کی جگہ۔ دو دیواروں پر بڑی بڑی کیلیں گاڑ کر کچھ تختے بیوی نے نہایت سلیقے سے لگا دیے ہیں۔ جن پر برتن رکھے جاتے ہیں . . .

دوسرے کمرے میں دو پلنگ بچھے ہوئے ہیں اور ان دو پلنگوں کے بعد جو جگہ بچی ہے اس میں تلے اوپر کپڑوں کے بکس رکھے ہوئے ہیں دو الماریاں بھی اس کمرے میں ہیں . . . جن میں سے ایک الماری کے تختے پر . . . کہتے ہیں کہ کبھی ایک کنگھا بھی پایا جاتا تھا مگر امتدادِ زمانہ کے ماتحت اب اس کے چند دانے باقی رہ گئے ہیں۔

الماری کے تیسرے تختے کے متعلق مورخ حیران ہے کہ اس کو کتب خانہ کہے یا نعمت خانہ، اس پر کبھی کتابیں بھی دیکھی گئی ہیں اور بسا اوقات اِن ہی میں . . . میلاد شریف کے آئے ہوئے بتاشے،

[illegible]

[illegible]

[illegible] ان کو سمجھا جائے گا۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی۔ [illegible] حکومت کی مدد کے بعد روزنامہ [illegible] جنگ [illegible] شوکت تھانوی کو اس کا ایڈیٹر بنا کر بھیجا گیا۔ انھوں نے اس میں "پہاڑ تلے" کے عنوان سے جنگ کا مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا۔ اس کا ایک نمونہ دیکھیے۔

پہاڑ تلے (روزنامہ جنگ راولپنڈی)

ہمارے اسکول کے بچوں سے خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں اگر آپ یہ سوال کریں کہ تم کو کہانیوں میں سب سے زیادہ کیا بات پسند آئی؟ تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ "ہم کو تو کہانیوں میں سب سے زیادہ پسند یہ گانا آتا ہے کہ... "مرے راجہ کا جنگل میں راج ہے"

ان سے اگر پوچھیں کہ " اکبر اعظم کے عہد کا کوئی ناقابل فراموش کارنامہ بتائیے " تو وہ فوراً کہیں گے کہ ہم کو تو صرف ایک ہی کارنامہ یاد ہے کہ اکبر کا دربار سجا ہے۔ شاہزادہ سلیم ایک کرسی پر بیٹھا ہے خود اکبر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہیں۔ تمام امرائے دربار نہایت ادب سے بیٹھے ہیں کہ وہ حور بالا کا جو انارکلی ہی ہوتی ہے ناچ شروع ہوتا ہے اور وہ شہزادہ سلیم کی طرف اشارے کرکے گاتی ہے۔

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

ان سے اگر آپ دریافت کریں گے کہ " مرزا غالب کون تھے " تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ " مرزا غالب وہ تھے جن سے ملنے کو بیگم نے اپنی بیٹی نور جہاں کو سختی سے منع کیا تھا۔

ہمارے یہ طالب علم اس قسم کے نہ معلوم کتنے تاریخی اور ادبی حوالے بے نصاب سمجھ کر بلکہ فلموں سے لیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کو جو عبور فلموں پر حاصل ہے وہ اپنی درسی کتابوں پر ہرگز نہیں حاصل ہے۔ ان کو اپنے مستند اساتذہ کا کلام تو خیر یاد نہیں ہے البتہ وہ اس موقع پر جہاں بیٹھے سانس ملے وہ اشعار پڑھے یا لکھے جاتے ہیں جب کبھی ان کو کہیں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحبزادے نے والدہ محترمہ کو خط لکھا کہ " آپ نے مجھ سے خط نہ لکھنے کی جو شکایت کی ہے وہ میری طرف سے یہ شکایت کی جا سکتی ہے کہ میں آپ کو بھول گیا ہوں، کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ میں آپ کو کس قدر یاد کرتا ہوں۔ میرا تو یہ حال ہے کہ

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے جب تیرا کسی نے نام لیا

میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ جلدی سے چھٹی ہو اور میں آپ کی خدمت میں یہ کہتا ہوا حاضر ہو جاؤں کہ

تم جگ جگ جیو مہاراج ہم تہری نگریا آئے

اسکولوں کے ان بچوں کا کیا قصور ہے جب ان کے گھر کا ماحول ہی یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ والدہ محترمہ کو دیکھتے ہیں کہ درزی کپڑے سی کر لایا اور وہ اس کو ڈانٹ رہی ہیں کہ " تم نے غارت کرکے رکھ دی یہ قمیص، میں نے تم سے کہہ بھی دیا تھا کہ یہ بالکل اس وضع کی ہونا چاہیے جیسی لیلیٰ نے اس وقت پہن رکھی تھی جب وہ گا رہی ہے کہ

تو بین بجا میں ناچوں گی

یہ تو تم نے ڈھیلی ڈھالی بالکل ایسی ہی بنا دی جیسی فلم گلنار میں بیگم نے پہن رکھی ہے تم سے یہ کس نے کہا تھا کہ میرے لیے رخشی کی پیشواز سی لاؤ۔ میں نے تم کو ٹکٹ کے دام بھی دیے تھے کہ پہلے جا کر فلم پیپرن دیکھو۔ اس کے بعد لیلیٰ کی نمونے کی قمیص سی کر لاؤ۔ تم نے مجھے بھی کوئی سٹنٹ سمجھ رکھا ہے کہ میرے لیے یہ ڈھیلی ڈھالی بد قطع قمیص سی لائے ہو "

دوسری طرف سے ہمشیرہ محترمہ دوڑتی ہوئی آئیں کہ " دیکھیے ممی مجھے منی نے حوض میں دھکیل دیا ہے میرے سارے کپڑے بھیگ گئے معلوم ہوتا ہے جیسے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تصانیف شوکت تھانوی

• اُردو کے ایسے منفرد مزاح نگار ہیں جن کا ایک ایک حرف اپنی جگہ لازوال بھی
اور خوبصورت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شوکت تھانوی سب کا محبوب مصنف ہے

بھابی (ناول) • جتنے سو سال [illegible] ہو جائیں [illegible] کہاوت تو زبان زد [illegible] ہے مگر ناول بھابی کے پیرو نے اس واقعہ کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان سے ملیے یہ آپ کی بھابی ہیں۔ جیتا جاگتا کردار اور شوکت تھانوی کا انداز بیان۔

غزالہ اس ناول میں مزاح تو ہے ہی، اس لیے کہ اس کا مصنف شوکت ہے مگر مزاح کے علاوہ اور بھی کچھ ہے۔ کچھ کشش، کچھ جدوجہد، کچھ سرفروشی اور کچھ عداوت، حیرت و استعجاب۔

نیلوفر نیلوفر کا انداز تو غزالہ والا ہی ہے۔ مگر یہ اپنی دلچسپی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ وہی عشق و محبت کی حکایت ہے وہی سرفروشی کے نمونے ہیں۔ وہی دلچسپ چیز پھر آتی ہے جو دل میں اُترتی جاتی ہے۔

خدانخواستہ (ناول) ذرا تصور تو کیجیے، اگر آپ وہ ہو جائیں جو آپ کی بیگم صاحبہ ہیں اور بیگم صاحبہ وہ ہو جائیں جو آپ ہیں تو کیا ہو؟ اس کا جواب شوکت تھانوی سے سنیے۔

مولانا (ناول) وہ مولوی صاحب ہیں۔ جن کے قدم نے کبھی بھی اپنے معیار سے نیچے اُترنا گوارا نہیں کیا۔ اس ناول میں شوکت تھانوی نے بسم اللہ آپ جیسے ایک صاحب کو خواہ مخواہ مولانا بنا کر جو اس کی گت بنائی ہے، وہ خدا کسی کی نہ بنائے۔

کتیا (ناول) کتیا پالتو ہو یا جنگلی جونتی ضرور ہے۔ اور اگر کاٹ لے تو دماغ پر خاص اثر پیدا کرتی ہے۔ اس کتیا نے ہمارے دماغ پر یہ اثر کیا کہ ہم مسلسل ہنس رہے ہیں۔ اس لیے کہ نہ یہ پالتو کتیا ہے نہ جنگلی۔ بلکہ یہ دراصل شوکت تھانوی کے ایک مزاحیہ ناول کا نام ہے۔

سانچ کو آنچ یہ ناول اُن مہاجرین پر ہے جو ہندوستان میں مدتوں تک تو عاجز تھے اور پاکستان پہنچ کر اپنے آپ کو نواب سمجھنے اور کہلوانے لگے۔ یہ ناول ایسی ہی دلفریب حکایتوں پر اس انداز میں لکھا گیا ہے کہ پڑھ کر مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں۔

سسرال اس ناول کا کچھ حصہ ماہنامہ نقوش لاہور میں چھپ چکا ہے۔ جسے سب نے اتنا پسند کیا تھا کہ ہم اسے جلد سے جلد مکمل طور پر کتابی صورت میں شائع کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ ناول اتنا دلچسپ و لطیف ہے کہ اسے پڑھ کر ذہن جھوم جھوم اُٹھتا ہے۔

کارٹون (ناول) شوکت تھانوی کارٹونسٹ ہیں، اس لیے کہ ان کے ایک لاجواب مزاحیہ ناول کا نام کارٹون ہے۔ اس ناول میں شوکت کا قلم کہیں بھی آورد کا شکار نہیں ہوا ہے، وہی روانی اور سبک، وہی بے ساختہ اور بے تکلف مزاح ہے۔

[illegible] شوکت تھانوی [illegible]

[illegible]

بقراط (ناول) [illegible] شوکت تھانوی [illegible]
[illegible] کی جرأت [illegible] ہے۔

جوڑ توڑ (ناول) [illegible] شوکت تھانوی [illegible]
[illegible]

غالب کے ڈرامے [illegible] شوکت تھانوی [illegible]

بار خاطر شوکت تھانوی [illegible]
[illegible]

نمک مرچ شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ [illegible] اس سے پہلے آپ نے نہ پڑھے ہوں گے۔

سودیشی ریل شوکت تھانوی نے اپنی [illegible] کا [illegible] مجموعہ [illegible] مضامین سے [illegible] سے شاہکار خود منتخب کئے ہیں اور نئے مضامین بھی اپنے ہی انتخاب سے شریک کئے ہیں۔ مصنف کا خود اپنا انتخاب کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ کتاب ہے۔

مابدولت شوکت کی زد پر شوکت — شوکت تھانوی نے اپنے کو بھی نہیں بخشا۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنا کچا چٹھا پیش کر دیا ہے۔ "مابدولت" میں ایک نہایت نازک موضوع پر خود اپنے متعلق لکھے ہیں — ادھر سے [illegible] نظریہ۔ ادھر سے ان کی پذیرائی۔ آخر شیطان نے دونوں کو کھینچا کہ ہم دونوں ایک ہو گئے۔

قاضی جی (تین حصے) مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج کی رائے یہ ہے کہ: "قاضی جی پاکستان کا پہلا مزاحیہ کردار ہے۔ جسے شوکت تھانوی نے پیش کیا ہے۔ ریڈیو سننے والے قاضی جی سے بخوبی واقف ہو گئے۔ شوکت تھانوی سے قاضی جی کی نشریوں کا پہلا مجموعہ مرتب ہوا تو تقاضا شروع ہوا کہ دوسرا مجموعہ کہاں ہے۔ اب ہم نے دوسرا تیسرا مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے تاکہ اس مقبول عام کردار کے کارنامے دستاویزی صورت میں محفوظ رہیں۔

وغیرہ وغیرہ سودیشی ریل کے مصنف شوکت تھانوی نے پھر اس صنف ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ جو آج سے برسوں پہلے اس کی بے مثال اور غیر فانی شہرت کا سبب بنی۔ "وغیرہ وغیرہ" ان کے تازہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مزاح پاروں میں شوکت تھانوی کا فن نکھرا ہوا ہے اور انھوں نے جانبداری اور گہرے مشاہدے سے کام لے کر ہنسی کی ایسی پھلجڑیاں چھوڑی ہیں جن سے قہقہوں کی چنگاریاں رہتی دنیا تک برستی اور انسانی ذہن اُجالتی رہیں گی۔

مضامینِ شوکت اگر کوئی شخص صرف شوکت تھانوی کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہے تو بلاشبہ اس کے لئے صرف مضامینِ شوکت ہی تجویز کی جا سکتی ہے۔ آپ کو اس میں وہی بے ساختہ زبان، چٹپٹی فقرہ بازی، شگفتہ و لطیف پیرایۂ بیان ـــ یہ ہیں وہ خصوصیات جو شوکت تھانوی کے آرٹ کو زندۂ جاوید بناتے ہیں۔ مضامینِ شوکت میں جو مضامین شامل ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں۔

بے قاعدہ شوکت تھانوی کی بالکل نئے انداز کی تصنیف ہے اور یہ بالکل انوکھی چیز ہے۔ اس قاعدے سے بچے بھی لطف اندوز ہوں گے اور بڑے بھی ہنستے ہنستے دلچسپ تصنیف کو پڑھیں گے اور بڑے اس سے عقل کا شعور حاصل کریں گے۔ اس قاعدے میں آپ کو الف سے ے تک نہیں پڑھایا گیا بلکہ الف سے امتیاز علی تاج پڑھایا گیا ہے۔

شوکت تھانوی کی چند اور نئی کتابیں

ہنس مکھ ـــ افسانوں کا مجموعہ

چٹخارے ـــ افسانوں کا مجموعہ

قاضی جی (چہارم) ـــ ریڈیائی ڈرامے

قیمتوں میں تخفیف

نام کتاب	سابقہ قیمت	موجودہ قیمت	نام کتاب	سابقہ قیمت	موجودہ قیمت	نام کتاب	سابقہ قیمت	موجودہ قیمت
خمسہ الد	۶/-	۴/-	مابدولت	۳/-	۲/-	کارٹون	۳/۵۰	۲/۵۰
نیلوفر	۶/-	۴/-	جوڑ توڑ	۴/-	۲/۷۵	بقراط	۲/۵۰	۲/-
جمالی	۴/۵۰	۳/-	وغیرہ وغیرہ	۳/-	۲/-	مضامینِ شوکت	۲/۵۰	۱/۵۰
مولانا	۳/۵۰	۲/۷۵	غالب کے دوشالے	۲/۵۰	۱/۵۰	نمک مرچ	۳/-	۲/-
بارِ خاطر	۴/-	۲/۷۵	بے قاعدہ	۲/-	۱/۲۵	قاضی جی (اوّل)	۳/۵۰	۲/۵۰
خدانخواستہ	۳/-	۲/-	سودیشی ریل	۳/-	۲/-	قاضی جی (دوم)	۳/۵۰	۲/۵۰
کتیا	۳/۵۰	۲/۷۵	سانچ کو آنچ	۳/۵۰	۲/۵۰	قاضی جی (سوم)	۳/۵۰	۲/۵۰
سسرال	۲/۲۵	۱/۵۰						

شوکت تھانوی کی کتابیں پڑھیں
اور فکروں سے آزاد ہو جائیں

ادارۂ فروغِ اردو، ایبک روڈ (انارکلی) لاہور

اگر غور کیجئے تو ۔ یہی چھوٹی چھوٹی چیزیں...

[illegible]

خدمت اپنا افتخار
برما شیل پر اعتبار

جاری کردہ برما شیل آئل سٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ
(انگلستان میں قائم شدہ ـ کمپنی کے ممبران کی ذمہ داری محدود ہے)

نقوش

اپنا ۱۰۰ واں شمارہ
ایک کارنامہ کی صورت میں پیش کرے گا
اور وہ کارنامہ

آپ بیتی نمبر

کی صورت میں سامنے آئے گا

اُن تمام بڑے ادیبوں کی آپ بیتیوں کا جامع تذکرہ، انہی کے الفاظ میں ہوگا جو آج سے پہلے لکھی گئیں اور جن سے ملک قوم کی سیاست، ادب اور تاریخ متاثر ہوئی

اور موجودہ دور کے تمام بڑے ادیبوں کی غیر مطبوعہ خود نوشت سوانح عمریاں ہوں گی جو آج ہی نہیں کل بھی دستاویزی حیثیت رکھیں گی اور جو خود اپنی جگہ اتنی دلچسپ ہوں گی کہ افسانوی کردار ان کے سامنے گرد نظر آئیں گے

آئندہ شمارہ **آپ بیتی نمبر** ہی ہوگا

۳۲۱۲۶ ق ۷۶ ص ۸۰۲ ص

یہ کتاب اس تاریخ کو جو سب سے آخیر میں ڈالی گئی ہے
واپس کرنی ہے، ورنہ پانچ پیسے روزانہ کے حساب سے
ہرجانہ ادا کرنا ہوگا

[illegible]

۲۲۳۹ .... ۸۹۷ش ۳۸۰۱
توخن .... مدیر محمد نبیل ....
شوکت نمبر ـ